2

مذہب اثنا عشریہ کے اصول و فروع پر سیر حاصل مکمل و مدلل کتاب

تحفہ اثنا عشریہ

الملقب بہ

نصیحۃ المومنین و فضیحۃ الشیاطین

امام الکبیر علامہ شاہ عبدالعزیز

بن شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی ۱۲۳۹ھ)

ترجمہ

مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی مظاہری

تقدیم و تخریج و تعلیق

مجلس تحقیقات علوم اسلامیہ پاکستان

فہرست عنوانات

باب ہفتم 18
امامت کا بیان 18
مسئلہ نمبر 1: در اختلافی مسائل 18
مسئلہ نمبر 2: امام کو ظاہر ہونا چاہیے پوشیدہ اور روپوش نہ ہونا چاہیے 31
مسئلہ نمبر 3: امام و خلیفہ کا علم و اجتہاد میں خطا سے پاک ہونا ضروری ہے 34
شبہ نمبر 1: اگر امام معصوم نہ ہو تو تسلسل لازم آتا ہے 37
شبہ نمبر 2: امام شریعت کا نگہبان ہوتا ہے 38
مسئلہ نمبر 4: امام کا تقرر خدا پر واجب ہے 41
مسئلہ نمبر 5: امام کو تمام اہل زمانہ سے افضل ہونا چاہیے 43
مسئلہ نمبر 6: خلیفہ بلا فصل حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں 44
لفظ امام کے معانی کی وضاحت 45
لفظ خلیفہ کا اطلاق کس پر ہو گا 45
حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کی وجہ 46
بعض جاہل امامیہ کے ایک شبہ کا جواب 49
حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت کے متعلق بحث 50
لعنت کے بارے میں شیعہ کی اپنے اصول کی خلاف ورزی 55
شیعہ کو اشتباہ پیش آنے کی اصل وجہ 57
خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کا قرآن سے ثبوت 59
خلیفہ کے معنیٰ شرعی اصطلاحی ہیں یا حادث مابعد 62
جناب امیر رضی اللہ عنہ کی اپنے لشکریوں کی شکایت اور ان پر عدم اعتماد 72

اقوال عترت سے خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کا ثبوت 79
خلافت خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے ثبوت پر قرآن وسنت اور بعض دیگر دلائل 95
بحث امامت بلافصل 105
وہ آیات جن سے شیعہ خلافت علی رضی اللہ عنہ بلافصل پر استدلال کرتے ہیں 107
مسئلہ عصمت از آیت زیر بحث 128
کیا ہر واجب المحبت واجب الاطاعت ہوتا ہے 129
آیت مباہلہ سے خلافت علی بلافصل کے استدلال کا جواب 135
وہ احادیث جن سے شیعہ خلافت علی رضی اللہ عنہ بلافصل پر استدلال کرتے ہیں 145
حدیث غدیر خم 145
حدیث ہارون وموسیٰ علیہما السلام 154
حدیث ان علیا منی وانا من علی 157
حدیث طیر سے استدلال کا جواب 158
حدیث انا مدینۃ العلم وعلی بابھا 160
حدیث تشبیہ بالانبیاء 162
حدیث تکفیر نزاع فی الامامت 169
حدیث نورین 171
حدیث لواء خیبر 173
حدیث الحق مع علی حیث دار 176
حدیث قتال علی التنزیل والتاویل 182
حدیث ثقلین 183
حدیث سفینہ نوح کی مزید تشریح 186

شیعوں کے عقلی دلائل کا جواب 188

پہلی دلیل امام کے لئے معصوم ہونا واجب ہے 189

دوسری دلیل امام نے کبھی کفر نہ کیا ہو 193

تیسری دلیل امام کی امامت نص سے ثابت ہوتی ہے 195

چوتھی دلیل جناب امیر کی صداقت امامت بالاجماع ثابت ہے 196

پانچویں دلیل حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے امامت کا دعویٰ بھی کیا تھا 205

چھٹی دلیل جناب امیر رضی اللہ عنہ پر کسی نے کبھی طعن نہیں کیا 208

نواصب وخوارج کی جناب امیر رضی اللہ عنہ کی شان میں قدح وطعن گوئی 209

مطاعن خوارج کے مختصر جوابات 219

امامت کی بحث کا خاتمہ 226

شروط امامت میں اختلاف 227

ائمہ کی تعداد میں امامیہ کا اختلاف 234

باب ہشتم 244

متعلق آخرت 244

امور معاد میں کتاب وعزت سے شیعی مخالفت 244

عقیدہ نمبر 1: بعض فرق شیعہ کا حشر اجساد سے انکار 244

عقیدہ نمبر 2: بعث بعد الموت اللہ تعالیٰ پر واجب ہے 247

عقیدہ نمبر 3: عذاب قبر کا انکار 251

عقیدہ نمبر 4: قیامت کے دن سوال وجواب کا انکار 260

عقیدہ نمبر 5: تناسخ بعض روافض کے ہاں ثابت ہے 260

عقیدہ نمبر 6: رجعت ثابت ہے 264

عقیدہ نمبر 7: کسی امامی کو عذاب نہ ہو گا 268
باب نہم 279
احکام فقہیہ جن میں شیعوں نے ثقلین سے اختلاف کیا ہے 279
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تکفیر کرنا 280
حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر لعنت کرنے کو ذکر پر فضیلت دینا 281
نماز کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر لعنت کرنا 281
عید غدیر 282
عید بابا شجاع 282
نوروز کی تعظیم 285
ظالم بادشاہ کو سجدہ جائز ہے 286
مسائل فقہیہ 288
نجس پانی کو پاک قرار دینا 288
شراب کی طہارت کا مسئلہ 289
مذی پاک ہے 290
مذی ناقض وضو نہیں ہے 291
ودی پاک ہے 291
ودی ناقض وضو نہیں ہے 291
عضو مخصوص تین بار جھٹکنے کے بعد پاک ہوتا ہے 292
گھریلو مرغا، مرغی کی بیٹ پاک ہے 293
وضو میں مکمل چہرہ دھونا فرض نہیں ہے 293
غسل جنابت کے ساتھ وضو حرام ہے 294

غسل نوروز سنت ہے.......... 295
تیمم میں فقط ایک ضرب کافی ہے.......... 295
لباس یا جگہ ناپاک ہو تو نماز جائز ہے.......... 296
نمازی کے کپڑوں پر خون لگا ہو تو حرج نہیں.......... 296
خلاف قبلہ رخ ہو تو نماز جائز ہے.......... 296
خشک انسانی غلاظت پر نماز جائز ہے.......... 297
نجس پانی سے ہاتھ دھو کر نماز جائز ہے.......... 297
نماز سے فراغت کے بعد ناپاکی معلوم ہو تو نماز درست ہے.......... 298
ننگا آدمی اعضاء مخصوصہ پر مٹی لگا کر نماز پڑھ سکتا ہے.......... 298
نجاست کے ساتھ نماز درست ہو جائے گی.......... 299
حالت نماز میں چلنا پھرنا جائز ہے.......... 299
بعض سورتوں کی قرأت سے نماز فاسد ہو جاتی ہے.......... 300
حالت نماز میں کھانا پینا جائز ہے.......... 300
نماز میں عضو خاص میں انتشار ہو تو کوئی حرج نہیں.......... 301
نمازی عضو خاص سے کھیلتا ہے تو نماز نہیں ٹوٹتی.......... 301
ائمہ کی قبور کی طرف رخ کرنا نماز میں جائز ہے.......... 302
بغیر عذر کے ظہر و عصر و مغرب کو جمع کرنا جائز ہے.......... 302
چار نمازیں ملا کر پڑھنا مستحب ہے.......... 303
قصر اور اتمام کے بعض مسائل.......... 303
مکہ مدینہ اور کوفہ میں قصر جائز نہیں ہے.......... 304
امام کی عدم موجودگی میں جمعہ ترک کرنا.......... 305

میت پر نوحہ اور جزع فزع جائز ہے 305
پانی میں غوطہ لگانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے 306
لڑکے سے بد فعلی کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا 306
جانور کی کھال کھانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا 307
عاشورہ کے دن عصر تک روزہ جائز ہے 307
18 ذوالحجہ کا روزہ مستحب ہے 307
اعتکاف کے لئے مسجد جمعہ نبی یا وصی ضروری ہے 308
زکوۃ صرف سونے یا چاندی کے سکوں پر ہے 308
مال تجارت پر زکوۃ نہیں 309
مستحق صاحب نصاب بن جائے تو اس سے زکوۃ واپس لی جائے 310
استطاعت حج کا مسئلہ 310
حج میں ستر عورت فرض نہیں ہے 311
حالت احرام میں دوسری بار شکار پر کفارہ نہیں 312
جہاد صرف پانچ اوقات کے ساتھ مخصوص ہے 312
عقد نکاح یا معاملات خرید و فروخت صرف عربی زبان میں جائز ہیں 314
باپ کی موجودگی میں ولی دادا ہوتا ہے 315
تجارت میں مومن سے نفع لینا مکروہ ہے 315
شے مرہونہ پر قبضہ کیے بغیر رہن جائز ہے 316
مرہونہ لونڈی سے جماع جائز ہے 316
ام ولد کو رہن رکھنا جائز ہے 316
اجازت کے بغیر کفیل بنانا جائز ہے 317

امانت سے انکاری ہونا جائز ہے 317

غصب شدہ مال فقیروں کو خیرات کر دیا جائے 317

غاصب پر حاکم کا ظلم درست ہے 318

مرہونہ لونڈی سے لطف اندوزی جائز ہے 318

سمجھدار بچے کی نگرانی جائز نہیں 319

اجارہ صرف عربی زبان میں معتبر ہے 320

مجاہد یا سیکورٹی گارڈ تنخواہ کا مستحق نہیں 320

غیر کی باندی سے منافع حاصل کرنا حلال ہے 320

ہبہ بغیر عربی زبان کے درست نہیں 320

لونڈی ہمبستری کے لیے کسی کو دینا جائز ہے 321

صدقہ واپس لینا جائز ہے 321

بلی کو وقف کرنا جائز ہے 321

لونڈی کی شرمگاہ کا وقف جائز ہے 321

ضرورت اور خواہش کے باوجود نکاح نہ کرنا مستحب ہے 322

بعض دنوں میں نکاح مکروہ ہے 322

نو برس سے کم عمر کی لڑکی سے صحبت حرام ہے 323

حلال نکاح میں جماع کی تعداد مقرر کرنا جائز ہے 323

متعہ دوریہ جائز ہے 325

پندرہ مرتبہ پے درپے پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے 331

طلاق عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں دینے سے واقع نہیں ہوتی 332

بغیر گواہوں کے طلاق واقع نہیں ہوتی 333

شوہر کی موجودگی میں کنایات سے طلاق نہیں ہوتی 334

مقطوع الذکر کی مطلقہ کی عدت نہیں ہوتی 334

بغرض اذیت جماع ترک کرنے سے ظہار نہیں ہوتا 334

کفارہ ظہار میں 18 روزے کافی ہیں 335

لعان کے لئے بیوی مدخول بہا ہونی ضروری ہے 335

لفظ عتق سے آزادی نہیں ہوتی 336

فک رقبہ سے بھی غلام آزاد نہیں ہوتا 336

آزادی صرف اثنا عشریہ کی صحیح ہے 337

غلام مجذوم یا اندھا ہو جائے تو خود بخود آزاد ہو جاتا ہے 337

لونڈی فقط آقا کا نطفہ گر جانے سے ام ولد ہو جاتی ہے 338

مرتہن کے جماع سے بچہ ہو جائے تو لونڈی اس کی ام ولد ہو گی 338

بیوی کی شوہر کی اجازت کے بغیر منعقد نہیں ہوتی 338

پیدل حج کی نذر مانی تو یہ نذر ساقط ہو جاتی ہے 339

نذر فقط دل کے ارادے سے لازم ہو جاتی 340

حدود میں قاضی کا حکم نافذ نہیں ہوتا 340

قاضی پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے 341

مردہ بیٹی کی امانت کا دعویٰ مسموع ہو گا 342

دس سالہ لڑکے کی قصاص میں شہادت معتبر ہے 343

کتاب الصید والذبائح کے چند مسائل 343

غیر رواجی آلات سے شکار ناجائز ہے 344

کتاب الاطعمہ کے بعض مسائل 344

بھوکے کے لئے کھانا چھین کر کھانا جائز ہے 345

مسائل فرائض (میراث) 346

دیت میں ماں شریک بھائی بہن کو حصہ نہیں ملے گا 346

بیوی کو زمین سے میراث کا حصہ نہیں ملتا 346

وصایا کے مسائل میں مظروف کو ظرف کے تابع کرتے ہیں 347

تحلیل فرج فقط دو سال ہے 348

مجنون اور پاگل پر حدود کا اجراء ہوگا 348

عورت کا عورت سے رگڑ کرنا موجب رجم ہے 348

کافرہ کی اولاد کو ابن الزانیہ کہنے سے قذف واجب ہے 349

اندھے سے قصاص نہیں لیا جائے گا 349

بھوکے کے لئے قتل جائز ہے 349

ذمی قاتل کا مال اور اولاد مقتول کے ورثاء کا ہوگا 350

باب دہم 351

جواب مطاعن خلفاء راشدین و کبار صحابہ رضی اللہ عنہم 351

مطاعن ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ 352

طعن نمبر 1: حضرات حسنین رضی اللہ عنہما نے ممبر سے اتر جانے کا کہا 352

طعن نمبر 2: مالک بن نویرہ کا قتل 354

طعن نمبر 3: اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں آپ رضی اللہ عنہ نے تاخیر کی 359

طعن نمبر 4: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کبھی دینی امور سپرد نہیں کئے 366

طعن نمبر 5: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا 369

طعن نمبر 6: حضرت ابو بکر و عمر پر عمرو بن العاص اور اسامہ کا امیر بننا 371

طعن نمبر 7: حضرت ابو بکر نے آنحضرت کی مخالفت کرتے ہوئے عمر کو خلیفہ بنایا 372

طعن نمبر 8: ابو بکر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ میرے پیچھے شیطان لگا ہوا ہے 374

طعن نمبر 9: بیعت ابی بکر بغیر غور و فکر کے اچانک ہوئی 379

طعن نمبر 10: ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا علی رضی اللہ عنہ کے ہوتے میں بہتر نہیں 383

طعن نمبر 11: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پیغام رساں بنا کر پھر منع کر دیا 385

طعن نمبر 12: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو وراثت نہیں دی 392

علم کے لئے وراثت کا لفظ استعمال کرنا مجاز ہے 398

طعن نمبر 13: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے باغ فدک سیدہ رضی اللہ عنہا کو نہیں دیا تھا 403

طعن نمبر 14: سیدنا ابو بکر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے باوجود سیدہ کو فدک نہ دیا 410

شیعہ کے بعض مغالطے اور ان کا جواب 412

سیدہ کے جنازے میں خلیفہ الرسول کی شرکت 416

طعن نمبر 15: ابو بکر رضی اللہ عنہ کو شرعی مسائل کا علم نہیں تھا 418

طعن ھذا کے متعلق دوسری دلیل 421

طعن ھذا کے متعلق تیسری دلیل 424

مطاعن عمر رضی اللہ عنہ 427

طعن نمبر 1: قصہ قرطاس 427

طعن نمبر 2: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سیدہ رضی اللہ عنہا کا مکان جلا دیا تھا 452

طعن نمبر 3: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا انکار کیا 456

طعن نمبر 4: حضرت عمر رضی اللہ عنہ شرعی مسائل سے ناواقف تھے 458

طعن نمبر 5: عمر رضی اللہ عنہ نے سو کوڑوں کی جگہ سو شاخہ لکڑی مارنے کا حکم دیا 466

طعن نمبر 6: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نصاب شہادت کے باوجود مغیرہ رضی اللہ عنہ پر حد نہ لگائی 468

طعن نمبر 7: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مہر کے مسئلہ میں ایک عورت نے لاجواب کر دیا 471
طعن نمبر 8: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خمس میں سے اہل بیت کا حصہ نہیں دیا 477
شیعہ کے نزدیک خمس کا حکم 481
حنفیہ کے نزدیک خمس کا حکم 482
شوافع کے نزدیک خمس کا حکم 482
طعن نمبر 9: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دین میں بدعات جاری کیں 483
طعن نمبر 10: دادا کی میراث میں سو فیصلے نافذ کئے 485
طعن نمبر 11: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے متعہ اور حج تمتع سے منع کیا 487
متعۃ الحج کی ممانعت کے الزام کا جواب 492
مطاعن عثمان غنی رضی اللہ عنہ 496
طعن نمبر 1: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ظالموں کو امیر بنایا 496
طعن نمبر 2: مروان کے باپ کو واپس مدینہ بلالیا 510
طعن نمبر 3: اپنے عزیز و اقارب کو بہت زیادہ مال و دولت بخشا 512
طعن نمبر 4: کئی صحابہ رضی اللہ عنہم کو عہدوں سے معزول کیا گیا 522
فائدہ جلیلہ 526
طعن نمبر 5: حضرت عبد اللہ بن مسعود اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کا وظیفہ بند کر دیا 529
حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا قصہ 538
حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا قصہ 541
حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قصہ 543
حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا قصہ 545
حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا قصہ 546

حضرت کعب بن عبدہ نہدی رضی اللہ عنہ کا قصہ 547

اشتر نخعی کا قصہ 548

طعن نمبر 6: حضرت عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے قصاص نہ لینا 549

ولید بن عقبہ پر حد جاری نہ کرنے کا اعتراض 553

احد، بدر اور بیعت رضوان کے متعلق اعتراض 555

طعن نمبر 7: جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو بدل ڈالا 557

طعن نمبر 8: مدینہ کی چراہ گاہ بقیع کو قرق کیا 558

طعن نمبر 9: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دوستوں کو جاگیریں دیں 559

طعن نمبر 10: سارے ہی صحابہ ان کے قتل پر خوش تھے 561

مطاعن ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا 571

طعن نمبر 1: مکہ، مدینہ و بصرہ کا سفر اللہ کے حکم کے خلاف کیا 571

طعن نمبر 2: عائشہ رضی اللہ عنہا نے خون عثمان کے قصاص کے لئے سفر کیا 574

طعن نمبر 3: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی 577

طعن نمبر 4: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بصرہ کا بیت المال لوٹا 579

طعن نمبر 5: جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا راز افشا کر دیا 582

طعن نمبر 6: حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے غیرت کھانے کا اقرار 586

طعن نمبر 7: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑائی پر اظہار افسوس 588

طعن نمبر 8: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ میں اپنے والد اور ان کے دوست کو دفن کرایا 588

طعن نمبر 9: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجرہ عائشہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا فتنہ یہاں ہے 592

طعن نمبر 10: ایک لونڈی کا رشتہ کے لئے بناؤ سنگھار کیا 593

مطاعن صحابہ رضی اللہ عنہم علی العموم 595

طعن نمبر 1: صحابہ رضی اللہ عنہم نے دو مرتبہ گناہ کبیرہ کیا 595
طعن نمبر 2: صحابہ رضی اللہ عنہم خطبہ کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا چھوڑ گئے 597
طعن نمبر 3: صحاح کی ایک روایت کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم پر طعن 598
طعن نمبر 4: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قرطاس طلب کیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے حیلے حوالے کئے 606
طعن نمبر 5: صحابہ رضی اللہ عنہم احکامات کی بجا آوری میں سستی سے کام لیتے تھے 607
طعن نمبر 6: میں تمہیں آگ سے بچاتا ہوں اور تم اس میں گرتے ہو 610
طعن نمبر 7: روم وفارس کے خزانے ملنے کے بعد آپس میں حسد و حرص 611
طعن نمبر 8: صحابہ رضی اللہ عنہم سیدنا علی و سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما کی ایذا پر متفق ہو گئے تھے 613
شیخین رضی اللہ عنہما کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے برتاؤ 616
جنگ جمل کی حقیقت 619
جنگ صفین کے محرکات 623
طعن نمبر 9: قیامت قائم نہ ہوگی جب تک میری امت اگلی قوموں کی اتباع نہ کرے گی 628
طعن نمبر 10: قوم کے ڈر سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ کام چھوڑ دیئے 629
باب یازدہم 631
خصوصیات مذہب شیعہ 631
فصل اول شیعی اوہام 633
فصل دوم شیعی تعصبات 643
فصل سوم شیعی ہفوات 667
ہفوہ نمبر 1: تقیہ کی حقیقت 667
فائدہ عظیمہ 690
ہفوہ نمبر 2: شیخین رضی اللہ عنہما منافق تھے 699

ہفوہ نمبر 3: شیخین رضی اللہ عنہما اصحاب العقبہ میں سے تھے 699

ہفوہ نمبر 4: امام کا وجود محض لطف ہوتا ہے 701

ہفوہ نمبر 5: سیدنا علی کو اوصاف خدائی سے متصف کرتے ہیں 701

ہفوہ نمبر 6: تمام انبیاء کو سیدنا علی کی ولایت کی پاسداری کے لیے بھیجا گیا 702

ہفوہ نمبر 7: قرآن کریم کی تحریف کرتے ہیں 703

ہفوہ نمبر 8: روز جزا کے مالک وہ حاکم جناب علی رضی اللہ عنہ ہوں گے 706

ہفوہ نمبر 9: جناب عمر رضی اللہ عنہ نے جناب علی رضی اللہ عنہ کو حیلوں بہانوں سے قتل کرنا چاہا 707

ہفوہ نمبر 10: بعض صحابہ رضی اللہ عنہم پر لعنت سے ستر نیکیاں 708

ہفوہ نمبر 11: قتل عمر رضی اللہ عنہ سے تین دن تک نامہ اعمال نہیں لکھے گئے 709

ہفوہ نمبر 12: تیمی اور عدوی نام کے دو بت تھے 709

ہفوہ نمبر 13: حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطاب کے صلبی بیٹے نہ تھے 710

ہفوہ نمبر 14: شیخین کی ہر سال منی میں رمی کی جاتی ہے 710

ہفوہ نمبر 15: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اعتماد نہیں تھا 711

ہفوہ نمبر 16: فلاں عورت کی کھال اصحاب کہف کے کتے سے تبدیل ہوگی 713

ہفوہ نمبر 17: معصوم کے بدن سے لگنے والی مٹی کعبہ سے بھی بہتر ہے 714

ہفوہ نمبر 18: حقیقی بادشاہ امام معصوم مہدی منتظر ہیں 715

ہفوہ نمبر 19: مخصوص وقت کے علاوہ جہاد فساد ہے 716

ہفوہ نمبر 20: یہ قرآن منزل من اللہ نہیں ہے 716

ہفوہ نمبر 21: دابۃ الارض سے مراد حضرت علی ہے 716

ہفوہ نمبر 22: شرم گاہوں کو حلال جاننا 717

ہفوہ نمبر 23: متعہ بہترین اور افضل عبادت ہے 718

خاتمہ باب خلاصہ حساب 721
شیعہ مذہب کی یہودیوں سے مشابہت 741
شیعہ مذہب کی نصرانیوں سے مشابہت 742
شیعہ مذہب کی صائبین سے مشابہت 744
شیعہ مذہب کی مجوسیوں سے مشابہت 744
شیعہ مذہب کی ہندوؤں سے مشابہت 744
باب دو از دہم 746
تولّا اور تبرّا 746
اللہ کے ہاں صحابہ رضی اللہ عنہم کا مقام 763
مصنف کا حرف آخر 790

باب ہفتم

امامت کا بیان

معلوم رہنا چاہئے کہ اس سلسلہ کے وہ مسائل جو مختلف فیہ ہیں ان میں پہلا مسئلہ یہ ہے:

مسئلہ نمبر 1: در اختلافی مسائل

اہل سنت کہتے ہیں کہ مسلمین کے ذمہ ضروری ہے کہ وہ اپنے میں سے ایک رئیس (خلیفہ وامیر) کا انتخاب کریں اور پھر شریعت کی روشنی میں اس کی اتباع اپنے اوپر لازم جانیں، اور شرعی امور میں اپنے رئیس کی ہر طرح مدد اور اعانت کریں، یوں تو ہر فرقہ اپنے فطری جذبہ کے تحت اپنے لئے ایک رئیس منتخب کرتا ہے مگر شارع نے ایسے رئیس کے لئے اوصاف اور شرائط ولوازمات متعین اور بیان کر دیئے ہیں تاکہ ان شرائط و لوازمات کی وجہ سے ریاست فساد و بد انتظامی کا شکار نہ ہو اور یہی شریعت کا قانون ہے اس کا انسان کے فطری امور کی تعیین و تخصیص میں کوئی نقل نہیں بلکہ ان امور کے عموی اوصاف اور شرائط ولوازمات کی وضاحت کرتا ہے، جو صلاح وفلاح عالم کا باعث ہوں اور جن سے انتظام کی حفاظت میسر ہو۔

اور تعیین و تخصیص کو عقل کے حوالہ کیا گیا ہے خواہ وہ عقل انفرادی یعنی شخص متعلق کی ہو یا عقل اجتماعی کنبہ، برادری یا پنچایت کی مثلاً نکاح کے بارے میں یہ تو بیان کیا گیا ہے کہ جس سے نکاح کیا جائے اس میں کیا اوصاف ہوں اور شرائط نکاح مثلاً کفائت وہم نسبی، ولایت، شہادت اور مہر نیز اس کے لوازمات مثلاً نان ونفقہ، جائے رہائش وغیرہ مگر منکوحات کی تعین سے مثلاً فلاں سے فلاں کا نکاح ہو اور فلاں سے فلاں کا کوئی تعرض نہیں کیا گیا اس کو عقل انفرادی یا اجتماعی کے حوالہ کر دیا گیا ہے۔

اور یہی حال تمام معاملات کا ہے، بلکہ دینی امور میں بھی یہ تو فرمایا گیا ہے کہ "فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ"[1] اگر تم نہ جانتے ہو تو کسی جاننے والے سے پوچھو، مگر اہل علم و مجتہدین کی کوئی

1۔ سورۃ النحل، الآیۃ: 43

تخصیص نہیں فرمائی کہ فلاں عالم یا مجتہد سے پوچھو ہاں اگر پیغمبر علیہ السلام کی زندگی وموجودگی میں کسی شخص میں ریاست کبری کی قابلیت حاصل ہوئی یا اس کو فتویٰ واجتہاد کا درجہ نصیب ہوا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یا رسائی طبع یا قرائن سے اس کا علم ہوا پھر آپ نے اس شخص کے استحقاق واہلیت کو بیان فرمایا تو پھر اس کے کیا کہنے یہ تو نور علی نور کا معاملہ ہو گیا، جیسا کہ خلفاء اربعہ اور بعض دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ہوا۔

اس مسئلہ میں امامیہ اختلاف کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ رئیس عام کا مقرر کرنا اللہ تعالی کے ذمہ واجب ہے،[1] حالانکہ الہیات کے باب میں گزر چکا کہ اللہ تعالی پر کسی چیز کے واجب ہونے کے کوئی معنی نہیں یعنی اس پر کوئی چیز واجب ولازم نہیں بلکہ اس پر کسی چیز کا واجب ہونا اس کی الوہیت اور ربوبیت کے منافی ہے، بلکہ تمام تکلیفات سیادت، مثلاً نظام سیاست کا اجراء، دشمنوں سے جہاد عسکری، تیاری مال غنیمت، خمس، فئ کی تقسیم احکام کا نفاذ وغیرہ وغیرہ رئیس عام کے وجود سے وابستہ ہیں تو پھر اس کا تقرر انہیں کے ذمہ ہونا چاہیے اللہ تعالی پر اسے کیوں واجب ولازم کیا جائے اس لئے کہ واجب کا مقدمہ وپیش خیمہ اسی پر واجب ولازم ہوتا ہے جس کی طرف اس واجب کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے نہ کہ کسی دوسرے پر مثلاً وضو کرنا، ستر کو چھپانا، قبلہ کی سمت رخ کرنا، کپڑے، جائے نماز کا پاک رکھنا، جو تکلیفات دینی وشرعی ہیں، یہ سب نمازی کے ذمہ ہیں اللہ تعالی کے ذمہ نہیں، لہذا امام وخلیفہ اور رئیس کا مقرر کرنا جو بہت سے واجبات کا پیش خیمہ ہے جو مکلفین پر واجب ہیں تو یہ بھی ان مکلفین ہی پر واجب ہو گا نہ اللہ تعالی پر۔

اور اگر اس معاملہ میں ذرا غور سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اللہ تعالی کی طرف سے رئیس کا تقرر بہت سے فسادات کا سبب ہے، اس لئے کہ اہل عالم کی آراء اور نفوس انسانی کی خواہشات ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو کسی ایک شخص یا چند اشخاص کا پورے عالم کے لئے دائمی تابقائے دنیا امام وحاکم کی حیثیت سے تقرر فتنوں کو ہوا دینے کا باعث ہو گا۔

1۔ قال الطوسي: «الإمام لطف فيجب نصبه على الله تعالى تحصيلا للغرض». كشف المراد في شرح صحيح الاعتقاد: ص 367. وقال المجلسي: «إن وجود الإمام لطف باتفاق جميع العقلاء، وأنه لا بد أن يكون معصوما ... ». بحار الأنوار: 51/ 213.

اور بے انتظار رخنے پیدا ہو سکتے ہیں ایسا کرنا امر امانت کو لغو و بیکار کر دینے کا سبب ہو گا اور سر کشوں کے غلبہ کا باعث ہو گا اور خود صاحبان امر کے مایوس ہو جانے اور تقیہ کرنے کا سبب ہو گا بلکہ ان کو معرض خطرہ ہلاکت میں ڈالنے کا باعث کیونکہ ان حالات میں یہ حضرات رؤساء امراء ہر دم خوفزدہ دبے دبے اور چھپے رہیں گے چنانچہ جن حضرات کے بارے میں یہ امامت کا اعتقاد رکھتے ہیں وہ حالات مذکورہ بالا سے دوچار ہوئے نہ کھل کر حکومت کر سکے نہ نفاذ احکام کی جرات ہوئی نہ لوگوں میں نظم وضبط قائم کر کے فتنوں کا سدباب کر سکے بلکہ وہ تو اتنے مجبور اور دبے رہے کہ ان لوگوں کا بھی کچھ نہ بگاڑ سکے جو علی الاعلان ان پر افترا اور بہتان کے تومار باندھتے اور اس جھوٹ وجہ سازی کو دھڑلے سے دنیا میں پھیلاتے رہے وہ تقیہ فرما کر گوشہ نشین رہے اور کار سیادت وہ لوگ چلاتے رہے جو اہل نہ تھے۔

تقرر امامت و خلافت کو لطف خداوندی کہہ کر اس کو خدا کے ذمہ کرنے کی بات کو ایسی ہے کہ سرسری عقل اس کو باور کر لیتی ہے مگر غور و فکر اس کو کبھی گوارا نہیں کرتے ہاں رئیس کا تقرر اس شکل اور اس شرط کے ۔ اتھ ضرور لطف الٰہی قرار پا سکتا ہے کہ امام وحاکم کی تائید کی جائے نصرت واعانت کے ساتھ اس کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں اور اس کو غلبہ وبرتری حاصل رہے اس کے دشمن اور مخالف غائب وخاصر ذلیل ورسوا رہیں ورنہ تو وہی فتنہ فساد غدر وبغاوت گلے کا ہار بنتے ہیں اور جب تائید کے بجائے سازش ہو اور غلبہ کی بجائے مقہوری مقسوم ہو تو پھر اس منصب کو لطف کہنا خلاف عقل ہی نہیں عقل کا ماتم ہے۔

اس سلسلہ میں امامیہ بطور جواب یہ کہتے ہیں کہ امام کا وجود ایک مہربانی لطف ہے اور اس کی مدد کرنا یا تصرف واختیار سے نوازنا دوسری مہربانی اور غلبہ وتصرف اگر حاصل نہ ہو تو یہ بندوں کا قصور اور ان کی کوتاہی ہے کہ انہوں نے اماموں کو اتنا ڈرایا دھمکایا کہ ان کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور اظہار امامت سے پہلو تہی کرنے لگے رفتہ رفتہ نوبت غیبت کبری کی آگئی اور پھر سوائے نام ونشان کچھ نہ رہا لہذا جب بندوں نے اپنی ناعاقبت اندیشی سے ان کی مدد چھوڑی تو اس میں خدا کے ذمہ کی کیا قباحت لازم آئی اور دشمنوں سے چھپنا یا ان سے خوفزدہ ہونا تو انبیاء اور اوصیاء کی خاص سنت ہے چنانچہ حضرت ﷺ بھی کفار کے خوف سے غار میں پوشیدہ رہے۔

امامیہ کے اس جواب میں ان مقدمات سے سراسر غفلت اور چشم پوشی برتی گئی ہے جو اعتراض میں ذکر

کیے گئے تھے اس لیے کہ کہا یہ گیا تھا کہ امام کا وجود بشرط تصرف و نصرت نہ ہو گا تو نتیجہ وہی فساد ہو گا لہذا جواب میں مجیب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ان فسادات کے لزوم کی دلیل کے ساتھ تردید کرے اس کے بغیر وہ جواب محض بک بک ہو گا اور یہاں مجیب کے اس جواب میں فسادات کے لزوم وعدم پر توجہ ہی نہیں دی گئی۔

اور بندوں کی مدد ترک کرنے کی جو بات کہی ہے وہ بھی ناقابل تسلیم ہے اس لیے کہ اہل سنت اور شیعوں خصوصا زیدیوں واقفیوں اور ناؤسیوں اور افتحیوں کے مؤرخین میں سے کسی نے نہ یہ لکھا نہ اس کا ذکر کیا ملوک والسلاطین میں سے کسی نے بھی اپنے امام وقت کو ڈرایا ہوتا اور پھر ایسا ڈرایا جو چھپنے کا سبب ہو وہ ڈرا ہوا تو قتل ہی کا ہو سکتا ہے اور ائمہ کے لیے قتل کی دھمکی نہ چھپنے کا سبب ہے نہ خوف کا بلکہ وہ دھمکی تو ان کے لیے بے معنی اور فضول سی بات ہے اس لیے کہ ائمہ تو اپنے اختیار سے مرتے ہیں جب موت ان کی اپنی مرضی پر موقوف ہوئی تو پھر قتل سے ڈرنے کا سوال ہی نہیں جب تک ان کی مرضی نہ ہو کوئی ان کو ہاتھ نہیں لگا سکتا چنانچہ کلینی نے اس قاعدہ کو بہت سی روایات سے ثابت کیا ہے اور اس کے لیے ایک مستقل باب علیحدہ باندھا ہے۔ [1]

پھر یہ بات بھی ہے کہ ائمہ حکم الہی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تو ان کی یہ روپوشی بھی حکم خداوندی کے مطابق ہو گی اور یہ روپوشی بھی حکم الہی سے وہی اور اس نے اتنا طول کھینچا کہ ہزار سال سے بھی زیادہ مدت گزر گئی اور ان کی روپوشی کے درمیان اتنا بڑا فساد اور انقلاب رونما ہو گی کہ دین وایمان کی نہ صرف شکل ہی بگڑ گئی بلکہ ان کا شیرازہ اتنا پریشان اور ایسا بکھرا کہ اس میں اصلاح کی بھی گنجائش نہ رہی تو یہ منصب لطیف کہاں رہا دوسری بات یہ کہ جب ان کی روپوشی امر الہی سے ثابت ہو گئی تو ان انبیاء واوصیاء کو آپ کیا کہیں گے جو روپوش نہ ہوئے بلکہ ثبات قدمی کے ساتھ دین وایمان کے بقا وسلامتی کی خاطر اپنی جان دے دی مثلاً حضرت یحیی علیہ السلام

---

1 ۔ أن الأئمة عليهم السلام يعلمون علم ما كان وما يكون وانه لا يخفى عليهم الشيء صلوات الله عليهم۔ (الأصول من الكافي، 1/ 260، دار الكتب الاسلامية)

وفي بحار الانوار: انهم عليهم السلام لا يحجب عنهم علم السماء والأرض والجنة والنار،وأنه عرض عليهم ملكوت السماوات والأرض ويعلمون علم ما كان،وما يكون إلى يوم القيامة. (بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار،26/ 109، ط: مؤسسة الوفاء بيروت لبنان)

اور حضرت سبط نبی حسین رضی اللہ عنہ یہ تو پھر آپ کے خیال وعقیدہ کے مطابق نعوذ باللہ واجب کے تارک ہوئے۔

اچھا آپ اگر اسے یعنی روپوشی کو واجب نہیں مندوب و مستحب ہی کہیں تو پھر یہ لازم آتا ہے کہ روپوش ہونے والے حضرات نے ایسے امور کا ترک کیا جو یقیناً ان کے لیے واجب تھے مثلاً اقامت دین اور تبلیغ احکام تو ایک مندوق و مستحب کام کی خاطر ترک فرض و واجب کیا ان ذی شان حضرات کے شایان شان تھا یہ بات تو ان حضرات کے لیے پچھلی بات سے بھی زیادہ سخت ہوگی اور اگر پیچھا چھڑانے کے لیے کوئی یہ کہے کہ امر الہی مختلف نوع پر آئے تارکین کے حق میں تو وہ مندوب و مستحب تھے اور روپوشوں کے حق میں وجوب و فرضیت کی شکل میں تو پھر یہاں بھی یہ اشکال رہا کہ ہر دو میں سے کسی ایک فریق کے لیے اللہ تعالی نے ترک اصلح کیا اور یہ صورت بھی شیعوں کے نزدیک غلط اور باطل ہے

پھر ہم کہتے ہیں کہ ائمہ کی روپوشی قتل کے ڈر سے تو نہیں ہو سکتی اس لیے کہ جیسا کہ ابھی ہم سطور ماسبق میں بتا چکے ہیں کہ ائمہ برضی خود فوت ہوتے ہیں ان کی مرضی کے خلاف کوئی انہیں موت سے ہمکنار نہیں کر سکتا اور اپنی مرضی واپسند کی موت خوف وڈر کا باعث نہیں ہوا کرتی تو پھر ڈر اور خوف کا سبب کوئی جسمانی ایذا ہوگی لیکن اس میں خرابی یہ ہے کہ گویا ائمہ عبادات و مجاہدات اور صبر و مشقت کے اجر جزیل سے بھی اباو نفور کرتے ہوں گے کیونکہ خدا کی راہ میں اذیت کو مشقت کی برداشت تو اپنے اندر بہت بڑے اجر و ثواب رکھتی ہے اور جہاد تو نام ہی سرتاپا مشقت کا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مجاہدین کے بلندی درجات مسلم الثبوت ہیں۔

اور پھر ائمہ تو بڑے بلند مراتب کے لوگ ہیں ان کی عبادات تو عام بندوں سے اعلی وارفع ہوتی ہے اور ان میں خاص طور پر صاحب الزمان کا چھپنا تو بالکل ہی ناقابل فہم اور بے معنی بات ہے اس لیے کہ ان کو تو یقین سے یہ بات معلوم ہے کہ میں عیسی بن مریم علیہ السلام کے نزول تک زندہ رہوں گا نہ مجھے موت آسکتی ہے نہ کوئی مجھے مار سکتا ہے اور میں تو سر برآرائے سلطنت شرق و غرب بنوں گا تو وہ کیسے اور کیوں مخالفین اور دشمنوں کی طعن و تشنیع اور تخویف و تکذیب کی دھونس میں آگئے وہ ان سے کیوں ڈرتے ہیں اور کھلم کھلا دین کی دعوت اور اس کی اقامت کا فریضہ کیوں ادا نہیں کرتے اور اس راہ کی صعوبت کو مشقت کیوں برداشت نہیں کرتے اور ایسا نہ کر کے ائمہ سابقہ خصوصا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے طریقہ کے کیوں خلاف کرتے ہیں کہ وہ صابر اور ثابت قدم رہے

کہ ظالموں اور ناہنجاروں نے اتنا ڈرایا اور خوفزدہ کیا کہ بالآخر نوبت کشت و خون تک آگئی مگر وہ نہ ڈرے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ بجالاتے رہے ان کو تو اپنی طول عمری کی خبر بھی نہ تھی اور نہ ان کو یہ معلوم تھا کہ ان کا اقتدار اور تسلط ہو گا بھی کہ نہیں انہوں نے تو صرف ادائے فرض اور رضائے الٰہی کی خاطر ہر قسم کی اذیت اور تکلیف خواہ وہ بدنی تھی یا مالی بخندہ پیشانی برداشت کی اور اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر دیا۔

انہی اور اس جیسی قرین عقل باتوں اور فہم و دانش گفتگو سے آگاہ ہو کر ہی شریف مرتضیٰ نے اپنی کتاب تنزیہ الانبیاء والائمہ میں لکھا ہے کہ صاحب الزمان اور ان کے آبائے کرام کے مابین فرق ہے اور وہ یہ کہ ان کو تو اس بات کا پتہ ہے کہ وہ مہدی قائم ہیں اور نیزہ وسنان تیغ کے دھنی ہیں دشمنوں کا زیر وزبر کرنے والے ہیں اور مخالفین سے انتقام لینے والے ان کے ملک و دولت کو صفحہ ہستی سے مٹانے والے لہٰذا ان کو وہ خوف وڈر ہے جو دوسروں کو نہیں تھا مگر شریف مرتضیٰ کی گفتگو برائے گفتگو ہی ہے بلکہ مجنوں کی بڑ اور یاوہ گوئیوں کی بکواس بھی کہیں تو بجا ہے اس سے زیادہ صاحبان اعقل و شعور اسے کوئی عنوان نہیں دیں گے کیونکہ کئی مرتبہ یہ بات دہرا دی گئی ہے کہ ان کو اپنے قتل کا بہرحال ڈر وخوف نہیں ہے ان کو یہ یقین ہے کہ مجھ کو کوئی قتل نہیں کرے گا میں عیسیٰ بن مریم علیہ السلام سے ملاقات کروں گا ان کی نماز کی امامت کروں گا دجال سے نبرد آزما ہوں گا لوگوں کو چاروں ناچار عبادت پر لگادوں گا اپنے اور اپنے اسلاف کے دشمنوں سے پورا پورا بدلہ لوں گا پھر ان تمام امور سے نمٹ کر بستر کی موت مروں گا۔

تو پھر ان اسباب امن وطمانیت کو کیوں خاطر میں نہیں لاتے اسباب خوف کو ہی جو محض وہم کی پیداوار ہیں کیوں ہر دم پیش نظر رکھ کر یوں اپنے آپ دکھلا رہے ہیں حالانکہ حقیقت میں یہ اسباب خوف بھی بالکل خلاف واقع ہیں کیونکہ صاحب الزمان تو امام ہیں ان کو تو کچھ ہوا یا ہونے والا ہے سب کا علم ہو گا اور کم از کم زمانہ غیبت میں کسی شیعہ سے جس کی ان تک رسائی ہو گئی ہو گی سنا ہو گا کہ مخالفین ان کے دعوی مہدویت کو ہزار سال سے زائد مدت تک طول کھینچنے کو قبول و تسلیم نہیں کریں گے اس لیے کہ مخالفین کے نزدیک یہ طے شدہ بات ہے کہ آثار قیامت تیسری ہجری سے بارہ سو برس گزر جانے کے بعد نمودار ہوں گے ان کے مخالفین یہ بھی کہتے ہیں کہ مہدی صدی کے اوائل میں ظہور کریں گے وسط صدی میں نہیں اور یہ ظہور بھی حضرت عیسی

علیہ السلام کے نزول سے متصل ہو گا کچھ زمانی فاصلہ دے کر نہیں اور ان کے سر پر وقت ظہور ابر کا سایہ ہو گا سرد ابر سر من رائ کا نہیں،[1] ان کے ظہور کی جگہ مکہ مکرمہ کا حرم شریف ہو گا سر من رائ نہیں،[2] اور امامت کا دعوی عمر کے چالیس سال گزرنے کے بعد کریں گے بچپن یا بڑھاپے میں نہیں۔

لہذا مذکورہ علامات ونشانیوں کے برعکس ظاہر ہو جائیں اور کسی وقت علماء ومشائخ کے بھیس میں دین کی دعوت اور احکام شرع کی تبلیغ کریں اور کرامات دکھائیں تو یقین ہے کہ ان سے کوئی تعرض نہ کرے گا خصوصا شیعہ کے وہ تو دل وجان سے اس کے متمنی اور شیدائی ہیں اور خدا سے اس کے لیے مرادیں مانگتے ہیں نیز ان کو یہ خبر بھی ملی ہو گی کہ باقریہ یہ دعوی کرتے ہیں کہ مہدی موعود تو جناب باقر ہیں اور ناؤسیہ یہ ہانکتے ہیں کہ اس منصب پر جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ فائض ہیں اور قطوریہ اس مسند پر موسیٰ بن جعفر کو بٹھاتے ہیں اور ان لوگوں کے یہ دعوے امت میں شائع اور مشہور ہیں پھر بھی ان بزرگوں کے پیچھے کوئی نہیں پڑا اور نہ مہدویت کی وجہ سے کسی نے ان کو ڈرایا دھمکایا تو صاحب الزمان کو کیوں ڈرائیں گے اور ان کے پیچھے کیوں پڑھیں گے؟ اسی طرح جون پور کے سید محمد نے بہانگ دہل مہدی ہونے کا دعویٰ کیا اور افغان، دکن اور راجپوتانہ کے ایک جم غفیر نے اپنا لقب مہدویہ رکھ کر انہیں خراج عقیدت پیش کیا اور ان کا اتباع کیا اور کسی نے بھی ان کو قتل نہیں کیا نہ کوئی سزا دی۔[3]

---

1 ـ قال الكفعمي: «يستحب زيارة المهدي في كل زمان ومكان والدعاء بتعجيل فرجه (صلوات الله عليه) عند زيارته، وتتأكد زيارته في السرداب بسر من رأى ... ». البلد الأمين: ص 309.

2 ـ في رواية نعيم بن حماد عن الزهري أنه قال: «يخرج المهدي من مكة». الفتن: 1/ 351.

3 ـ ذكره القنوجي في أبجد العلوم: 3/ 221.

وقال الملا على القاري: وقد ظهر في البلاد الهندية جماعة تسمى المهدوية، ولهم رياضات عملية، وكشوفات سفلية، وجهالات ظاهرية، من جملتها أنهم يعتقدون أن المهدي الموعود هو شيخهم الذي ظهر، ومات ودفن في بعض بلاد خراسان، وليس يظهر غيره مهدي في الوجود، ومن ضلالتهم أنهم يعتقدون أن من لم يكن على هذه العقيدة فهو كافر.(مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، كتاب الفتن ، باب أشراط الساعة، 8/ 3443، ط: دار الفكر، بيروت لبنان)

خصوصاً 1000ھ میں کہ عراق و خراسان پر خاندان صفوی کا تسلط ہوا، [1] ادھر دکن میں سلاطین بہمنیہ اور عادل شاہیہ جو مذہب شیعت میں حد درجہ شدت اور غلو رکھتے تھے بر سر اقتدار آئے اور ہند و سندھ اور بنگالہ جو اس عہد میں بظاہر تو جہانگیر بادشاہ کے زیر نگین لیکن دراصل نور جہاں کے زیر نقاب تھے اس لیے کہ حکمرانی درحقیقت اس کے عراقی و خراسانی اقارب کر رہے تھے اور امراء، وزراء اور صوبہ دار کثر شیعہ تھے تو ایسے زریں موقع کو کیوں ہاتھ سے جانے دیا اور اسی وقت ظہور کیوں نہ فرمالیا اور اپنے دوستوں کو محض بے بنیاد وہم کی وجہ سے ماوراء النہر کے خانوں اور روم کے قیصروں کے لطف و کرم اور فوائد سے کیوں محروم رکھا ہے یہ ان سے کون کہتا تھا کہ آپ اپنے ان علاقوں کو چھوڑ کر جو ان کے شیدائیوں اور جانثاروں سے بھرے پڑے ہیں بخارا و سمرقند یا اسلامبول میں ظاہر ہوں اور خواہ مخواہ لوگوں کے ڈراوے اور خوف کا شکار ہوں کیا ان کو یہ وسیع ممالک اور کشادہ زمین نامناسب نظر آئی؟

اور شریف مرتضیٰ نے جو یہ کہا ہے کہ صاحب الزمان شروع میں دوستوں سے تو مل ملا لیتے تھے اور ان پر ظاہر ہو جاتے صرف دشمنوں ہی سے چھپے رہتے تھے مگر بعد میں دوست دشمن سب ہی سے غائب ہو گئے خطرہ یہ تھا کہ نادان دوست دانا دشمنوں پر ان کے راز فاش نہ کر دے، اور یوں دشمنوں کو بھڑکانے کا ذریعہ نہ بن جائیں یہ ایسی فسانہ طرازی ہے جس سے شاید تاریخ سے ناواقف لوگوں کو تو فریب دیئے جا سکے لیکن تاریخ دان تو اس انکشاف کو خندہ استہزاء سے زیادہ سمجھنے کو تیار نہیں، کسی بھی مؤرخ نے آج تک کبھی یہ نہیں لکھا کہ کوئی گروہ یا جماعت محمد بن حسن عسکری کی تلاش میں سراغ رساں بنی گھروں میں تاکتی جھانکتی پھری ہو یا اس وقت ان کو جستجو بغداد یا سر من رائی میں لوگوں میں موضوع گفتگو بنی ہو یا اس زمانہ کے خلفاء وملوک کے دل میں اس کا

1ـ أسسها إسماعيل الصفوي في إيران (1600 – 1620م)، الذي أظهر عقيدة الإمامية في إيران، وقتل كل من يعارضها من العلماء والعامة، قال الشوكاني: «كاد أن يدعي الربوبية وكان يسجد له عسكره ويأتمرون بأمره»، وقال قطب الدين الحنفي الشوكاني: «قتل ألف ألف نفس بحيث لا يعهد في الجاهلية ولا في الإسلام ولا في الأمم السابقة من قتل من النفوس ما قتل الشاه إسماعيل، وقتل من أعاظم العلماء بحيث لم يبق من أهل العلم أحد في بلاد العجم وأحرق جميع كتبهم ومصاحفهم وكان شديد الرفض»، مات سنة 931هـ/ 1620م. البدر الطالع: 1/ 271، أعيان الشيعة: 3/ 321.

خیال بھی آیا ہو سوائے اثنا عشریہ کے انہوں نے البتہ ان کی غیبت کی توجیہ کرتے وقت یہ مبہم اور فرضی احتمالات ذکر کیے ہیں ان کے علاوہ اور کوئی نہ ان سے واقف نہ آشنا بلکہ اب تک تاریخ اس بات کا ثبوت دینے سے قاصر ہے کہ اس میں کہیں یہ ذکر بھی آیا ہو کہ جناب حسن عسکری کے گھر اس شکل وشباہت اور اوصاف کا کوئی بچہ پیدا ہوا جس کو مہدی موعود جان کر لوگ اس کے درپے آزار اور درپے قتل ہوئے ہوں۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ان بزرگوں کی غیبت صغریٰ کا عرصہ 70 سالوں سے زیادہ رہا اس دوران اس عہد کے کئی خلفاء وملوک سب ختم ہو گیا ان کی سلطنتیں خواب وخیال ہو گئی تو اس بات کو کون عقلمند درست و صحیح سمجھے گا کہ ان خلفاء وملوک کے عہد میں چار پانچ سال کا ایک بچہ امامت کا دعویٰ کرتا ہے اور پھر اپنے دعویٰ کے مطابق معجزہ بھی پیش کرتا ہے اور اسی وقت سے اس عصر کے ملوک وخلفاء وامراء اس کی تکذیب کر کے اس کے ڈرانے اور ایذا رسانی کے درپے ہو گیا ہوں جگہ جگہ جاسوس مقرر کر دیے ہوں اور پھر ایک دوسرے کو وصیت کر مرے ہوں کہ صدیاں گزرنے کے باوجود بھی ان خلفاء وملوک کے جانشین اس کی تلاش سے نہ تھکے ہوں نہ نچلے بیٹھے ہوں بلکہ پیش از پیش تندہی سے تلاش وتجسس میں لگے رہے ہوں ایسی صورت میں روپوش اور غیبت کبریٰ کا عذر کیسے قابل پذیرائی ہو سکتا ہے۔

اور پھر یہ وہم بھی ایسے زمانہ میں جب کہ کوئی ان عالی مقام کی ایذاء رسانی کا خواہاں نہ ہو مثلاً یہ کہ اس دور میں تو لوگ ان کے لیے آنکھیں فرش راہ کیے ہوئے تھے ان کے دیدار کے مشتاق تھے جان ومال اس محبوب مبارک کی آمد پر نثار کرنے کے لیے کمربستہ تھے اور سب کے سب یک زبان ہو کر نالہ وزاری، فریاد وغوغا میں مشغول رہ کر چلا رہے تھے کہ امام زمان ہماری فریاد سنو اور اپنی زیارت سے ہماری انکھیں ٹھنڈی کیجئے اور یہ کوئی یکہ وتنہاء فرد بھی نہ ہو بلکہ مور وملخ کی ایک جماعت اور جم غفیر ہو اس پر بھی یہ حضرت محض چند تورانی اور رومی اوباشوں کے ڈر سے اس قدر بزدلی سے کام لیتے ہوئے خود کو ظاہر نہ کریں بلکہ روز بروز پہلے سے بھی زائد چھپنے اور پوشیدہ رہنے کی کوشش کرتے ہوں تو ان امام عالی مقام کا یہ عمل درجہ امامت کے حد درجہ منافی ہوگا کیونکہ امامت کی بنیاد تو دلیری وبہادری پر استوار ہے۔

باوجود اس کے کہ جان کا خوف بالکل نہیں ہے کہ خود کی درازی عمر کا علم ہے اس لیے کہ اثنا عشریہ کے

نزدیک گزشتہ و آئندہ کا علم ان کے لیے لازمی ہے تو ان کو شیعوں کا اشتیاق ملک عراق و خراسان ہند و سند خصوصا یورپ اور بنگالہ، دکن، لکھنؤ و فیض آباد میں ان کو بالتفصیل معلوم ہوگا نیز یہ بھی معلوم ہوگا کہ ان کے مخلصوں معتقدوں کے پاس کتنی فوجیں اور آلات حرب وضرب ہیں اور انگریزوں سے کتنی زبردست ساز باز ہے یہ سب ہی ان پر منکشف ہوگا ان سب حالات کے ہوتے ہوئے بھی خود کو روپوش رکھنا اور ڈرنا کہ کہیں مجھ کو بھی مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کی طرح کوئی دھوکہ سے قتل نہ کر دے حالانکہ مارا جانا مقدر نہیں تو آخر کس معقول عذر پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

اور پھر ہر امت وملت و دین میں نیک بخت انبیاء اوصیاء گزرے ان کے دشمن بھی ہوئے اور وہ درپے آزار کا بھی رہے بلکہ حتی کہ عزت کے ساتھ ساتھ جسمانی آزار ونقصان پہنچانا بھی اور ان کو حالات تک پر قدرت پاگئے اس پر بھی میدان عمل سے بھاگنا گوارا نہیں کیا جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ[1]

اور بہت سے نبی ایسے ہیں کہ اللہ والوں نے ان کی معیت میں جہاد کیا اور اللہ کے راستے میں ان کو جو کچھ درپیش ہوا اس پر نہ وہ ست پڑے نہ کمزوری دکھائی نہ فریاد والتجا کی اور اللہ تعالی صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

حالانکہ ان حضرات کو نہ اپنی موت پر اختیار تھا اور نہ اپنی درازی عمر غلبہ وتسلط کا یقین تھا۔

سارے ہی شیعوں کا یہ دینی طرز عمل حیرت میں ڈالنے والا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ غم اور فکر کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار اور مشرکین کے ہاتھوں کوئی گزند نہ پہنچ جائے جبکہ آیت "وَاللهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ"[2] اللہ تعالی لوگوں سے آپ کی حفاظت فرمائے گا" کا مژدہ سمع مبارک نبوی تک نہیں پہنچا تھا تو ان کو

1۔سورۃ ال عمران، الایۃ: 146

2۔سورۃ المائدۃ، الایۃ: 67

قابل طعن نظر آتا ہے اور وہ اسے بزدلی کہتے ہیں مگر اس سخت خوف کو جو بزدلی کی حدوں سے بھی کئی درجہ بڑھا ہوا ہے خود اپنے خیال خام میں امام زمان کے بارے میں ثابت کرتے ہیں اور انہیں ہوش نہیں آتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کس کے متعلق کہہ رہے ہیں بات دراصل فہم و فراست کے نہیں تعصب اور اندھے پن کی ہے اور طرز فکر کی بھی اس کا نتیجہ ہے کہ وہ دوسروں پر وہ بات تھوپنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں جو ان کے اپنے بزرگواروں کی قامت پر راست آتی ہے۔

ان مسکینوں کو یہ پتہ نہیں کہ غم چیز دیگر اور خوف شے دیگر اور بزدلی ان دونوں ہی سے الگ چیز ابن مطہر حلی نے کہا ہے "الجبان لا یستحق الامامة"[1] بزدل امامت کا مستحق نہیں، اور حقیقت بھی یہی ہے اس لیے کہ اس سے مقاصد امامت حاصل نہیں ہوتے اب اگر وہ غم اور خوف کو بھی اسی زمرہ میں شامل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے سے انہیں کون روک سکتا ہے اس لیے کہ امامیہ کے نزدیک راویان اخبار نے ابی حمزہ سے اور اس نے علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہ سے روایت بیان کی ہے:

وقال أبو حمزة الثمالي أتيت باب علي بن الحسين فكرهت أن أصوت فقعدت حتى خرج فسلمت عليه ودعوت له فرد علي ثم انتهى إلى حائط فقال يا أبا حمزه ألا ترى هذا الحائط؟ فقلت بلى يا ابن رسول الله قال فإني اتكأت عليه يوما وأنا حزين وإذا رجل حسن الوجه حسن الثياب ينظر في تجاه وجهي ..... فقال وما حزنك يا علي فقلت ما أتخوف من فتنة ابن الزبير فقال لي يا علي هل رأيت أحدا سأل الله فلم يعطه؟ قلت لا قال فخاف الله فلم يكفه قلت لا فغاب عني فقيل لي يا علي بن الحسين هذا الخضر عليه السلام[2]

1۔ الحق المبين في معرفة المعصومين ، كيف يستحق الإمام مقام الإمامة؟، ص: 524، ط: دار الهدى قم المشرفة

2۔ كشف الغمة في معرفة الأئمة، للاربلي، 2/ 289، ط: دار الأضواء بيروت لبنان

ابو حمزہ کہتا ہے کہ مجھ سے علی بن حسین نے فرمایا کہ میں غمگین حالت میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا کہ ایک خوش پوشاک شخص جس نے خوشبو بھی لگا رکھی تھی عام موجود ہوا اور میرے چہرہ پر نظریں ڈال کر کہنے لگا کہ تیرے غم کی کیا وجہ ہے اور سبب ہے میں نے کہا کہ ابن زبیر کے فتنہ کا خوف تو وہ شخص ہنس پڑا اور کہنے لگا اے علی کیا تو نے ایسے آدمی کو دیکھا ہے کہ وہ اللہ تعالی سے ڈرتا ہے اور اسے اللہ تعالی نے نہ بچایا ہو میں نے کہا نہیں پھر اس نے کہا کیا تو نے کسی ایسے آدمی کو دیکھا ہے کہ اس نے اللہ تعالی سے سوال کیا ہو اور اس نے اس کا سوال پورا نہ کیا ہو میں نے کہا نہیں اب جو میں جواب دے کر دیکھتا ہوں تو وہ شخص میرے سامنے سے غائب تھا مجھے اس پر بہت تعجب ہوا کہ ناگاہ غیب سے کسی آواز دینے والے نے آواز دی جو میں نے سنی تو لیکن صاحب آواز کو نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اے علی یہ خضر تھے۔

اس خبر سے چند مفید مطلب باتیں حاصل ہوئیں اول تو یہ کہ غم اور دشمنوں کا خوف بزدلی کی نشانی نہیں ورنہ جناب سجاد امامت کے مستحق نہ ہوتے جیسا کہ حلی نے بزدل کو امامت کا مستحق نہ مان کر ان کی امامت کی نفی کرنی چاہی ہے جو از روئے اجماع غلط ہے۔

دوسرے یہ کہ ائمہ بھی بعض اوقات حضرت خضر علیہ السلام کی نصیحت ہدایت اور تنبہ کے محتاج رہے ہیں اور حضرت خضر علیہ السلام کا یہ مرتبہ ہے کہ وہ ائمہ کو نصیحت وہدایت اور تنبیہ کر سکیں جب حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق یہ بات تسلیم کر لی گئی تو پھر یہ بات از خود ثابت ہو گئی کہ ائمہ حضرت خضر علیہ السلام سے افضل نہیں ہیں نیز بالاجماع یہ بات بھی طے ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام یا تو انبیاء علیہم السلام سے باعتبار درجہ کم ہیں یا مساوی لہذا ائمہ کی افضلیت انبیاء کرام علیہم السلام پر بھی ثابت نہ ہوئی۔

اب رہا یہ قصہ کہ سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم بھی کفار کے ڈر سے غار میں مقیم ہوئے تو یہ بات اس مسئلہ میں بالکل بے جوڑ ہے اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غار میں قیام دعوی نبوت کو چھپانے کی غرض سے نہیں تھا بلکہ اپ اپنے ہجرت کے پروگرام کو کفار سے چھپانا چاہتے تھے کہ وہ اس سے آگاہ ہو کر اس پروگرام میں مزاحم نہ ہوں اور کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کر دیں اور یہ ماجرہ تین راتوں میں ختم ہو گیا کفار آپ کی تلاش سے ہار تھک کر اور کوئی آتا

پتہ نہ پا کر مایوس واپس لوٹ گئے اور آپ ﷺ مقام ہجرت مدینہ طیبہ کی جانب روانہ ہو گئے تو آپ کے غار میں تین شبانہ قیام کو ائمہ کی غیبت صغری و کبری پر قیاس کرنا سفاہت ہی کہلا سکتا ہے،[1] ہاں آپ کے اس قیام کے وقت یا سفر میں دعوت دین تبلیغ احکام اور اظہار نبوت میں سے کسی بھی چیز میں خلل پڑتا یا وہ درہم برہم ہو جاتی تو اس پر قیاس درست مان بھی لیا جاتا بلکہ یہاں تو تاریخ و سیرت کی کتابیں موجود ہیں انہیں اٹھا کر دیکھ لیا جائے کہ وہ کون سی جسمانی و روحانی ایذاء و مشقت ہے جو ان بدبخت کفار کے ہاتھوں خلاصہ کائنات اور وجہ موجودات ﷺ کو نہ پہنچی ہو مگر آپ ایک لمحہ کے لیے بھی ادائے فرض اور اعلاء کلمۃ الحق سے باز نہیں رہے۔

اور اگر اس لطیف نقطہ کو کسی کی عقل نارسہ اور فہم کج میں بار نہ مل سکے تو اس سے قطع نظر ایک اور ظاہر و بین فرق ان دونوں صورتوں میں ایسا ہے کہ معمولی عقل و شعور رکھنے والا بھی اس سے صرف نظر نہیں کر سکتا کہ اس پوشیدگی میں جو ظہور و خروج کا پیش خیمہ ہو اور اس اختفاء و پوشیدگی میں جس کا لازمی نتیجہ گمنامی ہو جیسے جانا اور ترکعون ہو زمین و اسمان کا فرق ہے چنانچہ سید الابرار ﷺ نے تو تین راتوں میں بداندیشوں کی بیخ و بُن اکھاڑ ڈالی اور خیر اندیشوں کی تعداد کہیں سے کہیں پہنچا دی لہذا یہ قیام تو مقصد کے لیے ایک تدبیر تھی کہ ارباب عزم ابتدائے عمل میں ان سے کام لیتے ہیں اور حصول مقصد کا بہترین سبب شمار کرتے ہیں یہ وہ پوشیدگی نہیں تھی جس کا فسانہ شیعہ حضرات بنام صاحب الزمان و دنیا کو سنا رہے ہیں کہ ظاہری طور پر اس سے بزدلی ہویدہ ہے اور دعویٰ دستبرداری اور تہمت امامت سے خود کو دور کرنا صاف آشکارا ہے انہوں نے اس غیبت کے دوران کسی فرقہ و طبقہ کو متاثر تابع اور مسخر کیا کس ملک و سلطنت کی بنا قائم کی۔

اگر صاحب الزمان کو تین راتوں کی بجائے تین سو سال ملتے اور غار ثور کے بجائے سردابہ سرہ من رائ اور مدینہ منورہ کے بجائے دار المومنین قم یا دار الامان کاشان اور بجائے انصار نبی کے فارس کے شیعہ جو انصار سے

---

1 ۔ وهذا ما قاله الطوسي: «أليس النبي صلى الله عليه وآله اختفى في الشعب ثلاث سنين لم يصل إليه أحد، واختفى في الغار ثلاثة أيام ولم يجز قياسا على ذلك أن يعدمه الله تعالى تلك المدة مع بقاء التكليف على الخلق الذين بعثه لطفا لهم. ومتى قالوا: إنما اختفى بعدما دعا إلى نفسه وأظهر نبوته فلما أخافوه استتر. قلنا: وكذلك الإمام لم يستتر إلا وقد أظهر آباؤه موضعه وصفته، ودلو عليه، ثم لما خاف عليه أبوه الحسن بن علي ... ». كتاب الغيبة: ص 14.

کثرت سامان میں ہزار گنا زائد ہیں اس وقت یہ خبر دار کرتے کہ میں ہر طرح سے چوکس ہو کر امت کی اصلاح احوال کے لیے ظہور کروں گا تو اہل سنت اور دیگر مسلمان ان شرائط کی فراہمی پر ان کو معذور سمجھتے کہ آخر امام کا رتبہ پیغمبر سے تو کم ہی ہوتا ہے مگر ستم ظریفی تو دیکھیے کہ ہزار سال سے زائد گزر گئے اتنی لمبی مدت ملی اور اکثر بلاد اسلامی میں مذہب کا چرچہ ہوا اور وسیع و پر فضا دیار و امصار دوستوں کے قبضے میں آئے کہ ان میں سے ہر ایک رشک جابرصا اور جابلقاء اور حیرت مینوارم ہے اور انصار و اعوان نے وہ قوت پکڑی جو کسی اور مذہب کو نہ ملی اس سب کے باوجود اپ نے ظاہر ہونے کا میلان یا اس کا خیال نہ کیا اور روز بروز اختفا اور پوشید گی میں قدم آگے ہی بڑھتا گیا تو ایسے دشوار پسند اور مشکل طلب امام کے ہاتھوں نہ جانے اور کیا کیا بھگتنا ہے کہ ابتدا ہی میں امت میں طاقت برداشت سے زیادہ تکلیفیں ڈال دیں یہ تو امامت نہ ہوئی قیامت ہوگئی انہی باتوں کو دیکھ اور ان پر غور کر کے متاخرین شیعہ کے شیخ کنز العرفان کے مصنف میں خدا نے شریف مرتضیٰ اور متقدمین کے راستہ سے ہٹ کر دوسرا راستہ اختیار کیا کہ پوشیدگی ایک حکمت پر مبنی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے علم غیب میں اپنے لیے پسند کیا۔ (1)

ظاہر ہے کہ یہ نرا دعویٰ ہی دعویٰ ہے اس طرح تو ہر چیز کے بارے میں جب اس کو خلاف لطف و مہربانی پائیں کہہ سکتے ہیں تو پھر کسی بھی چیز میں لطف ثابت نہ ہو گا مثلاً تقرر امام وغیرہ اور اسے احتمال کی وجہ سے شیعوں کا سر رشتہ کلام مختل ہو جائے گا کیونکہ ان کی دلیلوں کی بھی بنیاد اسی قول پر تو ہے کہ فلاں عمل لطف ہے اور لطف اللہ پر واجب ہے لہٰذا اس بحث کو غور و فکر سے سمجھنا چاہیے اور پھر اس مرد آزما سمندر میں ان کا ہاتھ پاؤں مارنا دیکھنا چاہیے کہ یہیں سے ان کی عقل و دانش کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2: امام کو ظاہر ہونا چاہیے پوشیدہ اور روپوش نہ ہونا چاہیے

امام کو ظاہر ہونا چاہیے پوشیدہ اور روپوش نہ ہونا چاہیے یہی اہل سنت کا مذہب ہے کہ وہ خود کو امامت کی شرط قرار دیتے ہیں مگر شیعہ اس شرط کو نہیں مانتے اور یوں وہ عقل و نفس ہر دو کی خلاف ورزی کے مرتکب

---

1 ۔ ويقول الشيخ مقداد السيوري: " كان الاختفاء لحكمة استأثر بها الله تعالى في علم الغيب عنده" (حياة الإمام محمد المهدي عليه السلام، للباقر شريف القرشي الغيبة من أسرار الله، 1 / 163، ط: المطبعة أمير، 1996م.)

ہوتے ہیں عقل کے خلاف ورزی تو اس طرح ہوتی ہے کہ امام کے تقرر کی تو غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ حدود و قوانین اور سزاؤں کا اجرا کرے فوجوں اور لشکروں کو تیار کرے اسلام کی قوت کی حفاظت اور نظم وضبط برقرار رکھے اسلام وشریعت کا بول بالا کرے اوامر ونواہی کا نفاذ کرے برائیوں اور گناہوں پر لوگوں کو سزائیں دے منتظمین اور افسروں کے تقرروں میں لائے اور یہ امور بغیر اس کے کہ امام عالم ظہور میں آئے فساد پیشہ لوگوں پر اس کا رعب ودبدبہ چھا جائے دلوں پر اس کے غلبہ و قار کا سکہ بیٹھ جائے اور اس کی حکومت وسلطنت کا اقبال قائم ہو جائے میسر نہیں آسکتے اگر یہ امور حاصل نہ ہو تو امام کا ہونا نہ ہونا برابر ہے بلکہ بیکار ہے اور کارخانہ قدرت میں بے کار شے کا وجود محال ہے امام وخلیفہ کا ظاہر ہونا عقل کے نزدیک اتنا ظاہر وباہر ہے کہ اہل مذہب اسلام ہی نہیں بے دین ومذہب مجوسی بھی اسے جانتے ہیں چنانچہ فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں انہی کا یہ قول نقل کیا ہے:

نزیبد بہر پہلوی تاج وتخت بباید یکے شاہ فرخندہ بخت

کہ باشد بروفرہ ایزدی بتابد زگفتار او بخردی[1]

ہر پہلوی کو تاج وتخت زیب نہیں دیتا اس کے لیے تو ایک مبارک بخت کا بادشاہ چاہیے کہ جس سے شان ایزدی ہویدا ہو، جس کی گفتگو میں عقل کی روشنی جھلکتی ہو۔

اور نقل کی خلاف ورزی یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَعَدَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا[2]

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیے ان سے اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ ان کو زمین

1۔ شاہنامہ از حکیم ابوالقاسم فردوسی، 2/315، ط: بروخیم (Beroukhim Edition)

ترجمہ: تاج وتخت ہر پہلوان (یا طاقتور شخص) کو زیب نہیں دیتا، (اس کے لیے) ایک ایسا بادشاہ چاہیے جو نیک بخت اور بلند قسمت والا ہو، جس پر اللہ (ایزد) کا سایہ اور تائید ہو، اور اس کی گفتگو سے دانائی اور الٰہی نور (فرِ ایزدی) جھلکتا ہو۔

2۔ سورۃ النور، الآیۃ: 55

میں اس طرح خلیفہ بنانے کا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا اور ان کے اپنے پسند فرمودہ دین پر تمکن عطا فرمائے گا اور ان کے خوف کو دور کر کے اس خوف کو امن سے بدل دے گا۔

نیز فرمایا:

الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ[1]

یہ وہ لوگ ہیں کہ ہم ان کو زمین میں تمکن وقدرت واختیار عطا کریں تو یہ نظم نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں بھلے کاموں کا حکم کریں برے کاموں سے روکیں۔

لہذا معلوم ہوا کہ خلیفہ بنانے کی یہ اغراض ومقاصد ہیں ان کے ذریعہ پسندیدہ دین کا استحکام واشاعت اہل خیر کی امن وصلاح، نماز یا جمعہ جماعت عیدین کا قیام وانصرام، زکوۃ صدقات کی وصولی اور پھر مستحقین میں اس کی تقسیم اور امر بالمعروف نہی عن المنکر چنانچہ کتاب الجہاد کتاب الاحتساب، کتاب الحدود والقصاص والجنایات انہی دو کلموں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی تشریح وتفصیل ہیں امور مذکورہ کے علاوہ بھی خلافت کے مقاصد ہو سکتے ہیں جیسا کہ ایک جگہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللهِ"[2]

ہمارے لیے ایک بادشاہ بھیجے کہ ہم اس کے زیر علم اللہ کے راستے میں قتال کریں۔

تو معلوم ہوا کہ بادشاہ وخلیفہ کے تقرر کی ایک غرض جہاد فی سبیل اللہ بھی ہے پھر ارشاد ہوا:

"وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا"[3]

ہم نے ان کو امام بنایا کہ وہ ہدایت کرتے تھے ہمارے حکم کی جب صبر کیا انہوں نے۔

1۔ سورۃ الحج ،الآیۃ : 41

2۔ سورۃ البقرۃ،الآیۃ : 246

3۔ سورۃ السجدۃ،الآیۃ : 24

تو معلوم ہوا لوگوں کو ہدایت کرنا اور ان کو ہدایت کرنے میں تکالیف پیش آئیں اس پر صبر کرنا بھی امامت کے لوازمات میں سے ہے، قاعدہ عقلیہ یہ ہے کہ جب کسی چیز سے وہ کام نہ لیا جائے جس کے لیے وہ پیدا کی گئی یا اس سے کوئی مقصد حاصل نہ ہو تو وہ بے کار ہو جاتی ہے نیز اہل عقل کے نزدیک یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ جب کوئی چیز موجود ہو تو وہ اپنے تمام لوازمات کے ساتھ موجود ہوتی ہے ورنہ وہ وجود و عدم برابر ہوتے ہیں شیعہ عقیدہ عقل و نقل کے خلاف ہونے کے ساتھ عترت کے بھی مخالف ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ سے روایت صحیح بطریق تواتر نہج البلاغہ میں یہ روایت مذکور ہے:

إنه لا بد للناس من أمير بر أو فاجر يعمل في إمرته المؤمن. ويستمتع فيها الكافر ويبلغ الله فيها الأجل ويجمع به الفيء ويقاتل به العدو وتأمن به السبل ويؤخذ به للضعيف من القوي حتى يستريح به بر ويستراح من فاجر[1]

آپ نے فرمایا لوگوں کے لیے ایک امیر ضروری ہے وہ نیک ہو یا بد کہ اس کے زیر فرمان مومن کام کرے اور کافر فائدہ اٹھائے اور اس کی حکومت میں اپنی مدت پوری کرے اس کی امارت میں راستے محفوظ و مامون ہوں طاقتور سے کمزور کا حق دلائے نیک عمل سے رہیں اور بدوں سے ان کی حفاظت ہو۔

اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے اس کلام کو تقیہ پر بھی محمول نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ نہج البلاغہ میں اس کی تصریح ہے کہ آپ نے خوارج کی یہ بات "لا إمرة"[2] کوئی حکومت نہیں ہے، سن کر یہ کلام فرمایا تھا اور خوارج کے مقابلہ میں تقیہ کا کیا سوال اور کیا جواز؟

مسئلہ نمبر 3: امام و خلیفہ کا علم و اجتہاد میں خطا سے پاک ہونا ضروری ہے

امام و خلیفہ کا علم و اجتہاد میں خطا سے پاک ہونا ضروری نہیں اور نہ گناہ سے معصوم ہونا امامت کی شرط ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ تقرر کے وقت کبیرہ گناہوں میں مبتلا نہ ہو اور صغیرہ پر مصر نہ ہو کیونکہ یہ عدالت کے

1۔ نہج البلاغة، 1/ 91، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

2۔ المرجع السابق

خلاف ہے اور یہی اہل حق کا مذہب ہے۔

مگر شیعہ خصوصا امامیہ اور اسماعیلیہ کہتے ہیں کہ علم میں غلطی سے پاک ہونا اور عمل میں گناہ سے ان کا صدور اس سے ممتنع ہو ان کے نزدیک انبیاء کی شرح امام بھی ہوتا ہے،[1] ان کا یہ عقیدہ بھی کتاب وعترت کے خلاف ہے کتاب اللہ کے تو اس طرح کے اللہ تعالی نے فرمایا:

"إِنَّ اللهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا"[2]

بے شک اللہ تعالی نے طالوت کو تمہارا بادشاہ بنا کر بھیجا۔

لہذا طالوت واجب الاطاعت امام ہوئے کیونکہ وہ اللہ تعالی کے مقرر کردہ تھے حالانکہ یہ بالاجماع معصوم نہیں تھے بلکہ ان کا جو معاملہ حضرت داؤد علیہ السلام سے ہوا اس سے تو ان کی عدالت پر بھی حرف آتا ہے عصمت تو بعد کی بات ہے پھر دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے:

"إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً"[3]

میں زمین میں اپنا خلیفہ مقرر کر رہا ہوں۔

تو حضرت آدم علیہ السلام نبوت سے پیشتر ہی خلیفۃ اللہ فی الارض ہو گئے اور بالاجماع ان سے لغزش ہوئی:

"وَعَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى"[4] پس آدم نے نافرمانی کی اپنے رب کی وہ بہک گئے۔

اور یہ قصہ خلافت وامامت کے زمانہ کا ہے نبوت کے وقت کا نہیں اس کی دلیل اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے:

1۔قال ابن المطهر الحلي: «ذهبت الإمامية إلى أن الأئمة كالأنبياء في وجوب عصمتهم عن جميع القبائح والفواحش من الصغر إلى الموت عمدا وسهوا، لأنهم حفظة الشرع والقوامون به حالهم كحال النبي ...». نهج الحق: ص 164. وقال الميلاني: «إن كل الأدلة تدل على أنهم [أي الأئمة] معصومون من الخطأ والنسيان». العصمة: ص 38.

2۔سورة البقرة، الاية : 247

3۔سورة البقرة، الاية : 30

4۔سورة طه، الاية : 121

ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَى(1)

پس اس کے رب نے اس کو چنا اس کی توبہ قبول کی اور ان کو ہدایت دی۔

اور عترت کی مخالفت اس طرح کے ایک تو جناب امیر رضی اللہ عنہ کا وہ قول جو بحوالہ نہج البلاغہ ابھی مذکور ہوا دوسرے کلینی کی کافی میں روایت صحیح یہ مذکور ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ اپنے دوستوں سے فرمارہے تھے:

فلا تكفوا عن مقالة بحق أو مشورة بعدل، فإني لست في نفسي بفوق أن أخطئ(2)

تم حق بات کہنے سے اور منصفانہ مشورہ دینے سے بعض نہ رہو کیونکہ میں مطمئن نہیں ہوں کہ غلطی مجھ سے سرزد نہیں ہوسکتی۔

یہ پوری روایت باب مطاعن میں ان شاء اللہ بیان کی جائے گی۔

یہاں شیعوں کے لیے اس بات کی گنجائش نہیں کہ وہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان "أنتم أعلم بأمر دنياكم"(3) تم اپنی دنیاوی معاملات کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو پر قیاس کر کے حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے کلام کو دنیاوی مشورہ پر محمول کریں اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جہاں دو جملے ارشاد فرمائے " عن مقالة بحق أو مشورة بعدل" اس میں آخری جملہ کو دنیاوی مشورہ پر محمول کرلیں تو پہلے جملہ کو کہاں لے جائیں گے پھر امامیہ میں سے صاحب الفصول نے ابو مخنف سے یوں روایت کی ہے کہ:

أنه قال: كان الحسين يبدي الكراهة من صلح أخيه الحسن مع معاوية ويقول: لو جز أنفي كان أحب إلي مما فعله أخي.(4)

1۔ سورة طه، الآية: 122

2۔ نهج البلاغة، 2/ 201، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

3۔ صحيح مسلم، باب وجوب امتثال ما قاله شرعا۔الخ، 4/ 1836، رقم: 2363، ط: دار إحياء التراث العربي بيروت

4۔ كشف الغمة عن معرفة الأئمة، للأربلي: 2/ 35.

وہ کہتا ہے کہ حضرت حسین بن علی حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے صلح پر ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے اور کہتے تھے اگر میری ناک کٹ جاتی تو مجھے یہ پسند تھا بمقابلہ اس کے جو میرے بھائی نے کیا۔

اور جب ایک معصوم دوسرے معصوم کی کسی معاملہ میں گرفت کرے تو لامحالہ ان دونوں میں سے ایک کی خطا ضروری ہوگی کیونکہ دو مختلف چیزوں یا باتوں کا جمع کرنا محال و ناممکن ہے، اور جناب سجاد کے اس صحیفے میں جو امامیہ کے نزدیک بطریق صحیح ثابت ہے[1] اس طرح مروی ہے:

وقد ملك الشيطان عناني في سوء الظن وضعف اليقين، وإني أشكو سوء محاورته لي وطاعة نفسي له[2]

بے شک بدگمانی اور یقین کی کمزوری میں میری باغ شیطان کے ہاتھ میں آگئی اور میں فریاد کرتا ہوں اس کی ہمسائے گی سے اور اس بات سے کہ میرے نفس نے اس کی پیروی کرلی۔

اور ظاہر ہے کہ اس کلام کو سچ مانے یا جھوٹ عصمت کے خلاف ضرور ہے اب امامیہ اور اسماعیلیہ کے پاس کتاب و عترت سے تو کوئی دلیل ہی نہیں ان کے استدلال کا مدار شبہات عقلیہ پر رہ جاتا ہے لہذا ہم مجبوراً اس پر بھی خامہ فرسائی کرتے ہیں اور ان میں جہاں جہاں غلط فہمی ہوئی ہے اس کو بھی واشگاف کرتے ہیں۔

شبہ نمبر1: اگر امام معصوم نہ ہو تو تسلسل لازم آتا ہے

اگر امام معصوم نہ ہو تو تسلسل لازم آتا ہے اس لیے کہ امت کے لیے جو امام کی ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ محض اس لیے کہ امت سے علم و عمل میں غلطی سرزد ہونا جائز ہے پس اگر امام سے بھی خطا غلطی کا صدور مان لیا جائے تو اس کی تصحیح کے لیے پھر ایک اور امام کی ضرورت ہوگی اور احتیاج ہوگی اور یہ سلسلہ یوں ہی دراز

1۔ قال عنها الطهراني: «الصحيفة السجادية الأولى المنتهى سندها إلى الإمام زين العابدين المعبر عنها (أخت القرآن) و (إنجيل أهل البيت) و (زبور آل محمد) ... وهي من المتواترات عند الأصحاب ...». الذريعة: 15/ 18.

2۔ الصحيفة السجادية الجامعة لأدعية الإمام علي بن الحسين عليهما السلام، ص: 182، ط: مؤسسة الأنصاريان للطباعة والنشر شارع الشهداء قم إيران

ہوتا رہے گا کہیں بھی ختم نہیں ہوگا یہی تسلسل ہے جو محال ہے۔[1]

ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ امت سے چونکہ خطا سرزد ہو سکتی ہے اس لیے اس کی درستگی کے لیے امام کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ امام کے تقرر کے جو فوائد واغراض ہیں وہ ہم اوپر بیان کرائے ہیں یعنی احکام کا نافذ کرنا فساد و دہشت گردی تقریب اور بد نظمی کو دور کرنا اور سرزمین اسلام کی حفاظت کرنا وغیرہ وغیرہ اور ان اغراض کے حصول اور ان امور کی انجام دہی کے لیے عصمت ضروری نہیں اجتہاد و عدل کافی ہے، اور جب اجتہاد میں غلطی ہو جانے سے امام پر اور ان کے متبعین پر کوئی مواخذہ نہیں تو خطا کا جواز و عدم دونوں برابر ہوئے۔

اور اگر اس شعبہ کو تسلیم بھی کر لیں تو ہم اس سلسلہ میں تسلسل کو نہیں مانتے اس لیے کہ عصمت کا سلسلہ بالاتفاق نبی پر ختم ہو جاتا ہے ان کے بعد کوئی معصوم نہیں اور اگر بالفرض اس کا اجراء تسلیم کر لیں تب بھی ان کا یہ شبہ اس مجتہد جامع شروط سے ٹوٹ جاتا ہے جو امامیہ کے نزدیک امام روپوش کے وقت ان کا نائب مقرر ہوتا ہے،[2] اس لیے کہ اس پر سب کا اجماع ہے کہ یہ نائب غلطی کر سکتا ہے اب یہاں ان کا جو جواب ہوگا امام کے بارے میں وہی ہمارا جواب ہے۔

شبہ نمبر 2: امام شریعت کا نگہبان ہوتا ہے

امام شریعت کا نگہبان ہوتا ہے، اگر اس سے غلطی کا صدور جائز مان لیں تو وہ شریعت کی حفاظت کس

1۔ قال نصير الدين الطوسي: «وامتناع التسلسل يوجب عصمته، ولأنه حافظ للشرع، لوجوب الإنكار عليه لو أقدم على المعصية فيضاد أمر الطاعة، ويفوت الغرض من نصبه، ولانحطاط درجته عن أقل العوام». كشف المراد في شرح صحيح الاعتقاد: ص 264.

2۔ ويسمى عند الإمامية المرجع الديني أو آية الله أو الحجة، وهو بمثابة الحكومة أو الحاكم، فقد جاء: «اتقوا الحكومة، فإن الحكومة إنما هي للإمام العالم بالقضاء العادل في المسلمين أو للنبي أو وصي نبي». الكافي: 7/ 406؛ من لا يحضره الفقيه: 3/ 5. قال الشوشتري: «فإن المأذون من قبلهما [النبي أو الوصي] ينطبق عليه عنوان الوصي ولو عناية كوكيل الوصي، فيكون المجتهد ممن عهد إليه هذا المنصب، وظاهر الرواية المتقدمة نفي الولاية العرضية عن غير النبي والإمام عليهما السلام لا نفي الولاية الطولية الحاصلة بالأذن». منتهى الدراية: 8/ 409.

طرح کرے گا،(1) ہم کہتے ہیں کہ ان کا یہ مفروضہ بھی قابل تسلیم نہیں کہ امام نگہبان شریعت ہے وہ صرف احکام شرع کی ترویج دینے اور اوامر اور نواہی کا نفاذ کرنے والا ہے شریعت کی نگہبانی علماء اسلام کا کام ہے اور انہی سے متعلق ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ(2)

اور اہل اللہ اور اہل علم کے ان سے کتاب اللہ کی حفاظت کی توقع کی گئی تھی اور وہی اس پر گواہ تھے۔

نیز دوسری جگہ ارشاد ہے:

كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ(3)

تم اللہ والے بن جاؤ بسبب اس کے کہ تم کتاب اللہ کی تعلیم دیا کرتے اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں لگے رہتے تھے۔

اور جب فترت کے زمانہ میں (کہ اماموں کا سلسلہ رک جانے سے عبارت ہے) امامیہ کے نزدیک بھی شریعت کی حفاظت علماء کے ذمہ ہے تو اسی طرح حضور روپوشی امام کے وقت بھی شریعت کی حفاظت علماء کے ذریعہ ہوگی،(4) چنانچہ ابن مطہر حلی نے کشف الکرامہ میں لکھا ہے:

ان حصل بين الامام المتصل بالنبي المتصل بالله فتره من الزمان الى وصى

---

1 ـ قال المجلسي: «فلو لم يجعل لهم قيما حافظا لما جاء به الرسول، فسدوا على نحو ما بينّا، وغُيرت الشرائع والسنن والأحكام والإيمان، وكان ذلك فساد الخلق أجمعين». بحار الأنوار: 23/ 19.

2 ـ سورة المائدة، الآية: 44

3 ـ سورة آل عمران، الآية: 79

4 ـ قال القرطبي: «الربانيون وأحدهم رباني منسوب إلى الرب والرباني الذي يربي الناس بصغار العلم قبل كباره وكأنه يقتدي بالرب سبحانه في تيسير الأمور». الجامع لأحكام القرآن: 4/ 122. وقال المجلسي: «الربانيون الذين علت درجتهم في العلم والأحبار العلماء الكبار {بما استحفظوا} أي بما استودعوا من كتاب الله وبما أمروا بحفظ ذلك والقيام به وترك تضييعه». بحار الأنوار: 13/ 202.

آخر حفظ الله تلك الوصية برجال من المؤمنين [1]

اگر نبی سے متصل امام اور اللہ سے واصل نبی کے درمیان اور دوسرے وصی کے درمیان زمانہ فترت اور خلا ہو تو اللہ تعالی اس کی وصیت کی حفاظت مومنین کے ذریعہ کراتا ہے۔

اور اگر ان کا شبہ تھوڑی دیر کو مان بھی لیں تو امام شریعت کی حفاظت میں نگہبانی کتاب اللہ سنت رسول اللہ اور اجماع امت کے ذریعے سے کرتا ہے بذات خود نہیں ان تینوں ذرائع حفاظت شریعت میں خطاء و غلطی جائز و درست نہیں ان کے علاوہ جو کچھ ہے وہ زمرہ اجتہاد میں شامل ہے زمرہ شریعت میں نہیں اس لیے اس کی نگہبانی کی بھی امام کے لیے چنداں ضرورت نہیں۔

ان شبہات کی صحت کی صورت میں یہ اعتراض پیش کیا جاسکتا ہے کہ اگر امام کے لیے معصوم ہونا اس لیے ضروری ہوتا کہ وہ غلطی اور خطا سے بچاتا رہے تو پھر یہ چاہیے تھا کہ ہر ملک بلکہ ہر شہر میں ایسا ایک شخص موجود ہوتا کیوں کہ صرف ایک آدمی اکیلا معصوم پوری دنیا کو غلطی و خطا سے نہیں بچا سکتا اس لیے کہ مکلفین تو شرق سے غرب تک پھیلے ہوئے ہیں اور پھر ہر ایک اپنی حاجتوں اور ضروریات میں گھرا ہوا ہے ہر ایک کو اتنی فرصت کہاں کہ اپنی غلطیاں امام سے درست کرائے ان کی خدمت میں حاضر ہو اور نا با اعتبار حقیقت ایسا ہونا ممکن ہے بلکہ عادتا محال ہے اور اگر امام سے دوری کے سبب امام ہر شہر ہر قریہ میں اپنا نائب مقرر کرے تو اس میں عصمت نہ ہونے کی وجہ سے غلطی جائز ہوگی اور امام سے دوری کے سبب امام اس کی غلطی پر مطلع بھی نہ ہو سکے گا خصوصا روزانہ کے نت نئے واقعات اور گوناگوں مسائل اور نہ رکنے والے حوادث پیش آنے کے سبب تو ایسا ممکن نہیں کہ غلطی سے بچ بچ کر چلتا رہے خاص طور پر غیبت کبری کے زمانہ میں تو اصلاح احوال کی کوئی صورت ممکن ہی نہیں پھر امام اگر غائب کی غلطی پر مطلع بھی ہو جائے تو بالمشافہ اس کو ٹوکنے اور اصلاح کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں بجز اس کے کہ یا قاصد کے ذریعے مطلع کرے یا بذریعہ مراسلات اور قاصد چونکہ معصوم

---

1 ـ لم اجد كشف الكرامة و الحلي هو جمال الدين أبي منصور الحسن بن يوسف بن علي الحلي (ت 726).
الذريعة: 18/ 73.

نہیں ہو گا تو وہ خطا و غلطی سے محفوظ نہ رہا لہذا غیر معتبر ٹھہرا اور مراسلات و تحریرات میں جو دھوکے بازی اور جعل سازی چل رہی ہے اس کے پیش نظر اس میں بھی غلطی کا احتمال موجود ہو گا۔

پھر اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اگر نائب کو تحریر کا مطلب سمجھنے یا قاصد کی گفتگو کے ذریعہ امام کا مقصد سمجھنے میں کوئی دشواری اگر پیش آگئی تو وہ اپنی رائے اور قیاس کے اصول کو کام میں لائے بغیر اس کو حل نہ کر سکے گا اور ان سب صورتوں میں شبہات خطا کی گنجائش ہے لہذا خطا سے حفاظت کی اس کے بغیر کوئی صورت ہی نہیں کہ ہر ہر ملک اور ہر ہر شہر میں ایک معصوم مقرر ہو۔

مسئلہ نمبر 4: امام کا تقرر خدا پر واجب ہے

یہ ضروری نہیں کہ امام کے تقرر کے وقت خدا کا صریح حکم بھی آئے کیونکہ اس تقرری کی ذمہ داری تو مکلفین پر ہے وہ ضرورت کے وقت حالات کے تحت اپنی مصلحت اور تقاضائے زمانہ کے موافق اپنے میں سے ایک رئیس چن لیں اور چونکہ یہ ان کا اپنا انتخاب ہو گا اس لیے اس کی لاج رکھیں گے اور پاسداری کرتے ہوئے اس رئیس کی اطاعت میں کوئی کوتاہی نہ کریں گے اور اگر اس کا تقرر خدا کی طرف سے کسی نص کے ذریعہ ہو تو دیگر تمام احکام شرعیہ کی طرح اس کے متعین و مقرر کرنے میں غفلت اور سستی پیش اۓ گی اور خلیفہ و امام کے مقرر کرنے سے جو غرض تھی وہ ہاتھ نہ آئے گی اگر مکلفین ایسے ہی بھلے مانس ہوتے کہ ان کے لیے صرف فرمان الٰہی کافی ہوتا تو قران کی اطاعت کرنے اور اس پر عمل کرنے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے فرامین کی کون سی کمی باقی رکھی یا نبی کریم ﷺ نے کون سی کسر اٹھا رکھی اور ان مکلفین نے ان کے ساتھ کیا کیا۔

امام و خلیفہ کا تقرر سب اسی لیے ہوتا ہے کہ مکلفین کی نیند توڑی جائے احکام شریعت میں ان کی سستی و قاہلی کا فور کی جائے اور جن کا بھوت باتوں سے نہ اترتا ہو ان کو لاتوں کی ماردی جائے اور لوگوں کو چاروں ناچار طریقہ شریعت سے ادھر ادھر نہ کیا جائے ان کو باندھ کر رکھا جائے وہ اپنے کو مادر پدر آزاد نہ سمجھیں اور اگر خود امام و خلیفہ بھی دیگر شرعی احکام کی طرح کی ایک کڑی ہوتا تو وہ بھی دیگر احکام شرح کی طرح غفلت و سستی کا شکار ہوتا لہذا مکلفین کے حق میں یہی اصلح ہے کہ انتخاب امیر کی ذمہ داری انہی کی عقلوں پر ڈالی جائے۔

مگر امامیہ کہتے ہیں کہ امام کا تقرر خدا پر واجب ہے،[1] لہذا خدا کی طرف سے تقرر نامہ آنا چاہیے حالانکہ ان کا یہ عقیدہ بھی عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے عقل کے خلاف ہونا تو سطور بالا سے معلوم ہو گیا نقل کے خلاف اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جا بجا انسانوں کے بعض فرقوں مثلا بنی اسرائیل کے متعلق فرمایا:

"وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً"[2] ہم نے ان کو امام بنایا۔

"وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ"[3]

ہم چاہتے ہیں کہ ان کو امام بنائیں اور وارث کریں۔

اور یہ بھی فرمایا:

"وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا وَآتَاكُمْ مَا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ"[4]

اور اس نے تمہیں بادشاہ بنایا اور وہ کچھ دیا جو عالمین میں سے کسی کو نہیں دیا تھا۔

اور یہ بھی ارشاد ہے:

"وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ"[5]

وہی وہ ذات ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا۔

اور ان مختلف فرقوں کے ملوک اماموں اور خلفاء میں سے کسی ایک نام کی بھی تصریح نہیں فرمائی بلکہ

1۔قال ابن المطهر الحلي: «يجب أن يكون الإمام منصوصا عليه من قبل الله تعالى ليعلم استحالة ذلك منه، وذلك هو المعصوم ولا يحسن من الحكيم توليته غير المعصوم». الألفين: ص 83، وقال الطبرسي: «إن الإمام لا بد أن يكون معصوما منصوصا عليه». أعلام الورى: ص 206.

2۔سورة الانبياء، الاية: 73

3۔سورة القصص، الاية: 5

4۔سورة المائدة، الاية: 20

5۔سورة الانعام، الاية: 165

ہوتا یہ رہا کہ ان فرقوں کے ارباب اختیار خود ہی اپنے عقل و تدبر اور سمجھ بوجھ سے کسی ایک فرد کو زمام ریاست سپرد کرتے یا وہ خود اپنی شوکت و غلبہ سے سب پر مسلط ہو جاتا اور سب اس کے حلقہ اطاعت میں آ جاتے۔

لہذا معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے امام و خلیفہ بنانے کے یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے ان لوگوں کے دلوں میں جن کی کہی ہوئی بات وقعت اور اعتبار رکھتی تھی یہ بات جاگزیں کر دیتا تھا کہ فلاں شخص کو رئیس بناؤ تاکہ اللہ تعالیٰ تائید آسمانی اور شوکت غیبی سے اس کو مخلوق پر تسلط عطا فرمائے، اب اگر وہ ریاست و سیادت کا اہل ہے تو امام عادل ہے ورنہ امام جابر۔

مسئلہ نمبر 5: امام کو تمام اہل زمانہ سے افضل ہونا چاہیے

امام کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک تمام اہل زمانہ سے افضل ہو اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کو اپنے حکم سے خلیفہ بنایا جبکہ پیغمبروں میں حضرت داؤد اور حضرت شموئیل علیہم السلام موجود تھے جو بلا ریب و شک ان سے افضل تھے اور عند اللہ برتر تھے ہاں اگر امیر و خلیفہ کا چناؤ اہل حل و عقد کی بیعت سے ہو تو اس کا اہتمام ہونا چاہیے کہ حکمرانی کے اوصاف سرداری کے شرائط میں جو بلند و افضل ہو اس کو منتخب کریں دوسرے امور میں افضل و برتر ہونے کا لحاظ نہ کریں اس لیے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ذاتی طور پر ایک شخص ولی کامل عالم متبحر اور نجیب الطرفین ہو مگر وہ اپنے اکیلے گھر کا بھی انتظام نہ چلا سکتا ہو تو وہ اپنے ملک کی سرداری کے فرائض کیسے پورے کر سکے گا لہذا یہاں دوسری ہی قسم کی صلاحیت و فضیلت ہونی چاہیے۔

اور پھر یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ یہ امامیہ نرے بدھو بھی نہیں ہیں کہ یوں ہی الل ٹپ عقیدہ گھڑ لیتے ہوں یہ بڑے کائیاں اور منصوبہ باز لوگ ہیں یہ کوشش تو یہی کرتے ہیں کہ زخم دوسرے ہی کے لگے مگر بیچارے مکافات عمل کے قانون کی زد میں ہاتھ پاؤں اپنے ہی تڑوا بیٹھتے ہیں اس عقیدہ میں بھی یہ تینوں شرائط (معصوم ہونا منصوص ہونا اور افضل ہونا) بڑی چالاکی اور بدنیتی سے بڑھائے ہیں کہ عقیدہ کے پردہ میں ہی خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے خلافت کا انکار کر دیں اور اہل سنت کو علیحدہ جواب نہ دینا پڑے اس لیے کہ اہل سنت کے نزدیک خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم اور افضلیت میں بھی بحث کا میدان خاصہ وسیع ہے لہذا ہم بھی جہاں ان شروط کو نظر انداز کرتے ہیں اپنی مرضی کے میدان یعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت کے اس بات کے موقع پر ان

کے یہ ہتھیار بھی پرکھیں گے اور ان شرائط کے ان شاء اللہ پرخچے اڑائیں گے لیکن امامیہ نے اپنی کتابوں میں سارے مسائل کی اصل و بنیاد انہی شرائط کو ٹھہرایا ہے اور اس میں بڑی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں اس لیے مجبورا مقام کی مناسبت سے ان شرائط کی جدا جدا نفی بیان کر دی گئی لیکن تسلی بخش کلام کے لیے اصل محل و مقام تک پہنچنے تک کا انتظار کر لیا جائے۔

مسئلہ نمبر 6: خلیفہ بلا فصل حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے نائب بلا فصل حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور یہی اہل سنت کا مذہب ہے۔

مگر شیعہ اس عقیدہ کے سب سے جدا انداز میں مخالف ہیں شیعوں کے تمام فرقوں میں قدر مشترک اور نقطہ خیال جس میں سب متفق ہوں یہ ہے کہ امام بلا فصل بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حاکم بد بن غاصب خلافت تھے،[1] کہ حیلہ حوالہ اور اپنے اثرات سے کام لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منصب امامت سے محروم کر کے خود اس پر فائز ہوئے اس خیال پر دنیا جہان کے سارے ہی شیعہ متفق ہیں ان میں اختلاف تو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے بعد پر ہے کہ ان کے بعد امام برحق کون ہے۔

اہل سنت کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت سے امام ہیں جب ان کے ہاتھ پر بیعت ہو چکی اس سے پیشتر آپ امام نہیں تھے ہاں امت کا استحقاق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہی سے تھا اور اسی استحقاق سے کسی نے بھی کبھی انکار نہیں کیا خود حضرات کی خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم بھی اس استحقاق کو مانتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ امام ہوئے اس کے بعد دوسرے ائمہ بھی استحقاق تو رکھتے تھے لیکن چونکہ بعض نے تو اہل حل و عقد سے بیعت نہیں کی اور بعض تزکیہ بات اور ارشاد علم میں مشہور رہ کر امامت کے دعوی دار نہ بنے اس لیے وہ امام نہ ہوئے۔

---

1 ـ قال ابن المطهر الحلي: «ذهبت الإمامية كافة إلى أن الإمام بعد رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم هو علي بن أبي طالب عليه السلام ، وقالت السنة إنه أبو بكر بن أبي قحافة ثم عمر بن الخطاب ثم عثمان بن عفان ثم علي بن أبي طالب، وخالفوا المعقول والنقول ... »!!. نهج الحق: ص ١٦٦ .

لفظ امام کے معانی کی وضاحت

نیز یہ بھی واضح رہے کہ اہل سنت کے نزدیک امام پیشوائے دین کو بھی کہتے ہیں اور اس معنی کے لحاظ سے امام اعظم ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جو فقہ میں پیشوا تھے امام غزالی امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کو جو عقائد وکلام میں پیشوا تھے اور امام نافع وعاصم رحمۃ اللہ علیہ جو فن قراءت میں پیشوا تھے امام کہتے ہیں اور ائمہ اہل بیت اطہار ان تمام علوم وفنون میں پیشوا تھے خصوصا ہدایت باطن اور ارشاد طریقت میں کہ ان میں ان کو درجہ امتیاز حاصل تھا لہذا اسی نقطہ نظر سے اہل سنت بھی عام طور سے ان کے لیے امام کالقب استعمال کرتے ہیں امام بمعنی خلیفہ کے نہیں کیونکہ خلافت کے لیے ان کے نزدیک زمین پر اقتدار استحقاکے امامت غلبہ وشوکت اور حکم کا نفاذ ضروری ہے اسی وجہ سے انہوں نے خلافت کو صرف پانچ حضرات پر منحصر ومحدود رکھا ہے۔

اور کبھی بادشاہت وریاست پر بھی لفظ امامت استعمال کرتے ہیں گو بادشاہ خوش سیرت نہ ہو لیکن بہت سے دینی امور میں وہ پیشوا ہوتا ہے مثلا جہاد میں غنیمتوں کی تقسیم جمعہ وعیدین کے قائم کرنے میں لہذا ان تینوں معنی کو جدا جدا ذہن نشین کرلینا چاہیے اگرچہ ان سب معنی میں نقطہ مشترک ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ امور دین میں جس کی پیروی اور اقتداء کی جائے وہ امام ہے یہاں تک کہ امیر الحج کہ وہ بھی ایک لحاظ سے مقتدی اور امام ہے اور اسی لیے تو پیشوا نماز کو امام کہتے ہیں۔

لفظ خلیفہ کا اطلاق کس پر ہو گا

اور جب دین کے تمام ظاہری وباطنی امور میں کسی کو پیشوائی نصیب ہو تو وہ خلافت حقہ کا مستحق ہے یہ خلافت صرف پانچ حضرات میں منحصر ہے اور اہل سنت کا یہ خیال محض ہوائی نہیں ارشادات قرآن پر مبنی ہے کہ اس میں ان پیشواؤں کو جو بظاہر اقتدار نہیں رکھتے تھے ائمہ کہا ہے، مثلا:

"وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا"[1] ہم نے ان کو امام بنایا کہ وہ ہمارے احکام کی تبلیغ کرتے تھے۔

اور ہر شخص کو یہ دعا سکھائی:

1۔ سورۃ الانبیاء، الآیۃ: 73

"وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا"(1) اور ہمیں پرہیز گاروں کا امام بنا۔

اور خلافت میں ہر جگہ زمین کی قید لگائی مثلاً فرمایا:

"لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ"(2)

"وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ"(3)

"وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ"(4)

اسی طرح کی اور آیات۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کی وجہ

اور اس کی وجہ کے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح کیوں کی جبکہ اس وقت آپ کی ذات عالی صفات استحقاق امامت میں مخصوص و ممتاز تھی اور فریق ثانی کی بے استحقاق کی واضح اور روشن تھی یہ ہے کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ واقف تھے اور جانتے تھے کہ خلافت کا زمانہ ختم ہوا کھٹک نے بادشاہوں کا وقت آن پہنچا اور ظلم و ستم گری کا دور دورہ شروع ہوا، اگر میں بھی ریاست کا مدعی بنا رہا اس تقدیر میں چونکہ ہے نہیں تو ریاست انتظام پذیر نہ ہوگی اور فتنہ و فساد غصب و عناد رونما ہوں گے اور امامت کے جو مصالح ملحوظ و منظور ہونے چاہیے وہ یکسر فوت ہو جائیں گے لہذا مجبوراً ریاست و سعادت سے کنارہ کشی اختیار فرمائی اور امور ریاست حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیئے جو اس وقت ریاست کی اہلیت رکھتے تھے اور یہ صلح و تسلیم کسی خامی، کمزوری یا ذلت کی وجہ سے نہیں تھی اس لیے کہ امام کے ہمراہ جانثاروں اور جانبازوں کی ایسی مستعد فوج موجود تھی جو یک دل اور یک ہمتی سے امام کی مدد کے لیے تیار تھی اور تعداد کے لحاظ سے بھی کچھ کم نہ تھی لیکن

1۔ سورۃ الفرقان، الآیۃ: 74

2۔ سورۃ النور، الآیۃ: 55

3۔ سورۃ الانعام، الآیۃ: 165

4۔ سورۃ النمل، الآیۃ: 62

چونکہ مدت امامت جو پورے تیس سال تھی ختم ہو چکی آپ نے اس کو ترک ہی فرما دیا۔

اسی سلسلہ میں امامیہ کے صاحب فصول نے جو یہ لکھا ہے کہ روسہ لشکر نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ساز باز کر لی تھی اور جناب امام کو اس کا علم یقینی ہو چکا تھا کہ وہ اپنے اس فاسد ارادے پر تلے ہوئے ہیں کہ آپ کو گرفتار کر کے ان کے سپرد کر دیں یہ محض افترا ہے اس لیے کہ امامیہ ہی نے اپنی کتابوں میں حضرت امام کا خطبہ نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"إنما فعلت ما فعلت إشفاقا عليكم"[1]

میں نے جو کچھ کیا وہ تم پر ترس کھا کر کیا۔

اور ایک دوسرے خطبہ میں جس کو شریف مرتضیٰ اور صاحب الفصول ہر دو نے نقل کیا ہے یوں ہے کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ نے اس وقت جب کہ وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کا پختہ ارادہ کر چکے تھے فرمایا:

إن معاوية قد نازعني حقا لي دونه، فنظرت الصلح للأمة وقطع الفتنة. وقد كنتم بايعتموني على أن تسالموا من سالمني وتحاربوا من حاربني، ورأيت أن حقن دماء المسلمين خير من سفكها، ولم أرد بذلك إلا صلاحكم[2]

البتہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے میرے ساتھ اس حق میں جھگڑا کیا جس کا حقدار میں تھا وہ نہیں تھے مگر میں نے فتنے کی بے خونی اور امت کی بھلائی کو پیش نظر رکھا اور تم نے مجھ سے اس بات پر بیعت کر لی تھی کہ جس نے مجھ سے صلح کی تم بھی اس سے صلح کرو گے اور جو مجھ سے لڑائی لڑے گا تم بھی اس سے لڑو گے اور میں نے یہ دیکھا کہ مسلمانوں کی جانوں کی حفاظت ان کی خون ریزی سے اچھی ہے۔

تو اس سے صاف واضح ہے کہ ریاست ملک و تصرف کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دینے اور ان

1۔ مناقب آل أبي طالب، لابن شهر آشوب المازندراني: 4/ 35.

2۔ كشف الغمة، للإربلي: 1/ 571؛ وعنه المجلسي، بحار الأنوار: 44/ 64. وأخرج المرتضى رواية قريبة في تنزيه الأنبياء: ص 171.

سے دستبردار ہونے کا سبب کمزوری و بے بسی نہ تھا، بلکہ آپ نے اس مصلحت کی بنا پر صلح فرمائی جس کے رعایت آپ ہی کے شایان شان تھی اور خطبہ ثانی سے صاف طور پر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فریق ثانی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھی بھی مسلمان تھے کیونکہ کفار و مرتدین سے فتنہ و فساد کے خوف سے بھی صلح جائز نہیں بلکہ ان سے اور ان کے غلبہ کو نہ روکنا ہی عین فتنہ ہے جیسا کہ ارشاد ربی ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ[1]

ان سے اتنا لڑو کہ فتنہ نابود ہو جائے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔

اور علماء امامیہ میں سے صاحب الفصول نے بھی مخنف سے جو روایت کی ہے اور جو صفحات ماسبق میں گزر چکی ہے جس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے برادر اکبر پر اس صلح کے سلسلہ میں اظہار ناراضگی فرمایا تھا بلکہ یہ تک فرما دیا کہ مجھے اپنے ناک کٹا لینا اس صلح سے زیادہ پسند تھا[2] آپ کے اس فرمان اور طرز عمل سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے مجبور ہو کر صلح نہیں کی تھی کیونکہ مجبوری کی صورت میں نہ ملامت کی جاتی ہے نہ شکایت۔

یہ ایک مشہور قاعدہ ہے کہ ضرورتیں ممنوعات کو جائز کر دیتی ہیں اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کلام سعادت پر جام جو کتب شیعہ میں مذکور ہے اس بات کی بھی دلیل ہے کہ امام وقت کے کسی فعل پر اپنی سمجھ میں آنے والی کسی مصلحت کے خلاف پا کر نکیر کرنا یا ناخوشی ظاہر کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ مصلحت وقت اور رعایت حال کی بنا پر اکابرین امت میں بھی اختلاف رونما ہوا ہے اور وہ ناخوشی و ناراضگی کا سبب بھی بنا ہے مگر ایک دوسرے کے خلاف بدگوئی اور برا بھلا کہنے کا باعث نہیں ہوا ان دو عمدہ فائدوں کو بڑی احتیاط سے حافظہ میں تازہ رکھنا چاہیے کہ یہ بہت سی جگہ کام آئیں گے۔

1۔ سورۃ الانفال، الآیۃ: 39

2۔ لما أراد الحسن الصلح قال له الحسين: أنشدك الله ان تصدق احدوثة معاوية وتكذب احدوثة ابيك فقال له الحسن: اسکُت، انا اعلم بما صنع منی فقال الحسين: والله لوددت ان انفی قد قد قبل ان اسمع منك ما سمعت۔
(ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، جلد 16، صفحہ 15، عیسی البابی الحلبی وشرکاہ قاہرہ، مصر)

بعض جاہل امامیہ کے ایک شبہ کا جواب

یہاں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ بعض جاہل امامیہ انتہائی عناد و تعصب کی بنا پر کہتے ہیں کہ اہلسنت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو امام مانتے ہیں یہ قول انتہائی بے شرمی اور دروغ چشمی پر مبنی ہے اور اس کو منہ پر جھوٹ بولنا کہتے ہیں ورنہ معمولی پڑھا لکھا فارسی خان جس نے اہلسنت کے مولانا عبد الرحمن جامی رحمۃ اللہ علیہ کا مرتبہ عقائد نامہ فارسی پڑھا یا دیکھا ہے یہ یقین سے جانتا ہے کہ اہلسنت سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ابتدائی امامت سے لے کر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے معاملے امامت حوالہ کرنے تک وہ حق پر نہیں تھے بلکہ باغی جیسا کردار ادا کر رہے تھے اس لیے کہ امام وقت کی اطاعت چھوڑ بیٹھے تھے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے جب امامت سپرد کی تو اس وقت وہ بادشاہ ہوئے یا ان کی حیثیت کے لیے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک عام بادشاہ تھے تمام اسلامی ممالک کے فرمان روا اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے کسی ناگزیر مصلحت کے سبب ان کی سلطنت کی وسعت کو گوارا کر لیا تھا اور وہ امام کی اتباع جیسا کہ چاہیے نہ کرتے تھے۔ (1)

1۔ بغاوت سے مراد لغوی بغاوت ہے جو خطاء اجتہادی سے سرزد ہوئی نہ کہ بغاوت بالمعنی المشہور اور لغوی بغاوت خود شیعہ سنی ہر دو کی کتب میں بایں الفاظ مروی ہے: والبغی التعدی وبغی الرجل علینا بغیا عدل عن الحق واصل البغی مجاوزۃ الحد و فی حدیث ابن عمر قال لرجل انا ابغضک قال لم؟ قال لانک تبغی فی اذانک اراد التطریب فیه و التمدید من تجاوز الحد۔(لسان العرب لابی الفضل جمال الدین محمد بن مکرم جلد14 ص78 مطبوعہ بیروت) یعنی بغاوت کا اصل (لغوی معنی) زیادتی ہے اور محاورہ ہے کہ آدمی نے ہم پر بغاوت کی، بغاوت کرنا یہ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص حق سے پھر جائے اور "بغی" کا اصلی مفہوم حد سے بڑھنا ہے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک حدیث میں ہے کہ انہوں نے ایک آدمی کو کہا میں تجھ سے ناراض ہوں آدمی بولا کیوں؟ فرمایا بایں وجہ کہ تو اذان میں بغاوت کرتا ہے اس سے آپ کی مراد یہ تھی کہ وہ شخص اذان میں سروں اور بے جا الفاظ کو کھینچ کر ادا کیا کرتا تھا۔

فروع کافی میں ہے: انما جاء تاویل هذه الایة یوم البصرة وهم اهل هذه الایة وهم الذین بغوا علی امیر المومنین علیه السلام۔(فروع کافی جلد8 صفحه 180 کتاب الروضه الذین خرجوا یوم البصرة هم الباغون مطبوعه تہران طبع جدید) یعنی بے شک اس آیت کریمہ کی تفسیر یوم بصرہ کے متعلق ہے اور وہی لوگ اس آیت کے مصداق بنتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے بغاوت کی۔ شیعی مفسر "ملا کلینی" نے لکھا کہ ان دونوں گروہوں سے مراد بصرہ کے رہنے والے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھی ہیں۔

اور حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خطاء اجتہادی کے بارے میں اہل سنت والجماعت کے مشہور متکلم حضرت مولانا عبد العزیز پرہاروی رحمۃ اللہ علیہ یوں لکھتے ہیں: ان اهل السنه اجمعوا علی ان من خرج علی علي كرم الله وجهه خارج علی الامام الحق الا ان هذا البغي

جس طرح بعض صوبے داروں کا رویہ اپنے بادشاہ کے ساتھ ہوتا ہے یا جیسے ہمارے زمانہ کے بادشاہ شاہ عالم کے مختار کار کے بادشاہ کے علم میں لائے بغیر امور سلطنت انجام دیتے ہیں اور سوائے مقررہ روزینہ کے پہنچانے اس کی طرف عرضیاں لکھنے یا اس سے القاب وخطابات حاصل کرنے کے اپنے بادشاہ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے لہذا ان حالات کے ماتحت وہ بادشاہ تھے جو بظاہر امام کی رائے اور رضامندی کے تحت سلطنت حاصل کر چکے تھے اس لیے اہل سنت ان کو پہلا بادشاہ اسلام کہتے ہیں۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت کے متعلق بحث

اب رہا یہ شک کہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا کردار باغیانہ تھا اور وہ ناحق غلبہ حاصل کرنے والے تھے تو ان پر لعن کیوں نہیں کرتے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک گناہ کبیرہ کے مرتکب پر لعن جائز نہیں اور چونکہ بغاوت بھی گناہ کبیرہ ہے اس لیے اس پر بھی لعن منع اور ناجائز ہے،[1] اہل سنت اپنے اس دعویٰ کی دلیل بھی قرآن وعترت سے لاتے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الاجتهادي معفو عنه. (الناهيه عن طعن معاويه، تحت الجواب التاسع، ص: 38 طبع ملتان) یعنی اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اجماع اور اتفاق ہے کہ ان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف کھڑے ہونا بنا بر اجتہاد ہے اور وہ ان کے حق میں معاف ہیں۔

اور ان مشاجرات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان 40ھ میں صلح ومصالحت بھی ہو گئی تھی پھر حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد امام حسن رضی اللہ عنہ کی بھی ربیع الآخر یا جماد الاولیٰ 41ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح ہو گئی تھی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت خلافت کر لی اس صلح اور بیعت کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تمام اہل اسلام کے لیے خلیفہ برحق تجویز ہو گئے اور امام المسلمین اور امیر المومنین ٹھہرے اس ابتلائی دور کے گزر جانے کے بعد سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نہ باغی ہیں نہ طاغی ہیں نہ ہی فاسق ہیں اور نہ ہی جائر اور نہ ظالم بلکہ ایک صحابی رسول کی شان سے یہ امور سرزد ہونا بہت ہی بعید بات ہے۔

مزید تفصیل کے لئے استاد محترم مفتی عبدالواحد قریشی حفظہ اللہ کی کتاب "قاتل عمار کون" کا مطالعہ فرمائیں جس میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور اشکالات کے تشفی بخش جوابات دیئے گئے ہیں۔

1۔ اہلسنت والجماعت کے نزدیک حضرت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ گناہ کبیرہ کے مرتکب نہیں تھے کیونکہ وہ مجتہد تھے شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: فاتفق أهل السنة علي أنه لا تفسق واحدة من الطائفتين وان قالوا في احداهما أنهم بغاة لأنهم كانوا متأولين مجتهدين والمجتهد لا يكفر ولا يفسق. (منهاج السنة النبوية في نقض كلام الشيعة القدرية: ج 4 ص 394، ط جامعة الامام

"وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ"[1]

اپنی لغزش سے اگر کبھی ہو جائے اور مومن مرد و عورت کے گناہوں سے اللہ کی بخشش طلب کرو۔

کتاب اللہ کی یہ آیت صاف دلالت کرتی ہے کہ شارع کی غرض اہل ایمان کے حق میں استغفار ہے لعن نہیں اس لیے کہ قاعدہ اصولیہ کے مطابق جس کو امامیہ بھی مانتے ہیں ایک چیز کے لیے حکم دینا اس کے

محمد بن سعود الاسلامية)یعنی اہل سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فریقین میں سے کسی ایک کو بھی فاسق نہیں کہا جائے گا اگرچہ اہل سنت ان میں سے ایک کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ باغی تھے، کیوں کہ وہ تاویل کرنے والے مجتہد تھے اور مجتہد کو نہ کافر کہا جاتا ہے اور نہ ہی فاسق۔

اسی طرح حافظ زین الدین عراقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: مذهب أهل الحق أن الفئة المقاتلة لعلي هي الباغية و ان كانت متاولة طالبة للحق في أنها غير مذعومة بل مأجورة على الاجتهاد ولا سيما الصحابة منهم . (طرح التثريب في شرح التقريب للعراقي : ج 7 ص 278 ،ط الطبعة المصرية القديمة)یعنی اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قتال کرنے والی جماعت ہی باغی تھی، اگرچہ وہ تاویل کر رہی تھی، اپنے گمان میں حق کی طلب گار تھی، وہ قابل مذمت نہیں بلکہ (اپنے) اجتہاد پر ماجور ہے بالخصوص ان میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ تحریر فرماتے ہیں: میں نے حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کی تحریروں پر جتنا غور کیا ہے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہوں نے حضرت معاویہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خروج کے لیے جو فسق اعتقادی کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے مراد یہی ہے کہ بغاوت فی نفسہ فسق ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اس کی بنا پر یہ حضرات (معاذ اللہ) فاسق ہو گئے بلکہ چونکہ ان کی جانب سے اس فعل کا صدور نیک نیتی کے ساتھ اجتہاد کی بنا پر ہوا اور یہ حضرات اجتہاد کے اہل بھی تھے اور اپنے موقف کی ایک بنیاد رکھتے تھے اس لیے یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی ورنہ ظاہر ہے کہ اگر حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا منشا یہ ہوتا کہ وہ واقعتاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو (معاذ اللہ) خروج کی بنا پر فاسق قرار دیں جیسا کہ ملک غلام صاحب نے سمجھا ہے تو پھر وہ اپنی مذکورہ عبارت میں اسے خطائے اجتہادی سے کیوں تعبیر کرتے ہیں؟ .... اور اگر میرا یہ خیال غلط ہے اور ان کا منشا یہی ہے کہ حضرت عائشہ حضرت طلحہ حضرت زبیر حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کرام حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محاربہ کرنے کی بنا پر معاذ اللہ فاسق ہو گئے تو ان کی یہ بات بلاشک وشبہ غلط اور جمہور امت مسلمہ کے مسلمات کے قطعی خلاف ہے، میں اپنے سابقہ مضمون کے آخر میں حوالوں کے ساتھ لکھ چکا ہوں کہ ساری امت از اول تا آخر ان حضرات کی اس غلطی کو اجتہادی غلطی قرار دیتی آئی ہے اہل سنت کی عقائد و کلام کی کتابیں ان تصریحات سے بھری ہوئی ہیں اور ان میں سے کسی نے بھی اس بنا پر ان حضرات کو فاسق قرار دینے کی جرأت نہیں کی اگر بفرض محال شاہ عبد العزیز یا میر سید شریف جرجانی واقعتاً اس کے خلاف کوئی رائے ظاہر کرتے ہیں تو جمہور امت کے مقابلے میں ان کا قول ہرگز مقبول نہیں ہوگا۔ (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور فسق وبغاوت، ص:237،238، ط:مکتبہ معارف القرآن کراچی)

نیز حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی کتب میں کچھ لوگوں کی طرف سے قطع وبرید اور تحریفات وغیرہ پر کچھ علماء نے کلام کیا ہے جس کی تفصیل مقدمۂ تحقیق میں ملاحظہ فرمائیں۔

1۔ سورة محمد، الاية : 19

مخالف سے انکار کا مترادف ہے لہذا استغفار کا حکم اس کے مخالف (لعن) کے انکار کا متقاضی ہے، اور پھر گناہ کبیرہ کا مرتکب شیعہ و سنی ہر دو کے نزدیک ایمان سے ہاتھ نہیں دھو بیٹھتا وہ مومن رہتا ہے کیونکہ اللہ تعالی فرماتا ہے:

"وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا"[1]

اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں میں صلح کرا دو۔

لہذا لعن سے ممانعت ثابت ہوگئی ہاں اہل کبائر متصف بالوصف پر خود کتاب اللہ میں لعنت آئی ہے:

"أَلَا لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الظَّالِمِينَ"[2] خبردار ہو کہ ظالم پر اللہ کی لعنت ہے۔

"فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ"[3] پس ہم جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں۔

مگر یہ لعنت دراصل صفت پر ہے موصوف پر نہیں اور بالفرض اگر مان لیں کہ لعنت موصوف پر ہی ہے تو یہاں ایمان تو مانع لعنت ہو رہا ہے اور صف کذب و ظلم کا وجود لعنت کو جائز قرار دے رہا ہے تو اس سلسلہ میں امامیہ شیعوں کے اصول میں یہ طے شدہ امر ہے کہ جب ایک صفت سے کسی حکم کو چاہے اور وہ مانے حکم کے ساتھ جمع ہو تو حکم رک جاتا ہے لہذا یہاں بھی صرف صفت کے پائے جانے پر لعنت کا حکم ثابت نہ ہوگا تاوقتیکہ اس کا مانع ایمان نہ اٹھ جائے جس طرح کافر کے حق میں جب اس کی موت یقینی کفر پر ہوئی ہو اس میں اچھے صفات پائے جانے کے باوجود استغفار اس کے لیے جائز نہیں ہوگا اور ایک آیت قرآنی میں یہ بھی فرمان ہے:

وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ[4]

1۔ سورۃ الحجرات، الآیۃ: 9

2۔ سورۃ ھود، الآیۃ: 18

3۔ سورۃ آل عمران، الآیۃ: 61

4۔ سورۃ الحشر، الآیۃ: 10

جو لوگ ان کے بعد آئے وہ یوں کہتے ہیں اے ہمارے رب ہماری بھی مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی جو ہم سے پہلے ایمان لائے تھے اور ہمارے دل میں اہل ایمان کی عداوت نہ پیدا فرما اے ہمارے رب بے شک تو مہربان اور رحم والا ہے۔

اس آیت مبارک میں مغفرت کی طلب اور بغض وعداوت پیدا نہ ہونے کی بنا محض ایمان پر رکھی گئی ہے اس میں عمل کی کوئی قید مذکور نہیں لہذا یہ دونوں معاملات برتنا یعنی ترک بغض وعداوت اور لعنت سے احتراز جو طلب مغفرت کا لازمہ ہے ہر مومن کے ساتھ ضروری ہوئے جستجو اور تلاش کی جائے تو اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیات قرآن مجید میں ملیں گی۔

اور بحوالہ عترت اس سے استدلال یوں ہے کہ کتب امامیہ سے بطریق تواتر یہ بات ثابت ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اہل شام پر لعنت کرنے سے روکا اور منع فرمایا اہل سنت و بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منع کی ہوئی بات کے ارتکاب کی جوت نہیں کر سکتے یہ تو شیعہ ہی ہیں جو ادھر ادھر بات کو گھما پھرا کر یا جھوٹی سچی تاویلات کا سہارا لے کر خلاف ورزی کی صورت پیدا کرنے میں ماہر ہیں، چنانچہ یہاں بھی جناب امیر رضی اللہ عنہ کی اس ممانعت کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ اہل شام پر آپ نے لعنت سے اس لیے منع نہیں فرمایا تھا کہ وہ لعنت کے مستحق نہ تھے بلکہ ممانعت اپنے دوستوں کو تہذیب اخلاق اور حسن کلام کا سبق سکھانے کے لیے آپ نے ایسا فرمایا تھا چنانچہ روایت کے الفاظ اس کی گواہی دے رہے ہیں:

إني أكره لكم أن تكونوا سبابين[1]

میں تمہارے لیے پسند نہیں کرتا کہ تم گالی دینے والے بنو۔

اہل سنت کہتے ہیں کہ امام نے جو چیز ہمارے لیے ناپسند کی کیا ہم اس کو پسند کر سکتے ہیں اور پسند ہی نہ کریں بلکہ اس کو وجہ قرب وعبادت بھی سمجھیں ہمارا کام تو امام کے احکام کی بجاآوری ہے جس بات کو آپ نے مکروہ و برا سمجھا ہم بھی اسے مکروہ ہی سمجھیں اور سب فعلت کا معاملہ امام پر چھوڑ دیں خواہ مخواہ کے قیاسی گھوڑے دوڑا کر

1۔ نہج البلاغة، 2/ 185، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

خسران آخرت کا خطرہ کیوں مول لیں، اس کے علاوہ اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ شیعہ حضرات نہج البلاغہ کی اس دوسری روایت سے آنکھیں کیوں چراتے ہیں جس میں لعنت کی ممانعت اسلامی و ایمانی اخوت و شرکت کی بنا پر کی گئی ہے وہ روایت یہ ہے:

إنما أصبحنا نقاتل إخواننا في الإسلام على ما دخل فيه من الزيغ و الإعوجاج والشبهة والتأويل (1)

جب آپ نے اپنے ساتھیوں کو اہل شام پر لعنت کرتے سنا تو آپ نے ان سے خطاب فرمایا کہ ہماری اپنے مسلمان بھائیوں سے لڑائی اس لیے ہے کہ بعض اسلامی امور میں بے راہ روی کجی شبہات اور تاویلات داخل ہو گئی ہیں۔

امامیہ کی کتابوں میں دونوں روایات موجود ہیں یہ بھی اور اس سے پہلے والی بھی پہلی روایت اگر لعنت سے ممانعت کا یہ سبب بتاتی ہے کہ زبان درازی اور خلاف ادب گفتگو کے عادی نہ بنے تو ہم اس روایت کو اس بات پر محمول کرتے ہیں کہ یہ روایت ان لوگوں کے حق میں ہے جو لعن بالوصف کرتے ہیں اور جو شرعا جائز ہے۔

اب یہ بات ایسے اشخاص کے لیے تو ناگزیر ہوتی ہے جو شریعت کو پہچاننے والے ہیں جیسے انبیاء کرام علیہم السلام کے ان اوصاف کی برائی لوگوں کے سامنے لائے اور ان کے ذہن نشین کرنے کی خاطر متصفین صفات مذمومہ پر لعنت فرمائے مگر انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ جو دوسرے ہیں اور اس منصب پر فائز نہیں ہے وہ بڑے بے لگام ہوتے ہیں ان کے لیے اب ایسا کرنا جائز نہیں ورنہ لعن وطعن کی عادی زبانیں اور بہانہ جو ان لوگوں پر بھی لعن کرنے لگیں گے جو اس کے مستحق نہ ہوں گے اور "لعن الله السارق، لعن الله الشارب الخمر" وغیرہ وغیرہ ان کا ورد بن جائے گا اور بات بے بات گلی کوچوں میں یہ لعنتی نعرے گونجاتے رہیں گے۔

اور دوسری روایت میں ان لوگوں کو منع کیا گیا ہے جو اسلام و ایمان کا لحاظ کیے بغیر اہل شام کی تعیین و تخصیص کر کے خصوصیت سے لعنت کرتے تھے اسی طرح جناب امیر رضی اللہ عنہ کی دونوں روایات پر عمل کی صورت

1۔ نہج البلاغة، 1 / 236، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

نکل آئی اور کلام عترت بھی کلام اللہ کے موافق ہو گیا بحمد اللہ کتاب اللہ عترت رسول اللہ کے فہم اور تطابق میں اہل سنت کا یہی وطیرہ طریقہ اور رویہ ہے۔

لعنت کے بارے میں شیعہ کی اپنے اصول کی خلاف ورزی

اب یہاں بعض دانشمندان شیعان کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک بھی لعنت اسی کافر پر جائز ہے جس کے متعلق یقین ہو کہ وہ کفر پر مرا ہے اور ہمارے اصول کا بھی یہ تقاضا نہیں کہ باغیوں پر جو گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں اور دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہے لعنت کریں لیکن یہ ایسے ہی لوگوں کے متعلق ہے جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہ لڑیں کیونکہ ان سے لڑنے والے کافر ہیں اور ایسا اسی حدیث کی روشنی میں کہتے ہیں جو شیعہ اور سنی دونوں میں متفق علیہ ہے اور دونوں کے نزدیک صحیح بھی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا" حربك حربي "[1] تیرے ساتھ لڑنا میرے ساتھ لڑنا ہے۔

اسی لیے خواجہ نصیر طوسی نے تجرید میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کے محض مخالف ہوں اور ان سے لڑنے والوں میں فرق کرتے ہوئے کہا ہے" محاربوه كفرة ومخالفوه فسقة "[2] ان کا مخالف فاسق ہے اور ان سے لڑنے والے کافر ہیں۔

اگر تو اسی اپنی بات مشہور مذہب پر اعتماد کر کے کہتا تو اس فرق کی بھی اس کو شاید ضرورت نہ پڑتی کیونکہ عام امامیوں کے نزدیک منکر امامت منکر نبوت جیسا ہے اور ظاہر ہے منکر نبوت کافر ہے تو اس بنیاد پر مخالف اور محارب دونوں ہی کافر قرار پا جاتے مگر طوسی نے مشہور قول کے خلاف ایسا اس لیے کیا کہ کافی اور شیعوں کی دوسری صحاح میں ائمہ سے ایسی روایات جو پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ہمارے امامت سے انکار کرنے والا کافر نہیں ہے تو وقت کہ یہ انکار عداوت و دشمنی کی شکل اختیار نہ کر لے اور ہماری

1۔ الأمالي لابن بابويه: ص 97 و الأمالي للطوسي: ص 364. قال ابن تيمية في منهاج السنة النبوية: «وما ذكره في الحديث من قوله حربك حربي لم يذكر له إسنادا فلا يقوم به حجة فكيف وهو كذب موضوع باتفاق أهل العلم بالحديث»

2۔ كشف المراد في شرح تجريد الاعتقاد، للطوسي، ص :243.

خونریزی کو حلال نہ سمجھے اور انہی روایات میں منکر امامت کی نجات کا علم بھی ہے چنانچہ فاضل کاشی نے کلام میں جو باب دوم میں مذکور ہے ان روایات کی تفصیل موجود ہے۔

یہ حضرات مزید یہ کہتے ہیں کہ دونوں ہی فرقوں کی کتابوں میں یہ بھی ملتا ہے کہ حضرت ﷺ نے اہل عبا سے فرمایا:

أنا سلم لمن سالمتم حرب لمن حاربتم[1]

جن سے تم صلح کرو میری اس سے صلح ہے اور جن سے تم جنگ کرو اس سے میری بھی جنگ ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ سے جنگ بلاشبہ کفر ہے تو دیگر ائمہ حضرات سے جنگ بھی لامحالہ کفر ہو گی۔

اہل سنت اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہاں الفاظ وکلام کے حقیقی معنی مراد نہیں ہے بلکہ مقصد ان حضرات سے لڑائی پر ڈرانا اور دھمکانا ہے اور یہ بتانا ہے کہ ان سے لڑنا بہت ہی سخت جسارت اور ناروا بات ہے اور یہ گناہ کبیرہ کی سخت ترین شکل ہے اور اس کی دلیل امامیہ کی وہ صحیح روایات ہیں جن میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کا یہ صریح حکم موجود ہے کہ اہل شام میں ایمان باقی ہے اور ان کے ساتھ اسلامی بھائی چارگی کا تعلق قائم ہے اگر اس حدیث کے وہ معنی مراد ہوتے جو شیعوں یا نصیر طوسی نے سمجھے ہیں تو پھر جناب امیر رضی اللہ عنہ نے جو سمجھا خدانخواستہ وہ غلط ثابت ہوتا ہے، لہذا ہمیں تو جناب امیر رضی اللہ عنہ کی ہی سمجھ پر اعتماد کرنا اور وہی سمجھنا ہے جو انہوں نے سمجھا ہے اور وہ انہی کی اتباع کرنی اور انہی کے فہم کے مطابق عمل کرنا ہے نہ کہ جو خواجہ طوسی یا دوسروں کی سمجھ پر کیونکہ طوسی نا معصوم ہے نہ امام اور پھر جو فرق ان دونوں میں ہے وہی فرق ان دونوں کے متبعین میں بھی ہو گا۔

---

1 ـ أخرجه الترمذي في كتاب الفضائل، باب فضل فاطمة - رضي الله عنها -: 5/ 699، رقم 3870 وقال عنه: «حديث غريب وإنما نعرفه من هذا الوجه، وصبيح مولى أم سلمة غير معروف»؛ وأخرجه أحمد في المسند: 2/ 442، رقم 9696؛ والطبراني في المعجم الكبير: 3/ 40، رقم 2620؛ قال الهيثمي: وفيه من لم أعرفهم، مجمع الزوائد: 9/ 169؛ والحديث قال عنه ابن الجوزي: وهذا حديث لا يصح، العلل المتناهية: 1/ 268؛ وهو في ضعيف الترمذي: ص 813. وأخرجه من الإمامية: عماد الدين الطبري، بشارة المصطفى: ص 61؛ ابن طاوس، الطرائف: 1/ 132؛ المجلسي، بحار الأنوار: 24/ 261؛ العاملي، الوسائل: 24/ 261؛

پھر ایک اور بات اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں جو خبر احاد کے درجے کی ہے اس میں امیر کی لڑائی کو صرف رسول اللہ ﷺ کی لڑائی کہا گیا ہے مگر قرآن مجید میں جو یقینی متواتر ہے اس میں سود خور کو اللہ و رسول دونوں سے جنگ کرنے والا بتایا ہے:

فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللهِ وَرَسُولِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ[1]

اگر تم ایسا نہ کرو تو پھر اللہ و رسول سے تمہاری جنگ ہے اور اگر باز آجاؤ تو تم کو تمہارا راس المال مل جائے گا۔

تو یہاں تو اسی کی فہم سود خوری پر کفر کا فتویٰ کیوں نہیں لگاتی،[2] جو سود خوری سے توبہ نہیں کرتا اور اس سود خوری کو اسباب کفر کیوں قرار نہیں دیتی اور اس کو تمام کبائر سے مستثنیٰ نہیں کرتی اسی طرح اللہ نے جو راہزنوں کے متعلق فرمایا ہے: إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ[3]

تو یہ بھی اس بات پر دلالت ہے کہ وہ بھی خدا اور رسول دونوں ہی کے ساتھ لڑنے والے لوگ ہیں لہذا اس سے یہ معلوم ہو گیا سخت کبیرہ گناہ کے ارتکاب کی صورت میں اللہ اور رسول سے لڑائی تو لازم آتی ہے مگر ایمان باقی رہتا ہے یہ باہر یہاں چونکہ ضمناً آگئی اس لیے اس پر اکتفا کر کے اصل مسئلہ کی طرف لوٹتے ہیں۔

شیعہ کو اشتباہ پیش آنے کی اصل وجہ

اس فرقہ کو یہ اشتباہ پیش آنے کا راز یہ ہے کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد آنے والے مروانی و عباسی اپنے آپ کو خلیفہ کہلواتے تھے اور خود بھی کہتے تھے اور یہ صرف ان کاموں میں ظاہری مشابہت کی وجہ سے تھا جو حضور ﷺ کے ساتھ رکھتے تھے مثلاً جہاد کا سر انجام کرنا شہروں کی فتح فوجوں اور لشکروں کی تیاری

1۔ سورة البقرة، الآية: 279

2۔ بلکہ شیعہ کے نزدیک تو سود خور محض گناہ گار ہے: بل حكم الشيعة بأنهم عصاة لم يخرجوا عن الإسلام. ينظر الراوندي، فقه القرآن: 1/ 367؛ الكراكجي، كنز الفوائد: 1/ 158.

3۔ سورة المائدة، الآية: 33

غنائم اور صدقات کی تقسیم اور کفار کی دست وبرد سے دارالاسلام کی حفاظت اور علماء اہل سنت بھی کاموں کی اسی ظاہری مشابہت کی وجہ سے ان کے لیے خلیفہ کالفظ استعمال کرتے ہیں۔

اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ ہر فرقہ وطبقہ کے القاب یانام خود ان کی اپنی مرضی واصطلاح کے مطابق ہوتے ہیں دوسروں کو ان میں الجھنے کی کیاضرورت چنانچہ آج کل جو شخص کربلا جاکر ملا نصیر اور اخوان باقر سے کتاب شرائع پڑھ کر آتا ہے تو اس فرقہ کے نزدیک وہ مجتہد کہلاتا ہے اسی طرح ان کے زمانے میں خلیفہ کالفظ کافی معروف اور کثیر الاستعمال تھا اس لیے اس کو امام کامرادف سمجھ کر اختیار کر لیا اس لیے یہ نتیجہ نکالنا کہ اہل سنت ان حضرات کو خلفائے اربعہ کی طرف برحق جانتے ہیں ایسا سمجھنے والوں کی غلط فہمی ہے محققین اہل سنت تو اس معاملہ میں زیادہ محتاط تھے وہ ان حضرات کے لیے خلیفہ کالفظ استعمال نہیں کرتے تھے چنانچہ حدیث صحیح:

"الخلافة بعدي ثلاثون سنة"[1] خلافت کازمانہ میرے بعد تیس سال ہے۔

کہ ایک راوی سعید بن جمہان سے امام ترمذی نے نقل کیا ہے کہ جب اس سے کہا گیا کہ مروانیوں کو بھی تو خلیفہ کہتے ہیں تو اس نے کہا کہ بنوالزرہ یعنی بنوامیہ کاخیال غلط ہے وہ توبادشاہ ہیں بادشاہ بھی شریر!

اور ابو بکر بزار رحمۃ اللہ علیہ نے جن کا شمار اہل سنت کے چوٹی کے محدثین میں ہوتا ہے حضرت عبید ابن الجراح رضی اللہ عنہ سے بطریق حسن روایت کی ہے:

قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن أول دينكم بدأ نبوة ورحمة، ثم تكون خلافة ورحمة، ثم يكون ملكا وجبرية[2]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے دین کی ابتدا نبوت ورحمت کے سائے میں ہوئی پھر اس کو خلافت کادور نصیب ہوگا وہ بھی رحمت ہی ہوگا اس کے بعد وہ بادشاہت وجبریت دیکھے گا۔

1۔ صحيح ابن حبان بترتيب ابن بلبان، ذكر الخبر الدال على أن الخليفة بعد عثمان بن عفان كان علي بن أبي طالب رضوان الله عليهما ورحمته وقد فعل، 15/ 392، رقم: 6943، ط: مؤسسة الرسالة بيروت

2۔ مسند البزار المنشور باسم البحر الزخار، 4/ 108، رقم: 1282، ط: مكتبة العلوم والحكم المدينة المنورة

خلاصہ کلام یہ کہ اہل سنت کے نزدیک یہ طے شدہ بات ہے کہ خلافت حقہ بلاشبہ تیس برس تک جاری رہی اور 15 جماد الاول 41ھ کو امام حسن رضی اللہ عنہ کی جناب معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح پر ختم ہوگئی۔

اور ان کے نزدیک خلفاء کی وہی ترتیب حق صحیح و درست ہے جو عملاً پیش آئی اس میں کسی تقدم متاخر کا کوئی سوال نہیں گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق ہیں اہل سنت کے پاس اپنے اس قول کی کتاب وت کے بہت سے دلائل موجود ہیں چنانچہ کتاب ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء میں کتاب و سنت اجماع امت اور اقوال عترت سے ہزاروں دلائل اس پیرایہ اور اس انداز و طرز سے بیان کیے گئے ہیں جو دانشمندان روزگار کے لیے سرمایہ مسرت و ذریعہ تمانیت ہیں اور اس کتاب کے مصنف کو جو پرانی دہلی میں سکونت پذیر تھے آیت الٰہی اور معجزہ نبوی ہی کہا جاسکتا ہے کاتب حروف بھی بارہا ان کی زیارت سے شرف یاب ہوا اور ان کی رنگین بیانی سے دامن میں گل چینی کی اللہ تعالیٰ ان کو بہترین جزا عطا فرمائے۔

خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کا قرآن سے ثبوت

مذکورہ بالا دعویٰ کی دلیل میں اب چند قرآنی آیات اور احادیث شریفہ پیش کی جاتی ہیں تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ یہ فرقہ جو ثقلین کو اپنا اصل الاصول بنائے ہوئے اور شیعت کی بنیاد اس پر رکھے ہوئے ہے کس طرح ثقلین کی مخالفت کرتا ہے اللہ ہی سے مدد و توفیق کے امید ہے اور اسی سے سیدھی راہ تک پہنچنے کی التجا۔

وَعَدَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ(1)

اس آیت کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے وعدہ فرمایا جو سورہ نور کے نزول کے وقت ایمان لائے تھے اور نیک کام کیے تھے کہ ان میں سے ایک جماعت کو زمین میں خلافت عطا فرمائے گا اور تسلط

1۔ سورۃ النور، الآیۃ: 55

نصیب کردے گا جس طرح ان کے پہلو کو خلافت سے نوازا مسلمان حضرت داؤد علیہ السلام کے حق میں ارشاد ہے:

"يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ "[1]

اے داؤد ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا۔

اسی طرح دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کے بارے میں بھی خلافت کے وعدہ کے علاوہ یہ وعدہ بھی فرمایا کہ ان کے اس دین کو جو اللہ تعالی کو پسندیدہ و مرغوب ہے زمین میں تمکن اور جماؤ عطا فرمائے گا یعنی اسے رواج شہرت بخشے گا نیز وعدہ فرمایا کہ انہیں جو خوف اس وقت لاحق و در پیش ہے ان کو مکمل امن وسکون سے بدل دے گا۔

یہ وہ مواعید ہیں جو آیت بالا میں اللہ تعالی نے فرمائے اور اس کی شان "لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ"[2] ہے اس لیے ان کا وقوع پذیر ہونا ضروری ہے ورنہ وعدہ خلافی لازم آئے گی چنانچہ اللہ تعالی نے یہ سارے وعدے پورے فرمائے اور ان امور کے وقوع پذیر ہونے کا زمانہ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک کے اور کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ امام مہدی سورہ نور کے نزول کے وقت موجود ہی نہ تھے اور جناب امیر رضی اللہ عنہ گو موجود تھے لیکن شیعوں کے گمان کے مطابق اللہ کا پسندیدہ و مرغوب دین اس وقت رائج نہ ہو سکا جس کے بارے میں شریف مرتضیٰ نے تنزیہ الانبیاء والائمہ میں تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ اور ان کے شیعوں نے اپنے دین کو ہمیشہ پردہ اخفاء میں رکھا اور مخالفین کے دین کے زیر سایہ اپنی زندگی گزاری ان کو مکمل امن اور پوری بے خوفی بھی نصیب نہ ہو سکی کیونکہ اکثر شہروں اور دور دراز ملکوں مثلاً شام مصر و مغرب میں آپ کی امامت تسلیم نہ ہو سکی چہ جائے کہ آپ کے احکام کو قبول کیے جاتے آپ کے لشکری اور احکام ہمیشہ شامی افواج سے خائف و ہراساں رہے۔

پھر جناب امیر رضی اللہ عنہ اس جماعت کے جس سے وعدہ خلافت ہوا ایک فرد ہیں اور ایک شخص پر جماعت کا لفظ بولنا اصول شیعہ کے خلاف ہے کم از کم تین افراد تو ہوں کہ ان پر جمع کا اطلاق صحیح ہو۔

1۔ سورۃ ص ، الآیۃ : 26

2۔ سورۃ ال عمران ، الآیۃ : 9

اب رہے وہ ائمہ جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے بعد پیدا ہوئے وہ اس سلسلہ میں قابل ذکر ہی نہیں کہ بوقت وعدہ نہ خود موجود تھے نہ ان کا زمین پر تسلط ہوا اور نہ ان کا پسندیدہ دین بقول شیعوں کے رائج ہی ہوا اور نہ ان کو زندگی بھر امن و سکون ہی نصیب ہوا بلکہ وہ ہمیشہ خوفزدہ اور روپوش ہی رہے۔

ان سب امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خلافت فی الارض کا وعدہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم ہی سے تھا اور وہ دین جو ان حضرات کے زمانہ میں رائج اور شائع ہوا وہی خدا کا پسندیدہ اور مرغوب دین تھا یہی خلافت حقہ ہے جو امامت کے مرادف ہے اور ملا عبد اللہ مشہدی نے بہت ہاتھ پاؤں مار کر اور بڑی چھان بین کے بعد اظہار الحق نامی کتاب میں کہا ہے کہ احتمال ہے کہ خلیفہ سے بمعنی لغوی مراد ہو یعنی استخلاف سے مطلب صرف ایک شخص کو دوسرے کے بعد لانا ہو جیسا کہ بنی اسرائیل کے حق میں آیا ہے:

عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ [1]

قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کرے اور تم کو زمین میں خلیفہ بنادے۔

اور یہ خاص معنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کی پیداکردہ اصطلاح ہو اور اس اصطلاح نے اہل سیر محدثین اور مورخین کے اقوال میں سید عالم وعالمیان صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے بعد اور مسلمانوں میں اس میں امامت کے وجود میں انے کے بعد مذکورہ مکتوبہ معنوں میں مشہور ہوا ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے یہ کب کہا ہے کہ استخلاف بمعنی لغوی کلام میں مستعمل نہیں لیکن یہ تو خود شیعوں کا اپنا اصولی قاعدہ ہے کہ الفاظ قرآن کو حتی الامکان شرعی اصطلاحی معنی پر محمول کیا جائے لغوی معنوں پر محمول نہ کیا جائے اور تمام شریعت کا شیرازہ بکھر جائے اور دینی احکام میں سے کسی کا ثبوت نہ مل سکے گا مثلاً قرآن مجید میں جہاں کہیں ایمان کا لفظ آئے وہاں اس کا لغوی معنی تصدیق مراد لے لیں یا صلوۃ سے دعا، حج سے قصد اسی طرح دوسرے احکام تو کوئی بھی شرعی حکم ثابت نہ ہوگا اس لیے نماز حج اور ایمان سے شرعی اصطلاحی معنی ہی مراد لیے جائیں گے۔

1۔ سورۃ الاعراف ، الآیۃ : 129

خلیفہ کے معنی شرعی اصطلاحی ہیں یا حادث مابعد

اب رہی یہ بحث کے خلیفہ کہ یہ معنی شرعی اصطلاحی ہیں یا بعد کے نکالے ہوئے تو اس بارے میں ہم خود شیعوں ہی کو پیچ بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ چاہیں تو اس حدیث سے تمسک کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی صحت ثابت کریں وہ حدیث یہ ہے "أنت مني بمنزلة هارون من موسى "[1] تو میرے لیے ایسا ہے جیسے موسیٰ کے لیے ہارون، اور اس حدیث کے ساتھ قرآن کی یہ آیت لگا نہ بھولیں کہ "اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي "[2] میری قوم میں تو میرا خلیفہ ہو جا، یا چاہیں "یا علي أنت خليفتي من بعدي "[3]

اس کوشش ناکام کے بعد خود ہی کہہ اٹھیں گے کہ حقیقت وصداقت کیا ہے اور یہی نہیں پھر ان کو لفظ امام سے امامت کے اصطلاحی معنی ثابت کرنا بھی بہت دشوار ہو جائے گا کیونکہ قرآن مجید بایں معنی مستعمل نہیں اور خدا اپنی پناہ میں رکھے کہ اگر نواصب قرآن کی دو چار آیات بطور شہادت تلاوت کر کے لفظ امام کے خراب معنی مراد لیں تو ان سے کوئی جواب نہیں بن پڑے گا مثلاً وہ آیت پڑھ دیں "فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ "[4] سرداران کفر سے لڑو یا "وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ "[5] ہم نے ان کو امام بنایا کہ وہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف۔

اور جو شخص بھی قرآن مجید میں غور وفکر سے کام لے کر اس کا مطالعہ کرے گا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ قرآن مجید میں لفظ امام بمعنی رئیس عام میں مستعمل نہیں ہے بلکہ بمعنی نبی رشد یا ہادی کے استعمال ہوا ہے بخلاف لفظ خلیفہ کے کہ وہ ہر جگہ لفظ فی الارض کے ساتھ متصل ہے جو تصرف عام پر دلالت کرتا ہے۔

1۔ صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب من فضائل علي بن أبي طالب ،4/ 1870، رقم : 2404.

2۔ سورة الاعراف، الاية : 142

3۔ هذه الرواية ليست في كتب أهل السنة، بل من روايات الإمامية: ابن بابويه، من لا يحضره الفقيه: 4/ 179؛ المجلسي، بحار الأنوار: 18/ 178.

4۔ سورة التوبة، الاية : 12

5۔ سورة القصص، الاية : 41

اور خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی صحت خلافت پر ہم صرف لفظ استخلاف سے دلیل نہیں لائے کہ اس میں بحث کی گنجائش ہو بلکہ ہمارا نقطہ استدلال تو استخلاف کی وہ نسبت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف ہے لہٰذا جب استخلاف لغوی معنی کے ساتھ حق جل مجدہ کی طرف منسوب ہو گا تو وہ لامحالہ استخلاف شرعی ہو گا اور ہم اس سلسلہ میں علمائے شیعہ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ یہ بتائیں کہ بنی اسرائیل کو آل فرعون کے بجائے صاحب تخت و تاج بنانا اور آل فرعون و عمالقہ کے بجائے زمین مصر و شام میں تصرف عام ان کے ہاتھ میں دے دینا حق تھا یا باطل و ناصواب اب ان کی مرضی ہے کہ جواب میں وہ کون سی شق اختیار کرتے ہیں ہمارا مقصد ہر حال میں ثابت ہو تا۔

اور اگر ملاجی کا دل خوش کرنے کو ہم ان سب سے قطع نظر کر لیں تب بھی ان کا مدعا و مقصد حاصل نہیں ہو گا بلکہ شگاف اور گہرا اور زیادہ وسیع ہو جائے گا کیونکہ استخلاف لغوی تو تمام امت کو شامل ہے جو بھی ایمان و عمل صالح رکھتا ہو گا وہ اس میں داخل اور اس کا مصداق ہو گا اور خلفائے ثلاثہ ملاجی کے نزدیک بھی ایمان و عمل صالح کے حامل تھے تو وہ بھی اس استخلاف لغوی میں داخل ہوئے پھر دوسرے ذرا زیادہ باریک بین اور دقیقہ سنج شیعوں نے بھی اس آیت کے مفید مطلب معنی متعین کرنے میں بہت زور لگایا ہے اور ان کی اس سعی و جہد کا حاصل چند توجیہات کی شکل میں سامنے آیا ہے اول یہ کہ آیت میں من بیان کے لیے ہے تبعیض کے لیے نہیں ہے اور استخلاف کے معنی کسی زمین کو وطن بنانے کے ہیں۔

اس پر ہم کہتے ہیں کہ جب من ضمیر پر داخل ہو تو اس کو بیانیہ کہنا اہل عرب کے استعمال کے خلاف ہے اور یہ مان بھی لیں تو پھر عملوا الصالحات کی قید لغو اور بیکار ثابت ہوتی ہے کیونکہ زمین میں وطنیت جس طرح نیک عمل والے کو حاصل ہے اسی طرح برے اعمال والے کو بھی ہے بلکہ اس کو تو بڑے اچھے اور خوب تر نوعیت کی وطنیت حاصل ہے اور یہی نہیں اس صورت میں تو ایمان کی قید بھی بیکار ہو گی کیونکہ وطنیت تو کفار کو بھی حاصل ہے اور لغو و بیکار کلام کی قرآن مجید میں موجودگی محال و باطل ہے دوسرے یہ کہ اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں اور جمع کا صیغہ بطور تعظیم ہے یا آپ اور آپ کی اولاد یعنی ائمہ مراد ہیں۔

اس پر ہم کہیں گے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی دین کی برقراری و ثبات اور خوف سے امن نصیب نہ ہوا تو وعدہ خلافی لازم آئی اور واللہ لا یخلف المیعاد۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت میں خلیفہ بنانا دین پسندیدہ الٰہی کو رواج دینا خوف کا زائل ہونا اور ریا وشرک سے پاک عبادات کا رواج ماناان سب باتوں کا مومنین صالحین کی جماعت کے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ اس امت کی پوری زندگی میں یہ امور معارض وجود میں نہیں آئے لہذا مجبوراایسے زمانہ اور ایسے چند اشخاص کی تعیین لازم ہے جن میں یہ سب باتیں بیک زمانہ ووقت موجود ہوں اور یہ مذکورہ بالا اجتماعات اس جگہ بیکار بات ثابت ہوتی ہیں پس اہل سنت نے اس آیت کے صحیح مصداق کی تعیین میں جو اللہ تعالیٰ کے سچے اور پکے وعدہ پر مشتمل ہے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کلام کی طرف رجوع کیا جو نہج البلاغہ میں مذکور ہے نہج البلاغہ ان کے نزدیک بلاشک وشبہ اصح الکتب اور متواتر شمار ہوتی ہے تو اس میں مذکور آپ کے بابرکت کلام نے اس اختلاف ونزاع کی جڑ ہی کاٹ دی آپ کا فیصلہ ہے کہ یہ جماعت خلفائے ثلاثہ اور ان کے معاونین ومددگاروں کی ہے اور آپ نے خود کو بھی انہی مددگاروں میں شمار فرمایا ہے۔ چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

اب ان حضرات کو چاہیے کہ آپ کے اس کلام صدق نظام کو دل کے کانوں سے سنے اور اپنی عقل خام کو پس پشت پھینک دیں کہ اب اس معاملہ میں لیت ولعل کی آپ نے کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑی نہج البلاغہ میں یوں ذکر ہے کہ جب اہل فارس کی جمع شدہ افواج کے مقابلہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بنفس نفیس شریک ہونے کہ سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا تو آپ نے اس کے جواب میں یوں فرمایا:

إن هذا الأمر لم يكن نصره ولا خذلانه بكثرة ولا قلة. وهو دين الله الذي أظهره، وجنده الذي أعده وأمده، حتى بلغ ما بلغ وطلع حيث طلع. ونحن على موعود من الله. حيث قال عز اسمه وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ والله منجز وعده وناصر جنده. ومكان القيم بالأمر مكان النظام من الخرز يجمعه ويضمه. فإن انقطع النظام تفرق وذهب، ثم لم يجتمع بحذافيره أبدا. والعرب اليوم وإن كانوا قليلا فهم كثيرون بالاسلام وعزيزون بالاجتماع. فكن قطبا، واستدر الرحى بالعرب، وأصلهم دونك نار الحرب، فإنك إن شخصت من هذه الأرض

انتقضت عليك العرب من أطرافها وأقطارها، حتى يكون ما تدع وراءك من العورات أهم إليك مما بين يديك إن الأعاجم إن ينظروا إليك غدا يقولوا هذا أصل العرب فإذا قطعتموه استرحتم، فيكون ذلك أشد لكلبهم عليك وطمعهم فيك. فأما ما ذكرت من مسير القوم إلى قتال المسلمين فإن الله سبحانه هو أكره لمسيرهم منك، وهو أقدر على تغيير ما يكره. وأما ما ذكرت من عددهم فإنا لم نكن نقاتل فيما مضى بالكثرة، وإنما كنا نقاتل بالنصر والمعونة[1]

بے شک یہ وہ دین ہے جس کی نصرت و بے نصرتی کثرت و قلت پر مبنی نہیں اور یہ دین اللہ کا وہ دین ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے غلبہ عطا فرمایا اور وہ فوج ہے جس کو اللہ نے عزت دی اور اس کی مدد فرمائی یہاں تک کہ وہ اس اوج تک پہنچا جہاں اسے پہنچنا تھا اور اتنا بلند و ظاہر ہوا جتنا اس کو بلند و ظاہر ہونا تھا اور ہم اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ پر ہیں جو اس نے فرمایا تھا پھر آپ نے یہ آیت پڑھی وَعَدَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ اور اللہ اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا ہے اور اپنی فوج کا مددگار اور اسلامی رئیس کا مرکز قیامگاہ موتی کی لڑی کی طرح ہے کہ اگر ٹوٹ جائے تو سارے موتی بکھر جائیں اور بہت سی بکھری ہوئی چیزیں اکٹھی نہیں ہوا کرتی اور آج عرب گو افرادی اعداد سے کم ہے مگر اسلام کی قوت سے بہت ہیں اور اتفاق و اتحاد کے سبب قوت غالب پس تم تو کتب بنے مرکز پر جمے رہو اور ارد گرد عرب کی چکی چلنے دو اور انہی کو لڑائی کی آگ سے نمٹنے دو خود کو اس میں نہ ڈالو اگر تم مرکز چھوڑ کر اس زمین سے نکل کھڑے ہوئے تو اس کے اطراف و جوانب سے عرب مرکز پر ٹوٹ پڑیں گے یہاں تک سرحدی خطرات جو تم اپنے پیچھے چھوڑ جاؤ گے اتنے زیادہ اہم ہوں گے جو تمہاری سامنے کی مہم کے خطرہ سے بھی زیادہ ہوں گے اور کل

1 ۔ نهج البلاغة، ومن كلام له عليه السلام (وقد استشاره عمر بن الخطاب في الشخوص لقتال الفرس بنفسه) 2/ 29، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان۔

جب عرب تم کو مرکز سے ہٹادیں گے تو کہیں گے کہ خلاصہ عرب یہی ہے اس پر قابو پاکر مٹا ڈالوگے تو آرام سے بیٹھو گے اس لیے تمہارا مرکز سے ہٹنا ان کی دلیری اور جرات کا تمہارے متعلق لالچی سوچ کا سبب ہوگا اور یہ جو تم نے کہا ہے کہ قوم عجم مسلمانوں سے لڑنے نکل پڑی ہے تو ان کا نکلنا تم سے زیادہ اللہ کو ناگوار ہوا ہے ناپسندیدہ چیز بدل دینے پر زیادہ قادر ہے اور تم نے جو کثرت تعداد کا ذکر کیا ہے تو ماضی میں ہم کثرت کی بنا پر کبھی نہیں لڑے ہم تو اللہ کی مدد و نصرت کے بھروسے اور اعتماد پر لڑا کرتے تھے۔

یہ عبارت سراسر ہدایت ہے اس سے تمام شبہات کا حل اور پوری تسکین و دلجمعی حاصل ہوتی ہے اور اللہ کے وعدہ کی سچائی ظہور پذیر ہوئی اسی سلسلہ بالا کی ایک دوسری آیت یہ ہے جو خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی صحت خلافت پر دال ہے مگر شیعہ جس کی مخالفت کرتے ہیں:

قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ إِلَى قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ فَإِنْ تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللهُ أَجْرًا حَسَنًا وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا[1]

ان اعراب سے کہو جو (حدیبیہ کے موقع پر ساتھ نہ تھے) پیچھے رہ گئے تھے کہ عنقریب تم کو ایک بڑی جنگ جو قوم سے لڑنے کے لیے دعوت دی جائے گی تم ان سے لڑو گے یا وہ (بغیر لڑے) مسلمان ہو جائیں گے پس اگر اس وقت تم نے اطاعت کی تو اللہ تعالیٰ تم کو بہت اچھا اجر عطا فرمائے گا اور اگر تم نے اس دعوت سے پہلوں کی طرح روگردانی کی تو پھر تم کو بڑا دردناک عذاب دیا جائے گا۔

یہ آیت بعض عرب قبائل مثلاً اسلم، جہینہ، مزینہ، غفار اور اشجع کے بارے میں ہے جو سفر حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب نہ تھے۔

1۔ سورۃ الفتح، الآیۃ: 16

اور دونوں فرقوں کے مورخین اس پر متفق ہیں کہ اس ایت کے نازل ہونے کے بعد حضور ﷺ کے عہد مبارک میں سوائے غزوہ تبوک کے کوئی ایسی جنگ پیش نہیں آئی جس میں تمام عرب کو دعوت قتال دی جاتی اور غزوہ تبوک تو بہر حال یہاں مراد ہے ہی نہیں اس لیے کہ اس لڑائی کے لیے یہ فرمایا گیا ہے کہ یا تو اپنے دشمنوں سے لڑو گے یا وہ اسلام لے ائیں گے اور غزوہ تبوک میں ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی وہ پذیر نہیں ہوئی نہ قتال ہوا نہ مخالفین اسلام لائے لہٰذا وہ کوئی اور ہی لڑائی ہے اس لیے اس کو کسی اور زمانہ میں تلاش کرنا چاہیے اور وہ زمانہ لا محالہ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی خلیفہ کا ہی ہو گا چنانچہ خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کہ عہد میں عرب کو قتال مرتدین کے لیے دعوت دی گئی اور اہل فارس وروم سے لڑنے کے لیے دعوت خلیفہ اول و خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں دی گئی، بہر حال خلیفہ اول کی خلافت قابل تسلیم قرار پائی اس لیے کہ ان کی دعوت کی اطاعت پر اچھے اجر کا وعدہ کیا گیا اور عدم اطاعت پر عذاب علیم کی دھمکی دی گئی اور جو واجب الاطاعت ہو وہی امام و خلیفہ ہے۔

اس آیت کے متعلق شیخ ابن مطہر حلی نے بڑی تگ ودو کے بعد ایک جواب گھڑا ہے کہ داعی آنحضرت ﷺ ہیں اور ممکن ہے کہ آپ نے دوسری لڑائیوں میں جن میں قتال نہ ہوا ہو دعوت دی ہو لیکن وہ نقل و بیان میں نہ آئی ہو، اس جواب کا لغو ولچر ہونا بالکل سامنے کی بات ہے کہ اخبار وسیع اور تواریخ میں محض احتمالات سے تمسک و استدلال عقلمندوں کا شیوہ نہیں ورنہ تو ہر بات میں احتمال نکالا جا سکتا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے غدیر خم کے بعد آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت منسوخ و موقوف کر کے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت و امامت کا حکم فرمایا ہو اور لوگوں کو اس پر اہمیت کے ساتھ تاکید کی ہو اسی طرح کے اور بھی معاملات ہو سکتے ہیں۔

اور بعض شیعہ کہتے ہیں کہ داعی حضرت امیر رضی اللہ عنہ ہیں کہ جنہوں نے عہد شکنوں بدکاروں اور مرتدین کے قتال کے لیے دعوت دی۔[1]

1۔ يعني من قاتل علي بن أبي طالب في خلافته، وخاصة أهل صفين كما نقل عن الإمامية، وبذلك صرح المازندراني في المناقب: 3/ 164؛ وقال أيضا: «المعني به أمير المؤمنين - عليه السلام - في قتال الخوارج». متشابه القرآن: 2/ 68.

یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں کہ جس کے جواب میں بہت غور و خوض کی ضرورت پڑے جواب صاف ظاہر ہے کیونکہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا قتال طلب اسلام کے لیے نہ تھا بلکہ وہ محض انتظام امامت کے لیے تھا اور عرف قدیم و جدید میں یہ کہیں منقول نہیں کہ امام کی اطاعت اسلام ہے اور اس کی مخالفت کفر ہے۔

اور اس کے علاوہ خود شیعوں نے صحیح روایات سے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں فرمایا:

إنك يا علي تقاتل على تأويل القرآن كما قاتلت على تنزيله.[1]

اے علی تم تاویل قرآن پر لڑو گے جس طرح میں اس کے نزول پر لڑا۔

اور ظاہر ہے کہ مخالفین سے تاویل قرآن پر لڑنا قبول تنزیل قرآن پر لڑنے سے بعد میں ہو اور قبول تنزیل قرآن اسلام کے بغیر متصور نہیں بلکہ وہ عین اسلام ہے گویا تاویل قرآن پر مقاتلہ اور اسلام پر مقاتلہ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے یہ بالکل ظاہر بات ہے اسی سلسلہ کی ایک اور روایت میں اللہ تعالی فرماتے ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَلِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ[2]

اے ایمان والو تم میں جو کوئی دین سے پھر جائے تو جلد ہی اللہ تعالی اس کی جگہ ایسی قوم لے آئے گا جس کو اللہ تعالی بھی پسند کرتا ہو گا اور وہ بھی اللہ سے محبت کرتے ہوں گے جو مسلمانوں سے دبنے والے ہوں گے اور کافروں کو دبانے والے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہوں گے ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہیں ڈریں گے یہ اللہ تعالی کا خاص فضل ہے وہ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ تعالی بہت وسیع علم والا ہے۔

1۔ كشف الغمة في معرفة الأئمة، 1/ 121، ط: دار الأضواء بيروت لبنان

2۔ سورة المائدة، الآية: 54

اس آیت میں ان لوگوں کی تعریف ہے جنہوں نے مرتدین سے قتال کیا ایسے بلند اوصاف سے کی ہے جن سے بالاتر اوصاف اصطلاح قرآن میں نہیں۔

پہلا وصف: ان کے درجہ قرب اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ کہ وہی اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں کرتے ہوں گے اللہ تعالیٰ کے بھی وہ محبوب ہوں گے گویا وہ محبوب الٰہی بھی ہوں گے اور محب الٰہی بھی۔

دوسرا وصف: مومنین کے ساتھ ان کا معاملہ۔

تیسرا وصف: کفار کے ساتھ ان کے رویہ اور طرز عمل۔

چوتھا وصف: منافقین اور ضعیف الایمان سے ان کا برتاؤ۔

اور ظاہر ہے کہ امام کا معاملہ یا خدا کے ساتھ ہوتا ہے یا خلق کے ساتھ اور خلق مومن ہوگی یا کافر یا منافق اور ضعیف الایمان اور جب امام چاروں معاملوں میں خدا کا پسند فرمودہ ہو اور اس کا عمل بھی راست و درست ہو تو وہی امام برحق ہے اسی لیے اخیر آیت میں اپنے فضل و رحمت کی نوید ذکر فرمائی اور یہ بات باجماع ثابت ہے کہ مرتدین کی جنگ خلیفہ اول اور آپ کے پیروکاروں سے ہوئی کیونکہ حضور ﷺ کے عہد کے آخر میں تین گروہ مرتد ہوئے۔

1۔ اسود عنسی ذوالخمار کی قوم بنی مدلج جس نے یمن میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور فیروز دیلمی کے ہاتھوں مارا گیا۔

2۔ مسیلمہ کذاب کے ساتھ ہی بنو حنیفہ مسیلمہ خلیفہ اول کے عہد میں وحشی کے ہاتھوں جہنم رسید ہوا۔

3۔ طلیحہ بن خویلد متنبی کی قوم بنو اسد حضور ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس کی سرکوبی کو بھیجا وہ ان کے ڈر سے شام بھاگ گیا آخر میں ایمان لے آیا۔

اور خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں سات گروہ مرتد ہوئے:

1۔ عینہ بن حصن کی قوم بنو فزارہ

2۔ بن سلمہ کی قوم غطفان

3۔ ابن عبد یالیل کی قوم بنو سلیم

4۔ مالک بن نویرہ کی قوم بنو یربوع

5۔ سجاح بن المنذر کی قوم بنو تمیم (یہ مسیلمہ کذاب کی زوجہ تھی اور متنبیہ)

6۔ اشعث بن کندی کی قوم بنو کندہ

7۔ بنو بکر یہ بحرین میں رہتے تھے

مرتدین کے ان تمام فرقوں کو خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے بیخ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکا اور سب کو اسلام میں واپس لائے مؤرخین کا ان واقعات پر اجماع ہے، خلیفہ دوم رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایک گروہ مرتد ہو کر نصاریٰ سے جاملا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مرتدین کے ساتھ لڑنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا اس سلسلہ میں آپ خود فرماتے ہیں:

"ابتليت بقتال اهل القبلة"[1] میں تو اہل قبلہ کے ساتھ لڑائی میں مبتلا ہو گیا۔

آپ کا یہ فرمان امامیہ نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

اور اگر امامیہ منکرین امامت کو جنہیں جناب امیر رضی اللہ عنہ اہل قبلہ فرما رہے ہیں مرتدین میں شمار کریں تو ہم کہیں گے کہ حرف قدیم وجدید میں اصل دین سے انکار کرنے والے کو مرتد کہتے ہیں اگر غلط تاویل سے کسی اسلامی عقیدہ کا منکر ہو جائے تو ایسے شخص کو مرتد کہنا عرف عام میں رائج نہیں اور قرآن کے معنیٰ کو بالاجماع لغوی عرف پر محمول کرنا چاہیے ہر قوم کے الگ الگ اصطلاحی معنوں پر نہیں۔

اور پھر عن دینکم کے لفظ کی واضح دلالت یہی بتاتی ہے کہ اصل دین اور پورے دین سے جو منکر ہو وہ مرتد ہے کسی ایک مسئلہ سے انکار پر نہیں اور خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے عہد میں مانعین زکوۃ کو جو مرتد کہا گیا تو اس لیے کہ وہ زکوۃ کے فرضیت کے منکر تھے اور جو ضروریات دین میں سے کسی ضرورت کا انکار کرے وہ گویا اصل دین کا منکر ہے اور امامت کو خود شیعہ بھی ضروریات دین میں سے نہیں مانتے جس کے انکار کی وجہ سے کوئی مرتد کہلا سکے یا کافر ہو جائے اس سلسلہ میں فاضل کاشی کا کلام بر حوالہ روایت کافی وغیرہ باب دوم میں مذکور ہو چکا اور ملا عبد اللہ مصنف اظہار الحق کی ایک تحریر جو سوال وجواب کی شکل میں اس موقع کے بہت مناسب ہے ملاحظہ فرمائیے وہ کہتا ہے کہ:

1۔ الشيعة والسنة، 1/ 12، ط: إدارة ترجمان السنة، لاهور باكستان

اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں امامیہ کے پاس کوئی صریح نص نہیں ہے تو امامیہ جھوٹے پڑھتے ہیں اگر نص صریح ہے تو پھر جن صحابہ نے مسئلہ خلافت میں مخالفت کی وہ مرتد ہوں گے اس کے جواب میں وہ رقم طراز ہے کہ نص صریح کے انکار سے کفر اس وقت لازم آتا ہے جب منصوص شدہ امر کے متعلق باطل ہونے کا اعتقاد رکھے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نص کے بارے میں تکذیب کرے لیکن اگر نص کو حق اور درست تسلیم کرے مگر دنیاوی اغراض یا حب مال وجاہ کے سبب اس کو ترک کر دے اس پر عمل نہ کرے تو یہ فسق تو ہو گا مگر کفر نہ ہو گا، مثلاً زکوۃ کی ادائیگی پر قرآن و حدیث میں حکم صریح موجود ہے اور یہ باجماع امت فرض ہے اب اگر کوئی اس کی فرضیت کا انکار کر دے تو کافر ہو گا لیکن اگر فرضیت کا اعتقاد رکھتے ہوئے مال کی محبت، طبعی بخل یا کسی ایسی ہی وجہ سے ادائیگی نہ کرے اور اپنے ذمہ اسے باقی رکھے تو یہ گنہگار ہو گا اور وہ لوگ جو خلیفہ اول کی خلافت پر متفق ہوئے یہ نہیں کہتے کہ اس پر پیغمبر نے نص فرمائی ہے لیکن یہ جھوٹ ہے بلکہ بعض اوقات بعض اشخاص نے نص کی تحقیق سے انکار کیا ہے مگر دور از کار تاویلات سے کام لے کر۔[1]

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں جو امامیہ کے نزدیک بطریق صحیح مروی ہے فرمایا ہے:

إنما أصبحنا نقاتل إخواننا في الإسلام على ما دخل فيه من الزيغ و الإعوجاج والشبهة والتأويل[2]

1۔ اگر کسی گوید کہ امامیہ را بر خلافت علی علیہ السلام نص صریح نیست پس امامیہ کاذب باشند و اگر نص صریح ہست پس مخالفت کنندگان مرتد باشند۔ جواب گوییم کہ انکار نص صریح موجب کفر آن وقت شود کہ اعتقاد بہ بطلان امر منصوص داشتہ باشد و تکذیب پیغمبر کند۔ اما اگر نص را حق داند و بسبب اغراض دنیوی یا حب جاہ و مال ترک عمل بر ان کند، آن فسق باشد نہ کفر۔ چنانکہ وجوب زکوۃ بنص صریح و اجماع امت ثابت است، اگر کسی انکار وجوب کند کافر شود و اگر اعتقاد بوجوب داشتہ باشد و بسبب بخل و حب مال ادا نکند گناہگار و فاسق باشد۔ و آنکہ گویند اجماع بر خلافت اول شدہ است، این کذب است بلکہ بعضے از صحابہ انکار نص کردہ اند اما بسبب تاویلات بعیدہ و اعراض از حق۔ (اظہار الحق فی معارف الائمہ، از عبد اللہ یزدی ، ص:531-532، قدیم بمبئی ایڈیشن)

2۔ نهج البلاغة، 1/ 236، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

ہم اپنے اسلامی بھائیوں سے اس لیے لڑ بیٹھے کہ اسلام میں کجی بے راہ روی اور شبہات و تاویلات کا عمل دخل ہونے لگا تھا۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنے سے لڑنے والوں کو سب و شتم کرنے سے منع فرمایا جیسا کہ رضی نے نہج البلاغہ میں بیان کیا ہے حالانکہ مرتدین پر دشنام منع نہیں ہے اور اگر ان سب باتوں کے علی الرغم یہ مان بھی لیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی مرتدین سے اپنی عہد میں جہاد کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر اور خلیفہ اول کے اول عہد میں جو افراد یا قبیلے مرتد ہو گئے تھے ان میں سے بھی تو کسی نے قتال کیا ہو گا تو وہ جنگ کرنے والا بھی اس تعریف و توصیف میں شریک ہوا اور مدعا ثابت ہو گیا۔

اور یہ اصولی قاعدہ طے شدہ ہے کہ جب حرف من شرط و جزا میں واقع ہوتا ہے تو اس سے عام معنی مراد ہوتے ہیں "من دخل حصن كذا فله كذا" جو کوئی اس قلعہ میں داخل ہو اس کے لیے یہ یہ ہے، میں دیکھا جاسکتا ہے لہٰذا اس آیت سے ثابت ہوا کہ جو کوئی مرتد ہو گا اس کے لیے مذکورہ اوصاف سے متصف ایک قوم پیدا ہو گی۔

خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب سلسلہ ارتداد بہت تیزی سے بڑا اس وقت ان اوصاف کی کسی قوم کا وجود تسلیم نہ کریں تو اس سے دو خرابیاں لازم آتی ایک تو یہ کہ مرتدین کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا رہتا اور دوسرے یہ کہ اس صورتحال سے وعدہ الٰہی کے خلاف بات ثابت ہو جاتی (مگر چونکہ اوصاف قرانی کی حامل قوم موجود تھی انہوں نے مرتدوں کا قلع قمع کر ڈالا اور مابقیہ کو اسلام میں لوٹا لائے) اس قوم کی تعیین میں سوال اٹھے کہ وہ کون تھی جس نے صدر اول میں مرتدین سے قتال کیا؟ تو یہ بات تو بلا شک و شبہ کہی جا سکتی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے تو ان کا مقابلہ نہیں کیا وہ اس وقت اس پوزیشن میں ہی نہیں تھے اس لیے لامحالہ یہ کارنامہ خلیفہ اول اور آپ کے پیروکاروں کے چاروں ناچار سب کو ماننا ہی پڑے گا۔

جناب امیر رضی اللہ عنہ کی اپنے لشکریوں کی شکایت اور ان پر عدم اعتماد

اس وقت ایک تو جناب امیر رضی اللہ عنہ مدافعت کی پوزیشن میں نہیں تھے دوسرے ان کے دوست ساتھی اور لشکری بھی ان صفات سے متصف نہ تھے کیونکہ ان کے متعلق جو شکایت جناب امیر رضی اللہ عنہ کو تھیں اس کی ایک جھلک آپ کو گزشتہ اوراق میں بحوالہ نہج البلاغہ ملاحظہ فرما چکے ہیں حرج نہیں کہ اس موقع پر بھی بات کو پختہ تر

کرنے کی خاطر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دیگر فرمودات جو نہج البلاغہ میں دوسرے مقامات پر مذکور ہیں پیش کر دیے جائیں یہ تو ایسی باتیں ہیں کہ ان کی تکرار سے فائدہ ہی فائدہ ہے کیونکہ مشک کو جتنی مرتبہ بھی سونگھو وہ خوشبو ہی دے گی نہج البلاغہ میں ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں دوستوں کی شکایت کرتے ہوئے کہ وہ ان کی دعوت قبول نہیں کرتے اور ان کے وعظ ونصیحت پر کان نہیں دھرتے وہ عبارات ذیل سے تفصیلاً بیان کی ہے:

أما والذي نفسي بيده ليظهرن هؤلاء القوم عليكم، ليس لأنهم أولى بالحق منكم، ولكن لإسراعهم إلى باطل صاحبهم وإبطائكم عن حقي. ولقد أصبحت الأمم تخاف ظلم رعاتها. وأصبحت أخاف ظلم رعيتي. استنفرتكم للجهاد فلم تنفروا. وأسمعتكم فلم تسمعوا، ودعوتكم سرا وجهرا فلم تستجيبوا، ونصحت لكم فلم تقبلوا. أشهود كغياب وعبيد كأرباب؟ أتلو عليكم الحكم فتنفرون منها. وأعظكم بالموعظة البالغة فتتفرقون عنها. وأحثكم على جهاد أهل البغي فما آتي على آخر القول حتى أراكم متفرقين أيادي سبا ترجعون إلى مجالسكم وتتخادعون عن مواعظكم. أقومكم غدوة وترجعون إلي عشية كظهر الحية، عجز المقوم وأعضل المقوم أيها الشاهدة أبدانهم. الغائبة عقولهم. المختلفة أهواؤهم. المبتلى بهم أمراؤهم صاحبكم يطيع الله وأنتم تعصونه. وصاحب أهل الشام يعصي الله وهم يطيعونه. لوددت والله أن معاوية صارفني بكم صرف الدينار بالدرهم فأخذ مني عشرة منكم وأعطاني رجلا منهم.(1)

خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے سن لو کہ یہ قوم مخالف تم پر ضرور غالب آ کر رہے

1 ۔ نہج البلاغة، 1/ 187، 188، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

گی اس لیے نہیں کہ وہ تم سے زیادہ حق پر ہے بلکہ اس لیے کہ وہ اپنے سردار کے غلط حکم کو بجا لانے پر ہر دم چاق و چوبند اور تند و تیز ہیں تمہاری طرح میرے احکام حق کی بجا آوری میں کم ہمت و سست اور ڈھیلے نہیں دوسری ساری قومیں تو اپنے امراء اور سرداروں کے ظلم سے ڈرتی ہیں اور میرا یہ حال ہے کہ میں اپنی ہی رعایہ کے ظلم سے خائف ہوں، میں نے تم کو جہاد کے لیے نکالنا چاہا مگر تم نہ نکلے تم کو کچھ سنانا چاہا مگر تم نے سن کے نہ دیا میں نے تم کو ڈھکے کھلے ہر طرح بلایا مگر تم نے سنا ہی نہیں میں نے تم کو کوئی نصیحت کی تو تم نے قبول نہ کی تم حاضر ہو تو مگر غائب دماغ والے ہو تو غلام مگر مالکانہ انداز کے میں تمہیں حکمت کی باتیں سناتا ہوں مگر تم فرار ہو جاتے ہو میں تم کو جہاد کی ترغیب دے رہا ہوتا ہوں اور بات ختم بھی نہیں کر پاتا کہ تم رفو چکر ہو جاتے ہو تم بھی قوم صبا کی طرح ہو کہ مجلسوں میں تو گھسے رہتے ہو مگر نصیحتوں کے ساتھ فریب بازی کرتے ہو صبح میں تم کو سیدھا کرتا ہوں مگر شام کو تم پھر سانپ کی پیٹھ کی طرح ٹیڑھے ہو جاتے ہو تم کو سیدھا کرنے والا بھی عاجز اور لاچار ہو جاتا ہے اے لوگو! جن کے جسم تو موجود ہیں مگر عقل و شعور غائب اور ان کی خواہشات اختلاف کا شکار ان کی وجہ سے ان کا امیر آزمائش میں پڑ گیا ہے تمہارا امیر تو اللہ کا مطیع ہے مگر تم امیر کے نافرمان اور اہل شام کا امیر تو اللہ کا نافرمان ہے مگر اس کی قوم اس کی مطیع خدا کی قسم میرا دل چاہتا ہے کہ دینار و درہم میں کمی بیشی کے سودے کی طرح میں معاویہ سے تمہارا سودا کر لوں کہ وہ تم میں سے دس نفر لے کر اپنا ایک پیروکار مجھے دے دے۔

اور جب آپ کے دونوں عامل و حاکم جناب عبداللہ بن عباس و جناب سعید بن عمران واپس لوٹ آئے اور آپ کو یہ خبر سنائی کہ اس علاقہ میں جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے امیر بسر بن ارطاۃ نے اس لیے تسلط و قبضہ جمالیہ کے جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے کمک نہیں پہنچی حالانکہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے حکام یمن کو پہلے ہی سے بڑی تاکید اور سختی سے لوگوں کو مدد کے احکام دے دیئے تھے مگر لشکریوں نے سنی ان سنی کر دی حتی کہ معاملہ ہاتھ سے نکل گیا اور حکام اپنا اپنا مستقر چھوڑ کر چلے آئے اس وقت آپ نے فرمایا:

أنبئت بسرا قد اطلع اليمن وإني واللهلأظن أن هؤلاء القوم سيدالون منكم باجتماعهم على باطلهم وتفرقكم عن حقكم. وبمعصيتكم إمامكم في الحق وطاعتهم إمامهم في الباطل، وبأدائهم الأمانة إلى صاحبهم وخيانتكم. و بصلاحهم في بلادهم وفسادكم. فلو ائتمنت أحدكم على قعب لخشيت أن يذهب بعلاقته. اللهم إني قد مللتهم وملوني وسئمتهم وسئموني فأبدلني بهم خيرا منهم وأبدلهم بي شرا مني. اللهم مث قلوبهم كما يماث الملح في الماء. أما والله لوددت أن لي بكم ألف فارس من بني فراس بن غنم.(1)

مجھے خبر ملی ہے کہ بسر یمن پر مسلط ہو گیا ہے خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ یہ قوم تم پر فتح یاب ہو گی کیونکہ وہ باطل پر ہوتے ہوئے بھی متحد ہیں اور تم حق پر بھی منتشر اور بکھرے ہو اور تم اپنے امام کی حق بات بھی نہیں مانتے اور نافرمانی کرتے ہو مگر وہ ناحق بات میں بھی اپنے امام کی تابعداری کرتے ہیں اور اپنے سردار کے نیک خواہ ہیں اور تم خیانت کا برتاؤ کرتے ہو وہ شہروں میں امن پھیلاتے ہیں اور تم فساد اگر میں تم سے کسی کے پاس کوئی پیالہ امانت رکھوں تو مجھے ڈر ہے وہ اس کا کنڈا ہی نہ لے جائے اے میرے اللہ ہمیں ان سے بتایا گیا ہے میں ان سے سوال ہو گیا تو مجھے ان سے بہتر ہ کار عطا فرما اور ان کو مجھ سے بدتر عبور اے اللہ تو ان کو اس طرح گھلا جس طرح نمک پانی میں گھومتا ہو خدا کی قسم میں یہ تمنا کرتا ہوں کہ تمہارے بدلے میرے پاس بنی فراس بن غنم کے صرف ایک ہزار سوار ہوتے تو ان کو بلائے وہ کف اچھالتی موجوں کی طرح فوراً حاضر ہو جائیں۔

اور ایک دوسرے خطبہ میں جس کا کچھ حصہ پہلے باب صوم میں گزر چکا یوں فرماتے ہیں:

وأيم الله إني لأظن بكم أن لو حمس الوغى واستحر الموت قد انفرجتم

---

1 ۔ نهج البلاغة، 1 / 64، 65، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

عن ابن أبي طالب انفراج الرأس.[1]

خدا کی قسم تمہارے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ میدان کارزار میں موت کی گرم بازاری شروع ہو جائے تو تم ابن ابی طالب سے اس طرح الگ ہو جاؤ گے جس طرح سر سے بال۔

پھر ایک دوسرے خطبہ میں فرماتے ہیں:

أحمد الله على ما قضى من أمر وقدر من فعل، وعلى ابتلائي بكم أيها الفرقة التي إذا أمرت لم تطع، وإذا دعوت لم تجب ثم قال بعد كلام: وإني لصحبتكم قالٍ وبكم غير كثير ...[2]

اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ فرمایا اور جو کام اس نے مقدر فرمایا میں اس پر اس کی حمد و ثنا کرتا ہوں اور اس پر بھی کہ اس نے مجھ کو تمہارے ساتھ مبتلا کیا اے لوگو جب میں تم کو حکم دیتا ہوں تو تم اس کو نہیں مانتے اور جب بلاتا ہو تو آتے نہیں اور باتیں فرما کر فرمایا بے شک میں تم سے بیزار ہوں اور تمہارے ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تنہا سمجھتا ہوں۔

اور جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر نے شہر انبار کو تہس نہس کر دیا ہے تو خود بنفس نفیس مکان سے نکل کر موضع نخیلہ تک جا پہنچے جو شہر کوفہ سے باہر تھا آپ کے پیچھے کچھ دوست بھی دوڑے آئے اور کہنے لگے آپ کے بدلے ہم کافی ہیں تو آپ نے فرمایا خدا کی قسم تم تو اپنی جانوں کو ہی نہیں سنبھال سکتے دوسرے کے لیے تم کیا کافی ہو گے؟ کوئی رعایا اگر اپنے حاکم سے شاکی ہے تو میں اپنی رعایہ سے نالاں ہوں گویا میں تو ان کا تابع ہوں اور وہ میرے امیر، اور میں تو متعین شدہ ہوں اور وہ میری تعیین کرنے والے تب آپ کے دوستوں کے گروہ میں سے دو افراد آگے بڑھے اور عرض کیا اے امیر مومنین! میں اپنے اور اپنے بھائی کی جانوں کا مختار و ذمہ دار ہوں آپ حکم دیجیے ہم بسر و چشم اس کی تعمیل کریں گے آپ نے فرمایا میرے مقصد

1۔ نهج البلاغة، 1/ 83 ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

2۔ نهج البلاغة، 2/ 100، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

کے لیے تم دونوں کیا کام آؤ گے؟[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قسم کے بیانات وخطابات بہت ہیں جو سب کے سب نہج البلاغہ کے حاشیہ پر درج ہیں یہ کتاب شیعوں کے ہاں بڑی معتبر اور اصح الکتب اور متواتر شمار ہوتی ہے اس کے مندرجات سے کسی شیعہ کو انکار کی مجال نہیں، اس بیان صادق سے صاف صاف عیاں ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے مرتدین سے لڑنے والوں کے جو اوصاف بیان کیے ہیں حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے لشکریوں میں ان کا موجود ہونا تو دور کی بات ہے ان کو تو اس کی ہوا بھی معلوم ہوتا ہے نہیں لگی تھی وہ خائن تھے اور چور بھی جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ"[2] اور پھر وہ فساد پیشہ بھی تھے جن کے لیے ارشاد باری ہے "إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ"[3] اور انہوں نے الامر کی اطاعت بھی نہیں کی جو خدا کا محب محبوب ہونے کا ذریعہ ہے:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللهُ[4]

اللہ سے دوستی کا ادعا ہے تو میری اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم کو اپنا دوست بنا لے گا۔

اسی طرح وہ " يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ" کے تحت نہ آ سکے نہ اس کا مصداق بن سکے (وہ جناب امیر کی اطاعت بجائے جناب امیر پر ازراہ تکبر و سرکشی حکم چلاتے تھے آپ کو ایذاء اور صدمات پہنچاتے اس طرح تو وہ مرتدین کے بجائے) مومنین بلکہ امیر المومنین پر غلبہ کرنے والے ہوئے اور چونکہ باغیوں اور خارجیوں سے خوفزدہ اور ڈرتے تھے تو "اذلة علي الكافرين" کافروں سے دبنے والے ہوئے جہاد سے جان چھڑانے کے

1۔ وقال عليه السلام (لما بلغه إغارة أصحاب معاوية على الأنبار فخرج بنفسه ماشيا حتى أتى النخيلة (2) فأدركه الناس وقالوا يا أمير المؤمنين نحن نكفيكهم) فقال عليه السلام: والله ما تكفونني أنفسكم فكيف تكفونني غيركم.(نهج البلاغة، 4/ 62، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان)

2۔ سورة الانفال ، الاية: 58

3۔ سورة القصص ، الاية: 77

4۔ سورة ال عمران ، الاية: 31

باعث " يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ " سے دور جا پڑے اور بجائے " وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ "[1] کے لا یسمعون نصیحة ناصح ناصح کی نصیحت نہیں سنتے تھے کہ عبارت ان کے حال کی زیادہ ترجمانی کرتی ہے کیونکہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی نصیحت پر کوئی ہی نہ دھرتے تھے۔ الغرض وہ اوصاف جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں بیان فرمائے ہیں ان کا جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لشکریوں پر جذبہ ہونا ناممکن اور محال ہے کیونکہ دو ضدین ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔

پھر آیت کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کی جدوجہد سے ارتداد کا فتنہ ختم ہو جائے گا اور دین اصلاح پذیر ہو جائے گا اس لیے کہ سلسلہ کلام مومنین کی تسلی اور تقویت کے لیے ہے اور ان کے دلوں سے مرتدین کا خوف نکالنا ہے اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کی لڑائیاں نہ تو اصلاح کا سبب بنیں نہ ان کو غلبہ حاصل ہو سکا اور باغیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا اور فساد نے دین کی جڑ پکڑ لی۔

پس ثابت ہو گیا کہ کتاب اللہ کی مذکورہ بالا تینوں آیات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت و امامت کی واضح گواہ ہیں اور اپنے اندر وہ قیود و امتیازات رکھتی ہیں کہ بلحاظ اصول عقلیہ کسی غیر کا احتمال نہیں چھوڑتیں اور اگر عقلی فوائد سے ہٹ کر کوئی شیعہ عالم انجان بنتے ہوئے کوئی دور از کار احتمال ذکر کرے تو وہ احتمال اس لیے لائق جواب اور قابل توجہ نہیں کہ ہمارا روئے سخن اور خطاب اہل عقل و دانش سے ہے وہم پرست اور انجانوں کی طرف نہیں۔

اب جس کسی کو ان تمام استدلالات کی تفصیل درکار ہو اور اس بحث کی تکمیل مدنظر اور دوسری آیات سے جو اسی ذیل میں وارد ہیں استدلات کر کے بحث کا تمام اطراف و جوانب سے احاطہ کرنا چاہتا ہو تو اسے کتاب "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ اس میں یہ موضوع حد اتمام و تکمیل تک پہنچا ہوا ہے اور کتاب اللہ کے ظاہر و باطن معنی کو واشگاف کیا گیا ہے اس کے مصنف تمام امت کی طرف سے قابل اعداد ہیں اور چونکہ یہاں اصل مقصد یہ ہے کہ ہر اصولی اور فروعی مسئلہ میں شیعوں نے جو مخالفت کی ہے اس کی تردید ثقلین سے واضح و آشکارہ کی جائے اور اس کے ثبوت کے لیے کتاب اللہ کی ایک آیت ہو یا صدہا آیات باعتبار شہادت و

---

1 ـ سورة المائدة، الآية: 54

گواہی یکساں اور برابر ہیں، اس لیے طوالت کلام اور درازی بیان سے بچتے ہوئے جو بیان ہو چکا اسی پر اکتفا کی جاتی ہے اور اس سلسلہ میں بطریق اہل سنت عترت کے اقوال بے حد و شمار منقول ہیں ان کی تفصیل بھی ازالہ الخفاء میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے البتہ ہم نے اس کتاب میں چونکہ اہتمام کیا ہے اور پابندی برتی ہے کہ کسی بھی معاملہ میں سوائے شیعوں کی روایات کے کوئی دلیل نہیں پیش کرتے اس لیے یہاں بھی انہی کی روایات اور صحیح کتب کے حوالے سے عترت رسول کے وہ اقوال نقل کرتے ہیں جن کو انہوں نے معتبر سمجھ کر درج کیا ہے۔

اقوال عترت سے خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کا ثبوت

ان میں سے ایک روایت یہ ہے جس کو رضی بحوالہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نہج البلاغہ میں بیان کرتا ہے کہ آپ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھا جس میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

أما بعد فإن بيعتي يا معاوية لزمتك وأنت بالشام، فإنه بايعني القوم الذين بايعوا أبا بكر وعمر وعثمان، وعلى ما بايعوهم عليه، فلم يكن للشاهد أن يختار ولا للغائب أن يرد، وإنما الشورى للمهاجرين والأنصار، فإن اجتمعوا على رجل وسموه إماما كان ذلك لله رضا، فإن خرج منهم خارج بطعن أو بدعة ردوه إلى ما خرج منه فإن أبى قاتلوه على اتباعه غير سبيل المؤمنين، وولاه الله ما تولى. وصلاه جهنم وساءت مصيرا[1]

بعد حمد وصلاۃ: اے معاویہ! تم پر میری بیعت لازم ہوگئی گو کہ تم شام میں مقیم ہو کیونکہ مجھ سے ان لوگوں نے بیعت کی ہے جنہوں نے ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم سے بیعت کی تھی اور اسی شرط پر مجھ سے بیعت کی ہے جس پر انہوں نے ان تینوں سے بیعت کی تھی اور جو موجود ہیں ان کو تو اس میں اختیار کی اور جو غیر حاضر ہیں ان کو انکار کی کوئی مجال نہیں رہی البتہ مشورہ کا حق

---

1 ۔ نهج البلاغة (بشرح ابن أبي الحديد): 12/ 3؛ تاريخ دمشق: 59/ 128.

مہاجرین وانصار کو حاصل ہے یہ اگر کسی آدمی پر متفق الرائے ہو کر اسے امام تسلیم کریں تو وہ اللہ کے نزدیک بھی پسندیدہ ہوگا پس اگر کسی طعن یا بدعت کے سبب کوئی اختلاف کرنے والا اس سے اختلاف کر بیٹھے تو اس کو اس کی طرف لوٹالاؤ جس سے وہ جدا ہوا ہے اگر نہ آئے تو اس سے جنگ کرو کیونکہ اس نے مومنین کے خلاف راستہ اختیار کر لیا ہے اللہ اسے وہاں پہنچائے جہاں سے وہ لوٹا ہے اور داخل کرے اسے جہنم میں اور واپسی کا وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

اب قابل غور و توجہ یہ بات ہے کہ ایسی پاک صاف اور واضح تحریر کو جو امام معصوم کے قلم سے نکلی علماء امامیہ اس کی کھینچ تان میں لگ پڑے وہ کہتے ہیں کہ یہ تحریر ایک الزامی دلیل ہے جس کو اصطلاحاً مجارات قسم کہتے ہیں اور یہ دلیل ان مقدمات سے مرکب ہوتی ہے جن کو فریق مخالف بھی تسلیم کرتا ہے استدلال کرنے والا ان مقدمات کو تسلیم نہ کرتا ہو، اب ذرا اس دور از کار تاویل بلکہ تحریف اور بلکہ تکذیب اور نظر غور فکر ڈال لینی چاہیے:

اول تو معصوم کے کلام کو خلاف واقعہ معنی پر محمول کرنا جو خلاف عقل ہے پھر کلام کے تا کہ وہ علیہ کو نظر انداز کرنا بھی ہے کہ اگر جناب امیر رضی اللہ عنہ کو صرف الزام دینا ہی مقصود ہوتا تو وہ بیعت کی حد تک کافی تھا اس سے آگے کی عبارت " فإن اجتمعوا " کو الزام سے کوئی تعلق نہیں اور امام معصوم نے بے فائدہ جھوٹ اپنی زبان پر لانا کیسے گوارا کر سکتا ہے، پھر وہ جھوٹ بھی خدا پر بالفاظ "کان ذلك لله رضا" اور وہ بھی تاکید و تکرار کے ساتھ! العیاذ باللہ

اور اگر ان باتوں سے قطع نظر بھی کر لیں تو الزامی دلیل کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے مقدمات کو فریق مخالف بھی تسلیم کرے ورنہ وہ تو الزامی دلیل نہیں رہے گی اور یہاں جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ مقدمات کب اور کس موقع پر تسلیم کیے تھے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کو ان پر الزام رکھنے کے لیے ان مقدمات کی ترتیب دینے اور تسلیم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، بہر حال جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خط کے جواب میں جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو لکھا جو امامیہ اور زیدیہ کی کتابوں میں درج ہے اس سے ان کا جو مذہب اور مسلک بابت خلافت میں امامت معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر قریشی مسلمان خواہ مہاجرین اولین میں سے ہو یا بعد والوں میں سے ہو وہ اگر احکام نافذ کرنے پر قادر، کفار سے جہاد، ریاست کے انتظام و انصرام، تیاری لشکر، حلقہ اسلام کی دیکھ بھال، سرحدوں کی حفاظت اور فسادات کو فرو کرنے پر متمکن و قادر ہو اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس سے بیعت کر

لے خواہ وہ عراقی ہوں خواہ شامی یا اہل مدینہ تو وہ شخص امام ہے چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

اسی نظریے کے تحت وہ اپنی امارت کا دعویٰ کرتے تھے وہ اس بات کے مدعی نہیں تھے کہ ان کو مہاجرین وانصار میں سے کسی نے چنا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اتباع سے گریز اور ان کی امامت سے انکار کا سبب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور ان کے قاتلین کی حمایت کے الزام ہیں جو ان کے نزدیک فساد فی الارض کے مترادف تھے اصلاح احوال کے نہیں اور وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فسادات کے رفع دفع کرنے حدود اسلام کی حفاظت کرنے اور حکم قصاص کے نافذ کرنے پر جو بلند مرتبہ قدر شرعی احکام ہیں قادر نہیں سمجھتے تھے اور مہاجرین وانصار کی بیعت بھی ان کے علم میں تھی اگر وہ اس کو ذرہ برابر وقعت دیتے تو اپنی مجالس اور خطوط میں ان کی برائیوں کو آشکارانہ کرتے بلکہ وہ تو اس کے ساتھ یہ بھی کہتے تھے کہ مہاجرین وانصار نے بیعت کرکے غلطی کی ہے۔

یہی ان کا مذہب معروف اور مسلک مشہور ہے اسی بنا پر وہ اپنے زمانہ امارت میں بار بار انصار کی شکایت کرتے رہے اور طنز وتعریض بھی ان کے مقابلہ میں مہاجرین وانصار کی بیعت کا ذکر کرنا دلیل تحقیقی سے جو مقدمات خفیہ سے مرکب ہوتی ہے چاہے وہ مقدمات فریق ثانی کو تسلیم ہوں یا نہ ہوں لہذا علماء امامیہ کی یہ تاویل صحیح نہیں کہ یہ الزامی دلیل ہے۔

منجملہ اقوال عترت کے ایک قول یہ ہے جس کو رضی ہی نے اپنی کتاب نہج البلاغہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے مگر طبعی مقتضیٰ اور اپنے مذہب کے پاس کی خاطر بس اتنی سی تحریف کر دی ہے کہ جناب امیر نے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا نام لیا تھا مگر اپنے وہاں فلاں بنا دیا تاکہ اہل سنت اس سے استدلال نہ کرلیں مگر اس کو بھول گیا کہ بعض اوقات اشارہ کنایہ تصریح سے بھی زیادہ بلیغ ہوتا ہے اور وہی بات یہاں بھی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے اس بیان میں جو اوصاف بیان ہوئے وہ بذات خود اسی شخصیت کی طرف پکار پکار کر اشارہ کر رہے ہیں جس کو رضی نے فلاں کے پردہ میں روپوش کرنا چاہا تھا ملاحظہ فرمائیے:

لله بلاد أبي بكر لقد قوم الأود، وداوى العلل، وأقام السنة، وخلّف البدعة، وذهب نقي الثوب قليل العيب، أصاب خيرها واتقى شرها، أدى لله طاعة واتقاه بحقه،

رحل و ترکھم في طریق متشعبة لا یهتدي فیها الضال، ولا یستیقن المهتدي[1]

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا (ابو بکر) فلاں قابل تعریف ہیں کہ کجی کو سیدھا کیا اور راہوں کو ہموار، سنت قائم کی بدعت کو ملیامیٹ کیا وہ پاک دامن تھے کم عیب والے خلافت کی بھلائی حاصل کر لی اور برائی سے آگے بڑھ گئے اللہ کی اطاعت کی اور کما حقہ پرہیز گاری برتی خود تو چل بسے مگر دوسروں کو دوراہے پر چھوڑ گئے نہ گمراہ کو راستہ ملتا ہے نہ راہ یاب کو یقین۔

اب نہج البلاغہ کے شارحین امامیہ اس بات میں مختلف رائے ہیں کہ فلاں سے مراد کون ہے بعض نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام لیا اور بعض نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مگر اکثریت قول اول کے مؤید ہے اور یہی صحیح و ظاہر ہے اس عبارت سراپا ہدایت و بشارت میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دس بڑے اوصاف سے متصف فرمایا ہے اور اس کو قسم کھا کر پختہ اور مؤکد کیا ہے:

1۔ سنت کو قائم کرنا 2۔ بدعت سے بچنا 3۔ حسن تدبیر سے فتنوں کا قلع قمع 4۔ دنیا سے پاکدامن جانا 5۔ عیوب کی کمی 6۔ امامت و خلافت کا مقصد اصل 7۔ عدل 8۔ اور ترویج دین الٰہی کا ان کے ذریعہ انجام پانا 9۔ طاعت الٰہی بجالانا 10۔ آخر عمر تک تقویٰ و دینداری پر قائم رہنا

اور اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں جس نوعیت کی امامت و خلافت بشہادت جناب امیر رضی اللہ عنہ وقوع پذیر ہوئی اگر اس کو معراج خلافت و امامت کہیں تو بے جا نہیں۔

اور یہ مقام ہے جہاں شیعہ حضرات کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور ساری چوکڑیاں بھول جاتے ہیں گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں ایسی رکیک اور نازیبا تاویلات کا سہارا لے کر خفت دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا نہ ذکر کرنا ہی بھلا ہے ہاں جن توجیہات میں کچھ معقولیت فہم و شعور کی کوئی رمق ہو ان میں سے چند اپنے ناظرین کے لیے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ بھی اس فرقہ کے دانشمندوں کی قوت فکر و فہم کا اندازہ لگالیں۔

ایک توجیہ یہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کبھی کبھی حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی تعریف

1۔ نهج البلاغة (بشرح ابن أبي الحديد): 12/ 223.

اور خوبیاں محض اس لیے بیان کر دیا کرتے تھے کہ لوگوں کی دل جوئی ہو جائے اور رعایا میں سے جو طبقہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی سیرت حسنہ پر دلدادگی کی حد تک فریفتہ تھا اور اس بات کا معتقد تھا کہ امور دین کے انتظام میں ان حضرات کا عہد مبارک زریں دور تھا ان کو اپنی طرف مائل کر لیں چنانچہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق جناب امیر رضی اللہ عنہ کا یہ بیان اسی نوعیت کا ہے۔

لیکن ہر انصاف پسند صاحب عقل و شعور سے یہ بات پوشیدہ نہ ہو گی کہ کیا حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کی شان ان کے نزدیک بس یہی ہے کہ آپ نے دس اوصاف قسم کھا کر جو بیان کیے ہیں ان کو آپ لوگ جھوٹا قرار دیں اور وہ بھی صرف دنیا کے حقیر لالچ کی خاطر کے چند لوگوں کی دل جوئی ہو جائے ادھر سے ٹوٹ کر کچھ لوگ ادھر کو آجائیں تاکہ ان کے ذریعے انتظام ریاست درست ہو جائے حالانکہ اس کا بھی کوئی یقین نہیں تھا بلکہ اس سے تو ایک حد تک ساتھیوں کے طرز عمل کی وجہ سے مایوسی ہو چکی تھی اتنی معمولی باتوں کی خاطر اور حقیر دنیا کے لالچ میں زمانہ سازی اور دروغ گوئی کا الزام آپ کے شیعہ اور ساتھی لگائیں تو لگائیں اہل سنت تو ایسی باتوں کے تصور سے بھی ہزار بار اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔

اور اسی کے ساتھ یہ عقل سے پیدل یہ نہیں سوچتے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کو کہاں کھینچے لے جا رہے ہیں اس توجیہ و تاویل سے تو دین کی غرض وغایت ہی ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے کہ اس قسم کی مدح سرائی کرنا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح نافرمانی پر اتر آئے ہوں اور ارتداد کی حد تک پہنچ چکے ہوں اور کتاب اللہ کی تعریف کی ہو اور دین خدا کو بدل ڈالا ہو کہاں تک جائز ہے حالانکہ انہوں نے یہ حدیث صحیح ضرور سنی ہو گی:

"إذا مدح الفاسق غضب الرب"[1]

جب فاسق کی تعریف کی جائے تو اللہ تعالی کا غضب ٹوٹ پڑتا ہے۔

لہذا یہ سب کچھ دین و دیانت اور عقل و فراست سے کتنی بعید بات ہے جو یہ نادان دوست جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر رہے ہیں آخر ایسی کون سی ضرورت تھی جس کی وجہ سے اتنی تاکیدات مبالغے اور

1۔ أخرجه البيهقي في شعب الإيمان عن أنس: 3/ 230، رقم: 4544، ط: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض

سخت قسموں سے کام لیا گیا اور اگر ان کی مداح و تعریف کا مقصد اتنا ہی تھا کہ ایک آسان ترین مصلحت سے امور خلافت حسن انتظام سے انجام پا سکیں تو پھر ان دس جھوٹ بصورت توصیف و تعریف بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی اس کے لیے تو اتنا کہنا بھی کافی ہو سکتا تھا:

لله بلاد فلان قد جاهد الكفر والمرتدين، وشاع بسعيه الإسلام، وقام عماد المسلمين، ووضع الجزية، وبنى المساجد، ولم تقع في خلافته فتنة ولا بقي فيها معاند.

صرف اللہ ہی کے لیے تعریف ہے فلاں شہروں کی البتہ جہاد کیا اس نے کافروں و مرتدوں سے اور اس کی کوشش سے شہروں میں اسلام پھیل گیا اس نے جزیہ مقرر کیا مساجد بنوائیں اور اس کے خلافت میں کوئی فتنہ رونما نہ ہوا۔

یا اس جیسی کوئی اور عبارت! پھر یہ مضامین جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کی عبارت میں درج ہیں اور آپ کے دوسرے مضامین میں زمین و آسمان کا فرق ہے ایک معصوم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ باطل و ناحق کو اتنا سراہے اور اپنے بیان میں اپنے متبعین کو گمراہ کرے اور کافروں اور فاجروں کی تعریف کرے اور ان کی اصلاح باطن اور قرب مدارج کا حکم لگا کر اپنے اوپر الزام لگائے جانے کا سبب بنے بلکہ ہاں جناب رضی اللہ عنہ کو تو یہ چاہیے تھا واجب تھا کہ ایسی جماعت کے عیوب اور برائیاں تفصیل وار منظر عام پر لاتے تا کہ لوگ ان کی اقتدا اور ان کے ساتھ حسن ظن رکھنے سے باز رہتے اور گمراہی کے بھنور میں نہ پھنس جاتے بمطابق حدیث صحیح:

اذكروا الفاجر بما فيه يحذره الناس (1)

فاسق کا کچا چٹھا کھولو کہ لوگ اس سے دور بھاگیں۔

اگر اسی قسم کی حقیر و معمولی دنیاوی اغراض ان پاک طینت حضرات کی نظر میں کوئی وقعت اور قدر و قیمت رکھتی تو پھر جھوٹے مکر پیشہ اور دنیا طلب لوگوں میں جو ریاست و سیادت کی تمام میں اس قسم کے نازیبا امور کے

أخرجه البيهقي في السنن الكبرى: 10/ 210، والطبراني في المعجم الكبير: 19/ 418

مرتکب ہوتے ہیں اور خوشامد اور مفسدوں کی مداح سرائی میں جو ریاست میں لگے رہتے ہیں اور ان پاک باز حضرات میں فرق ہی کیا رہ جاتا، خدا جناب امیر کے پاک دامن کو ان نجس و ناپاک دھبوں سے پاک صاف اور بچائے رکھے جو یہ نادان دوست غلط سلط تاویلات و توجیحات کے ذریعے ان پر لگانے کے لیے ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

اور بعض دوسرے عقلمندوں نے کہا ہے کہ اس عبارت سے آپ کا ارشاد کسی اور صحابی کی طرف تھا اور جو حضور ﷺ کی موجودگی میں ہی فوت ہو گئے اور فتنہ رونما ہونے سے پیشتر ہی جہان سے سدھار گئے تھے راوندی [1] نے اسی قول کو پسند کیا اور اسی کو اختیار بھی کیا ہے واقعی ان لوگوں کی عقل و دانش پر قربان ہو جانا چاہیے جوبات کی خدا کی قسم لاجواب کی یہ لوگ تو آنکھ بند کر کے جو منہ میں آتا ہے کہہ جاتے ہیں مگر جس کو اللہ تعالی کی طرف سے دانش و بینش اور عقل و شعور سے کچھ حصہ ملا ہے اسے تو بہر حال کوئی بات قبول یا رد کرنے میں غور و فکر ہی سے کام لینا چاہیے اور اسی لیے ہم یہ دیکھیں گے کہ اوصاف مذکورہ دربیان جناب امیر رضی اللہ عنہ شخص مذکورہ پر منطبق ہوتے بھی ہیں یا نہیں؟

اول تو یہ کہ حضور اکرم ﷺ کے عین حیات نزول وحی کا سلسلہ جاری تھا آپ موجود تھے تو اعمال کی نہ ہمواری کجی کی درستی اور سنت کا قیام یہ آپ کے علاوہ دوسرا کوئی کس استحقاق کی بنا پر کرتا، کیوں کرتا اور اگر کرتا تو گمنام اور بے نشان کیوں رہتا کسی کو اس کا نام و نشان کیوں معلوم نہیں ہوا اور کون عقلمند یہ بات باور کر لے گا کہ حضرت ﷺ کی موجودگی میں ایک شخص مرے اور لوگوں کو مختلف اطراف میں پھٹنے والے چوراہے پر چھوڑ جائے جو گمراہوں کی حیرانی کا باعث ہو تو اہل ہدایت کے لیے طلب یقین کا حالانکہ پیغمبر ﷺ بنفس نفیس موجود ہیں وحی کا نزول جاری ہے فیض الہی دم بدم دین کی تکمیل اور نعمت کے اتمام میں شد و مد سے مصروف کار۔

اور بعض امامیہ نے کہا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی غرض اس بیان سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر تعریض کرنا ہے اور اس بات پر سرزنش کہ وہ شیخین رضی اللہ عنہما کی سیرت پر نہ چلے اور ان کے زمانہ میں فتنہ و فساد پیدا ہوا یہ توجیہ و تاویل پچھلی دو توجیہات سے بھی زیادہ لچر و لغو ہیں۔

1۔ قال عنه الذهبي: «الملحد عدو الله ... كان يلازم الرافضة والملاحدة»، مات سنة 245هـ. وفيات الأعيان: 1/ 94؛ سير أعلام النبلاء: 14/ 59.

اول تو اس وجہ سے کہ اگر تعریض ہی مقصود تھی تو اس سے بہتر عبارت سے بھی ہو سکتی تھی یہ اس قسم کے جھوٹ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی دوسرے یہ کہ سیرت شیخین رضی اللہ عنہما اگر پسندیدہ ہے تو ان کی خلافت برحق ثابت ہوگئی اور اگر پسندیدہ نہیں تھی تو جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو اس کے ترک پر سرزنش کیوں ہو رہی ہے، تیسرے اس عبارت سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شیخین رضی اللہ عنہما سے مخالفت ہرگز ظاہر نہیں ہوتی نہ ظاہراً نہ اشارتاً پھر یہ کہ عبارات کوفہ کے خطبوں میں اس وقت بیان ہو رہی ہیں جب نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ موجود تھے نہ ان کا فساد و فتنہ بلکہ ظاہر میں اپنے زمانہ میں امور خلافت کے پورے طور پر سرانجام نہ پانے پر حسرت و افسوس ہے اس خیال کے پیش نظر کے خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کی تدبیر تقدیر کے موافق رہی کہ سارے کام پوری آسانی سے بے کھٹکے ظہور پذیر ہوتے رہے اور پھر اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ڈانٹ ڈپٹ ہی مقصود تھی تو لاگ لپیٹ کے بغیر صاف صاف یوں کیوں نہ فرمایا کہ انہوں نے ایسا ایسا کیا اور ایسا ایسا نہ کرنا چاہیے تھا۔

اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی توبیخ سے اگر کوئی خطرہ تھا تو وہ اہل شام ہی سے تھا کیونکہ وہی اپنے آپ کو ان کا مددگار کہتے تھے وہ خطرہ توبہ سے خود ہی بڑھ جاتا تھا اور پھر جب اہل شام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی نسبت یقینی طور پر جناب رضی اللہ عنہ کی طرف کرتے تھے تو خطرہ کی کوئی بات ہی نہ تھی بمصداق اس مثل کے کہ میں تو ڈوبا ہوا ہوں مجھے تری کا کیا ڈر!

اقوال عترت کے من جملہ ایک وہ قول بھی ہے جس کو امامیہ نے جناب ابی محمد حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی تفسیر میں نقل کیا ہے:

انه قال عن النبي صلي الله عليه وسلم: لما بعث الله عز وجل موسى بن عمران عليه السلام واصطفاه نجيا وفلق له البحر ونجى بني إسرائيل وأعطاه التوراة والألواح رأى مكانه من ربه عز وجل فقال: يا رب لقد أكرمتني بكرامة لم تكرم بها أحدا قبلي، فقال الله جل جلاله: يا موسى أما علمت أن محمدا أفضل عندي من جميع ملائكتي وجميع خلقي؟ قال موسى: يا رب فإن كان محمد أكرم عندك من جميع خلقك فهل في آل الأنبياء أكرم من آلي؟ قال الله

جل جلاله: يا موسى أما علمت أن فضل آل محمد على جميع آل النبيين كفضل محمد على جميع المرسلين؟ فقال موسى: يا رب فإن كان آل محمد كذلك فهل في أصحاب الأنبياء أكرم عندك من صحابتي؟ قال الله: يا موسى أما علمت أن فضل صحابة محمد على جميع صحابة المرسلين كفضل آل محمد على جميع آل النبيين وفضل محمد على جميع المرسلين؟ فقال موسى: يا رب فإن كان محمد وأصحابه كما وصفت فهل في أمم الأنبياء أفضل عندك من أمتي؟ ظللت عليهم الغمام وأنزلت عليهم المن والسلوى وفلقت لهم البحر. فقال الله جل جلاله: يا موسى أما علمت أن فضل أمة محمد على جميع الأمم كفضلي على جميع خلقي[1]

انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی کہ جب اللہ تعالی نے موسی علیہ السلام کو مبعوث فرما کر اپنی ہم کلامی کے لیے انتخاب فرمایا ان کے لیے دریا میں راستے کھول دیے بنی اسرائیل کو نجات بخشی اور تختیوں کی شکل میں تورات عنایت فرمائی اور انہوں نے اپنے رب سے اپنا قرب جان لیا تو عرض کی کہ اے میرے رب تو نے مجھے وہ عزت بخشی جو مجھ سے پہلے کسی کو نہ بخشی تو کیا تیرے انبیاء میں ایسا ہے جو مجھ سے زیادہ باعزت ہو تو اللہ تعالی نے فرمایا اے موسی کیا تم کو معلوم نہیں کہ محمد میرے نزدیک تمام مخلوقات سے زیادہ افضل ہیں حضرت موسی نے کہا کہ اگر محمد تیرے نزدیک تمام مخلوقات سے افضل ہیں تو کیا انبیاء کی اولاد میں کوئی ایسا ہے جو میری اولاد سے زیادہ بزرگ ہو تو اللہ تعالی نے فرمایا تم کو پتہ نہیں کہ محمد کی اولاد تمام انبیاء کی اولاد سے بزرگ تر ہے اس پر موسی علیہ السلام بولے کہ اگر محمد کی اولاد تیرے نزدیک ایسی افضل ہے تو کیا

1 ۔ بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار، 13/ 340، 341، ط: دار إحياء التراث العربي بيروت لبنان

انبیاء کے ساتھیوں میں کوئی ایسا ہے کہ میرے ساتھیوں سے زیادہ باعزت ہو تو اللہ تعالی نے فرمایا تم کو خبر نہیں کہ محمد کے ساتھ ہی تمام رسولوں کے ساتھیوں سے افضل ہیں جیسے ان کی اولاد تمام انبیاء کی اولادوں سے موسی بولے کہ اگر محمد ان کی اولاد ان کے ساتھیوں کی فضیلت ایسی ہے جیسی آپ نے فرمائی تو انبیاء میں سے کسی کی امت ایسی ہے جو تیرے نزدیک میری امت سے افضل ہو جن پر تو نے ابر کا سایہ فرمایا ان پر من وسلوی نازل کیا اور دریا میں ان کے لیے راستے بنائے اللہ تعالی نے فرمایا اے موسی محمد کی امت کی فضیلت تمام انبیاء کی امتوں پر ایسی ہے جیسی میری ذات کی فضیلت تمام مخلوق پر۔

اب ان بزرگ امام کی اس روایت سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا دو طریقوں سے ثبوت ملتا ہے، اول اس طرح کے حضور رضی اللہ عنہ سے آپ کی مصاحبت از روئے کتاب و اجماع اہل سنت وشیعہ قطعی الثبوت ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے "إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ"[1] جبکہ انہوں نے اپنے ساتھی سے فرمایا تو غم نہ کر، اور یہاں سے صاحب سے مراد بالاجماع حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں اور پھر یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی محبت خصوصیت اور ہم رازی اس قدر مشہور زمانہ ہوئی کہ ہر خاص ساتھ ہی اور محرم راز کو بطریق ضرب المثل انہی کی صفت سے یاد کیا جاتا ہے کہ فلاں کا رفیق غار ہے لہذا ان کی افضلیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحاب پر صفت محبت میں ثابت ہو گئی کم از کم تمام انبیاء کے ساتھیوں سے تو قطعا افضل ہے اور جو انبیاء کے تمام اصحاب میں افضل ہو وہی خلافت کا امامت کے لائق ہو گا اس لیے کہ ان میں بھی تو اس لیاقت و قابلیت کے بہت سے گزرے ہیں مثلا کالب لوقا جو حضرت موسی علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے اور حضرت یوشع علیہ السلام کے بعد آپ کے خلیفہ ہوئے اور آصف بن برخیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے اور اس قابلیت کے مالک۔

اور اگر ان امور سے قطع نظر بھی کریں تو ان کے ہاتھ سے عام مسلمانوں پر ظلم چہ جائے کہ عترت رسول رضی اللہ عنہم پر یا ان کے حقوق غصب کرنا تو سرزد ہو ہی نہیں سکتا ورنہ تو پھر افضلیت کجا فضیلت بھی ہاتھ سے جاتی رہے گی۔

1۔ سورۃ التوبۃ ،الآیۃ: 40

دوم اس طرح کے جب رسول اللہ ﷺ کے صحابہ جملہ پیغمبروں کے اصحاب سے افضل قرار پائے تو اہل بیت رسول اللہ پر جور و ظلم ان کی حق تلفی اور اس عالی قبر و عالی مرتبہ خاندان کی تحقیر و اہانت وہ کس طرح کریں گے جبکہ سارے پیغمبروں کے اصحاب میں سے کسی نے ایسی حرکت کبھی نہ کی ہو اگر یہ حضرات دیگر انبیاء کے اصحاب کے ہم مرتبہ بھی ہوتے تب بھی ضروری ہوتا کہ ایسے ناشائستہ کام ان سے سرزد نہ ہوں چہ جائے کہ ان سے افضل ہوں اور پھر بھی ان سے ان امور کا ارتکاب ہو۔

اس موقع کے لحاظ سے امام فخر دین رازی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بحث بڑی دلچسپ اور ذہن نشین کرنے کے لائق ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

میرے نزدیک رافضیوں کا فرقہ عقل اور اپنے رسول کے ساتھ نیک اعتقادی میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی چیونٹی سے بھی گیا گزرا ہے کیونکہ اس چیونٹی نے تو اپنے ماتحت افراد سے یوں خطاب کیا"یا أیھا النمل ادخلوا مساکنکم لا یحطمنکم سلیمان و جنودہ وھم لا یشعرون"اے چیونٹیو! اپنے ٹھکانوں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو سلیمان اور ان کے لشکری انجانے میں تم کو روند ڈالیں۔(1)

گویا چونٹی اتنا تو سمجھتی تھی کہ فوجی اور لشکری ظلم و ستم ڈھانے میں جری بے باک اور بے دھڑک ہوتے ہیں مگر سلیمان علیہ السلام کے فوجی ان کی صحبت کی تاثیر سے اتنے مہذب ہو گئے ہیں اور نبی کی سرسری سی صحبت ان پر اس حد تک اثر انداز ہو گئی ہے کہ ایک چیونٹی پر بھی ظلم نہ کریں گے بلکہ پاؤں تلے بھی نہ روندیں گے اور یہ رافضی اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے اتنا سمجھنے سے قاصر رہے کہ سرتاج الانبیاء حضرت خاتم المرسلین ﷺ کی صحبت ہم دم سے ان کے اصحاب حاضر باش اور آپ ﷺ کے یار غار اور رفیق غم گسار پر اتنا بھی اثر نہ کیا ہو اور خیانت شرارت اور شیطنت ان سے متاڈالی ہو۔

کیا صحبت پیغمبر ﷺ سے انہوں نے منفی اثر لیا تھا اور نہ شائستہ باتوں نے دوسرے لوگوں کی نسبت ان پر

1۔ مفاتیح الغیب المعروف بالتفسیر الکبیر، 24/ 546، ط: دار إحیاء التراث العربي بیروت

زیادہ تسلط جمالیا تھا جو یہ حضور ﷺ کے نور نظر ان کے داماد اور نواسوں کو بحالت بے کسی رنج پہنچاتے ان پر ظلم ڈھاتے ان کے گھروں کو نظر آتش کرتے اور ان کو بے وسیلہ و بے قدر کرتے ان کے باغ و زمین ضبط کرتے، ان کے روزینے روکتے اور ہمیشہ ان کی ایذاء رسانی کی فکروں میں لگے رہے، تفو بر تو اے چراغ گرداں تفو!

اقوال عترت میں سے ایک اور قول وہ ہے جس کو علی بن عیسیٰ اربیلی امامی اثنا عشری نے اپنی کتاب کشف الغمہ عن معرفۃ الائمہ میں نقل کیا ہے:

أنه سُئل الإمام أبو جعفر عن حلية السيف هل تجوز؟ فقال: نعم، قد حلى أبو بكر الصديق سيفه بالفضة. فقال الراوي: أتقول هذا؟ فوثب الإمام عن مكانه فقال: نعم الصديق، نعم الصديق، فمن لم يقل له الصديق فلا صدق الله قوله في الدنيا والآخرة[1]

جناب ابو جعفر سے تلوار کے زیور کے بارے میں سوال کیا گیا کہ وہ جائز ہے یا نہیں آپ نے فرمایا جائز ہے اس لیے کہ ابو بکر صدیق نے اپنی تلوار پر چاندی جڑوائی ہوئی تھی راوی نے حیرت سے پوچھا کیا آپ ایسا کہتے ہیں (یعنی صدیق) یہ سن کر آپ اچھل پڑے اور فرمایا ہاں صدیق ہاں صدیق ہاں صدیق اور جس نے آپ کو صدیق نہ کہا اللہ اس کے قول کو دنیا و آخرت میں سچا نہ کرے۔

مذہب و دین اور قرآن کریم کے طے شدہ اصولوں کی روشنی میں انبیاء کے بعد صدیقین کا درجہ ہے اور یہ تمام امت میں افضل شمار ہوتے ہیں چنانچہ اس کے ثبوت میں آیات ذیل ملاحظہ ہوں:

فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَ الصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَئِكَ رَفِيقًا[2]

---

1 ـ كشف الغمة عن معرفة الأئمة: 2/ 148. وأخرجه من أهل السنة أبو نعيم، حلية الأولياء: 3/ 185؛ وعزاه ابن حجر الهيثمي إلى الدارقطني كما في الصواعق المحرقة: ص 79.

2 ـ سورة النساء، الآية: 69

بس یہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن پر اللہ تعالی نے انعام فرمایا وہ انعام یافتہ حضرات انبیاء صدیق شہداء اور صالحین ہیں اور یہ بہت ہی اچھے ساتھی ہیں۔

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ[1]

عیسی بن مریم اور کچھ نہیں ہیں مگر رسول اور ان کی والدہ صدیقہ ہیں۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللهِ وَرُسُلِهِ أُولَئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ وَالشُّهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ أَجْرُهُمْ [2] اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق و شہداء ہیں ان کے لیے ان کا اجر ہے۔

اس فضیلت سے قطع نظر بہت سی دیگر آیات اور احادیث سے یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ صدیق کا لقب تعریفی لقب ہے جو باعتبار مرتبہ شہید و صالح سے برتر ہے قرآن مجید میں اللہ تعالی نے یوسف علیہ السلام کو یہ لقب دیا "يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ "[3] اور خود امامیہ کی کتابوں میں مروی اور ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود اپنے لیے یہ لقب استعمال فرمایا" أنا الصديق الأكبر "میں صدیق اکبر ہوں بلکہ مستقبل میں آنے والوں کے مقابلے میں اسے اپنے اندر ہی منحصر قرار دیا" لا يقولها بعدي إلا كذاب "[4] میرے بعد وہی استعمال کرے گا جو کذاب ہوگا، یہی سبب ہے کہ ائمہ نے اپنے لیے یہ لقب استعمال نہیں کیا اور کہیں استعمال ہوا بھی ہو تو وہ حقیقی معنی میں نہیں بلکہ بطور مجاز ہوگا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے من بعدی فرمایا اس سے صاف طور پر معلوم ہے کہ آپ کے علم میں یہ بات تھی کہ اس امت میں آپ سے پہلے بھی کوئی صدیق گزر چکا

1۔ سورة المائدة ، الاية: 75

2۔ سورة الحديد، الاية: 19

3۔ سورة يوسف ، الاية: 46

4۔ بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار، 35/ 412، ط: مؤسسة الوفاء بيروت لبنان

ہے جس کا یہ لقب مشہور تھا اور اس کی صفت صدیقیت برحق اور قابل تسلیم تھی اگر کوئی یہ کہے کہ
صدیقیت پر نص اکبریت ہے کہ کوئی صدیق تو ہو سکتا ہے مگر مجھ سے اکبر نہیں ہو گا تو اس کے بعد
صدیقیت کبریٰ حضرت ابو بکر ہی کے لیے قرار پاتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ جس شخص کے لیے امام معصوم لفظ صادق استعمال فرمائے تو بجز وہ فسق تک
احتمال اس شخص صادق سے بالکل جاتا رہتا ہے ایسا نہ ہو تو امام معصوم پر دروغ گوئی کا الزام آئے گا
بات یہ ہے کہ جس کسی شخص کو ایک امام معصوم نے اس قدر شدید تاکید سے نہ صرف صدیق کہا ہو بلکہ
صدیقیت کا اعتقاد تمام مکلف مخلوق پر واجب قرار دیا ہو اور اس کا انکار کرنے والے کو بد دعا دی ہو تو ایسے شخص
کے متعلق کیا خیال اور کیا گمان کرنا چاہیے اگر ایسے شخص کی امامت و خلافت نہ مانی جائے یا ان کے متعلق یہ
عقیدہ رکھا جائے کہ انہوں نے حقدار امامت کی امامت غصب کر لی تو یہ تو ان کی صدیقیت کا انکار ہو گا اور
سے تو امام معصوم بھی بد دعا میں شریک ہو جائیں گے۔

علماء امامیہ اس روایت کی بحث سے زچ اور لاجواب ہو کر اب اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے کہ
روایت ہی سے انکار کر دیں کیونکہ اس روایت کو تقیہ پر محمول کر کے بھی پیچھا نہیں چھوٹے گا کیونکہ کشف الغمہ
کوئی نایاب کتاب نہیں جہاں کہاں دستیاب ہے اور اگر کوئی تعصب و عناد سے مجبور ہو کر کسی ایک کتاب (
ایڈیشن) سے اس روایت کو حذف بھی کر دے تو دوسرے نسخے (اور سابقہ ایڈیشن) اس کی خود تردید کر دیں گے
پیچھا چھوڑنے کی البتہ ایک صورت ہو سکتی ہے کہ چونکہ اہل سنت نے بھی اپنی کتابوں میں یہ روایت بیان کی ہے
اس لیے فرقہ امامیہ کے پرہیزگار علماء شریک روایت علماء اہل سنت کی کم مائیگی علم (یعنی اپنے مقتدیوں سے
کی) روایت سے انکار کر دیں تو ان سے یہ کچھ بعید بھی نہیں مگر یہ ذہن نشین کر لیں کہ پھر ان اصول کی
دینی اور شرعی امور میں پابندی کرنی ہو گی اور یوں ان کا کلمہ نماز اور بہت سے امور شرعیہ کا انکار کرنا ہو گا
ختم ہو جائیں گے اور ان سے متعلق ساری روایات سے دستبردار ہونا پڑے گا کیونکہ ان میں بھی اہل سنت
شریک روایت ہیں چنانچہ روایت بالا کو اہل سنت میں سے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے سالم بن ابی حفصہ سے روایت کی
ہے کہ اس نے کہا:

دخلت على ابي جعفر فقال اللهم اني اتولا ابا بكر وعمر اللهم ان كان في نفسي غير ذلك فلا نالني شفاعة محمد صلى الله عليه وسلم يوم القيامة قال سالم اراه قال ذلك من اجلي[1]

جب میں ابی جعفر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھا تو آپ نے فرمایا اے اللہ تو گواہ ہے میں ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت رکھتا ہوں اے اللہ اگر میرے دل میں اس کے علاوہ کوئی اور جذبہ یا بات ہو تو قیامت کے دن مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے محروم رکھ سالم کہتا ہے کہ میرا خیال ہے آپ نے ایسا میری وجہ سے کہا۔

تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ سالم بن ابی حفصہ شیعہ تھا اور یہ روایت بھی اس کی شیعت کو ثابت کرتی ہے اور جناب ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو سنانے کے لیے ہی یہ الفاظ فرمائے کہ ممکن ہے یہ میرے خیالات اور عقائد سن کر ہی اپنے غلط و بیکار عقیدہ اور گمان باطل سے تائب ہو جائے۔

یہ روایت یہاں اس غرض سے بیان کی گئی ہے کہ جناب امام رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں تقیہ کا احتمال نہ رہے کیونکہ یہاں ان جناب نے اس سلسلہ میں شرط و جزا ذکر کر کے اپنے خدا سے اپنے لیے کفر کی دعا فرمائی اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے بالاجماع کافر ہی محروم ہو گا اور امام معصوم کی دعا مقبول ہی ہوتی ہے اگر شرط پوری ہو جائے تو جزا پوری ہونے میں کوئی شک ہی نہیں رہتا، اب اسی امر زیر بحث پر اہل سنت کی روایات ملاحظہ فرمائیں دار قطنی نے عروہ بن عبداللہ سے روایت کی ہے:

---

1 ـ قال الذهبي في تاريخيه: أخبرنا أبو الحسن الدارقطني قال: حدثنا يعقوب بن إبراهيم البزار، قال: حدثنا الحسن بن عرفة، قال: حدثنا محمد بن فضل، عن سالم بن أبي حفصة قال: سألت أبا جعفر محمد بن علي، وابنه جعفرا عن أبي بكر، وعمر فقالا: يا سالم، تولهما وابرأ من عدوهما، فإنهما كانا إمامي هدى، وقال لي جعفر: يا سالم، أيسب الرجل جده! أبو بكر جدي، فلا نالتني شفاعة محمد صلى الله عليه وسلم يوم القيامة إن لم أكن أتولاهما، وأبرأ من عدوهما. هذا إسناد صحيح، وسالم، وابن فضيل شيعيان.(تاريخ الإسلام وَوَفيات المشاهير وَالأعلام، 3/ 828، ط: دار الغرب الإسلامي)

قال: سألت أبا جعفر محمد بن علي عن حلية السيوف؟ قال: لا بأس به، قد حلى أبو بكر الصديق، رضي الله عنه، سيفه، قال: قلت: وتقول الصديق؟ قال: نعم الصديق، فمن لم يقل له الصديق، فلا صدق الله له قولا في الدنيا والآخرة[1]

کہتا ہے کہ میں نے ابی جعفر سے تلوار کے زیور کے بارے میں پوچھا آپ نے فرمایا کوئی حرج نہیں کیونکہ ابو بکر صدیق نے اپنی تلوار پر جڑاؤ کروایا تھا میں نے آپ سے کہا آپ ان کو صدیق کہہ رہے ہیں فرمایا ہاں صدیق ہاں صدیق ہاں صدیق اور جو ان کو صدیق نہ کہے دنیا و آخرت میں اس کے قول کی کوئی تصدیق نہ کرے گا۔

اور علامہ ابن جوزی کی کتاب صفوۃ الصفوۃ میں جو روایت بیان ہوئی ہے اس میں یہ الفاظ زائد ہیں: فوثب وثبة، واستقبل القبلة[2] پس وہ اچھل پڑے اور قبلہ رخ ہو کر، لہذا یہ روایت جو کشف الغمہ کی روایت کے مطابق ہے بد دعا کو ظاہر کرتی ہے اور تقیہ کی کوئی گنجائش نہیں رکھتی اور شیعوں کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ جناب ابو جعفر اور جناب جعفر صادق رحمہ اللہ سونے کی مہروں سے مہر شدہ کتاب کی رو سے تقیہ سے روک دیئے گئے تھے اس لیے ان کی روایات کو تقیہ پر محمول نہیں کیا جا سکتا اور یہ بات ان شاء اللہ اپنے موقع پر ان کی معتبر کتابوں کے حوالہ سے بیان کی جائے گی اور دار قطنی ہی نے ایک اور روایت جناب ابی عبد اللہ ابن محمد بن صادق رحمہ اللہ کے حوالہ سے بھی بیان کی ہے جو انہوں نے اپنے والد محترم سے بیان کی ہے:

قال: جاء رجل إلى أبي فقال: أخبرني عن أبي بكر؟ قال: عن الصديق تسأل؟ قال: وتسميه الصديق؟! قال: ثكلتك أمك قد سماه صديقا من هو خير مني،

---

1 ۔ البداية والنهاية، 9/ 349 و حلية الأولياء 3 / 185 و الإمامة وأهل البيت، 3/ 35، ط: مركز الغدير للدراسات الإسلامية

2 ۔ المرجع السابق

رسول الله صلى الله عليه وسلم، والمهاجرون، والأنصار، فمن لم يسمه صديقا، فلا صدق الله قوله، اذهب فأحب أبا بكر وعمر[1]

ایک شخص میرے والد زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آکر بولا مجھے ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق کچھ بتایئے آپ نے کہا صدیق کے بارے میں وہ بولا آپ بھی انہیں صدیق کہتے ہیں آپ نے فرمایا تجھے تیری ماں روئے خدا کی قسم ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق کا لقب دیا اور مہاجرین و انصار نے ان کو صدیق نام سے پکارا اور جو ان کو صدیق نہ کہے اللہ اس کے قول کو دنیا و آخرت میں سچا نہ کرے جا اور ابو بکر و عمر سے محبت کر۔

اب جب اس مسئلہ میں واضح وصاف آیات اور عترت پاک کے غیر مبہم اقوال کے بیان سے فارغ ہو چکے تو بجائے اس کے کہ نتیجہ مرتب کرنے کے لیے مقدمات کی ترکیب یا اشکال کی ترتیب میں لکھیں جو اس مدعا پر دلالت کرتے ہیں لگے ہاتھوں بعض ایسے دلائل بھی یہاں ذکر کیے دیتے ہیں جو قرآن و سنت سے محفوظ ہیں اور ادنیٰ تامل و تفکر سے ناظر و قاری کو مقصد و مدعا تک پہنچا دیتے ہیں۔

خلافت خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے ثبوت پر قرآن و سنت اور بعض دیگر دلائل

1۔ اللہ تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی اس جماعت کو جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کے وقت موجود تھی اور امور خلافت میں آپ کی معین و مددگار تھی مختلف القابات سے سرفراز فرمایا کہیں انہیں "أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ"[2] وہی کامیاب مقام گار ہیں، فرمایا تو کہیں "رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ"[3] اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے، ایک جگہ جنت کے وعدے اور اجر عظیم کی خوشخبری کا شرف بخشا تو دوسری جگہ بلندی درجات اور اپنی رحمت و عنایت اور رضامندی کی بشارت سے خوش دل۔

1۔ سير أعلام النبلاء،4/ 395

2۔ سورة التوبة،الاية:20

3۔ سورة التوبة،الاية:100

اب بھلا کوئی یہ بتائے کہ ایسی معزز مکرم اور انعامات الہیہ کی مورد اور جنت اور رضائے الٰہی سے ...
جماعت کسی ایسی بات پر متفق ہونے کا سوچ بھی سکتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے ... مخالف ...
اس سے آپ کا عہد ٹوٹتے ہوئے ہرگز نہیں وہ تو ایسی کسی بات کا تصور تک نہیں کر سکتی جو قرآنی ... کی
تکذیب یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ادنیٰ حکم کی نافرمانی کا موجب ہے۔

2۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توصیف میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ الفاظ فرمائے "حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ"[1] تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت پیوست کر دی تمہارے دلوں کو اس سے مزین اور روشن کیا اور کفر بدکاری و بد عملی اور گناہ کی نفرت و کراہت تمہارے دل میں ڈال دی۔

اب اسے کون مان سکتا ہے کہ اس شان کے افراد باجماعت باہم متفق ہو کر کفر و فسق اور عصیان کا ارتکاب کریں گے ورنہ ایک دو دن ماہ سال نہیں بلکہ زندگی بھر ایسا ہی کرنے پر بضد رہیں گے۔

3۔ تقسیم فی والی آیت میں فقراء مہاجرین کے ذکر کے بعد "أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ"[2] وہی سچے ہیں فرمایا ہے اور سارے ہی مہاجرین حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ کہتے تھے اب اگر کوئی ان کو خلیفہ برحق نہ مانے تو گویا وہ ان مہاجرین کو جھوٹا کہتا ہے جن کو خدا نے سچا کہا تھا (اب وہ اپنی اوقات خود پہچان لے)

4۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ان حضرات نے بیعت کی تھی جو دینی معاملات میں اپنے بیٹوں بھائیوں باپوں اور عزیز و اقارب کسی کا بھی پاس و لحاظ نہ کرتے تھے موقع آتا تو دینی تقاضے کی خاطر اپنے یاروں کو اپنے ہاتھ سے جام مرگ پلا دیتے تھے، جہاد کی سختیوں پر وہ صابر تھے مشقت برداشت کرتے تھے کسی مخالف سے نہ ڈرتے نہ دبتے اور دین کی خاطر اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے بار بار اپنی جان ہتھیلی پر رکھے دشمن کے روبرو ہوتے اور یہ خواہش کرتے کہ اللہ تعالیٰ یہ جان کا نذرانہ قبول کرے اور دشمن کا کوئی وار کام کر جائے۔

1۔سورۃ الحجرات،الآیۃ:7

2۔سورۃ الحشر،الآیۃ:8

اور یہ سب وہ ہیں جن کے خود امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبات میں شہادت دی ہے جو ان شاء اللہ باب مطاعن الصحابہ میں بیان ہوں گی ایسی حالت اور اوصاف والی جماعت اگر کسی بات پر اتفاق کر لے تو یقیناً وہ امر خلاف شرع ہرگز نہیں ہوگا۔

5۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر تمام صحابہ نے اتفاق کیا اور جس بات پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اتفاق کر لیں وہ حق ہے اور اس کے خلاف بات باطل ہوگی اس دلیل کی پختگی کے لیے اب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا وہ کلام ملاحظہ کریں جو نہج البلاغہ جیسی کتاب میں جسے تمام شیعہ بہت ہی معتبر و صحیح سمجھتے ہیں روایت کیا گیا ہے آپ نے ایک گفتگو کے دوران فرمایا:

الزموا السواد الأعظم فإن يد الله على الجماعة وإياكم والفرقة فإن الشاذ من الناس للشيطان كما أن الشاذ من الغنم للذئب[1]

سواد اعظم میں شامل رہو کہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے اور دیکھو پھوٹ اور تفرقہ سے بہت بچو کیونکہ جماعت سے بچھڑ کر اکیلا رہ جانے والا شیطان کا ایسا ہی شکار ہے جیسے ریوڑ سے علیحدہ ہو جانے والی بکری بھیڑیے کا۔

نہج البلاغہ کی جو شرح امامیہ نے لکھی ہے اسم تحریر ہے کہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچی ہے کہ آپ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ تحریر ارسال کی:

الا إن للناس جماعة يد الله عليها وغضب الله على من خالفها فنفسك نفسك قبل حلول غضبك۔[2]

آگاہ رہو کہ لوگوں کی جمعیت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے اور اس جماعت کے مخالف پر اللہ کا غضب پس اپنے آپ کو اس کا غضب نازل ہونے سے پہلے بچا لو۔

1۔ نهج البلاغة، 2/ 8، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

2۔ بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار، 33/ 83۔

اس کا کچھ حصہ رضی شریف نے بھی نقل کیا مگر اپنی عادت سے مجبور ہو کر اس کا بالائی حصہ کھا گیا ہے کیونکہ وہ اس کے مذہب سے ٹکراتا تھا جو سراسر تفرقہ پر مبنی ہے اور اس کا آخری حصہ بیان کر دیا ہے کہ:

اتق الله فيما لديك، وانظر في حقه عليك[1]

جو تمہارے قبضہ میں ہے اس کے بارے میں اللہ سے ڈرو اور اس کا حق جو تم پر ہے ذرا دھیان سے اس کی دیکھ بھال کرو۔

اور انہی امامیہ و معتزلہ کی شروح نہج البلاغہ میں جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف لکھے ہوئے خطوط میں سے ایک خط کا مضمون یہ ہے:

ما كنت إلا رجلا من المهاجرين، أوردت كما أوردوا، وأصدرت كما أصدروا، وما كان الله ليجمعهم على الضلال[2]

میں بھی مہاجرین کا ایک فرد تھا جیسے وہ آئے میں بھی آیا اور جیسے وہ لوٹے میں بھی لوٹا اور ان کو اللہ تعالیٰ ضلالت و گمراہی پر اکٹھا نہیں کرے گا۔

رضی نے پورے خط کو باقی رکھ کر کسی ایک جگہ نقل نہیں کیا بلکہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کسی کو کہیں کسی کو کہیں بیان کیا اسی خط کے ایک ٹکڑے کو اس نے نہج البلاغہ میں یوں درج کیا ہے:

اما بعد فقد ورد علي كتاب امرئ ليس له بصر يهديه ولا قائد يرشده[3]

میرے پاس ایک ایسے شخص کا خط آیا ہے جس کے پاس نہ آنکھیں کہ راستہ دیکھ سکے نہ اس کا کوئی رہبر ہے جو اس کو راستے پر لگائے۔

اور اسی خط کو ایک دوسرے خط کا سرنامہ بنا دیا اور اس کی یہی عادت اور فطرت ہے یہ شخص جناب امیر

1۔ شرح نهج البلاغة لابن أبي الحديد، 16/ 08، ط: دار إحياء الكتب العربية

2۔ شرح نهج البلاغة لابن أبي الحديد، 3/ 89، ط: دار إحياء الكتب العربية

3۔ نهج البلاغة، 3/ 07، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

رضی اللہ عنہ کے خطبوں اور خطوں کا یہی حشر کرتا ہے اپنے مذہب کے مطابق ان کی قطع برید کر کے ان کا حلیہ بگاڑتا اور ان کی تحریف کرتا ہے۔

6۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گزشتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق استفسار کیا گیا تو آپ نے ان کا وہ وصف بیان فرمایا جو ولایت کو لازم ہے آپ نے فرمایا:

كانوا إذا ذكروا الله هملت أعينهم حتى تبل جباههم ومادوا كما يميد الشجر يوم الريح العاصف خوفا من العقاب ورجاء للثواب[1]

ان کا حال یہ تھا کہ جب ان کے سامنے ذکر الٰہی کیا جاتا تو ان کی آنکھیں برس پڑتی حتی کہ ان کے چہرے تر ہو جاتے اور وہ خوف عتاب اور امید ثواب سے اس طرح کانپنے لگتے جس طرح سخت اندھی میں درخت جنبش کرتا ہے۔

پھر ایک اور مرتبہ انہی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق فرمایا:

كان أحب اللقاء إليهم لقاء الله وإنهم يتقلبون على مثل الجمر من ذكر معادهم[2]

ان کو سب سے محبوب چیز اللہ سے ملاقات تھی اور وہ آخرت کے ذکر پر چنگاری کی طرح پہلو بدلتے تھے یعنی بے چینی کا اظہار کرتے تھے۔

تو ایسی جماعت یا اس کے ایک فرد کا کسی باطل امر پر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی حکم کے خلاف اصرار کرنا محالات میں سے ہے۔

7۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا ایک ثبوت اس جماعت کا آپ کی بیعت کرنا جن کی تعریف میں جناب سجاد رحمۃ اللہ علیہ صحیفہ کاملہ کی دعاؤں میں بھی اللہ تعالی کی جناب میں مناجات کرتے وقت کے جو بندگان خاص کے ساتھ راز و نیاز کا وقت ہے، رطب اللسان ہیں بلکہ ان کے متبعین کے حق میں بھی طویل طویل دعائیں ان الفاظ میں فرماتے تھے:

1۔ شرح نهج البلاغة لابن أبي الحديد، 7/ 77، ط: دار إحياء الكتب العربية

2۔ المرجع السابق

اللهم وأوصل إلى التابعين لهم بإحسان الذين يقولون {ربنا اغفر لنا ولإخواننا الذين سبقونا بالإيمان} خير جزائك الذين قصدوا سمتهم وتحروا وجهتهم ومضوا في قفو أثرهم والائتمام بهداية منارهم يدينون بدينهم على شاكلتهم لم يثنهم ريب في بصيرتهم ولم يختلج شك في صدورهم» إلى آخر ما قال.[1]

اے اللہ ان کے ان متبعین کو بہترین صلہ اور جزا عطا فرما جنہوں نے اخلاص کے ساتھ ان کی پیروی کی اور جو اپنی دعاؤں میں کہتے تھے اے ہمارے رب ہماری اور ہمارے ان بھائیوں کی جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گزرے مغفرت فرما جنہوں نے اپنا رخ ان کے رخ پر رکھا اور ان کی طرف کا قصد رکھا اور ان کے نشان قدم پر چلے اور ان کی قائم کردہ علامات ہدایت کو قبول کیا انہی کے طریقہ پر ان کا دین اختیار کیا کوئی شخص ان کو نہ اپنے ارادہ سے باز رکھ سکتا تھا اور نہ ہی کوئی شک ان کے دل میں کھٹکتا تھا۔

اب امام معصوم جن کے متعلق اپنی تعریف فرمائے اور وہ بھی اللہ تعالی کی جناب میں مناجات کے وقت جو پوشیدہ باتوں کا جاننے والا ہے کہ ایسے وقت تقیہ کا خیال بھی کفر اور باطل پر اصرار ہے تو ان کے مراتب کا کیا ٹھکانہ اس لیے کہ امام کے متعلق یہ سوچنا اور خیال کرنا محال و ممتنع ہے کہ انہوں نے حق کو چھپایا یا رواداری برتی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان پر ظلم و غصب کو روا رکھا۔

8۔ کلینی کے باب السبق الی الایمان میں بحوالہ ابو عمرو زبیری جناب ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے:

قلت له إن الإيمان درجات ومنازل يتفاضل المؤمنون فيها عند الله. قال نعم. قلت صفه لي رحمك الله حتى أفهمه، قال: إن الله سبق بين المؤمنين كما يستبق بالخيل يوم الرهان ثم فضلهم على درجاتهم في السبق إليه فجعل كل

1۔ الصحيفة السجادية: ص 40.

امرئ منهم على درجة سبقه ولا ينقصه فيها من حقه ولا يتقدم مسبوق سابقا ولا مفضول فاضلا تفاضل بذلك أوائل الأمة وأواخرها. ولو لم يكن للسابق إلى الإيمان فضل على المسبوق إذا للحق آخر هذه الأمة أولها، نعم ولتقدموهم إذ لم يكن لمن سبق إلى الإيمان فضل على من أبطأ عنه ولكن بدرجات الإيمان قدم الله السابقين وبالإبطاء عن الإيمان أخر الله المؤخرين، لأنا نجد من المؤمنين من الآخرين من هو أكثر علما من الأولين وأكثرهم صلاة وصوما وحجا وزكاة وجهادا وإنفاقا ولو لم تكن سوابق يفضل الله بها المؤمنين لكان الآخرون بكثرة العمل متقدمين على الأولين ولكن أبى الله إلى الإيمان. فقال: قول الله عز وجل {سابقوا إلى مغفرة من ربكم وجنة عرضها كعرض السماء والأرض أعدت للذين آمنوا بالله ورسله} وقوله تعالى {السابقون السابقون أولئك المقربون} وقوله تعالى {والسابقون الأولون من المهاجرين والأنصار والذين اتبعوهم بإحسان رضي الله عنهم ورضوا عنه} فبدأ بالمهاجرين على درجة سبقهم ثم ثنى بالأنصار ثم ثلث بالتابعين لهم بإحسان، فوضع كل قوم على قدر درجاتهم ومنازلهم عنده ثم ذكر ما فضل الله به أولياءه بعضهم على بعض فقال عز من قائل {تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض منهم من كلم الله ورفع بعضهم فوق بعض درجات} الآية وقال تعالى {ولقد فضلنا بعض النبيين على بعض} وقال تعالى {انظر كيف فضلنا بعضهم على بعض} وقال تعالى {وللآخرة أكبر درجات وأكبر تفضيلا} إلى آخر الحديث وقال في آخره «فهذا ذكر درجات الإيمان ومنازله

عند اللہ عز و جل (۱)

میں نے ابی عبد اللہ سے پوچھا کہ کیا ایمان کے بھی درجے اور مرتبے ہوتے ہیں کہ اس کی وجہ سے مومنین اللہ تعالی کے نزدیک باعتبار درجات گھٹتے بڑھتے ہوں آپ نے فرمایاہاں میں نے کہا آپ پر اللہ مہربانی فرمائے مجھے اس کی ذرا تفصیل تو بتائیے کہ میں بھی اس کو سمجھ لوں آپ نے فرمایا اللہ تعالی نے مومنین میں باہم ایک دوسرے کو اسی طرح سبقت دی ہے جس طرح کوئی دور میں گھوڑوں کو ایک دوسرے پر سبقت دی جاتی ہے پھر سبقت کے درجہ کے لحاظ سے ان کو فضیلت مرحمت فرمائی لہذا ان میں سے ہر آدمی کو اس کی سبقت کے درجہ پر رکھا اس میں سے ان کا حق بالکل کم نہیں کرتا نہ پیچھے رہ جانے والا آگے بڑھ جانے والے سے آگے ہو سکتا ہے نہ مفضول جس پر فضیلت دی گئی فاضل پر فضیلت پا سکتا ہے اس طرح سے امت کے اگلوں اور پچھلوں میں باعتبار سبقت گھٹت بڑہت ہوئی ہے اور اگر ایمان میں پیچھے رہ جانے والوں پر فضیلت نہ رکھتا تو اس امت کے بعد والے مراتب میں پہلے والوں پر فضیلت نہ صرف جا ہی ملتے بلکہ آگے بھی نکل جاتے اگر ایمان میں پہل کرنے والوں کو اپنے بعد ایمان لانے والوں پر نہ دے دی گئی ہوتی بلکہ اللہ تعالی نے درجات ایمان میں سابقین کو آگے بڑھایا اور ایمان میں تاخیر کرکے پیچھے رہ جانے والوں کو پیچھے رکھا مومنین میں بلحاظ عمل تم پچھلوں کو اگلوں سے زیادہ نہیں پاؤ گے نہ نماز روزہ میں نہ حج وزکوۃ میں نہ جہاد میں نا راہ خدا میں خرچ کرنے میں اگر یہ مسابقتیں نہ ہوتی کہ جن کی وجہ سے ایک دوسرے سے اللہ کے نزدیک بڑھا ہوا ہے تو بعد والے عمل کے لحاظ سے اگلوں سے آگے نکل جاتے لیکن اللہ تعالی نے اسے پسند نہیں فرمایا کہ بعد والا پہلے والے جتنے درجات ایمان پالے یا اللہ نے جس سے پیچھے ڈالا ہے وہ آگے بڑھ جائے یا جس کو اللہ تعالی نے آگے بڑھایا ہے وہ پیچھے رہ جائے راوی نے کہا کہ مجھے اس سے بھی مطلع فرمائیے کہ وہ سبقت

1۔ الكافي: 2/ 33، 34؛ تفسير العياشي: 2/ 105.

ایمانی کیا ہے جس کی طرف اللہ تعالی نے مومنین کو رغبت دلائی ہے تو آپ نے فرمایا وہ اللہ کا قول" سابقوا إلى مغفرة من ربکم " ہے اور شفقت کرو اللہ کی مغفرت کی طرف اور جنت کی طرف جر جس کا عرض چوڑائی اسمان اور زمین کے برابر ہے جو اللہ ورسول اللہ پر ایمان لانے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے اور فرمایا اللہ تعالی نے پہل کرنے والے تو پہل کرنے والے ہی ہیں اور وہی مقرب ہیں نیز فرمایا اللہ تعالی نے کہ پہل کرنے والوں میں اولین مہاجرین و انصار اور ان کے مخلص پیروکار ہی ہیں جن سے اللہ راضی ہوا اور جو راضی ہوئے اللہ سے یہاں اللہ تعالی نے مہاجرین کا ذکر ان کے درجہ سبقت کے لحاظ سے پہلے کیا دوسرے درجہ پر انصار کا ذکر فرمایا اور درجہ سوم اور تابعین کا ذکر کیا جنہوں نے صدق دل سے اپنے پہلوؤں کی اتباع کی پس اللہ کے نزدیک جس گروہ کا جو درجہ مقرر ہے اس میں اس کو اسے درجے پر رکھا اس کے بعد اللہ تعالی نے اپنے اولیاء کو باہم دیگر جو فضیلت دی اس کا ذکر کیا اور فرمایا یہ رسول ہیں جن میں سے بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت دی ہے ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اللہ تعالی سے کلام فرمایا اور بعض کے درجات بلند فرمائے اور فرمایا بے شک ہم نے بعض انبیاء کو بعض دوسروں پر فضیلت بخشی اور فرمایا دیکھو ہم نے ایک کو دوسرے پر کس طرح فضیلت دی اور ارشاد فرمایا آخرت اپنے درجات اور فضیلت میں بہت بڑی ہے۔ اختتام حدیث پر کہا یہ ہے ان درجوں اور مرتبوں کا ذکر جو اللہ تعالی کے نزدیک ایمان میں قائم ہیں۔

اس روایت سے سات پتہ چل گیا کہ درجہ ایمانی میں مہاجرین و انصار سب سے بلند و بالا تر ہیں ان کے بعد والا کوئی ان سے ہمسری نہیں کر سکا چنانچہ ذیل میں درج شدہ آیات قرآنی بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں:

"أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا"[1]

پکے مومن وہی ہیں۔

1۔ سورة الانفال، الاية: 74

"أَعْظَمُ دَرَجَةً عِندَ اللهِ"(1) یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلند مرتبت ہیں۔

"لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ"(2)

فتح مکہ سے قبل خرچ کرنے والے یا لڑنے والے کے کوئی برابر نہیں۔

اب ایسا شخص جو اتنا عظیم المرتبت ہو وہ ایسے ناشائستہ امور پر اصرار کرتا ہے ان پر اجتماع و اتفاق کرتا ہو محال در محال ہے۔

9۔ نہج البلاغہ کے شارحین نے اپنے ہاں ایک خط نقل کیا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا اس خط میں حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے ذکر کے بعد ان کے متعلق یہ الفاظ تحریر فرماتے ہیں:

لعمري إن مكانيهما لعظيم وإن المصاب بهما لجرح في الإسلام شديد رحمهما الله تعالى وجزاهما بأحسن ما عملا(3)

میری جان کی قسم ان دونوں کا اسلام میں بہت بڑا مقام ہے اور ان دونوں کا اٹھ جانا اسلام کے لیے بڑا کاری زخم ہے اللہ تعالیٰ ان دونوں پر اپنی رحمت فرمائے اور ان دونوں کے اعمال کی بہترین جزا مرحمت فرمائے۔

اگر شیعوں کے بقول یہ حضرات ظالم وغاصب تھے تو ایک امام معصوم ان کی ایسے شاندار الفاظ میں مداح و توصیف کیسے کر سکتے تھے تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ یہ خط صاحب نہج البلاغہ نے خود بھی نقل کیا مگر اسی خبث باطنی کے ساتھ جو اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے یعنی تحریف سے یہاں بھی باز نہیں رہا الفاظ و عبارت کو آگے پیچھے تو کیا ہی ہے کوئی بات جو اس کے مذہب پر چوٹ لگاتی تھی اس کو اس نے عبارت سے ساقط بھی کر دیا ہے چنانچہ اس کتاب کے تمام شارحین نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ اس خط کی نقل میں ریزی سے

1۔ سورة التوبة، الآية: 20

2۔ سورة الحديد، الآية: 10

3۔ نهج البلاغة (بشرح ابن أبي الحديد): 15/ 76.

ایسی بے ربطی اور بے ترتیبی عمل میں آئی ہے کہ عبارت میں ایسی گڑبڑ اور مطلب میں ایسی گنجلک پیدا ہو گئی ہے کہ شراح اس کی توجیہ اور عبارات کی ترکیب سے عاجز آگئے۔

بحث امامت بلا فصل

اہل تشیع حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت بلا فصل ثابت کرنے کے لیے بہت سی دلیلیں بیان کرتے ہیں جن کی چھان پھٹک اور تحقیق و تفتیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ بہت روایتیں تو ایسی ہیں جو موضوع بحث سے بالکل ہی ہٹی ہوئی ہیں اور بہت سی روایتیں ایسی ہیں جو موضوع اہل سنت کے ذخیرہ علمی و دینی سے چھپائی گئی ہیں اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو، اس سلسلہ میں ان کے دلائل تین قسم کے ہیں:

1۔ وہ حضرات واحادیث جو حضرت علی واہل بیت رضی اللہ عنہم کے مناقب وفضائل میں وارد ہوئی ہیں یہ سب اہل سنت کے ذکر کردہ ہیں جو انہوں نے خوارج اور نواصب کے مقابلہ میں لکھی اور بیان کی کیونکہ یہ لوگ حضرت علی واہل بیت رضی اللہ عنہم کی شان میں لعن وطعن کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے رہتے تھے ابھی شیعوں کی بے وقوفی ہی ہے کہ وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت بلا فصل ثابت کرنے کے دلائل کے طور پر ان کو اہل سنت ہی کے مقابلہ پر لے آئے۔

ان کے اگلوں نے جب علم کلام واصول میں اہل سنت ومعتزلہ کے شاگردی کر کے کچھ شد بد حاصل کر لی اور کچھ سمجھداری آگئی اور دلائل مرتب کرنے سے بھی کچھ واقف ہو گئے تو انہوں نے ان مقدمات علمی میں کچھ الٹ پھیر اور چند من گھڑت کلمات کا ان میں اضافہ کر کے اپنے مفید مطلب بنالیا حالانکہ وہ پھر بھی ان کے مفید مطلب نہ تھے مگر خیر بظاہر میں خود وہ اپنے کو یہی سمجھتے تھے تب انہی دلائل کی تہذیب واصلاح کے لیے ان کی ایک کتاب "کتاب الالفین" کے نام سے تصنیف ہوئی، ظاہر ہے ان حالات کے تحت اہل سنت کے لیے ان دلائل کے جوابات دینا نامفید ہے نہ مناسب، البتہ ان کے یہ دلائل اس مقصد سے نقل ضرور کیے جائیں گے کہ ان بزرگواروں کی دانشمندی اور خوش تقریری بے نقاب ہو اور مصنوعی کلمات اور زبردستی کے بڑھائے ہوئے مقدمات پر واقفیت حاصل ہو۔

2۔ وہ دلائل ہیں جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا استحقاق کے خلافت بحیثیت خصوصی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ ایک وقت ومدت خاص ومعینہ میں خلیفہ برحق اور امام مطلق ہیں۔

یہ دلائل بھی وہ ہیں، جو اہل سنت ان خوارج ونواصب کے مقابلہ میں بیان کرتے تھے جو آپ کی خلافت

وامامت کے منکر تھے اور آپ کے مرتبہ امامت میں ردو قدح کرتے تھے، ان دلائل سے جو کچھ سمجھ میں آتا ہے وہ صرف یہ کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ خلافت راشدہ کے مستحق ہیں اور آپ کی خلافت شارع کی پسندیدہ ہے نہ ان میں وقت وزمانہ کی تعیین ہے نہ اس بات کی تشریح کہ ان کا زمانہ خلافت زمانہ نبوت سے متصل ہے یا منفصل، یہ بات تو چونکہ اہل اہل سنت کے مذہب کے مطابق اور ان کے مطلب کا خلاصہ ہے، اس لئے ان روایات کے جواب کی طرف وہ کیوں متوجہ ہوں!ہاں کہیں کہیں ان مقدمات پر تنبیہ و تنقید ضرور ہو گی، جو انہوں نے بے ضابطہ طور پر گھڑ گھڑ کر دلائل میں شامل کر لئے ہیں اور اپنے خیال خام میں اس پر بڑے خوش کہ کارے کردم۔

3۔ وہ دلیلیں جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت پر بلا تفضیل دلالت کرتی ہیں، یا آپ کے غیر سے امامت سلب کرتی ہیں، یہی وہ دلیلیں ہیں کہ جن پر مذہب شیعہ کی بنیادر قائم ہے اور ان کی روایت و نقل ہیں، یہ تنہا ہیں، اس قسم کی دلیلیں ہوتی تو بہت کم ہیں، اور جو میں بھی تو ان کے مقدمات نا قابل تسلیم ہیں کیونکہ ان کی تردید کے لئے بصورت ثقلین کتاب اللہ و عزت رسول اللہ جیسے سچے گواہ اور عادل شاہد موجود ہیں۔

لہذا اس کتاب میں موقع کی مناسبت سے کچھ نہ کچھ بحث تینوں قسم کے دلائل پر کی جائے گی البتہ قسم آخر کو ذرا تفصیل سے سامنے لایا جائے گا، اور بناء غلطی اور موقع شک پر ضرور تعبیر کی جائے گی، تاکہ ان کی دلیلوں کی حقیقت الم نشرح ہو جائے۔

اس بحث میں ضابطہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اتنی بات تو ضروری ہونی چاہیے کہ ان دلائل کے مبادیات اور اور مقدمات ایسے ہوں جو اہل سنت کے ہاں بھی قابل تسلیم ہوں اس لئے کہ ان دلائل سے مقصود اہل سنت ہی کو تو الزام دینا ہے ورنہ اپنی جگہ تو سارے ہی باون گزے بنتے ہیں۔

شیعوں کی وہ روایات اور اصول جو ابواب ماسبق میں تفصیلاً مذکور ہوئے وہ تو اہل سنت کے نزدیک ذرہ برابر نہ قابل قدر میں نہ لائق توجہ، البتہ وہ دلائل جو آیات قرآنی پر مشتمل ہوں یا احادیث متفق علیہا کیا یا پھر وہ عقلی دلائل جن کے مقدمات طرفین کے نزدیک مسلم ہوں یا پھر وہ طعن آمیز اقوال جو خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت سے انکار کے سلسلہ میں بیان کئے جاتے ہیں، موضوع گفتگو بن سکتے ہیں، ہم نے چونکہ باب مطاعن کو مستقل طور پر کتاب ہذا کا جز بنایا ہے، اس کو چھوڑ کر باقی کے تین اصناف دلائل پر یہاں گفتگو کرتے ہیں۔

وہ آیات جن سے شیعہ خلافت علی رضی اللہ عنہ بلا فصل پر استدلال کرتے ہیں

ان کی طرف سے پہلی آیت یہ ہے:

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ[1]

بے شک تمہارا ولی اللہ و رسول اور وہ مومن ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، اور زکوۃ دیتے ہیں اس حال میں کہ رکوع کئے ہوئے ہیں۔

اس آیت کے متعلق یہ حضرات کہتے ہیں کہ اہل تفسیر کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت جناب امیر رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی کہ آپ نے حالت رکوع میں ہی ایک سائل کو اپنی انگشتری دی تھی۔[2]

پھر انما کا کلمہ حصر چاہتا ہے اور ولی سے مراد اوامر چلانے والا یا نافذ کرنے والا ہے، اور ظاہر ہے یہاں وہ تصرف عام مراد ہے جو سب مسلمانوں پر ہے اور جو امامت کا مرادف ہے، اس کا قرینہ یہ ہے کہ ان کی یہ ولایت کو خدا اور رسول کی ولایت کے ساتھ ذکر کیا ہے لہذا آپ کی امامت ثابت ہو گئی اور آپ کے علاوہ دوسروں کی امامت کی نفی کیونکہ انما حصر پر دلالت کرتا ہے اور یہی مدعا ہے۔[3]

پہلا جواب: اس کا جواب چند صورتوں میں دیا جا سکتا ہے، اول بطریق نقض، کہ یہ دلیل آپ کے بیان کے

1۔ سورة المائدة، الآية: 55

2۔ في الكافي عن الصادق (عليه السلام) في تفسير هذه الآية يعني أولى بكم اي أحق بكم وبأموركم من أنفسكم وأموالكم الله ورسوله والذين آمنوا يعني عليا وأولاده الأئمة إلى يوم القيامة ثم وصفهم الله عز وجل فقال الذين يقيمون الصلاة ويؤتون الزكاة وهم راكعون وكان أمير المؤمنين (ع) في صلاة الظهر وقد صلى ركعتين وهو راكع وعليه حلة قيمتها ألف دينار وكان النبي (ﷺ) أعطاه إياها وكان النجاشي أهداها له فجاء سائل فقال السلام عليك يا ولي الله وأولى بالمؤمنين من أنفسهم تصدق على مسكين فطرح الحلة إليه وأومى بيده إليه أن احملها فأنزل الله عز وجل فيه هذه الآية(تفسير الصافي لملا فيض الكاشاني، 2/ 44، ط: مكتبة الصدر طهران)

3۔ هكذا قال الشيخ الامامية ناصر مكارم الشيرازي في التفسير الأمثل ثم في تفسير كتاب الله المنزل، 4/ 47

مطابق جناب امیر رضی اللہ عنہ کے پہلے والے ائمہ کی جس طرح نفی کرتی ہے اسی طرح آپ کے بعد کے ائمہ کی تردید بھی یہی آیت ساتھ ساتھ ہی کر رہی ہے، اور آپ کی اسی تقریر سے بعد میں آنے والوں کی امامت کی نفی بھی اس سے نکلتی ہے جس کالازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اور بعد کے ائمہ کی امامت برحق نہ ہو، اگر شیعہ اس انکار کے لئے تیار ہیں، تو چشم ماروشن دل ماشاد بلا کھٹکے اس دلیل سے ضرور استدلال کریں۔

خلاصہ کلام یہ کہ یہ استدلال جس وجہ سے اہل سنت کے مقابل لایا گیا ہے کلمہ حصر پہ مبنی ہے اور حصر جس طرح اہل سنت کے لئے مضر ہے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ شیعوں کے لئے مضر ہے، کیونکہ اس صورت میں اگر جناب امیر رضی اللہ عنہ سے قبل کے ائمہ کی تردیدہ ہوتی ہے تو بعد کے ائمہ کی بدرجہ اولیٰ ہوتی ہے، گو مذہب اہل سنت باطل قرار پاتا ہے مگر شیعہ مذہب کی عمارت بھی زمین بوس ہوئی جارہی ہے، اس کا باطل ہونا تو حقیقت ہے ہی اس کے ساتھ اس کی بنیاد ہی نیست ونابود ہوئی جارہی ہے اگر اہل سنت کے تین اماموں پر زد پڑتی ہے تو شیعوں کے تو بارہ امام ہاتھ سے جارہے ہیں، تین اور بارہ کا فرق امید ہے وہ بھی بخوبی سمجھتے ہوں گے، جناب امیر رضی اللہ عنہ تو دونوں فریق کے نزدیک امام و خلیفہ ہیں، باقی سب اگلے پچھلے اس اعزاز سے محروم ہوں گے۔

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گزشتی   گو مشت خاک ماھم برباد رفتہ باشد

ترجمہ شعر: گو میری تو مشت خاک ہی برباد ہوئی، مگر خوشی اس کی ہے کہ رقیب تو نامراد گیا۔

اگر وہ نقص کا جواب یہ دیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت وقت کے ایک حصہ میں منحصر ہے یعنی اپنے عہد امامت میں نہ حضرات حسنین وائمہ مابعد کے وقت میں، تو ہم اس اتفاق پر ان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں، ہمارا عقیدہ و مذہب بھی تو یہی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کی ولایت عامہ ایک محدود وقت کے ساتھ مخصوص تھی، یعنی جب آپ خلیفہ مقرر ہوئے اس سے پہلے نہیں کہ وہ خلفا الثلاثۃ کا دور تھا۔

اگر وہ یہ کہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے عہد میں اگر ولایت عامہ سے خالی مانے جائیں تو ان کے لئے ان کی ذات میں نقص لازم آئے گا بخلاف سبطین کی امامت کے وقت کہ اس وقت آپ زندہ ہی نہ تھے کسی دوسرے کا امام ہونا اس وقت آپ کی ذات میں نقص شمار نہیں ہوگا کیونکہ موت تمام دنیوی احکام وذمہ داریوں سے بری الذمہ کر دیتی ہے۔

توہم کہیں گے یہ ایک دوسرا مستقل استدلال ہوا، آیت سے تو استدلال نہ رہا، کیونکہ یہ استدلال مذکور دو مقدمات پر استوار ہے ایک یہ کہ صاحب ولایت عامہ کا کسی دوسرے کی ولایت میں ہونا خواہ کسی وقت میں بھی ہو نقص کا سبب ہے دوسرے یہ کہ صاحب ولایت عامہ میں کسی طرح بھی اور کسی وقت بھی نقص پیدا نہیں ہو سکتا تو یہ دونوں مقدمات آیت سے کہاں سمجھے جاتے ہیں، یہ صورت اصطلاح مناظرہ میں فرار کہلاتی ہے کہ ایک دلیل کو چھوڑ کر دوسری جا پکڑنا، جب کہ پہلی دلیل کے مقدمات کا جھگڑا نہ اقرار سے نہ اثبات سے طے ہوا ہو۔

اور اگر ہم جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کی خاطر اس فرار کو نظر انداز کر دیں اور نئے استدلال کے مقدمات کی طرف توجہ دیں تو ہم کہیں گے کہ یہ دونوں مقدمات ہی غلط ہیں، اور یہ استدلال ہی اس وجہ سے باقی نہیں رہتا کہ اس صورت میں حضرات حسنین رضی اللہ عنہما ولایت مستقل سے محروم ہو جاتے ہیں کہ وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں ان کی ولایت میں تھے اور پھر خود جناب امیر رضی اللہ عنہ کی ولایت سے بھی یہ استدلال ختم ہو جاتا ہے کہ وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مستقل ولایت نہیں رکھتے تھے بلکہ حضور کی ولایت کے زیر سایہ تھے، لہذا معلوم ہوا کہ صاحب ولایت کا دوسرے کی ولایت میں کچھ عرصہ کے لئے رہنا نقص نہیں ہے اور اگر نقص ہے تو صاحب ولایت عامہ میں یہ کوئی عیب نہیں ہے تو وہ استدلال ہی مع مقدمات کے غلط ہوا جس کی طرف چھلانگ لگائی تھی۔

دوسرا جواب: جناب شیخ ابراہیم کردی رحمۃ اللہ علیہ[1] اور دوسرے اہل سنت نے یہ دیا ہے کہ "الذین امنوا" میں بوقت خطاب ولایت مراد نہیں کہ خطاب کا زمانہ نبی کا زمانہ اور عہد تھا، اور امامت نبی کے بعد نبی کی نیابت ہے اس کے حین حیات نہیں، تو لا محالہ بعد ہی کا زمانہ مراد ہوگا اور بعد کی کوئی حد نہیں، وہ ایک منٹ بعد ہو سکتا ہے تو ایک یا چند سال بھی ہو سکتا ہے، لہذا یہ دلیل بھی وجہ نزاع نہیں ہو سکتی اور یوں شیعوں کا مدعا امامت بلا فصل غتربود ہو گیا۔

اور اگر ان کی دلیل کے مقدمات پر تفصیلی نظر ڈالیں تو اجماع مفسرین کا ان کا دعویٰ بھی غلط اور نا قابل تسلیم ہے اس لیے لیے کہ علماء تفسیر تو اس آیت کے نازل ہونے ہونے کے سبب میں مختلف الرائے ہیں، ابو بکر

---

1 ـ إبراهيم بن حيدر بن أحمد الكردي الشافعي، له مؤلفات عديدة، توفي سنة 1151 هـ. معجم المؤلفين: 1/ 27

نقاش[1] جو ان کے ہاں کی مشہور تفسیر کا مصنف ہے جناب ابو جعفر محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ سے یوں روایت کرتا ہے کہ "نزلت في المهاجرين والانصار" یہ آیت مہاجرین وانصار کے بارے میں نازل ہوئی، کسی کہنے والے نے کہا کہ ہم نے تو سنا ہے یہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ وہ بھی تو انہیں میں سے تھے،[2] اور یہ روایت الذین اور جمع کے صیغوں یقیمون ، یوتون ، و هم راکعون کے بہت مناسب اور موزوں ہے، اور مفسرین کی ایک جماعت نے کہا کہ عکرمہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حضرت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی اور اس آیت کا ربط پچھلی آیت سے جو مرتدین کے قتال کے بارے میں ہے اسی قول کی تائید کرتا ہے۔

اب یہ قول کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں اتری اور بحالت رکوع سائل کو انگوٹھی دینے کا یہ قصہ تو یہ روایت تنہا ثعلبی نے روایت کی ہے[3] اور سارے ہی محدثین اس روایت کو رتی بھر اہمیت نہیں دیتے اور اس کو حاطب اللیل کہہ کر پکارتے ہیں، اس لئے کہ اسے خشک وتر میں کوئی تمیز نہیں، غلط سلط مرویات روایت کر دیتا ہے، یہ تفسیری روایات کلبی[4] سے لیتا ہے۔

---

1 ـ اشتهر بالقراءة والتفسير رغم ضعفه في الحديث. ميزان الاعتدال: 6/ 115؛ طبقات المفسرين: ص 94.

2 ـ الدر المنثور للسيوطي: 3/ 106. وأخرج الطبري وأبو نعيم عن عبد الملك بن أبي سليمان قال سألت أبا جعفر محمد بن علي عن قوله: «{إنما وليكم الله ورسوله والذين آمنوا الذين يقيمون الصلاة ويؤتون الزكاة وهم راكعون} قال: أصحاب محمد ﷺ، قلت يقولون: علي؟ قال: علي منهم». تفسير الطبري: 6/ 288؛ حلية الأولياء: 3/ 185.

3 ـ قال العلامة ابن تيمية في رسالة (مقدمة أصول التفسير) ص 39 طبع المطبعة السلفية عند تنبيه على تفسير الرافضة هذه الآية بأن المراد بها علي بن أبي طالب: «ويذكرون الحديث الموضوع بإجماع أهل العلم وهو تصدقه بخاتمه في الصلاة». فالقصة إذن مكذوبة على كتاب الله من أصلها بإجماع أهل العلم، وليست هذه بأول دسائسهم ولا بأخرها.

4 ـ هو أبو النضر محمد بن السائب الكلبي، تركه معظم المحدثين، مات سنة 147هـ. ابن عدي، الكامل في ضعفاء الرجال: 6/ 114؛ ابن حجر، تهذيب التهذيب: 9/ 157.

ابی صالح[1] کہتا ہے کہ تفسیری روایات میں اس کی روایت سب سے زیادہ رکیک ہوتی ہے، قاضی شمس الدین بن خلکان نے کلبی کے حال میں لکھا ہے کہ یہ عبد اللہ بن سبا یہودی کے ان ساتھیوں میں سے ہے جو کہتے تھے کہ علی بن ابی طالب مرے نہیں اور وہ دنیا میں پھر آئیں گے،[2] ثعلبی کی بعض روایات کا سلسلہ محمد بن مروان سدی الصغیر[3] پر ختم ہوتا ہے جو کٹر رافضی تھا اور سلسلہ کذب و وضع کی ایک کڑی کے طور پر جاتا ہے۔

لباب التفسیر کا مصنف کہتا ہے کہ یہ آیت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کے حق میں اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے خلفائے یہود سے بیزاری و نفرت ظاہر کی جب کہ عبد اللہ بن ابی (مشہور منافق) نے بیزاری کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کی حمایت و خیر خواہی پر تلا رہا[4] یہ قول آگے آنیوالی آیت " يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاءَ "[5] مومنو یہود و نصاری کو دوست نہ بناؤ سے پوری مناسبت رکھتا ہے۔

پھر مفسرین کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ جناب عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو علماء یہود میں سے تھے جب اسلام لے آئے تو ان کے پورے قبیلے نے ان کا بائیکاٹ کر دیا انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارکہ میں اس کی اطلاع بایں الفاظ فرمائی "إن قومنا هجرونا"[6] یارسول اللہ ہماری قوم نے ہمیں چھوڑ دیا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور قواعد فن حدیث کی رو سے یہ قول بہ نسبت دوسرے تمام اقوال کے زیادہ صحیح ہے۔

1۔ هو من صناديد التشيع. قال النسائي عن أبي صالح: ليس بثقة، وقال عنه ابن معين: ليس به بأس، وقال ابن عدي: عامة ما يرويه تفسير. ميزان الاعتدال: 2/ 3؛ تهذيب التهذيب: 1/ 364

2۔ وفيات الأعيان: 4/ 310.

3۔ هو محمد بن مروان السدي الكوفي، قال البخاري: لا يكتب حديثه البتة، وقال النسائي: متروك الحديث، وقال الذهبي: تركوه واتهمه بعضهم بالكذب، مات سنة 189هـ تاريخ بغداد: 3/ 291؛ ميزان الاعتدال: 6/ 328؛ شذرات الذهب: 1/ 325.

4۔ تفسير الطبري: 6/ 287 و الدر المنثور للسيوطي: 3/ 98.

5۔ سورة المائدة، الاية: 51

6۔ تفسير الجلالين، ص: 147، ط: دار المعرفة بيروت .لبنان والدر المنثور: 3/ 105.

آیت مذکورہ بالا متعلقہ امامت کے سلسلہ کا دوسری طرح سے جواب یہ ہے کہ لفظ ولی، محب، ناصر، صدیق اور صاحب تصرف سب معانی کے لئے آتا ہے،[1] اور ان سب میں مشترک ہے، اور مشترک لفظ سے کوئی خاص معنیٰ اسی وقت مراد لئے جاسکتے ہیں، جب اس کے لئے کوئی خارجی وجہ موجود ہو، اور یہاں اس آیت سے اگلا کلام اس آیت میں ناصر کے معنیٰ کی تائید کرتا ہے کیونکہ یہ آیت مومنوں کی تسلی، دلی تقویت اور مرتدوں سے ان کے خوف کو دور کرنے کی خاطر نازل ہوئی اور آنے والا کلام محب وصدیق کے معنیٰ کو متعین کرتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ[2]

اے ایمان والو ان کو جو تمہارے دین کو مذاق وکھیل بناتے ہیں خواہ وہ اہل کتاب ہوں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی یا وہ کافر ہوں دوست مت بناؤ۔

معلوم ہوگیا کہ یہاں اولیاء کے معنیٰ محب وصدیق کے متعین ہیں کیونکہ یہود ونصاریٰ اور کافر کو کوئی مسلمان امام نہیں بناتا اور نہ ہی وہ آپس میں ایک دوسرے کو اپنا امام بناتے ہیں۔

پھر کلمہ حصر انما بھی انہیں معنیٰ کو چاہتا ہے کیونکہ قاعدہ کے مطابق حصر کی وہیں ضرورت پیش آتی ہے جہاں کسی نزاع، شک اور شرکت کے اعتقاد کا احتمال ہو، اس امر پر اجماع ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے وقت امامت اور ولایت تصرف کے سلسلہ میں نہ کوئی جھگڑا تھا نہ شک، بلکہ نصرت وامداد اور محبت کا مسئلہ درپیش تھا۔

تیسرا جواب: تیسرے طریقہ سے جواب یہ ہے کہ اس اصولی قاعدہ کے مطابق جو سنی وشیعہ دونوں میں متفق ہے عموم لفظ کا لحاظ ہوتا ہے خصوصی سبب کا نہیں،[3] لہذا آیت کا مقصد یہ ہوگا کہ ولایت عامہ چند اشخاص

1۔ قال ابن منظور: «الولي هو الناصر، وقيل هو المتولي لأمور العالم المتصرف فيها ...». لسان العرب: مادة ولي، 16/ 406.

2۔ سورة المائدة، الاية: 57

3۔ أوردها صاحب المحصول: 1/ 448 من أهل السنة وأوردها من الإمامية المرتضى في الذريعة في أصول الشيعة: 1/ 307، والمقتول الثاني في تمهيد القواعد: ص 216.

میں منحصر کر دی جائے اور ان اشخاص میں جناب امیر رضی اللہ عنہ بھی داخل ہیں، کیونکہ جمع کے صیغے اور کلمہ الذین کے الفاظ عمومی ہیں یا بقول مرتضیٰ وابن مطہر جو اربعہ اور نہایہ نامی تصنیف میں مذکور ہے الفاظ عمومی کے مساوی ہیں، ایسی صورت میں جمع کو واحد پر محمول کرنا دشوار ہے اور اسی طرح عام کا خاص پر محمول کرنا خلاف اصل ہے کہ بغیر ضرورت ایسا نہیں کیا جاسکتا۔

اور اگر شیعہ یہ کہیں کہ یہاں ایسا کرنے کی ضرورت ہے کہ رکوع کی حالت میں سائل کو صدقہ دینے کا واقعہ ایک شخص سے صادر ہوا ہے تو ہم کہیں گے کہ اس آیت سے اس قصہ کا پتہ کہاں چلتا ہے جس کی وجہ سے لفظ کو عموم پر محمول نہ کرسکیں بلکہ وھم راکعون ایک عطفی جملہ ہے جو اگلے جملوں پر معطوف ہے اور موصول کا صلہ ہے، یعنی الذین هم راکعون یا یقیمون الصلوة سے حال ہے، بہر صورت یہاں رکوع سے خشوع مراد ہے اصطلاحی رکوع نہیں!

اس پر اگر شیعوں کو یہ اعتراض ہو کہ رکوع سے خشوع مراد لینا، خود شارع کے کلام میں لفظ کو غیر شرعی معنی میں استعمال کرنے کے مرادف ہے جو خلاف اصل ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن مجید میں دوسری جگہ رکوع، خشوع کے معنیٰ میں آیا ہے، اور استعمال ہوا ہے، چنانچہ ارشاد ہے "وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ"[1] اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر، حالانکہ یہ بالاجماع ثابت ہے کہ پہلے کی امتوں کی نماز میں اصطلاحی رکوع موجود نہیں تھا، یا فرمایا" وَخَرَّ رَاكِعًا"[2] میں گر پڑا رکوع کرتے ہوئے اور ظاہر ہے اصطلاحی رکوع میں خر اور سقوط نہیں ہوتا، اب جب کہ رکوع کے مشہور معنیٰ مجازی خشوع کے ہوگئے تو طے شدہ قاعدہ کے مطابق اس لفظ کو بلا ضرورت بھی محمول کرسکتے ہیں، بلکہ ہم تو الٹ کر یہ کہتے ہیں کہ "وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ" سے سائل کو انگشتری صدقہ کر دینے کے معنیٰ سمجھنا لفظ رکوع کو غیر شرعی معنی پر حمل کرنے کی مانند ہے، اب جو تم

1۔ سورۃ ال عمران، الایۃ : 43

2۔ سورۃ ص، الایۃ : 24

اس کا جواب دو وہی ہمارا جواب بھی رکوع میں سمجھ لو بلکہ اقامت صلوٰۃ کے بعد رکوع کا ذکر ہمارے خیال کی تائید ہے تاکہ بے جا تکرار لازم نہ آئے، اور صلوۃ کے بعد زکوۃ کا ذکر کرنا تمہاری تردید کرتا ہے کہ قرآنی عرف میں جہاں کہیں زکوٰۃ صلوٰۃ سے متصل بیان ہوئی ہے اس سے فرض زکوٰۃ مراد ہوتی ہے نہ کہ مطلقاً صدقہ۔

اور اگر رکوع کو اس کے حقیقی معنٰی پر ہی محمول کریں تب بھی وہ "يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ" سے حال واقع ہو گا اور تمام مومنین کو شامل ہو گا، اس لئے کہ مومنوں کی نماز کو یہود کی نماز سے جدا کرنا ہے، جس میں یہ رکوع نہیں ہوتا اس صورت میں بعد والی آیت میں جو یہود سے ترک موالات کا حکم ہے، بہت چسپاں ہوتا ہے۔

اور اگر "وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ" سے حال واقع ہو تو معنٰی کے لحاظ سے یہ نہ صفت ہو گا نہ تعریف بلکہ یہ تو "يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ" میں نقص کا باعث ہو گا اس لئے کہ نماز کا وصف اور تعریف تو یہ ہے کہ وہ اس عمل سے پاک ہو جس کا تعلق نماز سے نہیں، خواہ وہ عمل قلیل ہو یا کثیر، فرق صرف اتنا ہے کہ عمل قلیل مفسد نماز نہیں جب کہ عمل کثیر مفسد نمازہ ہے، بہر حال اقامت صلوٰۃ کے معنی میں دونوں ہی صورتیں کسی نہ کسی مقدار کا نقص پیدا کرتے ہیں، اور کلام الٰہی کو ناقص پر محمول کرنا جائز نہیں اور پھر اس کے ساتھ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ امامت کی حقیقت میں اس قید کو دخل بھی نہیں کہ جس میں یہ صفت ہو وہ امام ہو اور جس میں نہ ہو وہ قابل امامت نہیں۔

لہٰذا اگر امامت کے حکم کو اس قید کے ساتھ معلق یا موقوف کیا جائے تو نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کا کلام بے کار ثابت ہو گا یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ تمہاری بادشاہت کے قابل وہ شخص ہے جس کے کپڑے سرخ ہوں تو کیا بات ہوئی، اور اگر ان سب باتوں کو نظر انداز بھی کر دیں تو بھی یہ آیت اگر حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی امامت کے حصر کی دلیل ہو گی تو دوسری آیات اس کے متعارض ہوں گی، اور شیعوں کو بھی ان معارض آیات سے خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی امامت سے بھی استدلال کرنا پڑے گا اور کوئی دلیل قابل استدلال اس وقت ہوتی ہے جب معارضات سے محفوظ ہو، خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم سے متعلق آیات اوپر بیان ہو چکیں۔

اور تعجب تو ملا عبد اللہ صاحب اظہار الحق یہ ہوتا ہے کہ وہ اس گروہ کا کچھ سمجھدار اور پڑھا لکھا لگتا ہے، مگر وہ بھی اس استدلال کو صحیح ثابت کرنے کے لئے بڑی کوشش اور تگ و دو میں پڑ گیا اور چند بے سروپا باتوں کے سوا کوئی پُر مغز علمی بات نہ لا سکا۔

ہم صرف اس غرض سے کہ اس فرقہ کی ممتاز شخصیات کے مبلغ علمی اور ان کی دانشمندی روشنی میں آجائے ان کی باتیں نقل کرتے ہیں اور جہاں جہاں ان کو غلطی لگی اس کی نشاندہی بھی ساتھ ساتھ کرتے جارہے ہیں، ایک بات ملا عبد اللہ نے یہ کہی ہے کہ:

> خدا اور اس کے رسول کے ساتھ محبت اور دوستی کا حکم وجوبی ہے تو جو مومن ان اوصاف سے متصف ہوں ان کے ساتھ بھی محبت و دوستی کا حکم وجوبی ہو جانا چاہیے کیونکہ کلام بھی ایک ہے اور قصہ بھی ایک اور جس کا موضوع ایک ہو، اور محمول بھی ایک اور کئی صورتوں میں ایک دوسرے پر معطوف بھی ہوئی تو یہ جائز نہیں کہ ایک جگہ تو حکم کو بطریق وجوب مانیں اور دوسری جگہ بطریق ندب (مستحب) اور ایک لفظ کو ایک ہی استعمال میں دو معنوں کے لئے لینا یہ بھی جائز نہیں، لہذا اس آیت کے مفاد اور مطلب کے بموجب مومنین متصفین بصفات مذکورہ کی ولایت اور دوستی واجب ہوگی، اور ان کی دوستی مطلقاً بغیر کسی قید و جہت کے ہونے میں خدا اور رسول کی دوستی سے تیسرے درجہ پر ہوگی، اب اگر مومنین سے سارے مسلمان مراد ہوں اور پوری امت اس اعتبار سے کہ سارے مسلمان ان صفات سے متصف ہو سکتے ہیں، تو یہ ناقابل عمل ہے کیونکہ ہر شخص پر سب سے تعارف ہی دشوار ہے چہ جائیکہ ان سے دوستی رکھنا یہ تو اس سے بھی دشوار تر ہے، پھر بعض وجوہ سے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مومن کی دوسرے مومن کے ساتھ دشمنی مباح ہو جاتی ہے بلکہ واجب لہذا یہاں اس آیت میں مراد حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ ہی ہوں گے۔ (1)

ان کی اس تحریر میں عقلمندوں کو تھوڑا سا غور و فکر کرنا پڑے گا تب ہی اس فرقہ کے علماء کی فہم عالی کا

1۔ چون محبت و دوستی با خدا اور سول بطریق وجوب ثابت است، پس واجب باشد کہ با مومنان متصف بصفات مذکورہ نیز بطریق وجوب باشد۔ زیرا کہ کلام واحد است و قصہ واحد، و موضوع و محمول متحد۔ و عطف کردن واجب بر مندوب (مستحب) در یک صیغہ جائز نہ باشد و استعمال لفظ واحد در معنیین مختلفین در یک استعمال نیز روا نیست۔ پس بمقتضائے ایں آیت، ولایت مومنین مذکورین واجب باشد۔ و اگر مراد از مومنین جمیع امت باشد، ایں تکلیف مالا یطاق است، زیرا کہ معرفت ہر فردے از افراد امت و دوستی با ہمہ کس در غایت دشواری است۔ بلکہ گاہے عداوت مومن با مومن دیگر بسبب بعض وجوہ مباح بلکہ واجب می شود۔ پس متعین شد کہ مراد ازیں مومن حضرت علی مرتضی علیہ السلام است۔ (اظہار الحق (فارسی) از ملا عبد اللہ یزدی، ص: 534،535، ط: قدیم ایڈیشن بمبئی)

صحیح اندازہ ہوسکے گا، یہ بات ظاہر ہے کہ تمام مومنین کے ساتھ محبت و دوستی بسبب صفت ایمانی کسی قید و جہت سے مخصوص نہیں بلکہ عام ہے، جیسے موالات ایمانی کہتے ہیں، اگر کسی سبب سے عداوت مباح کیا واجب بھی ہو تب بھی موالات ایمانی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، اس معاملہ میں ہم فیصلہ کا حق شیعہ حضرات کو ہی دیتے ہیں وہ بتائیں کہ شیعہ باہم ایک دوسرے سے دوستی اور محبت اتحاد مذہب شیعت کی ہی وجہ سے تو رکھتے ہیں اور یہ دوستی کسی قید کے ساتھ مقید بھی نہیں اور نہ کسی جہت سے مخصوص اس کے ساتھ ساتھ دنیادی معاملات میں چپقلش اور عداوت بھی ہو جاتی ہے تو کیا اس وقت محبت مذہبی ختم ہو جاتی ہے یا اسے کوئی نقصان پہنچتا ہے؟ اور یہ اگر اس آیت کو سمجھنے میں انہیں کوئی مشکل پیش آرہی ہے یا اسے سمجھنا محال خیال کر رہے ہیں تو پورے قرآن سے یہ کیسے چشم پوشی کرسکتے ہیں، ایک دوسری آیت دیکھیے:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللهُ[1]

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے باہم دوست ہیں، اچھی باتوں کا حکم کرتے ہیں اور منکرات سے منع کرتے ہیں، نماز قائم کرتے، زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ ورسول کی اطاعت کرتے ہیں، اللہ عنقریب ان پر رحم فرمائے گا۔

اور اگر ایمانی دوستی سب مومنین سے عام اس سے کہ وہ مطیع ہوں یا نافرمان خدا اور رسول کی دوستی سے تیسرے درجہ پر ہو تو اس میں کونسی عقلی خرابی لازم آتی ہے وہاں خرابی اس وقت ہے کہ یہ تینوں دوستیاں ایک درجہ اور مرتبہ کی ہوں اور جب خدا کی محبت اصل ہوئی اور رسول کی محبت اس کے تابع اور مومنین و عام مسلمانوں کی اس کے تابع تو یہ تینوں محبتیں برابر کب ہوئیں اور موضوع و محمول کے اتحاد کا قضیہ یہاں متحقق نہیں یہ تو ملاجی کی ایک دھونس ہے جو اہل سنت کے جاہل لوگوں کو ڈرانے اور مرغوب کرنے کے لئے یہ منطق

1۔ سورۃ التوبۃ، الآیۃ: 71

اصطلاح میں بولنے لگا ہے کہ لوگ اس کو منطقی سمجھ کر اس کے کلام میں رد و قدح کرنے کی جرات نہ کریں پھر کچھ ہوش آیا تو متعدد ہوں مگر ایک دوسرے پر معطوف کا ٹکڑا لگا دیا مگر اتنا نہیں سمجھ سکا کہ بصورت تعدد عطف یہ مقدمہ نا قابل تسلیم ہے کیونکہ عطف حکم کی شرکت کے لئے ہوتا ہے جہت کی شرکت کے لئے نہیں عقلیات میں سے اس کی مثال یہ ہے کہ مثلاً یہ کہیں:

"انما الموجود في الخارج الواجب والجواهر والاعراض"

البتہ خارج میں موجود ہونے والی چیزیں واجب جواہر اور اعراض ہیں۔

حالانکہ واجب کی طرف وجود کی نسبت جہت وجوب کے ساتھ ہے کیونکہ اس کا وجود ضروری ہے اور دائمی ہے بخلاف جواہر و اعراض کے کہ ان کا وہ وجود ممکن ہو سکتا ہے واجب نہیں گو حکم وجود میں سب برابر ہیں اور شرعیات میں اس کی مثال اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے:

قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي [1]

آپ کہیئے یہ میری راہ ہے اللہ کی طرف اعتماد سے بلاتا ہوں میں بھی اور میرے ساتھی بھی۔

حالانکہ دعوت الی اللہ پیغمبر پر تو واجب ہے اور دوسروں پر مندوب اسی لیے اصولیوں نے کہا کہ قرآن فی النظم قرآن فی الحکم کا موجب ہے بلکہ اس قسم کے استدلال کو مسالک مردودہ میں سے لکھا ہے اور اگر اس کو بھی جانے دیں تو یہ ظاہر ہے کہ صرف وجود محبت میں شرکت سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی جو کچھ خرابی ہے وہ اس حالت اور طبعیت کے درجہ و مرتبہ کے اتحاد و یکسانیت میں ہے۔

پھر ملاجی نے تمام مومنین سے من حیث الایمان محبت رکھنے کو خصوصیت کے ساتھ ہر مومن کو پہچاننے پر موقوف ٹھہرایا ہے حالانکہ ایسی کوئی کثرت نہیں جس کو عنوان اور حدود سے نہ پہچانا جا سکے اگرچہ وہ غیر متناہی کیوں نہ ہو پھر متناہی کا کیا ہی ذکر مثلاً "كله عدد فهو نصف مجموع حاشيه "ہر عدد اپنے کناروں کا نصف ہے اس حکم سے تمام اعداد کی طرف اجمالی توجہ تو ہو گئی حالانکہ مراتب اعداد بلاشبہ غیر متناہی ہیں یا مثلاً یوں کہیں

1۔ سورة يوسف ، الاية : 108

کل حیوان حساس ہر حیوان احساس رکھتا ہے اس میں تو جن سے حیوان کے ہر فرد کے لیے حساس ہونے کا حکم لگایا گیا ہے حالانکہ حیوان کی تمام انواع بھی ہم کو معلوم نہیں اصناف و اقرار کا علم تو کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ بیچارا ملا کہ اسے اجمالی ملاحظہ کا بھی پتہ نہیں چلا جسے ایک عامی سے عامی بھی جانتا ہے اور یہ مسکین عنوان و مضمون کے فرق سے بھی آگاہ و آشنا نہیں۔

اور اگر اس بحث کو جو علم معقول سے تعلق رکھتی ہے ناقابل توجہ قرار دے کر تسلیم نہ کریں تو ہم دینی مسلمات کے متعلق ان سے پوچھیں گے اور کہیں گے کہ مسلم تمام کفار سے بحیثیت کفر ترک موالات کرنا اور ان سے دشمنی رکھنا واجب ہے یا نہیں اگر یہ کہہ دیں کہ واجب ہے تو وہی خرابی لازم آئے گی کہ سبب کی پہچان اور معرفت حاصل نہیں اگر کہیں کہ واجب نہیں تو پھر یزید و مروان سے ان کی دشمنی کس طرح ثابت ہوگی اور قرآنی آیات کا کیا جواب دیں گے فرقہ ہائے مومنین میں تو معرفت ایمان کی مدد سے ہم امتیاز کر بھی سکتے ہیں مگر انواع کفر کا تو ہمیں بالکل پتہ ہی نہیں تھا کہ ان میں نوعی امتیاز کر سکیں اشخاص افراد کا امتیاز تو بعد کی بات ہے۔

اور پھر ان کا اعتراض موالات علویہ (اولاد علی) سے بھی ٹوٹتا ہے جو ان کے اعتقادات میں داخل ہے کیونکہ علوی حضرات اور ان کی گنتی معلوم کرنا جبکہ وہ اکناف عالم میں پھیلے ہوئے ہیں عام مومنین ہی کی طرح کی مشکل سے کم نہیں ملا عبد اللہ کی مندرجہ بالا بات کی طرح ان کی ایک اور بات یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ خود اہل سنت کی بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی کہ آپ اپنا خلیفہ نامزد فرما جائیں چنانچہ مشکوۃ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت یوں بیان کی گئی ہے:

قالوا يا رسول الله لو استخلفت؟ قال: لو استخلفت عليكم فعصيتموه عذبتم ولكن ما حدثكم حذيفة فصدقوه وما أقرأكم عبد الله فاقرأوه رواه الترمذي.[1]

صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا اچھا ہوتا کہ آپ کسی کو خلیفہ مقرر فرما دیتے آپ نے ارشاد فرمایا میں اگر کسی کو خلیفہ بناتا اس کے بعد تم اس کی نافرمانی کرتے تو اس کی وجہ سے تم کو عذاب

1۔ مشكاة المصابيح، باب جامع المناقب، الفصل الثاني، 3/ 1757، رقم: 6241، ط: المكتب الإسلامي بيروت

دیا جاتا لیکن اس سلسلہ میں حذیفہ جو حدیث تم کو سنائے اس کو سچ جانو اور جو چیز جس طرح تم کو عبداللہ پڑھائے اس کو پڑھو۔

اسی طرح آپ سے اس شخص کے بارے میں بھی دریافت کیا گیا جو خلافت وامامت کے لائق ہو اس کی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنو وہ روایت فرماتے ہیں:

قيل يا رسول الله من يؤمر بعدك؟ قال: إن تؤمروا أبا بكر تجدوه أمينا في الدنيا راغبا في الآخرة وإن تؤمروا عمر تجدوه قويا أمينا لا يخاف في الله لومة لائم وإن تؤمروا عليا ولا أراكم فاعلين تجدوه هاديا مهديا يأخذ بكم الصراط المستقيم[1]

آپ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ ہم آپ کے بعد کس کو امیر بنائیں آپ نے فرمایا اگر ابو بکر کو اپنا امیر بنالو گے تو اسے امین پاؤ گے دنیا سے بیزار آخرت کے طلب گار اور اگر عمر کو امیر بنالو گے تو اسے مضبوط امانت دار پاؤ گے جو اللہ کے معاملات وراستہ میں کسی بھی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتا اور اگر تم علی کو امام بناؤ گے اور میرا خیال ہے تم ایسا نہیں کرو گے تو اس کو ہدایت کرنے والا اور ہدایت یافتہ پاؤ گے تم کو سیدھے رستے پر لگائے گا۔

یہ التماس اور استفسار بتاتا ہے کہ نزول آیت کے وقت بموجودگی رسول اللہ ﷺ امر امارت میں تردد موجود تھا تو اس صورت میں انما کے معنی باطل نہ ہوئے۔

یہاں بھی بات غور وفکر کی ہے اس لئے کہ محض سوال یا دریافت تردد کا تقاضا نہیں کرتا ہاں جناب نبی کریم ﷺ کا جواب سننے کے بعد باہمی مشورہ کرنے اور امیر بنانے میں ایک دوسرے سے مختلف الخیال ہوتے

---

1 ۔ مسند الإمام أحمد بن حنبل، 2/ 214، رقم : 859، ط: موسسة الرسالةوأخرجه ابن الجوزي في "العلل المتناهية" 1/ 254،253 من طريق المسند وأخرجه البزار (783) ، والحاكم 3/ 70 من طريق فضيل بن مرزوق، عن أبي إسحاق، بهذا الإسناد. قال الحاكم: صحيح الإسناد! فتعقبه الذهبي بقوله: ضعيف۔

اور نزاع و جھگڑا کرتے تو البتہ انما کے معنیٰ متحقق ہوتے اس وقت یہ کہہ سکتے تھے کہ ان میں تردد و شک پایا جاتا تھا، صرف التماس واستفسار انما کی ضرورت نہیں یہ موقع تو ان کا ہے جیسا کہ علم معانی کی ابتداء میں بحث مؤکدات اسناد میں اس کا ذکر ہے کہ ایسے موقع پر ان کا استعمال ہوتا ہے انما کا نہیں، آہ بے چارے ملاجی! کہ ان کو ابھی تک ان اور انما میں بھی تمیز کرنا نہ آیا!

اور اگر ان کا دل رکھنے کی خاطر تردد کی موجودگی مان بھی لیں تو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ یہ تردد نزول آیت سے پہلے تھا یا بعد میں پیدا ہوا ہو، اگر پہلے تھا تو متصل تھا یا کچھ فاصلہ سے، اگر متصل تھا تو یہ اتصال اتفاقی تھا یا یہ واقعہ آیت کے نزول کا سبب بھی تھا، یہ تمام امور سند صحیح کے ساتھ ہنوز تشنہ بیان ہیں اور مقام استدلال میں خالی خولی احتمالات کی کوئی گنجائش نہیں دوسرے اسباب نزول کوئی عقلی امر نہیں، بغیر خبر صحیح کے محض احتمالات پر کوئی کیوں کان دھرے ان سے کسی طرح ثبوت فراہم کرے اس کو تو مفسرین ہر دو فرقہ میں سے کسی نے بھی سبب نزول قرار نہیں دیا تو معلوم ہوا کہ یہ واقعہ نزول آیت کے متصل نہیں تھا ممکن ہے بعد کا واقعہ ہو بہر صورت یہ ان کے مفید مطلب بالکل نہیں۔

اور طرفہ تماشا یہ کہ جو حدیث بیان کی وہ کلمہ انما کے ساتھ واضح خلاف اور منافات رکھتی ہے کیونکہ حضور ﷺ کا جواب اس سوال کے ذیل میں ہے کہ لائق خلافت و امامت کون ہے اور جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ان اشخاص میں سے ہر ایک کو استحقاق خلافت ہے لیکن ترتیب اسماء میں در حقیقت شیخین رضی اللہ عنہما کو مقدم رکھنے کی طرف اشارہ ہے تو اس حدیث میں حضور کے جواب اور سائل کے سوال میں صاف منافات نکلی کیونکہ آیت میں تو انما خلافت کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے مخصوص کر رہا ہے اب اگر آیت کو حدیث سے مقدم مانیں تو رسول اللہ ﷺ کا فرمان قرآن کے مخالف ہوتا ہے اور اگر آیت حدیث سے بعید ہے تو قرآن سے نبی کریم ﷺ کے قول کی تردید و تکذیب لازم آتی ہے اور اس بات کی یہاں گنجائش نہیں کہ یہ کہدیں کہ ایک نے دوسرے کو منسوخ کر دیا، کیونکہ حدیث و آیت دونوں باب اخبار سے ہیں اور اخبار نہیں نسخ جائز نہیں، اور اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ چونکہ ان میں سے ایک کا دوسرے پر تقدم و تاخر معلوم نہیں تو

(منافات کے سبب) ہر دو کا عمل ساقط ہوا۔

اگر وہ یہ کہیں کہ حدیث خبر واحد ہونے کی وجہ سے مسئلہ امامت میں قابل تمسک نہیں تو ہم کہیں گے کہ پھر یہ تردد اور اثبات نزاع میں بھی قابل استدلال نہیں رہے گی، پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ خود آیت کے ساتھ استدلال بھی تردد و نزاع کے ثبوت پر موقوف ہے اور وہ ثبوت ہے نہیں تو شیعوں کا اس آیت سے استدلال بھی غلط ہوا کیونکہ مسئلہ امامت میں ایسی آیت سے بھی استدلال جائز نہیں جس کی خبر واحد پر موقوف ہو۔

اور پہلی حدیث میں استخلاف کو امت کے حق میں ترک اصلح فرمایا پس اگر آیت "انما ولیکم الله" استخلاف پر دلالت کرے تو جناب الہیٰ سے ترک اصلح کا صدور لازم آئے گا جو حال ہے لہذا پہلی حدیث ان کو منع کرتی ہے کہ اس مسئلہ میں اس آیت سے استدلال نہ کریں، یہ ان کے چیدہ اور برگزیدہ علماء کی باتیں ہیں کہ علمی جلالت شان رکھتے ہوئے بھی کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کہہ سکتے پھر ان کی دوسری پاور ہوا باتیں جو ان کے منہ سے بے سوچے سمجھے نکلتی ہیں ہم نقل کرنے بیٹھے جائیں تو خواہ مخواہ وقت کا ضیاع ہوگا اور بات بے فائدہ لمبی ہو جائے گی۔

ان کے بعض اقوال میں سے ایک یہ ہے کہ آیت:

"إنما يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجسَ أَهْلَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا"[1]

اے اہل بیت اللہ چاہتا ہے کہ تم سے نجاست دور کر کے تم کو پورا پورا پاک کر دے۔

کے بارے میں سارے مفسرین متفق القول ہیں کہ یہ آیت حضرت علی، بی بی فاطمہ اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کے حق میں نازل ہوئی اور تاکیدی پہلو کے لحاظ سے ان کی عصمت کا ثبوت دیتی ہے۔

یہاں بھی مقدمات گڑبڑ ہیں، اول تو اجماع مفسرین ان کے اتفاق قول کا دعویٰ ہی غلط ہے اس لئے کہ ابن ابی حاتم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ یہ آیت ازواج مطہرات کے حق میں نازل ہوئی ہے، اور ابن جریر عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ وہ علی الاعلان کوچہ و بازارہ میں یہ کہتے پھرتے تھے کہ یہ

1۔ سورۃ الاحزاب، الایۃ: 33

آیت ازواج مطہرات کے بارے میں اتری ہے،[1] اور سیاق و سباق آیت کے لحاظ سے یہ ہی بات ظاہر و صحیح ہے، کیونکہ "يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ"[2] سے اطعن بلکہ والحکمۃ تک ازواج مطہرات ہی سے خطاب ہے اور امر و نہی کا تعلق انہیں سے ہے، تو اب ایک سلسلہ کلام میں دوسروں کا حال لے آنا اس تنبیہ کے بغیر کہ پہلا کلام ختم دوسرا شروع، طریقہ بلاغت کے خلاف ہے جس سے قرآن مجید کو پاک جاننا اور ماننا چاہیے پھر بیوتکن کا لفظ بڑھا کر بیوت ازواج مطہرات کی طرف اشارہ کرنا بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ آیت میں اہل بیت سے ازواج مطہرات ہی مراد ہیں اس لئے کہ ازواج مطہرات کے بیوت کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کا اور کون سا بیت تھا یا ہو سکتا تھا۔

ملا عبد اللہ کہتا ہے کہ بیوتکن میں بیوت کو جمع کی صورت میں لانا اور اہل بیت میں واحد کی صورت میں یہ بتاتا ہے کہ ان کے بیوت بیت نبوت کے علاوہ نہیں اگر وہ اہل بیت ہوتی تو کلام یوں ہوتا واذکرن مایتلی فی بیتکن بجائے بیوتکن کے۔

اب ذرا انصاف سے کام لے کر دیکھیں کہ یہ پڑھے لکھے عالم و دانشمند ملا جی کتنی بے مغز اور پوچ بات کر رہے ہیں۔ اہل بیت میں بیت کو جو اسم جنس ہے جس کا اطلاق قلیل و کثیر سب پر ہوتا ہے اس اعتبار سے کہ اس کی نسبت و اضافت آنحضرت ﷺ کی طرف ہے مفرد لائے کہ ازواج مطہرات کے سب گھر اس اضافت

---

1 ۔ وروى ابن جرير: عن عكرمة أنه كان ينادي في السوق: {إنما يريد الله ليذهب عنكم الرجس أهل البيت ويطهركم تطهيرا} ، نزلت في نساء النبي صلى الله عليه وسلم خاصة، وهكذا روى ابن أبي حاتم قال: حدثنا علي بن حرب الموصلي، حدثنا زيد بن الحباب، حدثنا حسين بن واقد، عن يزيد النحوي، عن عكرمة عن ابن عباس في قوله: {إنما يريد الله ليذهب عنكم الرجس أهل البيت} قال: نزلت في نساء النبي صلى الله عليه وسلم خاصة. وقال عكرمة: من شاء باهلته أنها نزلت في أزواج النبي صلى الله عليه وسلم.(تفسير القرآن الكريم لابن كثير ، 6/ 410 ،ط: دار طية)

2 ۔ سورة الاحزاب ، الاية : 32

کے اعتبار سے ایک گھر کی جگہ ہیں اور بیوتکن میں چونکہ اضافت ازواج مطہرات کی طرف ہے اور وہ متعدد ہیں، اس اعتبار سے جمع کا صیغہ لائے۔

اور ملا عبد اللہ نے جو یہ کہا ہے کہ معطوف معطوف علیہ میں فاصلہ لانا اگرچہ طویل ہو کوئی حرج کی بات نہیں اس لئے کہ اس آیت کریمہ میں یہ واقع ہے "أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ "[1] پھر آیت کے ختم پر فرمایا "وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ"[2] مفسرین کا قول ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ کا عطف اطیعوا الرسول پر ہے۔ تمت کلامہ

ان کا یہ قول پہلے قول سے بھی زیادہ لچر اور پوچ ہے اس لئے کہ معطوف علیہ و معطوف میں فاصلہ ایسے اجنبی امر سے جو نحوی اعراب کے اعتبار سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو بے شک جائز ہے لیکن یہ فاصلہ ہمارے لئے موجب نقض نہیں اس لئے کہ ہماری بحث کا تعلق اس اجنبیت اور مغایرت میں ہے جو اگلی پچھلی آیات کے موقع و محل کے اعتبار سے پیدا ہوتی ہے اور بلاغت کے خلاف یہ صورت ہے وہ نہیں۔

اور یہ بات جو انہوں نے بعض مفسرین کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ، اطیعوا الرسول پر معطوف ہے صریحاً غلط ہے اس لئے کہ اقیموا الصلوٰۃ کے بعد پھر اطیعوا الرسول آیا ہے اس صورت میں عطف الشیئ علی نفسہ (کسی چیز کا عطف خود اسی چیز پر) لازم آتا ہے، اور اس سے بھی زیادہ لچر اور مضحکہ خیز بات انہوں نے یہ کہی ہے کہ: "آیات میں مغایرت انشائی اور خبری کی ہے کیونکہ آیت تطہیر جو جملہ ندائیہ اور خبریہ ہے اور اس کے قبل و بعد امر و نہی ہے یہ انشائیہ ہے اور انشائیہ کا عطف خبریہ پر قطعاً ممنوع ہے"

اول تو آیت تطہیر میں حرف عطف ہے ہی کہاں بلکہ وہ تو "وَأَطِعْنَ اللهَ وَرَسُولَهُ" میں جو اطاعت کا

1۔ سورۃ النور، الآیۃ: 54

2۔ سورۃ النور، الآیۃ: 55

امر ہے اس کی علت ہے اور انشائیہ کو خبر یہ کی علت ٹھہرانا پورے قرآن وحدیث میں عرب کے کلام میں مشہور اور رائج ہے مثلا یہ کہتے ہیں "اضرب زیدا انه فاسق یااطیعني یا غلام انما ارید ان اکرمك" اور اگر واذکرن کا عطف مراد لیتا ہے تو اس کے معطوف علیہ اطعن، قرن اور دوسرے سابق حکم ہیں نہ کہ انما۔

یہیں سے ان کے علماء کی عربی دانی کی پول بھی کھل جاتی ہے اور نحو وصرف میں اتنی واضح کوتاہی کے باوجود چاہتے یہ ہیں کہ کلام اللہ کے مفسر بنے شاید خواب میں کسی چوہے کو اونٹ بنتے دیکھ لیا ہوگا یا ہلدی کی گرہ پا کر پنساری بننے کا خواب دیکھنا چاہتے ہوں گے۔

اور عنکم میں مذکر کے صیغہ کا استعمال اھل کے لفظ کے لحاظ سے ہے اہل عرب کا یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی ایسی چیز کو جو حقیقت میں مونث ہو مذکر لفظ سے تعبیر کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے مذکر کا صیغہ استعمال کرتے ہیں جیسے قرآن مجید کی اس آیت میں "أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللهِ رَحْمَتُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُ حَمِيدٌ مَجِيدٌ"[1] اللہ کے حکم سے جو تم پر رحمتیں اور برکتیں ہیں تو اے اہل بیت کیا تم اس پر تعجب کرتے ہو اللہ بے شک تعریف کیا ہوا بزرگ ہے۔

اور ترمذی نیز صحاح کی دوسری کتابوں میں جو یہ روایت ہے کہ حضرت ﷺ نے چار افراد کو اپنے کمبل کی بغل میں لے کر یہ دعا فرمائی "اللهم هؤلاء أهل بيتي فأذهب عنهم الرجس وطهرهم تطهيرا" اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے ناپاکی دور کر اور ان کو پورا پورا پاک فرما دے، اور جب ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اس وقت آئیں اور کہا کہ مجھے بھی ان میں شریک فرمالیجئے تو آپ نے فرمایا "أنت على خير وأنت على مكانك" تو تو میری ہوہی اور تمہارا تو خود ایک مقام ہے۔[2]

یہ واقعہ صاف طور پر اس بات کی دلیل ہے کہ آیت تطہیر ازواج مطہرات ہی کے حق میں نازل ہوئی

1۔ سورۃ ھود، الآیۃ : 73

2۔ المعجم الکبیر للطبراني ، 3/ 53، رقم :2666، ط: مکتبۃ ابن تیمیۃ القاھرۃ

تھی اور یہ چار بھی چونکہ آپ ﷺ کے جگر پارے اور عزیز تھے مگر آیت کا مصداق نہ تھے اس لیے آپ نے ان کو بھی اس وعدہ الٰہی میں شریک کرنے کی خصوصی دعا فرمائی اگر آیت انہی کے حق میں اتری ہوتی تو اس اہتمام سے دعا کی کیا ضرورت تھی اور ایک حاصل شدہ بات کی خاطر آپ دوبارہ کیوں کوشش فرماتے اور اس لیے آنحضور ﷺ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو اس میں شریک نہیں فرمایا کہ ان کے لیے تو وعدہ الٰہی نازل ہو ہی چکا تھا اس لیے ان کے حق میں یہ دعا تحصیل حاصل ہوئی۔

اور اہل سنت کے محقق علماء کا یہ خیال ہے کہ گو یہ آیت خطاب تو ازواج مطہرات سے کر رہی ہے لیکن چونکہ اعتبار عمومی لفظ کا ہوتا ہے خصوص سبب کا نہیں،[1] اس لیے تمامی اہل بیت اس بشارت میں داخل ہیں اور حضور ﷺ نے جو چار افراد کے لیے دعا فرمائی وہ کسی سبب خاص کی بنا پر فرمائی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے سیاق وسباق کلام یا کسی قرینہ سے یہ محسوس فرمالیا ہو کہ یہ آیت ازواج مطہرات کے لیے ہی خاص ہے دیگر اہل بیت کی اس سے مراد نہیں تو آپ نے خصوصیت کے ساتھ چار اشخاص کے لیے دعا فرمائی اور بیہقی کی صحیح روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہی معاملہ آپ نے اپنے محترم چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور آپ کی اولاد کے لیے بھی فرمایا بیہقی نے ابی السید الساعدی سے یہ روایت بایں الفاظ نقل کی ہے:

قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم للعباس بن عبد المطلب «يا أبا الفضل لا ترم منزلك أنت وبنوك غدا حتى آتيك فإن لي بكم حاجة» فانتظروه حتى جاء بعد ما أضحى فدخل عليهم فقال: السلام عليكم فقالوا: وعليك السلام ورحمة الله وبركاته. قال: كيف أصبحتم؟ قالوا: بخير نحمد الله. فقال لهم: تقاربوا. فزحف بعضهم إلى بعض حتى إذا أمكنوا اشتمل عليهم بملاءة ثم قال «يا رب هذا عمي وصنو أبي وهؤلاء أهل بيتي استرهم من النار كستري إياهم بملاءتي هذه» قال

1۔ العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب (البرهان في علوم القرآن: 1/ 32 و الإتقان للسيوطي: 1/ 89)

فأمنت أسكفة الباب و حوائط البيت و قالت: آمين آمين آمين.[1]

رسول اللہ ﷺ نے عباس بن عبد المطلب سے فرمایا اے ابو الفضل کل جب تک میں تمہارے پاس نہ آؤں تم اور تمہارے لڑکے بالے گھر سے نہ جائیں مجھے تم سے کچھ کام ہے بس وہ آپ کے منتظر رہے یہاں تک کہ آپ چاشت کے بعد تشریف لے آئے اور ان کے پاس پہنچ کر السلام علیکم فرمایا ان سب نے جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا پھر آپ نے فرمایا صبح کیسی گزری سب نے کہا خدا کا شکر ہے خیریت سے گزرے پھر آپ نے فرمایا قریب قریب آجاؤ وہ سب کھسک کر آپ کے قریب مل جل کر بیٹھ گئے تب آپ نے ان سب کو اپنی چادر مبارک کی بغل میں لے لیا اور فرمایا اے میرے رب یہ میرے چچا ہیں میرے باپ کے سگے اور یہ میرے اہل بیت تو ان کو آتش دوزخ سے اس طرح آڑ میں لے لے جس طرح میں نے ان کو اپنی چادر کی اوٹ میں لے لیا ہے راوی کا بیان ہے کہ آپ کی اس دعا پر گھر کے در و دیوار بام و در سب نے تین مرتبہ باآواز بلند آمین کہی۔

ابن ماجہ نے بھی یہ روایت مختصراً اپنے ہاں بیان کی ہے اور دوسرے محدثین نے بھی یہ قصہ متعدد طریقوں سے اعلام النبوۃ میں روایت کیا ہے، ملا عبد اللہ نے یہ کہا ہے کہ:

"بیت سے مراد بیت نبوت ہے اور اس میں تو شک نہیں کہ اہل بیت کا لفظ باعتبار لغوی معنیٰ ازواج کو بھی شامل ہے بلکہ اس فرد پر بولا جاتا ہے جو اس گھر میں رہتا بستا ہو مثلاً خدام غلام وغیرہ لیکن اس پر اتفاق ہے کہ یہ وسیع لغوی معنیٰ مراد نہیں لہذا اس سے مراد خمسہ اہل عبا ہوں گے جن کی تخصیص حدیث کسا نے کی"[2]

1۔ أخرجه الطبراني، المعجم الكبير: 19/ 263. قال عنه الهيثمي: «وإسناده حسن» و سنن ابن ماجه: 2/ 1222.

2۔ مراد از بیت دریں مقام بیت نبوت است۔ و شکے نیست کہ لفظ اہل بیت باعتبار لغت شامل ازواج مطہرات نیز ہست، بلکہ بر ہر کسے کہ دراں خانہ سکونت دارد اطلاق می شود مثل خدام و غلام۔ لیکن اتفاق ست کہ ایں معنی لغوی وسیع مراد نیست، بلکہ مراد ازاں پنج تن پاک (خمسہ اہل عبا) ہستند کہ حدیث کسا تخصیص ایشاں کردہ است۔ (اظہار الحق از ملا عبد اللہ یزدی، ص:538، 539، قدیم بمبئی ایڈیشن، 1300ھ / 1882ء)

اس کی یہ بات بھی پہلے بیان شدہ باتوں جیسی ہی ہے کیونکہ اس وسیع لغوی معنی کے مراد لینے میں جو قباحت ان کو لازم آتی ہے وہ عصمت کی عمومیت ہے اگر یہ سب کو مراد لے لیتے ہیں تو سب کو معصوم بھی ماننا پڑے کیونکہ وہ اہل بیت کی معصومیت پر اس آیت ہی سے تو استدلال کرتے ہیں اور جب اہل سنت شیعوں کے ساتھ اس بات میں متفق نہیں کہ اس ایت سے عصمت سمجھی جاتی ہے اور خمسہ اہل عبا اور ازواج مطہرات میں عصمت (معصومیت) کے قائل نہیں تو اس عمومی معنی مراد لینے میں ان سے کیوں متفق ہوں گے یہ تو ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے وسیع دائرہ کو تنگ کرنا ہوگا۔

پھر اگر وہ وسیع لغوی معنی مراد نہ بھی ہوں تب بھی وہ اس لحاظ سے کہ اگلی پچھلی آیات کے قرائن مراد کو متعین کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ باعتبار عرف عقل بھی اس لفظ کو ان لوگوں کے لیے مخصوص کرتی ہے جو گھر میں سکونت پذیر ہوں اور عادتاً ان میں انتقال، تحول اور تبدل کا سلسلہ جاری نہ ہو مثلاً ازواج و اولاد نہ کہ خادم غلام اور کنیزیں کہ یہ تبدیلی ردوبدل کا نشانہ بنے رہتے ہیں، خادم نوکری چھوڑ کر دوسرے کے پاس چلا جا سکتا ہے غلام و کنیز کی ملکیت بدل سکتی ہے وہ بک کر کسی اور مالک کے پاس چلے جاسکتے ہیں یا بخشش کے طور پر کسی کو دیئے جاسکتے ہیں یا آزاد ہو کر یہ گھر چھوڑ دیتے ہیں اور حدیث کسا اہل بیت کے ساتھ ان چند اشخاص کو اس وقت مخصوص کرتی ہے جب اس تخصیص کا کوئی اور فائدہ نظر نہ آتا حالانکہ یہاں اس کا دوسرا فائدہ یہ پیش نظر ہے کہ صرف ازواج مطہرات کے مخاطب ہونے کے سبب یہ خیال پیدا نہ ہو کہ یہ چند اشخاص اہل بیت میں نہیں۔

کتنی حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ پورا عالم اسلام کیا سنی کیا شیعہ آنحضرت ﷺ کی ازواج کے ذکر کے وقت ہمیشہ ان کی تعظیمی لقب مطہرات سے یاد کرتا ہے چنانچہ نور اللہ شوستری اور ملا عبداللہ مشہدی اور ان کے دوسرے علماء کی تحریروں میں ہزاروں جگہ لکھا دیکھا ہے اور ظاہر ہے یہ لقب اسی آیت تطہیر سے لیا گیا ہے اور لفظ مطہرات بلاریب و شک ان کے منصف لوگوں کی زبانوں پر جاری ساری رہتا ہے اس کے باوجود اگر کوئی ان سے یہ کہہ دے کہ آیت تطہیر ازواج نبی ﷺ کی طہارت و تطہیر کا پتہ دے رہی ہیں تو ان کے رگ پھول جاتی ہے اور لڑاکا مرغ کی طرح (بحث و جدال میں) الجھ پڑتے اور جھگڑنے لگتے ہیں۔

مسئلہ عصمت از آیت زیر بحث

اب رہا یہ مسئلہ کہ یہ آیت عصمت پر دلالت کرتی ہے یا نہ تو یہ چند بحثوں پر مبنی ہے ایک تو یہ کہ "لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ" ترکیب نحوی میں کیا واقع ہوا ہے آیا یہ یُرید کا مفعول لہ ہے یا مفعول بہ دوسرے اہل بیت سے کیا مراد ہے اور تیسرے رجس سے کیا مراد ہے؟

ان تینوں امور میں بحث و گفتگو کی بڑی گنجائش ہے اس پر کی گئی بحثوں کے لیے بڑی بڑی کتب تفاسیر کی طرف رجوع کرنا چاہیے رو قد کے بعد اگر نتیجہ یہ نکلے کہ " لِيُذْهِبَ "مفعول بہ ہے اور اہل بیت کا انحصار انہی چار اشخاص میں ہے اور رجس سے مراد مطلق گناہ ہیں پھر بھی اس آیت کی عصمت پر دلالت قابل تسلیم نہیں بلکہ یہ اس وقت بھی عدم عصمت پر ہی دلالت کرے گی کیونکہ کسی پاک چیز کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم اس کو پاک کرنا چاہتے ہیں زیادہ سے زیادہ اس ارادہ کے وجود میں آنے کے بعد ان چند اشخاص کا گناہ سے محفوظ رہنا ثابت ہو گا اور یہ حفاظت بھی اہل سنت کے اصول کے ماتحت ہو گی شیعہ اصول کے بموجب نہیں کیونکہ ان کے نزدیک ارادہ الٰہی مراد الٰہی کے وقوع کے لیے لازم نہیں اللہ تعالیٰ بہت سی چیزوں کا ارادہ کرتا ہے مگر شیطان یا بنی آدم اس کو وجود میں نہیں آنے دیتے اس کی تفصیل باب الٰہیات میں گزر چکی اور اگر مقصود الٰہی عصمت ہی ظاہر کرنا ہوتا تو اس کے لیے یوں عبارت لائی جاتی "ان اللہ اذہب عنکم الرجس وطهركم تطهيرا" اور یہ ایسی صاف بظاہر بات ہے جسے غبی اور معمولی سمجھ کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے چہ جائیکہ ذکی اور علامہ!

اور پھر اگر یہ کلمہ عصمت کو ثابت کرتا ہوتا تو پھر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم بالعموم اور اصحاب بدر بالخصوص سب کے سب معصوم ہوتے اس لیے کہ ان کے حق میں تو یہ کلمہ کئی مرتبہ فرمایا گیا ہے مثلاً:

وَلَكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ[1]

اور لیکن چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور تم پر اتمام نعمت کرے تاکہ تم شکر بجالاؤ۔

---

1 سورة المائدة ،الاية : 6

وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ[1] اور دور کر دے تم سے شیطانی گندگی کو۔

اور دو لفظوں سے جن سے عصمت کا اظہار ہوتا ہے ان آیات میں تو صحابہ کے لیے اتمام نعمت کی مہربانی و عنایت مزید ثابت ہو گئی کیونکہ اتمام نعمت تو اس وقت تک تصور میں بھی نہیں آ سکتا جب تک گناہوں اور شر شیطان سے حفاظت نہ کی جائے، اب وہ تخصیصات جو لفظ تطہیر اور اذہاب رجس سے بطریق احتمال و شک ثابت کی جا رہی تھیں کہاں گئیں وہ تو غبار کی طرح ہوا میں اڑ گئیں۔

تیسری بات وہ یہ کہتے تھے کہ غیر معصوم امام نہیں ہوتا ان کا یہ خیال بھی سراسر باطل اور ناقابل تسلیم ہے کتاب اللہ اور عترت رسول دونوں اس کی تردید کرتے ہیں پھر اگر اسے مان بھی لیں تو اس دلیل سے جناب علی رضی اللہ عنہ کی صرف امامت ثابت ہوئی لیکن یہ کہ وہ امام بلا فصل تھے یہ کیسے ثابت ہوا؟ کیا یہ جائز ہے کہ سبطین محترمین رضی اللہ عنہما میں سے کوئی ایک جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ہی نے حیات امام ہو سکتا ہے اگر نہیں تو اس طرح یہ کیسے جائز ممکن ہے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی خلافت اگرچہ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے بعد ہو مگر وہ ہوں امام بلا فصل ایسی بات سے استدلال کرنا جس کا کوئی قائل ہی نہ ہو علم و عقل سے عاجزوں کا کام ہے کیونکہ معترض کا جب کوئی مذہب نہ ہو تو وہ اعتراض کیسے بخش دے گا۔

کیا ہر واجب المحبت واجب الاطاعت ہوتا ہے

ان کے سابقہ سلسلہ کے مسائل میں سے ایک بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَى[2]

آپ کہیے کہ میں تبلیغ دین کے سلسلہ میں بجز اپنے قرابت داروں سے محبت کے تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا۔

اس وقت سب نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے وہ قرابت دار کون ہیں جن کی محبت ہم پر واجب کی

1۔ سورة الانفال، الاية : 11

2۔ سورة الشوري، الاية : 23

گئی ہے آپ نے فرمایا علی فاطمہ اور ان کے دو بیٹے رضی اللہ عنہم۔ (1)

واضح رہے کہ یہ آیت تو اہل سنت کی دلیل ہے جو وہ نواصب کے مقابلے میں اہل بیت کی محبت کو واجب ثابت کرنے کی غرض سے پیش کرتے ہیں چنانچہ علامہ قرطبی اور دوسرے اہل سنت جو شام کے نواصب سے مناظرہ کرتے تھے اس آیت کو اپنی دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے شیعوں نے اسے ان کی کتابوں سے چرایا اور خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کی نفی کی دلیل بنا بیٹھے اور دلیل میں دو تین کلمے اپنی طرف سے بڑھا کر یوں کہنے لگے کہ اہل بیت کی محبت واجب ہے اور اور جس کی محبت واجب ہو اس کی اطاعت بھی واجب ہوتی ہے گویا یوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت واجب ہوئی اور یہی امام ہونے کے معنی ہیں اور ان کے علاوہ کسی کی محبت واجب نہیں لہذا اطاعت بھی واجب نہیں۔

اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کی مراد کیا ہے اس میں مفسرین کا زبردست اختلاف ہے طبرانی اور امام احمد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت اس طرح کی ہے لیکن اکثر محدثین نے اس روایت کو کمزور ثابت کیا ہے کیونکہ یہ آیت سورہ شوریٰ کی ہے اور پوری کی پوری سورہ شوریٰ مکی ہے جبکہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی پیدائش کا تو کیا سوال بی بی فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب تک نہ ہوئی تھیں پھر اس سند میں کٹر شیعہ بھی گھسے ہوئے ہیں محدثین میں سے جس کسی نے اس شیعہ کو سچا سمجھا ہو گا وہ اس کے ظاہری حالات کو دیکھ کر اور اس کے عقیدہ سے ناواقف ہوتے ہوئے کہا ہو گا اور گمان غالب یہ ہے کہ اس شیعہ

---

1 ـ فإنها لما نزلت قالوا: يا رسول الله من قرابتك الذين وجب علينا مؤدتهم؟ قال: علي وفاطمة وأبناؤها. (قال مجيد الخليفة: وهذا الحديث لا يصح من حيث السند لوجود ثلاثة من الضعفاء فيه، فحرب بن الحسن الأزدي، ضعفه الأزدي كما في لسان الميزان: 2/ 184، وقيس بن الربيع قال عنه النسائي: «متروك الحديث» كما في الضعفاء والمتروكين: ص 88؛ ونقل ابن الجوزي عن يحيى قوله: «ليس بشيء»، فقد كان يتشيع وكان كثير الخطأ في الحديث»، الضعفاء والمتروكين: 3/ 19؛ أما حسن بن حسين الأشقر، فإنه أسوؤهم حالا، فقد اتهمه ابن عدي، وقال الذهبي: «هو رافضي» كما في المغني في الضعفاء: 1/ 170. ولذلك قال ابن تيمية: «إن هذا الحديث كذب موضوع باتفاق أهل المعرفة بالحديث، وهم المرجوع إليهم في هذا ..»، منهاج السنة النبوية: 7/ 99، وحكم عليه بالضعف والوهن في سنده أيضا الحافظ ابن حجر عندما قال: «وإسناده ضعيف وهو ساقط لمخالفته الحديث الصحيح ...» فتح الباري: 8/ 564.

نے بھی جھوٹ نہیں بولا ہو گا بلکہ روایت بالمعنی کی ہو گی۔

حدیث میں لفظ اهل بیتی ہو گا اس نے اپنے عقیدہ کے مطابق اہل بیت کی تشریح انہی چار سے کر دی چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت جوں کی توں بیان کی ہے اس کے الفاظ یوں ہیں:

"القربى من بينه وبين النبي صلى الله عليه وسلم قرابة"[1]

قربیٰ وہ ہیں جس کے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان قرابت ہو۔

اور قتادہ سدی کبیر اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ نے وثوق سے کہا ہے کہ آیت کہ یہ معنی ہیں: کہ میں تم سے دینی دعوت اور تبلیغ مذہبی کا کوئی صلہ نہیں مانگتا لیکن تم سے اپنے ساتھ دوستی چاہتا ہوں اس قرابت کی بنا پر جو تمہارے ساتھ رکھتا ہوں۔[2]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی بخاری میں یہ روایت تفصیل سے مذکور ہے کہ قریش میں کا کوئی خاندانی سلسلہ ایسا نہ تھا جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ قرابت نہ ہو لہٰذا آپ نے اس کی یاد دہانی فرمائی اور قرابت کے حق کی ادائیگی چاہی کہ کم از کم ایذا دہی سے تو باز رہیں جو صلہ رحمی کا ادنی درجہ ہے اس صورت میں یہ استثناء منقطع ہے چنانچہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اور تمام مفسرین متاخرین نے اس معنی کو پسند کیا ہے،[3] اس لیے کہ پہلے معنی شان نبوت کے مناسب نہیں یہ تو دنیاداروں کی خصلت ہے کہ جب کوئی کام کرتے ہیں تو اس کا صلہ اولاد و اقارب کے لیے چاہتے اگر انبیاء کی بھی یہی روش ہو تو ان کے اور عام دنیاداروں کے مابین فرق و امتیاز کیا رہ جائے گا اور پھر ان کے اقوال و افعال میں لوگوں کی شک و شبہ کرنے کا بہانہ بھی ہاتھ آ سکتا تھا اور یوں بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا اور پھر ان معنوں کے مطابق یہ آیت بہت سی دوسری آیات کے منافی بھی ہو جاتی جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے:

1۔ صحيح البخاري، باب قوله: إلا المودة في القربى، 6/ 129، ط: دار طوق النجاة

2۔ لا أسألكم على الدعوة والتبليغ من أجر إلا المودة لأجل قرابتي بكم.(صحيح البخاري، كتاب المناقب، باب قوله تعالى: (إنا خلقناكم من ذكر وأنثى): 4/ 1819)

3۔ قال الرازي: «معنى الآية أي لا أسألكم على الدعوة والتبليغ إلا المودة والمحبة لأجل قربتي بكم». التفسير الكبير: 14/ 167.

مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللهِ[1]

جو اجر میں تم سے چاہوں وہ تمہارے لیے میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔

أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَغْرَمٍ مُثْقَلُونَ[2]

کیا تم ان سے اجر مانگو گے یہ تو آپ ہی ڈنڈے بوجھل ہو رہے ہیں۔

اور سورۃ الشعراء میں تمام انبیاء علیہم السلام کی زبان سے اجرت طلبی سے انکار نقل فرمایا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو افضل الانبیاء ہیں کب اجر طلب فرما سکتے تھے کیا اس سورت میں آپ کی کا مقام ان انبیاء کرام علیہم السلام سے نیچا نہ ہو جاتا حالانکہ ایسا ہونا خلاف اجماع ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم یہ مفروضہ تسلیم نہیں کرتے کہ جو واجب المحبت ہو وہ واجب الاطاعت بھی ہو اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جو واجب الاطاعت ہو وہ امام یعنی رئیس عام بھی ہو۔

پہلی صورت کی یہ دلیل ہے کہ اگر محبت کا واجب ہونا اطاعت کے واجب ہونے کو لازم ہوتا تو یہ ضروری ہوتا کہ تمام علوی حضرات واجب الاطاعت ہوں اس لیے کہ شیخ بابویہ نے اپنی کتاب الاعتقاد میں لکھا ہے کہ باجماع امامیہ علویہ کی محبت واجب ہے،[3] اور پھر اس سے یہ بھی لازم آتا کہ اس دلیل کی بنا پر بی بی فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا بھی امام ہوں حالانکہ یہ خلاف اجماع ہے اور اس کی بنا پر یہ بھی لازم آتا ہے کہ یہ چاروں حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں بھی امام ہوں اسی طرح جناب حسنین رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی امام ہوں حالانکہ یہ صورت بالاتفاق غلط اور باطل ہے۔

دوسری صورت یہ کہ اگر ہر واجب الاطاعت خلافت کبری کا مالک ہے تو ہر نبی کو بھی خلافت کبری کا

1۔ سورة سبا،الاية : 47

2۔ سورة الطور،الاية : 40

3۔ فإن الإمامية أجمعت على وجوب محبة العلوية- (نفحات الأزهار في خلاصة عبقات الأنوار،للسيد علي الحسيني الميلاني،20/212، ط: المطبعة: ياران)

مالک ہونا چاہیے حالانکہ یہ غلط ہے اس لیے کہ مثلاً حضرت شموئیل علیہ السلام نبی واجب الاطاعت تھے اور حضرت طالوت خلافت کبریٰ کے مالک تھے، قرآن میں ارشاد فرمایا ہے:

"إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا" (1)

اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ کر کے بھیجا۔

ہماری طرف سے ایک اور جواب یہ ہے کہ ہم یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ محبت صرف اہل بیت ہی کی واجب ہے بلکہ دوسرے بھی اس میں شریک ہیں چنانچہ حافظ ابو طاہر سلفی نے اپنی مشیخت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے:

"حب أبي بكر وشكره على كل أمتي" (2)

ابو بکر رضی اللہ عنہ کی محبت اور ان کا شکریہ میری ساری امت پر واجب ہے۔

ابن عساکر نے بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ابو طاہر سلفی جیسی روایت نقل کی ہے اور ایک دوسرے طریقہ سے سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت مروی ہے اور حافظ عمر بن محمد خضر الملا اپنی سیرت میں یوں روایت کرتا ہے:

إن الله تعالى فرض عليكم حب أبي بكر وعمر وعثمان وعلي، كما فرض عليكم الصلاة والزكاة والصوم والحج (3)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر ابو بکر عمر عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کی محبت اسی طرح فرض کی ہے جس طرح نماز روزہ زکوٰۃ اور حج تم پر فرض کیے۔

ابن عدی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے:

1۔ سورة البقرة، الآية: 247

2۔ تاريخ بغداد، 5/474، ط: دار الغرب الإسلامي بيروت

3۔ تاريخ دمشق، 39/128، ط: دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع

عن النبي ﷺ أنه قال حب أبي بكر وعمر من الإيمان وبغضهما نفاق [1]

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی محبت ایمان ہے اور ان دونوں سے بغض نفاق۔

اور ابن عساکر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے:

قال رسول الله (ﷺ) حب أبي بكر وعمر من الإيمان وبغضهما من الكفر [2]

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہ کی محبت ایمان کا جز ہے اور ان سے بغض کفر۔

اور ترمذی نے روایت کی ہے:

أنه أتي بجنازة رجل إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فلم يصل عليه وقال إنه كان يبغض عثمان، فأبغضه الله [3]

ایک جنازہ نبی کریم ﷺ کے پاس لایا گیا آپ نے اس کی نماز نہیں پڑھی اور یہ فرمایا یہ عثمان سے بغض رکھتا تھا تو اللہ نے بھی اس سے بغض رکھا۔

یہ روایات اگرچہ اہل سنت کی کتابوں سے مذکور ہیں لیکن چونکہ شیعہ اہل سنت کو الزام دینا چاہتے ہیں اس لیے اس سلسلہ کے تمام روایات کو پیش نظر رکھے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا اپنے مطلب کی ایک آدھ روایت سنا دینے سے وہ دھونس میں نہیں آسکتے اور اگر شیعہ اہل سنت کو تنگ کرنے سے باز نہ آئیں تو کتاب اللہ اور عترت رسول کے اقوال سے بھی ان کو جواب دے کر ان کا منہ بند کیا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالی نے فرمایا "يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ"[4] یہ بالاجماع مرتدین سے لڑنے والوں کے حق میں ہے

1۔ الرياض النضرة في مناقب العشرة ، ذكر اختصاصهما (ابو بكر وعمر) بمحبة المؤمنين وبغض المنافقين، 1/ 220، ط: دار الكتب العلميه (بيروت)

2۔ تاريخ دمشق، 30/ 144، ط: دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع

3۔ سنن الترمذي: 5/ 360، رقم 3709

4۔ سورة المائدة، الاية : 54

اور دنیا جانتی ہے کہ خلفاء کرام رضی اللہ عنہم ان کے سر گروہ تھے اور اللہ تعالی جس سے دوستی رکھے وہ واجب المحبت ہے اسی طرح اور بھی آیات ہیں۔

آیت مباہلہ سے خلافت علی بلافصل کے استدلال کا جواب

خلافت بلافصل کے سلسلہ میں ان کی طرف سے آیت مباہلہ بھی پیش کی گئی ہے:

"فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ"[1]

کہیے کہ آؤ ہم تمہیں بلائیں اپنے اپنے بیٹوں عورتوں اور اپنے اپنے نفسوں کو۔

شیعہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مباہلہ کے لیے گھر سے نکلے اور علی، فاطمہ اور حسنین رضی اللہ عنہم کو ساتھ لیا تو معلوم ہوا کہ ابناء سے مراد حضرت حسن حسین رضی اللہ عنہما اور انفس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں گویا جناب امیر نفس رسول ٹھہرے اور یہ تو ظاہر ہے کہ نفس کے حقیقی معنی مراد لینا تو محال ہے لا محالہ مساوی کے معنی ہوں گے اب جو مساوی رسول ہو تو وہ یقیناً دوسروں سے افضل اور اولی بالتصرف ہو گا اس لیے کہ افضل و اولی بالتصرف کا مساوی بھی افضل و اولی بالتصرف ہو گا تو وہ امام ہو گا کیونکہ امام وہی تو ہے جو افضل و اولی بتصرف ہو تک سک سے درست اور نظم و ترتیب کے ساتھ دلیل کی یہ تقریر ہمارے لفظوں میں ہے خود شیعہ علماء میں اتنا سلیقہ بھی نہیں کہ وہ اپنا مافی الضمیر قاعدہ ضابطہ میں پیش کر سکیں دراصل ان پر اس کتاب کا یہ بڑا احسان ہے کہ ان کی اکثر بے ترتیب غیر منظم دلیلوں کو مناسب ترتیب اور دل آویز تقریر سے آراستہ و پیراستہ کیا اگر کسی کو ہماری یہ بات ماننے میں تامل ہو تو وہ ان کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھ لے کہ ان کا کلام کس قدر پراگندہ بے ربط و بے جوڑ ہے یہاں تک کہ وہ اپنا مطلب بھی واضح نہ کر سکے۔

یہ آیت بھی دراصل اہل سنت کی دلیل ہے جس سے انہوں نے نواصب کے مقابلہ میں استدلال کیا سبب استدلال تو ظاہر ہے کہ جناب امیر اور دیگر افراد کو بوقت مباہلہ ساتھ لے جانا کسی وجہ اور سبب ترجیح پر مبنی ہے اور وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو وجہ یہ ہو گی کہ آپ ان حضرات کو عزیز و پیارا جانتے تھے مقصد یہ تھا کہ جب

1۔ سورۃ ال عمران، الآیۃ: 61

ان کو مباہلہ کے وقت جو بظاہر خطرہ ہلاکت سے خالی نہ تھا لے آئیں گے تو مخالف کو آپ کی نبوت کی صداقت پر پورا وثوق اور اعتماد پیدا ہوگا اور حضرت عیسی علیہ السلام کی پیدائش میں جس کی آپ خبر دے رہے ہیں ہرگز شک نہ کریں گے کیونکہ کوئی بھی عقلمند جب تک اپنے دعوی کی سچائی پر پورا یقین رکھتا ہو خود کو اور اپنے پیاروں کو معرض ہلاکت میں نہیں ڈالتا نہ اس پر قسم کھاتا ہے۔

اکثر اہل سنت و شیعوں نے یہ وجہ پسند کی ہے اور ملا عبد اللہ نے اظہار الحق میں اس کو پسند کر کے ترجیح دی ہے اس بنا پر اس آیت سے ان حضرات کا حضور ﷺ کے نزدیک عزیز و محبوب ہونا ثابت ہوگا چونکہ پیغمبر حب و بغض نفسانی سے پاک ہوتا ہے اس لیے ان سے محبت دین تقوی صلاح پر مبنی ہوگی تو ان حضرات میں یہ صفات ثابت ہوں اور چونکہ نواصب کا مذہب اس کے خلاف ہے اس لیے یہ آیت ان کے مقابلہ میں کار آمد و مفید رہی۔

یا ان حضرات کو اپنے ساتھ لے جانے کی وجہ و مقصد یہ تھا کہ یہ حضرات بھی نجران کے کافروں پر بددعا میں شریک ہو جائیں اور آپ کی بددعا پر امین کہیں کہ ان کی آمین کے سبب جلد درجہ قبولیت کو پہنچے اکثر شیعوں نے یہ احتمال اور وجہ بیان کی ہے ملا عبد اللہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اس صورت میں بھی ان بزرگوں کے دینی مرتبہ کی بلندی اور ان کا مستجاب الدعوات ہونا ثابت ہوتا ہے اور نواصب کے مقابلہ میں یہ بھی فائدہ سے خالی نہیں۔

نواصب نے دونوں وجوہ پر رد و قدح کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضور ﷺ کا ان حضرات کو اپنے ہمراہ لے جانا نہ وجہ اول کی بنا پر تھا نہ وجہ ثانی کی بنا پر بلکہ مخالف کے لیے الزامی پہلو مد نظر تھا کیونکہ کفار کے نزدیک یہ تسلیم شدہ اور ثابت شدہ امر تھا کہ جب تک قسم کے وقت اولاد داماد کو حاضر نہ کریں اور ان کی بلا کی پر قسم نہ کھائیں قسم معتبر نہیں آنحضرت ﷺ نے بھی بغرض الزام یہی صورت اختیار فرمائی اور ظاہر ہے کہ اولاد و اقارب کیسے بھی ہوں بہر حال لوگوں کے خیال میں غیروں سے زیادہ عزیز و پیارے ہوتے ہیں گو اس شخص کی نظر میں وہ ایسے نہ ہوں۔

ہماری طرف سے شیعوں کے استدلال کے سلسلہ میں یہ جواب ہے کہ اس طرح مباہلہ کرنا اور اولاد کی قسم کھانا حضور ﷺ کے نزدیک مسلم نہ تھا اگر ہوتا تو شریعت میں ایسی قسم آئی ہوتی حالانکہ شریعت میں تو اس پر ممانعت وارد ہوئی یعنی اولاد کو حاضر کر کے قسم نہ کھائیں نتیجہ یہ نکلا کہ حضور ﷺ نے یہ سب کچھ مخالف کو

خاموش اور لاجواب کرنے کے لیے کیا اسی طرح دوسری وجہ بھی ٹھیک نہیں کیونکہ نجرانی وفد کی ہلاکی و تباہی کوئی بڑی اہم بات نہ تھی نہ کوئی سنگین امر تھا اس سے زیادہ اور سخت تر حوادث سے حضور ﷺ دوچار ہوئے مصائب و دکھ جھیلے مگر کبھی بھی ان بیاروں سے دعا میں مدد کے خواستگار نہ ہوئے۔

اور یہ متفق علیہ امر ہے کہ کفار کے ساتھ مقابلے اور معارضہ میں پیغمبر کی دعا مقبول ہوتی ہے ورنہ تو پھر پیغمبر کی تکذیب لازم آتی ہے اور بعثت کے غرض فوت ہوتی ہے اور پیغمبر کو خود اپنی دعا کے قبول ہونے میں کس طرح شک لاحق ہو سکتا ہے کہ وہ دوسروں کی آمین کی مدد لیتے لہذا یہ وجہ بھی باطل و فاسد و غلط ثابت ہوئی۔

اس موقع پر اس بحث کو طول دینا نامناسب سمجھتے ہوئے اسے یہیں ختم کرتے ہیں حاصل بحث یہ ہے کہ ثبوت مدعا کے لیے دراصل یہی آیت دلیل ہے شیعہ ازراہ تعصب خواہ مخواہ اہل سنت کے مقابلے میں یہ دلیل پیش کر بیٹھے، شیعوں کے اس آیت سے استدلال میں بہت سی خامیاں اور قابل گرفت باتیں پائی جاتی ہیں اول یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ "انفسنا" سے مراد جناب امیر ہیں بلکہ خود حضور ﷺ بنفس نفیس مراد ہیں اس قول کو غلط ثابت کرنے کے لیے علمائے شیعہ نے یہ احتمال و شبہ بیان کیا ہے کہ انسان اپنے آپ کو نہیں بلائے کرتا ان کی یہ بات تو اس گاؤدی کی بات کی طرح ہے کہ کسی گاؤں سے چلا رہا تھا کہ کسی عالم نے پوچھا کہ میاں یہ تو بتاؤ کہ کیا اس گاؤں میں ہل بھی چلاتے یا ہل بھی گھومتے ہیں تو وہ کہنے لگا ارے بھائی کچھ سوچ کے تو بات کر ہل کو نہ وہ چلاتے ہیں نہ وہ چلتے ہیں بیلوں کو چلاتے ہیں اور وہی چلتے ہیں۔

پھر عرف قدیم وجدید میں یہ محاورات ہمیشہ استعمال میں آتے رہتے ہیں "دعته نفسه الی کذا دعوت نفسي الی کذا" اس کے نفس نے اس کو اس طرف بلایا میں نے اپنے نفس کو اس طرف بلایا، یا قرآن مجید کی یہ آیت "فَطَوَّعَتْ لَهُ نَفْسُهُ قَتْلَ أَخِيهِ"[1] رغبت دلائی اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل کی، یہ بھی بولتے ہیں "امرت نفسی" میں نے اپنے نفس کو حکم دیا یا "شاورت نفسی" میں میں نے

1۔ سورۃ المائدۃ، الآیۃ : 30

اپنے نفس سے مشورہ کیا اسی طرح کے اور بھی بہت سے استعمالات فصحاء کے کلام میں پائے جاتے ہیں پس "ندع انفسنا" کے حاصل معنی "تحضر انفسنا" کے ہوئے یعنی حاضر کریں ہم اپنے نفسوں کو۔

پھر ایک قابل لحاظ بات یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ کی جانب کے انفسنا سے جناب امیر رضی اللہ عنہ مراد ہوں تو کفار کی جانب کے انفسکم کا مصداق کون ہوگا حالانکہ ندعوا میں بحیثیت فریق ثانی وہ بھی شریک ہیں اور یہ معنی ہونے نہیں سکتے کہ ہم نبی کریم ﷺ ان کو اور ان کے بیٹوں کو بلائیں جبکہ آپ تعالوا فرما چکے ہیں لہذا معلوم ہوا کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی طرح ابناءنا میں حکماً نہ حقیقتاً داخل ہیں اور عرف میں داماد کو بیٹا ہی شمار کیا جاتا ہے۔

اور نفس، قریب، شریک، نسب، دین وملت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ آیا ہے "یخرجون أنفسهم من دیارهم" نکالتے ہیں وہ اپنے نفسوں کو شریک مذہب لوگوں کو اپنے یا "وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ"[1] مت نام دھرو اپنے نفسوں کا (اپنے شریک دین بھائیوں کا) یا" لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا"[2] جب یہ بات مومنوں اور مومنات نے سنی تو اپنے نفسوں کے ساتھ گمان نیک کیوں نہیں کیا ہم ملت افراد کے ساتھ۔

لہذا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ سے اتصال نسبی، قرابتی اور مصاہرت حاصل تھا اور اتحاد دینی ملی وہم صحبتی اس قدر زیادہ حاصل تھا کہ جس کی بنا پر آپ نے ان کے حق میں یہ تمک فرمادیا "علي مني وأنا من علي "[3] تو آپ کو نفس سے تعبیر کیا تو یہ کون اچنبھے کی بات ہے اور اس سے مساوات کب لازم آتی ہے

1۔ سورۃ الحجرات، الآیۃ : 11

2۔ سورۃ النور، الآیۃ : 12

3۔ العترۃ والصحابۃ فی السنۃ،لمحمد حیات الانصاری 1/ 111۔

جیسی آیات بالا میں نہیں آتی دوسرے یہ بات بھی ہے کہ اگر تمام صفات میں مساوات مراد لیں تو ضروری ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ تمام پیغمبرانہ خصوصیات میں بھی آپ کے شریک ہوں مثلاً نبوت رسالت خاتمیت تمام مخلوق کی طرف بعثت، چار بیویوں سے زائد نکاح کا جواز، قیامت کے دن عرفہ واعلیٰ درجہ پر فائز ہونا، شفاعت کبریٰ کا حصول، مقام محمود کا حصول، وحی کا نزول وغیرہ وغیرہ حالانکہ ان اوصاف میں شرکت بالاجماع باطل ہے اور اگر بعض اوصاف میں مساوات مراد لیں تو اس سے ان کا مقصد حاصل نہیں ہوتا کیونکہ افضل واولی بھی تصرف کے ساتھ بعض صفات میں مساوات افضل واولیٰ بالتصرف نہیں بناتی ظاہر بات ہے۔

اور اس آیت کو امامت کی دلیل ماننے سے یہ لازم آتا ہے کہ جناب علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات بھی امام ہوں اور یہ بات بالاتفاق غلط ہے اور اگر کسی خاص وقت کی قید لگائیں کہ اس وقت نہیں اس وقت تو اگرچہ اس پر بھی کوئی لفظی دلیل آیت میں نہیں مگر پھر بھی مدعا ثابت نہیں ہوگا کیونکہ کسی نہ کسی وقت کے خلافت پر امامت تو اہل سنت بھی مانتے اور ثابت کرتے ہیں ان کا مدعا بلا فصل ہونا تو ثابت نہ ہوا۔

ان کی ایک اور دلیل یہ آیت ہے:

إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ[1]

البتہ آپ ڈرانے والے ہیں اور ہر ایک قوم کے لیے ایک ہدایت دینے والا ہے۔

اسی سلسلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک متفق علیہ روایت ان الفاظ میں منقول ہے:

عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: أنا المنذر وعلي الهادی[2]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں ڈرانے والا ہوں اور علی ہادی ہیں۔

1۔سورۃ الرعد، الآیۃ: 07

2۔الحديث من رواية الحسن بن الحسين العرني الكوفي، وهو من رؤساء الشيعة، قال الدارقطني: «منكر الحديث» كما في ميزان الاعتدال: 2/ 231؛ لسان الميزان: 2/ 199. وقال ابن الجوزي عن الحديث: «هو من موضوعات الرافضة». زاد المسير: 4/ 307.

یہ روایت بسلسلہ تفسیر ثعلبی کی روایت ہے اور اس کی مرویات ساری ہی درجہ اعتبار سے گری ہوئی ہیں اور یہ آیت بھی انہی دلائل میں سے ایک ہے جو اہل سنت نے نواصب کی تردید میں بیان کیے ہیں یہ آیت میں اکیلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت پر دلالت کرتی ہے نہ دوسروں کی امامت سے انکار پر اس لیے کہ کسی کا ہادی ہونا اس کے امام ہونے کے ہرگز متقاضی نہیں اور نہ ہی دوسرے کی ہدایت کی نفی کو مستلزم اور اگر صرف ہدایت امامت پر دلالت کرے تو یہ اصطلاحی امامت ہوگی جو اہل سنت کے ہاں پیشوائے دین کے معنوں میں مستعمل ہے اس میں کوئی جھگڑا ہی نہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا[1]

ہم نے ان کو امام بنایا کہ وہ ہمارے احکام کے ساتھ ہدایت کرتے ہیں جب انہوں نے صبر کیا۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ[2]

تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے اچھی باتوں کا حکم کرے اور برائیوں سے روکے۔

اسی قسم کی اور بھی آیات اس سلسلہ کی موجود ہیں ان کے دلائل میں کی ایک دلیل یہ آیت ہے:

"وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ"[3] انہیں روکے رکھو ان سے پوچھ پاچھ ہوگی۔

اس بارے میں یہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع روایت یوں بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

وقفوهم إنهم مسئولون عن ولاية علي بن أبي طالب.[4]

دراصل یہ تمسک تو پھر روایت سے ہوا آیت سے تو نہیں ہوا اور ان کی روایت کا جو حال ہے وہ سب کو

1۔سورۃ السجدۃ، الآیۃ: 24

2۔سورۃ آل عمران، الآیۃ: 104

3۔سورۃ الصافات، الآیۃ: 24

4۔بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار، 36/ 78، ط: دار إحياء التراث العربي بيروت لبنان

معلوم ہے اہل سنت کے نزدیک سب بے اعتبار ہیں خصوصا یہ روایت جو مسند فردوس دیلمی میں بھی بیان کی گئی ہے اور یہ وہ کتاب ہے جو خصوصیت کے ساتھ ضعیف اور بے اصل روایات سے بھری ہوئی ہے اور پھر یہ روایت کے اس کی سند میں تو خاص طور پر ضعیف اور مجہول الحال راوی ہی بھرے ہوئے ہیں جو ہر گز کسی درجہ میں بھی قابل حجت نہیں اور اصولی مسائل میں تو بالکل بھی نہیں۔

اور پھر قرآن کا نظم بھی اس روایت کی تکذیب کرتا ہے کیونکہ اس میں مشرکین کے حق میں خطاب ہے"وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ"[1] اور مشرکین سے پہلا سوال تو شرک اور غیر اللہ کی عبادت کے بارے میں ہوگا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی ولایت سے نہیں ہوگا نظم قرآن دلالت کرتا ہے کہ "مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُونَ"[2] تمہیں کیا ہو گیا کہ مدد نہیں کرتے، کا سوال اس جملہ استفہامیہ کے مضمون سے ہے جو محض ڈانٹ ڈپٹ اور غیرت دلانے کی غرض سے ہے کسی اور مقصد سے نہیں اس لیے عالمان قرات کا اس پر اجماع ہے کہ آیت تلاوت کے وقت مسولون پر وقف نہ کیا جائے۔

پھر اگر روایت کو صحیح بھی مان لیا جائے اور نظم قرآن میں بے ربطی کا سوال نہ بھی اٹھایا تب بھی ولایت سے مراد محبت ہو گی ریاست کبریٰ تو اس صورت میں مراد نہیں ہو گی جو محل نزاع ہے اور چلو وہی مراد لے لیں تب بھی مفید مقصد نہیں کیونکہ آیت اپنے مضمون کے لیے لحاظ سے اس عقیدہ کو واجب کرتی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کسی وقت امام ہیں اور بالکل یہی عقیدہ اہل سنت کا ہے واحدی نے بھی اپنی تفسیر میں یہ روایت ان الفاظ سے بیان کی ہے کہ "عن ولاية علي وأهل البيت"[3] ظاہر ہے سارے کے سارے اہل بیت تو امام نہیں تھے شیعہ بھی اس کے قائل نہیں ایسی صورت میں تو ولایت کو محبت پر محمول کرنا یقینی ہو گیا اس لیے کہ ولایت ایک مشترک لفظ ہے اور خارجی قرائن اور اندازوں سے اس کے ایک معنی متعین ہو گئے۔

1۔ سورة الفرقان، الآية : 17

2۔ سورة الصافات، الآية : 25

3۔ ينابيع المودة لذوي القربى للشيخ سليمان بن إبراهيم القندوزي الحنفي،2/ 436، ط: دار الأسوة للطباعة والنشر

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی محبت اور نفس امامت کا جہاں تک تعلق ہے سب اس پر متفق الخیال، عقیدہ ہیں اہل سنت کا بھی یہی عقیدہ ہے بعض تو دراصل جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بلا فصل ہونے میں تھی اور یہ بات کہ آپ کے علاوہ کوئی اور صحابی مستحق امامت نہیں اس آیت کا اس موضوع سے کوئی تعلق سرے سے ہی نہیں ہے۔

موضوع بالا کے سلسلہ میں ایک یہ آیت بھی یہ حضرات پیش کرتے ہیں:

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ ، أُولَئِكَ الْمُقَرَّبُونَ[1]

پہل کرنے والے تو پہل کرنے والے ہی ہیں وہی مقرب ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک مرفوع روایت ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:

السابقون ثلاثة، فالسابق إلى موسى يوشع بن نون، والسابق إلى عيسى صاحب ياسين، والسابق إلى محمد ﷺ علي بن أبي طالب رضي الله تعالى عنه.[2]

انہوں نے کہا سابق تین ہیں موسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے یوشع بن نون اور عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے صاحب یاسین اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لحاظ سے جناب علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ استدلال بھی حدیث سے ہوا آیت قرآنی سے نہیں یہ حدیث طبرانی اور مردویہ کے نزدیک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور دیلمی کے نزدیک حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے لیکن سندوں کا مدار ابوالحسن اشقر پر ہے جو بالاجماع ضعیف ہے، عقیلی نے کہا ہے کہ وہ شیعہ ہے جس کی روایت ناقابل قبول ہے اور یہ حدیث منکر ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں بلکہ اس میں بناوٹی اور گھڑی ہوئی ہونے کی علامات پائی جاتی

1۔ سورة الواقعة، الآية: 10، 11

2۔ أخرجه الطبراني في المعجم الكبير: 11/ 93، رقم 11152، وأخرجه العقيلي في كتابه الضعفاء في ترجمة حسين بن حسن الأشقر: 1/ 249. وقال عنه: «وهذا لا أصل له». والحديث فيه الأشقر الذي ضعفه الجمهور، نقل ابن عدي عن السعدي أنه قال: «غالٍ من الشاتمين» أي للصحابة: الكامل في ضعفاء الرجال: 2/ 361؛ وقال ابن الجوزي: «كذاب»، .يوان الضعفاء والمتروكين: 1/ 221؛ وقال الذهبي: «رافضي»، المغني في الضعفاء: 1/ 170.

ہیں اس لیے کہ صاحب یاسین حضرت عیسی علیہ السلام پر ایمان لانے والوں میں سے نہیں ہے بلکہ آپ کے رسولوں (قاصدوں) پر اول ایمان لانے والوں میں سے ہے جس کا پتہ نص سے چلتا ہے اب جو حدیث اخبار و قصص میں مدلول کتاب سے متناقض بخلاف ہو اور اس سے ٹکرائے وہ محدثین کے طے شدہ اصولوں کے اعتبار سے موضوع اور گھڑی ہوئی ہے۔

دوسری بات یہ کہ سابق کا انحصار صرف تین میں خلاف عقل ہے کیونکہ ہر نبی کا کوئی نہ کوئی ایک سابق ہو گا اور پھر ردو کد کیا ضروری ہے کہ ہر نبی کا سابق ریاست عظمیٰ کا مالک ہو اور مقرب امامت کا مستحق قرار پائے اور پھر اگر روایت سے یہ بھی قرار پائے تو یہ صریح آیت کے متناقض ثابت ہوتی ہے کیونکہ انہی سابقین کے متعلق فرمایا ہے:

ثُلَّةٌ مِنَ الْأَوَّلِينَ ، وَقَلِيلٌ مِنَ الْآخِرِينَ[1]

ایک جماعت ہے پہلوؤں سے اور تھوڑے ہیں پچھلوں سے۔

ثلۃ جمع کثیر کے معنی میں بولا جاتا ہے جو دو آدمیوں پر نہیں بولا جاتا اسی طرح ایک کو قلیل نہیں کہہ سکتے

نتیجہ ظاہر ہے کہ آیت میں سبق (پہل) حقیقی مراد نہیں بلکہ سبق عرفی اضافی مراد ہے جو جماعت کثیر کو شامل ہے اس کے دلیل ایک دوسری آیت ہے:

وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ[2]

اور سابقین اولین مہاجرین وانصار سے۔

اور قرآن کا ایک حصہ دوسرے کی تفسیر کرتا ہے قاعدہ معروفہ مشہورہ ہے پھر یہ بھی قابل توجہ ہے کہ شیعوں اور سنیوں دونوں کے اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ سب سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا اسلام لائی اور اگر ایمان میں سبقت ہی امامت کے لیے کافی ہے تو پھر یہ لازم آتا ہے کہ وہ بھی امامت کے قابل ہوں اور یہ بات بالاجماع غلط ہے اگر یہ کہا جائے کہ وہ عورت ہیں تو ہم کہیں گے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت میں بھی

1۔ سورۃ الواقعۃ، الایۃ : 13، 14

2۔ سورۃ التوبۃ، الایۃ : 100

کوئی مانع ہوا ہوگا اور وہ ان کی امامت کے وقت کا ابھی نہ آنا تھا جب یہ مانع نہ رہا تو امام آپ ہو گئے اور ... مانع خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم ہے کہ ان کا زمانہ پہلے تھا اور جو آپ کی نسبت جمہور اہل سنت کے نزدیک اصلح تھے یا خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے بعد آپ کا باقی رہنا اور ان حضرات کی موت آپ رضی اللہ عنہ سے پہلے ہونا یہ توجیہ تفضیلیہ کی ہے اس لیے کہ وہ کہتے ہیں:

لو كان إماما عند وفاة النبي صلى الله عليه وسلم لم ينل أحد من الخلفاء الإمامة وماتوا في عهده وقد سبق في علم الله تعالى أن الخلفاء أربعة فلزم الترتيب على الموت

اگر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت امام ہوتے تو خلفاء میں سے کسی کو امامت نہ ملتی اور وہ انہی کے عہد میں وفات پاتے حالانکہ علم الٰہی میں یہ بات تھی کہ خلفاء چار ہوں گے اس لیے موت میں ترتیب لازم ہوئی۔

حاصل گفتگو یہ ہے کہ آیات قرآنیہ سے شیعوں کے سارے کے سارے تمسکات اور استدلالات ایسے ہی بونگے ہیں اور کتاب الفین کا مصنف بھی اسی طرح کی بہت سی آیات اپنے مدعا کی دلیل میں بیان کرتا ہے یہ تو ان کے چیدہ اور برگزیدہ اہل علم کا حال ہے باقی جو حال ہو گا اس کا ان پر قیاس کیا جاتا ہے قیاس کن زگلستان من بہار مرا، ان کے دعویٰ اور تقریرات کا اصول کلی یہ ہے کہ آیات پر ان کے استدلات اس وقت تک پورے نہیں اترتے اور نہ احتمالات اور شکوک دور ہوتے ہیں جب تک ان کی گھڑی ہوئی ملاوٹی ناقابل تسلیم ناقابل عمل اور مردود روایات کو بطور لاحقہ ان کے ساتھ شامل نہ کریں اس لیے ان کے استدلات میں کوئی علمی یتیم لطیفہ یا دلچسپی بھی نہیں ہوتی لیکن چونکہ ان کی چشم بصیرت پر تعصب کا گہرا اور دبیز پردہ پڑا ہوا ہے اس لیے ان کی اچھے اور برے میں تمیز کی حس ہی رہ گئی ان کو تو اپنی من گھڑت اور بناوٹی باتیں ہی دنیا جہان کے علوم اور باتوں سے اچھی معلوم ہوتی ہیں۔

وہ احادیث جن سے شیعہ خلافت علی رضی اللہ عنہ بلا فصل پر استدلال کرتے ہیں

آیات کا معاملہ تو آپ نے ملاحظہ فرمالیا اب وہ احادیث ملاحظہ فرمائیں جو یہ اپنے مدعا و مقصد کے حاصل کرنے میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور ایسی احادیث کی تعداد کل بارہ ہے:

حدیث غدیر خم

1۔ ان میں سے پہلی حدیث غدیر خم ہے کہ ان کی کتابوں میں جس کا ذکر بڑے دھوم دھڑکے اور آن بان سے آتا ہے اور یہ بزعم خود اس کو اپنے مدعا کے لیے نص قطعی کے حل کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ بروایت بریدہ بن الحصب اسلمی حجۃ الوداع سے واپسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب غدیر خم نامی ایک مقام پر جو مکہ و مدینہ کے درمیان پڑھتا ہے فروکش ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شریک سفر ساتھیوں کو اپنے پاس بلایا اور ان الفاظ میں ان کو خطاب فرمایا:

یا معشر المسلمين ألست أولى من انفسكم؟ قالوا بلى. قال: من كنت مولاه فعلي مولاه، اللهم وال من والاه وعاد من عاداه.[1]

اے مسلمانوں کی جماعت کیا میں تمہاری جانوں سے زیادہ تمہارے نزدیک پسندیدہ نہیں ہوں سب نے عرض کیا بلاشک ایسا ہی ہے فرمایا میں جس کا مولا ہوں علی اس بھی اس کے مولا ہیں اے اللہ جو علی کو دوست رکھے تو بھی اسے دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ۔

اس روایت کے نتیجہ کے طور پر بات جو یہ کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مولی سے مراد اولی بالتصرف ہے اور اسی کو امام کہتے ہیں،[2] اس طریقہ استدلال و حجت میں پہلی خرابی اور خامی تو یہ ہے کہ سارے کے سارے اہل زبان

1۔ والحديث بهذا اللفظ ضعيف جدا كما حقق ذلك الهيثمي في مجمع الزوائد: 7/ 17؛ والعجلوني في كشف الخفاء: 2/ 361؛ والكناني في مصباح الزجاجة: 1/ 19. وقال ابن تيمية: «حديث الموالاة قد رواه الترمذي وأحمد في مسنده عن النبي صلى الله عليه وسلم انه قال من كنت مولاه فعلي مولاه، وأما الزيادة وهي قوله: اللهم وال من والاه، وعاد من عاداه ... الخ، فلا ريب انه كذب». منهاج السنة النبوية: 7/ 319.

2۔ نهج الحق، لابن المطهر الحلي: ص 173.

عرب اس کے منکر ہیں کہ اولی کے معنی مولا ہوں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ مفعل بمعنی افعل کسی جگہ اور کسی بھی مادہ میں استعمال نہیں ہوتا چہ جائیکہ اس خاص مادہ میں ابوزید لغوی سے جائز کہنے والا اکیلا ہے اور دلیل میں ابو عبیدہ[1] کا قول بیان کرتا ہے جس نے ھی مولاکم کی تفسیر اولی لکم صحیح کی ہے لیکن عام اہل زبان اربوں نے اس کے مذہب اور تمسک کو غلط بتایا ہے اور کہا ہے کہ اگر اس کا قول صحیح ہو تو ہمیں فلان اولی منك کی جگہ فلان مولی منك کہنا چاہیے حالانکہ یہ غلط اور بالاجماع نام مقبول ہے اس پر یہ کہا گیا ہے کہ ابو عبیدہ کی تفسیر حاصل معنی بیان کرتی ہے مولاکم کی تفسیر اولی سے کرنے کا یہ مطلب ہے کہ آگ تمہارا ٹھکانہ ہے جائے بازگشت اور وہ جگہ جو تمہارے لائق ہے یہ نہیں کہ مولی بمعنی اولی ہے۔

دوسری بات یہ کہ مولی بمعنی اولی ہو بھی تو بالتصرف سے اس کا صلہ ٹھہرانا کس لغت سے ثابت ہو سکتا ہے اولی بالمحبت یا اولی بالتعظیم مراد ہو اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ جہاں کہیں اولی کا لفظ نے اس سے اولی بالتصرف مراد لیں مثلاً ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا[2]

بے شک ابراہیم علیہ السلام سے نزدیک وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی اولاد نبی کی پیروی کی جو ایمان لائے۔

اور ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے متبعین اولی بتصرف نہیں ہیں۔

تیسری بات یہ کہ روایت کے بعد کے الفاظ اللھم وال۔۔۔ الخ صاف پتہ دیتے ہیں کہ لفظ خواہ مولا ہو خواہ اولی ولایت سے مراد محبت ہے کیونکہ مولی اگر متصرف فی الامر کے معنی میں ہوتا یا اولی سے اولی بالتصرف مراد ہوتا تو یوں فرمانا قرین قیاس تھا کہ اے خدا اس کو دوست رکھ جو اس کے تصرف میں ہو اور اس کو دشمن رکھ جو اس کے تصرف سے باہر ہو دوستی اور دشمنی کا ذکر اس بات کی صاف دلیل ہے کہ مقصد دوستی کو

1۔ هو معمر بن المثنى التيمي، توفي سنة 211هـ. تاريخ بغداد: 13/ 252؛ تذكرة الحفاظ: 1/ 371.

2۔ سورة آل عمران، الآية: 68

واجب ٹھہراتا ہے اور دشمنی سے ڈرانا تصرف اور عدم تصرف مقصد ہی نہیں۔

یہ بات واضح اور ظاہر ہے کہ حضور ﷺ نے معمولی واجبات ہی نہیں بلکہ سنن نشست و برخاست عقل و شرب وغیرہ کے اداب تک اس خوش اسلوبی سے بیان فرمائے ہیں کہ ان کے مرادی معنی ہر شخص کی سمجھ میں بے تکلف آجاتے ہیں جو عربی زبان سے واقفیت رکھتا ہو خواہ وہ حاضر ہو یا غائب اور در حقیقت بلند معیار بلاغت بھی یہی ہے اور منصب ارشاد و ہدایت بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے اتنے اہم اور اعلیٰ پایا کے مسئلہ میں بھی اگر آپ کسی قسم کے کلام پر اکتفا فرمائیں کہ باعتبار لغت عرب اس کے معنی و مفہوم تک بھی رسائی نہ ہو سکے تو نعوذ باللہ یہ تو آپ ﷺ کی فصاحت و بلاغت کے قصور کا اقرار ہوا اور اس سے بھی آگے بڑھ کر تبلیغ و ہدایت کے معاملہ میں سستی روا رکھنے کا الزام لگاتا ہوا جس کا کوئی ادنیٰ مسلمان بھی تصور نہیں کر سکتا لہذا معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کے پیش نظر یہی معنی ہیں جو آپ کے کلام سے بے تکلف سمجھ میں آتے ہیں کہ جیسے پیغمبر کی محبت تم پر فرض ہے ایسے ہی علی سے دشمنی رکھنا بھی حرام ہے یہی اہل سنت کا مذہب ہے۔

اور اہل سنت کی سخن فہمی بھی اس کی تائید کرتی ہے چنانچہ ابو نعیم نے جناب حسن مثنیٰ بن امام حسن سبط رسول رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ:

> آیا حدیث من کنت مولی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر نص ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اگر رسول اللہ ﷺ اس سے خلافت مراد لیتے تو لوگوں کے ذہن نشین کرنے کے لیے اس کو وضاحت سے بیان فرماتے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سب لوگوں سے زیادہ فصیح اور واضح البیان صاف گو تھے اس مراد کے لیے آپ یوں فرماتے "يا أيها الناس هذا ولي أمري والقائم عليكم من بعدي فاسمعوا وأطيعوا" اے لوگو یہ میرے معاملے کے مختار کار ہیں اور میرے بعد تم پر نگران پس ان کی بات سننا اور ان کی اطاعت کرنا، پھر جناب مثنیٰ نے کہا خدا کی قسم اگر خدا اور رسول جناب علی رضی اللہ عنہ کو اس کام کے لیے منتخب کرتے اور جناب علی اس حکم کی پاسداری نہ کرتے اور اس پر کار بند نہ ہوتے تو خدا اور رسول کی عدم پیروی کے سبب امت کے سب سے بڑے خطاکار شمار ہوتے اس پر ایک شخص بولا کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ جس کا میں مولیٰ ہوں علی بھی اس کے

مولیٰ ہیں ؟ تو آپ نے فرمایا سنو میاں خدا کی قسم اگر رسول اللہ ﷺ کے اس قول سے مراد خلافت ہی ہوتی تو وضاحت کے ساتھ صاف فرمادیتے جس طرح نماز روزہ کی وضاحت فرمائی اور یوں ارشاد فرماتے "يا أيها الناس إن عليا ولي أمركم من بعدي والقائم في الناس بأمري" لوگو علی میرے بعد تمہارے امور کے مختار ہوں گے اور لوگوں میں میرے معاملات کے نگران۔[1]

پھر اس صورت میں یہ حدیث ایک زمانہ میں دو ولایتوں کے جمع ہونے کی کھلی دلیل ہے کیونکہ اس میں لفظ بعد کی قید نہیں ہے (میں جب اور جس وقت جس کا مولا ہوں علی بھی اس وقت اس کے مولا ہیں) بلکہ سلسلہ کلام جیسا کہ ظاہر ہے ہر دو ولایتوں کی مساوات و برابری بحر حیثیت و بتمام وقت کو چاہتا ہے حالانکہ یہ بڑی واضح بات ہے کہ جناب امیر کی شرکت حضرت ﷺ کے ساتھ ولایت میں آپ کے حین حیات ممتنع و محال و ناممکن ہے۔[2]

1۔ أخرجه البيهقي بسنده عن فضيل بن مرزوق ... الاعتقاد: ص 355؛ وأخرجه من الطريق نفسه ابن عساكر، تاريخ دمشق: 13/ 69۔

2۔ شیعہ علماء نے بھی اس کی وضاحت کی ہے کہ یہ حدیث سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل کے لئے صریح اور واضح نہیں ہے ذیل میں ہم چند حضرات کی شہادتیں نقل کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

کتاب الاحتجاج کے مصنف علامہ طبرسی لکھتے ہیں: اثبت حجة الله تعريضاً لا تصريحاً بقوله فی وصية من كنت مولاه فعلی مولاه۔ (كتاب الاحتجاج ،1/ 380، ط، طبع في مطابع النعمان النجف الأشرف 1966ء) یعنی حدیث "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کی دلالت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حجۃ اللہ ہونے پر صریح نہیں ہے اس میں اس پر صرف تعریض پائی جاتی ہے۔

اور اسی بات کو علامہ باقر مجلسی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے: وأثبت حجة الله تعريضا لا تصريحا بقوله في وصيه: " من كنت مولاه فهذا مولاه " - (بحار الأنوار الجامعة لدرر اخبار الأئمة الأطهار، 90/ 123، ط، مؤسسة الوفاء بيروت لبنان)

اور علامہ طوسی لکھتے ہیں: اختلفوا فی دلالته على الامارة۔ (شرح تجريد ،ص 230، طبع قم بحواله دوازده حديث مؤلفه الدكتور خالد محمود ص 57)

شیعہ عالم نوری طبرسی لکھتا ہے: لم يصرح النبی صلی الله عليه وسلم لعلی بالخلافة بعده بلا فصل فی يوم غدير خم - (فصل الخطاب ، ص 205، بحواله عيد غدير كی حقيقت ، مؤلفه مولانا ساجد خان نقشبندی، ص 35)

لہذا یہ اس بات کی دلیل اول ہے کہ مراد وجوب محبت ہے اور دو محبتوں کے جمع ہونے میں نہ کوئی اشکال ہے نہ قباحت بلکہ ایک محبت دوسری محبت کا تقاضا کرتی ہے البتہ دو تصرفات کے بیک وقت جمع ہو جانے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اگر کلام کو اس قید کے ساتھ مقید کریں کہ اس سے امامت فی الوقت اور فوری مراد نہیں ہے بلکہ کچھ عرصہ کچھ وقت ٹھہر کر مراد ہے تو پھر یہ اتفاق مومنہ مبارک ہو کیونکہ اہل سنت خود آپ کے عہد میں آپ کی خلافت و امامت کے قائل ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ اس طرز کلام کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کو کیوں مخصوص فرمایا تو اس کا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ عہد مرتضی میں فتنہ فساد اور بغاوت کی آگ بھڑک اٹھے گی اور کچھ لوگ آپ کی خلافت سے منکر ہو جائیں گے تو اسی لیے آپ کو مخصوص فرمایا۔

اور ایک طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ان کے بعض علماء اس بات کے ثابت کرنے میں کہ مولا سے مراد اولی بالتصرف ہے حدیث کے ابتدائی الفاظ "الست اولی بالمؤمنین من انفسھم" سے دلیل لاتے ہیں یہ وہی بات ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ ان کو جہاں اولی کا لفظ نظر آتا ہے تو فوراً ہی وہاں بالتصرف کا دم چھلا لگانے دوڑ پڑتے ہیں یہاں کون سا داعیہ ہے کہ اس سے اولی بالتصرف کی ہی معنی لیں بلکہ یہاں بھی معنی محبت مراد لینا ہی جچتا ہے کہ کیا میں مومنوں کو ان کی اپنی جانوں سے زیادہ پیارا نہیں اس لیے یہاں کا اولی ولایت بمعنی محبت سے مشتق ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ کیا میں مومنوں کو ان کی جانوں سے زیادہ محبوب وہ پیارا نہیں تا کہ اجزائے کلام اور ایک سلسلہ میں منسلک جملوں میں تناسب اور ربط برقرار رہے اور حسن کلام دوچند ہوں پھر اس خطبہ کا اصل مطلب یہ ہو گا۔

> اے گروہ مسلمانان یہ تو ہے ہی کہ تم مجھ کو اپنی جانوں سے زیادہ دوست رکھتے ہو تو جو کوئی مجھ کو دوست رکھتا ہے وہ علی کو بھی دوست رکھے اے اللہ جو اس کو دوست رکھے تو بھی اسے دوست رکھ اور جو عیس سے دشمنی رکھے تو بھی اسے دشمن رکھ۔

ان حوالہ جات سے ثابت ہوتا ہے کہ جس حدیث کی بنا پر شیعہ عید غدیر مناتے ہیں وہ بنیادی محل نظر ہے چہ جائیکہ اسے مستقل دلیل بنا کر اس سے خلافت بلافصل ثابت کی جائے اس لئے شیعہ حضرات کو پہلے اس طرف متوجہ ہونا چاہیئے کہ یہ تو خود ان کے علماء کے مابین ایک مختلف فیہ امر ہے۔

عقلمند وہی ہے جو اس کلام کے ربط کو ملحوظ رکھ کر کلام کے تسلسل کو دیکھے حضور ﷺ کا یہ ارشاد "الست اولی بکم من انفسکم" آیت قرآنی سے ماخوذ ہے اس لیے اس کو اہل اسلام کی تسلیم کردہ بات کو بنیاد بنا کر اس پر آئندہ کے کلام کو موقوف فرمایا اور قرآن میں یہ لفظ ایسے موقع اور جگہ پر آیا ہے جہاں اولی بالتصرف کے معنی مناسب ہی نہیں لگتے۔

النَّبِيُّ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَى بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللهِ[1]

نبی مومنوں کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں اور ان کی ازواج مسلمانوں کی مائیں ہیں از روئے کتاب اللہ رشتہ دار باہم ایک دوسرے سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں بنسبت دوسرے مومنین کے۔

لہذا اس آیت کا سلسلہ کلام بتا رہا ہے کہ اس میں متبنیٰ (منہ بولے بیٹے) کی نسبت حضور ﷺ کی طرف کرنے سے انکار ہے یعنی زید بن حارثہ کو زید بن محمد نہیں کہنا چاہیے اس لیے کہ آپ کی نسبت تمام مسلمانوں سے ایک شفیق باپ کی سی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور آپ کی ازواج مطہرات اہل اسلام کی ماؤں کے بمنزلہ ہیں اور اہل قرابت نسبت کرنے میں غیروں سے زیادہ حقدار ہیں اور بہتر بھی اگرچہ شفقت اور تعظیم میں دوسرے ہی زیادہ ہوں لہذا نسبت کا دارومدار قرابت پر ہوا جو متبنیٰ میں موجود نہیں اس کا مدار شفقت و تعظیم پر نہیں یہ ہے کتاب اللہ اور حکم خدا کا مفہوم و مطلب اب اس میں اولی بالتصرف کو کسی نوع کا بھی دخل نہیں لہذا یہاں وہی معنی مراد ہوں گے جو حدیث میں ہیں۔

اور اگر حدیث کی ابتدائی عبارت میں اولی سے مراد اولی بالتصرف لیں تو بھی مولی اولی بالتصرف سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا اس لیے کہ اس صورت میں یہ عبارت مخاطبین کی توجہ اور بیداری کے لیے ہوگی کہ پوری توجہ اور ہمہ تن گوش ہو کر آئندہ آنے والی بات سنے اور اس فرمودہ کو حکم واجب جان کر اس کی اطاعت پر کمر

1۔ سورۃ الاحزاب، الآیۃ: 24

بستہ ہو جائے جس طرح ایک باپ بیٹے کو بعض ونصیحت کے وقت کہتا ہے کہ کیا میں تیرا باپ نہیں ہوں بیٹا اس سوال سے چکنا ہو جاتا ہے کہ باپ کہنا کیا چاہتا ہے کہ ایسے یقینی تعلق کو سوال بنا رہا ہے وہ اقرار کرتا ہے تو باپ جو باتیں کہنا چاہتا ہے کہہ دیتا ہے تاکہ جس تعلق کا اس نے ابھی اقرار کیا ہے اس کا پاس خاطر کرتے ہوئے تعمیل حکم کرے اور اطاعت شعاری کا ثبوت دے اور اس کے مطابق عمل پیرا ہو۔

پس اس جگہ "الست اولی بالمؤمنین، الست رسول الله الیکم یاالست نبیکم" کہ مثل ہے آئندہ کے کلام سے ایک لفظ کے ذریعے نسبت ڈھونڈنا اور چاہنا نہایت بے وقوفی ہے اس عبارت سے سارے کلام کو جو ربط ہے وہی کافی ہے۔

اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کے بعض باریک بین لوگ محبت و دوستی کے معنی مراد نہ ہونے کی دلیل میں کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ دوستی اس آیت "وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ"[1] مومن اور مومنات باہم ایک دوسرے کے دوست ہیں، کے ضمن میں ثابت ہے یہ حدیث بھی اگر اس معنی کا فائدہ دے تو کلام بے فائدہ اور لغو ہو جائے گا۔

یہ زیرک لوگ اتنا بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ایک شخص کی دوستی کا ثبوت سب کے ضمن میں اور چیز ہے اور اسی شخص کی دوستی کا وجود خصوصی پہلو سے کچھ اور چیز اگر کوئی شخص اللہ کے سارے نبیوں اور رسولوں پر ایمان لاتا ہے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی زبان پر نہیں لاتا تو اس کا ایمان مرتبہ نہیں یہاں خاص جناب امیر رضی اللہ عنہ کی ذات سے دوستی منظور ہے اور آیت میں دوستی وصف ایمان کے باعث جو عام ہے مقصود تھی پھر اگر آیت وحدیث کا مضمون مل بھی گیا تو اس میں قباحت کی کیا بات ہے پیغمبر کا کام یہی ہوتا ہے کہ مضامین قرآن کی بار بار تاکید اور اس کی یاد دہانی کرتا رہے خصوصاً جہاں کہیں کہ مکلفین کی طرف سے احکام قرآنی میں غفلت و سستی یا عمل میں کوتاہی رونما ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

1۔ سورة التوبة، الآية : 71

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ[1]

اور نصیحت کرتے رہیے نصیحت مومنوں کو نفع دیتی ہے۔

اور قرآن مجید میں کوئی مضمون ایسا نہیں جس کی تاکید کئی آیات میں نہ کی گئی ہو پھر پیغمبر ﷺ کی زبان مبارک سے اس کی تاکید مزید کرائی گئی تاکہ بندوں پر حجت کو لازم اور ان پر نعمت کو پورا فرمائے جس نے قرآن پڑھا اور اسے سمجھا ہو گا وہ ایسے کلام کو پوچ نہیں کہہ سکتا ورنہ پھر روزہ نماز زکوۃ و تلاوت قرآن کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کی تاکیدات بھی سب یوں ہی ہوں گی، اور خود شیعوں کے نزدیک جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت کی نص کو بار بار دہرانا اور اس پر تاکید کرنا بھی لغو اور بے کار ٹھہرے گا۔

اور اہل تاریخ و سیر کے کلام کی روشنی میں اگر اس خطبہ کا سبب و مقصد معلوم کرنا چاہیں تو صاف معلوم ہو گا کہ یہاں پیش نظر جناب امیر رضی اللہ عنہ کی دوستی اور محبت کا ثبوت ہے اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی وہ جماعت جو ملک یمن کی مہم میں آپ کے ہم رکاب تھی انہوں نے سفر سے واپسی پر حضور ﷺ سے آپ کی چند شکایات کا چرچہ کیا جو بے جا تھیں حضور ﷺ نے یہ خیال فرما کر کے یہ باتیں لوگوں کی زبانوں پر آگئی ہیں اگر دو چار کو روکوں گا تو خاطر خواہ اثر نہ ہو گا ممکن ہے کوئی ناعاقبت اندیش اسے جانبداری اور پاسداری تعلق پر محمول کر لے اور وہ بات ختم نہ سمجھے، لہذا آپ نے انفرادی فہمائش کی بجائے خطبہ عام دیا اور "الست اولی بالمؤمنین من انفسهم" کے کلمہ سے شروع فرمایا جو نص قرآن سے تھا یعنی جو کچھ کہہ رہا ہوں از راہ خیر خواہی و شفقت ہے اسے جانبداری یا پاسداری پر محمول نہ کریں اور نہ میرے تعلق خاطر کا باعث سمجھیں چنانچہ محمد بن اسحاق اور دیگر اہل سیر نے اس قصہ کو بتفصیل بیان کیا ہے۔[2]

1۔ سورۃ الذاریات، الآیۃ: 55

2۔ اس واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ "حجۃ الوداع" سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف والی یعنی عامل بنا کر بھیجا تھا، وہاں کے محصولات وغیرہ وصول کر کے ان کی تقسیم اور بیت المال کے حصے کی ادائیگی کے فوراً بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے پاس حج کی ادائیگی کے لیے پہنچے، اس موقع پر محصولات کی تقسیم وغیرہ کے حوالے سے بعض حضرات نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیا، اور یہ اعتراض براہ راست نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دوہرایا، آپ ﷺ نے انہیں اسی موقع پر انفرادی طور پر سمجھایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تصویب فرمائی، بلکہ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ

علی ؓ کا اس سے بھی زیادہ حق تھا، نیز آپ ﷺ نے انہیں حضرت علی ؓ سے محبت کا حکم دیا اور حضرت علی ؓ کے بارے میں دل میں کدورت اور میل رکھنے سے منع فرمایا، چنانچہ ان حضرات کے دل حضرت علی ؓ کی طرف سے بالکل صاف ہو گئے، وہ خود بیان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے بعد ہمارے دلوں میں حضرت علی ؓ محبوب ہو گئے۔

البتہ اسی حوالے سے کچھ باتیں سفر حج سے واپسی تک قافلے میں گردش کرتی رہیں، آپ ﷺ نے محسوس فرمایا کہ اس حوالے سے آپ ﷺ حضرت علی ؓ کی قدر و منزلت اور ان کا حق ہونا بیان فرمائیں، چنانچہ سفر حج سے واپسی پر مقام غدیر خم میں نبی کریم ﷺ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں فصیح و بلیغ حکیمانہ اسلوب میں حضرت علی ؓ کا حق واضح فرمایا، اور جن لوگوں کے دل میں حضرت علی ؓ کے بارے میں کوئی شکوہ یا شبہ تھا اسے یوں ارشاد فرما کر دور فرما دیا، امام احمد بن حنبل ؒ نے یہ روایت بیان کی ہے:

عن البراء بن عازب قال: كنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم في سفر فنزلنا بغدير خم، فنودي فينا: الصلاة جامعة،
وكسح لرسول الله صلى الله عليه وسلم تحت شجرتين، فصلى الظهر وأخذ بيد علي فقال: ألستم تعلمون أني أولى
بالمؤمنين من أنفسهم؟ قالوا: بلى، قال: ألستم تعلمون أني أولى بكل مؤمن من نفسه؟ قالوا: بلى، قال: فأخذ بيد
علي فقال: اللهم من كنت مولاه فعلي مولاه، اللهم وال من والاه، وعاد من عاداه، قال: فلقيه عمر بعد ذلك فقال:
هنيئا لك يا ابن أبي طالب، أصبحت وأمسيت مولى كل مؤمن ومؤمنة. (فضائل الصحابة، للامام احمد بن حنبل،
فضائل علي، 2/ 596، ط، مؤسسة الرسالة بيروت)

یعنی سیدنا براء بن عازب بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے تو ہم نے غدیر خم کے مقام پر پڑاؤ کیا تو ہم میں یہ اعلان کیا گیا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے، رسول اللہ ﷺ کے لئے دو درختوں کے نیچے جھاڑو دیا گیا آپ ﷺ نے نماز ظہر پڑھائی اور سیدنا علی ؓ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کیا تمہیں علم نہیں کہ میں مومنوں پر خود ان سے بھی زیادہ حق رکھتا ہوں، تو صحابہ ؓ نے کہا کیوں نہیں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے نہیں ہو کہ میں ہر مومن پر اس کی جان سے بڑھ کر حق رکھتا ہوں تو صحابہ نے فرمایا کیوں نہیں، پھر آپ ﷺ نے سیدنا علی کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: جس کا دوست میں ہوں علی بھی اس کا دوست ہے، یعنی اے اللہ! جو مجھے دوست رکھے گا وہ علی ؓ کو بھی دوست رکھے گا اور میں جس کا محبوب ہوں گا علی ؓ بھی اس کا محبوب ہو گا، اے اللہ! جو علی ؓ سے محبت رکھے تو اس سے محبت رکھ، اور جو علی ؓ سے دشمنی رکھے تو اس کا دشمن ہو جا، آپ ﷺ کے اس ارشاد کے بعد حضرت عمر ؓ حضرت علی ؓ سے ملے تو فرمایا: اے ابن ابی طالب! آپ کو مبارک ہو! آپ صبح و شام ہر مؤمن مرد اور ہر مؤمنہ عورت کے محبوب بن گئے۔

یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ علامہ ابن کثیرؒ نے اپنی کتاب "البداية والنهاية، باب بعث رسول الله صلى الله عليه وسلم علي بن أبي طالب وخالد بن الوليد إلى اليمن قبل حجة الوداع، 5/ 120، ط، داراحياء التراث العربي: میں اور امام ترمذیؒ نے "جامع الترمذي باب مناقب علي بن ابي طالب، 7/ 73، ط، دار الغرب الإسلامي بيروت " میں ذکر کیا ہے۔

حدیث ہارون وموسیٰ علیہ السلام

2۔ اس سلسلہ کی دوسری حدیث وہ ہے جو بخاری مسلم میں جناب براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اہل بیت کی مستورات اور بچیوں پر خلیفہ مقرر فرمایا اور خود غزوہ کے لئے تشریف لے گئے اس وقت جناب امیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: أتخلفني في النساء والصبيان؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أما ترضى أن تكون مني بمنزلة هرون من موسى إلا أنه لا نبي بعدي[1] یعنی تم اس پر خوش نہیں کہ تم میرے لئے ایسے ہو جیسے ہارون موسیٰ کے لئے تھے ہاں مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

اس کے متعلق یہ کہتے ہیں "منزلة" اس جنس ہے جو علم کی طرف منسوب ہے اس لئے تمام منازل و عام ہو گا تاکہ اس سے استثناء صحیح ہو سکے اور جب مرتبہ نبوت کو اس سے مستثنیٰ کر دیا تو اب وہ تمام منازل و مراتب جو حضرت ہارون علیہ السلام کے لئے ثابت تھے وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لئے بھی ثابت ہوں گے اور ان میں سے امامت کا صحیح ہونا اور ان کی اطاعت کا فرض ہونا بھی شامل ہے، اگر حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد زندہ رہتے تو جو مرتبہ ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حین حیات حاصل تھا اس سے موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد وہ محروم قرار پائیں تو یہ ان کا نبوت سے معزول ہونا کہا جائے گا اور نبی کا نبوت سے معزول ہونا جائز نہیں کیونکہ اس میں توہین کا پہلو نکلتا ہے، لہذا یہ مرتبہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کو بھی حاصل ہوا اور یہی امامت ہے۔

دراصل یہ حدیث بھی اہل سنت کی دلیل ہے جو وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور آپ کے عہد میں آپ کی امامت کے اثبات میں پیش کرتے ہیں کیونکہ اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ امامت کا استحقاق رکھتے تھے۔

اب ہم اس موضوع پر کہ آپ کے علاوہ کوئی امام نہ تھا اور جناب امیر رضی اللہ عنہ بلا فصل امام تھے بحث کا آغاز کرتے ہیں، لہذا ہم کہتے ہیں کہ یہ بات اس حدیث سے معلوم نہیں ہوتی کہ نواصب نے اہل سنت کے استدلال پر رد و قدح کی ہے اور یہ کہا ہے کہ عورتوں بچوں کی خلافت وہ خلافت ہی نہیں تھی جو ہمارے تمہارے

---

1 صحيح البخاري، باب مناقب علي، 5/ 19، رقم: 3706، دار طوق النجاة

درمیان زیر بحث ہے کہ اس خلافت کی سپردگی سے اس خلافت کا ثبوت ہم پہنچ سکے کیونکہ باجماع اہل سیر سے یہ بات ثابت ہے کہ اسی موقعہ پر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا صوبہ دار سباع عرفطہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا کوتوال اور جناب ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اپنی مسجد کا امام نماز بنایا، اگر جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت عام ہوتی تو پھر ان امور کے کیا معنیٰ تھے؟ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ خلافت محض امور خانگی کی غور و پرداخت اور اہل و عیال کی دیکھ بھال سے عبارت تھی جب کہ اس قسم کی دیکھ بھال ایسے آدمی سے سرانجام پاسکتی ہے جو محرم ہو اور اندرون خانہ کے حالات سے آگاہی رکھتا ہو اسی وجہ سے ایسے کاموں کے لئے لڑکے، دایا یا ان جیسوں کو ہی مقرر کیا جاتا ہے، بہر حال ایسا استخلاف خلافت کبریٰ کو نہیں چاہتا، بفضلہ تعالیٰ اہل سنت نے ان تمام اعتراضات کے شافی اور مسکت جوابات اپنی کتابوں میں دے دیے ہیں جو اپنی جگہ اور مقام پر موجود ہیں۔

شیعوں کے اس حدیث سے طریق استدلال کو جس انداز میں ہم نے ترتیب دے کر بیان کر دیا ہے اس سے درحقیقت ان کی بات سمجھ میں آنے کے قابل ہو گئی ہے ورنہ ان کی اپنی کتابوں میں اگر دیکھا جائے تو یہی استدلالی عبارت ایسی واہی تباہی اور پراگندہ باتوں پر ختم ہوتی ہے جس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

بہر حال ان کا یہ استدلال بھی کئی خرابیوں کا مجموعہ ہے اول یہ کہ اسم جنس جو علم کی طرف مضاف و منسوب ہو وہ تمام اصولیوں کے نزدیک الفاظ عموم سے نہیں بلکہ اس کی تصریح کی ہے کہ وہ عہد کے لئے ہے مثل غلام زید وغیرہ کہ اس میں خاص غلام مراد ہے اگر ایسا نہ ہو تو پھر ان مثالوں میں کوئی کیا کہے گا۔[1]

رکبت فرس زید (میں زید کے گھوڑے پر سوار ہوا) لبثت ثوب زید (میں نے زید کے کپڑے پہنے) اور رائیت ابن زید (میں نے زید کے لڑکے کو دیکھا) کہ ظاہر ہے کہ یہاں عموم باطل ہے، اور کلام زیر بحث میں بھی خصوصیت کا قرینہ موجود ہے اور وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا قول اتخلفنی في النساء والصبيان ہے، یعنی جس طرح حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ تھے جب وہ کوہ طور پر تشریف لے گئے اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوہ تبوک پر تشریف لے جانے کے بعد خلیفہ تھے، اور وہ

1۔ كذا قرر الطوسي في عدة الأصول: ص 51 و شرح ابن عقيل: 1/ 178.

استخلاف جو غیر موجودگی کی مدت کے ساتھ مقید ہو، وہ مدت کے ختم ہو جانے کے بعد ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے چنانچہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام کے حق میں بھی ختم ہو گیا اور استخلاف کے اس صورت میں ختم ہونے کو معزول ہونا نہیں کہتے جو کسی کی اہانت کا سوال پیدا ہو۔

اب رہا استثناء تو اس میں عموم اس وقت پایا جاتا ہے، جب کہ استثناء متصل ہو اور یہاں استثناء متصل نہیں بلکہ منقطع ہے لفظی اور معنوی قرائن اس کی تائید کرتے ہیں، لفظی تو یہ کہ لا نبی بعدی جملہ خبریہ ہے جس کو منازل حضرت ہارون علیہ السلام سے مستثنیٰ نہیں کر سکتے اور اگر جملہ کی تاویل مفرد سے کریں تو ان کے داخل ہونے سے الا کا حکم عدم الثبوت ہو گا، اور ظاہر ہے کہ عدم النبوت آپ کے منازل میں سے ہے نہیں جو استثناء صحیح ہو۔

اور معنوی یہ کہ من جملہ منازل حضرت ہارون علیہ السلام میں سے ایک ان کا عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑا ہونا ہے، دوسرے یہ کہ بلحاظ زبان ان سے گویائی میں فصیح تر تھے، تیسرے یہ کہ نبوت میں ان کے شریک تھے، چوتھے یہ کہ وہ باعتبار نسب ان کے حقیقی بھائی تھے اور یہ تمام منازل، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاصل نہیں تھے لہٰذا اگر استثناء کو متصل ٹھہرائیں اور منزلۃ کو عموم پر محمول کریں تو معصوم کے کلام پر حرف آتا ہے، اور پھر یہ بھی ہے کہ ہم اسے تسلیم ہی نہیں کرتے کہ منازل ہارون علیہ السلام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کی خلافت بھی تھی، اس لئے کہ اگر وہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد زندہ بھی رہتے تو تبلیغ و ہدایت میں وہ مستقل رسول ہوتے اور یہ مرتبہ ان کے ہاتھ سے کبھی نہ جاتا اور یہ مرتبہ خلافت سے منافات رکھتا ہے کیونکہ خلافت تو اس مرتبہ کی نیابت ہے اور اصل اصل ہے نیابت، نیابت، باہم نیابت کو اصل سے کیا علاقہ لہٰذا معلوم ہو گیا کہ اس طرز تقریر اور استدلال سے جناب امیر رضی اللہ عنہ کی خلافت پایہ شہرت کو ہرگز نہیں پہنچتی۔

تیسرے جو بات کہی گئی ہے کہ یہ مرتبہ اگر حضرت ہارون علیہ السلام سے زائل ہو جاتا تو یہ ان کی معزولی ہوتی اور نبی کا معزول ہونا جائز نہیں، اس کے متعلق ہمارا کہنا یہ ہے کہ کام کے ختم ہونے کو عزل کہنا عرف کے خلاف تو ہے ہی لغت کے بھی خلاف ہے، کیونکہ شاہ و حکام اپنے دار السلطنت سے باہر جاتے وقت نائبوں اور اپنے گماشتوں کو اپنا جانشین مقرر کر جاتے ہیں، اور ان کی مراجعت و واپسی کے بعد ان کی جانشینی ختم ہو جاتی ہے تو اسے کوئی بھی معزول نہ کہتا ہے نہ سمجھتا ہے اور ان کے حق میں نہ اسے اہانت کا سبب مانا جاتا ہے، اور دہاندلی سے

کوئی عزل ہی سمجھتا ہے تو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام نبوت کے مستقل درجہ سے سرفراز ہوئے جو خلافت سے ہزار درجہ اعلیٰ وارفع ہے تو یہ ان کے حق میں توہین وتحقیر کیوں ہونے لگی بلکہ وہ تو اس طرح کا ہوتا کہ ایک وزیر کے مرنے کے بعد نائب کو عہدہ نیابت سے ہٹا کر مستقل وزیر بنا دیا جائے، یہاں تو اعزاز بڑھتا ہے تحقیر وتوہین کا کیا کام!

بات کا ایک پہلو اور ہے کہ جب حضرت امیر کو حضرت ہارون علیہ السلام سے تشبیہ دی گئی اور یہ معلوم ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات میں بغیر موجودگی کے وقت حضرت ہارون علیہ السلام آپ کے خلیفہ ہوتے تھے اور آپ کی وفات کے بعد یوشع بن نون اور کالب بن یوقنا خلیفہ ہوئے تو اس سے لازم آیا جناب امیر رضی اللہ عنہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حین حیات آپ کی غیر موجودگی میں تو آپ کے خلیفہ ہوں مگر وفات کے بعد نہ ہوں بلکہ دوسرے ہوں تاکہ تشبیہ پوری پوری صحیح ہوسکے، کیونکہ کلام رسول میں موجود تشبیہ کو ناقص قرار دینا تو رسول کی شان میں انتہائی بے ادبی ہے۔

اور اگر ان سب باتوں سے صرف نظر بھی کرلی جائے تو اس حدیث سے خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کی نفی کیسے ثابت ہوئی اور وہ بھی ثابت نہیں تو اصل مدعا کہاں حاصل ہوا! بہت کھینچ تان کر زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت کی جاسکتی ہے وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا استحقاق ہے اور بھی کسی وقت اور اسے تو اہل سنت پہلے ہی سے مانتے ہیں۔[1]

حدیث ان علیا منی وانا من علی

3۔ تیسری حدیث وہ ہے جو حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعا منقول ہے کہ:

إن عليا مني وأنا من علي، وهو ولي كل مؤمن بعدي[2] جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علی مجھ سے ہے اور میں علی سے اور وہ میرے بعد ہر مومن کے ولی ہیں۔

1۔ ممن رد على الإمامية في احتجاجهم بهذا الحديث ابن حزم في الفصل في الملل والأهواء والنحل: 4/ 78 وما بعدها. وابن تيمية في منهاج السنة النبوية: 5/ 34 وما بعدها.

2۔ مسند أبي داود الطيالسي، 2/ 168، رقم: 868، ط: دار هجر مصر

یہ حدیث باطل اور ناقابل استناد ہے کیونکہ اس کی سند میں اجلح نامی ایک شخص ہے جو شیعہ تھے[1] اور روایات میں گڑبڑ کا اتہام اس پر لگا ہوا ہے جمہور علماء نے اس ضعیف کہا ہے لہٰذا اس کی روایت حجت میں پیش نہیں کی جاسکتی۔

دوسری بات یہ کہ اس کے الفاظ مشترک میں سے ہیں تو کیا قرینہ ہے اور کیا ضروری ہے اس سے اولیٰ بالتصرف ہی مراد لیں دوسرے معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں، اور پھر ایک بات یہ کہ وہ کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں اہل سنت کا مذہب پہلے معلوم ہو ہی چکا ہے کہ وہ یہ مانتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے بعد جناب امیر رضی اللہ عنہ کسی وقت ضرور واجب الاطاعت امیر تھے۔

حدیث طیر سے استدلال کا جواب

4۔ چوتھی حدیث استدلال وہ ہے جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں مروی ہے:

أنه كان عند النبي صلى الله عليه وسلم طائر قد طبخ له وأهدي إليه فقال «اللهم ائتني بأحب الناس إليك يأكل معي هذا الطير» فجاءه علي.[2]

نبی ﷺ کے خوان نعمت پر ایک پرندہ تھا جو آپ کے لیے لگایا گیا تھا یا پکایا یا بطور ہدیہ پیش ہوا تھا اس وقت آپ نے فرمایا اے اللہ اپنے اس بندہ کو جو سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہو میرے پاس

---

1 ـ قال السعدي: «مفترٍ»، وقال أحمد: «منكر الحديث»، الكامل في ضعفاء الرجال: 1/ 427؛ الضعفاء والمتروكين: 1/ 64؛ تهذيب التهذيب: 5/ 122. وقال الشيخ شعيب الارناؤط على هامش المسند: لكن تفرد به أجلح بن عبد الله الكندي، وهو شيعي ضعيف(مسند الامام احمد،33/ 155)

2 ـ أخرجه الطبراني في الأوسط والكبير وأبو يعلى في مسنده: 7/ 105، رقم 4052؛ وأخرجه ابن عدي في ترجمة حماد بن يحيى بن المختار الكوفي، الكامل في ضعفاء الرجال: 2/ 251، وقال عنه: «هو ليس بمعروف». والحديث موضوع كما حكم عليه ابن الجوزي في العلل المتناهية: 1/ 229، ونقل ابن كثير عن الذهبي: «لا والله ما صح شيء من ذلك وأنه جمع طرق الحديث في جزء أورد فيه بضعا وتسعين نفسا من اللذين أوردوه»، وقال: جميعها باطلة ومظلمة». البداية والنهاية: 11/ 355؛ وذكره الشوكاني في الفوائد المجموعة في الأحاديث الموضوعة: ص 1134.

بھیجنا کہ وہ اس پرندہ کے تناول میں میرے ساتھ ہو اس وقت حضرت علی تشریف لے آئے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس بھنے ہوئے پرندے کے بارے میں روایات مختلف اللفظ ہیں بعض میں سہام ہے جو ایک پرندہ کا نام ہے بعض میں حباری بمعنی چوزہ ہے اور بعض میں حجل کا لفظ ہے بمعنی چکور۔

اس روایت کو اکثر محدثین نے موضوع قرار دیا ہے اس کے موضوع ہونے کی تشریح کرنے والوں میں حافظ شمس الدین جزری کا نام بھی ہے اور امام حدیث شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن احمد دمشقی ذہبی (معروف بہ علامہ ذہبی) نے اپنی کتاب تلخیص میں لکھا ہے:

لقد كنت زمنا طويلا اظن ان حديث الطير لم يحسن الحاكم ان يودعه في مستدركه فلم علقت هذا الكتاب رايت القول من الموضوعات التي فيه[1]

بہت دنوں تک میرا یہی خیال رہا کہ حاکم نے اپنی کتاب میں حدیث طیر کو ذکر کر کے اچھا نہیں کیا جب میں نے اس کتاب پر حاشیہ لکھا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اسے موضوعات کے زمرہ میں رکھا ہے۔

اور اس کے ساتھ ساتھ یہ روایت ان حضرات کے لیے مفید مطلب بھی نہیں کہ قرینہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ہم طعامی کے لیے جناب امیر رضی اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین لوگوں میں سے تھے اور بے شک جناب امیر رضی اللہ عنہ ایسے ہی تھے کیونکہ بیٹے کو یا جو منزلہ بیٹے کے ہو اس کا شریک طعام ہونا کھانے کے لطف کو دوبالا کر دیتا ہے، اور اگر مطلقا احب بھی مراد لیں تو بھی مدعا کہ ثابت کرنے میں قاصر رہیں گے کیونکہ مخلوق میں خدا کا محبوب ترین ہونے کے لئے یہ لازم و ضروری نہیں کہ وہ ریاست عامہ کا مالک بھی ہو، بہت سے اولیاء کبار کیا انبیاعالی مقدار مخلوق میں اللہ کے نزدیک محبوب ترین تھے، مگر ریاست عامہ کے مالک نہ ہو سکے، مثلاً حضرت ذکریا و حضرت عیسی علیہ السلام بلکہ حضرت شموئیل علیہ السلام بھی کہ جن کے زمانہ میں جناب طالوت ریاست کے مالک تھے جس پر قرآنی آیت شاہد ہے۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس وقت مدینہ منورہ میں رہتے ہوں اور یہ دعا خاص

1۔ التلخيص: 4/ 102.

حاضرین کے بارے میں ہوتا کہ غائبین کے بارے میں، اس کی دلیل آپ کا اثتنی فرمانا ہے اس لئے کہ غائب شخص کر دور دراز کی مسافت سے ایک لمحہ میں ہم طعامی کے لئے خرق عادت کے طریقہ سے لے آنا یہاں مقصود نہیں، اور انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالی سے خرق و معجزہ کا سوال صرف کفار کے مطالبہ کے وقت ہی کرتے ہیں، ورنہ پھر جنگ و جہاد یا کسی اور کام کے لئے اسباب ظاہری کی تیاری کی کیا ضرورت تھی تمام امور خرق عادت سے انجام فرمالیا کرتے، اور ممکن ہے اس سے مراد ایسی ہی ہو جیسے عام بول چال میں لوگوں کی ہوتی ہے جیسے یہ کہنا من احب الناس الیک تیرے نزدیک سب لوگوں میں محبوب ترین کون ہے؟ اور یہ استعمال بہت رائج اور مشہور ہے اسی طرح اہل زبان کا یہ قول فلان اعقل الناس وافضلهم وہ لوگوں میں فلاں بڑا عقلمند اور ان سے افضل ہے، اور بالفرض یہ مدعا کے لئے دلیل ہو بھی تو یہ ان صریح و صحیح احادیث کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو کھلے اور آسان الفاظ میں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً:

"اقتدوا بالذين من بعدي أبي بكر وعمر"[1]

میرے بعد دین کے معاملہ میں ابو بکر اور عمر کی پیروی کرو۔

حدیث انا مدینۃ العلم و علی بابھا

5۔ پانچویں حدیث وہ جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"أنا مدينة العلم وعلي بابها"[2]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں؟

یہ حدیث بھی خرابیوں سے خالی نہیں یحییٰ بن معین نے کہا اس کی کوئی اصل نہیں امام بخاری نے کہا ہے

1۔ أخرجه الترمذي من حديث حذيفة، السنن، كتاب المناقب، باب مناقب أبي بكر وعمر: 5/ 609، رقم 3662، وابن ماجة، السنن، كتاب المقدمة، باب فضل أبي بكر: 1/ 37، رقم 98.

2۔ المستدرك على الصحيحين، 3/ 137، وقال الذهبي في التلخيص: بل موضوع

منکر ہے، ترمذی نے کہا کہ "منکر غریب ہے" ابن جوزی نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے شیخ تقی الدین ابن دقیق العید نے کہا کہ علماء حدیث نے اس کا کوئی ثبوت نہیں پایا، شیخ محی الدین نووی حافظ شمس الدین ذہبی، اور شیخ شمس الدین جزری نے اس کو موضوع بتایا ہے۔[1]

لہٰذا ایسی روایت سے جو موضوع ہو اور اسے اہل سنت نے احتجاج و تمسک کے دائرہ سے باہر کر دیا ہو، استدلال و تمسک کرنا اور وہ بھی اہل سنت ہی کو الزام دینے کے لئے علماء شیعہ کی دانشمندی کا کچھ اچھا مظاہرہ نہیں، اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کسی شخص نے اپنے ملازم کی بد دیانتی خیانت اور غلطیوں سے آگاہ ہو کر ملازمت اور گھر سے نکال دیا ہو اور منادی عام کے ذریعہ اعلان بھی کرا دیا ہو کہ اس کو فلاں فلاں قصوروں اور غلطیوں کی بنا پہ نکال دیا گیا ہے اب اس سے میری ذمہ داری پر کوئی لین دین نہ کرنے میں اس کی کسی بات و معاملہ کا ذمہ دار نہیں ہوں پھر بھی کوئی احمق جس کی اس نوکر سے شناسائی ہو وہ اس سے لین دین کرے اور تقاضے کے لئے مالک کو پکڑے، تو کون اس احمق کو عقلمند کہے گا۔

اور پھر یہ روایت ان کے مفید مطلب بھی نہیں، چلو مان لیا کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ شہر علم کا دروازہ ہیں مگر یہ کیا ضروری ہے کہ وہ ریاست عامہ کے مالک ہوں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ بلا فصل بھی، زیادہ سے زیادہ آپ کے لئے جو بات ثابت ہو گی وہ یہ کہ شرائط امامت میں سے ایک شرط بوجہ اکمل آپ میں پائی گئی اور پھر ایک شرط پائی جانے سے تو مشروط کا وجود لازم نہیں آتا، جب اس کے ساتھ یہ بات بھی ہو کہ وہی شرط یا اس سے بھی زیادہ دوسروں میں بروایت اہل سنت ثابت ہو مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما صب الله شيئا في صدري إلا وقد صببته في صدر أبي بكر[2]

---

1 ۔ قال العجلوني في هذا الحديث: «قال الترمذي: منكر، وقال البخاري: إنه كذب لا أصل له، وذكره ابن الجوزي في الموضوعات»، وقال أبو زرعة: «كم من خلق افتضحوا فيه»، وقال أبو حاتم ويحيى بن سعد: «لا أصل له ...»، وقال ابن دقيق العيد: «لم يثبتوه، وقيل إنه باطل ...». كشف الخفاء: 1/ 236. ووضعه السيوطي في اللآلي المصنوعة: 1/ 329؛ الزركشي، التذكرة: ص 163؛ والألباني؛ ضعيف الجامع: 1/ 1322.

2 ۔ أورده ابن القيم في المنار المنيف تحت عنوان: ومما وضعه جهلة المنتسبين إلى أهل السنة في فضائل الصديق رضي الله عنه

اللہ تعالیٰ نے میرے سینہ میں کوئی چیز نہیں ڈالی جو میں نے ابو بکر کے سینے میں نہ ڈالدی ہو۔

لو كان بعدي نبي لكان عمر[1]

میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔

اگر اہل سنت کی روایات کا اعتبار کرنا ہے تو ہر جگہ کریں ورنہ ان کے منہ ہی نہ آنا چاہیے کیونکہ یہ ایک آدھ روایت سے مات کھانے والے نہیں۔

حدیث تشبیہ بالانبیاء

6۔اس حدیث کو امامیہ نے مرفوعا روایت کیا ہے:

أنه صلى الله عليه وسلم قال من أراد أن ينظر إلى آدم في علمه، وإلى نوح في تقواه، وإلى إبراهيم في حلمه، وإلى موسى في بطشه، وإلى عيسى في عبادته، فلينظر إلى علي بن أبي طالب[2]

آپ نے فرمایا جو آدم کے علم کو نوح کے تقوی کو ابراہیم کے علم کو موسیٰ کی سختی کو، عیسیٰ کی عبادت کو دیکھنا چاہے تو اسے چاہئیے کہ علی بن ابی طالب کو دیکھتے۔

اس حدیث سے ان کا طریق استدلال یوں ہے کہ اس روایت سے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی ہم صفتی ظاہر ہوئی اور انبیاء دوسروں پر افضل ہیں اور افضل کا مساوی بھی خود افضل ہوتا ہے لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ دوسروں سے افضل ہوئے، اور امامت کا حقدار افضل ہی ہوتا ہے دوسرا کوئی نہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو عقل کی نعمت دی ہے تو وہ اس استدلال وتمسک کی زسر تا پا خرابیاں کھلی آنکھوں

---

1 ـ أخرجه الترمذي عن عقبة بن عامر في كتاب المناقب، باب مناقب عمر بن الخطاب: 5/ 619، رقم 3686؛ وأحمد في المسند: 4/ 154؛ الطبراني في الكبير: 17/ 298؛ الحاكم في المستدرك: 3/ 92، رقم 4495

2 ـ ابن أبي الحديد في شرح نهج البلاغة: 2/ 429؛ ابن المطهر الحلي في نهج الحق: 237. وعزاه الأول إلى مسند أحمد، والثاني إلى سنن البيهقي، وليس فيهما.

دیکھ سکتاہے، اول تو یہ کہ یہ روایت اہل سنت کی احادیث میں سے نہیں ابن مطہر نے اپنی کتابوں میں کبھی تو اس کو بیہقی کی طرف منسوب کیاہے اور کبھی بغوی کی طرف حالانکہ ان دونوں کی تصانیف میں اس روایت کا نشان تک نہیں، افتراء وبہتان سے اہل سنت کو الزام دینے کا طریقہ ان کا فطری حربہ ہے۔

جب کہ اس طریقہ سے نہ ان پر الزام آسکتاہے، نہ وہ اس دھوکیں سے مرعوب ہو سکتے ہیں اہل سنت کا یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ ایسی حدیث حجت وتمسک کے لائق نہیں جو ائمہ حدیث نے اپنی کتاب میں درج تو کی ہو مگر صاحب کتاب نے کتاب میں مندرج احادیث کی صحت کا التزام واہتمام نہ کیا ہو جیسا کہ امام بخاری مسلم اور دیگر اصحاب صحاح نے التزام کیاہے اور اس حدیث کی نہ صاحب کتاب نے بالخصوص تصریح کی ہے اور نہ کسی فقیہ اور محدث نے، اسی محدثین کی وہ جماعت جو پچھلے طبقہ میں گزری ہے مثلاً دیلمی، خطیب، ابن عساکر وغیرہ جب انہوں نے دیکھا کہ محدثین سلف احادیث صحاح حسان کو خوب جانچ پرکھ کر مرتب کر گئے اور اس کوشش میں کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا تو انہوں نے ضعیف وموضوع روایات پر توجہ دی یا ان روایات کہ جن کی اسانید یا متون میں الٹ پھیر کیا گیا تھا، اور بیاضی کی صورت میں ان کو جمع کیا تاکہ ان پر نظر ثانی کریں اور موضوعات کو حسان سے الگ کرلیں لیکن فرصت کی کمی اور عمر کی کوتاہی کے سبب اس اہم کام کو سرانجام نہ دے سکے اور یہ کام ان کے بعد والوں نے انجام دیا اور ان میں فرق کرنے اور تمیز دینے کی ذمہ داری کو پورا کیا چنانچہ علامہ ابن جوزی نے موضوعات کو علیحدہ کیا اور اس کے مقابلہ میں حسان لغیرہا کو مقاصد حسنہ میں جدا لکھا، ادھر علامہ سیوطی نے تفسیر در منثور کی شکل میں کام کیا۔

اور اس قسم کے مجموعوں کے مرتبین نے اپنی کتابوں کے مقدمات میں یہ بات صاف لکھ دی کہ یہ مجموعہ کس غرض کے لئے مرتب کئے گئے اور ان میں کس کس طرح کی روایات ہیں، لہذا ان کتابوں کا حال وحیثیت خود مرتبین سے معلوم ہو جانے کے بعد ایسی روایات سے استدلال وتمسک کہاں تک جائز ہے اسی لئے صاحب جامع الاصول نے یہ بات نقل کی ہے کہ خطیب بغدادی نے شریف مرتضیٰ سے جو رضی کا بھائی تھا شیعی روایات کو لیاہے اور اس غرض سے ان کو یکجا ومرتب کیا کہ ان کی جانچ کرکے اور بحث کرکے یہ پتہ چلائے کہ ان کی کوئی اصل بھی ہے یا نہیں، حاصل کلام یہ کہ یہ حدیث زیر بحث تو ایسی بھی نہیں جو اہل سنت کی کسی کتاب

میں مروی ہو گو بطریق ضعیف ہی ہو!

دوسرے یہ کلام محض تشبیہ کے طور پر ہے کہ جناب امیر کی بعض مقامات کو انبیاء مذکورین کی بعض صفات سے تشبیہ دینا مقصود ہے، اور تشبیہ جس طرح مشہور ہے حروف تشبیہ کاف کان مثل نحو کے ساتھ ہوتی ہے، اس طرح بھی ہوتی ہے، چنانچہ علم بیان میں طے شدہ ہے کہ "من اراد ان ینظر الی القمر لیلہ البدر فلینظر الی وجه فلان" کا کلام بھی تشبیہ میں داخل ہے جو لیلۃ البدر میں چاند دیکھنا چاہے اسے چاہیئے کہ فلاں کا چہرہ دیکھے، اور یہ شعر بھی تشبیہ ہے:

لا تعجبوا من بلاء غلالته   قد زرا زراره علی القمر

اس کے جامہ کتان کے پھٹ جانے پر تعجب نہ کرو یہ تو چاند پر تکمہ لگایا گیا ہے۔

اور متنبی کے یہ دو شعر بھی تشبیہ کے ہیں:

نشرت ثلاث ذبائب من خلفها   في ليله فارت ليالي اربعا

واستقبلت قمر السماء بوجهها   فارتني القمرين في وقت معا[1]

بوقت شب معشوقہ نے پیچھے کے طرف اپنے تیں گیسو بکھیر دیئے تو لوگوں کو تین راتیں یکجا دکھائیں، اور اپنے چہرے سے آسمانی چاند کے سامنے آئی تو مجھ کو دو چاند ایک ساتھ دکھائے۔

اور اگر اس سے بھی قطع نظر کریں تو یہ استعارہ ہوگا جس کی بنا تشبیہ پر ہے اور تشبیہ یا استعارہ میں مشبہ کو مشبہ بہ کے ساتھ مساوی جون نام پر لے درجہ کی بے وقوفی ہے چنانچہ اشعار میں یہ بات عام ہے کہ بادشاہوں کے صحن کی خاک کو مشک کے ساتھ اور وہاں کے سنگریزوں کو مروارید سے تشبیہ دیتے ہیں اور ان دونوں میں مساوات کو کوئی بھی نہیں مانتا یہ شعر دیکھیے:

أری بارقا بالأبلق الفرد یومض   یذهبُ جلباب الدجی ویفضض

1۔ الواقي بالوفيات للصفدي ج 5 الصفحة 5

كأن سليمى من أعاليه أشرقت　　　تمد لنا كفا خضيبا وتقبض

میں دیکھتا ہوں کہ بجلی تہامٹی کے تودہ پر چمکتی ہے تو اندھیری کا پردہ چاک کر دیتی ہے اور پھر چھپا دیتی ہے گویا کہ سلمی اس ٹیلہ کی طرف متوجہ ہے پس مہندی لگی ہے ہتھیلیوں کو کھول دیتی ہے اور پھر بند کر دیتی ہے، اب اس شعر کے مضمون سے یہ لازم نہیں آتا کہ سلمی کا مہندی لگا ہاتھ چمک اور درخشندی میں بجلی کے برابر ہو۔

اہل سنت کی احادیث صحیحہ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابراہیم و حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت نوح اور حضرت عیسی علیہم السلام کے ساتھ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو حضرت عیسی علیہ السلام سے تشبیہ دی گئی، لیکن چونکہ فرقہ اہل سنت عقل خداداد سے بہرہ ور ہے اس لیے وہ اس تشبیہ کو انبیاء مذکورین کے ساتھ ان اصحاب گرامی کے برابر ہو جانے پر محمول نہیں کرتے مشبہ کو اپنے مقام پر اور مشبہ بہ کو اپنے مقام پر رکھتے ہیں، بلکہ اس قسم کے کلمات میں تشبیہ سے اس طرف اشارہ خاص ہے کہ پیغمبر کے مختص اوصاف میں سے اس شخص میں جو وصف ہے وہ اس درجہ اور مرتبہ کا نہیں ہے۔

بدر کے قیدیوں کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے جب مشورہ طلب فرمایا تو اس کا قصہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یوں منقول ہے:

فقال: " ما تقولون في هؤلاء؟ إن مثل هؤلاء كمثل إخوة لهم كانوا من قبلهم، {قال نوح رب لا تذر على الأرض من الكافرين ديارا} [نوح: 26] وقال موسى: {ربنا اطمس على أموالهم واشدد على قلوبهم} [يونس: 88] الآية وقال إبراهيم: {فمن تبعني فإنه مني ومن عصاني فإنك غفور رحيم} [إبراهيم: 36] وقال عيسى: {إن تعذبهم فإنهم عبادك وإن تغفر لهم فإنك أنت العزيز الحكيم} [المائدة: 118] (1)

1۔ المستدرك على الصحيحين، 3/ 24، رقم: 4304، ط: دار الكتب العلمية بيروت

انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم ان کے بارے میں کیا کہتے ہو بے شک ان کی مثال ان کے ان بھائیوں کی سی ہے جو ان سے پہلے تھے یعنی جس طرح بعض انبیاء صفات جمال ولطف مظہر ہیں اور بعض صفات جلال و قار کے اسی طرح ابو بکر صفات جمال کا مظہر ہے اور عمر صفات جلال کا مظہر نوح علیہ السلام نے فرمایا اے میرے پروردگار زمین پر بسنے والے کسی کافر کو بھی نہ چھوڑ اور موسی علیہ السلام نے فرمایا اے میرے پروردگار ان کے مال ناپید کر اور ان کے دلوں پر سختی ڈال اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا پس جس نے میری نافرمانی کی تو پس تو بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے اور عیسی علیہ السلام نے فرمایا اگر تو ان کو عذاب دے گا تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر بخش دے گا تو ان کو پس تو غالب اور حکمت والا ہے۔

یہ روایت حاکم نے بیان کی اور اس کی تصحیح کی ہے اور حضرت ابی موسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

أن النبي صلى الله عليه وسلم قال له: «يا أبا موسى لقد أوتيت مزمارا من مزامير آل داود»[1]

نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا اے ابو موسی تم کو حضرت داود علیہ السلام کے خوش آوازیوں میں سے خوش آوازی مرحمت ہوئی ہے۔

نیز فرمایا رسول اللہ ﷺ نے:

من سره أن ينظر إلى تواضع عيسى ابن مريم فلينظر إلى أبي ذر[2]

جس شخص کی یہ خواہش ہو کہ وہ عیسی بن مریم علیہ السلام کی تواضع کا نمونہ دیکھے تو اسے چاہیے کہ ابی ذر کو دیکھ لے۔

اسے استیعاب میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے ترمذی نے اسی کو مختلف الفاظ میں روایت کیا گیا ہے یعنی:

1۔ خلق أفعال العباد للبخاري، 1/ 67، ط: دار المعارف السعودية الرياض

2۔ مصنف ابن ابي شيبة، 6/ 388، رقم: 32267، ط: مكتبة الرشد الرياض

ما أظلت الخضراء، ولا أقلت الغبراء من ذي لهجة أصدق من أبي ذر[1]

فرمایاﷺ نیلگوں آسمان نہیں سایہ فگن ہوا کسی پر اور نہ اٹھایا کسی کو زمین نے اپنی پشت پر جو زیادہ راست گو ہو ابی ذر رضی اللہ عنہ سے جو زہد میں عیسیٰ بن مریم علیہ السلام سے مشابہ ہیں۔

تیسرے یہ کہ افضل کی کسی ایک صفت میں مساوات وبرابری افضلیت کا سبب نہیں کیونکہ اس افضل میں اور جو صفات ہیں ان کی وجہ سے وہ افضل ہی رہا پھر یہ بات جسے ہم بار بار دہرا چکے ہیں کہ افضلیت کا تقاضا ریاست کبری کو کب ہے!

چوتھے یہ کہ اس حدیث سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت تینوں خلفاء پر اس وقت تو ثابت ہو سکتی ہے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ان یا ان جیسی صفات میں مساوی نہ ہوں اور اس سے انکار بہت ہی مشکل ہے بلکہ اگر اہل سنت کی کتابوں کی واقعی چھان بین کی جائے تو جناب ابو بکر وجناب عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق انبیاء کرام علیہم السلام سے مشابہت کی اتنی حدیثیں ملیں گی، کہ ان کا کوئی ہم عصر اس کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔

اسی لئے محققین صوفیاء رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کمالات نبوت کے حامل ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کمالات ولایت کے حامل[2] چنانچہ انبیاء کے کام یعنی کفار سے جہاد، احکام شریعت کو رواج دینا، ملت کی اصلاح، بحسن وخوبی شیخین رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں سرانجام پائے اور اولیاء کے کام مثلاً تعلیم طریقت، ارشاد حال ومقامات سالکین، نفس کے امور سے آگاہی اور دنیا میں زہد کی ترغیب زیادہ تر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ومنقول ہے۔

اور یہ بات عقل سے سمجھی جاسکتی ہے کہ ملکات کا سراغ ان افعال کے صدور سے لگ سکتا ہے جو ان کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً اگر ایک شخص میدان کارزار میں ثابت قدمی دکھاتا ہے اور اپنے ہم جنسوں کے مقابلہ میں تیغ زنی اور نیزہ بازی میں بازی لے جاتا ہے تو یہ اس کی شجاعت نفسی کی واضح دلیل ہے، بلکہ محبت وعداوت خوف وامید اور دوسرے باطنی امور بھی انہیں معاملات وافعال کے ذریعہ سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

1۔المرجع السابق

2۔اس سے ملتی جلتی بحث مکتوبات امام ربانی، مکتوب نمبر 123، بنام ملا حیدر کے کشمیری صفحہ 185 مطبوعہ مکتبہ مجددیہ میں موجود ہے۔

اسی قیاس پر کسی شخص کے کمالات باطنی کے پتہ لگانے میں کہ آیا وہ کمالات نبوت کا حامل ہے یا کمالات اولیاء کا اس کے خارجی افعال سے جو انہیں دو حمیدہ اوصاف سے تعلق رکھتے ہیں، امتیاز حاصل ہوتا ہے اور شیعوں کی خود اپنی کتابوں سے منقول اس حدیث سے کہ "إنك يا علي تقاتل على تأويل القرآن كما قاتلت على تنزيله"[1] میں واضح اشارہ اسی تفرقہ و امتیاز کی طرف ہے کیونکہ شیخین رضی اللہ عنہما کی جنگ و جہاد تنزیل قرآن پر تھی گویا ان کا عہد عہد نبوت کا ہی بقایا حصہ ہے اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کا دور دور ولایت کا آغاز ہے اسی لئے شیوخ طریقت اور ارباب معرفت و حقیقت آنجناب کو باب ولایت محمدیہ کا فاتح اور ولایت مطلقہ انبیاء کا خاتم لکھتے ہیں، یہی سبب ہے کہ اکثر اولیاءاللہ کے فرقوں کے سلسلے آنجناب ہی پر ختم ہوتے ہیں، اور وہ سب ندیوں کی طرح آپ کی ہی ذات بحر صفات سے پھر ملتے ہیں۔

بالکل اسی طرح جس طرح فقہا شریعت و مجتہدین ملت کی شاگردگی کے سلسلے حضرات شیخین یا ان کے متبعین تک پہنچتے ہیں مثلاً عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم اور ان ہی کے قطرات علمیہ سے سب کے سب سیراب ہوتے ہیں۔

اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں جس معنی کی امامت باقی رہی اور جس کے لئے وہ ایک دوسرے کو وصی بناتے رہے وہ ارشاد و ولایت کے قطب اور سرچشمہ ہونے کے معنی میں بھی گویا آپ ہی کی طرح آپ کی ذریت بھی ارشاد و ولایت کا چشمہ فیض بنی رہی اور یہی وجہ ہے کہ اس امر کا تمام مخلوق پر لازم ہونا ان ائمہ کرام سے مروی نہیں بلکہ وہ اپنے چیدہ اور منتخب دوستوں اور برگزیدہ مصاحبوں کو اس فیض خاص سے مشرف فرماتے اور ان کی استعداد کے موافق اس دولت سے نوازتے، اور ان میں کے ناسمجھ ان تمام اشارات کو ریاست عامہ اور امور ملک و مال میں استحقاق و تصرف پر ڈھالتے رہے اور یوں گمراہی کے بھنور میں ڈبکیاں کھاتے رہے۔

اور یہی راز ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ اور آپ کی ذریت کرام رضی اللہ عنہم کو پوری امت پیروں مرشدوں کی طرح مانتی اور عقیدت رکھتی ہے اور دنیا کے کاموں کو ان سے وابستہ سمجھتی ہے اور فاتحہ درود و نذر و منت ان کے نام

1۔ كشف الغمة في معرفة الأئمة، 1/ 121، ط: دار الأضواء بيروت لبنان

ہے اسی طرح رائج ہیں جس طرح پیروں اور مرشدوں اور دیگر اولیا، اللہ کے ساتھ ہوتا ہے مگر ان معاملات میں شیخین رضی اللہ عنہما کا نام کوئی نہیں لیتا، اور نہ نذر ومنت، مجالس واعراس میں ان کو شریک کرتے ہیں نہ اس قسم کے دنیادی کاموں سے انہیں وابستہ کرتے ہیں، گو ان سے محبت وعقیدت رکھتے اور ان کے فضل وکمال کے معتقد ہیں۔

حدیث تکفیر نزاع فی الامامت

7۔ ساتویں حدیث وہ ہے جس کی روایت جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے کرتے ہیں کہ:

"من ناصب عليا في الخلافة فهو كافر"[1]

جس نے خلافت کے لئے حضرت علی سے جھگڑا کیا وہ کافر ہے۔

اہل سنت کے ہاں اس روایت کا کوئی اتہ پتہ، نام ونشان مطلق نہیں! ابن مطہر حلی نے اس روایت کی نسبت اخطب خوارزم کی طرف کی ہے اول تو خود ابن مطہر نقل روایات میں بدنامی کی حد تک خائن ہے، اور پھر اخطب کٹر زیدیہ ہے، پھر اس کی کتاب جو مناقب امیر المومنین رضی اللہ عنہ میں ہے اس روایت کے وجود سے خالی ہے، باوجود تلاش اس کا کھوج نہیں لگایا جا سکتا، اور اگر ہو بھی تو وہ اس لئے غیر معتبر ہو گی کہ وہ ان احادیث صحیحہ کے مخالف ہے جو خود امامیہ کی کتابوں میں موجود ہیں، مثلاً جناب امیر رضی اللہ عنہ ہی کا یہ قول نہج البلاغہ میں موجود ہے، اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے "أصبحنا نقاتل إخواننا في الإسلام على ما دخل فيه من الزيغ و الإعوجاج والشبهة والتأويل"[2]

اور اگر اس حدیث کو معتبر بھی مان لیں تو اس حدیث کا مضمون اس وقت متحقق ہو سکتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے کس وقت مطالبہ خلافت کیا بھی ہو اور اس وقت کسی دوسرے نے ان سے اسے چھیننا چاہا ہو حالانکہ ایسا واقعہ کسی زمانہ میں بھی پیش نہیں آیا۔

1۔ ليس في كتب أهل السنة، ورواه من الإمامية: الأمالي لابن بابويه: 673؛ الطرائف لابن طاوس: 1/ 23؛ العمدة لابن البطريق: ص 91؛ كشف اليقين لابن المطهر الحلي: ص 293.

2۔ نهج البلاغة، 1/ 236، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے خلافت کا مطالبہ ہی نہیں کیا جیسا کہ امامیہ کی اپنی کتابوں میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو وصیت فرما گئے تھے کہ اگر کوئی مددگار نہ ہو تو اس معاملہ میں سکوت اختیار کریں چنانچہ اس وصیت کی پاسداری میں آپ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کے زمانہ میں خاموش رہے اور جب آپ نے خلافت کا مطالبہ کیا اس وقت بھی حضرت طلحہ، زبیر اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم نے بھی خلافت چھیننے کی نہ کوئی کوشش کی نہ مطالبہ کیا ان حضرات کا مطالبہ تو صرف اتنا تھا کہ (اب آپ با اختیار امیر ہیں تو) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قاتلین کی تفتیش اور ان کے بارے میں قصاص کا جلد بندوبست فرمائیں، (مگر سازشوں کی درپردہ مساعی سے) رفتہ رفتہ یہ معاملہ جانبین کے قصور ارادہ کے علی الرغم جنگ و جدال کی شکل اختیار کر گیا، چنانچہ کتب سیر اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خطبات اس پر گواہ ہیں۔

پھر اگر یہ بھی تسلیم کر لیں تو لفظ کفر سے حقیقی کفر نہیں بلکہ کفران نعمت مراد ہے اس لئے کہ اس پر سب متفق ہیں کہ آپ کے عہد میں آپ کی خلافت اتنی بڑی نعمت تھی جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں اور اس پر دلیل لفظ خلافت ہے کیونکہ خلافت بالاجماع زمین میں تصرف کے ساتھ مشروط ہے اور یہ تصرف آپ کو خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے عہد میں ملا ہی کہاں جو کوئی اسے چھینتا یا انکار کرتا، اسی لئے حدیث میں لفظ امامت نہیں آیا، اور اگر اس کو مان بھی لیں تو قرآن مجید کی آیت استخلاف میں خلفاء ثلاثہ کی خلافت کے منکر کو بھی کافر فرمایا ہے اور آیت کو اسی پر ختم بھی فرمایا ہے: وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ[1] اور جو کوئی اس آیت کے سننے اور اس کا علم ہو جانے پہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خلیفہ بنایا ہے، کے بعد انکار کرے وہی کامل فاسق ہے۔

اور محدثین کا اس پر اجماع ہے کہ اخطب زیدی کی ساری روایات مجہول الحال ضعیف راویوں سے منقول ہیں اور یہ کہ اس کی اکثر روایات منکر اور موضوع ہیں اس لئے فقہاء اہل سنت اس کی روایات سے کوئی حجت و دلیل نہیں دیتے اور اسی وجہ سے علماء اہل سنت سے اس کا نام پوچھا جائے تو کوئی اسے نہیں پہچانتا۔

ان حالات میں اہل سنت کو اس زیدی کی روایت کے حوالہ سے الزام دینا بالکل اس قصہ کی طرح ہے

---

[1] سورة النور، الآية: 55.

کہ ایک بوڑھا سنی عاشورہ کے دنوں میں کہیں جارہا تھا راستہ میں ایک سانپ دکھائی پڑا یہ اپنے بڑھاپے کے سبب سانپ کو مار نہ سکتا تھا، اتفاقاً وہاں سے ایک شیعہ نوجوان گزر رہا تھا اس کو آواز دے کر بلایا اور کہا اے شیعہ بھائی تجھے عثمان غنی کا واسطہ اس سانپ کو مار ڈال یہ سن کر شیعہ جوان واویلا کرنے اور فریاد کرنے لگا کہ مسلمانوں میری فریاد سنو، دیکھو یہ کس کو، کس کا واسطہ دے کر کن دنوں میں کس جانور کو مارنے کے لئے کہہ رہا ہے؟

حدیث نورین

8۔ وہ حدیث جس کی ان الفاظ میں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كنت أنا وعلي بن أبي طالب نورا بين يدي الله قبل أن يخلق آدم بأربعة عشر ألف عام، فلما خلق الله آدم قسم ذلك النور جزءين: فجزء أنا، وجزء علي بن أبي طالب[1]

میں اور علی بن ابی طالب بشکل نور اللہ تعالیٰ کے سامنے چودہ ہزار سال رہے جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا تو اس نور کے دو حصے کئے ہیں ایک حصہ میں اور ایک حصہ علی بن ابی طالب ہیں۔

اہل سنت کے نزدیک یہ روایت بالاجماع موضوع ہے، اس کی اسناد میں ایک راوی محمد بن خلف مروزی ہے یحییٰ بن معین نے اسے کذاب کہا ہے، دار قطنی نے اسے متروک کہا ہے اور اس کے جھوٹا ہونے کے بارے میں کسی نے اختلاف نہیں کیا،[2] اس روایت کا ایک دوسرا سلسلہ سند بھی ہے جس میں ایک راوی جعفر بن احمد ہے یہ متعصب رافضی اور جھوٹی روایات کرنے والا ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی برائی اور ان کی سب و شتم کے سلسلہ میں روایات گھڑا کرتا تھا۔[3]

1۔ أورده ابن أبي الحديد، شرح نهج البلاغة: 2/ 430؛ والحلي نهج الحق: ص 212 و المجلسي، بحار الأنوار: 35/ 24.

2۔ كذبه يحيى بن معين والدارقطني، وذكر ابن الجوزي حديثا يرويه في فضائل علي: «أنا وهارون ويحيى وعلي من طينة واحدة». ميزان الاعتدال: 6/ 154؛ لسان الميزان: 5/ 157؛ الكشف الحثيث: 225.

3۔ جعفر بن أحمد بن علي بيان بن زيد، أبو الفضل الغافقي الماسح المصري المعروف بابن أبي العلاء (ت 299 هـ)، قال ابن يونس: «كان رافضيا كذابا يضع الحديث في سب أصحاب رسول الله - صلى الله عليه وسلم -».

اور اگر اسے کسی درجہ میں قابل لحاظ مان لیں تو یہ ایک دوسری روایت کے مخالف ہے جو ان سے فی الجملہ بہتر ہے اس کی سند میں کوئی جھوٹا اور وضاع نہیں ہے، امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كنت أنا وأبو بكر وعمر وعثمان وعلي بين يدي الله قبل أن يخلق آدم بألف عام فلما خلق أسكننا ظهره ولم نزل ننتقل في الأصلاب الطاهرة حتى نقلني إلى صلب عبد الله ونقل أبا بكر إلى صلب أبي قحافة ونقل عمر إلى صلب الخطاب ونقل عثمان إلى صلب عفان ونقل عليا إلى صلب أبي طالب[1]

میں ابو بکر عمر عثمان و علی تخلیق آدم سے ہزار سال پہلے اللہ تعالی کے سامنے تھے جب ان کو پیدا کیا تو ہمیں ان کی پشت میں قائم فرمایا اور یوں ہم پاک پشتوں میں منتقل ہوتے رہے حتی کہ مجھے اللہ تعالی نے عبد اللہ کی صلب میں منتقل کیا تو ابو بکر کو ابو قحافہ کی عمر کو خطاب کی عثمان کو عفان کی اور علی کو ابی طالب کی صلب میں منتقل فرمایا۔

اس حدیث کی مؤید ایک دوسری مشہور حدیث بھی ہے، وہ یہ ہے:

الأرواح جنود مجندة فما تعارف منها ائتلف، وما تناكر منها اختلف[2]

ارواح فوج در فوج جمع تھیں وہاں آپس میں جن جن کی شناسائی ہوئی، ان میں دنیا میں بھی الفت رہی اور جن میں ناآشنائی تھی وہ دنیا میں بھی باہم انجان رہے۔

اور ساری تگ و دو اور رد و کد کے بعد بھی یہ روایت ان کے مدعا پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ جناب امیر رضی اللہ عنہ

وقال ابن عدي: «كان يحدث بأحاديث موضوعة نتهمه بوضعها». الكامل في ضعفاء الرجال: 3/ 156؛ ابن الجوزي، الضعفاء والمتروكين: 1/ 170؛ ميزان الاعتدال: 2/ 126؛ لسان الميزان: 2/ 108.

1 ـ رواه أحمد بن عبد الله الطبري (ت 694هـ) في كتابه الرياض النضرة: 1/ 248 نقلا عن الشافعي.

2 ـ صحيح البخاري، باب: الأرواح جنود مجندة، 4/ 133، رقم: 3336، ط: دار طوق النجاة

کی نور نبوی میں شرکت بھی ان کی امامت بلافصل ثابت نہیں کرتی ان ہر دو کے درمیان تلازم اس طرح ثابت ہونا چاہیے کہ اعتبار کا غبار بھی اسے نہ چھو سکے مگر اس کے ثبوت میں مشکلات کے مراحل حائل ہیں، جناب امیر کو حضور ﷺ سے جو قرب حاصل تھا، اس میں تو کوئی کلام نہیں کلام تو اس میں ہے کہ یہ قرب امامت بلافصل کا سبب ہے یا نہیں؟ اگر قرب نبی ہی صرف امامت کا سبب ہوتا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ امامت و خلافت کے زیادہ حقدار تھے کیونکہ آپ چچا بھی تھے اور والد بزرگوار کے شریک اصل بھی! اور ظاہر ہے چچا، چچازاد بھائی سے عرفاً و شرعاً اقرب ہے۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ جناب عباس رضی اللہ عنہ نور سے محروم تھے اس لئے لیاقت امامت سے محروم ہوئے کیونکہ نور عبد المطلب حضرت عبد اللہ اور جناب ابو طالب میں بٹ گیا دوسرے بیٹوں کے حصہ میں نہیں آیا تو ہم یہ کہیں گے کہ اگر نور کی قوت و کثرت پر مدار تقدم ہے تو پھر حضرات حسنین رضی اللہ عنہما قوت اور کثرت ہر دو جہت سے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے بھی امامت میں احق و اولی ہوں گے باعتبار قوت تو اس طرح کہ جب نور بٹا تو حضور ﷺ کا حصہ حضور ہی کو ملا اور وہی نور حضرات حسنین کو تقسیم ہوا، بخلاف جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کہ آپ اصل نور میں ہی شریک تھے، نور پیغمبر میں تو شریک نہیں تھے اور ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کے حصہ کا نور دوسرے کے نور سے زیادہ قوی ہے۔

اور بلحاظ کثرت اس طرح کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اپنے اندر نور مصطفوی اور نور مرتضوی دونوں رکھتے تھے، اور دونوں ایک نور سے قطعاً زیادہ اور اکثر ہے۔

حدیث لواء خیبر

9۔ وہ حدیث جو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ خیبر کے دن آپ نے فرمایا:

لأعطين الراية غدا رجلا يحب الله ورسوله ويحبه الله ورسوله يفتح الله على يديه[1] کل میں جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ و رسول سے محبت رکھتا ہے اور اللہ و رسول اس کو محبوب رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر فتح دے گا۔

1۔ صحيح البخاري، باب غزوة خيبر، 5/ 134، رقم: 4210، ط: دار طوق النجاة

یہ حدیث صحیح تر بھی ہے اور قوی الروایت بھی، یہ اہل سنت کے سر کا جھومر اور آنکھوں کی روشنی ہے اور خوارج و نواصب کے اقوال کو رد کرنے کی خاطر اپنی کتابوں میں بڑے اعتماد اور شرق سے درج بھی کرتے ہیں مگر افسوس ہے کہ شیعوں کا مدعا اس بروایت سے بھی ثابت نہیں ہوتا کیونکہ خدا اور رسول کا محب محبوب ہونا بھی اس بات کو مستلزم نہیں کہ وہ امام بلا فصل بھی ہو (اور اگر انہیں اس پر اصرار ہی ہو تو ہم کہتے ہیں کہ جو خدا اور رسول کو محبوب تھے وہی امام بلا فصل ہوئے یعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) کیونکہ ان دو صفتوں کا کسی ایک شخص کے لئے ایک کلام میں ثابت کرنا دوسروں سے ان صفات کی نفی نہیں کرتا اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے "یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ"[1] خود حضرت ابو بکر اور ان کے رفقاء رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرمایا ہو یا اہل بدر کے حق میں ارشاد فرمایا:

إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ[2]

بے شک اللہ تعالیٰ ان کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں صف بستہ ہو کر قتال کرتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی ایک دیوار ہیں۔

اور اس میں کوئی شک نہیں اللہ جسے دوست رکھے اس کا رسول بھی ان کو دوست رکھتا ہے اور مومنوں میں جو اللہ کو دوست رکھتا ہے وہ اس کے رسول کا بھی محب ہے! اور اہل مسجد قبا کی شان میں ارشاد فرمایا ہے:

فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ[3]

اس میں ایسے لوگ ہیں جو طہارت کو بہت پسند کرتے اور اللہ تعالیٰ طہارت پسند لوگوں کو محبوب رکھتا ہے۔

اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

1۔ سورۃ المائدۃ، الآیۃ: 54

2۔ سورۃ الصف، الآیۃ: 4

3۔ سورۃ التوبۃ، الآیۃ: 108

"يا معاذ إني أحبك "[1] میں تم کو دوست رکھتا ہوں۔

ولما سئل: من أحب الناس إليك؟ قال: «عائشة» قيل: ومن الرجال؟ قال: «أبوها».[2] اور جب آپ سے پوچھا گیا (اہل بیت مستورات میں سے) آپ کو کون سی زیادہ محبوب ہیں، تو آپ نے فرمایا عائشہ پوچھا گیا کہ مردوں میں سے کون؟ فرمایا ان کے والد۔

اگر شیعوں کو یہ اشکال ہو کہ جب خدا اور سول کا محب و محبوب ہونا دوسروں میں بھی پایا گیا تو پھر جناب امیر رضی اللہ عنہ سے اس کی تخصیص نہ رہی حالانکہ یہاں (واقعہ خیبر میں) تخصیص ہونی چاہیئے تو اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ یہاں تخصیص باعتبار مجموع صفات کے ہے یعنی "يفتح الله على يديه" اور چونکہ علم الٰہی میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پر اس کی فتح مقدر تھی اس لئے وہ سب صفات مجموعی حیثیت سے جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مخصوص ہوئیں گو علیحدہ علیحدہ دوسروں میں پائی جاتی ہیں، پھر اس صفت کا ذکر جو دوسروں میں بھی مشترک ہے یہاں ایک لطیف نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ یہ ہے کہ حدیث صحیح میں وارد ہے:

"إن الله يؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر "[3]

بے شک اللہ تعالیٰ اس دین کی تائید فاجر شخص سے بھی کر دیتا ہے۔

لہٰذا اگر صرف قلعہ کی فتح جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیان کر دی جاتی تو وہ آپ کی فضیلت و بزرگی کا سبب نہ ہوتی اسی وجہ سے ان صفات کو پہلے ذکر فرمایا۔

دوسرا جواب تخصیص کا یہ ہے کہ کلام عرب بلکہ تمام فرقوں کی گفتگو میں پہلے ایک خبر بطور تمہید ہوتا ہے اور مقصود اس کے بعد کا حصہ ہے جیسے رجلا کا لفظ اس حدیث میں یا جیسے کہتے ہیں زید ایک مرد عقلمند ہے تو یہاں زید کا

1۔ عمل اليوم والليلة سلوك النبي مع ربه عز وجل ومعاشرته مع العباد، 1/ 163، رقم: 199، ط: دار القبلة للثقافة الإسلامية ومؤسسة علوم القرآن جدة

2۔ صحيح البخاري، باب غزوة ذات السلاسل، 5/ 166، رقم: 4358، ط: دار طوق النجاة

3۔ صحيح البخاري، إن الله يؤيد الدين بالرجل الفاجر، 4/ 72، رقم: 3062، ط: دار طوق النجاة

مرد ہونا بیان میں مقصود نہیں بلکہ اس کا عقلمند ہونا مقصود بیان ہے، اسی طرح یہاں بھی مقصود تو یفتح الله علی یدیہ سے آپ کی تخصیص ہے اور رجلا اور یحب الله ورسوله ویحبه الله ورسوله محض تمہید بیان ہے۔

حدیث الحق مع علی حیث دار

10۔ یہ حدیث "رحم الله عليا، اللهم أدر الحق معه حيث دار "[1] اللہ علی پر رحم کرے اللہ حق کو علی کے ساتھ گھما جدھر وہ گھومے۔

اہل سنت بھی اس حدیث کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ شیعوں کا مدعا یعنی امامت بلا فصل اس سے بھی ثابت نہیں ہوتا یہ حدیث اس مدعا سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتی یوں تو جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی یہ فرمایا ہے "الحق مع عمار حيث دار "[2] حق عمار کے ساتھ ہے وہ جدھر بھی گھومے، بلکہ حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حق کی معیت کی خبر دی جارہی ہے،[3] بخلاف جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کہ وہاں ان کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی جارہی ہے کہ حق ان کے ساتھ گھومتا رہے اب اخبار و دعا کا فرق جو ہے وہ کسی پر پوشیدہ نہیں، خاص طور پر شیعوں کے طے شدہ اصول کے مطابق کیونکہ وہ نبی کی ہر دعا قبول ہونا ضروری خیال نہیں کرتے چنانچہ ابن بابویہ قمی نے ایک روایت بحوالہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیان کی ہے کہ آپ نے اپنے رب سے دعا کی کہ آپ کے سب اصحاب کو آپ کی محبت پر جمع کردے

1۔ أخرجه الترمذي من حديث علي في المناقب، باب مناقب علي رضي الله عنه: 5/ 633، رقم 3714 وقال عنه: «غريب لا نعرفه إلا من هذا الوجه»؛ والحاكم في المستدرك: 3/ 134، رقم 4629. وحكم عليه ابن الجوزي بالوضع في العلل المتناهية: 1/ 410؛ والألباني في ضعيف الترمذي: 1/ 767.

2۔ أخرجه أبو الشيخ في طبقات المحدثين بأصبهان: 2/ 419؛ والعقيلي، الضعفاء الكبير: 4/ 236؛ ابن عساكر، تاريخ دمشق: 43/ 476. من طريق مبشر بن الفضيل، قال العقيلي عنه: «مجهول».

3۔ "الحق بعدي مع عمر حيث كان" أخرجه العقيلي عن ابن عباس في الضعفاء الكبير 3/ 482؛ والحكيم الترمذي، نوادر الأصول: 2/ 21؛ ابن عساكر، تاريخ دمشق: 44/ 126

الی آخر الحدیث (یہ روایت پہلے گزر چکی ہے) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں بعدی بھی فرمایا جس سے آپ کی امامت کے صحیح ہونے اور ہر اس شخص کی صحت امامت کا جس کو آپ امام سمجھیں خفیف اشارہ نکلتا ہے۔

اگر شیعوں کی طرح اہل سنت کا بھی یہ عقیدہ و مذہب ہوتا کہ نبی کے علاوہ بھی کوئی اور معصوم ہو سکتا ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عصمت پر یہ پہلی دلیل ہوتی مگر چونکہ یہاں شیعوں کے پیش نظر اہل سنت کی روایات سے تمسک اور ان کو الزام دینا ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ ان کی تمام روایات کو قبول کریں۔

اہل سنت کے بعض ظریف الطبع حضرات نے شیعوں کے مقابلہ میں حدیث ادر الحق معه حیث دار سے حضرت ابو بکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت صحیح ہونے پر استدلال کیا ہے، اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر معاملہ میں ان کے ساتھ تھے، بیعت میں ساتھ تھے، ان کی متابعت فرماتے، جمعہ و جماعت میں ان کے ہمراہ، نماز کی ادائیگی میں، امور ریاست میں مشورہ دینے میں ان کے دست راست لہذا اس سے قیاس مساوات بنتا ہے کہ حق علی کے ساتھ ہے اور علی ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہیں، لہذا حق بھی ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ ہے اور مقدمہ اجنبیہ جو اس قیاس میں صحت کے نتیجہ کا مدار ہے سچا ہے اس لئے کہ مقارن کا مقارن مقارن ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ استدلال اپنی جگہ بہت مضبوط اور ٹھوس ہے گو ذکر کرنے والے نے بطور لطیفہ و ظرافت اس کو بیان کیا ہے اس لئے کہ شیعوں کی اس روایت کے مطابق ہے جو نہج البلاغہ میں ہے یہ کتاب ان کے نزدیک اصح الکتب اور متواتر ہے چنانچہ یہ بات ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتنہ نہاوند کے فرو کرنے کے لئے بنفس نفیس جانا چاہا تو مشورہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی آراء مختلف ہوئیں بعض نے اس اقدام کی حمایت کی اور بعض نے آپ کو ایسا کرنے سے روکا، تب آپ نے جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا آپ نے اس سلسلہ میں جو کچھ فرمایا وہ ہم تفصیل سے باب ہفتم کے عقیدہ ششم میں تحریر کر آئے ہیں وہاں اس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے، جناب امیر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ فرمایا اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ دل و جان سے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے ناصر و معین، ناصح و امین تھے، اگر معاذ اللہ آپ دل میں ان کی طرف سے کوئی گرہ رکھتے ہوتے تو اس سے زیادہ اچھا موقعہ کب آسکتا تھا، کہ ان کو عجم کی طرف جانے کا مشورہ دیتے اور جب وہ اور ان کے عساکر جنگ میں الجھ جاتے یا شکست سے دوچار تو آپ حجاز میں جو اسلام کا دار السلطنت تھا صاحب تصرف قرار پا جاتے

تو لوگ چار و ناچار آپ کی اتباع کے لئے سر جھکا دیتے مگر آپ کے قلب مبارک میں کوئی کھوٹ نہ تھا اور نہ آپ اپنے کو ان حضرات کے زمرہ سے علیحدہ شمار فرماتے تھے، بلکہ اس روایت سے تو واضح اشارہ اسی بات کا ملتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو زمرہ ابو بکر و عمر میں شمار فرماتے تھے، اسی لئے آپ نے یہ ارشاد و الفاظ ارشاد فرمائے "و نحن على موعد من الله"[1]

اور نہج البلاغہ ہی میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے غزوہ روم کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ طلب کیا تھا آپ نے فرمایا:

إنك متى تسير إلى هذا العدو بنفسك فتلقهم وتنكب لا تكن للمسلمين كأنفة دون أقصى بلادهم، وليس بعدك مرجع يرجعون إليه. فأرسل إليهم رجلا مجربا واحفز معه أهل البلاء والنصيحة، فإن أظهره الله فذلك ما تحمد، وإن تكن الأخرى كنت ردءا للناس ومثابا للمسلمين[2]

آپ بنفس نفیس دشمن سے مقابلہ کے لئے جائیں گے اور اگر شکست کھا کر واپس ہوں گے تو مملکت کے آخری سرے سے لے کر یہاں تک مسلمانوں کے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی نہ آپ کے بعد کوئی ایسا ٹھکانہ و مرکز ہوگا کہ لوگ وہاں جمع ہو جائیں لہذا ایک آزمودہ کار آدمی ان کے مقابلہ کے لئے بھیجئے اور ساری اونچ نیچ سمجھا کر اس کا حوصلہ و ہمت بلند کیجئے اگر اللہ تعالی نے فتح عطا فرمائی تو ہم اللہ کا شکر ادا کریں گے اور اگر نتیجہ اس کے برعکس نکلا تو آپ لوگوں کے لئے پشت پناہ اور جائے امن ثابت ہوں گے۔

1۔ نهج البلاغة، 2/ 28، ط:مطبعة الاستقامة، قاهره (مصر)

2۔ نهج البلاغة (بشرحه): 8/ 296. وذكر ابن أبي الحديد أن هذه غزاة فلسطين التي فتح فيها بيت المقدس، وأن عمر بن الخطاب كان قد استخلف عليا عند سفره لاستلام مفاتيح بيت المقدس. شرح نهج البلاغة: 8/ 298. وينظر تاريخ الطبري: 2/ 449

اور مزے کی بات یہ ہے کہ شیعہ اس قسم کی روایات کو جو ان کی اصح اور متواتر الروایت کتابوں میں موجود ہیں پڑھتے اور سنتے ہیں، تو ان دیکھی اور ان سنی خیال کر کے گزر جاتے ہیں، اور جھوٹوں کی گھڑی ہوئی افتراء آمیز روایتوں کو حد درجہ کی مخالفت اور منافقت کی بناپہ باہم روایت کرتے اور پھیلاتے ہیں ان کے مقابلہ کی ان صحیح روایات کو دیکھ کر اور سان خطا ہو جاتے ہیں، تو آئیں بائیں کرتے ہوئے کبھی تو یہ کہنے لگتے ہیں کہ جناب امیر کی یہ پیروی اور متابعت شیخین رضی اللہ عنہما کے حق میں محض اس وجہ سے تھی کہ آپ کے معاون اور مددگار کم تھے اور پھر جب خود اپنی صحیح السند وہ روایات دیکھتے ہیں جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کی قوت غلبہ اور اعوان وانصار کی کثرت پر واضح طور پر دلالت کرتی ہیں، تو شرمندہ اور نادم ہوتے ہیں مثلاً وہ روایت جو ابان بن عیاش نے سلیم بن قیس ہلالی سے کی ہے یا اس کے علاوہ کچھ اوروں نے بعض دوسروں سے نقل کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

والله لئن لم تبايع أبا بكر لنقتلنك. قال له علي: لولا عهد عهده إلى خليلي لست أخونه لعلمت أينا أضعف ناصرا وأقل عددا.[1]

خدا کی قسم اگر تم نے ابو بکر کی بیعت نہ کی تو میں تم کو قتل کر دوں گا جواب میں جناب علی نے فرمایا اگر وہ عہد نہ ہوتا جو مجھ سے میرے خلیل نے لیا ہے اور جس کو میں توڑنا نہیں چاہتا تو پتہ چل جاتا کہ ہم میں سے کسی کے مددگار کمزور یا تعداد میں کم ہیں۔

یہ روایت ڈنکے کی چوٹ پر کہہ رہی ہے کہ جناب امیر کا سکوت محض اس بات کی وجہ سے جو آپ اپنے خلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکے تھے کہ خلافت بلافصل اول ابو بکر رضی اللہ عنہ کا حق ہے، پھر عمر کا رضی اللہ عنہ، اور اس بات پہ کہ عہد مذکور یہی ہے اصول شیعہ کے موافق برہان عقلی بھی ہے کہ اگر امامت کا حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہوتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، باوجود انصار واعوان کے جیسا کہ اس روایت سے آشکارا ہے آپ کو شیخین رضی اللہ عنہما سے جھگڑا نہ کرنے کی وصیت فرماجاتے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ نعوذ باللہ آپ امر الہی کو معطل چھوڑ دینے کی وصیت فرما

1۔ كتاب سليم بن قيس: ص 937. بحار الأنوار للمجلسي: 28/ 242.

گئے ہوں کیونکہ اس صورت میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کو اہل باطل کے اتباع کی وصیت فرماگئے اور امت کو لطف سے محروم فرمایا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا "یَا أَیُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِینَ عَلَى الْقِتَالِ"[1] اے نبی مومنوں کو لڑائی پر ابھاریئے اس وقت کہ دس کافروں کا مقابلہ ایک مسلمان ہوتا تھا، جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بڑی تاکیدات سے جہاد پر آمادہ فرماتے تھے، اور جب دین مکمل ہوا اور اتمام نعمت ہو چکا تو آپ شیر خدا جیسے شخص کو بزدلی اور خوف کا سبق دین تبلیغ احکام کو ترک کرائیں فتنہ فساد، تحریف کتاب اللہ اور تبدیل دین کو روا رکھیں العیاذ باللہ شان نبوت ورسالت کو اس وصیت سے دور کا واسطہ بھی نہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا "أَیَأْمُرُکُم بِالْکُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ"[2] کیا تمہارے مسلمان ہونے کے بعد وہ تم کو کفر کا حکم دیتے ہیں۔

اور کبھی شرمندگی مٹانے کے لئے کہتے ہیں کہ جھگڑے سے کنارہ کشی اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کی خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ موافقت، وفاداری اور صلح جوئی میں محض افعال الٰہی کی اقتداء مد نظر تھی یہ توجیہ ابو جعفر طوسی کے پوتے ابن طاوس کی ذہنی اختراع ہے جیسے دوسروں نے بھی سینوں سے لگالیا ہے حالانکہ یہ ایسی توجیہ ہے کہ نہ اس کا سر ہے نہ پیر، کیونکہ افعال الٰہی کی اقتداء واجب تو کیا ہوتی جائز بھی نہیں البتہ امتثال اوامر ضروری ہے خدا تعالیٰ کا فعل تو بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کافر کی مدد کرتا ہے اور مسلمان صالح کو نکال دیتا ہے حالانکہ یہ کسی مسلمان کے لئے بھی جائز نہیں کہ کافر کی مدد کرے اور مسلمان کو قتل کردے شان بندگی تو یہی ہے کہ اپنے مالک و آقا کے حکم کی تعمیل کرے اور اسے قبول کرے نہ یہ کہ اس کے افعال کی نقل کرنے لگے اس دنیا میں تعلقات بندگی و آقائی میں جو سراسر مجاز در مجاز میں اس قسم کا رویہ معیوب بھی ہے اور مطعون بھی چہ جائیکہ حقیقی بندگی و آقائی میں۔

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اطمینان سے کام لینا اور کام میں جلدی نہ کرنا قابل تعریف ہے تو یہ بات اچھے اور نیک کاموں کے لئے نہیں اس لئے کہ مثلاً آقا اپنے رسولوں پیامبروں اور غلاموں کو فوری حکم صادر کرے

1۔ سورۃ ال عمران، الایۃ: 80

2 سورۃ الانفال، الایۃ: 65

اور وہ سستا پن دکھائیں یا سستی کریں تو یہ کھلم کھلا نافرمانی کے داغ سے داغدار ہوں گے جیسا کہ فرمایا "وَإِنَّ مِنكُمْ لَمَن لَّيُبَطِّئَنَّ"[1] تم میں سے بعض ایسے ہیں جو نکلنے میں دیر لگاتے ہیں، اور جلد بازوں کی تعریف میں فرمایا "أُولَٰئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ"[2] یہی ہیں جو اچھے کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور یہی سبقت لے جانے والے ہیں، اس سے مثل مشہور ہے نیک کام میں سوچ بچار کی حاجت نہیں! اور کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست۔

اور امام کے لئے دھیما پن کس طرح جائزہ ہو سکتا ہے جبکہ مخلوق کی ہدایت اور گمراہوں کی رہنمائی اس کے ذمہ لازم ہے کیونکہ سستی اور دھیمے پن سے بہت سے واجبات ہاتھ سے نکل جائیں گے اور پھر اطمینان کی بھی کوئی حد ہونی چاہئیے پچیس سال کا عرصہ کوئی اطمینان میں نہیں گزارتا۔

اگر اس پر یہ کہا جائے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی یہ آہستہ روی امر الہی کی وجہ سے تھی اس لئے ترک واجب لازم نہیں آتا تو ہم کہیں گے کہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک جناب امیر کی امامت وجود میں نہیں آئی ہوگی ورنہ امام کا مقرر کرنا اور حکم دینا کہ آہستگی برتے اور لوازم امامت کو معطل رکھے، دونوں باتیں باہم متضاد و مخالف ہیں اس کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی بادشاہ کسی کو قاضی مقرر کرے اور کہے کہ پچیس سال تک اپنی قضا کا اظہار نہ کر، کوئی مقدمہ اپنے سامنے پیش نہ ہونے دے، اور دو آدمیوں کے بارے میں لب نہ ہلا یہ الفاظ تو واضح طور پر ایک ہی بات ظاہر کرتے ہیں کہ ابھی صرف قضا کا وعدہ ہے، قاضی کا تقرر عمل میں نہیں آیا پچیس سال بعد وہ قاضی ہوگا، اگر اس کو ظاہر پر محمول کریں تو یہ کھلا تناقض ہوگا اور قاضی کے تقرر سے جو غرض و مقصد مد نظر ہوتا ہے اس کا فوت ہونا لازم آئے گا یہ کوئی عقلمندی کی بات نہ ہوگی اس کی قباحت کسی سے پوشیدہ نہیں اللہ تعالیٰ ان باتوں سے پاک اور بالا و برتر ہے۔

اور ایک بات اس سے یہ بھی نکلتی ہے کہ جب جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے آہستگی برتنے کے لئے

1۔ سورة النساء، الاية: 72

2۔ سورة المومنون، الاية: 61

مامور ہوئے، اور آپ نے دعویٰ امامت قطعاً ظاہر بھی نہ فرمایا تو لا محالہ مکلفین آپ کی اتباع اور پیروی نہ کرنے میں معذور ہوں گے، اب اگر وہ دین و دنیا کے اہم کاموں کو انجام دینے کے لئے اس درمیانی مدت میں کسی اور کو نامزد کر لیں تو وہ عتاب و عقاب کے سزاوار ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

حدیث قتال علی التنزیل والتاویل

11۔ یہ حدیث جو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ان النبي قال لعلي إنك تقاتل على تأويل القرآن كما قاتلت على تنزيله.[1]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب علی سے فرمایا کہ تم تاویل قرآن پر لڑو گے جیسا کہ میں تنزیل قرآن پر لڑا۔

یہ حدیث بھی اثبات مدعا سے بالکل کوئی تعلق نہیں رکھتی کیونکہ حدیث کا ماحصل صرف یہ ہے کہ تم کسی وقت تاویل قرآن پر قتال کرو گے، اہل سنت کا مسلک بھی یہی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ اپنی لڑائیوں میں حق بجانب تھے اور آپ کے مخالفین خطاکار!

اس حدیث میں وہ کون سی وجہ ہے جس سے آپ کے امامت بلا فصل ثابت ہو سکے بلکہ یہ بالکل ظاہر ہے کہ تاویل قرآن پر قتال اور امامت بلا فصل میں ایک کو دوسرے کے ساتھ کسی وجہ سے بھی کوئی تلازم نہیں لہذا اس حدیث کو اہل سنت کے مقابلہ میں لانا انتہائی ناسمجھی کی بات ہے ہاں اس کو اہل سنت کے مذہب کی دلیل ٹھہرائیں تو یہ درست ہو گا کیونکہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کسی وقت امام ہوں گے اور تاویل قرآن پر قتال فرمائیں گے اور ان کے قتال کا وقت معلوم ہی ہے کہ کب تھا۔

اور پھر یہ حدیث اہل سنت کے اس دعویٰ کی دلیل بھی ہو سکتی ہے کہ حق جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف تھا اور آپ کے مخالف خطاء پر تھے کہ قرآن کے معنی سمجھنے میں ان سے خطا ہوئی اور ایک اجتہادی غلطی کے شکار ہوئے یہ شیعوں کی بد قسمتی ہے کہ بے وقوفی کے سبب اس قسم کی احادیث کو اس مقام پر لاتے اور اپنی ندامت و شرمندگی کا سامان اپنے ہاتھوں کرتے ہیں کیونکہ یہ احادیث تو ان کی تائید کی بجائے علی الاعلان ان کی تردید

1۔ كشف الغمة في معرفة الأئمة، 1/ 121، ط: دار الأضواء بيروت لبنان

کرتی ہیں ظاہر ہے کہ تاویل قرآن بالاجماع اوپر نہیں اگر قرآن کے ظاہری معنی سے غلط فہمی کی بنا پر نیک نیتی کے ساتھ تاویل کرلے اور اصلی معنوں تک رسائی نہ ہونے کے سبب انکار کر بیٹھے تو اس کے کفر میں بھی کلام ہے نہ کہ جو معنی خفی یعنی تاویل سے منکر ہو حالانکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ آپ سے لڑنے والے کافر ہیں جیسا کہ طوسی کی تجرید العقائد میں صاف موجود ہے۔[1]

حدیث ثقلین

12۔ بارہویں حدیث وہ ہے جو حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: إني تارك فيكم الثقلين، فإن تمسكتم بهما لن تضلوا بعدي: أحدهما أعظم من الآخر كتاب الله وعترتي[2]

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم میں دو مرکز ثقل چھوڑے جارہا ہوں جب تک تم ان دونوں کو تھامے رہو گے تو میرے بعد بھی گمراہ نہ ہو گے ان میں سے ایک دوسرے سے بڑھ کر ہے یعنی اللہ تعالی کی کتاب قرآن مجید اور میری عترت۔

یہ حدیث بھی احادیث ماسبق کی طرح اصل مدعا سے کوئی تعلق نہیں رکھتی آخر وہ ایسی کون سی مجبوری اور ضرورت ہے کہ مالک ریاست کبری ہی سے تمسک واستدلال ہو اور اگر اسے محسن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بھی تو حدیث صحیح ہے کہ:

«عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين من بعدي، تمسكوا بها وعضوا عليها بالنوجذ».[3]

تم پر میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت میرے بعد لازم ہے اسے تھام لو اور

1۔ قال الطوسي: «إن من حارب أمير المؤمنين عندنا كافر». بحار الأنوار: 8/ 368.

2۔ مسند ابي يعلي الموصلي، 2/ 303، رقم :1027، ط: دار المأمون للتراث دمشق

3۔ مسند الإمام أحمد بن حنبل، 28/ 373، رقم:17144، ط: مؤسسة الرسالة

مضبوطی کے ساتھ دانتوں سے پکڑلو۔

اور پھر چلو تمہارا کہا ہی صحیح لیکن لغت عرب میں عترت اقارب کے معنی میں آتا ہے اگر اس کی ولایت امامت پر ہوگی تو حضور ﷺ کے تمام اقارب ائمہ واجب الاطاعت ہوئے لازم ہوں گے خصوصا عبد اللہ بن عباس، محمد ابن الحنفیہ، زید بن علی، حسن مثنی، اسحاق بن جعفر صادق رضی اللہ عنہم اور ان جیسے دیگر اہل بیت! اور صحیح حدیث میں یہ بھی ہے "خذوا شطور دينكم عن هذا الحميراء" اپنا آدھا دین اس حمیرہ سے لو یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے۔

"واهتدوا بهدي عمار، وتمسكوا بعهد ابن أم عبد"[1]

عمار سے روش ہدایت سیکھو اور عبد اللہ بن مسعود کی وصیت کو مضبوطی سے تھام لو۔

"رضيت لكم ما رضي لكم ابن أم عبد"[2]

عبد اللہ بن مسعود تم سے جس بات پر خوش ہوں میں بھی اس پر خوش ہوں۔

وأعلمكم بالحلال والحرام معاذ بن جبل[3]

اور تم میں معاذ بن جبل حلال وحرام کا زیادہ علم رکھنے والے ہیں۔

اسی طرح کی اور بھی بے شمار احادیث صحیحہ موجود ہیں خصوصا آپ کا یہ فرمان:

اقتدوا باللذين من بعدي أبي بكر وعمر[4]

میرے بعد دین میں ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما کی پیروی کرو۔

اور یہ حدیث تو شہرت و تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے تو اب یہ لازم آیا اور ضروری ہوا کہ سب ہی

1۔ الترمذي وصحيح الجامع: رقم 1144

2۔ المستدرك على الصحيحين، 3/ 360، رقم: 5394، ط: دار الكتب العلمية بيروت

3۔ أحمد والترمذي وابن ماجة. صحيح الجامع: رقم 895.

4۔ سنن الترمذي، 6/ 50، رقم: 3662، ط: دار الغرب الإسلامي بيروت

اشخاص امام ہوں، اس کے علاوہ اگر یہ حدیث عطرت دلیل امامت ہو تو جناب امیر رضی اللہ عنہ سے جو حدیث مروی ہے اور جسے شیعہ متواتر مانتے ہیں کہ " وإنما الشورى للمهاجرين والأنصار "[1] کس طرح ٹھیک ثابت ہوگی اور اسی طرح حدیث:

مثل أهل بيتي فيكم مثل سفينة نوح من ركبها نجا ومن تخلف عنها غرق[2]

میں میرے اہل بیت کی مثال نوح کی کشتی کی سی ہے کہ جو اس میں سوار ہو گیا نجات پا گیا اور جو پیچھے رہ گیا ڈوب گیا۔

صرف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ فلاح وہدایت ان سے محبت ودوستی سے وابستہ ہے اور ان کی اتباع پر موقوف اور ان کی محبت ودوستی سے روگردانی ہلاکت وتباہی کا باعث اور بفضلہ تعالیٰ سارے فرق اسلامیہ میں سے اہل سنت ہی کو یہ سعادت نصیب ہے اور دیگر مذاہب کے مقابلے میں صرف انہی کے مذہب کو مسلک کی یہ خصوصیت ہے کہ انہوں نے تمام اہل سنت کی محبت کی رسی کو پورے طور پر تھام رکھا ہے اس طرح نہیں کہ "أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ"[3] کتاب کی ایک بات مانتے ہیں اور کچھ کا انکار کرتے ہیں، بلکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ایمان کے بموجب کہ "لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ"[4] ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے ساتھ فرق نہیں کرتے، بعض سے محبت یا ان پر ایمان اور بعض سے عداوت یا کفر اختیار نہیں کرتے۔

اور ان شیعوں کا یہ حال ہے کہ ان میں کا کوئی فرقہ تمام اہل بیت کو دوست نہیں رکھتا بعض ایک طائفہ سے دوستی رکھتے ہیں تو باقیوں سے بغض عداوت اور بعض دوسرے طائفہ سے یہی حال ان کے اتباع وپیروی کا

1۔ نهج البلاغة، ومن كتاب له عليه السلام إلى معاوية، 3/ 7، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

2۔ ميزان الحكمة أخلاقي، عقائدي، اجتماعي سياسي، اقتصادي، أدبي، لمحمد الري شهري، 4/ 2820، ط، دار الحديث و ضعفه ابن كثير في تفسيره وابن حجر في ذخيرة الحفاظ، ووضعه الألباني في ضعيف الجامع: 1/ 1974.

3۔ سورة البقرة، الاية : 85

4۔ سورة البقرة، الاية : 285

ہے بخلاف اہل سنت کے کہ کسی ایک پر انحصار کریں سب سے روایات لیتے ہیں اور ان سے تمسک و استدلال کرتے ہیں چنانچہ ان کے کتب تفسیر و فقہ و حدیث اس پر گواہ ہیں اگر کتب اہل سنت کا اعتبار نہ کریں تو پھر مرویات شیعہ کا کیا جواب ہے جن کو اس کتاب میں نقل کیا ہے اور جو عقائد الہیہ سے لے کر فروع فقہیہ تک اہل سنت کے مذہب کے موافق ہیں۔

حدیث سفینہ نوح کی مزید تشریح

اس موقع پر بعض خوش طبع شیعہ دلفریب تقریر جھاڑتے ہیں ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کو یہاں نقل کر کے ان کے فریب بازی کو واضح کریں، وہ کہتا ہے کہ اس حدیث میں اہل سنت کی سفینہ نوح سے تشبیہ اشارہ کرتی ہے کہ تمام اہل بیت کی محبت اور سب کی اتباع نجات و فلاح کے لیے ضروری نہیں اس لیے کہ اگر ایک شخص نے کشتی کے ایک کونے میں اپنی جگہ پکڑلی تو بلاشبہ اس کو ڈوبنے سے نجات مل گئی ساری کشتی میں چکر لگاتے پھرنا کبھی اس کونہ میں کبھی اس کونہ میں نہ اس کا کوئی عادی ہوتا ہے نہ اس پر عمل کرتا ہے لہذا جب شیعہ نے کسی اہل بیت سے تعلق رکھا اور ان کی اتباع کو اپنا مقصد ٹھہرالیا تو بلاشبہ اسے راہ نجات مل گئی اور اہل سنت کا یہ الزام کہ انہوں نے بعض کی اطاعت ترک کی صحیح نہ رہا۔

بحمد للہ اہل سنت اس کا شافی جواب دے سکتے ہیں اور دو طرح سے اول بطریق نقض و الزام کہ اگر یہی بات ہے تو امامیہ کو چاہیے کہ زیدیوں کیسانیوں، ناؤسیوں اور افطحیوں میں سے کسی کو نہ گمراہ کہیں نہ ان کی تکفیر و تفسیق کریں بلکہ ان کو ناجی اور بامراد خیال کریں کیونکہ ان میں سے ہر ایک فرقہ نے اس وسیع کشتی کا ایک گوشہ پکڑا ہوا ہے اور اس کو اپنا ٹھکانہ بنالیا ہے اور بقول تمہارے ایک گوشہ ہی ڈوبنے سے بچانے کے لیے کافی ہے بلکہ اس صورت میں تو بارہ اماموں کی تعیین بھی خطرہ میں پڑ جائے گی کیونکہ کشتی کا تو ایک کونہ ہی نجات کے لیے کافی ہے بارہ گوشوں کی کیا کیا ضرورت ہے۔

اور امام وہی ہے جس کی اتباع نجات آخرت کی موجب ہو اور پھر یوں تو اثنا عشریہ ہی نہیں پورا سلسلہ امامیہ ہی زیر وزبر اور درہم برہم ہو جائے گا یہی بات زیدیہ کہیں تو یہی بات ان کے خلاف بھی جائے گی گویا اس صورت میں شیعوں کے فرقوں میں سے کوئی فرقہ اپنے لیے کوئی خاص مذہب مخصوص نہیں کر سکتا بلکہ ان کو

چاہیے کہ اپنے سب ہی مذاہب کو مبنی بر حق اور ثواب و درست سمجھیں حالانکہ ان کے مذاہب میں باہم جو تناقض اور تضاد ہے اس کو معلوم کرنے کے لیے کسی علمی گہرائی میں جانے کی بھی ضرورت نہیں اور اجتہادیات کے علاوہ تناقض کے دونوں اطراف کو حق جاننا اجتماع نقیضین کا قائل ہونا ہے جو محال ہے۔

دوسرا جواب بطریق حل ہے وہ یہ کہ ایک کونہ میں جگہ پکڑ لینا اس وقت ڈوبنے سے بچا سکتا ہے کہ دوسرا کونہ اس کی تخریب کاری سے محفوظ رہے اور وہاں سوراخ نہ کرنے لگے اگر ایک کونہ میں مقیم رہ کر دوسرے کونہ میں سوراخ کرے گا تو ہرگز ڈوبنے سے نہ بچ سکے گا اور شیعی فرقوں میں ایک بھی فرقہ ایسا نہیں جو ایک کونہ میں بیٹھا ہو اور دوسرے کونہ میں سوراخ نہ کر رہا ہو، ہاں اہل سنت اگرچہ دوسرے گوشوں میں بھی چلت پھرت رکھتی ہیں مگر ان کی کشتی اس کے باوجود محفوظ و سالم ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے کسی گوشہ میں سراخ نہیں کیا کہ ادھر سے موج دریا کشتی میں داخل ہو جائے اور کشتی کو ڈبو دے اور یہ مقام شکر ہے کہ اہل سنت کی اس روش کے سبب نواصب کے اشکالات کا اعتراضات کا دفیعہ بھی آسان و سہل ہوا کہ انہوں نے عقلی دلیل سے ان دونوں احادیث کا انکار کیا ہے اور اس میں کمزوریاں نکالی ہیں اور کہا ہے کہ ان دونوں حدیثوں کا مطلب ممتنعات عقلیہ کی تکلیف کو روا رکھتا ہے جو بالبداہت محال و ناممکن ہے اور وہ اس طرح کے اگر تمام اہل بیت سے تمسک کیا جائے تو ان کے آپس کے عقائد و فروع میں متناقض کی حد تک اختلاف کے سبب امت کو نقیضین کے جمع کرنے کی تکلیف دینا ہے جو بالکل ہی محال ہے اور اگر تمام کی جگہ سے تمسک کریں تو تعین سے ہوگا اور بلا تعین کے اگر پہلی صورت ہو تو بغیر مرجع کے ترجیح لازم آتی ہے یعنی جب سب اہل بیت فوقیت میں برابر ہیں تو ایک کو دوسرے پر ترجیح کیسی اور پھر ان میں بھی ہر ایک کو تاہی نے حق کی روایات میں سخت اختلاف پیش آیا لہذا پھر وہی اجتماع نقیضین یا ترجیح بلا مرجح کا الزام لگتا ہے۔

دوسری صورت میں مختلف عقائد اور مختلف شریعتوں کا ایک دین میں خلاف شارع سماجانا لازم اجاتا ہے جس کی ساخت تردید اس کلام الٰہی سے ہوتی ہے "لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا"[1] تم میں سے ہر ایک

1۔ سورة المائدة، الآية : 48

کے لیے ہم نے ایک دین اور ایک راستہ بنایا، اور ضرورت دینیہ کی وجہ سے اس کا محال ہونا لازم آتا ہے، ان اشقیاء کے ان اشکالات واعتراضات سے پوری ملت شیعہ عہدہ برا نہیں ہو سکتی تا آنکہ اہل سنت کی روش اختیار نہ کریں۔

شیعوں کے عقلی دلائل کا جواب

اور شیعوں کے عقلی دلائل کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ حد و شمار سے بھی باہر ہیں الفین اور دوسری کتابوں نے ان کا احاطہ کیا ہے، یہاں اہل سنت کے لیے مفید قاعدہ کلیہ بیان کیا جاتا ہے جس سے وہ ان کی ہر دلیل کا توڑ اور ہر مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں پہلے تو یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ اس مدعا پر جو عقلی دلیل ہو گی وہ تین حال سے خالی نہیں:

1۔ اس کے سب مقدمات عقلی ہوں گے جیسے اس کتاب میں بیان کردہ دلائل میں پانچویں دلیل۔

2۔ یا بعض عقلی ہوں گے بعض نقلی جیسے دلیل اول۔

3۔ یا سب نقلی ہوں گے جیسے دلیل دوم۔

یہ اصطلاح گو مشہور اصطلاح کے خلاف ہے کہ دلیل عقلی وہ ہے جو محض مقدمات اقلیت سے مرکب ہو اور دلیل نقلی وہ جس کا ایک مقدمہ نقلی ہے بہر حال حر سے عقلی دلائل یقینی طور پر ماخوذ ہوں گے شرائط امامت سے یا موانع امامت اور طریق تعین سے تو گویا اس صورت میں تمام دلائل کی بنیاد امامت کی بحث قرار پائے گی اور امامت کی بحث نبوت کے تابع ہے جس کی وہ امامت نائب ہے اور خود یعنی بحث نبوت فرع ہے الہیات کی جس کی وہ بھی نائب ہے کیونکہ نبوت خدا کی رسالت کا نام ہے۔

پس جب شیعوں کے اصول اور ان کے مسلمات کا تینوں مباحث میں کتاب اللہ عترت رسول اور عقل کے خلاف ہونے کے سبب قلا کما کر دیا گیا تو گویا ان کے دلائل تینوں مرحلوں میں مصدور کر دیے گئے اور ان کے شبہات کا نسب نامہ تین پشتوں تک مجروح کر دیا گیا اس کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں کہ مثلاً یہی مقدمہ جو ان کے دلائل میں بہت آیا ہے کہ امام کا منصوص علیہ ہونا (یعنی اس کی امامت پر نص کا ورود ہوا ہو) واجب ہے اس کی اصل و بنیاد ان کا یہ عقیدہ ہے " نصب الامام واجب علی اللہ " امام کا مقرر کرنا اللہ پر واجب ہے، اور اس بنیاد کی بنیاد یہ عقیدہ ہے "بعث النبی واجب علی اللہ" نبی کو پیدا کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور اس اصل کی اصل کی اصل یہ

عقیدہ ہے "التكليف واجب على الله" بندوں کو مکلف کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، اور اس اصل کی اصل کی اصل کی اصل یہ عقیدہ ہے "اللطف واجب على الله"[1] لطف و مہربانی اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔

جب ان مذکورہ بالا چار مباحث کو عقل نے کتاب اللہ اور عترت رسول جیسے دو معتبر و عادل گواہوں کی شہادت و گواہی سے باطل و غلط ثابت کر دیا تو اس مقدمہ کے باطل کو غلط ہونے میں کون سے شعبہ باقی رہ جاتا ہے یارہ سکتا ہے لہٰذا اس قاعدہ کی رو سے ان کے تمام دلائل کی حالت باعتبار مقدمات و مواد کے عقلمند کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے اور پھر ان کے اشکال لکڑی کی تلوار کا کھلونا جو بچوں کا دل بہلاوا ہو یا شیر کی کھال ثابت ہوتی ہے جس کو بوڑھے بھی روندتے پھرتے ہیں اسی لیے در حقیقت ان کے دلائل کے بیان سے اس کتاب میں اللہ تعالیٰ کا گھبراہٹ یا دغدغہ نہیں ہے البتہ ان کے وہ چند دلائل جن کو یہ "عروة الوثقي" (مضبوط کھونٹا) یا "عمدة القوي" (چیدہ قوت) خیال کرتے ہیں ہم بطور نمونہ یہاں قلم بند کرتے ہیں تاکہ ان کے باقی ماندہ دلائل کی حقیقت بھی کھل جائے جن سے وہ بھی کماحقہ واقف نہیں ہے ایسی دلیلیں کل چھ ہیں۔

پہلی دلیل امام کے لئے معصوم ہونا واجب ہے

یہ کہ امام کے لیے واجب ہے کہ معصوم ہو اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی معصوم نہیں لہٰذا وہی امام ہوں گے کوئی اور نہیں اور یہی مدعا ہے۔

اس دلیل میں صغریٰ و کبریٰ دونوں ناقابل تسلیم ہے صغریٰ اس لیے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے صراحتاً فرمایا "وإنما الشورى للمهاجرين والأنصار"[2] مشورہ کا حق مہاجرین و انصاری کو ہے، اور ظاہر ہے کہ مہاجرین و انصار کی جماعت میں جس نے ان کو خلیفہ چنا کو معصوم نہ تھا اور یہ بھی ہے کہ جب آپ نے خوارج

1۔ کشف المراد فی شرح تجرید الاعتقاد، قاعدہ لطف (اللطف واجب علی اللہ): صفحہ 442، بعث النبی (وجوب بعث): صفحہ 474، نصب الامام (وجوب امامت): صفحہ 490، ط: مؤسسۃ النشر الاسلامی (جامعہ مدرسین)، قم، ایران

2۔ نہج البلاغة، 3/ 7، ط: مطبعة الاستقامة، قاهرة

کا یہ کلام سنا کہ "لا امرة" خلافت کوئی چیز نہیں تو آپ نے فرمایا "لا بد للناس من أمير بر أو فاجر"[1] لوگوں کے لیے کوئی امیر ضروری ہونا چاہیے خواہ وہ نیک ہو یا بد، نہج البلاغہ میں بھی یہ روایت موجود ہے۔

لیکن اس کو اگر تسلیم بھی کر لیں تو نبی کے سوا کسی دوسرے اور شخص کا معصوم ہونا معلوم نہیں ہو سکتا کیونکہ علم و معلومات کے تین ہی تو اسباب ہیں حواس سلیمہ، عقل اور خبر صادق، ظاہر ہے کہ عصمت چونکہ اس ملکہ کا نام ہے جو گناہوں اور برائیوں کے صدور کو روک دے تو یہ حس میں نہیں آ سکتی، رہی عقل تو بھی افعال آثار کی مدد کے بغیر اس ملکہ کا پتہ نہیں چلا سکتی اور افعال کی رہنمائی یہاں نصیب نہیں اس لیے کہ اول تو شخص معین و مخصوص کے تمام افعال و اثار کا معلوم کرنا دائرہ امکان سے باہر ہے خصوصاً دل کی پوشیدہ اور چھپے ہوئے نیتوں و ارادوں مثلاً عقائد فاسدہ، حسد و بغض و جذبہ خود پسندی، ریا اور دوسرے نازیبا اخلاق وغیرہ اور پھر اگر اس کے تمام اچھے افعال و آثار موجودہ کا پتہ کسی طرح لگ بھی جائے تو اس کے ماضی و مستقبل کی کون ضمانت دے گا انسان کا حال تو یہ ہے کہ صبح وہ کچھ ہے تو شام کو کچھ، نفس اس کے ساتھ لگا ہوا ہے شیطان سا دشمن دم کے ساتھ ہے برے ہمدموں میں گھرا ہوا ہے ہو سکتا ہے کہ صبح وہ مومن ہے تو شام کو ایمان کو خیر باد کہہ چکا ہو برصیصا اور بلعم باعورہ کے قصے اس جگہ عبرت کے لیے بہت کافی ہیں دوسری طرف دعائے ماثورہ "یا مقلب القلوب ثبت قلبي على دينك وطاعتك"[2] اے دلوں کو لوٹ پلٹ کرنے والے میرے دل کو اپنے دین اور اپنی اطاعت پر جما دے، اس بیماری کے کھٹکے سے بچانے کے لیے بڑی اکسیر ہے۔

اور بفرض محال یہ سب کچھ معلوم بھی ہو جائے تو حقیقت عصمت کا پتہ کیسے چلے گا یعنی یہ کہ گناہ کا اس سے سرزد ہونا ممتنع و محال ہے زیادہ سے زیادہ اس بات کی کوشش کر لیں گے کہ معلوم کر لیں کہ اس سے گناہ سرزد نہیں ہوا جس کو محفوظیت کا مرتبہ کہتے ہیں جو عصمت کے لیے کافی نہیں تاوقتیکہ اس کا گناہوں کا امتناع معلوم نہ ہو۔

اب رہی خبر صادق تو وہ دو قسم کی ہوتی ہے متواتر اور خبر خدا اور سول ظاہر ہے متواتر کو یہاں کوئی دخل

1۔ نهج البلاغة، 1/ 91، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

2۔ الترمذي وأحمد، صحيح الجامع: رقم 4801.

نہیں اس لیے کہ حس کی شرط کے ساتھ انتہا علم ضروری کو مفید نہیں اور غیر محسوسات میں جو زیر بحث ہیں غیر مفید ورنہ پھر فلاسفہ کی عالم کے قدیم ہونے کی خبر علم ضروری کو مفید ہوگی جو بالاجماع باطل ہے اور خدا اور رسول کی خبر یہاں اصول شیعہ کے مطابق علم کی موجب نہیں اول تو یوں کہ اخبار میں بداء جائز ہے تو یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک وقت ایک شخص کی عصمت کی خبر دیں اور دوسرے وقت میں اسی شخص کے فسق کی، اور اس کی ایک خبر ہم تک پہنچے اور دوسری نہ پہنچے، اسی طرح ارادہ میں بھی یہ صورت باجماع شیعہ جائز ہے،[1] کہ ایک وقت میں ایک شخص کی عصمت سے ارادہ متعلق ہو اور دوسرے وقت میں اس کے فسق سے لہٰذا ایسی حالت میں اطمینان واعتماد اٹھ گیا اور اس پر سے اعتماد جاتا رہا کہ یہ شخص آخر وقت تک عصمت پر قائم رہے گا بھی!

دوسرے یہ کہ خدا اور رسول کی خبر اطلاع مکلفین کو یا تو معصوم کے ذریعہ پہنچے گی یا بواسطہ تواتر کے پہلی صورت میں دور لازم آئے گا کیونکہ اس کی عصمت بھی تو اسی خبر سے ہم ثابت کرتے ہیں اگر اس خبر کو بھی عصمت سے ثابت کریں تو یہ ایک چیز کا خود اپنے پر موقوف ہونا ہوگا۔

دوسری صورت میں یہ سقم ہے کہ خود شیعوں کے نزدیک ہر تواتر علم یقینی کو مفید نہیں مثلاً موزوں پر مسح کا تواتر وضو میں پاؤں دھونے کا تواتر اور "الى المرافق" اور "امة هي اربي من امة" الفاظ قرآن کا تواتر اور قعدہ نماز میں التحیات کے صیغہ کا تواتر[2] اور اسی طرح کے اور بہت سے تواتر کہ شیعہ ان سب تواتروں سے انکار کرتے ہیں پس کسی خاص تواتر کی تعیین درکار ہوگی مگر وہ بھی غیر مفید ہے کیونکہ تواتر سے علم یقینی ناقلین کی کثرت سے حاصل ہوتا ہے اور جب ایک دو باتوں میں جھوٹ کھل گیا تو سارے اقسام سے اعتماد جاتا رہے گا۔

---

1 ـ روى الكليني عن الفضيل عن أبي عبد الله أنه قال: «الله تبارك وتعالى البداء فيما علم متى شاء وفيما أراد لتقدير الأشياء». الكافي 1/ 149.

2 ـ إشارة إلى نفي الشيعة لصيغة التحيات رغم تواترها عند أهل السنة، فروى ابن بابويه عن الصادق أنه قال: «أفسد ابن مسعود على الناس صلاتهم بشيئين، بقوله (تبارك اسمك وتعالى جدك) وهذا شيء قالته الجن بجهالة، فحكاه الله عنها، وبقوله (السلام علينا وعلى عباد الله الصالحين) يعني في التشهد الأول، وأما الثاني بعد الشهادتين فلا بأس به ...». من لا يحضره الفقيه: 1/ 401.

اب رہا دلیل کا مقدمہ کبریٰ یعنی سوائے جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کوئی معصوم نہیں تھا تو وہ اس لیے ہم تسلیم نہیں کہ ہاں جناب نے اپنے دوستوں سے خود یہ فرمایا:

فلا تكفوا عن مقالة بحق أو مشورة بعدل، فإني لست في نفسي بفوق أن أخطئ ولا امن من ذلك في فعلي [1]

تم حق بات کہنے اور منصفانہ مشورہ دینے سے باز نہ رہو اس لیے میں خطا و لغزش سے بالاتر نہیں ہوں نہ اپنے فعل میں ایسی باتوں سے مامون ہوں، بحوالہ نہج البلاغہ۔

ظاہر ہے کہ ایک معصوم ایسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتا خصوصاً اسی کلام کے یہ آخری الفاظ:

"إلا أن يلقي الله في نفسي ما هو أملك به مني"[2]

مگر یہ کہ ڈال دے وہ میرے دل میں وہ چیز جس کا وہ مجھ سے بہتر مالک ہے۔

یہ الفاظ ان کی عدم عصمت پر واضح دلیل ہے کیونکہ معصوم کو تو اللہ تعالیٰ اس کے نفس کا مالک بنا دیتا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے" كان أملكهم لأربه"[3] ان کو اپنے نفس پر تم سے زیادہ قابو تھا، علاوہ ازیں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے بطور دعا یوں بھی منقول ہے:

"اللهم اغفر لي ما تقربت به إليك ثم خالفه قلبي"[4]

اے اللہ تو میرے اس عمل کو بخش دے جس کے ذریعہ میں نے تیرا قرب ڈھونڈنا چاہا مگر میرے دل نے اس کی مخالفت کی یہ سارا کلام نہج البلاغہ میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔

1۔ نهج البلاغة، 2/ 201، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

2۔ نهج البلاغة: (بشرح ابن أبي الحديد): 11/ 101.

3۔ سبل السلام ،لمحمد بن إسماعيل الكحلاني ثم الصنعاني المعروف بالأمير، 2/ 157، ط: مطبعة مصطفى البابي الحلبي

4۔ نهج البلاغة (بشرح ابن أبي الحديد): 6/ 176.

دوسری دلیل امام نے کبھی کفر نہ کیا ہو

یہ کہ امام کو چاہیے کہ اس نے کبھی کفر نہ کیا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے" لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ"[1] میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا اور کافر ظالم ہے کیونکہ فرمایا ہے" وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ"[2] اور کافر ہی ظالم ہیں یا ارشاد فرمایا" إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ"[3] بے شک شرک بڑا ظلم ہے اور سوائے حضرت امیر کے سب نے بت پرستی کی ہے لہذا آپ کے علاوہ کوئی دوسرا امام نہ ہو گا اور آپ امامت کے لیے متعین ہوئے۔[4]

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ امامت کی یہ شرط نہ کسی شیعہ نے اپنے کتب کلامیہ میں لکھی ہے نہ کسی سنی نے نہ قرآن کی کسی آیت میں اس کا ذکر ہے نہ کسی حدیث میں اس کا حوالہ ہے یہ صرف شیعی علماء نے حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی امامت و خلافت سے انکار کرنے کے سلسلہ میں تراشی ہے اس کا وجود ان کے سینہ پر کینہ کے علاوہ کہیں نہیں ملتا۔

ظاہر ہے کہ شرعی اور دینی امور میں سے کسی دینی امر میں کفر سابق کا کسی نہج اعتبار نہیں کیا گیا ہے بلکہ ایمان لانے کے بعد سو سال کا بوڑھا کافر اور پشتینی مسلمان جس کی ستر پشتیں اسلام پر گزری ہوں دونوں برابر ہیں تو پھر اس میں یہ شرط کیوں ملحوظ رکھی جاتی اور آیت لاینال۔۔۔الخ سے اس جگہ استدلال مضحکہ خیز ہے وہ مغالطہ دینے کی کوشش ناتمام کے سوا کچھ نہیں کیونکہ آیت کا مقصد یہ ہے کہ شرعی ریاست ظالم کو نصیب نہیں ہوتی اس لیے کہ عدل و انصاف امامت کبریٰ قضا احتساب اور عمارت تمام شرعی درجات میں شرط ہے تاکہ ان منصوبوں پر فوائد مرتب ہوں اور ہر عمارت در یاست میں ظالم کا تقرر چند در چند فسادات کا باعث ہوتا ہے لہذا کفر و ظلم اور

1۔ سورة البقرة، الاية: 124

2۔ سورة البقرة، الاية: 254

3۔ سورة لقمان، الاية: 13

4۔ هذا ادعاء الإمامية، قال الحسن الديلمي: «ومن فضائله - عليه السلام - أنه نشأ وربي في الإيمان ولم يدنس بدنس الجاهلية بخلاف غيره من سائر الصحابة». إرشاد القلوب: 2/ 229.

امامت میں منافات ثابت ہوئی اور دو منافی و مخالف باتیں ایک ذات میں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتی علیحدہ علیحدہ زمانوں اور وقتوں میں جمع ہو سکتی ہیں چنانچہ اہل سنت کا مذہب یہی ہے کہ بر وقت امامت امام کے لیے یہ چاہیے کہ وہ مسلمان ہو اور عادل ہو نہ یہ کہ اس نے امامت سے پہلے کفر و ظلم نہ کیا ہو اسی لیے اس شخص کو جو پہلے کوفے میں مبتلا رہا ہو یا ظلم پیشہ ہو ایمان لانے کے بعد اسے کافر و ظالم کہنا نہ لغت و عرف میں اور نہ شرع میں ہر گز جائز نہیں۔

اور اصول میں یہ بات طے شدہ ہے کہ جس میں مبداء فی الحال قائم ہو اس پر مشتق کا اطلاق حقیقت ہے اور دوسرے میں مجاز اور وہ مجاز بھی متردنہیں کہ ہر جگہ ہو جو موقع مشہور و معروف ہوں وہیں ان کو بولنا چاہیے جیسا کہ اپنے مقام پر یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ مجاز ہر جگہ استعمال نہیں ہوتا ورنہ پھر انسان کے علاوہ دراز طویل کو کھجور کا تنا کہہ سکیں گے اور ہر بوڑھے کو بچہ، یہ بڑا سخت مغالطہ ہے اسی طرح سونے والے کو جاگنے والا غنی کو فقیر پیٹ بھرے کو بھوکا مردہ کو زندہ اور زندہ کو مردہ کہہ سکیں گے۔

علماء حنفیہ میں سے ابوالحسن زاہد نے "معالی العرش الی معالی القرش" میں ایک طویل حدیث میں کہا:

أن أبا بكر قال للنبي صلى الله عليه وسلم بمحضر من المهاجرين والأنصار وعيشك يا رسول الله، إني لم أسجد للصنم قط، فنزل جبريل وقال: صدق أبو بكر [1]

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین و انصار کی موجودگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کی عمر کی قسم میں نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا اس وقت جبرائیل علیہ السلام نازل ہوا اور کہا کہ ابو بکر نے سچ کہا۔

اہل سیر و تواریخ نے بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حالات میں یہ بات لکھی ہے کہ آپ نے کبھی بت کو سجدہ نہیں کیا لہذا الحمد للہ کہ اس شرط کی رو سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے خلافت کی صحت پر بھی اجماع ہو گیا۔

الاكمال في أسماء الرجال للتبريزي، ص: ١٩، ط: مؤسسة أهل البيت قم المقدسة

تیسری دلیل امام کی امامت نص سے ثابت ہوتی ہے

یہ کہ امام کی امامت نص سے ثابت ہونی چاہیے اور نہ سوائے حضرت امیر رضی اللہ عنہ کسی کے حق میں نہیں لہذا آپ کے علاوہ کوئی امام نہ ہو گا۔

یہاں بھی صغریٰ و کبریٰ دونوں نا قابل تسلیم ہے صغریٰ اس لیے کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا کلام بابت مشورہ ابھی گزرا ہے اس کا آخری جزو یہ ہے "فإن اجتمعوا علی رجل وسموہ إماما کان ذلك لله رضا"[1] مشورہ کا حق مہاجرین و انصار کو ہے وہ اگر کسی شخص کو چن کر اس کو امام کہیں تو یہ رضائے الٰہی اور خوشنودی رب کا ذریعہ ہو گا۔

اور کبریٰ اس سبب سے نہ قابل تسلیم ہے کہ اگر کوئی نص وارد ہو تو وہ قرآن میں ہو گی یا حدیث میں اور ہر دو کا حال پورا معلوم ہوا کہ ان میں کوئی ایسی نص نہیں ہے اور پھر یہ بھی بات قابل لحاظ ہے کہ نا آگر وارد بھی ہوتی تو لا محالہ متواتر ہونی چاہیے تھی کیونکہ اصولی اور بنیادی عقائد میں خبر واحد کا کوئی اعتبار نہیں اور کوئی جانتا نہ جانتا اہل بیت کرام اس سے ضرور واقف ہوتے حالانکہ وہ اس کا انکار فرماتے ہیں اور اگر نص وارد ہوتی تو پھر اماموں کے حق میں ہوتا ہے جبکہ حال یہ ہے کہ ہر امام کی وفات کے بعد ان کی اولاد امامت میں مختلف ہوئی۔

اگر نص ہوتی تو یہ اختلاف اور سر پھٹول کیوں ہوتی اور کیوں ایک دوسرے کو ناحق اور نا اہل بتاتے اگر نص ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ابلاغ کی دو صورتیں ہوتیں یا تو اس کو لوگوں کو بحد تواتر اس کی تبلیغ فرماتے یا نہیں پہلی صورت میں وہ حاملین نص جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ علم ہو گیا موقع آنے تک یا تو اسے چھپائے رکھتے یا ظاہر کر دیتے دوسری شق لا محالہ بالاجماع باطل ہے کہ وہ اگر تھی تو ظاہر ی نہیں ہوئی اور پہلی شق ہو تو پھر وہ تواتر سے اعتماد اٹھا دیتی ہے اور متواترات میں کذب کا دخل لازم آتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کی دوسری صورت میں کہ آپ اس کو حد تواتر تک نہ پہنچائیں مکلفین سے حجت اٹھ جاتی ہے اور نص کا فائدہ ختم ہو جاتا ہے بلکہ نعوذ باللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ترک تبلیغ کا الزام آتا ہے۔

1۔ نهج البلاغة (بشرح ابن أبي الحديد): 12/ 3؛ تاريخ دمشق: 59/ 128.

چوتھی دلیل جناب امیر کی صداقت امامت بالاجماع ثابت ہے

کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ ہمیشہ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے ستم رسیدہ رہے اور ان سے شاکی رہے اور خود کو ہمیشہ مظلوم و مقہور ہی ظاہر فرمایا اور یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ آپ سے امامت چھین لی گئی تھی تو امامت آپ کا حق ہوئی نہ کسی اور کا کیونکہ آپ کی صداقت کو سب بالاجماع مانتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایات بھی اس لیے ناقابل تسلیم ہے کہ اہل سنت کو تلاش و جستجو کے باوجود ان روایات کا کوئی اتاپتا کھوج سراغ نہیں مل سکا بلکہ اس کے برخلاف ایسی متواتر حدیثوں تک ان کی رسائی ہوئی ہے جو ان میں باہم موافقت وغیرہ خواہی دعاو ثنا اور ایک دوسرے کی طرف مدد و تعاون کا ہاتھ بڑھانا ثابت کرتی ہیں۔

اس سلسلہ میں امامیہ کی روایات دو طرح کی ہیں ان میں اکثر اہل سنت کی روایات کے موافق ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ آپ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے حین حیات ان کے موافق وغیرہ اندیش و ہمدرد رہے اور کبھی اپنے نیک مشوروں سے دروغ نہ کیا چنانچہ خلیفہ ثانی جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مشورہ کا قصہ بحوالہ نہج البلاغہ صفحات ما سبق میں بیان ہو چکا ہے اسی طرح ان حضرات ثلاثہ کی وفات کے بعد بھی آپ رضی اللہ عنہ ان کے ثناخوان رہے اور ان کے اعمال کو سراہتے رہے ان کی بھلائی عافیت اور نجات پر شہادت دیتے رہے جیسا کہ بلاد ابی بکر والی عبارت کا پورا خطبہ جو حوالہ نہج البلاغہ گزشتہ اوراق میں ذکر ہوا اس پر صاف اور واضح دلالت کرتا ہے۔

اور شیعوں کی بہت سی روایات اہل سنت کی روایات کے خلاف بھی ہیں لہذا اہل سنت نے متفق علیہ روایات کو لے لیا اور مختلف فیہ کو جن کو شیعہ حضرات اپنے راویوں کے کچے چٹے واضح ہونے کے باوجود روایت کرتے ہیں نظر انداز کر دیا کیونکہ شیوہ عقلاء و دانشمندان یہی ہے کہ وہ متفق علیہ کو لیتے اور مختلف فیہ سے کنارہ کش رہتے ہیں، اس سلسلہ کی شیعی روایات نہج البلاغہ، کشف الغمہ اور صحیفہ کاملہ سے اوراق ماسبق میں کافی تفصیل سے بیان کی جا چکی ہیں رہی اہل سنت کی روایات تو وہ اور بھی اس سلسلہ میں حد و شمار سے باہر ہیں اب ہم کتاب الموافقہ ابن سمان سے جو اسی مقصد کے تحت تصنیف ہوئی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں ایک روایت بطور نمونہ پیش کرتے ہیں جو معاملہ امامت زیر بحث کی پوری وضاحت کرتی ہے اگر کوئی ماہر لسان عرب حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی اس عبارت کو اس عبارت سے جو نہج البلاغہ کی روایت میں ہے ملائے اور موازنہ کرے تو اس میں سر مو فرق نہ پائے

گا یہ ہمارا ذمہ ہے، اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کلام میں کوئی بناوٹ نہیں کر سکتا اس کو جانچنے اور دیکھنے کے لیے البتہ عربی میں مہارت اور متکلم کے بارے میں سلیقہ شناسی ضرور درکار ہے یہ نہیں کہ عربی لغات سے اجنبی محض بلاغت کلام سے متاثر ہو کر فریفتہ ہو جائے اور اسے پرکھ اور تمیز کا مادہ نصیب نہ ہو۔

روي الحافظ أبو سعيد ابن السمعان وغيره من المحدثين عن محمد بن عقيل بن أبي طالب أنه لما قبض أبو بكر الصديق وسجي عليه ارتجت المدينة بالبكاء كيوم قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم، فجاء علي باكيا مسترجعا وهو يقول «اليوم انقطعت خلافة النبوة» فوقف على باب البيت الذي فيه أبو بكر مسجى فقال «رحمك الله أبا بكر، كنت إلف رسول الله وأنيسه ومستروحه وثقته وموضع سره ومشاورته، كنت أول قومه إسلاما وأخلصهم إيمانا، وأشدهم يقينا، وأخوفهم لله، وأعظمهم غناء في دين الله عز وجل، وأحوطهم لرسول الله وأشفقهم عليه، وأحدبهم الإسلام، وأمنهم على أصحابه، وأحبهم صحبة، وأكثرهم مناقب، وأفضلهم سوابق، وأرفعهم درجة، وأشبههم برسول الله صلى الله عليه وسلم هديا وسمتا ورحمة وفضلا وخلقا، وأشرفهم عنده منزلة وأكرمهم عليه، وأوثقهم عنده. جزاك الله عن الإسلام وعن رسول الله وعن المسلمين خيرا. كنت عنده بمنزلة السمع والبصر، صدّقت رسول الله حين كذبه الناس فسماك الله في تنزيله صديقا فقال عز وجل {والذي جاء بالصدق وصدق به أولئك هم المتقون} فالذي جاء بالصدق محمد صلى الله عليه وسلم، وصدق أبو بكر. وأسيته حين بخلوا، وقمت معه عند المكاره حين عنه قعدوا وصحبته في الشدة أحسن الصحبة

ثاني الاثنين وصاحبه في الغار والمنزل عليه السكينة ورفيقه في الهجرة وخليفته في دين الله عز وجل. أحسنت الخلافة حين ارتد الناس وقمت بالأمر ما لم يقم به خليفة نبي. نهضت حين وهن أصحابك وبرزت حين استكانوا وقويت حين ضعفوا ولزمت منهاج رسول الله صلى الله عليه وسلم في أصحابه إذ كنت خليفته حقا ولم تنازع ولم تقذع برغم المنافقين وكيد الكافرين وكره الحاسدين وضغن الفاسقين وزيغ الباغين قمت بالأمر حين فشلوا ونطقت حين تعتعوا ومضيت نفوذا إذ وقفوا فاتبعوك فهدوا وكنت أخفضهم صوتا وأعلاهم قوة وأقلهم كلاما وأصوبهم منطقا وأطولهم صمتا وأبلغهم قولا وأكبرهم رأيا وأشجعهم وأعرفهم بالأمور وأشرفهم عملا. كنت والله للدين يعسوبا حين نفر الناس عنه وآخرا حين فشلوا. كنت للمؤمنين أبا رحيما إذ صاروا عليك عيالا تحملت أثقال ما ضعفوا عنه ورعيت ما أهملوه وحفظت ما أضاعوا وعلوت إذ هلعوا وصبرت إذ جزعوا وأدركت أوطار ما طلبوا ورجوا. أرشدتهم برأيك فظفروا ونالوا بك ما لم يحتسبوا وجليت عنهم فأبصروا كنت على الكافرين عذابا واصبا وللمؤمنين رحمة وأنسا وخصبا، فطرت والله بعبابها وفزت بجنابها وذهبت بفضائلها وأدركت سوابقها لم تفلل حجتك ولم تضعف بصيرتك ولم تجبن نفسك ولم يزغ قلبك كنت كالجبل لا تحركه العواصف ولا تزيله القواصف. كنت كما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم أمن الناس عليه في صحبتك وذات يدك. وكما قال ضعيفا في بدنك قويا في أمر الله متواضعا في نفسك عظيما عند الله جليلا في أعين

المؤمنين كبيرا في أنفسهم لم يكن لأحد فيك مغمز ولا لقائل فيك مهمز ولا لأحد فيك مطمع. الضعيف الذليل عندك قوي عزيز حتى تأخذ بحقه والقوي العزيز عندك ضعيف حتى تأخذ منه الحق. والقريب والبعيد عندك سواء. أقرب الناس إليك أطوعهم لله وأتقاهم له شأنك الحق والصدق والرفق وقولك حكم وجزم وأمرك حلم وحزم ورأيك علم وعزم حتى بلغت والله بهم السبيل وسهلت العسير وأطفأت النيران واعتدل بك الدين وقوي الإيمان وثبت الإسلام والمسلمون وظهر أمر الله ووكره الكافرون، فسبقت والله سبقا بعيدا وأتعبت من بعدك إتعابا شديدا وفزت بالخير فوزا مبينا فجللت عن البكاء وعظمت رزيتك وهدت مصيبتك الأنام فإنا لله وإنا إليه راجعون».[1]

حافظ ابو سعید بن سمان دوسرے محدثین نے بھی محمد بن عقیل بن ابی طالب سے روایت کی ہے کہ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وفات پائی اور آپ کو چادر میں لپیٹ دیا گیا، تو پورا مدینہ آہ وبکا سے لرز اٹھا اور وہی کیفیت لوگوں پر طاری تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت پیش آئی تھی حضرت علی رضی اللہ عنہ بچشم گریاں برزبان اناللہ تشریف لائے اور کہنے لگے آج نبوی خلافت کا خاتمہ ہو گیا، پھر اس گھر کے دروازہ پر جس میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ملفوف تھے کھڑے ہوئے اور فرمانے لگے، اے ابو بکر اللہ تم پر رحم فرمائے تم رسول اللہ کے مسکن الفت وانس راحت واعتماد تھے اور آپ کے اسرار کی قرار گاہ آپ کی امت میں تم اسلام سے مشرف ہونے والے پہلے فرد تھے ایمان میں سب سے زیادہ پر خلوص تقوی میں سب سے زیادہ مضبوط سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے سب سے زیادہ اللہ کے دین کی مدد پر کمربستہ ان کے رسول کا

1۔ تاریخ دمشق، لابن عساکر: 30/ 438، 440.

سب سے زیادہ لحاظ کرنے والے ان پر ان سب سے زیادہ شفیق سب سے زیادہ اسلام کے غم خوار ان کے اصحاب کے لیے سب سے زیادہ قابل بھروسہ با اعتبار صحبت سب سے زیادہ محبوب تر فضیلتوں میں سب سے زیادہ بڑھے ہوئے بے اعتبار سبقت سب سے زیادہ افضل با اعتبار درجہ سب سے بالاتر سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کے مشابہ با اعتبار طرز و روش رحمت و بزرگی میں عادت و خصلت میں رسول اللہ ﷺ کے نزدیک سب سے زیادہ درجہ میں اشرف ان سے زیادہ باعزت آپ کے نزدیک سب سے زیادہ درجہ میں اشرف ان سے زیادہ باعزت آپ کے نزدیک سب سے زیادہ قابل بھروسہ آپ کے نزدیک اللہ تعالی ان کو اسلام رسول اللہ ﷺ اور مومنین کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے، تم ان کے لیے کون اور آنکھ کی طرح تھے جب لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی تو تم نے تصدیق کی اس لیے قرآن میں تمہارا نام صدیق رکھا پس فرمایا صاحب عزت نے یہ قول جو سچ بات لایا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہ سب تقوی والے ہیں تو سچ بات لانے والے محمد ﷺ ہیں اور جنہوں نے ان کی تصدیق کی وہ ابو بکر ہیں تم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس وقت ہمدردی کی جب لوگوں نے ان سے جان چرائی تم نے ان کی مصیبتوں میں اس وقت پشت پناہی کی جب لوگ ان کی مدد سے بیٹھ رہے تھے تم سختی کے زمانہ میں آپ کے اچھے ساتھی بنے رہے تم دو میں کے دوسرے اور غار میں ان کے ساتھ ہی تھے جس پر سکینت اتری تم ہجرت میں ان کے رفیق تھے اللہ عزو جل کے دین اور آپ کی امت میں تم ان کے خلیفہ تھے جب لوگ مرتد ہو گئے تو تم نے خلافت کے امور بہترین انداز میں نبھائے اور امور ریاست کو ایسا سنبھالا کہ کسی نبی کے خلیفہ کے ہاں اس کی مثال نہیں، جب تمہارے ساتھی ست پڑے تو تم مضبوطی کے ساتھ قائم رہے جب وہ تھک گئے تو تم سامنے آئے جب انہوں نے کمزوری دکھائی تو تم نے قوت کا مظاہرہ کیا رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں تم رسول کے راستے پر رہے اس لیے کہ تم خلیفہ برحق تھے نہ تم نے کسی سے جھگڑا کیا نہ کوئی تمہارے مقابل ایا منافق ناخوش کافر ذلیل حاسد رنجیدہ فاسق خوار باغی گمراہ رہے

جب لوگوں نے بزدلی دکھائی تم نے کام سنبھالا جب لوگ گونگ ہو گئے تو تم ہی بولے جب اور لوگ کھڑے رہ گئے تو تم چل نکلے اس لیے سب نے تمہاری پیروی کی تو ہدایت پائی تم پست آوازی میں سب سے زیادہ اور پیش روی میں سب سے بلند ان سے زیادہ کم گو ان سے زیادہ راست گو ان سے زیادہ سکوت پسند ان سے زیادہ گفتگو میں اثر انداز رائے دہندگی میں سب سے بڑھ کر کاموں کی انجام دہی میں سب سے زیادہ بہادر کاموں کو ان سے زیادہ پہچاننے والے ان سے زیادہ کام میں شرافت پسند اللہ کی قسم تم پیشوائے دین تھے اول جب لوگ اس سے بھاگے اور آخر میں جب لوگ بزدیل ہوئے تو مومنوں کے لیے شفیق باپ کی طرح تھے جب وہ بال بچوں کی طرح تمہارے سائے عاطفت میں آپڑے تو تم نے ان کے کمزوروں کا وہ بوجھ اٹھایا جس کو وہ نہ اٹھا سکے جس کی وہ حفاظت نہ کر سکے اس کی تم نے حفاظت کی جس کو انہوں نے ضائع کیا اس کی تم نے نگہبانی کی جب وہ مصیبت سے بے قرار ہوئے تو تمہاری بے قراری ان سے بھی زیادہ رہی جب وہ دل چھوڑ بیٹھے تو تم صبر پر ڈٹے رہے وہ جو ڈھونڈتے رہے اور نہ پایا تم نے اسے پالیا تم نے اپنی رائے سے ان کی رہنمائی کی تو وہ کامیابی سے ہمکنار ہوئے اور تمہارے طفیل ان کو وہ کچھ ملا جن کا ان کو وہم وگمان بھی نہ تھا تو نے ان پر ہر چیز ایسی واضح کی کہ ان کو بینائی مل گئی تم کافروں پر ایک عذاب تھے تو مومنوں کے لیے سراپا رحمت وانس اور فراخی اللہ کی قسم تم ان مراتب کی بلندی پر اڑتے رہے پھر اس کے قرب سے کامیاب ہوئے تم نے برگزیدہ درجے حاصل کیے اور ان سے آگے کے مراتب پائے نہ تمہاری حجت کمزور رہی نہ تمہاری سوجھ بوجھ میں ضعف آیا نہ تمہارا نفس بزدل ہوا نہ تمہارا دل بہکا گویا تم ایک پہاڑ تھے جس کو نہ طوفان ہلا سکتا تھا نہ ہوا کے جھونکے اس کو اپنی جگہ سے ڈگمگا سکتے تھے رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق تم زیادہ احسان کرنے والے تھے حضور ﷺ پر اپنی رفاقت اور دولت نثار کرنے میں اور آپ ﷺ کے فرمان کے مطابق تم ضعیف بدن مگر اللہ کا حکم بجالانے میں قوی تر نفس میں تواضع پسند اللہ کے نزدیک بلند مومنوں کی نظر میں بزرگ ان کے دلوں میں باوقات کسی کو تم پر طعن

کرنے کی نہ تاب و مجال اور نہ کسی کہنے والے کو تمہارے بارے میں نازیبا گفتگو کرنے کی ہمت نہ کسی کو طمع کا ایسا موقع کہ تم پر قابو پاسکے کمزور ذلیل تمہارے نزدیک قوی و عزیز تھے جب تک ان کا حق نہ دلا دیتے اور قوی و عزیز تمہارے نزدیک کمزور و ذلیل تھے کہ تم اس سے کسی کا حق نہ لے لیتے دور و نزدیک تمہارے لیے برابر تھے جو اللہ سے زیادہ ڈرنے والا اور اس کا زیادہ مطیع تھا وہی سب سے زیادہ تمہارے قریب تھا تمہارا کام حق پرستی راست گوئی اور نرمی تھا، اور تمہارا قول حکمت امیز دل نشین اور مضبوط اور تمہارا حکم بردباری اور دانائی پر مبنی تھا پس اللہ کی قسم تم نے ان کو راہ راست پر لگایا ان کے مشکل راستوں کو اسان بنایا فتنہ کی اگ بجھائی تمہاری وجہ سے دین ٹھیک ہو گیا اور ایمان طاقتور اسلام اور مسلمان نے اپنے قدم جما لیے احکام الٰہی ظاہر ہوئے گو کافر اس پر کوڑے اللہ کی قسم تم بہت اگے بڑھ گئے اور اپنے بعد والوں کو تھکا مارا تم نے کھلم کھلا بھلائی حاصل کی اور تم اس سے بالاتر ہوکے تم پر کوئی روئے گو تمہاری جدائی کی مصیبت بہت سنگین ہے اور اس نے لوگوں کو جھنجوڑ ڈالا ہے "انا للہ و انا الیہ راجعون "ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فصیح و بلیغ خطاب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ستائش میں ہے گویا آپ کی طرف سے ہدیہ تحسین و عقیدت کا اظہار انتہائی بلند میں یار سے اظہار ہے اگر آپ کے ان تمام خطبات و کلمات کو جو آپ نے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی شان میں ارشاد فرمائے اور جو اہل سنت کی کتب میں بطریق وثوق و عدالت بلکہ بطریق تواتر و شہرت منقول ہیں یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے اور ایک مستقل دفتر رضی کی نہج البلاغہ کے برابر مرتب ہو سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ کسی کے دل میں یہ سوال اٹھے کہ شکایت و ظلم سے متعلق جو روایات شیعہ کتب میں مروی ہیں اگر ان سب کی سب کو ان کے پیشواؤں کی من گھڑت اور بناوٹی کہا جائے تو یہ بات دل کو نہیں لگتی کہ اتنی بڑی جماعت ساری کی ساری جناب امیر رضی اللہ عنہ پر افترا باندھنے پر تل جائے، لہذا اس میں کہیں نہ کہیں کوئی غلطی لگی ہے آخر وہ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات اوراق ماسبق میں گزر چکی ہے کہ ان کے ناسمجھ راویوں نے تجسیم و بدا وغیرہ میں ائمہ پر جھوٹ تھوپا ہے اور ائمہ نے ان کی تکذیب کی ہے حالانکہ عقائد الہیہ کا رتبہ کہاں ہے اور عقائد صحابہ کہاں! البتہ ان روایات کی تکذیب بھی دوسرے شیعوں کے ذریعہ ان تک پہنچی لیکن مطاعن صحابہ کے سلسلہ میں تو کوئی تکذیب ان تک نہیں پہنچی اگر پہنچی بھی ہو تو ان کے خیال میں اس کی تکذیب صراحت سے نہ آئی ہو جیسا کہ نہج البلاغہ اور صحیفہ کاملہ کے حوالہ سے سب کچھ تفصیلا بیان ہو چکا۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ سب کے سب چونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بغض رکھتے اور ان کے متعلق عقائد بد رکھنے میں متفق الخیال ہیں اس لیے وہ تکذیب کی روایت کر کے خود اپنی تردید کیوں کرنے لگے اس کو ظاہر کر کے اپنے پاؤں پر کلہاڑی کیوں مارنے لگے اس لیے یہ اپنے پچھلوں کے جھوٹ کو پالتے پوستے رہے بلکہ بلی کے گو کی طرح چھپاتے رہے اور یوں یہ جھوٹ رفتہ رفتہ اس فرقہ کے متفق علیہ جھوٹ کی شکل اختیار کر گیا اور یہ جھوٹ اتنے زور و شور اور باقاعدہ منصوبہ بندی سے بولا گیا کہ وہ ان کے لیے سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گیا کہ نگلے گا تو اندھا اگلے گا تو کوڑھی یہ جھوٹ ان کی زندگی و موت کا مسئلہ بن گیا اور اپنے ہاتھ سے کون اپنی قبر کھودنے لگا اور عقائد الہیہ سے متعلق جھوٹ ایسا نہیں اس لیے اس کے متعلق دونوں طرح کی روایات بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے اس لیے دونوں طرح کی روایت ملتی ہیں۔

اس کے باوجود بھی ان سب کی غلطی کا ایک منشا بھی ہے وہ یہ کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے وہ خطبات جو رضی نے نہج البلاغہ میں جمع کیے ہیں ان میں اور دوسرے خطبوں میں جو جناب امیر کی صحیح مراد کو ظاہر کرتے ہیں اور شیعوں کے خیال و گمان کی تردید کرتے ہیں جن کو حذف اور ساقط کیا مثلا یہی خطبہ مذکورہ بالا جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی ستائش میں گزرا اس میں جناب امیر رضی اللہ عنہ قریش کی شکایت فرماتے ہیں اور ان کے حق میں بددعا فرماتے ہیں مگر یہ فرقہ اپنی بدگمانی اور دلی بغض کے سبب سمجھتا ہے کہ ان قریش سے خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم مراد ہیں اور ان کے مددگار حاشا وکلا ایسا بالکل نہیں ہے بلکہ آپ کا اشارہ ان نوجوانان قریش کی طرف ہے جن کا شمار صحابہ کرام میں نہ تھا بلکہ خلیفہ اول و دوم کے عہد خلافت میں یہ سن بلوغ و عمر تمیز تک بھی نہ پہنچے تھے اور عہد امیر المومنین میں عقل و رسد ناقص حاصل کیا اور بڑے بڑے کاموں میں دخل در معقولات کرنے لگے اور

انہوں نے جناب امیر رضی اللہ عنہ اور آپ کے رفیقوں دوستوں مثلاً حضرت طلحہ حضرت زبیر اور ام المومنین رضی اللہ عنہم میں شکر رنجیوں اور ناراضگیاں پیدا کیں اور ایک بڑے زبردست فساد برپا کرنے کا سبب بنے اور پھر خود ان جناب کی مدد و معاونت سے بھی دستکش ہو گئے اور آپ کے اوامر و نواہی ماننے سے بھی منکر ہو کر بیٹھ رہے اور سستی کا مظاہرہ کیا اور یہ ان کی ہی روش سے ہوا کہ مخالف کے لشکر سارے شہروں پر قابض ہو گئے اور جناب امیر کا اقتدار صرف کوفہ عراق اور خراسان تک محدود ہو کر رہ گیا چنانچہ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ جب حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے کشتگان جنگ جمل پر گزر کیا تو ان میں عبد الرحمن بن عتاب بن اسید جو ام المومنین رضی اللہ عنہا کی طرف داروں میں سے تھے کو کشتہ دیکھا تو آپ نے حد درجہ افسوس کا اظہار فرمایا اور رو کر یوں فرمایا "هذا يعسوب قريش ثم قال جذعت انفي شفيت نفسي"[1] یہ قریش کا سردار ہے میں نے اپنی ناک کاٹ لی اور اپنے آپ کو تسلی دی۔

شیعوں کا عارضہ یہی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کلام کو اپنے معتقدات اور اپنے گمراہ پیشواؤں کے چند مرغوبات پر ڈھال لیتے ہیں بلکہ آیات واحادیث کو بھی اسی اسلوب اور نقطہ نظر سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں تو اس بیماری کا کیا علاج ہے ورنہ یہ تو قیامت تک بھی ممکن نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کے حق میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں:

"وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَى وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا"[2]

اور ان کو تقوی کی ملت پر جمائے رکھا اور وہ اس کے زیادہ مستحق بھی ہیں اور اہل بھی۔

"أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ"[3] وہ کافروں پر سخت اور مومنوں پر مہربان۔

حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ[4]

1۔ شرح نهج البلاغة لابن أبي الحديد، 1/ 249، ط: دار احياء الكتب العربية

2۔ سورة الفتح، الاية: 26

3۔ سورة الفتح، الاية: 29

4۔ سورة الحجرات، الاية: 7

اللہ تعالیٰ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا اور کفر و فسق سے تم کو نفرت دے دی۔

ان سے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت یا آپ کے خاندان کی ایذاء رسانی سرزد ہو سکے اگر کسی کا یہ عقیدہ ہو گا تو وہ قرآن و حدیث متواترہ کی تکذیب کا مرتکب ہو گا۔

پانچویں دلیل حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے امامت کا دعویٰ بھی کیا تھا

حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے امامت کا دعویٰ بھی کیا اور بطور تائید معجزہ بھی دکھایا مثلاً خیبر کا دروازہ اکھاڑنا[1] چٹان کو اٹھالینا یا جنوں سے جنگ و مقاتلہ کرنا اور سورج کو لوٹانا،[2] اس لیے وہ اپنے دعوے میں سچے ہوں گے اور امام ہوں گے، ان لوگوں کا یہ کلام اہل سنت کے اس استدلال سے ملتا جلتا ہے جو وہ پیغمبر ﷺ کی نبوت کے اس

---

1 ۔ تاريخ الطبري: 2/ 137؛ ورواها الخطيب البغدادي عن جابر بن عبد الله: «أن عليا حمل باب خيبر يوم افتتحها، وأنهم جربوه بعد ذلك فلم يحمله إلا أربعون رجلا». تاريخ بغداد: 11/ 327؛ قال الذهبي: «هذا حديث منكر». ميزان الاعتدال: 5/ 139؛ قال السخاوي: «وطرقه كلها واهية، ولذا أنكره بعض العلماء». كشف الخفاء: 1/ 438.

2 ۔ اس بارے میں مروی روایت پر اگرچہ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے " منهاج السنة " میں لکھا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے، اسی طرح علامہ ابن الجوزی نے "موضوع بلاشك" لکھا ہے اور علامہ جوزجانی نے "منكر مضطرب" کہا ہے، لیکن اس حدیث کو امام طحاویؒ نے شرح مشکل الآثار میں دو طرق سے ذکر کیا ہے، ان دونوں احادیث کے بارے میں علامہ طحاویؒ نے معجزۃ النبوۃ لکھا ہے، علامہ نوویؒ نے اس حدیث کو شرح مسلم (في باب حل الغنائم لهذه الأمة 12/52) میں ذکر کیا ہے، علامہ سیوطیؒ نے الدرر المنثورة في الأحاديث المشهورة، 1/ 222 میں ذکر کیا اور "حسن" لکھا ہے، اور حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباري ، في تخريج أحاديث الرافعي في باب الأذان 6/ 221 میں ذکر کیا ہے اور اسی کے تحت حافظ ابن حجرؒ نے علامہ ابن الجوزیؒ کو اس حدیث کو اپنی کتاب میں ذکر کرنے پر اس کے بارے میں لکھا ہے کہ ان سے خطا ہوئی ہے اور علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب (مختصر ابن الجوزی میں) لکھا ہے کہ اس حدیث کو ذکر کرنے میں علامہ ابن جوزی منفرد ہیں، اس حدیث کے بارے میں علامہ سیوطیؒ نے كشف اللبس عن حديث رد الشمس کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے اور ان کے شاگرد الامام المحدث شمس الدین محمد الصالحی الشامی نے مزيل اللبس عن حديث رد الشمس کے نام سے ایک اور رسالہ لکھا ہے، ان دونوں رسالوں میں بہت تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے، اور اس حدیث کے سارے طرق ذکر کیے ہیں، جن پر علامہ ابن تیمیہؒ نے "منهاج السنة" میں اعتراضات کیے تھے، ان سب کے جوابات ذکر کیے ہیں اور حدیث کے بہت سارے طرق اور راویوں کے حالات دیکھ کر اس حدیث پر بعض ائمہ حدیث نے "حسن" کا حکم لگایا ہے۔

بات میں پیش کرتے ہیں مگر یہ مشابہ صرف اسلوب بیان میں ہے مقدمات کی صحت میں نہیں ہے، اول تو اسی میں کلام ہے کہ امامت کا اثبات معجزہ سے ہوتا ہے کہ معجزہ تو نبوت کے ثابت کرنے کے لیے ہوتا ہے امامت، قضا، احتساب، افتاء، اجتہاد، کسی کی سلطنت، لشکر کی امارت اور وزارت یا دیگر شرعی عہدوں کے لیے نہیں ہوتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ نبوت چونکہ براہ راست خدا کی طرف سے ہوتی ہے اس لیے اس کا اس بات معجزہ کی شکل میں خدا کی طرف سے تصدیق کیے بغیر ممکن نہیں بخلاف امامت کے کہ وہ نبی کے فرمان اور آپ کے سونپنے سے ثابت ہوتی ہے پھر یہ بات بھی ہے کہ معجزہ سے نبوت کا ثبوت بھی محض عادت الٰہی کی بنا پر ہے اور اللہ تعالیٰ کی یہ عادت صرف انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں ہے ان کے علاوہ کسی سے متعلق بھی یہ عادت نہیں رہی اس لیے اس کی دلالت بھی انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص رہے گی۔

اس بات کی دلیل یہ ہے کہ کوئی شخص مدعی بن کر کسی دوسرے شخص پر کسی قسم کا دعویٰ دائر کرے اور ثبوت میں کوئی معجزہ پیش کرے تو شرعاً اس کا یہ ثبوت بالکل معتبر نہیں کیونکہ شریعت میں ثبوت دعوی کا ایک طریقہ گواہ شاہد ہے معجزہ کا اظہار نہیں یہی حال تمام دعوی اور معاملات کا ہے جب امامت بھی پیغمبر علیہ السلام کے متعین کرنے یا ارباب حل وعقد کے انتخاب سے وجود میں آئی ہو تو اس پر معجزہ کس طرح دلیل بن سکے گا۔

دوسرے یہ بات بھی غلط ہے کہ تینوں خلفاء رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں آپ نے امامت کا دعویٰ کیا جس کو خود امامیہ کی روایات بھی افترا قرار دے کر تردید کرتی ہیں اور تقیہ کا واجب سمجھنا بھی اس کو باطل قرار دیتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پر سکوت کی وصیت اس دعوے کی سراسر منافی ہے اور یہ سب امور امامیہ کے نزدیک آسمان سے نازل ہونے والی وحی کی طرح ثابت ہیں۔

تیسرے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے خوارق عادت اور کرامات کا صدور و ظہور بالکل قابل تسلیم ہے لیکن یہ امر تو خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم نیز دیگر صحابہ و اولیاء اللہ رحمہم اللہ سے بھی بطریق تواتر و شہرت ثابت ہیں،[1] رہا باب خیبر کا قصہ تو یہ واقعہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کا ہے اس وقت امامت کے دعویٰ کا امکان اور گنجائش ہی کہاں۔

---

1 ـ قال الطحاوي: (ونؤمن بما جاء من كرامتهم وصح عن الثقات من رواياتهم) وقال ابن أبي العز شارحا: «فالمعجزة في اللغة تعم كل خارق للعادة، وكذلك الكرمة في عرف أئمة أهل العلم المتقدمين، ولكن كثير من

اب رہی جنات سے لڑائی تو کتب اہل سنت سے تو اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا یہ محض شیعوں کی روایت ہے کہ:

جب آنحضرت ﷺ غزوہ بنو المصطلق کے لیے روانہ ہوئے تو جبرائیل علیہ السلام نے راستے میں خبر دی کہ فلاں کنویں میں جن اکٹھے ہوئے ہیں اور آپ کے لشکر پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو آنحضرت ﷺ نے جناب امیر کو بھیجا اور آپ نے ان کو قتل کیا۔(1)

اگر اس روایت کو صحیح بھی مان لیں تو بھی معجزہ تو یہ آنحضرت ﷺ ہی کا ہو گا البتہ کرامت جناب امیر رضی اللہ عنہ کی ہو گی مگر جس وقت امامت کا وجود ہی نہ تھا تو اس کے لیے یہ شہادت کیسی کیونکہ معجزہ کے لیے دعویٰ کی شرط بالاجماع ہے علی بن عیسیٰ اردبیلی نے کشف الغمہ میں لکھا ہے کہ یہ مقابلہ حضور ﷺ کے حکم سے تھا تو اس سے معاملہ ہی صاف ہو گیا کہ یہ آپ کا معجزہ تھا۔

اور چٹان کے اٹھا لینے والی بات کا بھی اہل سنت کی کتابوں میں کوئی وجود نہیں صرف شیعہ امامیہ اور زیدیہ کی کتابوں میں اس کی روایت ملتی ہے اخطب خوارزم جو زیدی ہے اپنی کتاب میں یوں بیان کرتا ہے کہ:

جناب امیر جب جنگ صفین کے لیے روانہ ہوئے تو راستہ میں ساتھیوں کو سخت پیاس لگی مگر پانی اس پاس دستیاب نہ تھا جناب امیر نے اس وادی میں واقع ایک گرجا کے قریب اشارہ فرمایا یہاں کھدائی کرو دوران کھدائی سامنے ایک چٹان آگئی جس کو اکھاڑنے اور ہلانے سے سب عاجز آگئے تو اس کی اطلاع آپ کو دی گئی چنانچہ آپ خود اس گڑھے میں اترے اور اس چٹان کو وہاں سے اٹھا کر دور پھینک دیا اس کے نیچے میٹھے اور ٹھنڈے پانی کا چشمہ نکل آیا ساری فوج نے وہ پانی پیا اور خوب سیراب ہوئے جب گرجا کے راہب نے یہ کرشمہ دیکھا تو ایمان لے آیا اور کہنے لگا کہ ہم نے اپنی پرانی کتابوں میں لکھا دیکھا ہے کہ ایک شخص ان ان اوصاف کا اس گرجا کے قریب

المتأخرين يفرقون في اللفظ بينهما فيجعلون المعجزة للنبي والكرامة للولي، وجماعها الأمر الخارق للعادة». شرح العقيدة الطحاوية: ص 424.

1 ـ من رواية طويلة أوردها المفيد ونسبها لابن عباس في الإرشاد: 1/ 339؛ ونقلها عنه المازندراني في مناقب آل أبي طالب: 2/ 87؛ والمجلسي في بحار الأنوار: 63/ 86.

پڑاؤ کرے گا اور اس چٹان کو اٹھالے گا وہ دین حق پر ہو گا۔[1]

اس کلام کا حاصل بس اتنا ہی تو نکلا کہ اگر یہ کرامت ثابت بھی ہو تو آپ کی اور کرامتوں کی طرح یہ بھی ایک کرامت ہو گی امامت کے دعوے کا یہاں کوئی ذکر ہی نہیں نہ اہل شام کے مقابلہ میں یہ کی پیش آیا، اگر ایسے موقع پر یہ واقعہ پیش آتا بھی تو وہ اہل سنت کے لیے راحت قلب ہوتا شیعوں کے دعوے سے اس کو کیا تعلق کیونکہ اس وقت تو بالاجماع جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت امامت حق تھی اور مد مقابل مخالف اور ناحق۔

اور رہا سورج کا لوٹنا تو اکثر محدثین رحمہم اللہ جو اہل سنت ہیں مثلاً طحاوی وغیرہ نے اس قسم کی روایت کو صحیح تسلیم کیا ہے اور یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بلاشبہ ایک معجزہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی نماز عصر فوت ہونا کے اندیشہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے یہ واقعہ پیش آیا تو آپ نے نماز عصر ادا فرمائی اس وقت امامت کا دعوی کہاں تھا اور کون ان کا مخالف اور منکر تھا۔[2]

چھٹی دلیل جناب امیر رضی اللہ عنہ پر کسی نے کبھی طعن نہیں کیا

یہ کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کسی موافق کے مخالف نے کوئی ایسی روایت بیان نہیں کی جس میں آپ پر طعن وقدح ذاتی طور پر وارد ہوتا ہو بخلاف خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے کہ ان کے بارے میں موافق و مخالف ہر دو نے ایسی بہت سی روایات بیان کی ہیں جو ان کی ذات میں برائی کا سبب ہیں اور ان کے استحقاق امامت کو سلب کرتی ہیں لہذا جناب امیر رضی اللہ عنہ جو امور مخالفت امامت سے بری اور صاف ہیں امامت کے لیے مخصوص ہوئے۔

اس دلیل میں عجیب انداز کی گڑبڑ اور مغالطہ آمیزی کی گئی ہے اس لیے کہ اہل سنت اور معتزلہ جو ان تینوں خلفاء رضی اللہ عنہم کی امامت کے قائل اور موافق ہیں ان سے ہرگز کوئی ایسی روایت مروی نہیں جو ان حضرات کی خردہ گیری ظاہر کرتی ہو رہا شیعہ تو وہ چونکہ ان حضرات ثلاثہ رضی اللہ عنہم سے بغض وعناد شدید رکھتے ہیں اس لیے انہوں نے ضرور اپنی روایات میں ان کو نشانہ ملامت وطعن بنایا ہے حالانکہ ان میں بھی کوئی طعن کی

---

1 ۔ أوردها الإمامية: ابن رستم الطبري، المسترشد: ص 201؛ المازندراني، مناقب آل أبي طالب: 2/ 291؛ القطب الراوندي، الخرائج والجرائح: 1/ 220 البحراني، مدينة المعاجز: 1/ 485.

تقدم تخريجه

بات نہیں ہے آگے چل کر باب مطاعن میں ہم ان شاء اللہ ان کا پول کھولیں گے۔

اگر ان امور کو جو انہوں نے اپنی روایات میں طعن کا سبب بنایا ہے موجب طعن مانے تو لازم آتا ہے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں بھی طعن وقدح پیدا کریں بلکہ اگر کوئی شیعی کتب کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کرے تو ان کو انبیاء کی شان میں طعن آمیز باتوں سے پر اور بھری ہوئی پائے گا اس بحث کا اچھا خاصا حصہ تو اوراق ما سبق میں بھی بیان ہو چکا ہے۔

اور ان کا یہ کہنا کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کسی موافق کے مخالف نے قادح روایت بیان نہیں کی دوسرا مغالطہ ہے کیونکہ اہل سنت اگر مخالف ہیں تو یہ ان کا سفید جھوٹ ہے کیونکہ وہ تو آپ کی صحت امامت کے معتقد ہیں وہ تو مخالف ہیں ہی نہیں وہ ایسی روایات بیان ہی کیوں کرنے لگے اور اگر مخالف سے مراد نواصب اور خارج ہیں تو انہوں نے تو اس سلسلہ میں اتنے لمبے چوڑے افترا اور تومار باندھے ہیں کہ ورق کے ورق سیاہ کر ڈالے اور ایسی خرافات ولغویات بک کر اپنے منہ کالے کیے ہیں کہ ہم اس کتاب میں سوء ادب کے خیال سے اس کا ذکر بھی نہیں کر سکتے لیکن معاملہ ایسی قوم سے بعض کا ہے جو لغویات وخرافات اور لعن طعن میں ان سے بھی بڑی ہوئی ہے تو نقل کفر کفر نہ باشد کے مصداق ان کی کتابوں سے بقدر قلیل بطور نمونہ یہاں درج کرتے ہیں۔

نواصب وخوارج کی جناب امیر رضی اللہ عنہ کی شان میں قدح وطعن گوئی

واضح رہے کہ عبد الحمید ناصبی مغربی کی کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ سے متعلق طعن آمیز باتیں (مطاعن) دو قسم کی ہیں ایک وہ جن کی روایات میں نواصب تنہا ہیں اہل سنت اور شیعہ محبان ان روایات کا انکار کرتے ہیں ایسی روایات ناقابل اعتبار ہیں نہ ایسی کہ ان کی وجہ سے کوئی الزام عائد کیا جا سکے اس لیے کہ وہ محض افترا اور جھوٹ وبہتان پر مبنی ہے، مثلاً قتل عثمان غنی رضی اللہ عنہ میں آپ کی شرکت یا قذف حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا میں آپ کا حصہ لینا اور یہ آیت نازل ہونا:

"وَالَّذِي تَوَلَّى كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ"[1]

1۔ سورۃ النور، الآیۃ: 11

ان منافقوں میں سے جو اس بہتان عظیم کا ذمہ دار بنا ہے اس کے لیے عذاب عظیم ہے۔[1]

دوسری قسم وہ جو اہل سنت اور شیعوں کی کتابوں میں سے جو اس بہتان عظیم کے ساتھ منقول و مروی ہیں اس قسم کے مطاعن واقعی قابل توجہ اور جواب طلب ہیں چنانچہ اہل سنت اور شیعہ دونوں نے اپنی اپنی جگہ ان کے جوابات دیئے ہیں شیعوں میں رضی نے تنزیہ الانبیاء والائمہ نامی کتاب میں اور اہل سنت میں سے ابن حزم نے اپنی کتاب کتاب الفیصل میں اس قسم کے بہت سے مطاعن کا جواب دے کر ان کا رد کیا ہے۔

ان میں ایک یہ ہے کہ قتل عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد ان کے اموال و اسلحہ پر جناب امیر رضی اللہ عنہ خود قابض و متصرف ہو گئے ہر چند ان کے وارثوں نے مانگا مگر ان کو نہ دیا حالانکہ مسلمان کا مال کسی طرح حلال نہیں چنانچہ ولید نے اس بارے میں چند اشعار کہے ہیں:

ألا من لليل لا تغور كواكبه	إذا لاح نجم غار نجم يراقبه
بني هاشم ردوا سلاح ابن أختكم	ولا تنهبوه ما تحل مناهبه
بني هاشم لا تعجلونا فإنه	سواء علينا قاتلوه وسالبه
وإنا وإياكم وما كان بيننا	كصدع بدا لا يرأب الصدع شاعبه
بني هاشم كيف التعاقد بيننا	وعند علي سيفه وحرائبه
لعمرك لا أنسى ابن أروى وقتله	وهل ينسأن الماء ما عاش شاربه
هم قتلوه كي يكونوا مكانه	كما غدرت يوما بكسرى مرازبه[2]

ترجمہ: خبردار یہ میری رات کو کیا ہوا کہ اس کے ستارے ڈوبتے ہی نہیں جب ایک ستارہ ڈوبتا ہے تو اس کے

1۔ وقال ابن عبد البر: كان علي يثني عليه ويفضله، وكانت له عبادة. واجتهاد، ولما بلغ عائشة قتله حزنت عليه جداً، وتولت تربية ولده القاسم، فنشأ في حجرها، فكان من أفضل أهل زمانه". (الإصابة في تمييز الصحابة لابن حجر العسقلاني، حرف الميم، القسم الثاني من له رؤية، الميم بعدها الحاء، 6/ 194)

2۔ الوافي بالوفيات للصفدي ج 27 الصفحة 5

مقابل دوسرا استارہ ظاہر ہو جاتا ہے، اے بنی ہاشم اپنے بھانجے کے ہتھیار واپس کر دو اور ان کو لوٹو مت ان کا لوٹنا جائز نہیں، اے بنی ہاشم ہم سے جلد بازی نہ کرو ہمارے نزدیک ان کے قتل کرنے والے اور ان کو لوٹنے والے برابر ہیں ہم تم اور جو کچھ تمہاری طرف سے ہوا ہے پتھر کا وہ شگاف ہے جسے کوئی بھرنے والا بھر نہیں سکتا، اے بنی ہاشم ہم میں اور تم میں صلح کس طرح ہو سکتی ہے جبکہ علی کے پاس ان کا تیر و تلوار ہے، تیری جان کی قسم میں نہ عثمان کو بھولوں گا اور نہ ان کے قتل کو اور کیا پانی کے پینے والا تازندگی اس کو بھول سکتا ہے، انہوں نے اس کو اس لیے قتل کیا کہ اس کی جگہ لے لیں جیسا کہ کسری کے ساتھ ایک دن اس کے امیروں نے کیا تھا۔

ایک دوسرا طعن یہ کہ آپ نے امہات الاولاد (وہ باندیاں جن کے اولاد ہو جائے) کے بارے میں اپنے مختلف مذاہب ظاہر فرمائے اور کسی ایک پر نہیں جے، پہلے ان کی فروخت کے قائل تھے پھر عہد عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں جب ان کی فروخت کے حرام ہونے پر اجماع ہوا تو آپ اس اجماع سے متفق ہو گئے پھر اپنے خلافت کے زمانہ میں ان کی فروخت صحیح ہونے پر فتویٰ صادر فرمایا اس لیے قاضی شریح رحمہ اللہ علیہ نے آپ رضی اللہ عنہ سے دو بدو گفتگو کی اور کہا" رأيك مع الجماعة أحب إلينا من رأيك وحدك"[1] آپ کی وہ رائے جو جماعت کے ساتھ ہے ہمیں آپ کی تنہا رائے سے زیادہ پسند ہے، حالانکہ آپ نے خود یہ فرمایا تھا کہ "الا ان يد الله علي الجماعة وغضب الله علي من خالفها"[2] خبردار جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے اور جو اس کی مخالفت کرے اس پر اللہ کا غصہ ہے اور قرآن میں یہ ارشاد موجود ہے "وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا"[3] لہذا آپ نے صاف طور پر اجماع کی مخالفت فرمائی۔

ان مطاعن میں سے ایک اور یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے دادا کے حصہ وراثت میں مختلف فیصلے صادر فرمائے

1۔ شرح نهج البلاغة لابن أبي الحديد، 7/ 73

2۔ بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار، 33/ 83

3۔ سورة النساء، الآية: 115

اور کسی پر بھی بر قرار نہ رہے حالانکہ خود ہی یہ بھی ارشاد فرمایا "من أراد أن يتقحم جراثيم جهنم فليقل في الجد" [1] جو جہنم میں جانے کا ارادہ کرے اسے چاہیے کہ مسئلہ جد میں کلام کرے۔

انہی میں سے ایک وہ ہے جس کی بخاری نے بایں الفاظ روایت کی ہے" أتي علي رضي الله عنه، بزنادقة فأحرقهم" [2] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ زندیق لائے گئے تو آپ نے ان کو آگ میں جلوا دیا، یہ بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو بہت بڑی لگی اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کو بھی ندامت ہوئی، آگ سے جلا دینے کا یہ قصہ شیعی کتب میں بھی موجود ہے شریف مرتضیٰ نے تنزیہ الانبیاء والائمہ میں روایت کی ہے: "ان عليا حرق رجلا اتي غلاما في دبره" جناب علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو جس نے اغلام کیا تھا جلوا دیا [3] حالانکہ حدیث "لا تعذبوا بالنار" [4] آگ سے عذاب نہ دو، کی صحت پر اجماع ہے۔

ایک طعن یہ ہے کہ آپ نے شراب پینے کی سزا میں بطور حد ایک شخص کے اسی کوڑے لگوائے اور جب وہ مر گیا تو ان کی دیت (خون بہا) بھی ادا فرمائی اور فرمایا" إنما وديته لأن هذا شيء فعلناه برايتنا" [5] ہم نے

1- كتاب من لا يحضره الفقيه للشيخ الصدوق، 4/ 286، ط: الحوزة العلمية في قم المقدسة

2- صحيح البخاري ، باب حكم المرتد والمرتدة واستتابتهم، 9/ 15 ، رقم: 6922، ط: دار طوق النجاة

3- لم اجد هذه الرواية ولكن روي المجلسي : أن رجلا " أتى أمير المؤمنين عليه السلام فقال: يا أمير المؤمنين! حد حد الله في جنبي، فقال له أمير المؤمنين عليه السلام :ماذا صنعت؟فقال: لطت بغلام، فقال له أمير المؤمنين عليه السلام :لم توقب؟ قال: بل أوقبت يا أمير المؤمنين، فقال له: اختر من إحدى ثلاث: ضربا " بالسيف أخذ منك ما أخذ، أم هدم جدار عليك، أو حرقا " بالنار. فقال الرجل: يا أمير المؤمنين وأيها أشد تمحيصا " لذنوبي؟ فقال علي عليه السلام:الحرق بالنار، فقال: إني قد اخترته. (بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار ، 76/ 73، ط: مؤسسة الوفاء بيروت لبنان)

4- مصنف ابن ابي شيبة، 6/ 485، رقم : 33144، ط: مكتبة الرشد الرياض

5- ذكره شريف مرتضى في الفصول المختارة ، ص: 215، ط: دار المفيد للطباعة والنشر والتوزيع بيروت

یہ خون بہا اس لیے دیا کہ یہ فعل ہم نے اپنی ذاتی رائے سے کیا تھا، حالانکہ خود عہد عمر رضی اللہ عنہ میں شراب کی حد کے سلسلہ میں آپ نے ہی ان کو مشورہ دیا تھا کہ اس حد میں اسی کوڑے ہونے چاہیں اور دلیل یہ تھی کہ "وإذا سکر هذی وإذا هذی افتری"[1] جب مستی چھائے گی تو اول فول بکے گا اور جب بکواس کرے گا تو افترا باندھے گا، گویا آپ کو اپنے اجتہاد میں شک و تردد ہو گیا۔

ایک طعن یہ ہے کہ ولید بن عقبہ کہ آپ نے چالیس کوڑے لگائے اور یوں آپ نے حد شرح میں لحاظ مروت اور رواداری سے کام لیا کیونکہ ولید بن عقبہ کا حضرت عثمان غنی شہید رضی اللہ عنہ سے رشتہ قرابت تھا۔[2]

ایک طعن یہ ہے کہ مولاۃ حاطب پر رجم کرایا حالانکہ وہ کنیز باندی تھی جس پر رجم نہیں ہوتا۔[3]

ایک طعن یہ بھی ہے کہ جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے مکاتب کے معاملہ میں آپ کو الزام دیا کہ مسئلہ تو یہ ہے کہ اگر غلام کے ذمہ زر مکاتبت میں سے ایک درہم بھی باقی ہے تو وہ پورا غلام باقی ہے مگر جناب امیر رضی اللہ عنہ کا خیال تھا

1۔ روي الكليني عن علي بن إبراهيم، عن محمد بن عيسى، عن يونس، عن زرارة، عن أبي جعفر عليه السلام قال: قال: عليا عليه السلام كان يقول: إن الرجل إذا شرب الخمر سكر وإذا سكر هذى وإذا هذى افترى فاجلدوه حد المفتري. (الفروع من الكافي، 7/ 215، ط: دار الكتب الاسلامية)

2۔ عن علي بن ابراهيم، عن ابيه، عن ابن ابي عمير، عن عمر بن اذينة، عن زرارة، عن ابي جعفر عليه السلام قال: لما اتي عثمان بالوليد بن عقبة قد شرب الخمر شهد عليه رجلان، احدهما حمران والاخر رجل آخر، فامر عثمان عليا عليه السلام ان يضربه، فقال علي عليه السلام لعبد الله بن جعفر: اضربه، فضربه، وعلي عليه السلام يعد، فلما بلغ اربعين قال: امسك، ثم قال: ضرب رسول الله صلى الله عليه وآله اربعين، وضرب ابوبكر اربعين، وضرب عمر ثمانين، وكل سنة، وهذا احب الي. (الكافي، جلد 7 / 214 ،ط: دارالكتب االاسلامية تهران)

3۔ عن علي بن ابراهيم، عن ابيه، عن ابن ابي عمير، عن حماد، عن الحلبي، عن ابي عبدالله عليه السلام قال: إن عليا عليه السلام رجم المرأة التي اقرت على نفسها بالزنا، فامر عليا عليه السلام ان يحفر لها حفيرة، ثم امر الناس ان يرموا، وكان اول من رمى بيده حجرين، ثم رمى الناس، فلما قضت اخرجها فصلى عليها ودفنها.(الفروع من الكافي ، كتاب الحدود ، باب رجم الزاني والزانية، 7/ 176 ، ط: دار الكتب الاسلامية)

کہ وہ جتنی ادائیگی کرے گا اس کے قدر آزاد ہو جائے گا اور مابقی کے برابر غلام رہے گا[1] جیسا کہ صحاح میں منقول ہے۔

اور ایک طعن یہ ہے کہ پہلے تو آپ دو پنچوں کے فیصلے پر راضی ہو گئے پھر فرمانے لگے "لقد عثرت عثرة لا تنجبر سوف أكيس بعدها"[2] میں نے ایسی ٹھوکر کھائی ہے جس کی کوئی تلافی نہیں اب اس کے بعد بہت ہوشیاری سے کام لوں گا، حالانکہ پنچائت کا حکم ٹھکرانا جائز نہیں۔

ایک طعن یہ بھی ہے کہ بمطابق روایت شعبی " أن أمير المؤمنين (عليه السلام) كان يقطع اليد من أصول الأصابع "[3] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چور کا ہاتھ انگلی کی جڑوں سے کاٹا، گویا آپ حد سارق سے ناواقف تھے اور جو شخص اقامت حدود ہی سے ناواقف ہو وہ امامت کے لائق نہیں۔

ایک طعن یہ بھی ہے کہ آپ نے اپنے بچوں میں بعض کی بعض کے خلاف گواہی کو قبول فرمایا[4] حالانکہ بات صاف صاف ظاہر ہے کہ بچوں کی بات کا کوئی اعتبار نہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے "وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ"[5] اور گواہ بنالو دو گواہ مردوں میں سے۔

ایک طعن یہ ہے کہ آنکھ کی دیت میں نصف دیت کا لینا قصاص لینے والے کا نے جس کی ایک آنکھ پھوڑ

1۔ عن علي بن إبراهيم، عن أبيه، عن ابن أبي عمير، عن حماد، عن الحلبي، عن أبي عبد الله عليه السلام قال: سألته عن المكاتب يؤدي بعض مكاتبته فيموت أو يعجز؟ فقال: كان علي عليه السلام يقول: يعتق منه بقدر ما أدى من ماله، ويؤدي ورثته ما بقي إن كان له مال، وإن لم يكن له مال عجز وبقي ما بقي مملوكا.(الكافي، كتاب العتق والتدبير والمكاتبة،باب المكاتب يؤدى بعض مكاتبته ثم يموت او يعجز، 6/ 185، ط: دار الكتب الاسلامية)

2۔ تنزيه الأنبياء، ص :199، ط: دار الأضواء

3۔ الصحيح من سيرة النبي الأعظم، للعاملي، 7/ 128، ط: دار السيرة بيروت لبنان

4۔ عن على بن ابراهيم، عن ابيه، عن ابن ابى عمير، عن حماد، عن الحلبى، عن ابى عبدالله عليه السلام قال: سألته عن شهادة الوالد لولده والولد لوالده والاخ لاخيه؟ قال: نعم...الخ(الفروع من الكافي، كتاب الشهادات، باب شهادت الوالد لولده والولد لوالده،7/ 391، ط: ط: دار الكتب الاسلامية)

5۔ سورة البقرة، الاية : 282

دی گئی ہو کو مقرر فرمایا[1] حالانکہ حکم "وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ "[2] آنکھ کے بدلے آنکھ کا ہے۔

ایک طعن یہ بھی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے بچے پر سرقہ کی حد جاری فرمادی جیسا کہ کتب شیعہ میں موجود ہے،[3] حالانکہ آپ نے خود روایت فرمائی ہے کہ "رفع القلم عن ثلاثة عن الصبي حتى يبلغ"[4] تین سے قلم اٹھالیا گیا یعنی وہ مکلف نہیں ہے بچہ سے جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے۔

ان میں سے ایک یہ ہے جس کی روایت محمد بن بابویہ قمی نے الفقیہ میں کی ہے "انه جاء رجل الي امير المومنين واقر بالسرقة اقرارا يقطع به اليد فلم يقطع يده"[5] امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے چوری کا اقرار کیا جس سے قطع ید کی حد لگنی چاہیے تھی مگر آپ رضی اللہ عنہ نے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا حالانکہ حدود قائم نہ کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

1۔ عن علي بن ابراهيم، عن ابيه، عن ابن ابي عمير، عن حماد، عن الحلبي، عن ابي عبد الله عليه السلام قال: سئل عن رجل اعور فقئت عينه الصحيحة؟ قال: فقال: ديتها دية كاملة، فان شاء الذي فقئت عينه ان يقتص من صاحبه فليقتص منه ويؤدي اليه نصف الدية. (الفروع من الكافي ، كتاب الديات ،باب دية العين ، 7/ 312، ط: دار الكتب الاسلامية)

2۔ سورة المائدة ، الاية : 45

3۔ روى الكليني عن على بن ابراهيم عن صفوان، عن إسحاق بن عمار قال: قلت لأبي إبراهيم عليه السلام: الصبيان إذا اتي بهم علي عليه السلام قطع أناملهم، من أين قطع؟ فقال: من المفصل مفصل الأنامل. (الفروع من الكافي، باب حد الصبيان في السرقة ، 7/ 232 ، ط: دار الكتب الاسلامية)

4۔ عوالي اللئالي العزيزية في الأحاديث الدينية ، ١/ ٢٠٩، ط: مطبعة سيد الشهداء قم إيران

5۔ روي الصدوق : "جاء رجل إلى أمير المؤمنين (عليه السلام) فأقر بالسرقة، فقال له أمير المؤمنين (عليه السلام): أتقرأ شيئا من كتاب الله عز وجل؟ قال: نعم سورة البقرة، فقال: قد وهبت يدك لسورة البقرة، فقال الأشعث: أتعطل حدا من حدود الله تعالى؟ فقال: وما يدريك ما هذا، إذا قامت البينة فليس للامام أن يعفو، وإذا أقر الرجل على نفسه فذاك إلى الامام إن شاء عفا وإن شاء قطع" (من لا يحضره الفقيه، 4/ 62، ط: الحوزة العلمية قم المقدسة)

ایک طعن یہ بھی ہے کہ جب نجاشی شاعر عین رمضان میں شراب نوشی کے جرم میں پکڑا ہوا آیا تو آپ نے حد شرعی سے بیس کوڑے سے زیادہ اس کے لگائے جبکہ حد شرعی پر زیادہ جائز نہیں۔[1]

ایک طعن یہ ہے کہ شریف مرتضیٰ نے تنزیہ الانبیاء والائمہ میں یہ روایت بیان کی ہے کہ "أنه (عليه السلام) أوتي بمال من مهور البغايا فقال (عليه السلام): ارفعوه حتى يجئ غني وباهلة"[2] امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جب فاحشہ عورتوں کی کمائی کا مال پیش کیا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اسے اٹھالے جاؤ تا آنکہ مالداروں اور اس کے اہل کی عطایا وصول ہوں، حالانکہ فاحشہ عورتوں کی اجرت حرام ہے۔

ایک طعن یہ ہے کہ آپ نے دراہم میں سود کا حکم دیا[3] جو حکم صریح کی مخالفت ہے جیسا کہ آپ کا ارشاد ہے "لا تبيعوا الدرهم بالدرهمين"[4] درہم کو درہم کے بدلے نہ بیچو۔

ایک طعن یہ ہے کہ آپ کی بعض باتوں سے دعویٰ الوہیت ظاہر ہوتا ہے مثلاً خطبۃ البیان جو رجال شیعہ میں سے اصبغ بن بنانہ سے منقول ہے" أنا آخذ العهد على الأرواح في الأزل، أنا المنادي لهم

---

1 ـ انه اتي أمير المؤمنين بالنجاشي الشاعر وقد شرب الخمر في شهر رمضان فضربه ثمانين جلدة-(مناقب آل أبي طالب لابن شهر آشوب المازندراني ،1/ 408، ط: المطبعة الحيدرية في النجف)

2 ـ تنزيه الأنبياء والأئمة، ص:310-

3 ـ عن علي بن ابراهيم، عن ابيه، عن ابن ابي عمير، عن حماد، عن الحلبي، عن ابي عبد الله عليه السلام قال: كان علي عليه السلام يقول: لا يكون الربا الا فيما يكال او يوزن، وقال: لا بأس بان تبيع درهما بدرهمين يدا بيد اذا لم يكن فيهما وزن، فاذا كان فيهما وزن فلا يصلح الا وزنا بوزن. (الفروع من الكافي، كتاب المعيشة، باب الربا، 5/ 189، ط: دار الكتب الاسلامية)

4 ـ مصنف ابن ابي شيبة ، 4/ 498، رقم : 22499، ط: مكتبة الرشد الرياض

الست بربکم"[1] ازل میں روحوں سے میں نے ہی عہد لیا اور میں نے ہی انہیں پکار کر کہا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، اسی طرح آپ کا قول "انا المنشی الأرواح"[2] ارواح کا پیدا کرنے والا میں ہی ہوں، یا خطبۃ الافتخار میں آپ کا وہ قول جس کی روایت رجب بن محمد بن رجب برسی حلی نے اپنی کتاب مشارق انوار الیقین فی الکشف عن امیر المومنین میں بایں الفاظ کی ہے "أنا صاحب الصور، أنا مخرج من في القبور"[3] میں صاحب صور ہوں اور میں ہی اہل قبور کو قبروں سے نکالنے والا ہوں، یا آپ کا یہ قول" أناحي لا يموت، انا جاوزت موسي البحر واغرقت فرعون وجنوده،أنا أرسيت الجبال الشامخات، و فجرت العيون الجاريات، وانا ذلك النور الذي اقتبس موسي منه الهدي"[4] حی لایموت میں ہی ہوں میں نے ہی موسی کے لیے دریا میں راستے بنائے اور میں نے ہی فرعون کو اور اس کے لشکر کو غرق دریا کیا اونچے پہاڑ اور بہتے چشمے میں نے ہی قائم مجاری کیے میں ہی وہ نور ہوں جس سے موسی کو ہدایت کی روشنی ملی۔

ایک طعن یہ ہے کہ یمن عراق اور عمان میں تو اپنے اعزا و اقارب کو حاکم مقرر فرمایا مگر کوفہ و بصرہ پر طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کی حاکمیت گوارا نہ فرمائی[5] حالانکہ عمارت کی سپردگی میں یہ زیادہ حقدار اور زیادہ بہتر تھے۔

---

1 ۔ مشارق أنوار اليقين في أسرار أمير المؤمنين، للحافظ رجب البرسي، ص: 260، ط: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات بيروت لبنان

2۔ ذخيرة المعاد، ج 1 ق 3 ص: 548

3 ۔ مشارق أنوار اليقين في أسرار أمير المؤمنين، للحافظ رجب البرسي، ص:269، ط: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات بيروت لبنان

4۔ المرجع السابق

5۔ فان عليا عليه السلام كان يعلم انهما ان ملكا هذين المصرين كانا منه على حذر، وخاف ان ينفتقا عليه، ويبغيا له الغوائل، وكان يرى ان انضمامهما اليه بالمدينة اسلم له، فاعتذر اليهما بانه يحتاج الى مشاورتهما والاستعانة بهما...الخ (شرح نهج البلاغة لابن ابي الحديد،1/ 231، ط: مصر)

ایک طعن یہ بھی ہے کہ قاتلان عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر حد قصاص جاری کرنے میں تاخیر اور بے دلی دکھائی[1] حالانکہ اسباب قتل حضرت عثمان پر ثابت نہ ہو سکے۔

ایک طعن یہ بھی ہے کہ حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کی اہانت کی ان کا مال لوٹا اور ان کے گھر کو نذر آتش کیا اور جناب ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی بھی توہین کی۔

ایک طعن یہ ہے کہ واقعہ افک کو تسلیم کرنے والوں میں سے آپ بھی تھے چنانچہ بخاری کی یہ روایت "كان علي مسلما في شأنها"[2] اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے معاملہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تسلیم کرنے والوں میں سے تھے، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ"[3] تو گویا ایمانی تقاضے کے خلاف کیا۔

ان میں سے ایک طعن یہ بھی ہے کہ اول تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قتل سے پوری بریت ظاہر کی جب اس پر قاتلان عثمان کبیدہ خاطر اور آزردہ دل ہوئے تو فرمایا "فإن الله قتله وأنا معه"[4] ان کو اللہ تعالیٰ
نے قتل کیا اور میں اس کے ساتھ ہوں۔

امامت کو باطل قرار دینے کے لیے ان بدبختوں کے شبہات واعتراضات اتنے طویل الذیل ہیں کہ اس مختصر کتاب میں ان کا اور ان کے جوابات کا بیان خواہ مخواہ طوالت کا باعث ہوگا ویسے وہ اس کتاب کے موضوع سے بھی خارج ہیں بحمد اللہ اہل سنت کی بڑی کتابوں میں ان خرافات کی بڑی تفصیل سے خاطر خواہ تردید کی جاتی رہی ہے۔

1۔ ان عليا عليه السلام لم يكن قادرا على تسليم قتلة عثمان، لانهم كانوا جندا كثيرا، وكتيبة عظيمة، وكانوا في عسكره، فلو اراد القبض عليهم لحدثت فتنة عمياء لا يدرى عاقبتها. (شرح نهج البلاغة لابن ابي الحديد، 9/ 36، ط: مصر)

2۔ صحيح البخاري، 5/ 120، ط: دار طوق النجاة بيروت

3۔ سورة النور، الاية: 12

4۔ شرح نهج البلاغة لابن أبي الحديد، 3/ 66

مطاعن خوارج کے مختصر جوابات

اصول اہل سنت کے مطابق ان مطاعن کا جواب اجمالی طور پر بالکل ظاہر ہے ملاحظہ فرمائیں:

1۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اسلحہ جات اور اموال جو آپ اپنے تصرف میں لائے تو وہ اس لیے کہ وہ اموال وغیرہ ایسے ہوں گے جن کا تعلق بیت المال سے ہوگا جناب شہید رضی اللہ عنہ کی ذاتی ملکیت نہ ہوں گے اور ایسا ہونا لوازم خلافت میں سے ہے کہ جو خلیفہ ہوتا ہے وہی ایسے اموال پر قابض و متصرف ہوتا ہے۔

ہمارے دور میں بھی اس کی مثال شاہی تخت چتر ہاتھی گھوڑے وغیرہ ہیں کہ وہ آنے والے بادشاہ کے قبضہ و تصرف میں آتے ہیں وارثان شاہ میں تقسیم نہیں ہوتے اسی طرح اس قسم کے اموال خلیفہ اول کے بعد خلیفہ ثانی کے تصرف میں آئے خلیفہ اول کے وارثوں کو نہیں ملے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ورثاء اس نقطہ کو نہ سمجھ سکے اس لیے انہوں نے مطالبہ پیش کر دیا۔

2۔ اہل سنت کے اعتقاد کے مطابق جناب امیر رضی اللہ عنہ مجتہد بھی تھے اور مجتہد کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ ایک مذہب ترک کر کے دوسرا مذہب اختیار کر لے اور ایسا بھی ہوا ہے (یہاں مذہب سے مراد مجتہدانہ رائے ہے مذہب بمعنی دین نہیں) چنانچہ شیخین رضی اللہ عنہما سے بھی ایسے واقعات کا صدور ہوا ہے۔

3۔ عہد عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں امہات الاولاد پر جو اجماع تھا وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے نقطہ خیال سے قطعی نہ ہوگا بلکہ ظنی ہوگا اس لیے آپ نے اس کی مخالفت کی اور اجماع ظنی اور اجماع سکوتی کی مخالفت ہو سکتی ہے پھر اصولیوں کے نزدیک اجماع کے حجت کے لیے یہ شرط ہے کہ اہل اجماع اپنے قول پر قائم و برقرار رہیں اور چونکہ جناب امیر بھی اہل اجماع میں سے تھے جب آپ کا اجتہاد بدلا تو اس وقت وہ اجماع آپ کے لیے حجت نہیں رہا۔

4۔ جد کے بارے میں حضرت ابو بکر صدیق اور جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہما باہم مختلف الخیال تھے چنانچہ عہد فاروقی میں اس مسئلہ پر کافی بحث اور مناظرہ ہوتا رہا، اگر مجتہدین کسی نقطہ نظر سے اختلاف کریں اور ایک مجتہد مختلف اوقات میں حکم کے مختلف جواب کو ترجیح دے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

آپ کے کلام "من أراد أن يتقحم" کا مطلب یہ ہے کہ مسئلہ جد مختلف فیہا ہے ترجیح کے لیے ہر جانب وجوہ قائم ہے اور اس میں کوئی نص وارد نہیں لہذا ان حالات میں اگر کوئی اس میں حکم قطعی ہے تو وہ بے

باک ہو گا اور بے احتیاط بھی محتاط علماء اور ماہرین فضلا، کی شان یہی ہے کہ مختلف فیہ اجتہادی مسائل میں کسی ایک طرف جزم ویقین نہیں رکھتے۔

5۔ زندیق اور مرتکب اغلام کو جلانے کا جو واقعہ تھا وہ بھی اجتہادی تھا جب آپ کو خبر صحیح معلوم ہوئی تو آپ رضی اللہ عنہ نے اظہار ندامت فرمایا اور اجتہاد میں تمام اخبار پر تفصیلی نظر رکھنا شرط نہیں اسی لیے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ابتدا میراث جد کا علم نہ تھا جب جناب مغیرہ بن شعبہ اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہما نے اس کی خبر دی تو آپ نے اس کو تسلیم فرمایا حالانکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ باجماع نواصب وخوارج مجتہد تھے۔[1]

6۔ اس طرح شرابی پر حد لگانے کے بعد دیت دینا بھی بطور احتیاط تھا اجتہاد میں کسی شک کی بنا پر نہیں تھا اور احتیاط کے پہلو پر عمل کرنا انتہائی تقوی اور پرہیز گاری کی علامت ہے اور جو جناب امیر رضی اللہ عنہ جیسی ہستیوں کے شایان شان ہے۔

7۔ اور ولید بن عقبہ کو چالیس کوڑے اس لیے لگائے کہ اس سے متعلق شہادت میں شبہ پیدا ہو گیا تھا ایک شخص نے شراب پینے پر شہادت دی تھی اور دوسرے نے شراب کی قے پر گو جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حد میں اس شبہ کو کوئی اہمیت نہیں دی (جبکہ ان کے دور میں ایسا واقعہ ہوا) اور فرمایا "ما قاءها إلا وقد شربها"[2] اس نے اسی لیے تو شراب کی قے کی کہ اس نے شراب پی، لیکن جناب امیر رضی اللہ عنہ نے احتیاط کے طور پر دو حدوں میں سے جو حد کم تھی اس پر اکتفا کیا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ قرابت عثمان کا حد کے اجراء میں لحاظ فرماتے جبکہ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو

1۔عن جعفر بن محمد، عن أبيه: أن رجلاً وجد على عهد أبي بكر قد نكح كما تنكح المرأة، فكتب فيه خالد بن الوليد إلى أبي بكر، فاستشار أبو بكر الناس، فقال علي عليه السلام: إن هذا ذنب لم تعمله أمة من الأمم إلا أمة واحدة، ففعل الله بها ما قد علمتم، أرى أن يحرق بالنار. فكتب أبو بكر إلى خالد بن الوليد: أن أحرقه بالنار، ثم أحرقهم علي عليه السلام في زمانه.(السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الحدود، باب ما جاء في حد اللواط، 8/ 405، رقم : 17043، ط: دار الكتب العلميه، بيروت)

2۔اللمعة الدمشقية، للشهيد محمد بن جمال الدين مكي العاملي ، ص:242، ط: دار الفكر إيران قم

آپ نے نہایت تاکید کے ساتھ یہ مشورہ دیا تھا کہ حدود پوری پوری نافذ کی جائیں چنانچہ سیرت و تاریخ کی وہ کتابیں جن کی صحت پر اہل سنت و نواصب دونوں متفق ہیں اس پر واضح اور صاف دلالت کر رہی ہیں۔

8۔ اور قصاص آپ نے معاف نہیں کیا تھا بلکہ مقتول کے ورثاء کی جانب سے معافی ہوئی تھی البتہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا مشورہ اس میں ضرور شامل تھا معتبر کتابوں میں یہ قصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ:

ایک شخص نے دوسرے شخص کو عداوت کی بنا پر ایک ویرانے میں قتل کیا اور بھاگ گیا مقتول کے ورثاق قاتل کی تلاش میں نکلے تو اس ویرانے سے متصل ایک اور ویرانہ تھا وہاں انہوں نے ایک شخص کو پیشاب کرتے دیکھا اس کے ہاتھ میں خون الود چھری بھی تھی کپڑے بھی خون آلود تھے لوگوں نے اسے شبہ میں پکڑ کر جناب امیر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کر دیا اس نے سارے حالات اپنے خلاف پا کر اقرار جرم کر لیا اور کہا کہ جو شرعی سزا ہو مجھے دے دی جائے کیونکہ آلہ قتل بھی میرے پاس ہے گواہ بھی سچے ہیں میں پایا بھی مقتول کے قریب ہوں اب میرے لیے کہنے کو کیا رہ گیا ہے اسی اثناء میں جب اصل قاتل کو یہ معلوم ہوا کہ ایک ناکردہ گناہ نے اس کا جرم اپنے سر لے لیا ہے تو وہ بھاگا ہوا جناب امیر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور کہا کہ اصل قاتل میں ہوں اور یہ شخص بے گناہ ہے لہذا اسے رہا کیجئے اور قصاص مجھ سے لیجئے امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے پہلے آدمی سے پوچھا کہ تو بتا تیرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا جو تو قتل کا اقراری ہو گیا وہ کہنے لگا میں نے اپنے گھر میں بکری ذبح کی تھی چھری پر اس کا خون تھا کپڑوں پر بھی اسی کا خون لگا تھا ذبح کے بعد کھال اتارنا ہی چاہتا تھا کہ پیشاب نے زور کیا تو میں فراغت کے لیے ویرانہ میں جا گھسا وہاں ایک لاش کو دیکھ کر ڈر گیا اور اس کے برابر والے ویرانے میں جا کر پیشاب کر رہا تھا کہ مقتول کے وارث ہونے آ پکڑا اور آپ کے پاس لے آئے سارے حالات میرے خلاف تھے کچھ کہتا بھی تو کوئی یقین نہ کرتا لہذا میں نے اقرار کر لیا اس پر جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اصل اقراری قاتل کو شاباش دی کہ گو تو نے ایک آدمی قتل کیا ہے مگر دوسرے کی جان بھی بچائی تو آکر اقرار نہ کرتا تو ایک بے گناہ قصاص میں مارا جاتا تو اس

قاتل ہے کہ تیرا خون بہا معاف کیا جائے مقتول کے وارث ہونے جب آپ کی یہ بات سنی تو قصاص سے لادعویٰ ہو گیا اور قاتل کو معاف کر دیا۔ [1]

لہذا اس صورت میں طعن کی کہاں گنجائش ہے۔

9۔ رجم مولاۃ حاطب اگر اس کی آزادی کے بعد ہوا تو جائز ہوا اور ممکن ہے آپ کو اس کے کنیز ہونے کی اطلاع نہ ہو۔

10۔ آپ کے ساتھ جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا مناظرہ کرنا اور ایک مسئلہ میں آپ کو الزام دینا جناب امیر رضی اللہ عنہ کی حقارت کا باعث نہیں حق کی پیروی تو اولیاء کی شان ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ ایک عورت کی بات کے قائل ہو گئے اور برملا یہ الفاظ فرمائے " کل النساء أفقه من عمر، حتی ربات الحجال!" [2] عمر سے تو سبھی لوگ زیادہ سمجھدار ہیں حتی کہ پردہ نشین خواتین بھی۔

11۔ پنچائت کی خلاف ورزی تو اس وقت لازم آتی ہے جبکہ دونوں پنچوں نے غور و فکر کے بعد متفقہ طور پر فیصلہ دے دیا ہو جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے پنچ نے مد مقابل کے پنچ کو گڑبڑا دیا اور اس کو سوچنے کا موقع ہی نہ دیا تو یہ پنچایت کہاں ہوئی جو اس کی خلاف ورزی کا الزام دیا جائے۔

12۔ میں چور کا ہاتھ انگلیوں کی جڑوں تک کاٹنا یہ جلاد کی غلطی تھی آپ رضی اللہ عنہ کا حکم نہیں تھا جو آپ کی لاعلمی لازم آئے۔

13۔ اور بچوں میں باہم ایک دوسرے کی گواہی قبول کرنا جبکہ وہ امور ہی ایسے ہوں جو بچوں میں چلتے رہتے ہیں اب بھی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں مقبول ہے اور آیت فاستشهدوا میں بچے داخل نہیں کیونکہ بچوں کے باہم کھیل کود میں بالغوں کی موجودگی نہیں ہوا کرتی اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ کافروں میں بعض کی گواہی بعض کے لیے مان لی جاتی ہے لہذا جب یہ مجتہدین کا مسلک ہوا تو طعن کا سوال نہ رہا۔

1۔ ذخائر العقبی فی مناقب ذوی القربی، ص: 81، ط: مکتبہ قدسی، قاهرہ

2۔ شرح نهج البلاغة لابن أبي الحديد، 1/ 182، ط: دار احیاء الکتب العربیة

14۔ اور یک چشم کی آنکھ کی آدھی دیت لینا یہ فقیہ کی باریک بینی اور نکتہ رسی ہے کیونکہ کانے کی صرف ایک ہی آنکھ ہے جو دونوں آنکھوں کا کام دیتی ہے لہذا اگر قصاص لینے والے نے اس کی اس آنکھ کو پھوڑا جو دونوں آنکھوں کا کام دیتی تھی تو گویا اس نے اپنے حق سے تجاوز کیا اور ایک زائد آنکھ پھوڑ دی تو اس پر دیت لازم ہو گئی البتہ قرآنی نص "العين بالعين"[1] کے پیش نظر اس سے قصاص لینا لازم ہو گا لہذا اس جگہ حقیقت اور شبہ حقیقت دونوں پر عمل ہوا اگرچہ یہ کسی مجتہد کا عمل نہیں ہے لیکن قواعد شرعیہ سے اس کے نظائر پیش کیے جا سکتے ہیں مثلاً زکوۃ میں بنت مخاض ایک سال کی اونٹنی کی جگہ بنت لبون دو سال کی اونٹنی لینا اور بقدر زائد کی قیمت دے دینا جائز ہے حاصل کلام یہ کہ اجتہادی مسائل میں کسی پر طعن فضول اور کار بے ثواب ہے۔

15۔ اور نابالغ بچہ پر اگر پوری حد سرقہ لگانا ثابت بھی ہو تو وہ سیاست خلافت پر مبنی ہو گا حکم شرع کی بنا پر نہیں بچوں پر وہ قلم شرع اٹھ گیا ہے مگر خلفاء کی سیاست اور تادیبی سزا ان پر لاگو ہو سکتی ہے حدیث صحیح موجود ہے کہ "واضربوهم عليها، وهم أبناء عشر"[2] وہ دس برس کے ہوں تو نماز نہ پڑھنے پر انہیں مار لگاؤ۔

16۔ اور محمد بن بابویہ کی روایت کے چوری کا اقرار کر لینے والے پر حد نہ لگائی یا رمضان میں شراب فوری والے پر مقررہ حد سے بیس کوڑے زائد لگائے ناقابل قبول ہے لہذا اس کے جواب کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس کی بھی یہ توجیح کی جاسکتی ہے کہ یہ زیادتی بربنائے سیاست تھی۔

17۔ رہا فاحشہ عورتوں کی اجرت کا معاملہ تو اہل سنت کی کتابوں میں تو اس کا وجود ہے نہیں اس لیے اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ یہ روایت جھوٹی ہے جبکہ اہل سنت کے ہاں تو اس کے خلاف ایک صحیح روایت استیعاب میں موجود ہے:

روى موسى بن إسماعيل، عن أبي عوانة، عن مغيرة، عن ثابت بن هرمز، قال:

حمل المختار مالا من المدائن من عند عمه إلى عليّ، فأخرج كيسا فيه خمسة

1۔ سورة المائدة، الآية :45

2۔ سنن أبي داود، باب متى يؤمر الغلام بالصلاة، 1/ 133، رقم: 495، ط: المكتبة العصرية، صيدا بيروت

عشر درهما، فقال: هذا من أجور المومسات. فقال له عليّ: ويلك! ما لي وللمومسات، ثم قام وعليه مقطعة حمراء، فلما سلّم قال عليّ: ما له قاتله الله لو شقّ عن قلبه الآن لوجد ملآن من حب اللات والعزى.[1]

موسی بن اسماعیل نے ابی عوانہ سے اس نے مغیرہ سے اس نے ثابت بن حرمز سے روایت کرتے ہوئے کہا کہ مختار ثقفی مدائن سے اپنے چچا کے پاس سے کچھ مال لاد کر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پاس لایا جب مال کی سپردگی سے فارغ ہو گیا تو ایک تھیلی نکالی جس میں پندرہ درہم تھے اور کہنے لگا کہ یہ فاحشہ عورت کی کمائی میں سے ہے جو جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تیرا ناس جائے میرا اس کمائی سے کیا واسطہ مختار یہ سن کر اٹھ کھڑا ہوا اس وقت وہ سرخ کپڑا لپیٹے ہوا تھا اس نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رخصتی سلام کیا تو آپ نے فرمایا دیکھو اسے کیا ہو گیا ہے اس پر اللہ کی پھٹکار ہو اس وقت اگر اس کا دل چیر کر دیکھا جائے تو وہ لات کی محبت سے لبریز نظر آئے گا۔

لہذا معلوم ہوا کہ شیعوں نے جو روایت بیان کی ہے وہ مختار ثقفی کے افترا اور بہتان پر مبنی ہے جس کو مختار نے ایسا مال ہضم کرنے اور شرمندگی مٹانے کی خاطر گھڑ نت کر کے عام لشکریوں اور اپنے پیروکاروں تک پہنچائی اور بالآخر رفتہ رفتہ شہرت پا گئی۔

18۔ دراہم کے سود کے متعلق صورت یہ ہے کہ وہ دراہم جن میں کھوٹ اتنی زیادہ ہو کہ ان کا چلن بند ہو جائے اور سکہ کی حیثیت ختم ہو جائے ایسے دراہم کی کمی بیشی کے ساتھ خرید و فروخت شافعیہ کے نزدیک جائز ہے حرام نہیں ہو سکتا ہے کہ جن دراہم میں جناب امیر نے زیادہ کو جائز رکھا ہو وہ اس قسم میں ہوں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں درہم سے مراد وہ ہے جو خالص چاندی کا ہو یا اگر کھوٹ ہو بھی تو اتنی نہ ہو کہ اس کے چلن میں خارج ہو اور اس کی قیمت کی حیثیت باقی ہو۔

1۔ الإصابة في تمييز الصحابة، 6/ 276، ط: دار الكتب العلمية بيروت

19۔ اور خطبۃ البیان اور خطبۃ الافتخار کا اہل سنت کی کتابوں میں کوئی وجود نہیں بلکہ ان کے ہاں یہ موضوعات میں شامل ہیں ان کے راوی امامیہ ہیں اور جھوٹے ہیں لہذا ایسی افترا اور بہتان کی بات کو اڑ بنا کر تعان کرنا پرلے درجہ کی صفات اور بے وقوفی ہے اور بالفرض ان کو صحیح معنی بھی لیں تو یہ غلب حال سر مستی کیفیت ہوگی چنانچہ بعض اوقات اولیاء اللہ پر یہ حالت طاری ہو جاتی ہے اور ان کے زیر اثر ان کی زبان سے ایسے کلمات کا صدور ہو جاتا ہے اور شرع میں حال کی ایسی مستی اور ایسے غلبہ پر معذور رکھا گیا ہے توبہ کے سلسلہ میں صحیح حدیث میں اس کی مثال موجود ہے کہ بندہ یوں بیٹھتا ہے "أنت عبدي وأنا ربك، أخطأ من شدة الفرح "[1] تو میرا بندہ میں تیرا رب خوشی کی شدت میں وہ ایسی غلطی کر بیٹھا۔

پھر یہ کلام زبان حال کی حکایت ہے جیسے کہتے ہیں" قالت الارض للوقد لم تشقني قالت لا تسالني واسئل من يدقني "زمین نے میخ سے کہا تو مجھے کیوں پھاڑ رہی ہے میخ بولی مجھ سے نہ پوچھ اس سے پوچھ جو مجھے ٹھونک رہا ہے، اسی طرح حدیث شریف میں ہے "أتدرون ماذا قال ربكم؟"[2] کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے رب نے کیا کہا؟ یعنی زبان اشارہ سے ورنہ زبان عبادت کا امت کو پتہ ہونا غیر ممکن ہے کہ وہ اس کو جان سکیں۔

20۔ اور عمارت اور عہدوں کے لیے ایسے اقارب اور عزیز زیادہ بہتر ہیں جو واجبی اطاعت سے سر مو انحراف نہیں کرتے بنسبت ان اجنبیوں اور عزیزوں سے جن کا شعار ہی نافرمانی اور حکم عدولی بن گیا ہو چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی یہ طرز اختیار فرمایا۔

21۔ اور قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے میں دیر اور پس و پیش اس لیے تھی کہ قاتل کی تعیین نہ ہو سکی تھی اور قاتل کی تفتیش اور سراغ رسانی خلیفہ کے ذمہ نہیں بلکہ وارث ان کے ذمہ ہے۔

1۔ صحيح مسلم، كتاب التوبة، باب في الحض على التوبة ..الخ، 4/ 2104، رقم: 2747، ط: دار إحياء التراث العربي

2۔ مجموعة رسائل ابن أبي الدنيا كتاب الهواتف، ص: 32، ط: مؤسسة الكتب الثقافية

22۔ اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی اہانت مالک اشتر اور اس کے غلاموں نے کی اور کوفہ میں کی ان کا گھر بغیر امیر رضی اللہ عنہ کے حکم کے جلاڈالا اور آپ کو اس کی اطلاع تک نہ ہوئی تاریخ طبری میں یہ واقعہ اسی طرح بیان ہوا ہے اور جناب ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی اہانت کا سبب ان کی باغیوں کی طرف داری اور جانبداری تھی۔

23۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شان میں واقعہ کی تسلیم آیت برات نازل ہونے سے پہلے پہلے تھا اور اس میں بظاہر خرابی اس لیے نہیں کہ محض خبر سچ اور جھوٹ دونوں پہلو رکھتی ہے۔

24۔ اور آپ کا یہ کہنا "قتلہ اللہ وانا معہ" بطور توریہ کے تھا کہ ضرورت کے وقت آپ اس کو کام میں لائے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے حضرت سارہ علیہا السلام کے حق میں ھذا اختی نکلا اور ضرورت یہ تھی کہ مبادہ قاتلان عثمان لشکر میں بلوہ اور فتنہ وفساد برپا کریں بلکہ خطرہ یہ بھی تھا کہ خود جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ہی قتل کے درپے نہ ہو جائیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شیطان نے نواصب اور شیعہ ہر دو کی راہ ہماری اور ان کو خدا کے دوستوں کی عیب جوئی کی راہ پر ڈال دیا جو اس کی عین ارزو اور مقصد وجود ہے اور یوں اس نے ان کو اپنا آلہ کار بنالیا(خدا جسے رسوا کرنا چاہتا ہے اس کا میلان طبع نیک لوگوں پر طعنہ زنی کی طرف کر دیتا ہے)

امامت کی بحث کا خاتمہ

شیعوں کے تمام فرقوں میں قدر مشترک وہ نقطہ خیال جس پر سب متفق ہیں یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ وامام بلا فصل تھے اور تینوں خلفاء رضی اللہ عنہم کے خلافت غلط اور بے بنیاد تھی اس قدر مشترک پر اہل سنت کے ساتھ ان کا جو نزاع اور بحث تھی وہ گزشتہ اوراق میں بڑی تفصیل اور واضح انداز میں گزر چکی اور اسی کے ساتھ شیعی فرقوں ان کی شاخوں بلکہ ڈالیوں نے اس سلسلہ میں کتاب اللہ عترت رسول اللہ سے جو مخالفت کی ہے وہ بھی وضاحت سے سامنے آچکی لیکن اس قدر مشترک کے باوجود بھی ان کے فرقوں میں باہم بڑے سنگین اختلافات ہیں حتی کہ بعض نے بعض دوسروں کو کافر و گمراہ تک کہنے میں کوئی بات نہ کیا ایک دوسرے کو طعن کرنا تو معمولی سی بات ہے۔

اس کتاب میں اختلافات کا ذکر وہ ضروری تو نہ تھا کیونکہ اس کا موضوع شیعہ وسنی کی آپس میں گفتگو و بحث ہے نیز ان کے باہمی اختلاف سے اہل سنت کا کچھ نقصان بھی نہیں لیکن اس نقطہ نظر سے کہ کسی چیز میں

زیادہ اختلاف ہونا اس کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے مسائل شروط امامت معنی امامت اور تعیین ائمہ میں ان کے اقوال نقل کرنا موضوع و مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ اس مذہب کے جھوٹ ہونے کی علامت مختلف پہروں سے واضح ہو جائے اور ان کا یہ طعن کہ اہل سنت فقہ میں بہت اختلاف کرتے ہیں انہی پر لوٹ جائے کیونکہ ان کا اختلاف تو اصول میں ہے جس سے مذہب کی بیخ و بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے اور اہل سنت کا اختلاف فروعات میں ہے جو رحمت ہے گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ادیان بھی اصول میں متفق رہے ہیں گو فروعات میں اختلاف رہا چنانچہ "شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا"[1] اس پر گواہ ہے۔

لہٰذا وہ دین جو اپنے اندر اصولی اختلاف رکھتا ہو ایک کرشمہ ہی ہے جس کی نظر انبیاء سابق کے ادیان تک میں نہیں ملتی چہ جائے کہ اسلام میں اس کی گنجائش ہو۔

شروط امامت میں اختلاف

غالی شیعوں کے نزدیک امامت محض اوامر، نواہی کے احکام کے اجراء و نفاذ کا نام ہے، شئون الٰہیہ میں سے ایک شان، ان غلاۃ کے علاوہ باقی فرقے کہتے ہیں کہ امامت دین و دنیا کے امور میں پیغمبر کی نیابت ہے سارے زیدی امام میں عصمت کی شرط کے قائل نہیں اور اسے بھی ضروری نہیں سمجھتے کہ اس کے لیے کوئی نصب وارد ہو اور نہ ہی امام کے لیے افضلیت کو لازم سمجھتے ہیں بلکہ امامت کی شرطوں میں سے بہترین شرط تلوار تھام کر نکل آنے کو مانتے ہیں اور اپنے سب دعوؤں کی دلیل پیش کرتے ہیں۔

اسماعیلیہ سب کے سب علاوہ فرقہ نزاریہ کے عصمت کو امامت کے لیے شرط قرار دیتے ہیں[2] نزاریہ اس معاملہ میں خاموش ہیں نہ انکار کرتے ہیں نہ ہاں کہتے ہیں نہ ناں، ان کا کہنا ہے کہ امام کو فروع کے لیے مکلف ہی نہیں کیا گیا وہ جو بھی حرام کاری کرے اس کے لیے سب کی سب جائز ہیں۔

1۔ سورۃ الشوری، الآیۃ: 13

2۔ مقالات الإسلاميين: ص 27؛ الفرق بين الفرق: ص 47؛ الملل والنحل: 1/ 168

شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی نے اپنے شیخ ابو عبد اللہ محمد بن نعمان بغدادی جو شیخ مفید کے لقب سے مشہور ہیں کہا یہ قول نقل کیا ہے کہ ابو الحسن ہارونی[1] ابتدا میں شیعہ مذہب رکھتے اور امامت کے قائل تھے لیکن امامیہ کے شدید اختلاف کی وجہ سے انہیں راہ ہدایت کا ہی پتہ نہ چل سکا اور انہوں نے ان کی روایات کو آپس میں مختلف متناقض اور متعارض دیکھ کر شیعت پر ہی تین حرف بھیجے اور توبہ کر کے شافعی مذہب اختیار کر لیا اور وہ لوگ جو آپ کے شاگرد یا صحبت یافتہ تھے اور عمر بھر ان سے استفادہ کرتے رہے تھے انہوں نے بھی اپنے شیخ کی پیروی میں اس مذہب سے بیزاری کا اظہار کیا۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو شخص بھی گہرائی میں اتر کر اس مذہب پر نظر ڈالتا ہے اور ان کے اقوال واخبار کے پریشان کن اختلاف سے آگاہ ہوتا ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس مذہب میں راہ نجات ہی غائب ہے اور تعارض کی راہ تنگ اور راہ اخلاص معدوم ومفقود ہے تو مجبور ہو کر اس مذہب کو خیر باد کہتا ہے اور دوسرا کوئی مذہب اختیار کر لیتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اماموں سے متعارض روایات بیان کرتے ہیں اور ہر امام سے دوسرے کے خلاف بھی روایات لاتے ہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ایسی روایات بھی نقل کرتے ہیں جو قرآن وحدیث کے بھی مخالف ہوتی ہیں اور اس تعارض وتناقض میں نسخ کا کوئی احتمال ہے ہی نہیں کیونکہ ایک نبی کے کلام کو دوسرے نبی ہی منسوخ کر سکتا ہے امام کو یہ حق ہی کہا ہے وہ خدا اور رسول کے احکام کو منسوخ کر سکے ورنہ امام امام ہی نہ رہے گا کیونکہ وہ تو نبی کا نائب ہے نہ اس کا مخالف ہے نہ مستقل نبی اور بلفرض محال نسخ کو مان لیں تو بعد میں آنے والا امام امام اول کے احکام کا ناسخ ہو گا اس صورت میں مدار عمل بعد والے امام کی روایات پر ہو گا حالانکہ اس فرقہ نے امام اول کی روایات پر اجماع کیا ہے۔

---

1 ۔ وقد حكى أبو جعفر الطوسي عن شيخه أبي عبد الله محمد بن النعمان البغدادي المشهور عندهم بالمفيد أن أبا الحسن الهاروني كان يعتقد مذهب الشيعة ويدين بطريق الامامية، فرجع عنه لما التبس عليه الأمر في اختلاف الأحاديث، وترك المذهب ودان بغيره. (صب العذاب على من سب الأصحاب،1 / 297، ط: أضواء السلف، الرياض)

پھر اس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ احکام مؤیدہ میں جن میں ایک دوسرے سے تاکید ہو نسخ جائز نہیں ورنہ معصوم کی تکذیب لازم آئے گی حالانکہ ان کی روایات کا اختلاف احکام مؤیدہ میں بھی چلتا ہے لہذا نسخ کا احتمال سرے سے زائل ہو گیا۔

اور رہی یہ بات کہ رواۃ کے وثوق کے اعتبار سے ایک خبر کی دوسری خبر پر ترجیح کا معاملہ تو اس کا تو راستہ ہی بند ہے کیونکہ انہوں نے چند کتابوں کو کتب سماوی سمجھ رکھا ہے اگر کوئی ان میں سے ایک روایت لاتا ہے تو دوسرے کے نزدیک اس کی حیثیت خاک کے برابر ہے لہذا اگر ان کے عوام کے نقطہ نظر سے سبھی کو قابل وثوق سمجھ لیں تو ایک کو دوسری پر ترجیح کس طرح دے سکیں گے اور اگر بعض راویوں کے قول کو بعض دوسروں کے مقابلہ میں قبول کر کے دوسروں پر طعن و تشنیع اور جرح شروع کر دیں تو سارے کے سارے مجروح ہو کر رہ جائیں گے اور اس صورت میں ترجیح کی کوئی شکل بھی متصور نہیں تو پھر ساری روایات ساقط اور ناقابل عمل ہو کر احکام معطل اور بیکار ہو جاتے ہیں۔

اس قسم کی روایات ان کے ایک فرقہ اثنا عشریہ کی ہیں کہ ان کا ہر عالم ایک ایسی روایت بیان کرتا ہے جو دوسرے کی روایت سے ٹکراتی ہے مثلاً ایک جماعت طریقے صحت یہ روایت بیان کرتی ہے کہ "المذي لا ينقض الوضوء"[1] مذی وضو نہیں توڑتی، تو دوسری جماعت صحیح سند سے یوں بیان کرتی ہے "المذي

1۔ روى الإمامية عن بريد بن معاوية أنه قال: «سألت أحدهما [الباقر أو الصادق] عليه السلام عن المذي فقال: لا ينقض الوضوء ولا يغسل منه ثوب ولا جسد إنما هو بمنزلة المخاط والبزاق». الكافي: 3/ 39؛ الاستبصار: 1/ 91

يـنقض الوضوء"[1] مذی وضو توڑ دیتی ہے، ایک جماعت کہتی ہے کہ نماز میں سجدہ سہو واجب نہیں تو دوسری روایت کرتی ہے کہ سجدہ سہو واجب ہے[2] اور ائمہ نے سجدہ سہو کیا ہے۔[3]

بعض کہتے ہیں کہ شعر خوانی سے وضو ٹوٹ جاتا ہے[4] تو بعض کہتے ہیں کہ وضو نہیں ٹوٹتا،[5] ایک

1ـ روي عن محمد بن إسماعيل قال: «سألت أبا الحسن [الرضا] عليه السلام عن المذي؟ فأمرني بالوضوء منه، ثم أعدت عليه سنة أخرى فأمرني بالوضوء منه». ابن بابويه، من لا يحضره الفقيه: 1/ 65؛ الطوسي، تهذيب الأحكام: 1/ 18.

2ـ رووا عن أبي بصير عن أبي عبد الله [الصادق]عليه السلام: «قال إذا لم تدر خمسا صليت أم أربعا فاسجد سجدتي السهو بعد تسليمك وأنت جالس ثم سلم بعدها». الكليني، الكافي: 3/ 355؛ الطوسي، تهذيب الأحكام: 2/ 195.

3ـ عن محمد بن علي الحلبي قال: «سمعت أبا عبد الله [الصادق] يقول في سجدتي السهو: بسم الله وبالله، السلام عليك أيها النبي ورحمة الله وبركاته». الكليني، الكافي: 3/ 356؛ ابن بابويه، من لا يحضره الفقيه: 1/ 342؛ الطوسي، تهذيب الأحكام: 2/ 196.

4ـ أخرج الطوسي عن زرعة بن سماعة قال: «سألت أبا عبد الله عليه السلام عن نشد الشعر هل ينقض الوضوء أو ظلم الرجل صاحبه أو الكذب؟ فقال: نعم إلا أن يكون شعرا يصدق فيه أو يكون يسيرا من الشعر، الأبيات الثلاثة والأربعة، فأما أن يكثر من الشعر الباطل فهو ينقض الوضوء». الاستبصار: 1/ 87؛ وسائل الشيعة: 1/ 269.

5ـ روى ابن بابويه وغيره عن معاوية بن ميسرة قال: «سألت أبا عبد الله عليه السلام عن إنشاد الشعر هل ينقض الوضوء؟ قال: لا». من لا يحضره الفقيه: 1/ 63؛ وأخرجه الكليني، الكافي: 1/ 16؛ الطوسي الاستبصار: 1/ 86.

جماعت کہتی ہے کہ بحالت نماز داڑھی یا دیگر اعضائے بدنی سے کھیلنا نماز میں خرابی پیدا نہیں کرتا[1] تو دوسری جماعت یہ روایت کرتی ہے کہ عضو مخصوص اور اس کے معلقات سے کھیلنا بھی نماز میں جائز ہے[2] اور یہ حالت دو چار اخباری ہی میں نہیں تمام اخبار میں ہے چنانچہ ان کی کتاب من لایحضرہ الفقیہ اس پر گواہ ہے۔

اور اگر شیعوں کے تمام فرقوں کی روایات واخبار پر نظر ڈالیں تو ان کے تمام اصول میں بے ربطی اور گردوں کا ایسا طوفان امڈتا دکھائی دیتا ہے جس کی کوئی حدود انتہا نہیں ان کے بعد علماء نے ان سب روایات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے تو انہوں نے در حقیقت عجیب جاگری دکھائی ہے ان میں سب کا پیشوا اور سردار شیخ الطائفہ محمد ابن الحسن الطوسی ہے جو تہذیب، استبصار کا مصنف ہے اس کی کوشش کی یہی معراج ہے کہ وہ ان کو تقیہ پر محمول کر گیا ہے کہ وہ مخالفین میں سے کسی کا مذہب نہیں ہے یا اگر ہے تو ضعف کہ ایک دو آدمیوں سے زائد کسی نے اسے اختیار نہیں کیا ظاہر ہے کہ ائمہ عظام اس قدر بزدل تو نہ تھے کہ صرف اس وہم وشبہ کی وجہ سے کہ شاید کوئی یہ مذہب رکھتا ہو اور اس وقت موجود بھی ہو اپنی عبادت کو باطل وخراب کر دیں ان ائمہ اور اولیاء کے متعلق ایسی بد عقیدگی کے تصور سے بھی خدا کی پناہ!

اور بعض جگہ خبر وروایت کے ایک جملہ کو تقیہ پر محمول کیا ہے اور دوسرے جملہ کو کہ وہ بھی اہل سنت کے مذہب کے خلاف ہے جوں کا توں چھوڑ دیا ہے اگر یہی تقیہ ہے تو پھر یہ کیسا تقیہ ہے کہ ایک جملہ میں تقیہ ہے اور دوسرا جملہ صاف صاف اور کھلم کھلا کیا یہ اپنے ائمہ کو عقل سے کورا ہی سمجھتے ہیں اس کی مثال حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ہے:

أن النبي ﷺ أمره بغسل الوجه مرتين وبتخليل أصابع الرجلين حين غسلهما[3]

1۔ روى الطوسي عن مسلمة بن عطا قال: «قلت لأبي عبد الله عليه السلام: أي شيء يقطع الصلاة؟ قال: عبث المصلي بلحيته». تهذيب الأحكام: 2/ 378؛ الحر العاملي، وسائل الشيعة: 7/ 262.

2۔ عن معاوية بن عمار قال: سألت أبا عبد الله (عليه السلام) عن الرجل يعبث بذكره في صلاة المكتوبة؟ فقال: لا بأس.(وسائل الشيعة إلى تحصيل مسائل الشريعة، 7/ 283،ط: مؤسسة آل البيت عليهم السلام لإحياء التراث)

3۔ أخرج الطوسي عن علي رضي الله عنه قال: «جلست أتوضأ فأقبل رسول الله صلى الله عليه وسلم حين ابتدأت بالوضوء فقال لي: تمضمض واستنشق واستن ثم غسلت ثلاثا، فقال: قد يجزيك من ذلك المرتان فغسلت ذراعي

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو منہ دو مرتبہ دھونے کا حکم دیا اور پاؤں دھوتے وقت ان میں انگلیوں سے خلال کرنے کا۔

حالانکہ منہ کا دو مرتبہ دھونا شیعوں کا مذہب ہے نہ سنیوں کا کیونکہ بطور سنت دونوں کا تین مرتبہ دھونے پر اجماع ہے اور پاؤں کا دھونا سنی مذہب کے موافق ہے شیعوں کے نزدیک تو مسح کرنا ان کا مذہب ہے لہذا اس حدیث میں تقیہ و اظہار دونوں کا جمع کرنا لازم آیا۔

بعض جگہ ایسی رکیک اور پوچ تاویلات کرتے ہیں کہ امام کے کلام فصیح و بلیغ کو بازاریوں کے مہمل اور لغو کلام کی حد تک پہنچا دیتے ہیں اسی قسم کی ایک وہ تاویل ہے جو یہ جناب سجاد رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں کرتے ہیں جبکہ آپ دعا فرمارہے ہیں "إلهي عصيت وظلمت وتوانيت"[1] میرے اللہ میں نے نافرمانی کی ظلم کیا اور سستی کی، یہاں یہی دعا ان کی کتابوں میں دوسرے ائمہ سے بھی مروی ہے، اب یہ روایات خاص ہوں یا جھوٹ بہر صورت عصمت کے خلاف ہیں پھر یہ تقیہ کا موقع بھی نہیں کیونکہ یہ معاملہ تو ان کی ذات کے ساتھ مناجات کا ہے جو ہر ظاہر و پوشیدہ بات کو جاننے والی ہے اب اس دعا میں ان کی تاویل دیکھیے یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ:

إلهي أن شيعتنا عصوا وظلموا وتوانوا ولكن رضينا بهم شيعة ورضوا بنا أئمة فحالنا حالهم وحالهم حالنا!

اے میرے اللہ ہمارے شیعوں نے نافرمانی کی اور ظلم کیا اور سستی کی لیکن ہم ان کے شیعہ ہونے پر راضی ہیں اور وہ ہمارے امام ہونے میں راضی ہیں پس ہمارا حال ان کا حال ہے اور ان کا

ومسحت برأسي مرتين، فقال: قد يجزيك من ذلك المرة، وغسلت قدمي، فقال لي: يا علي خلل بين الأصابع لا تخلل بالنار». الاستبصار: 1/ 65؛ العاملي، وسائل الشيعة: 1/ 421.

1 ـ مشارق أنوار اليقين في أسرار أمير المؤمنين، للحافظ رجب البرسي، ص:315، ط: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات بيروت لبنان

حال ہمارا حال ہے۔

اس یگانگت و اتحاد کے کیا کہنے! اگر شیعوں اور ائمہ میں اس قسم کی یگانگت و اتحاد ثابت ہو تو شیعوں کی نافرمانی ظلم اور سستی تو ائمہ میں عصر کر گئی مگر ائمہ کا عدل طاعت عبادت و خشوت شیعوں پر مطلق اثر نہ کر سکی گویا شیعوں کے احکام تو ائمہ پر غالب آگئے مگر ائمہ کے احکام شیعوں پر بے اثر رہے کوئی حد ہے اس بد عقیدگی کی عرب و عجم کے محاورات میں اس قسم کے لوگ تاویل کی کوئی نظیر ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گی۔

پھر اعتبار فن نحو اس میں جو رکاکت ہے وہ بھی پوشیدہ نہیں کہ واحد متکلم کی تا کو جمع پر محمول کیا اور متکلم کو غائب پر اور متکلم کا غیر کے فعل کو اپنی طرف منسوب کرنا بھی لازم آیا بغیر کسی وجہ تعلق سببیت وغیرہ کے اور ایسے لغو و فاسد کلام کو ایسے لوگوں کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے جو بلاغت کی انتہا پر پہنچے ہوئے تھے اور پھر اس کی کیا ضرورت پیش آئی کہ اپنی ذات مقدس کو اس نسبت سے آلودہ کیا ظلم و عصیان کی نسبت براہ راست ان شیعوں ہی کی طرف کیوں نہ کی جو ان کی عصمت کے منکر تھے ان کے لیے اپنے ہاتھوں یہ دستاویز کیوں کی اور خواہ مخواہ زائد ضرورت کلمات کہہ کر بہت بڑی جماعت کی گمراہی کا سبب کیوں بنے۔

اور پھر اسلام کے صدر اول اور ابتدائی صدیوں میں فروعی مسائل میں کافی سخت اختلافات رونما ہوئے خود اہل سنت میں بھی فروعی مسائل میں باہم یک دیگر خاص اختلافات تھے مگر فروعی مسائل کے اس اختلاف کو کسی نقصان کا سبب نہیں سمجھا نہ اس کے باعث آپس میں طعن و تاب اور سب و شتم سے کام لیا زبانی گفتگو اور بحث و مناظرہ کا البتہ رواج رہا ہر شخص اپنا مذہب ظاہر کرتا اور اس پر دلائل قائم کرتا عہد صحابہ سے لے کر عباسی دور تک آپس کی یہ مناظرہ بازی اور باہم چوٹیں چلتی رہیں ہر مسئلے پر بلا کھٹکے اور دھڑلے سے اجتہاد کرتے مسائل استنباط کرتے اپنے اقوال کی ترجیح کے دلائل ثابت کرتے اور فریق ثانی کے قول کو ضعیف و کمزور بتاتے ایسے ماحول میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ائمہ کرام کو تقیہ کرنے کی ضرورت کیوں پڑی اور اللہ تعالی کی طرف سے نازل کردہ احکام کو ظاہر کرنے سے کیوں پہلو تہی کی حالانکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلیفہ دوم و سوم کے عہد میں امہات الاولاد، حج تمتع اور دوسرے مسائل پر کافی زوردار بحث کی اور جانبین میں خاصی سخت بدرشتی کی نوبت بھی آئی مگر اس کے باوجود کسی نے بھی جدل و نیزہ نہیں کیا خصوصا خلیفہ دوم کہ ان کو تو شیعہ

بھی اس معاملے میں بہت نرم مزاج اور قبول حق میں فراغ دل مانتے ہیں ان کے سامنے قرآن و سنت سے جو بھی دلیل پیش کی جاتی بلا کسی پس و پیش کے قبول فرماتے خواص کی بات تو رہی الگ عام مسلمانوں میں ایک عورت نے ایک مسئلہ میں جب معقول بات کہی تو آپ نے نہ صرف اسے تسلیم کیا بلکہ یہ الفاظ فرمائے:

"كل الناس أفقه من عمر حتى المخدَّرات"(۱)

ہر آدمی عمر سے زیادہ دین کی سوجھ بوجھ رکھتا ہے حتی کہ پردہ نشین مستورات بھی۔

ایسے حالات میں جناب امیر رضی اللہ عنہ تقیہ کیوں فرماتے اور وہ بھی فروعی مسائل میں اور منزل من اللہ کے اظہار سے جو اپ پر واجب تھا کیوں باز رہتے اسی طرح بعد میں انے والے ائمہ مثلا جناب سجاد باقر صادق کاظم اور رضا رحمہ اللہ جو علماء اہل سنت مثلا زہری امام ابو حنیفہ امام مالک رحمہ اللہ کے مقتدی چکے ہیں اور انہی لوگوں سے ان حضرات کو تلمذ شاگردوں کا اعزاز بھی حاصل رہا اور اس وقت کے صفیہ کرام مثلا معروف کرخی رحمہ اللہ وغیرہ نے اجناب ہی کے فیض سے خوشہ چینی کی ہے اور مشائخ طریقت نے انہی کے سلسلہ کو سلسلہ ہے اور پھر محدثین اہل سنت نے انہی بزرگوں سے ہر فن خصوصا تفسیر سلوک اور حدیث میں دفتر کے دفتر روایت کیے ہیں تو کیا ایسے الات میں ان محترم ائمہ کرام کے لیے یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ یہ اپنے معتقدین شاگردوں اور عقیدت مندوں سے ڈر گئے ہو اور ان سے تقیہ کیا ہو اگر ایسے لوگوں سے تقیہ کیا جا سکتا ہے تو پھر رجال شیعہ سے تو بدرجہ اولی تقیہ کرنے کا احتمال ہونا چاہیے۔

ائمہ کی تعداد میں امامیہ کا اختلاف

دیکھیے زور بیان میں ہم کہاں سے کہاں نکل گئے بات یہ چل رہی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے بعد امامیہ اور شیعوں کے دوسرے فرقوں میں اصل امامت کے سلسلہ میں اتنا شدید اختلاف ہے جس کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا یہی اختلاف آگے چل کر روایات کے اختلاف کی صورت میں ظاہر ہوا خیر آمدم بر سر مطلب واضح رہے کہ اسماعیلیہ کے تینوں فرقوں کی طرح امامیہ بھی ائمہ کی تعداد کو خاص تعداد کے ساتھ محدود کرتے ہیں مگر اس حد تعداد میں بھی باہم

۱۔ قال ابن الأثير: «الخدر: ناحية في البيت يترك عليها ستر فتكون فيه الجارية خدرت فيه مخدرة». النهاية: 2/ 13.

مختلف ہیں بعض تعداد پانچ کہتے ہیں[1] اور بعض سات بتاتے ہیں[2] بعض دوسرے آٹھ اور بعض بارہ[3] کے قول ہیں بعض تیرہ کے،[4] غلاۃ ائمہ میں الوہیت مانتے ہیں اور ان میں پہلا نام حضور ﷺ کا پھر حضرت علی حسن حسین رضی اللہ عنہم کا پھر ان کی اولاد میں جو لوگ بخت ہوں جناب جعفر بن محمد رحمۃ اللہ علیہ تک گو سب چھوٹے خدا ہیں، اور دوسرے خداؤں کو ختم کرنے والے پھر ان کی اولاد میں جو نیک بخت ہو وہ ان کا جانشین و نائب ہے۔[5]

غلاۃ ایک فرقہ کہتا ہے کہ اس امت میں امام صرف دو ہیں حضور ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں جو نیابت کے لائق ہو وہ آپ کا نائب اور جانشین ہے۔[6]

حلولیہ کہتے ہیں کہ امام وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ حلول کرے ان کا اختلاف باب اول میں مذکور ہوا۔

کیسانیہ حضور ﷺ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امام مانتے ہیں پھر محمد ابن الحنفیہ کو،[7] کیسانیہ ایک ہی شاخ مختاریہ اس کے قائل ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ امام ہیں پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ پھر ان کے بعد محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ[8] ان میں سے ہر فرقہ اپنے تسلیم کردہ امام سے احکام شرعیہ میں احادیث و روایات نقل کرتا ہے اور ان سب کے متواتر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

کیسانیہ کا پہلا فرقہ کہتا ہے کہ جناب محمد ابن الحنفیہ نے اپنے والد کی وفات کے بعد امامت کا دعویٰ کیا

1۔ وهم الذمية. الفرق بين الفرق: ص238؛ التبصير في الدين: ص 129؛ الملل والنحل: 1/ 176؛ المواقف: ص 673.

2۔ هم فرقة السبعية من الإسماعيلية. اعتقادات فرق المسلمين: ص80؛ تلبيس إبليس: ص125؛ منهاج السنة النبوية: 3/ 481.

3۔ آج کل کے اثنا عشری شیعہ

4۔ ويسمون الجعفرية، فهم يجعلون بعد الحسن العسكري أخاه جعفرا.

5۔ مقالات الإسلاميين: ص 14؛ الفرق بين الفرق: ص 242.

6۔ يشبه قول الزيدية. الملل والنحل: 1/ 29.

7۔ مقالات الإسلاميين: ص 19؛ اعتقادات فرق المسلمين: ص 62

8۔ اعتقادات فرق المسلمين: ص 62؛ الملل والنحل: 1/ 147.

اور ان کے والد ان کی امامت کا حکم دے گئے تھے، اسی کیسانیہ کا دوسرا فرقہ مختار ہوا کہتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد محمد بن علی نے امامت کا دعویٰ کیا اور ان سے متعلق بہت سی خرق عادات کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے دعوی کی تائید میں پیش کی۔

اور سارے امامیہ کہتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد بے شک محمد بن علی علیہ السلام نے امامت کا دعویٰ کیا لیکن آخر میں اپنے دعوی سے رجوع فرما کر اپنے بھتیجے جناب زین العابدین کی امامت کے قائل ہو گئے راوندی نے جناب سجاد علیہ السلام کے معجزات کے بارے میں حسین بن ابی العلاء، اور ابی المضر حمید بن المثنی ہر دو سے روایت کی ہے یہ روایت انہوں نے ابی بصیر سے اور اس نے ابی عبد اللہ سے بیان کی کہ وہ فرماتے ہیں:

جاء محمد بن الحنفية إلى علي بن الحسين فقال: يا علي ألست تقر أني إمام عليك؟ فقال: يا عم لو علمت ذلك ما خالفتك وإن طاعتي عليك وعلى الخلق مفروضة، يا عم أما علمت أن أبي وصي؟ وتشاجرا ساعة فقال علي بن الحسين: بمن ترضى حتى يكون حكما بيننا؟ فقال محمد: بمن شئت. فقال: ترضى أن يكون بيننا الحجر الأسود؟ فقال: سبحان الله! أدعوك إلى الناس وتدعوني إلى حجر لا يتكلم؟ فقال علي: بلى يتكلم، أما علمت أنه يأتي يوم القيامة وله عينان ولسان وشفتان يشهد على من أتاه بالموافاة، فندنو أنا وأنت فندعو الله عز وجل أن ينطقه سبحانه لنا أينا حجة الله على خلقه فانطلقا ووقفا عند مقام إبراهيم ودنيا من الحجر الأسود وقد كان محمد بن الحنفية قال: لئن لم يجبك إلى ما دعوتني إليه إنك إذن لمن الظالمين فقال علي لمحمد: تقدم يا عم إليه فإنك أسن مني. فقال محمد للحجر: أسألك بحرمة الله وحرمة رسوله وحرمة كل مؤمن إن كنت تعلم أني حجة الله على علي بن الحسين إلا ما نطقت بالحق فلم يجبه ثم قال محمد لعلي: تقدم فاسأله فتقدم علي فتكلم بكلام خفي ثم قال: أسألك بحرمة

الله وحرمة رسوله وحرمة أمير المؤمنين علي وبحرمة الحسن والحسين وفاطمة بنت محمد إن كنت تعلم أني حجة الله على عمي لما نطقت بذلك وكلمته به حتى يرجع عن رأيه. فقال الحجر بلسان عربي مبين: يا محمد بن علي اسمع وأطع لعلي بن الحسين لأنه حجة الله عليك وعلى جميع خلقه. فقال ابن الحنفية عند ذلك: سمعت وأطعت وسلمت.[1]

محمد بن حنفیہ علی بن حسین کے پاس آئے اور کہا کہ اے علی کیا تم میری امامت کا اقرار نہیں کرتے ہو بڑے بھائی جان میں اگر صحیح ہوتا تو آپ کی مخالفت کیوں کرتا بلکہ صورت یہ ہے کہ آپ پر اور تمام مخلوق پر میری اطاعت فرض ہے چچا جان آپ کو پتہ نہیں کہ میں اور وصی کا بیٹا بھی غرض کچھ دیر کی بحث بحثی کے بعد علی بن حسین نے کہا کہ تم کس ثالث کو پسند کرو گے وہ ہمارے درمیان ثالثی کرے محمد نے کہا جسے آپ پسند کریں علی نے کہا کیا تم اس پر راضی ہو کہ حجر اسود ہمارا ثالث ہو محمد نے جواب دیا سبحان اللہ میں آپ کو لوگوں کی طرف بلاتا ہوں اور آپ مجھے پتھر کی ثالثی پر بلاتے ہیں جو بول نہیں سکتا علی نے کہا بے شک وہ روز قیامت کے دن اس کی دو آنکھیں ہوں گی ایک زبان اور دو ہونٹ وہ اس کے متعلق گواہی دے گا جو اچھے طریقے کے ساتھ اس کے پاس ہو گا اٹھو اور ہم اس کے پاس چلتے ہیں وہاں اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ وہ گویا ہو کر بتائے کہ ہم میں کون اللہ کی مخلوق پر اللہ کی حجت ہے چنانچہ دونوں نے مقام ابراہیم پر دوگانہ ادا کیا اور پھر حجر اسود کے قریب گیا محمد بن حنفیہ یہ کہہ چکے تھے کہ تم مجھے جس کے پاس لے جا رہے ہو وہ نہ بولا تو تم ظالم قرار پاؤ گے پھر علی نے کہا چچا جان پہلے آپ اس کی طرف بڑھیے کہ آپ باعتبار عمر مجھ سے بڑے ہیں چنانچہ محمد نے حجر اسود سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں اللہ کا رسول اور ہر مومن کی حرمت کو واسطہ ٹھہرا کر تجھ سے پوچھتا

1- دلائل الإمامة لمحمد بن جرير بن رستم الطبري، ص 204، ط مؤسسة البعثة قم

ہوں کہ اگر تو جانتا ہے کہ میں علی بن حسین پر حجت ہوں تو حق بات کیا ہے اور ہمیں ثابت کر دکھا کے کون اللہ کی حجت ہے پھر محمد نے علی سے کہا کہ اب تم آگے بڑھو اور اس سے پوچھو چنانچہ علی نے آگے بڑھ کر پہلے تو کچھ آہستہ سے کہا پھر کہا کہ میں اللہ رسول امیر المومنین علی حسن حسین اور فاطمہ بنت محمد کی حرمت کا واسطہ دے کر تجھ سے پوچھتا ہوں کہ اگر تو جانتا ہے کہ میں اپنے چچا پر اللہ کی حجت ہوں تو ان کو بتاؤ اور ثابت کر دکھا تا کہ وہ اپنی رائے سے رجوع کر لیں اس وقت اجر اسود کو زبان عربی صاف طور پر گواہ ہوا کہ اے محمد بن علی سنو! اور علی بن حسین کی اطاعت کرو کیونکہ وہ تم پر اور اللہ کی سب مخلوق پر اللہ کی حجت ہیں تب محمد بن حنفیہ بول اٹھے میں نے سن لیا اور میں نے اطاعت کی اور میں نے یہ بات تسلیم کی۔

کیسانیہ اس دعوے کی تو تصدیق کرتے ہیں مگر شہادت کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شہادت اس کے الٹ تھی کہ حجر اسود نے محمد بن حنفیہ کے حق میں ان کی دعا پر گواہی دی تھی اور علی بن حسین نے محمد کی امامت مان لی تھی نیز کہتے ہیں کہ علی بن حسین کا طرز عمل اس پر سچا گواہ ہے کہ اس کے بعد وہ امامت کا نام تک اپنی زبان پر نہ لائے اور مکمل خاموشی اختیار کر لی اور اسی سکوت کے امامیہ بھی قائل ہیں۔

محمد بن حنفیہ نے مختار ثقفی اور کوفہ کے شیعوں سے جو اس وقت مروانیوں سے نبرد آزما تھے خط و کتابت کا رابطہ قائم کیا چنانچہ انہوں نے بھی آپ سے تعلقات استوار کر لیے سے رابطہ و میل ملاپ نہیں رکھا حالانکہ دونوں ایک جگہ ہی شہر مدینہ منورہ میں سکونت پذیر تھے اور پھر کوفہ میں شیعوں کے نذرانے بھی محمد کو ہی پہنچائے جاتے نہ کہ علی بن حسین کو اور نہ ہی شیعان کوفہ علی کو اپنے پاس بلاتے تھے۔

قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں لکھا ہے کہ جب محمد بن الحنفیہ نے وفات پائی تو ان کے شیعوں نے ان کے صاحبزادے ابو ہاشم کی امامت کو تسلیم کیا، جو بڑے مرتبہ والے تھے اور شیعہ پہلے ہی سے ان کے معتقد تھے اور مطیع و فرمانبردار تھے خود محمد بن الحنفیہ نے ان کی امامت کے لئے وصیت کی تھی۔

اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ محمد بن الحنفیہ اپنے دعوے سے آخر تک نہیں پھرے تھے، اسی لئے امامت اپنے خاندان کے سپرد کی، قاضی نور اللہ نے محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کا وہ خط بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے

مختار اور کوفہ کے شیعوں کو لکھا تھا جس کی عبارت کچھ یوں تھی "اے مختار مکہ سے کوفہ جا اور ہمارے شیعوں سے کہہ کہ امام حسین (رضی اللہ عنہ) سے خون کا بدلہ لینے کے لئے نکل کھڑے ہوں اور کوفیوں سے (ہماری) بیعت لے "کہتے ہیں کہ جب مختار نے یہ خط کوفیوں کو دکھایا تو کوفہ کے اکثر لوگ سلیمان سے برگشتہ ہو کر منہ موڑ گئے سلیمان نے اپنے شیعوں سے کہا ٹھیک ہے تم بے شک محمد بن الحنفیہ کی حمایت میں خروج کرو کوئی مضائقہ نہیں مگر ہمارے امام تو علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہ ہی ہیں،"[1] لہذا کوفیوں کا سلیمان سے برگشتہ ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے دعوی سے دست بردار نہیں ہوئے تھے۔

اور قاضی نور اللہ، ابوالموید خوارزمی سے بھی جو زیدی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا یہ روایت بیان کرتا ہے کہ مختار ثقفی نے امراء شام سے سر فتح کی خوشخبری اور تیس ہزار دینار کے ساتھ محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کے پاس بھیجے تھے نہ کہ جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس، اور انہوں نے اس فتح کی نعمت کی شکر گزاری میں دوگانہ ادا فرمایا اور شامیوں کے سروں کو سر عام لٹکانے کا حکم دیا مگر جناب ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے ان کو اس سے منع کیا اور فرمایا ان کو دفن کرا دو![2]

اس واقعہ سے یہ بات بالکل عیاں ہو گئی کہ مختار محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ کی امامت کا معتقد تھا اس لئے اس کو اس وقت کوئی خوف و خطرہ نہ تھا، کہ وہ دل سے تو جناب سجاد کی امامت کا معتقد ہوتا اور کسی ضرورت کے تحت بطور تقیہ جناب محمد بن علی کو امام کہتا، اب ذرا قاضی نور اللہ کا ایک دوسرا بیان دیکھئے اور غور فرمائیے کہ اس سے مدعا کیا بر آمد ہوتا ہے وہ مختار کا حال لکھتے ہوئے علامہ حلی کے حوالہ سے کہتا ہے کہ شیعوں کو مختار کی حسن عقیدت میں تو کوئی کلام نہیں، البتہ اس کے بعض ناشائستہ اعمال ان کو قابل اعتراض لگے تو انہوں نے اس کو اعتراضات و مزمت اور سب

1۔ أيها المختار اذهب أنت من مكة إلى الكوفة وقل لشيعتنا اخرجوا واطلبوا ثأر الإمام الحسين، وخذ البيعة من أهل الكوفة. قالوا إن أكثر أهل الكوفة قد تولوا عن سليمان بعد إظهار المختار كتاب محمد ابن الحنفية، فقال سليمان لشيعته: إن خرجتم من قبل محمد بن الحنفية فلا بأس به، ولكن إمامي علي بن الحسين.(بحار الأنوار: 45/ 359)

2۔ عن أبي المؤيد الخوارزمي الزيدي أن المختار أرسل إلى محمد بن الحنفية رءوس أمراء الشام مع كتاب الفتح وثلاثين ألف دينار إلى الإمام علي بن الحسين، وقد صلى هو ركعتين شكرا على هذه الموهبة، وأمر أن يعلقوا رءوس أهل الشام، وقد منعه ابن الزبير من التعليق وأمر بدفنها فدفنوها.(بحار الأنوار: 45/ 386)

وشتم کا ہدف بنایا، اس کی خبر جب جناب باقر رحمۃ اللہ علیہ کو ملی تو آپ نے مختار پر اعتراضات کرنے سے شیعوں کو منع کیا اور کہا کہ اس نے ہمارے قاتلوں کو موت کے گھاٹ اتارا، اور ہمیں روپیہ پیسہ بھی بھیجا۔[1]

یہاں عقلمندوں کو غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہنچنے میں کوئی دقت نہیں کہ اس کا واضح اور صاف مطلب یہی ہے کہ اگر کوئی امام وقت کا منکر ہو تو یہ مناسب نہیں کہ اس کی دیگر خدمات اور خاندان سے دلی محبت کو نظر انداز کر کے اس کو برا بھلا کہا جائے۔

اب رہیں اس کی ذاتی بداعمالیاں جو اس سے سرزد ہوتی رہی ہیں تو ان کی پردہ پوشی ہی طریق احسن ہے اس نتیجہ سے پیش نظر کہنے والی بات یہ ہے کہ اہل سنت کا بھی تو یہی مذہب ہے وہ بھی حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے متعلق یہی کہنا چاہتے ہیں کہ گو وہ امام وقت کی امامت کے منکر تھے مگر بایں ہمہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتے تھے اللہ ورسول کے دشمنوں سے قلع وقمع کی خاطر مصروف جہاد رہتے تھے اللہ کے نام کا بول بالا کرنا ان کی زندگی کا مقصد تھا، رسول اللہ کے اہل بیت کی روپیہ پیسے سے اعانت کرتے تھے، حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو داد و دہش میں کبھی دریغ نہیں کیا تو ان پر زبان درازی کا کیا جواز رہا۔

بات پھر دور نکل گئی اور بات سے بات نکل آئی تو ہم کہتا ہے تھے کہ کیسانیہ ان شواہد ودلائل کی بنا پر یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ جناب محمد بن علی الحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ دعویٰ امامت سے پھر گئے تھے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

کیسانیوں نے جناب محمد بن علی کی کرامات کا اتنا طومار روایت کیا ہے کہ جو حدود تصورات سے بھی ماوراء اور قیاس وعقل سے بھی باہر ہیں، اور پھر ان سب کو متواتر بھی خیال کرتے ہیں وہ یہ بات بھی کہتے ہیں کہ جناب محمد بن علی کے بعد آپ ہی کی ہدایت وحکم سے آپ کے بیٹے ابو ہاشم امام ہوئے البتہ ان کے بعد باہم اختلاف ہو گیا کہ کون امام ہے، یہ سب تفصیلات باب اول میں بیان ہو چکیں۔

زیدیہ فرقہ کہتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہم امام ہوئے وہ علی بن

---

1 ـ عن أبي عبد الله أنه قال: «لا تسبوا المختار فإنه قتل قتلتنا، وطلب بثأرنا، وزوج أراملنا، وقسم فينا المال على العسرة». رجال الكشي: ص 125؛ رجال ابن أبي داود: ص 513.

حسین ؒ کی امامت کے قائل نہیں ان کے نزدیک تو "مارے سو میر" کے مصداق جو تلوار لے کر میدان میں آجائے وہی امام ہے، یہی ان کے ہاں شرط امامت ہے سکوت اور تقیہ چونکہ اس کے خلاف ہے، اس لئے وہ کسی گوشہ نشین اور تقیہ پر عامل کو امام تسلیم نہیں کرتے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جناب زید اپنے باپ، دادا، اور جناب امیر المومنین ؓ سے اپنی امامت کے متعلق نصوص اور بشارات بھی نقل کیا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض روایات کو وہ متواتر بھی بتاتے ہیں۔

جناب زید بن علی ؒ امامیہ کے تمام معتقدات سے انکار اور ان کی تردید کیا کرتے تھے اور اس انکار کی روایات امامیہ اور خود زیدیہ بھی نقل کرتے ہیں ہشام کے قصہ میں بحوالہ کلینی اس کی نقل اوراق ماسبق میں بیان ہو چکی ہے، باقریہ فرقہ کا یہ اعتقاد ہے کہ امام باقر مہدی موجود ہیں وہ حی لایموت ہیں اور نظروں سے اوجھل ہیں۔

ناؤسیہ فرقہ یہی اعتقاد جناب جعفر صادق ؒ کی نسبت رکھتے ہیں، اور آپ سے یہ متواتر روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

لو رأيتم رأسي تدهده – أي تدحرج – عليكم من هذا الجبل فلا تصدقوا، فإن صاحبكم صاحب السنين[1]

تم میرے سر کو اس پہاڑ سے لڑھکتا ہوا اپنے پاس آتا دیکھو تو بھی اس کی موت کا یقین نہ کرو کیونکہ تمہارا صاحب، سردار، امام بہت طویل عمر والا ہے۔

اسمعیلیہ، جناب اسمعیل بن جعفر صادق ؒ کے متعلق جناب جعفر صادق ؒ کی یہ ہدایت بتواتر روایت کرتے ہیں کہ " أن هذا الأمر في الأكبر، ما لم تكن به عاهة"[2] یہ امر امامت بڑے بیٹے کو پہنچتا ہے جب تک اس میں کوئی خرابی رونما نہ ہو، اور جناب موسیٰ کاظم ؒ کے دعویٰ امامت کو جھٹلاتے ہیں،

1۔ الصراط المستقيم إلى مستحقي التقديم، 2/ 271، ط: مطبعة الحيدري

2۔ الأصول من الكافي،1/ 285، دار الكتب الاسلامية

اور انہیں برائی سے یاد کرتے ہیں کہ انہوں نے نص متواتر کے خلاف کیا جس طرح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کیا۔

قرامطہ جناب اسماعیل کے بعد ان کے بیٹے محمد کو امام مانتے ہیں مگر افطحیہ جناب صادق کے بعد عبد اللہ بن جعفر کو امام بلا فصل مانتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ وہ اسمٰعیل کے حقیقی بھائی تھے اور یہ بھائی جب جناب صادق کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تو چونکہ نص اسماعیل کے حق میں تھی لا محالہ باپ کی وفات کے بعد بطریق میراث اس نص کا مصداق حقیقی بھائی ہوا نہ کہ سوتیلے بھائی اور اسماعیل وعبد اللہ کی والدہ فاطمہ بنت حسین بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم تھیں لہذا دونوں بھائی دونوں جانب سے حسینی سید تھے۔

موسویہ کہتے ہیں کہ جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ کی نص وہدایت کے مطابق آپ کے بعد جناب موسیٰ کاظم امام ہیں۔

ممطوریہ آپ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ حی لایموت ہیں اور قائم منتظر بھی وہی ہیں، اور ثبوت میں جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے یہ نص متواتر نقل کرتے ہیں:

"سابعهم قائمهم سمي صاحب التوراة"(1)

ان کا ساتواں ان میں قائم ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہم نام ہے۔

اثنا عشریہ نے جناب حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ کی امامت پر اتفاق کیا ہے ان کے بعد جعفریہ (فرقہ) نے جناب جعفر بن علی کو امام مانا ہے، یہ کہتے ہیں کہ جناب حسن عسکری لاولد تھے دلیل یہ ہے کہ آپ کی میراث جعفر بن علی نے لی یہ بالاجماع ثابت ہے اگر ان سے کوئی بیٹا ہوتا تو جعفر کو کیسے پہنچتی! مگر بعض کہتے ہیں کہ جناب حسن عسکری کے بیٹا تھا جو باپ کی زندگی میں کمسن فوت ہو گیا کلینی نے زیاد بن اعین سے بحوالہ ابی عبد اللہ روایت کی ہے:

أنه قال لا بد للغلام من غيبة. قلت: ولم؟ قال: يخاف! قلت: وما يخاف؟ فأومأ بيده إلى بطنه.(2)

1۔ الملل والنحل للشهرستاني، 1/ 168، ط: دار المعرفة بيروت لبنان

2۔ الأصول من الكافي، 1/ 338، ط: دار الكتب الاسلامية

آپ نے کہالڑکے کے لئے غائب رہنا ہی ضروری ہے میں نے کہا کیوں؟ آپ نے کہا خوف کھاتا ہے میں نے کہا کس بات سے ڈرتا ہے؟ آپ نے جواب میں اپنے ہاتھ سے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

اثنا عشریہ نے اس اشارہ کا مطلب سمجھا کہ لوگوں کو ان کی ولادت میں شک پڑ جائے گا، بعض کہیں گے کہ حمل ساقط ہو گیا بعض کہیں گے سرے سے حمل تھا ہی نہیں، لیکن عقلمند سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ "مایخاف" کے جواب میں اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کرنا ان کے سمجھے ہوئے معنی کو صاف طور پر غلط بتارہا ہے اس لئے کہ پیٹ کے بچہ کو خوف نہیں ہوا کرتا اور اگر ہو بھی تو اس سے لوگوں کا اختلاف دور نہیں ہوتا۔[1]

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ بیان کرنے کا مقصد کہ ان کے فرقے آپس میں مختلف ہیں، اور ہر ایک اپنی من مانی بات پر تواتر کا مدعی ہے یہ ہے کہ ان کے جھوٹ اور افترا پر دلیل وحجت قائم کی جائے! اگر ایک ہی فقہ کی خبر متواتر ہوتی تو یہ اختلاف ہرگز رونما نہ ہوتا خصوصاً جناب محمد بن حنفیہ نہ جناب زین العابدین سے جھگڑتے، نہ حجر اسود کی ثالثی تک نوبت پہنچتی نہ جناب زید بن علی کو جناب باقر سے نہ جناب جعفر بن علی کو جناب محمد بن مہدی سے کوئی پرخاش ہوتی کیونکہ اہل بیت ہی اپنے اندرونی معاملات کو زیادہ جانتے ہیں، یہیں سے عقلمند کو یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ ان تمام فرقوں کے جھوٹ کو سمجھے اور یہ جان لے کہ یہ سب کچھ اس فرقہ کی افترا پردازی ہے کہ ہر وقت کی مصلحت کے مطابق ایک امام اپنے خیالات کے مطابق مقرر کر لیا کرتے اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے تھے کہ اپنے بنائے ہوئے امام کی آڑ میں اپنے پیروکاروں سے خمس، نذرونیاز اور فتوح وصول کیا کریں اور عیش آرائیں اور بعد والے اپنی اندھی تقلید کی وجہ سے گمراہی کے بھنور میں جاگرے، سچ ہے:

"إِنَّهُمْ أَلْفَوْا آبَاءَهُمْ ضَالِّينَ ، فَهُمْ عَلَى آثَارِهِمْ يُهْرَعُونَ"[2]

انہوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا پس وہ ان ہی کے قدموں پر دوڑے چلے جاتے ہیں۔

1۔ أخرج ابن بابويه أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: «لا بد للغلام من غيبة، فقيل له: ولِمَ يا رسول الله؟ قال: يخاف القتل». علل الشرائع: 1/ 243.

2۔ سورة الصافات ، الاية : 69، 70

باب ہشتم

متعلق آخرت

امور معاد میں کتاب وسنت سے شیعی مخالفت

عقیدہ نمبر 1: بعض فرق شیعہ کا حشر اجساد سے انکار

مرنے کے بعد اجسام وارواح کے لئے ایک اور عالم، عالم آخرت در پیش ہو گا، جہاں سب حساب و کتاب جزاو سزا، ثواب وعقاب کے لئے جمع کئے جائیں گے اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے۔[1]

مگر شیعوں کے بہت سے فرقے مثلاً زرامیہ، کاملیہ، منصوریہ، حمیریہ، باطنیہ، قرامطہ، جناحیہ، خطابیہ، معمریہ، میمونیہ، مقنعیہ، خلفیہ اور جنابیہ کہتے ہیں کہ حشر اجساد بالکل نہیں ہو گا اور نہ ہی ارواح کے لئے موجودہ عالم کے سوا کوئی اور ٹھکانہ ہے بلکہ ان کا اسی عالم دنیا میں تناسخ الٹ پھیر اور لوٹ پلٹ ہوتی رہتی ہے اور وہ ایک بدن سے دوسرے بدن میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

ان کے اس عقیدہ کی تردید و مخالفت، کتاب اللہ، انبیاء کرام علیہم السلام کی نصوص اور ائمہ کے کلام سے اتنی ظاہر و باہر ہے کہ محتاج بیان نہیں، کتاب اللہ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں:

فَإِذَا هُمْ مِنَ الْأَجْدَاثِ إِلَى رَبِّهِمْ يَنْسِلُونَ[2]

پس وہ اچانک قبروں سے اٹھ کر اپنے رب کی طرف بڑھیں گے۔

سَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ[3]

جب یہ سوال اٹھائیں کہ ہم کو کون لوٹائے گا تو آپ کہہ دیجئے وہی جس نے تمہیں پہلی دفعہ پیدا کیا۔

1۔ والبعث حق ثابت دل عليه الكتاب والسنة وإجماع المسلمين، وهو مقتضى الحكمة، حيث تقتضي أن يجعل الله تعالى لهذه الخليقة ميعاداً يجازيهم فيه على ما شرعه لهم (حصول المأمول بشرح ثلاثة الأصول، 1/ 189، ط: مكتبة الرشد)

2۔ سورة يسين، الاية: 51

3۔ سورة الاسراء، الاية: 51

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ،قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ[1]

ہم پر اعتراض کرتا ہے اور اپنی اوقات بھول گیا کہتا ہے بوسیدہ ہڈیوں میں کون جان ڈالے گا آپ کہہ دیجئے وہی ان کو زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔

ثُمَّ إِلَى رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ[2] پھر اپنے رب کی طرف اکٹھے کئے جاؤ گے!

"وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ"[3] اور اسی کی طرف لوٹو گے۔

قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ،لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا وَمِنْ وَرَائِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ[4]

اے میرے رب مجھے دوبارہ دنیا میں لوٹا دے تاکہ جو ادھورے کام چھوڑ آیا ہوں ان کو تیری پسند کے مطابق انجام دے سکوں، ہرگز نہیں، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، اب تو قیامت تک اس عالم کے درمیان پردہ حائل ہو چکا۔

اس غلط اور فاسد عقیدہ میں ان فرقوں کا استدلال وتمسک ان چیزوں سے ہے جو انہوں نے فلسفیوں سے سیکھی ہیں حالانکہ شریعت کے نزدیک وہ قطعاً غلط اور سراسر بے بنیاد ہیں، مثلاً آسمان کی کرویت (کمرہ کی شکل) اور خلا کا محال ہونا، مزید یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر اس موجودہ عالم کی طرح کا کوئی دوسرا عالم بھی ہوگا تو لا محالہ وہ بھی کروی شکل کا ہوگا اور ایک جیسے دو کرے باہم چسپاں نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ ان کے درمیان فاصلہ ہو، اور فاصلہ ہونے کی صورت میں خلا لازم ہے (جو فلاسفہ کے نزدیک محال ہے)

1۔ سورۃ یسین، الایۃ : 78

2۔ سورۃ الجاثیۃ، الایۃ : 15

3۔ سورۃ البقرۃ، الایۃ : 245

4۔ سورۃ المومنون، الایۃ : 99، 100

اس استدلال میں ان کو کئی جگہ غلطی لگی اور دھوکہ ہوا ہے پہلی بات تو یہ کہ کیا ضروری ہے کہ عالم پورے کا پورا کرہ ہو اسلئے کہ وہ ہندسی دلائل جو کرویت پر قائم کئے گئے ہیں افلاک متحرکہ کی کرویت کے ساتھ مخصوص ہیں، ہو سکتا ہے یہ افلاک متحرکہ پورے عالم کا ایک حصہ ہوں، دوسری بات یہ ہے کہ خلاء سے محال ہونے کا دعوی ناقابل تسلیم ہے کیونکہ اس پر جتنی بھی دلیلیں بیان کی گئی ہیں سب پر کوئی نہ کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ اگر ہم دو کروں کو اوپر نیچے یا برابر رکھیں تو البتہ فاصلہ ضرور ہو گا لیکن اگر ایک کرہ دوسرے کرہ کی موٹائی میں دھنسا ہوا گڑھا ہوا یا سمایا ہوا ہو جس کی موٹائی ایک دوسرے کے برابر ہو اور اسکا قطر ان کے قطر کے برابر یا اس کی موٹائی اور قطر ان کی موٹائی اور قطر سے زائد ہوں، جیسا کہ فلاسفہ کے نزدیک تدویرین افلاک خوارج کی موٹائی میں گڑھی ہوتی ہیں تو فاصلہ ہرگز لازم نہیں آتا اس لئے کہ فاصلہ کی جگہ تو گھیرنے والے کرہ کی موٹائی سے بھری ہوئی ہے۔

خود فلاسفہ یہ کہتے ہیں کہ مریخ کی تدویر کا قطر مثل سورج کے قطر سے بڑا ہے لہذا ہو سکتا ہے کہ عالم کے یہ سب کرات جو ہم کو معلوم ہیں اپنی جگہ خود ایک ہی کرہ ہوں جو کسی دوسرے کرہ کی موٹائی میں سمائے ہوئے ہیں اور یہی حال دوسرے عالم کا بھی ہو۔

چوتھی بات یہ کہ کیا ضروری ہے کہ معاد کا عالم، اس عالم جیسا دوسرا ہی ہو، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی عالم میں تغیر و تبدل ہو جائے کل عناصر ناریت میں بدل جائیں اور افلاک سب کے سب باغ و بہشت کی شکل میں اسی عالم میں فلکی اور عنصری مادے دوسرا رنگ اور دوسری صورت میں ظاہر ہو جائیں کہ مرکبات کانیں، نباتات، حیوانات اور انسان افلاک میں پیدا ہوں گویا ہر آسمان باغ و بہشت بنے اور زمین دوزخ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَاوَاتُ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (1)

جس دن یہ زمین دوسری زمین و آسمانوں میں بدل دی جائیگی اور اللہ واحد و غالب کے حکم سے مردے نکل آئیں گے۔

1۔ سورۃ ابراھیم، الآیۃ: 48

اور حشر نشر سے پہلے جنت و دوزخ کا وجود، انبساط و امتداد کے منافی نہیں ان کی کیفیات اس وقت بھی ایسی ہی ہوں گی جیسی اب ہیں۔

عقیدہ نمبر 2: بعث بعد الموت اللہ تعالیٰ پر واجب ہے

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پر بندوں کو اٹھانا واجب نہیں کہ اس کے ترک پر کوئی عقلی قباحت لازم آئے ،ہاں اس نے چونکہ اس کا وعدہ کیا ہے اس لئے وعدہ کے مطابق ان کا اٹھانا اور جمع کرنا ایک ہونے والا، اور وقوع میں آنے والا واقعہ ہے تاکہ وعدہ خلافی لازم نہ آئے یہی اہل سنت کا عقیدہ و مذہب ہے!

مگر امامیہ کہتے ہیں کہ بندوں کا اٹھانا از روئے عقل اللہ تعالیٰ پر واجب اور ضروری ہے، حالانکہ بہت سی آیات صاف طور پر دلالت کرتی ہیں کہ بعث و معاد وعدہ الٰہی سے وابستہ ہیں اور پھر ایسی آیات کے آخر میں "ان اللہ لا یُخلف المیعاد"[1] (کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا) یا اسی طرح کی اور عبارات کا آنا ان کے عقیدہ کی کھلی تکذیب کرتی ہیں۔

اور الٰہیات کی بحث میں یہ گذر چکا ہے کہ خدا تعالیٰ پر کسی چیز کا واجب ہونا بے معنی سی بات ہے، امامیہ اس مسئلہ میں بھی چند ناقص عقل گدے اڑاتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اوامر و نواہی کا مکلف کیا ہے تو اگر طاعت پر ثواب نہ دے اور نافرمانی پر عقاب میں نہ جکڑے تو ظلم لازم آتا ہے اور ظلم ہر ایک ہی کے لئے قبیح اور برا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے لئے تو قبیح تر ہوگا، اور ثواب و عقاب بعث کے بغیر متصور نہیں تو لامحالہ اللہ تعالیٰ پر بعث واجب ہوا، ان کا یہ استدلال بھی بچند وجوہ ظاہر البطلان ہے:

اول یہ کہ خالق و مالک کے متعلق ظلم کی نسبت کا تصور ہی غلط ہے اس لئے کہ وہ اپنی ملک میں جس طرح کا چاہیے تصرف کرے اسے حق ہے اور اسے ظلم نہیں کہہ سکتے؟

دوسرے جن سے ظلم کا تصور ہو سکتا ہے مثلاً مالکان مجازی ان کے حق میں بھی فرمانبرداری پر انعام نہ دینا ظلم نہیں کہہ سکتے مثلاً ایک آقا اپنے غلام کو معاشی ضروریات سے بے پرواہ کرتا ہے اور اس سے کام بھی اس

1۔ سورۃ ال عمران، الآیۃ: 09

کی طاقت کے مطابق ہی لیتا ہے اب وہ غلام جو کام انجام دیتا ہے وہ اس کا فرض منصبی ہے اب اگر وہ اس سے وہ انعام مانگے تو دنیا کا کون عقلمند کہے گا کہ مالک پر انعام دینا واجب ہے وہ انعام نہ دے تو کوئی اسے ملامت نہیں سکتا، اسی طرح معصیت اور گناہ پر بالکل ہی باز پرس نہ کرنا تو ظلم ہو ہی نہیں سکتا بلکہ وہ تو عفو و احسان یا اپنا حق معاف کر دینا کہلاتا ہے اس کو ظلم خیال کرنے والا تو بیوقوف ترین بلکہ عقل سے پیدل ہی ہو گا۔

پھر البیات کے بیان میں جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ اور جناب سجاد رحمۃ اللہ علیہ سے بطریق تواتر یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ "اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار بندہ کو سب سے سخت کافر والا عذاب بھی دے دے تو وہ عدل ہے ظلم نہیں"[1] حاصل کلام یہ کہ شیعہ حضرات اس مسئلہ میں بھی حسب عادت دو ستور افراط و تفریط میں پھنس گئے کہ امامی افراط کے راستہ پر پڑ گئے کہ اللہ تعالیٰ پر بعث و معاد واجب کہنے لگے اور دوسرے فرقے جن کا ذکر باب اول میں ہوا تفریط کی راہ میں بھٹک کر سرے سے معاد کا ہی انکار کر دیا اور استدلال دونوں ہی کا عقلی ناقصات پر مشتمل ہے، امامیہ کا حال تو آپ ابھی پڑھ چکے اب ان دوسروں کی بھی سنیئے:

یہ کہتے ہیں کہ بعث و معاد اگر واقع ہو تو مومن صالح کے بعض یا کل بدنی اجزاء کو عذاب دینا یا کافر کے بعض یا کل اجزائے بدنی کو نعمت سے نوازنا لازم آتا ہے حالانکہ یہ عقل و شرع دونوں کے خلاف ہے، اور اس لزوم کی صورت یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے کسی آدمی کو بطور غذا کھا لیا حتیٰ کہ اس غذا سے نطفہ بنا، اور اس نطفہ سے بچہ پیدا ہوا اب اس بچے کے اجزائے بدنی کو یا عذاب دیا جائے گا یا انعام سے نوازا جائے گا عذاب کی شکل میں اجزائے غذائی عذاب سے متاثر ہوں گے اور نعمت کی صورت میں نعمت سے جو پہلی صورت میں عذاب کے مستحق نہ ہوں اور دوسری صورت میں نعمت کے.

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ کھانے والے کے بدن کو اس مدت تک

1 ـ عن علي بن إبراهيم، عن أبيه، عن ابن أبي عمير، عن هشام بن سالم، عن أبي عبد الله عليه السلام قال: إن الله عز وجل لا يجور على خلقه، ولو عذب أهل الأرض جميعا لم يكن جائرا، ولو أدخلهم الجنة جميعا لم يكن ذلك منه جورا، ولكنه تبارك وتعالى يفعل ما يشاء ويحكم ما يريد.(الاصول من الكافي، كتاب التوحيد، باب المشيئة والإرادة، 1/ 159، ط: دار الكتب الاسلامية تهران)

تحلیل ہونے سے محفوظ رکھے جب تک اجزائے غذا بالکل فضلہ ہو کر نہ نکل جائیں یا کھانے والے کو اتنی مدت تک نامرد
کر دے کہ اس سے نطفہ پیدا ہی نہ ہو، اور اگر پیدا ہو تو احتلام یا کسی اور طرح نکل جائے اور اس بچہ سے متعلق ہی نہ ہو۔

پھر ایسے شخص کا وجود کہ اس نے مدت دراز تک انسان کا گوشت کھایا ہو اور اس سے لڑکا بھی پیدا ہو گیا کسی دلیل سے معلوم، خالی خولی امکانی ہوائیوں سے کام تو نہیں چلتا کیونکہ یہ دلیل معارضہ کی شکل میں ہے (دوسرے کی دلیل کو کاٹنا معارضہ کہلاتا ہے) اور معارضہ کو دلیل چاہیئے احتمال اس کو کافی نہیں اور وقوع ممنوع ہے یہ طریق دلیل بازی (جدل) ہے، تحقیق کلام یہ ہے کہ بدن انسانی کے بعض اجزاء غذا نہیں بن سکتے، جیسے روح ہوائی کہ عرف عام میں اسی سے نکل جانے کا نام موت ہے یہ جزو بدن ہونے کے باوجود غذا نہیں بن سکتی اس میں کسی طرح کا تصرف نہیں ہو سکتا اور نہ یہ کسی دوسرے بدن کا جز بن سکتی ہے اور پھر بہت سے غذائی اجزاء کھانے سے پہلے ہی بطریق تحلیل جدا ہو کر چلے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ سارے اجزاء ایک دوسرے سے ممتاز ہیں بوقت حشر ان سب کو جمع کر کے روح ہوائی کا کنکشن ان سے جوڑ کر ان کو انسانی بدن کی شکل میں تبدیل فرمادے گا۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ دکھ سکھ کا اصلی تعلق روح سے ہے اس لئے عذاب سے وہی دکھ پاتی ہے اور نعمت سے لطف اندوز ہوتی ہے، بدن کا واسطہ البتہ ضرور ہوتا ہے اور بدن بغیر روح کے ایک پتھر ہے، اسی لئے اس کا دکھ پانا یا لطف اندوز ہونا متصور نہیں اور دکھ دینے یا لذات پہنچانے میں ہمارا بدن کافی ہے، لہذا اگر اس کا پہلا بدن باقی ہے اور اس کو ثواب وعقاب کا مورد بنانے میں کوئی قباحت نہیں تو اسی بدن پر اکتفا کیا جائے گا اور نہ دوسرا بدن پیدا کیا جائے گا، اب وہ خواہ پہلا ہی بدن ہو یا وہ ہو جو کھانے والے کے کھانے سے پہلے خلل پذیر ہو چکا تھا، پھر اس پر ثواب وعقاب ہو گا۔

یہ شکل تناسخ کی نہیں ہے کیونکہ تناسخ کا تو یہ مطلب ہے کہ دنیاوی ابدان میں روحیں بطلب کمال منتقل ہوتی رہتی ہیں اور یہاں بحث اس بدن کی ہے جو آخرت میں جزا و سزا کے لئے پیش ہو گا اسی لئے بعینہ بدن کی حفاظت جزا کے لئے ضروری نہیں کیونکہ ابدان میں زیادتی و کمی کے ساتھ گھٹنا، بڑھنا احادیث متواترہ سے ثابت ہے بلکہ قرآن کی نصوص سے بھی ثابت ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ[1]

جب ان کی کھالیں جل جایا کریں گی تو ہم ان کی کھالیں بدل دیں گے تا کہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔

مشاہدات میں اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ ایک شخص سے لباس پوشی کی حالت میں کوئی جرم سرزد ہوا اور وہ اسی حالت میں گرفتار ہو گیا تو وہ اسی حال میں سزا پائے گا لیکن اگر گرفتاری کے وقت وہ بے لباس عریاں تھا تو بقدر ستر عورت اس کے بدن پر لباس ڈال کر سزا دیں گے گویا روح سے بدن کی نسبت ایسی ہے جیسے کسی شخص کی لباس کی نسبت ہے:

وہ مبدم گر شود لباس بدل   شخص صاحب لباس راچہ خلل

لباس اگر بار بار بھی بدلا جائے تو اس سے صاحب لباس کی شخصیت میں کیا فرق پڑے گا۔

اسی لئے عرف میں بچپن سے لے کر بڑھاپے تک باوجود اجزاء بدن کے بدل جانے اور باوجود امراضیا شخصی محنت ومشقت کے سبب خلل پذیر ہونے کے وہ شخص باقی رہتا ہے اور کسی کے دل میں یہ وہم تک نہیں آتا کہ بوڑھا وہ نہیں ہے جو ستر سال پہلے بچہ تھا، پھر باوصف ان تبدیلیوں کے، انعام وعقاب کے احکام اس پر بلا کسی انکار کے بدستور جاری رہتے ہیں، بعضے امامی اپنے مذکورہ دعویٰ پر ان آیات سے دلیل لاتے ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ آخرت میں جزا اعمال سے وابستہ ہے مثلاً:

جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ[2] یہ ان عملوں کا بدلہ ہے جو وہ کیا کرتے تھے۔

الْيَوْمَ تُجْزَى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ[3]

جس دن ہر نفس کو اس کے عمل کے سبب بدلہ دیا جائے گا، اس دن ظلم بالکل نہیں ہو گا۔

1۔ سورۃ النساء، الایۃ: 56

2۔ سورۃ السجدۃ، الایۃ: 17

3۔ سورۃ غافر، الایۃ: 17

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ[1]

جو ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ بھی اس کی نظر کے سامنے ہوگی۔

یہ آیات ثبوت میں پیش کر کے بعض امامیہ کہتے ہیں کہ ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ جزاء کا سبب عمل ہے، تو گویا مطیع و فرمانبردار کو ثواب اور نافرمان کو گناہ کے بدلے عذاب دینا واجب ہوا۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ گو آیات جزاء کے وقوع پذیر ہونے اور اعمال پر ثواب و عقاب مرتب ہونے پر تو دلالت کرتی ہیں، مگر خدا تعالیٰ پر اس وجوب کو کسی طرح بھی نہیں بتاتیں، مثلاً کوئی شخص کسی کو نہ تو باقاعدہ نوکر رکھتا ہے اور نہ اس کی خدمت و تقصیر پر باقاعدہ کوئی قول و قرار کرتا ہے ایسی صورت میں اگر وہ خدمت پر انعام یا تقصیر پر سزا دے تو یہ تو کہا جائے گا کہ اسے انعام یا سزا اس کی خدمت یا تقصیر کے بدلہ میں ملی مگر یہ دونوں باتیں نوکر رکھنے والے پر کسی قاعدہ سے بھی واجب نہیں کہی جائیں گی۔

اور دوسری بات یہ کہ اگر گناہوں پر سزا دینا واجب ہوتا تو گناہ کبیرہ کے سلسلے میں یہ وجوب ہو سکتا تھا مگر نص قرآنی میں وقوع کے اعتبار سے اس کے واجب نہ ہونے کی خبر دی گئی ہے چہ جائیکہ اس سے عقلی وجوب کی بات کی جائے۔

إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ.[2]

اللہ کے ساتھ جو شرک کی ہے اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت نہیں کرے گا ہاں اس کے علاوہ جس کی چاہے گا مغفرت فرمادے گا۔

عقیدہ نمبر 3: عذاب قبر کا انکار

کہ عذاب قبر حق ہے اہل سنت کا یہی مسلک ہے مگر شیعوں کے اکثر فرقے حتی کہ زیدیہ بھی عذاب قبر سے انکاری ہیں حالانکہ قرآن مجید کی بہت سی آیات قبر کے عذاب اور اس کی راحتوں پر دلالت کرتی ہیں

1۔ سورۃ الزلزلۃ، الآیۃ: 7

2۔ سورۃ النساء، الآیۃ: 48

جیسے فرمایا گیا "مِمَّا خَطِيئَاتِهِمْ أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا"[1] اپنے گناہوں کی بدولت غرق کیے گئے اور پھر دوزخ میں ڈالے گئے۔

اور حرف "فا" ایک چیز کے بلا وقفہ بعد میں آنے کو بتاتا ہے اور صیغہ جو کہ ماضی کا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ڈوبتے ہی بلا وقفہ وفاصلہ کے وہ زمانہ ماضی میں دوزخ میں ڈالے گئے۔

النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا[2] صبح وشام ان کا سامنا سابقہ آگ سے پڑتا ہے۔

اس آیت میں عذاب قیامت کا عطف اس پیش ہونے والے عذاب پر مدعا کی صداقت پر صاف دال ہے، اور حضور اکرم ﷺ نیز آئمہ سے اخبار احادیث بطریق تواتر اس سلسلہ میں موجود ہیں، اسی طرح قبر کی نعمتوں اور راحتوں کا ذکر بھی بہت سی آیات میں آیا ہے مثلاً:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ[3]

جو اللہ کے راستے میں قتل کیے گئے ان کو مردہ مت کہو بلکہ وہ تو زندہ ہیں ان کے رب کی طرف سے انہیں رزق ملتا رہتا ہے۔

یا ارشاد ہوا: بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ[4]

کاش میری قوم کو معلوم ہو جاتا کہ میرے خدا نے میری مغفرت فرمادی اور مجھے عزت داروں میں سے بنا دیا۔

یہ واقعہ یقیناً قیامت سے پہلے کا ہے کیونکہ قیامت کے دن تو ہر ایک ہی کو اس کا حال اور اس کی مغفرت اور اعزاز و اکرام معلوم ہو جائے گا قبر کی جزا و سزا کے منکر بطور دلیل سمعی و عقلی یہ آیت پیش کرتے ہیں:

1۔ سورۃ نوح، الآیۃ: 25

2۔ سورۃ غافر، الآیۃ: 46

3۔ سورۃ آل عمران، الآیۃ: 169

4۔ سورۃ یسین، الآیۃ: 27

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ[1]

انہیں موت کا مزہ قبر میں پہلی موت ہی کے وقت چکھنا ہو گا۔

کہ اگر قبر میں زندگی ہوتی تو لازما اس زندگی کی موت بھی ہوتی کیونکہ قیامت کے دن زندہ کئے جانے کا ثبوت تو بالاجماع ہے تو اس صورت میں دو موتوں کا مزہ چکھنا ظاہر ہوتا ہے حالانکہ قرآنی آیت میں ایک ہی موت کے مزہ کا ذکر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قبر کی زندگی و موت حقیقی طور پر متحقق نہیں بلکہ روح و جسم کے ایک تعلق کا نام ہے کہ روح جب اس بدن پر اپنی شعاعیں ڈالتی ہے تو بدن سے ربط قائم ہو جاتا ہے اور قبر سے مناسب ماحول میں بدن کو تازگی ملنے لگتی ہے، ایسی زندگی نہیں جیسی دنیا میں تھی کہ وہاں بدن غذا کھاتا اور بڑھتا تھا بلکہ وہ تعلق مثال کے طور پر ایسا ہوتا ہے جیسا محب و محبوب کا یا آقا و غلام کا یا گھر والے اور گھر کا، اور اتنا تعلق رنج پہنچانے یا راحت دینے میں کافی ہوتا ہے اور یہ صورت بھی اس وقت ہوتی ہے جب قبر میں بدن صحیح و سالم موجود ہو اور اسے دفن کیا گیا ہو ورنہ عذاب و عیش سب روح کا ہو گا،[2] یعنی نفس مجرد کا کہ اس کا حقیقی بدن روحی ہوائی ہے جس کا تعلق دوسرے کسی

1۔ سورة الدخان، الآیة : 56

2۔ قبر کا ثواب و عذاب قرآن مجید کی متعدد آیات اور احادیث نبویہ سے ثابت ہے اور اس سلسلے میں اتنی حدیثیں وارد ہوئی ہیں کہ بعض محدثین نے ان کو معناً متواتر قرار دیا ہے، اور اہل اسلام کا شروع دور سے یہ متفقہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ قبر میں نیکوکاروں کو ثواب اور بدکاروں کو عذاب ہوتا ہے، اس پر اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے، اور یہ عقیدہ در حقیقت عقیدۂ آخرت کا تکملہ و تتمہ ہے، جو اسلام کا بنیادی و اساسی عقیدہ ہے۔
انسان کے مرنے کے بعد اس کا تعلق اس ظاہری اور دنیوی عالم سے نہیں رہتا، بلکہ اس کا تعلق ایک اور عالم سے ہو جاتا ہے، جس کو عالم برزخ (اور عرف عام میں عالم قبر) کہتے ہیں، اور قبر سے مراد صرف مٹی کا گڑھا نہیں ہوتا، بلکہ انسان کا جسم مرنے کے بعد جہاں چلا جائے وہی اُس کی قبر ہے، اسی مناسبت سے عموماً عالم برزخ کے عذاب کو "عذاب قبر" سے تعبیر کیا جاتا ہے، الغرض مردہ دنیا میں ہوتے ہوئے بھی دنیوی عالم میں نہیں ہوتا، بلکہ اس دوسرے عالم میں ہوتا ہے اور اس دوسرے عالم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے عام انسانوں سے مخفی رکھا ہوا ہے؛ لہٰذا اس پر اچھا یا برا جو کچھ گزرتا ہے، اس کا اس دنیا میں مشاہدہ عام طور پر نہیں ہوتا، لیکن ہمارے نہ دیکھنے یا محسوس نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مردے کو تکلیف یا راحت محسوس نہیں ہو رہی، بلکہ اسے راحت اور تکلیف بھی محسوس ہوتی ہے، مگر یہ سب اللہ تعالیٰ نے ہم سے مخفی رکھا ہے، تاکہ ایمان بالغیب باقی رہنے کی بدولت انسان اجر و ثواب کا مستحق بھی ہو اور اس کی آزمائش بھی ہو۔

بدن سے جو عالم مثال کا ہو یا اجزاء جمادیہ سے اسی اہمیت و شکل میں ترتیب دیا گیا ہو کہ دیکھنے والے کو اس بدن مثالی یہ جمادی میں اور دنیاوی بدن میں کوئی فرق یا تمیز نہ معلوم ہو، اور یہ تناسخ کی شکل نہیں ہے کیونکہ تناسخ تو اسے کہتے ہیں کہ روح ایک بدن سے نکل کر دوسرے بدن کی تدبیر میں مصروف ہو اور غذا حاصل کرنا اور بدن کا بڑھنا بھی جاری رہے اور یہ زیر بحث تعلق ایک احساسی تعلق ہے کہ جس کے سبب وہ دکھ یا راحت محسوس کر سکے چنانچہ طبرسی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی اپنی کتاب تہذیب الاحکام میں اپنی سند سے علی بن مہیار سے وہ قاسم بن محمد سے اور وہ حسین بن احمد سے اور وہ یونس بن ظبیان سے روایت کرتا ہے:

قال: كنت عند أبي عبد الله عليه السلام جالسا فقال: ما يقول الناس في أرواح المؤمنين؟ قلت يقولون تكون في حواصل طيور خضر في قناديل تحت

قال المحقق الدواني: وإنما الحق الذي انكشف لنا بطريق الاستبصار أن كل ذلك في حيز الإمكان، وإن من ينكر بعض ذلك، فهو نطيق حوصلته، وجهله باتساع قدرة الله سبحانه، وعجائب تدبيره، فينكر من أفعال الله تعالى مالم يأنس به، ولم يالفه، و ذلك جهل وقصور، فتامل ولاتغفل .(حتى أن الغريق في الماء، والمأكول في بطون الحيوانات المصلوب في الهواء يعذب و ان لم نطلع عليه): هذا دليل على عدم الاستلزام، يقول: إن الميت في بطون السباع وقعور الأبحار، والمصلوب في الفضاء يُحي ويسئل وينعم ويعذب، ولا ينبغي أن ينكر؛ لأن من أخفى النار في الشجر الأخضر قادر على إخفاء العذاب والنعيم هذه الأمور، فتدبر."(الجواهر البهية شرح العقائد النسفية ،براهين بعض القدرية والرافضة في إنكار عذاب القبر، 3/ 14، ط: الجامعة الحسينية براندير، سورت)

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ میت کا جسم محفوظ نہیں رہتا، مثلاً وہ آگ میں جلا دیا جاتا ہے یا دریا برد ہو جاتا ہے اور اس کو مچھلیاں وغیرہ جانور ہڑپ کر جاتے ہیں یا درندے اور پرندے اس کو کھا جاتے ہیں اور قبر میں دفن کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی اور ظاہر بات ہے کہ سوال قبر اور قبر کی راحت یا تکلیف و عذاب اس کے بارے میں بھی ہے، ایسے لوگوں کے بارے میں حضرات متکلمین، فقہاءؒ، اور شراحِ حدیث کے سامنے باطل فرقوں کی طرف سے یہ اشکال پیش آیا کہ جب ان لوگوں کو قبروں میں دفن ہی نہیں کیا گیا، تو ان کے متعلق قبر میں سوال اور راحت و عذاب قبر کا کیا مطلب؟ اس مشکل سوال سے جو مخلص ان حضرات نے تلاش کیا ہے وہ یہ ہے کہ قبر صرف اس جسی گڑھے کا ہی نام نہیں ہے، بلکہ برزخ علیین اور سجین کے اس مقام کا نام بھی ہے جو نیکوں اور بدوں کی ارواح کا مستقر ہے اور ان لوگوں کے لیے وہی مقام قبر ہے اور ان کی راحت و عذاب کا محل بھی وہی ہے۔ لہٰذا سوال قبر اور راحت و عذاب سب کے لیے ہے صرف انہی لوگوں کے لیے نہیں جو مٹی کے گڑھے میں دفن کیے جاتے ہیں"(تسکین الصدور، باب اول، قبر کا مجازی معنی، ص:92، ط: مکتبہ صفدریہ)

العرش فقال أبو عبد الله عليه السلام: سبحان الله المؤمن أكرم على الله من ذلك أن يجعل روحه في حوصلة طائر اخضر يا يونس المؤمنين إذا قبضه الله تعالى صير روحه في قالب كقالبه في الدنيا فيأكلون ويشربون فإذا قدم عليهم القادم عرفوه بتلك الصورة التي كانت في الدنيا. وعنه عن ابن أبي عمير عن حماد عن أبي بصير قال: سألت أبا عبد الله عليه السلام عن أرواح المؤمنين فقال: في الجنة على صور أبدانهم لو رأيته لقلت فلان.[1]

وہ کہتا ہے میں ابی عبد اللہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا انہوں نے مجھ سے پوچھا ارواح مومنین کے متعلق لوگ کیا کہتے ہیں میں نے کہا وہ کہتے ہیں کہ روحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں رہتی ہیں اور وہ عرش کے نیچے قندیلوں میں ابو عبد اللہ نے کہا سبحان اللہ! اللہ کے نزدیک مومن پرندوں کے پوٹوں میں رکھے جانے سے زیادہ باعزت ہے جس سے وہ غیر مانوس ہے در حقیقت جب اللہ تعالی مومن کی روح قبض کرتا ہے تو اسے اسی قالب میں واپس اتارتا ہے جو دنیا میں اس کو حاصل تھا پس وہ کھاتے ہیں اور پیتے ہیں جب کوئی آنے والا ان کے پاس آتا ہے تو وہ ان کی دنیاوی صورت کی وجہ سے ان کو پہچان لیتا ہے اسی طرح اس نے ابی عمیر سے اس نے حماد سے اس نے ابی نصیر سے روایت کی ہے وہ کہتا ہے میں نے ابو عبد اللہ سے مومنوں کی ارواح کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ جنت میں اپنے دنیاوی تشخص کی حالت میں ہیں کہ تو اگر اس کو دیکھے تو کہہ اٹھے یہ فلاں شخص ہے۔

بہر حال بدن سے روح کا تعلق اس طرح کا ہے ہو یا اس طرح کا عرف میں اس سے تعلق کو حیات سے تعبیر کرتے ہیں اور دو صوروں کی درمیانی مدت میں جب یہ تعلق ٹوٹ جاتا ہے تو اسے موت کے نام سے یاد کیا ہے "رَبَّنَا أَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَأَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ"[2] اے ہمارے رب تو نے ہمیں دو مرتبہ مارا دو مرتبہ زندہ کیا، یہ

1۔ تهذيب الأحكام للطبرسي، 1/ 466، ط: دار الكتب الاسلامية تهران

2۔ سورة غافر، الاية: 11

بھی اس صورت میں ہے کہ پہلی موت سے موت کا ایک فرد مراد ہو اور ممکن یہ بھی ہے کہ مراد جن سے موت ہو جو زندگی بہشت سے پہلے خواہ ایک بار ہو خواہ دو بار اس صورت میں ان کا استدلال اصل سے باطل ہوا، اور صدر الشیرازی کی شواہد الربوبیت میں یوں بیان کیا گیا ہے:

اعلم أن الأرواح ما دامت أرواحا لا يخلو من تدبير أجسام لها و الأجسام قسمان قسم يتصرف فيه النفوس تصرفا أوليا ذاتيا من غير واسطة ،و قسم يتصرف فيه تصرفا ثانويا بالعرض بواسطة جسم آخر قبله و القسم الأول ليس محسوسا بهذه الحواس الظاهرة لأنه غائب عنها لأنها إنما يحس بالأجسام التي هي من جنس ما يحملها من هذه الأجرام التي كالقشور و يؤثر فيها سواء كانت بسيطة كالماء و الهواء أو مركبة كالمواليد وسواء كانت لطيفة كالأرواحالبخارية أو كثيفة كهذه الأبدان اللحمية الحيوانية و الأجساد النباتية فإن جميعها ليس ما يستعملها النفوس و يتصرف فيها إلا بالواسطة ،و أما القسم الأول المتصرف فيه للنفوس فهو من الأجسام النورية الأخروية الحية بحياة ذاتية غير قابلة للموت و هي أعلى رتبة من هذه الأجسام المشفة التي يوجد هاهنا و من التي يسمى بالروح الحيواني فإنه من الدنيا و إن كان شريفا لطيفا بالإضافة إلى غيره و لهذا يستحيل و يضمحل سريعا و لا يمكن حشره إلى الآخرة و الذي كلامنا فيه من أجسام الآخرة و هي يحشر مع النفوس و يتحد معها و يبقى ببقائها.[1]

---

1 ـ الشواهد الربوبية في المناهج السلوكية ، لمحمد بن ابراهيم صدر الدين الشيرازي ، 1/ 335، 336، ط: موسسة التاريخ العربي بيروت

یہ سمجھ لو کہ روحیں جب تک روحیں ہیں اجسام کی دیکھ بھال میں لگی رہتی ہیں اور جسم دو قسم کے ہیں ایک ہوں جن میں نفوس ذاتی اولی اور بغیر کسی واسطے کے تصرف کرتے ہیں دوسرے وہ جن میں وہ ثانوی بلاغ اور دوسرے جسم کے واسطے سے تصرف کرتے ہیں جو اس سے پہلے ہے کس میں اول ان حواس ظاہرہ سے محسوس نہیں ہوتے کیونکہ وہ ان حواس کی دسترس سے باہر ہیں یہ حواس تو انہی اجسام کو محسوس کر سکتے ہیں جو ان اجرام کی قسم سے ہو جیسے کھال اور وہ اجسام اور اشیاء میں اثر و تصرف کرتے ہیں جو ہوا وفانی کی طرف وصیت ہو خواہ مرکب جیسے موالید ثلاثہ اور خواہ ارواح بخاریہ کی طرح لطیف ہوں خواہ کثیف جیسے گوشت پوست کے حیوانی بدن اور نباتاتی اجسام کیونکہ ان سب میں نفوس بالواسطہ تصرف کرتے ہیں ان کو استعمال نہیں کرتے اور اجسام کی قسم اول جن میں نفوس تصرف کرتے ہیں تو وہ اجسام نوری اخروی ہیں جن کو حیات ذاتی نصیب ہے جو موت کو قبول نہیں کرتی یہ بلند مرتبہ ہیں ان شفاف اجسام سے جو یہی پائے جاتے ہیں اور اس روز سے جس کو روانی روح کہتے ہیں کیونکہ وہ دنیا میں ہے اگرچہ وہ دوسرے کے لحاظ سے شریف پر لطیف تر ہے اسی لئے وہ جلد تغیر حاصل کر لیتی ہے اور نابود ہو جاتی ہے اور اس کا حشر بھی آخرت میں ممکن نہیں اور ہمارا کلام جس میں ہے وہ آخرت کے اجسام ہیں اور ان کا نفوس کے ساتھ حشر ہوتا ہے اور ان کے ساتھ متحد رہتے ہیں اور ان کے باقی رہنے تک باقی رہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ان کی عقلی دلیل یہ ہے کہ سوال وجواب بات چیت لذت والم اور ادراک یہ سب حیات پر موقوف ہیں اور حیات اس ڈھانچہ کے شکست وریخت اور بدنی مزاج کے مختل وباطل ہونے کے بعد ممکن نہیں لہٰذا ان امور کا میت کو لاحق ہونا امکان سے خارج ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس معنی کے لحاظ سے بدن مردہ ہے روح نہیں اور ٹوٹ پھوٹ اور مزاج کا بطلان اور اس کے تغیرات بدن پر واقع ہوتے ہیں روح پر نہیں ہاں جسمانی لذت اور دکھ پانے کے لیے اور حواس کے اعمال کے لیے یا تو اس کے اپنے بدن سے تعلق کر دیا جاتا ہے یا اس مثال بدن سے جو تدبیر و تصرف اور غذا

حاصل کرنے سے بالاتر ہے۔

اصل یہ ہے کہ جب روح بدن سے جدا ہوئی تو قوائے نباتی بھی اس کے ساتھ جدا ہوئے وائے نفسانی اور جسمانی وحیوانی جدا نہیں ہوئے اگر قوائے نفسانی وحیوانی کا وجود بطور فیضان یا بطور بقا قوائے نباتی کے ساتھ مشروط ہو تو یہ لازم آئے گا کہ فرشتے حرکت غضب ودفع منافر سے محروم ہوں لہذا ارواح قبروں میں فرشتوں کی طرح ہیں کہ وہ شکل وبدن کے توسط سے کام کرتے ہیں اور حیوانی ونفسانی افعال کا ان سے صدور ہوتا ہے بغیر اس کے کہ ان میں نفس نباتی کار فرما ہو فرق صرف اتنا ہے کہ فرشتوں کو بلحاظ اعمال نعمت وعذاب سے کوئی واسطہ نہیں اور روحوں کو ان کے اعمال کی بنا پر یا نعمت سے نوازا جائے گا یا عذاب سے دکھ دیا جائے گا۔

اور اس سلسلہ میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مردہ جو زمین پر پڑا ہوا ہے یا سولی دیا ہوا کوئی انسان جو کسی درخت پر لٹکا ہو امدت تک اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ اس کے اعضاء واجزا شکستہ وریختہ ہو کر ختم ہو جائیں اب نہ اس میں زندگی ہے نہ قیام وقعود ہے، نہ حرکت نہ گفتگو، نہ سوال نہ جواب اور نہ ہی ان امور کے آثار ہی پائے جاتے ہیں بلکہ ہم نے اس کے سینہ پر رائی کے دانے بھی ڈالے مگر وہ اسی طرح پڑے رہے اسی طرح کافر مردہ کے بدن کو دیکھا بھالا مگر اس میں چلنے کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔

اس شبہ کا جواب گزشتہ تقریر سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی اس میت کی روح کو اس انداز کے موافق کہ وہ ادراک کر سکے اور دکھ سکھ سے متاثر ہو سکے یا تو انہی عنصری ابدان سے جوڑ دیتا ہے یا دوسرے ابدان مثالیہ مخترعہ سے یہ کام انجام دیتا ہے۔

اب رہا ان حرکات کا محسوس نہ ہونا تو یہ ان کے سرے سے نہ ہونے اور واقع نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ یہ حرکات تو حرکات ہم فرشتوں اور جنوں کی ذاتوں اور اشخاص کو بھی حواس سے ادراک نہیں کر سکتے حالانکہ سنی وشیعہ ہر دو مذاہب میں ان کا وجود تسلیم کیا گیا ہے اسی طرح ایک سونے والا سونے میں کسی عورت سے پورے طور پر لذت اندوز ہوتا ہے کہ خارج میں اس کا ثبوت بصورت احتلام ظاہر بھی ہوتا ہے لیکن کوئی پاس بیٹھنے والا اس کے بدن پر ان لذتوں کا کوئی اثر بھی محسوس نہیں کرتا، نیز حکماء اور فلاسفہ ستاروں کی حرکات کے قائل ہیں اور ان کی روحانیت کی مدد کو بھی مانتے ہیں حالانکہ ان میں سے کسی کو بھی کچھ محسوس نہیں ہوتا،

چنانچہ ثابت بن قرہ کے حوالے سے یہ بات باب دوم میں نقل کی جاچکی ہے اور خدا تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ ادھر تورائی کے دانوں کو اپنی اصل حالت پر قائم رکھے اور ادھر میت کی روح کو بدن سے پیدا کردہ تعلق کے ذریعہ نعمت سے لدف اندوز یا عذاب سے دکھی رکھے زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک بعید از وقوع بات ہے مگر اس سے بعد نہیں بنتی کیونکہ جب ایک چیز عقلاً ممکن ہو اور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم اس کی خبر بھی دیں تو وہ بات واجب القبول ہو خواہ وہ عادت پر تجربہ کے موافق ہو یا نہ ہو، جیسے سرد ممالک کے حالات گرم ممالک کے باشندوں کے لیے اچنبھا اور انہونی لگتی ہے اور وہ اسے بعید الوقوع سمجھتے ہیں حالانکہ ان کا وجود ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک روایت ہے کہ ایک مجوسی خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مردوں کی تین کھوپڑیاں لیے ہوئے آیا اور کہنے لگا تمہارے رسول نے فرمایا ہے کہ جو دنیا سے بے ایمان جاتا ہے اس کو آگ سے جلاتے ہیں اپنے فرمایا بے شک ایسا ہی فرمایا ہے تو وہ کہنے لگا یہ کھوپڑیاں میرے ماں باپ اور بھائی کی ہیں ان پر ذرا ہاتھ رکھ دیکھو کیا ان میں حرارت گرمی ہے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے لوہے کا ایک ٹکڑا اور پتھر مجوسی کے سامنے رکھ کر کہا ذرا ان پر ہاتھ تو پھیروں کوئی حرارت محسوس ہوتی ہے مجوسی نے ہاتھ پھیر کر کہا نہیں پھر آپ نے لوہے کو پتھر پر مارا تو چنگاری نکلی تو اس سے پوچھا جی آگ کہاں سے نکل پڑی وہ کہنے لگا کہ لوہے پتھر کے اندر چھپی ہوئی ہے رگڑنے سے ظاہر ہو گئی آپ نے فرمایا پھر تو کیسے انکار کرتا ہے ہو سکتا ہے کہ ان کھوپڑیوں میں بھی آگ چھپی ہوئی ہو اور تیرے ہاتھ کو محسوس نہ ہوتی ہو مجوسی بات کی تہہ کو پہنچ گیا اور توبہ کر کے مسلمان ہو گیا۔

دونوں میں فرق اس قدر ہے کہ لوہے و پتھر میں چھپی ہوئی آگ تو ان کے رگڑنے سے ظاہر ہو جاتی ہے مگر کافر کے بدن کی آگ کچھ ایسی چھپی ہوتی ہے کہ بالکل ہی معلوم و محسوس نہیں ہوتی اور ایسا یوں ہے کہ جن و انس پر غفلت کا پردہ پڑا رہے اور ایمان بالغیب کی اہمیت کم نہ ہو۔

اور پھر اس مریض کے بارے میں کوئی کیا کہے گا جس کے دل یا دیگر اعضاء میں گرم گرم بخارات یا بھڑنے والا مادہ حرارت پیدا کرتا رہتا ہے جیسا درد والے یا دوسرے مریضوں کو یہ کیفیت لاحق ہوتی ہے حالانکہ اوپر والے پر بدن پر گرمی کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا اور جب قبر جزا و سزا کی پہلی منزل ہے تو اس کے اسرار و بھید کو اس عالم دنیا میں آشکارہ اور بے نقاب کرنا ایمان بالغیب کے منافی ہے اور اس دار التکلیف دنیا کے مخالف و زید جس کی بنیاد

سراسر عقل کے امتحان پر ہے نا ظاہر اور حس پر! اس کے باوجود مکلفین کو چونکانے اور تنبیہ کرنے کی غرض سے کبھی کبھی لوگوں پر قبر کے حالات بھی منکشف ہو جاتے ہیں اور خواب میں کبھی جاگتے میں بھی بعض مردوں کے اچھے یا برے حالات ظاہر ہو جاتے ہیں لہذا عقلاء کے اکثر و بیشتر فرقوں کے نزدیک بعد از موت عذاب و ثواب کی حقیقت قطعی اور یقینی ہے یہی وجہ ہے کہ کیا کافر کیا مسلمان ہر فرقہ اپنے مردوں کے امداد و اعانت کے لیے اپنے اپنے طور ایصال ثواب کے مختلف طریقے اختیار کرتے اور بڑے صدق قول سے ان میں مشغول و مصروف رہتے ہیں اگر اس عالم آخرت کے خوف و امید کی کوئی اصلیت و حقیقت نہ ہوتی تو یہ سب کچھ کس لیے ہوتا۔

عقیدہ نمبر 4: قیامت کے دن سوال و جواب کا انکار

قرآن و حدیث میں جو کچھ آتا ہے کہ قیامت کے دن سوال و جواب ہو گا اعمال تولے جائیں گے اچھے برے اعمال نامے لوگوں کے ہاتھوں میں گھمائے جائیں گے، صراط قائم ہو گی، حوض موجود ہو گا، شفاعت ہو گی وغیرہ وغیرہ یہ سب ظاہر معنی پر محمول ہیں ان کے معنوں میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں اسی طرح جنت و دوزخ کا وجود برحق ہے اور جنت و دوزخ کے اندرون کی جو کچھ تفصیل آئی ہے مثلاً حور و قصور و غلمان، نہریں، درخت، فواکہ یا سانپ، بچھو، آگ، وادی اور کھائیاں کھالوں کا پکنا اور ان کی جگہ دوسری کھالوں کا پیدا ہو جانا وغیرہ وغیرہ سب صحیح و درست اور برحق ہیں اہل سنت کا یہی مذہب و مسلک و اعتقاد ہے مگر رافضیوں کے اکثر فرقے مثلاً زیدیہ و اسماعیلیہ وغیرہ ان چیزوں سے انکار کرتے ہیں اور ان میں تاویلات کے پیوند لگاتے ہیں ان کی تردید و تکذیب جس انداز میں قرآنی آیات و احادیث رسول جیسے دو گواہ عادل کر رہے ہیں وہ کافی سے بھی بہت زیادہ ہے۔

عقیدہ نمبر 5: تناسخ بعض روافض کے ہاں ثابت ہے

کہ تناسخ غلط اور باطل ہے مگر شیعوں کے اکثر فرقے مثلاً کرامطہ، کاملیہ، منصوریہ اور مفضلیہ وغیرہ کا یہ عقیدہ ہے کہ ارواح میں تناسخ ہوتا ہے وہ ایک بدن سے دوسرے بدن میں آتی جاتی رہتی ہیں اور روحوں کی اسی آمد و رفت جار کا نام معاد آخرت ہے۔

کامل الاعتقاد و الطاعات افراد کی روحیں ایسے اشخاص کے اجسام میں منتقل ہوتی ہیں جو صاحب نعمت و ثروت ہوں صاحب عافیت و صیحت ہوں مثلاً سلاطین امراء حکام وغیرہ اور اس روح کی جنت یہی ہے اور گھٹیا اور

گناہ الود افراد کی روحیں ان اشخاص کے بدنوں میں گھستی ہیں جو بھوکے ننگے بے نوا گدا گر ہوں یا مریض اور صدموں کا مارا ہوا ہو یا کبھی ان حیوانوں کی جون چلی جاتی ہیں جو باعتبار اوصاف ان کے ہم رنگ ہوں مثلا حریص کے لیے چیونٹی بہادر متکبر کے لیے شیر چیتا وغیرہ یا بزدل کے لیے خرگوش عیار و مکار کے لیے لومڑی مسخرے کے لیے بندر چور کے لیے ریچھ اور خود پسند کے لیے مور کے ابدان باعتبار اوصاف جائے قیام بنتے ہیں ان لوگوں کا یہ عقیدہ دراصل ہندوؤں سے مانگا تانگا ہے اور کچھ ان کی قرآنی تحریف کا کارنامہ ہے کہ بعض ایات میں لفظی اور معنوی تحریف کر کے اپنے عقیدہ کی پیوند کاری کرتے ہیں مثلا:

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ[1]

حالانکہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ جانور چرند پرند بنی آدم ہی کی طرح جدا گانا انواع پر مشتمل ہیں کہ ان میں ہر ایک کو اس کی خلقت کے مناسب خاص خاص احکام و اوصاف عطا کیے گئے ہیں اگر یہ آیت تناسخ کی طرف اشارہ کرتی ہو تو یہ لازم تھا کہ جانوروں کی پہلی پیدائش نہ ہوتی اور وہ سب کے سب افراد حیوانی ہوں جو حقیقت میں تو آدمی تھا مگر تناسخ کی وجہ سے جانور بن گیا حالانکہ جو تناسخ مانتے بھی ہیں ان کا بھی یہ مذہب نہیں یا یہ آیت:

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا[2]

کہ یہ ان دوزخیوں کے حق میں ہے جو عذاب میں جکڑے ہوئے ہیں ان ارواح کے بارے میں نہیں ہے جو دنیا میں مشکل ہوتی رہتی ہیں یا یہ آیت:

كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ أُعِيدُوا فِيهَا[3]

کہ اس میں ضمیر صاف طور پر آخرت کی آگ پر پھرتی ہے کہ جب وہ نعرے جہنم سے نکلنے کا ارادہ کریں گے تو واپس ہی دھکیل دیے جائیں گے اسی طرح کا معاملہ ان احادیث کا ہے جو قیامت کے دن سورتوں کی تبدیلی پر

1۔ سورۃ الانعام، الآیۃ: 38

2۔ سورۃ النساء، الآیۃ: 56

3۔ سورۃ الحج، الآیۃ: 22

دلالت کرتی ہیں یا اس بات پر کہ حشر کے دن لوگوں کو مختلف صورتوں پر اٹھایا جائے گا ان احادیث کا تناسخ سے دور پرے کا واسطہ بھی نہیں کیونکہ تناسخ تو یہ ہے کہ عالم دنیا میں ایک روح ایک بدن سے دوسرے بدن میں منتقل ہو عالم آخرت کے منتقلی سے تناسخ بحث ہی نہیں کرتا اور ان احادیث کی دلالت عالم آخرت پر ہے عالم دنیا پر نہیں۔

اور پھر تناسخ کی تعریف میں یہ بات بھی شامل ہے کہ دوسرا بدن اپنے تمام اجزاء میں پہلے بدن کا مغائر ہو یہ نہیں کہ بدن تو پہلا ہی ہو شکل وصورت بھی وہی ہو مگر اجزائے بدن میں ان بساط یا پھیلاؤ وغیرہ ہو جائے تناسخ والے بھی اس کو نہیں مانتے اور اسی کے ساتھ قابل لحاظ ایک بات یہ بھی ہے کہ قطعی دلائل سے یہ بات بتا دی گئی ہے کہ اعمال کا بدلہ تناسخ کی شکل میں ناممکن ومحال ہے کیونکہ بدلہ پانے کے وقت کسی عمل کی تکلیف محال ہے اور تکلیف سابق کے بغیر بدلہ کا تصور محال ہے اور تناسخ کے وقت یہ دونوں محالات لازم آتے ہیں اور اس کا ثبوت کہ یہ محالات لازم آتے ہیں اور یہ ہے کہ اگر ایک شخص نے اچھے یا برے عمل کیے اور مرنے کے بعد اس کی روح دوسرے انسانی بدن میں منتقل ہوئی یہ حالت ایسی ہوگی کہ وہ مکلف بھی ہے یا جزا یافتہ بھی کیونکہ ہر فرد انسانی بغیر مکلف کیے ادھر میں نہیں لٹکایا جاتا اس کی حیات کا ایک ایک سیکنڈ عالم تکلیف میں ہوتا ہے اور اگر اس روح کی منتقلی کسی ایسے بدن میں ہوئی جو غیر مکلف ہے جیسے بچہ یا مجنون یا کوئی حیوان اب اس بدن کی موت کے بعد روح لامحالہ یا تو کسی مکلف انسانی بدن میں منتقل ہوگی یا غیر مکلف اور حیوانی بدر میں اور اس کو اس بدنی زندگی میں راحت بھی پیش آئے گی اور تکلیف بھی تو یوں وہ جزائے یافتہ ہوا حالانکہ عیسی سے پہلے کی زندگی میں اس کو مکلف ہی نہیں کیا گیا تھا اور یہ دکھ سکھ محض اتفاقی ہو کسی عمل کے کے سلسلہ میں نہ ہو تو پھر جزا جزا ہی نہ رہی کیونکہ جزا تو عبرت وتنبیہ کے لیے ہوتی ہے جب گنہگاروں کی طرح بے گناہ بھی اس کے شریک ہوئے تو پھر یہ جزا عبرت کیسے ہوئی اور محل عمل خلط ملط ہو گیا اور جو باتیں متی وفرمانبردار کو پیش آتی تھیں وہ غیر مطیع نافرمان کو بھی پیش آئی تو مطیع اعزاز واکرام سے محروم ہو گیا۔

اور ایک نقطہ قابل غور یہ بھی کہ اگر مومنین صالحین بلکہ انبیاء وائمہ کی ارواح عیش پرست فاسق وفاجر سلاطین وامراء کے بدن میں منتقل ہوں تو یہ لازم آتا ہے کہ موت ثانی کے بعد بزرگوں کی روحیں عذاب پائیں گے اور ان کی نیک بختی بد بختی سے بدل جائے گی اور عزت وتکریم کے بجائے ذلت واہانت سے دوچار ہوں گے

اور اگر اس کا الٹ ہو کے امراء وحکام و سلاطین انبیاء وصلحاء کے اجسام میں نمودار ہو تو یہ ضروری ہے کہ انبیاء وصلحاء زمانہ ماسبق کے انبیاء وصلحاء سے کمتر نہ ہوں وہ صاف میں زائد ہوں گے یا کم از کم برابر وہ ہم مرتبہ اور وہ سب کے سب بشکل انبیاء وصلحاء عیش پرست اور اسودہ حال ہوں گے حالانکہ یہ خلاف واقعہ ہے نیز روح کی بدن سے وابستگی کے بعد بدن کتنا بھی نعمت و اسودگی سے مالامال ہو وہ رنج و علم سے بچا نہیں رہ سکتا مثلا بھوک درد بیماری یا اسی جیسی تکالیف اس کو کیسے معاف کر دیں گی تو اس صورت میں فرمانبردار ہوں انبیاء وائمہ کو دکھ دینا لازم آیا جو صاف ظلم ہے اور اسی طرح روح کے بدن سے منسلک ہو جانے کے بعد اسے کتنے ہی رنج والم پیش آئیں راحت وخوشی سے بھی وہ محروم نہ ہو گی گو کسی قدر اور کسی وقت ہو سو ایسی صورت میں سرکشوں اور جابروں کا نعمت سے لطف اندوز ہونا لازم آئے گا۔

ایک اور بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر ابدان غیر متناہی ہیں تو نوع انسانی کا قدیم ہونا لازم آتا ہے بلکہ ہر زمانہ میں انسانی ابدان کا اگلے زمانہ سے کم ہونا محال ہو گا اور اگر وہ کسی حد پر ختم ہوا تو اخر کی طرف ختم ہونے سے تو یہ لازم آتا ہے کہ مکلف بدلہ پانے سے بچ جائے اور مشروع کی طرف ختم ہونے سے لازم آتا ہے کہ بغیر تکلیف کا جزا پائے اور اگر یہ کہیں کہ نوع انسانی کے خاتمہ پر جزاو سزا کا معاملہ آخرت پر انحصار کھیں اور وہ وہیں جزا پائیں گے تو ہم کہیں گے کہ اگلے اعمال کی جزا آخری بدن کے اعمال پر ختم ہوئی اور رک گئی، ثواب آخری بدن کے اعمال کی جزا آخرت میں ابدی ہو گی اور ہمیشہ ہمیش باقی رہے گی لہذا اگر پہلی جزا عدل پر مبنی تھی تو دوسری جزا سراسر ظلم ہوئی اور اگر دوسری جزا مقتضائے انصاف تھی تو پہلی جزا ناقص وادھوری ثابت ہوئی اور اگر یہ کہیں کہ نوع کے ابتدائی درجہ میں عیش وعالم محض اتفاقی تھا جزا کے طور پر نہیں تھا تو ہم کہتے ہیں کہ پھر بعد میں آنے والے طبقات پر ظلم ہوا کہ وہ اتفاقی عیش وراحت سے محروم رہے اسی طرح اگلے طبقوں کے حق میں بھی ظلم ہوا کہ قصور کے بغیر رنج وعلم بھگتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ تناسخ کو جزا کا ذریعہ کہنا عقلی و عرفی ہر دو کے قواعد کے صاف وصریح طور پر مخالف و غلط ہے اور یہاں اس قسم کے تناسخ کا بطلان مقصود ہے۔

عقیدہ نمبر 6: رجعت ثابت ہے

قیامت سے پہلے مردوں کی دنیا میں واپسی نہیں ہوگی مگر امامیہ تو سب کے سب اور رافضیوں کے بعض فرقے واپسی کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر، وصی، سبطین اور ان کے دشمن یعنی خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم اور جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید، مروان اور دوسرے ائمہ اور ان کے قاتلین حضرت مہدی کے ظہور کے بعد زندہ ہوں گے (1) اور حادثہ دجال سے پیشتر ان تمام قصورواروں کو عذاب دیا جائے گا اور ان سے قصاص لیا جائے گا پھر وہ مر جائیں گے اور قیامت میں پھر زندہ اٹھائے جائیں گے ان کا یہ عقیدہ کتاب اللہ کے صریح خلاف ہے کہ بہت سی آیات واپسی کی تردید کرتے ہیں ان میں سے ایک آیت ہے:

رَبِّ ارْجِعُونِ ۔ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا وَمِنْ وَرَائِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ (2)

اے میرے پروردگار تو مجھے دنیا میں لوٹا دے کہ وہ کام کر لوں جو میں نے ترک کر دیے تھے ہرگز نہیں یہ یوں ہی کہنے کی بات ہے جو کہنے والا کہہ رہا ہے اب تو اس زندگی میں قیامت تک ایک پردہ حائل رہے گا۔

اس آیت کے آخری جز "ومن ورائهم" سے شیعہ اپنے دعویٰ کا اس بات کرتے ہیں مگر اس آیت کی موجودگی میں تو ان کو اتنا کہنے کی بھی گنجائش نہیں کہ چلو نیک اعمال کے لیے واپسی محال ہے مگر اجرائے حدود و تعزیرات کے لیے واپسی محال نہیں کیونکہ آیت کا آخری حصہ ہی تو مطلقاً واپسی کو روکتا ہے شریف مرتضی نے ناصریہ (کتاب) میں کہا ہے کہ عہد مہدی میں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ایک درخت پر سولی دی جائے گی پھر

---

1 ۔ قال ابن بابويه: «إن الذي تذهب إليه الشيعة الإمامية انّ الله تعالي يعيد عند ظهور لمهدي قوما ممن كان تقدم موته من شيعته وقوما من أعدائه». وقال المفيد: «اتفقت الامامية على وجوب رجعة كثير من الأموات إلى الدنيا قبل يوم القيامة». الرجعة، لنجم الدين الطبرسي: ص 4.

2 ۔ سورة المومنون، الاية :99

اس درخت کے متعلق بعض تو یہ کہتے ہیں کہ وہ سولی سے پہلے سرسبز ہوگا مگر سولی کے بعد خشک ہو جائے گا تو بہت سے لوگ بہک کر یہ کہنے لگیں گے کہ یہ بیچارے بے گناہ تھے کہ ان کو خواہ مخواہ سولی دی گئی تب ہی تو یہ سرسبز درخت سوکھ گیا اور بعض دوسرے یہ کہتے ہیں کہ پہلے یہ درخت لنڈ منڈ سوکھا ہوگا سولی کے بعد ہرا ابھرا ہو جائے گا اور اس سبب سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ہو جائے گی،[1] اب اس ذہنیت پر ماتم کیجئے یا تعجب کے اس جھوٹ میں بھی تو باہم مختلف ہیں۔

اور جابر جعفی[2] جو اس فرقہ کے خدماء میں سے ہے کہ کہتا ہے کہ جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ اس دنیا میں واپس آئیں گے اور قرآن مجید میں قرب قیامت جس دابۃ الارض کے نکلنے کا ذکر ہے اس سے مراد آپ رضی اللہ عنہ ہی ہیں،[3] سبحان اللہ! کیا حسن عقیدت ہے ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو!

اور زیدیہ سب کے سب دنیا میں پھر واپسی کا سختی سے انکار کرتے ہیں اور انہوں نے اپنی کتابوں میں اس عقیدہ کو ائمہ کرام کے حوالے سے بڑے اچھے طریقے پر رد کیا ہے لہذا اہل سنت کو ان خرافات کی تردید کی اب

1۔ من حديث طويل عند ابن رستم الطبري يقول فيه المهدي: «وأجيء إلى يثرب فأهدم الحجرة [أي التي دفن فيها النبي صلى الله عليه وسلم وصاحبيه] وأخرج من بها وهما طريان [يعني أبا بكر وعمر رضي الله عنهم] فأمر بهما تجاه البقيع، وآمر بخشبتين يصليان عليها، فتورقان من تحتهما فيفتتن الناس بهما أشد من الأولى ... ». الطبري، دلائل الإمامة: 297؛ المجلسي، بحار الأنوار: 53/ 104.

2۔ جابر بن يزيد بن الحرث الجعفي الكوفي، تركه النسائي، وقال يحيى: «لا يكتب حديثه ولا كرامة»، ونقل عباس الدوري عن زائدة: «بأنه كان كذابا»، مات سنة 128هـ ميزان الاعتدال: 2/ 103.

3۔ أخرج القمي عن أبي عبد الله قال: «انتهى رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى أمير المؤمنين عليه السلام وهو نائم في المسجد، قد جمع رملا ووضع رأسه عليه، فحركه برجله ثم قال: قم يا دابة الله، فقال رجل من أصحابه يا رسول الله: أيسمي بعضنا بعضا بهذا الاسم؟ فقال: لا والله ما هو إلا له خاصة، وهو دابة الأرض الذي ذكر الله تعالى في كتابه {وإذا وقع عليهم القول أخرجنا لهم دابة من الأرض} فذكر الآية». تفسير القمي: 2/ 130؛ وأخرجه الصافي في تفسيره: 4/ 74؛ والمجلسي في بحار الأنوار: 39/ 59.

کیا ضرورت "وَكَفَى اللهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ"[1] مومنوں کی طرف سے لڑنے کے لیے اللہ ہی بہت ہے "فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ"[2] وہ ذات وہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو مارے گا پھر تم کو زندہ کرے گا پھر تم اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے۔

اصول امامیہ کے موافق اس عقیدہ کو باطل ثابت کرنے کی عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر ان کو حد قصاص کی صورت میں دنیا کے ختم ہونے سے پہلے عذاب دیا جائے اور آخرت میں پھر دوبارہ ان کی پکڑ کی جائے تو یہ سراسر ظلم اور کھلی زیادتی ہے اس لیے لامحالہ آخرت میں عذاب سے وہ بری ہوں گے اور اس صورت میں وہ آخرت کے بڑے اور دائمی عذاب سے چھٹکارا پالیں گے اور وہاں کی ابدی راحت سے بہرہ ور ہوں گے اور یہ بات سخت خیانت اور بڑے جرم کے سراسر منافی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَى[3] بے شک آخرت کا عذاب بڑا سخت اور باقی رہنے والا ہے۔

اور اگر دنیا کے عذاب سے مقصد دکھ دینا اور ایذاء رسانی ہے تو یہ سب کچھ تو عالم قبر میں ہو ہی رہا ہے اس کے لیے ان کو زندہ کرنا عبث و بیکار ہے اور عبث فعل کا صدور برا ہے اور اللہ تعالیٰ کو اس سے پاک ہونا چاہیے اور اگر دنیا کے عذاب سے غرض لوگوں کو ان کی خیانت سے باخبر کرنا ہے تو اس کی ضرورت تو ان لوگوں کو تھی جو ان کے عہد میں موجود اور ان کی خلافت کے حق ہونے کا عقیدہ رکھنے والے تھے اور ان کے معین و مددگار بنے ہوئے تھے بلکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جناب امیر اور حضرت سبطین رضی اللہ عنہم کو اپنے اپنے عہد میں انتقام کی قدرت دی جاتی تاکہ بعد میں آنے والی امت گمراہی میں نہ پڑتی اور ان کے کاموں اور کرداروں سے بروقت آگاہ ہو کر ان سے بیزار ہوتی انتظام میں اتنی دیر لگانا کہ امت کا اکثر حصہ گزر چکا اور گزرنے والوں کو ان کی بد کرداریوں کی برائی کا پتہ تک نہ ہو سکا حکمت کے خلاف اور صلاح کے منافی ہے تو گویا اصلح کا ترک لازم آیا اور

1۔ سورۃ الاحزاب، الآیۃ: 25

2۔ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: 28

3۔ سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: 127

کاش یہ آخرت میں ہوتا کہ اگلے پچھلے سارے جمع ہوتے اور سب کے سب اس جزا اور قصاص پر مطلع ہوتے تو وجہ جواز بھی ہوتی امت کے بیشتر حصہ عمر میں یہ تعزیری واقعہ پیش نہیں آیا اور آخرت کے مجمع عظیم کے سامنے وہ پاک صاف اٹھائے جائیں گے، اب جب دنیا کا دم واپس ہے اس وقت کے چند حاضرین ان کے خیانت وگناہ پر مطلع بھی ہوئے تو ان سے کیا حاصل ہوا وہ اس کو بھی دیگر انقلابات کی طرح کا ایک انقلاب جانیں گے اور کوئی عبرت نہ پکڑیں گے اور پھر ان کو اس وقت زندہ کریں گے تو یہ تمیز وفرق کون کر سکے گا کہ یہ ابو بکر ہیں یہ عمر ہیں اور یہ معاویہ ہیں رضی اللہ عنہم سب کو یہی خیال ہو گا کہ چند لوگوں کے یہ نام رکھ لیے ہیں جیسے اب بھی ایام عاشورہ میں کسی کا نام یزید کسی کا شمر رکھ کر ان کی پٹائی کرتے ہیں اور یوں اپنا دل ٹھنڈا کرتے ہیں (کتنے شریر تھے یہ یزید وشمیر کے شیعوں کو خود اپنے بھائیوں کے ہاتھوں پٹوانے کا شوشہ چھوڑ گئے کیونکہ ان کا تو نام ہی استعمال ہوا ہے ہڈیاں تو در حقیقت ان کے اپنوں ہی کی ٹوٹتی ہیں ان کو یہ عار نہیں لگتی)

اور اگر مہدی یا دیگر ائمہ کا یہ کہہ دینا کافی ہو کہ یہ عمر ہیں یہ ابو بکر ہیں رضی اللہ عنہما تو پھر ان کا یہ کہنا کیوں کافی نہ ہوا کہ ان کے خلافت ناحق و باطل تھی یا وہ ظلم و غصب کے مرتکب ہوئے ان کو زندہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی پھر اس سورت میں پیغمبر وصی اور ائمہ کو عام لوگوں کے مقابلہ میں ایک زائد موت کا مزہ کیوں چکھایا جارہا ہے موت کے برابر تو کوئی دکھ اور علم نہیں اللہ تعالیٰ کو یہ کب گوارا ہو گا کہ ایک فعل عبث کی خاطر اپنے دوستوں کو علم شدید سے دوبار دوچار کرے۔

اور یہ صورت بھی تو پیش اسکتی ہے کہ جب ان کو زندہ کریں تو وہ قرائن سے یہ جان جائیں کہ ہمیں تعزیب اور قصاص کے لیے زندگی کیا گیا اور سابقہ زندگی میں ہم ناحق اور ائمہ برحق تھے تو اس تنبیہ کے بعد ہو سکتا ہے کہ وہ صدق دل سے توبہ کر لیں (کیونکہ ظاہر ہے کہ اس وقت تک توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوا ہو گا) تو پھر ان پر عذاب کا کیا جواز باقی رہے گا اور پھر انہیں یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ اس صورت میں جناب امیر اور سبطین رضی اللہ عنہم کی کتنی سبکی اور اہانت لازم آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ اتنے ناقدر تھے کہ ان کے لیے ان کے دشمنوں سے انتقام بھی نہ لیا اور نہ انہیں کو ان پر حاوی کیا کہ یہ خود ہی اپنا انتقام لے لیتے اور جب سینکڑوں صدیاں گزر جانے پر مہدی پیدا ہوئے تو ان کی فریاد قبول ہوئی اور انتقام لیا۔

غرض یہ کہ اس عقیدہ کے مفاسد اتنے ہیں کہ آدمی لکھتا لکھتا تھک جائے مگر ان کا حد و شمار ختم نہ ہو اس رجعت کا سب سے پہلا قائل عبداللہ بن سبا یہودی تھا یہ شوشہ اسی کا چھوڑا ہوا ہے البتہ وہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رجعت کا قائل تھا دوسری صدی کے شروع میں جابر جعفی نے جناب امیر رضی اللہ عنہ کو بھی اس رجعت میں شریک کر دیا مگر اس نے اس رجعت کا کوئی وقت و زمانہ متعین نہیں کیا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بحوالہ سفیان بن عینہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز ہم جعفر جعفی کے گھر گئے تو ہم نے اس سے ایسی باتیں سنی کہ ہمیں خوف پیدا ہوا کہ کہیں ہم پر چھت نہ آ پڑے،[1] امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے جابر سے زیادہ جھوٹا اور عطاء سے زیادہ سچا کوئی نہیں دیکھا،[2] اور جب تیسری صدی کا آغاز ہوا تو اس زمانہ کے رافضیوں نے اپنے بغض کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے تمام ائمہ اور ان کے دشمنوں کی رجعت کا عقیدہ گھڑ لیا۔

عقیدہ نمبر 7: کسی امامی کو عذاب نہ ہو گا

اللہ تعالیٰ اپنے گنہگار بندوں میں سے جس کو چاہے گا عذاب دے گا اسے کسی فرقہ کا پاس یا لحاظ نہ روک سکے گا جیسا کہ فرمایا "يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَشَاءُ"[3] جس کو چاہتا ہے عذاب دیتا ہے جس پر چاہتا ہے رحم فرماتا ہے۔

مگر امامیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ کسی بھی امام شیعہ کو نہ گناہ صغیرہ پر عذاب ہو گا نہ گناہ کبیرہ پر اور نہ آخرت میں عذاب ہو گا نہ عالم قبر میں ان کا یہ عقیدہ ان کے ہاں مسلم اور اجماعی ہے اسی لیے یہ ترک واجبات اور ارتکاب معاصی میں انتہائی بے باک ہوتے ہیں اور اس عقیدہ کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ خلاصی اور نجات

1۔ وقال الشافعي سمعت سفيان بن عيينة يقول سمعت من جابر الجعفي كلاما فبادرت خفت أن يقع علينا السقف.(تهذيب التهذيب، 2/ 43، ط: دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع)

2۔ ما رأيت أحدا أكذب من جابر الجعفي ولا أفضل من عطاء بن أبي رباح- (العلل الصغير ، للترمذی، 1/ 739، ط: دار إحياء التراث العربي بيروت)

3۔ سورة العنكبوت ،الاية : 21

کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کافی ہے[1] لیکن یہ نادان اتنا نہیں سمجھتے کہ صرف محبت تو خدا اور رسول کی بھی کافی نہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کیسے کافی ہو سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک حکایت بیان کی جاتی ہے کہ اس فرقہ کا کوئی شخص کشمیر میں کسی حمام پر گیا حمام والے نے پوچھا آغا تمہارا نام کیا ہے اس نے کہا کلب علی علی کا کتا وہ بولا کہ ایسی کیا بات ہوگئی کہ غلام علی کی جگہ کلب علی نام رکھ لیا وہ بولا کہ اس نیت سے کہ ممکن ہے علی کا کتا سمجھ کر بہشت میں جانے سے کوئی نہ روکے وہ بولا یہ تو ٹھیک ہے مگر جب خدا کا کتا بہشت میں نہیں پھٹک سکتا تو علی کے کتے کی کیا حیثیت کہ اسے جنت میں گھسنے دیا جائے۔

اگرچہ یہ عقیدہ خود ان کے اصول کے بھی خلاف ہے اور ان کی روایات کے بھی لیکن چونکہ ہر ناجائز کو جائز کرنا ترک اطاعت اور تکالیف شریعت سے کنارہ کشی مد نظر ہے اس لیے بڑی ڈھٹائی سے اسے سینہ سے لگا رکھا ہے گویا اس معاملہ میں ان کا نفس امارہ ان کے علم و عقل پر غالب آگیا ہے یہ عقیدہ ان کے اصول کے تو یوں خلاف ہے کہ اگر کسی امام نے کبیرہ کا ارتکاب کیا ہو اور اللہ تعالیٰ ان کو سزا نہ دے تو اللہ تعالیٰ پر ترک واجب کا الزام آتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک گنہگار کو عذاب دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے بلکہ اس طرح عذاب دینے کو یہ عدل کہتے ہیں جیسا کہ اپنے موقع پر پہلے بیان ہوا اور روایات کے یوں خلاف ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ جناب سجاد رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ائمہ سے بذریعہ روایات صحیحہ ایسی دعائیں منسوب ہیں کہ وہ بارگاہ الٰہی میں رو رو کر مانگتے تھے تکثیرات پر عفو خواہ ہوئے اور ان کے عذاب سے پناہ چاہتے تھے اور ان میں حرمت رسول حرمت قرآن کے واسطے دیتے تھے جب یہ بزرگان محترم خود اس قدر عالی مرتبہ رکھنے کے باوجود پاداش عمل سے لرزتے ڈرتے اور کانپتے تھے تو خالی محبت کے مدعیوں کی یہ مجال و تاب کہاں کے وہ اس پر غراتے پھریں اور اس پر تقیہ کرکے دھڑلے سے ارتکاب مناہی و معاصی کیے جائیں۔

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ، فَكَيْفَ إِذَا

1۔ حب علي الصراط المستقيم، والنجاة من العذاب الأليم. (مشارق أنوار اليقين في أسرار أمير المؤمنين، ص: 200، ط: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات بيروت لبنان)

جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ[1]

کہ ہمیں تو چند دنوں سے زیادہ آگ چھوئے گی بھی نہیں اور یہ دھوکہ ان کو ان باتوں کی وجہ سے تھا جو انہوں نے اپنے دین میں جھوٹ کے طور پر شامل کر لی تھی تو اس وقت ان کا کیا حال ہو گا جب ہم ان کو ایک یقینی دن میں اکٹھا کر کے ہر ایک کے اعمال کا بلا کم و کاست پورا پورا بدلہ دیں گے اور ان پر کوئی ظلم و زیادتی نہ ہو گی۔

اس سلسلہ میں ان کے پاس وہ چند دلچسپ روایات ہیں جو کہ رؤسا نے احمقوں کو لبھانے کے لیے تراش لی ہیں ان میں ایک روایت وہ ہے جو ابن بابویہ قمی نے بیان کی ہے واضح رہے کہ قمی بدنامی کی حد تک جھوٹ بولنے اور روایات گھڑنے میں شہرت یافتہ ہے یہ ایسے کھوٹے سکوں سے تھیلیاں بھری رکھتا ہے اور موقع بموقع ان سے بیوپار کرتا رہتا ہے میں مفضل بن عمر سے یوں روایت کرتا ہے:

قال: قلت لأبي عبد الله لم صار علي قسيم الجنة والنار؟ قال: لأن حبه إيمان وبغضه كفر، وإنما خلقت الجنة لأهل الإيمان والنار لأهل الكفر فهو قسيم الجنة والنار، لا يدخل الجنة إلا محبوه ولا يدخل النار إلا مبغضوه.[2]

میں نے ابی عبد اللہ سے پوچھا کہ یہ علی رضی اللہ عنہ جنت دوزخ بانٹنے والے کیسے بن گئے تو کہا کہ دراصل ان کی محبت ایمان ہے اور ان سے بغض کفر ہے اور جنت اہل ایمان کے لیے اور دوزخ اہل کفر کے لیے پیدا کی گئی اور چونکہ جنت میں وہی داخل ہو گا جو ان سے محبت کرتا ہو گا اور دوزخ میں وہی جائے گا جو ان سے بغض رکھتا ہو گا اور اس طرح وہ جنت و دوزخ بانٹنے والے ہوئے۔

اس روایت کے جھوٹ ہونے کی یہ دلیل کافی ہے کہ حضرات ائمہ قرآن و شریعت کے خلاف ہرگز کچھ نہ فرماتے کیونکہ اگر ایسا کرتے تو نہ صرف اپنی ہی تردید کرتے بلکہ اپنے باپ دادا کی تکذیب بھی کرتے اور اس

1۔ سورۃ آل عمران، الآیۃ: 24، 25

2۔ علل الشرائع: 1/ 161؛ معاني الأخبار: ص 206.

روایت میں بچند وجوہ شریعت کے مقرر کردہ قواعد کی مخالفت بھی لازم آتی ہے:

اول اگر کسی کی محبت ایمان اور اس سے بغض کفر بھی ہو تب بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جنت و دوزخ کا بانٹنے والا بھی ہو دیکھو تمام انبیاء اور رسولوں ائمہ اور حضرات سبطین رضی اللہ عنہم کو بھی یہ مرتبہ حاصل ہے مگر وہ جنت و دوزخ کے بانٹنے والے نہیں ہیں۔

دوم اگر حب علی ہی کامل ایمان ہو تو توحید، نبوت، آخرت اور شیعوں کے دوسرے اہم اور ضروری عقائد سب باطل و بیکار ہو جائیں گے اور دوسرے ائمہ کے متعلق بدگوئی و بدزبانی اور ایذا رسانی کا جواز پیدا ہو جائے گا اور اسے کوئی تسلیم نہیں کرے گا تو معلوم ہوا حب علی ایمان کامل نہیں لامحالہ وہ جزو ایمان ہوگی اور یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ جزو ایمان جنت کے داخلہ کے لیے کافی نہیں۔

تیسرے اس جملہ کا "لا یدخل النار الا مبغضوہ" بتاتا ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا کافر جیسے فرعون ہامان نمرود، شداد، عاد و ثمود کوئی بھی دوزخ میں نہیں جائے گا کیونکہ علی رضی اللہ عنہ سے ان کو کوئی بغض نہیں تھا اور یہ بات بالاجماع غلط اور باطل ہے۔

چوتھے یہ کہ اگر یہ سب کچھ صحیح بھی مان لیں تو اس کا اصل مقصد و مدعا سے کوئی علاقہ و تعلق نہیں اس لیے کہ "لا یدخل الجنه الا محبوہ" کا مقصد و منشا صرف اتنا ہی ہے کہ محبین کے علاوہ کوئی جنت میں نہیں جائے گا یہ منشا نہیں ہے کہ ہر محب جنت میں جائے گا ان دونوں باتوں میں جو فرق ہے اسے معمولی سمجھ والا بھی جانتا ہے۔

پانچویں یہ کہ اگر ان سب سے قطع نظر کر لیں تو اس صورت میں رافضیوں کے تمام فرقے مثلاً غلاۃ کیسانیہ، ناؤسیہ، افطحیہ، قرامطہ اور باطنیہ بھی جنت کے مستحق ہوں گے حالانکہ یہ امامیہ کے مذہب کے بھی خلاف ہے جب اس روایت کا نشانہ بھی صحیح نہ بیٹھا اور مقصد براری ہوتے نہ دیکھی تو زنبیل کذب سے یہ بابویہ ایک اور روایت نکال لایا:

عن ابن عباس أنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم «جاءني جبريل وهو مستبشر فقال: يا محمد، إن الله الأعلى يقرئك السلام وقال: محمد نبيي ورحمتي، وعلي حجتي، لا أعذب من والاه وإن عصاني، ولا أرحم

من عاداه وإن أطاعني»[1]

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرائیل علیہ السلام میرے پاس خوش خوش آئے اور کہا اے محمد اللہ جل شانہ نے آپ کو سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ محمد میرے نبی اور میری رحمت ہیں اور علی میری محبت جس نے ان سے دوستی کی میں اس کو عذاب نہیں دوں گا اگرچہ وہ میری نافرمانی کرے اور جس نے ان سے دشمنی رکھی میں اس پر رحم نہیں کروں گا اگرچہ وہ میری اطاعت کرے۔

اس روایت کے جھوٹا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں در حقیقت نبوت ثابت کی جارہی ہے کیونکہ اطاعت کا سوخت منکر انبیاء کا خاصہ ہے نبی کے انکار کرنے والے کی اطاعت حبط ہوتی ہیں نیز اس روایت کی رو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت بھی لازم آتی ہے کہ وہ تو اللہ کی محبت ہے مگر حضور نہیں کہ آپ کا نافرمان تو نافرمانوں میں کا ایک ہے اور مطیع اطاعت گزاروں کے من جملہ ایک، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دوست رکھنے والا حب علی کے اثر سے نافرمانی سے بے خوف ہے اور اپ سے بغض رکھنے والا بغض کے باعث تعدد کے اجر سے محروم نیز اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز روزہ اطاعت و بندگی سب منسوخ اور بیکار محض ہیں اور گناہ خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ ان کی حرمت خاک بن کر ہوا میں اڑگئی، اس لیے کہ جزائے نیک اور بدکار کا معیار تو بغض علی پر ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن جو مخلوق کو گمراہی سے بچانے کے لیے اترا تھا اس میں ہدایت کی صفت ہی نہیں اس لیے کہ جو کام وہ نجات کی بات ہے یعنی حب علی و بغض علی وہ تو قرآن میں مذکور ہی نہیں اور اگر مذکور ہوا بھی تو اس پیرائے میں ہرگز نہیں جو ہر مکلف کے ذہن نشین ہو سکے اور معمہ بجھانے کی ہر ایک میں استعداد و طاقت نہیں گویا قرآن مجید ایسی چیز کی دعوت دیتا ہے جو آخرت کے لیے کسی کام کی نہیں سوائے مشقت، رنج و کلفت وملال اس سے کچھ حاصل نہیں آخرت میں جو بات کام آتی قرآن اسی سے خالی ہے۔

اور پھر ایسی باتیں نفس و شیطان کو مغرور و سرکش اور نافرمان بناتی ہیں اور ان جذبات کو قوی کرتی ہیں یہ

1۔ الأمالي لابن بابويه: ص 658؛ الأمالي للطوسي: 118؛ الأمالي للمفيد: ص 76.

کیسے ممکن ہے کہ انبیاء و اوصیاء نفس و شیطان کا راستہ روکنے کے لیے بھیجے گئے ہیں وہ اپنے منہ سے ایسی باتیں نکالیں پھر ان روایات کے تجربہ کہ آشکار ہونے کے بعد اسی سلسلہ میں ان کی معتبر کتابوں کی ایک اور روایت سنیے تا کہ ان کا باہمی تعارض و تناقض سمجھنے میں مدد ملے یہ روایت ان کے سردار اور پیشوا حسن بن قیس نے بحوالہ ابی ذر رضی اللہ عنہ بیان کی ہے:

نظر النبي صلى الله عليه وسلم إلى علي ابن أبي طالب فقال «هذا خير الأولين وخير الأخرين من أهل السماوات وأهل الأرض، هذا سيد الصديقين، هذا سيد الوصيين وإمام المتقين قائد الغر المحجلين. إذا كان يوم القيامة كان على ناقة من نوق الجنة قد أضاءت عرصهة القيامة من ضوئها، على رأسه تاج مرصع من الزبرجد والياقوت. فنقول الملائكة: هذا ملك مقرب، ويقول النبيون: هذا نبي مرسل. فينادي المنادي من تحت بطنان العرش: هذا الصديق الأكبر، هذا وصي حبيب الله علي بن أبي طالب، فيقف على متن جهنم فيخرج منها من يحبه ويدخل فيها من يبغضه، ويأتي أبواب الجنة فيدخل فيها من يشاء بغير حساب».[1]

وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن ابی طالب کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ یہ اسمانوں اور زمین کے بسنے والے سب اگلوں پچھلوں سے بہتر ہے یہ صدیقوں کا سردار ہے اور وصیوں کا بھی پرہیزگاروں کا پیشوا ہے اور محجلین (جن کے چہرے اور ہاتھ پاؤں سفید ہوں) کا رہبر، قیامت کے دن یہ جنت کی کسی اونٹنی پر سوار ہو گا جس کی روشنی سے میدان قیامت جگمگا اٹھے گا اس کے سر پر زبرجد اور یاقوت سے جڑا ہوا تاج ہو گا پس ملائکہ کہیں گے یہ ایک مقرب فرشتہ ہے اور

1۔ هذه روايات الإمامية! ابن شاذان، مائة منقبة: ص 89؛ الأربلي، كشف الغمة: 1/ 345.

نبی کہیں گے یہ نبی مرسل ہے اس وقت بطنان عرش کے نیچے سے آواز آئے گی کہ یہ صدیق اکبر ہے یہ حبیب کا وصی ہے یعنی علی بن ابی طالب پھر یہ پوچھتے جہنم پر جا کھڑا ہو گا اس میں سے اپنے دوستوں کو نکالے گا اور دشمنوں کو جھونکے گا پھر جنت کے دروازہ پر آئے گا اور اس میں جسے چاہے گا بے حساب داخل کرے گا۔

اس روایت سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ محبان علی بھی اپنے گناہوں کی پاداش میں جہنم رسید ہوں گے اور عذاب بھگتنے کے بعد آپ ان کو اس سے نکالیں گے تو یہ محبان علی وہاں کیوں اور کیسے چلے گئے ان پر تو آتش دوزخ حرام تھی، ابن بابویہ قمی کی بحوالہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ایک اور روایت سنیے:

أنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم «إن عبدا مكث في النار سبعين خريفا كل خريف سبعون سنة، ثم إنه سأل الله تعالى بحق محمد وآله أن يرحمه فأخرجه من النار وغفر له»[1]

کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک بندہ جہنم میں ستر خریف تک ہر خریف ستر سال کا ہو گا داخل رہے گا فرمایا پھر وہ محمد اور ان کی آل کا واسطہ دے کر اللہ سے کہے گا کہ وہ اس پر رحم فرمائے تو اللہ تعالیٰ جہنم سے اسے نکال دے گا اور اس کی مغفرت فرمادے گا۔

اب اگر یہ شخص محب علی تھا تو اتنی مدت تک یہ دوزخ میں کیا کرتا رہا اور دشمن علی تھا تو اس کی معافی اور دخل جنت یہ کیوں؟

ان روایات کا آپ شیعوں کی طرف سے حسب دستور قدیم یہی جواب سمجھ لیں کہ دروغ گو را حافظہ نباشد، حقیقت اور بالکل ظاہر بات یہی ہے کہ جو شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عقیدہ کا مخالف ہو گا اس کو ان کی زبانی کلامی بلکہ دلی محبت بھی ہرگز ہرگز کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گی جبکہ وہ آپ کے طریقہ اور راستہ چھوڑ کر گمراہ ہوں شیطانوں جھوٹوں اور روایات کا کاروبار کرنے والوں کے پیچھے چل پڑا ہو اور صراط مستقیم گم کر بیٹھا ہو۔

---

1 ۔ الأمالي: ص 672، المفيد، الأمالي: ص 218؛ الشعيري، جامع الأخبار: ص 143.

اس صورت میں یہ بھی لازم اتا ہے کہ خاتون جنت جناب سبطین اور دیگر ائمہ کی ولایت کا انکاری مگر جناب امیر ؓ کی محبت کا دم بھرنے والا بھی جنتی ہو اور دوزخ کا عذاب اسے چھو بھی نہ سکے حالانکہ اسی معلم نے کہ جس کو یہ مفید کے لقب سے یاد کرتے ہیں اپنی کتاب المعراج میں یوں روایت کی ہے:

أن الله تعالى قال «يا محمد، لو أن عبدا عبدني حتى يصير كالشن البالي [ثم] أتاني جاحدا لولاية محمد وعلي وفاطمة والحسن والحسين ما أسكنته جنتي»[1]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد میرے کسی بندہ نے میری اتنی زیادہ عبادت بھی کی ہو کہ وہ پرانی مشک کی طرح ہو گیا پھر اگر وہ میرے پاس اسی حالت میں آئے کہ محمد و علی فاطمہ حسن و حسین کی ولایت کا منکر ہو تو میں اسے جنت میں گھسنے بھی نہیں دوں گا۔

تو معلوم ہوا کہ کیسانیہ سبطین ؓ کی ولایت کے انکار کے باوجود اور غلاۃ جناب امیر کے عقیدہ کے مخالف ہونے کے باوصف ناجی اور بہشتی ہوں گے (اس وقت اماموں پر کیا گزرے گی)

اگر امامیہ یہ کہیں کہ اس روایت میں پانچوں کا انکار ولایت مراد ہے اور ان میں جناب امیر ؓ بھی ہیں تو شاید اس شخص کی عبادت انہی کے سبب نام قبول ہوئی ہو کہ وہ جناب امیر کی ولایت سے انکار کرتا تھا تو ہم کہتے ہیں کہ اس سورت میں ولایت محمد ﷺ سے انکار کرنا بھی جو بالاجماع کفر ہے اعمال کے سوخت ہو جانے کے لیے کافی ہو گا اور انکار ولایت علی کا اس میں کوئی دخل نہ ہو گا لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس روایت میں ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ انکار ولایت مقصود ہے اور یہ ہمارے مدعا کے لیے کافی ہے۔

اب تک ہمارا روئے سخن اثنا عشریوں کے علاوہ دیگر فرقوں کی طرف رہا ہے اب ہم چاہتے ہیں کہ اثنا عشریوں کے متعلق بھی کچھ بیان کریں معلوم ہونا چاہیے کہ اثنا عشریوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کے علاوہ شیعوں کے تمام فرقے دائمی طور پر جہنمی ہیں ناجی صرف وہی ہیں یہ ان کا مشہور خیال ہے ابن مطہر حلی شرح تجرید میں لکھتا ہے کہ ان فرقوں کے بارے میں ہمارے علماء کا اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے

1۔ تفسیر فرات: ص 73؛ ابن بابویہ، عیون أخبار الرضا: 1/ 58؛ ابن طاوس، الیقین: ص 149.

کیونکہ وہ جنت کا استحقاق نہیں رکھتے بعض دوسرے کہتے ہیں کہ ان کو دوزخ سے نکال کر جنت میں لایا جائے گا[1] ابن نوبخت[2] اور بعض دیگر علماء کہتے ہیں کہ دوزخ سے تو نکلیں گے کہ بہر حال کافر نہیں ہے لیکن جنت میں بھی نہ جا سکیں گے اس لیے کہ ایمان صحیح نہیں رکھتے جو استحقاق کے ثواب جنت کا سبب ہے بلکہ اعراف میں پڑے رہیں گے، صاحب التقویم[3] نے جو امامیہ کے بڑے علماء میں سے ہیں کہا ہے کہ صرف شیعوں میں بہتر فرقے ہیں جن میں نجات پانے والے صرف اثنا عشری ہیں باقی شیعی فرقے کچھ مدت دوزخ کا عذاب بھگت دیں گے پھر جنت میں چلے جائیں گے۔[4]

حاصل کلام یہ کہ یہ ہمیشہ کا عذاب یا کچھ مدت کا محبان جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لیے یقینا ثابت کرتے ہیں ہاں صاحب تقویم یہ بھی کہتا ہے کہ باقی کے تمام اسلام فرقے وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے لہذا معلوم ہو گیا کہ ان کے نزدیک اہل سنت باوجود محبت جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ہمیشہ اور دائماً دوزخی ہیں اس سے ان کا قاعدہ وصول

---

1 ـ شرح تجريد الاعتقاد: ص 423، 424.

2 ـ وهو الحسن بن موسى، أبو محمد النوبختي، قال عنه الذهبي: «العلامة ذو الفنون الشيعي المتفلسف»، وقال عنه النجاشي: «شيخنا المتكلم المبرز على نظرائه في زمانه»، مات بعد سنة 300هـ. رجال النجاشي: 1/ 179؛ سير أعلام النبلاء: 15/ 327؛ لسان الميزان: 2/ 258؛ معجم المؤلفين: 3/ 298.

3 ـ محمد باقر بن محمد الحسيني الأسترآبادي الأصفهاني الملقب عندهم بالمحقق الداماد (ت 1040هـ)، وكتابه (تقويم الإيمان). الذريعة: 4/ 396.

4 ـ رووا عن حمران أنه: «سأل عن المخالفين هل هم ممن يخرجون من النار؟ فقال أبو عبد الله: أما يقرؤون قول الله تبارك (ومن دونهما جنتان) إنها جنة دون جنة ونار دون نار، إنهم لا يساكنون أولياء الله، وقال: بينهما والله منزلة، ولكن لا أستطيع أن أتكلم، إن أمرهم لأضيق من الحلقة، إن القائم لو قام لبدأ بهم». بحار الأنوار: 8/ 359. ويشرح المجلسي فيقول: «قوله عليه السلام: إن أمرهم: أي المخالفين، لأضيق من الحلقة: أي الأمر في الآخرة مضيق عليهم لا يعفى عنهم كما يعفى عن مذنبي الشيعة، ولو قام القائم بدأ بقتل هؤلاء الكفار، فقوله (لا أستطيع التكلم): أي في تكفيرهم تقية»!!. وقال المجلسي أيضا: «والحاصل إن المخالفين ليسوا من أهل الجنان ولا من أهل المنزلة الجنة والنار، وهي الأعراف، بل هم مخلدون في النار ... ». بحار الأنوار: 8/ 360، 361.

جناب امیر رضی اللہ عنہ کا اس بات تھی اور منفی پہلو سے ٹوٹ گیا اب ان کے اسی مذہب کو ذہن میں محفوظ رکھ کر توجہ سے ان کی روایات سنیئے:

ابن بابويه عن ابن عباس عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال «والذي بعثني لايعذب بالنار موحد أبدا»[1]

ابن بابویہ بحوالہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ قسم ہے مجھے مبعوث کرنے والے کی کہ موحد کبھی دوزخ کا عذاب نہیں دیا جائے گا۔

اور طبرسی نے کتاب احتجاج میں حسن بن علی علیہ السلام سے روایت کی ہے:

أنه قال: من أخذ بما عليه أهل القبلة الذي ليس فيه اختلاف ورد علم ما اختلف فيه إلى الله سلم ونجا من النار ودخل الجنة.[2]

انہوں نے کہا کہ جس نے وہ راہ اختیار کی جس میں اہل قبلہ کا کوئی اختلاف نہیں اور اختلافی بات کو اللہ کے حوالے کیا وہ محفوظ رہا اور دوزخ سے نجات پائی اور جنت میں جا پہنچا۔

اور کلینی نے بحوالہ زرارہ بسند صحیح یوں روایت کی:

عنه قال: قالت لأبي عبد الله: أصلحك الله أرأيت من صام وصلى وحج واجتنب المحارم وحسن ورعه ممن لا يعرف ولا ينصب؟ قال: إن الله يدخله الجنة برحمته.[3]

اس نے کہا کہ میں نے ابی عبد اللہ سے کہا اللہ آپ کو نیک بخت کرے اس شخص کے بارے میں

1۔ الأمالي: ص 295؛ التوحيد: ص 29؛ الفتال، روضة الواعظين: 1/ 42.

2۔ الاحتجاج: ص 287.

3۔ الكافي: 2/ 20.

آپ کا کیا خیال ہے جس نے روزہ رکھا نماز پڑھی حج کیا حرام سے بچا پرہیز گاری کا اچھا نمونہ پیش کیا ائمہ کا نہ اقرار کرتا ہے نہ دشمنی رکھتا ہے آپ نے کہا اللہ تعالی اسے اپنی رحمت سے جنت میں داخل کرے گا۔

یہ تینوں روایات اہل سنت کے ناجی ہونے پر صاف دلالت کرتی ہیں اگر ائمہ کی معرفت نہ رکھتے ہوں چہ جائیکہ ان کو مستحق کے امامت جانتے ان کو اپنا پیشوا مانتے اور ان سے محبت ظاہر کرتے ہوں اور ان کے مطالعہ سے ہر سمجھدار پر ظاہر ہو گیا ہے کہ یہ روایات جمہور شیعہ اور صاحب تقویم کے قول کی سختی کے ساتھ تردید کرتی ہیں اور ابن نوبخت نجومی مجوسی کا قول بالکل ہی باطل اور بے بنیاد ہے یہ تو اب تک قواعد اسلام سے نابلد اور نہ آشنا ہے اسے یہ پتہ ہی نہیں کہ اعراف تو ایک عارضی قیام گاہ ہے ہمیشہ رہنے کی جگہ وہ ہے ہی نہیں اصحاب اعراف تو آخر میں بہشت میں بھیج دیئے جائیں گے مسلمانوں کے نزدیک یہی بات صحیح ہے۔

باب نہم

احکام فقہیہ جن میں شیعوں نے ثقلین سے اختلاف کیا ہے

اس باب میں ان فقہی احکام سے بحث کی جائے گی جن میں شیعوں نے کتاب اللہ و عترت سے مخالفت کی ہے اس سلسلہ میں فرمان خداوندی "أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللَّهُ"[1] کیاان کو کوئی شریک مل گیاہے جوان کے لئے دین کی ایسی راہ نکالتا ہے جس کی اللہ تعالی نے اجازت نہیں دی، کا مضمون اس پر بالکل چسپاں ہوتا ہے۔

شیعی فرقوں میں سے کیسانیہ اور غلاۃ کے فقہی مسائل واحکام بابوں، فصلوں میں مرتب اور تصنیف شدہ نہیں ملتے اس لئے کہ اب ان کے اہل علم بھی نہیں ملتے اوران کی تصانیف بھی دستیاب نہیں لیکن یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ مختار ثقفی نے کافی کچھ احکامات نکالے اوران کو شریعت قرار دیا تھاوہ کہتا تھا کہ جبریل میرے پاس آتے اوروحی لاتے ہیں،[2] اسی کی روشنی میں اندازہ لگالیاجائے کہ اس کے فقہی احکام کی کیا حقیقت ہوسکتی ہے۔

زیدیوں کے مجتہدین نے شریعت کے بہت سے احکام من مانے طور پر ترتیب دے لئے ہیں، یمن کے اکثر شہروں میں ان کے علماء بھی ملتے ہیں اور کتابیں بھی دستیاب ہیں کتاب الاحکام ان کی مشہور ومعروف کتاب ہے۔

عبیدیوں کے ظہور سے پہلے اسماعیلیہ اکثر مسائل میں امامیہ سے متفق تھے ان کے خروج کے بعد بہت سے دوسرے مسائل بھی گھڑے گئے چنانچہ ان کے کچھ مسائل اوراق ماسبق میں بھی بیان ہوئے ہیں۔

قرامطہ اور باطنیہ نے تو شرائع واحکام کو سرے سے ہی ختم کرنا مقصد قرار دیاہے اسی لیے ظاہر پر عمل

1۔ سورۃ الشوری،الایۃ :21

2۔ شاعت في الناس أخبار عنه بأنه ادعى النبوة ونزول الوحي عليه، وأنه كان لا يوقف له على مذهب، ونقلوا عنه أسجاعا، قيل: كان يزعم أنها من الإلهام...وعمل مصعب بن الزبير، وهو أمير البصرة بالنيابة عن أخيه عبد الله، على خضد شوكة المختار، فقاتله، ونشبت وقائع انتهت بحصر المختار في قصر الكوفة، وقتله ومن كان معه. ومدة إمارته ستة عشر شهرا".(الاعلام للزركلي،مخ، مختار الثقفي، 7/ ١٩١،١٩٢، ط:دار العلم للملايين)

نہ کرنا ہی اپنا شعار بنایا ہے لہٰذا فقہ اور شریعت کی در حقیقت اصلی دشمن یہی ہے اس وقت ہمارے دیار و امصار میں اثناء عشری فرقہ کے علاوہ کوئی اور فرقہ ایسا نہیں جس کے احکام و مسائل مدون انداز میں تصانیف کی صورت میں ملتے ہوں، یہ مناسب بھی ہے اور ضروری بھی کہ ان کی کتب فقہ کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے اور ان کا اسلوب شرعی اسلوب کے جس قدر مخالف یا بنا ہوا ہو اس کو واضح اور ظاہر کیا جائے تاکہ اہل دانش و بینش ان کی دروغ گوئی، افترا پردازی بناوٹ اور گھڑنت سے آگاہ ہو کر اس کا پورا پورا کھوج لگا سکیں مسائل فقہیہ میں گو اہل سنت کے ہاں بھی اختلاف ہے، لیکن ہر ایک کا اعتماد و استدلال قرآن و حدیث و آثار ہی پر ہے لیکن چونکہ ہر ایک کا طریق معنی فہمی جدا ہے اور شرائع بھی جدا اس لیے اختلاف ناگزیر ہوا بخلاف ان حضرات کے کہ ان کی خاص شرائع قرآن و حدیث کے اسلوب سے بالکل میل نہیں کھاتے ان کے متعلق آدمی یہی سوچتا ہے کہ یہ یہودی شریعت ہے یا نصاریٰ کی؟ یہ ہندوؤں کا وید اور شاستر ہے یا صابیوں کی وساتیر؟ یہ بحث چونکہ نہایت طویل الذیل ہے اس لیے مجبوراً بطور نمونہ مختصر سا بیان کرتے ہیں کہ عقلمند کو اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تکفیر کرنا

ان کے احکام میں پہلا حکم صحابہ اور خلفاء ثلاثہ نیز چند امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو جو بالاجماع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب تر تھی کافر ٹھہرانا ہے،[1] اس حکم کا کتاب اللہ کے مخالف ہونا روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔

---

1 ۔ ارتد الناس الا ثلاثة نفر سلمان وابو ذر و المقداد فقلت فعمار قال کان حیص حیصة ثم رجع قال ان اردت الذی لم یشک ولم یخله شیئ فالمقداد۔(مجالس المومنین ،1/ 367، 368، تحت ذکر مقداد بن الاسود ، ط، دار هشام و بحار الانوار 27/ 239 ، نقلا عن رجال کشی)

وترید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض...الخ ، مفضل نے پوچھا کہ اس ایت میں فرعون وہامان سے کون مراد ہیں فرمایا ابو بکر و عمر۔ (تحقیق المتین اردو ترجمہ حق الیقین از مجلسی، باب 5، مقصد 9، حدیث مفضل در باب رجعت، ص:468، طبع غلام عباس فیجر امامیہ جنرل بک ایجنسی لاہور)

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں ملا باقر مجلسی نے لکھا ہے: اسی طرح اس آیت میں حق تعالیٰ نے جس میں کہ حفصہ و عائشہ کی مثال بیان کی ہے فرمایا ہے کہ ان عورتوں کی مثال زن نوح ولوط کی سی ہے وہ دونوں ہمارے دو نیک بندوں کے تصرف میں تھیں پھر ان دونوں نے ان سے خیانت کی تو ان بندوں نے عذاب خدا سے بچانے میں ان کو کوئی فائدہ نہ پہنچایا اور ان عورتوں سے کہا گیا کہ دوزخ کی آگ میں جہنم والوں کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ (ترجمہ حیات القلوب، جلد اول صفحہ 173، ط: مطبع نامی منشی نول کشور لکھنؤ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر لعنت کرنے کو ذکر پر فضیلت دینا

دوسرا حکم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر لعنت اللہ کے ذکر سے بھی افضل ہونا ہے،[1] حالانکہ کسی بھی دین و شریعت میں ابلیس تک پر جو گمراہی کا اصل الاصول ہے لعنت کرنے کو اطاعت و عبادت شمار نہیں کیا گیا چہ جائے کہ اس کو حج سے بڑی اور افضل اطاعت مانا جائے قرآن مجید میں صاف آتا ہے "وَلَذِكْرُ اللهِ أَكْبَرُ"[2] اللہ کا ذکر سب سے بڑی عبادت ہے۔

نماز کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر لعنت کرنا

تیسرا حکم ہر نماز پنجگانہ کے بعد کبار صحابہ مہاجرین و انصار خلفاء ثلاثہ اور عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم کی اکثریت پر لعنت بھیجنا واجب اول قرار دینا ہے،[3] یہ حکم بھی تمام ادیان و شرائع کے اسلوب کے خلاف ہے اس لیے کہ تمام انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے دشمن گزرے ہیں مثال کے طور پر فرعون کو ہی لے لو کئی سال بنی اسرائیل اس کے مظالم کا تختہ مشق بنے رہے کون سی ایذاء تھی جو ان کو نہ دی گئی قرآن مجید میں یہ آیت دیکھیے:

وَإِذْ أَنجَيْنَاكُم مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُقَتِّلُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ[4]

اور جب ہم نے تم کو آل فرعون سے نجات دلائی جو تم کو سخت عذاب سے ستاتے تھے اور تمہارے لڑکوں کو قتل کرتے اور تمہاری لڑکیاں زندہ رہنے دیتے۔

1۔ ای عزیز آیا بعد از این حدیث کہ ہمہ عامہ روایت کردہ اند ہیچ عاقل را مجال آن ہست کہ شک کند در کفر عمر و کفر کسے کہ عمر را مسلمان داند۔ (حیات القلوب، باب شصت وسوم در وصیت حضرت رسول، 2/842، ط: مطبع نامی منشی نولکشور لکھنؤ)

2۔ سورۃ العنکبوت، الآیۃ: 45

3۔ وبسند معتبر منقول است کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام از جائے نماز خود بر نمی خاستند تا چہار ملعون و چہار ملعونہ را لعنت نمیکردند پس باید بعد از ہر نماز بگوید "اللھم العن ابابکر و عمر وعثمان ومعاویۃ وعائشہ و حفصہ و ھندا و ام الحکم" (عین الحیات، ص: 599، ط: انتشارات کتاب فروشی اسلامیہ تہران ایران)

4۔ سورۃ الاعراف، الآیۃ: 141

یا فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ [1]

اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے شیطان آدمی بھی رکھے۔

اس سب کے باوجود کسی بھی ملت و شریعت میں نبیوں اور رسولوں کے دشمنوں میں سے کسی پر بھی لعنت کو فرض وواجب قرار نہیں دیا گیا نہ بعد نماز اس کو وظیفہ مقرر کیا فرض وواجب تو رہے الگ مستحب بھی نہیں بنایا اور نہ اس پر اجر ثواب رکھا۔

عید غدیر

چوتھے عید غدیر کے نام سے ایک نئی عید اختراع کر لی جو 18 ذی الحجہ کو مناتے ہیں، اسے عید الفطر و عید الاضحی پر بھی فضیلت دیتے ہیں اور اسے عید اکبر کہتے ہیں، [2] یہ حکم بھی شرع کے صریحاً مخالف ہے۔

عید بابا شجاع

پانچویں ایک اور عید بنام بابا شجاع الدین مقرر کر لی یہ ان کے نزدیک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قاتل ابو لولو [3] کا لقب ہے جو آتش پرست مجوسی تھا ان کے گمان کے مطابق اس عید کا دن 9 ربیع الاول ہے روایت ملاحظہ ہو:

1۔ سورۃ الانعام، الایۃ: 112

2۔ اسلام کی تین صدیوں میں اس عید کا کوئی تصور نہ تھا، اس دن عید کی ابتدا کرنے والا ایک حاکم معز الدولہ گزرا ہے، اس شخص نے 18 ذوالحجہ 351ہجری کو بغداد میں عید منانے کا حکم دیا تھا اور اس کا نام "عید غدیر خم" رکھا علامہ ابن اثیر کی "الکامل" ملاحظہ فرمائیں: وفيها في ثامن عشر ذي الحجة أمر معز الدولة بإظهار الزينة في البلد وأشعلت النيران بمجلس الشرطة وأظهر الفرح وفتحت الأسواق بالليل، كما يفعل ليالي الأعياد فعل ذلك فرحا بعيد الغدير يعني غدير خم وضربت الدبادب والبوقات وكان يوما مشهودا۔ (الكامل في التاريخ الابن الاثير، 8/ 550،549، ط، دار صادر للطباعة والنشر دار بيروت للطباعة والنشر بيروت، 1965ء، وفي تاريخ أبي الفداء 2/ 104: ثامن ذي الحجة)

3۔ أبو لؤلؤة فيروز غلام المغيرة بن شعبة. ينظر تاريخ الطبري: 2/ 559.

روى علي بن مظاهر الواسطي عن أحمد بن إسحاق أنه قال: هذا اليوم يوم العيد الأكبر ويوم المفاخرة، ويوم التبجيل، ويوم الزكاة العظمى، ويوم البركة، ويوم التسلية.[1]

علی بن مظاہر واسطی نے احمد بن اسحاق سے روایت کی اس نے کہا کہ یہ دن عید اکبر کا دن ہے یہ دن بغلیں بجانے اور تعظیم کا دن ہے، یہ دن بڑی زکوۃ کا دن ہے، یہ دن برکت اور تسلی و اطمینان کا دن ہے۔

احمد بن اسحاق[2] وہ پہلا شخص ہے جس نے شیعوں کے لیے وہ عید مقرر کی بعد والوں نے یہ لکیر پھوٹی اور چند ہی دنوں میں اس عید کے منانے کی نسبت کا رخ ائمہ کی طرف کر دیا، حالانکہ دراصل یہ عید مجوسیوں کی تھی کہ ان کے ایک فرد نے اسلام کا ایک ستون منہدم کر دیا تھا اور جس کی خبر سن کر انہوں نے اظہار فرحت و شادمانی کا جشن بنایا تھا اور اس دن کو انتقام کا دن فخر کا دن اور تسلی کا دن کہا اس لیے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے

1۔ المختصر، لحسن بن سليمان الحلي، الصفحة ١٠٠، انتشارات المكتبة الحيدرية و نقل المجلسي عن الواسطي بإسناد متصل عن محمد بن العلاء الهمداني ويحيى بن محمد بن جريج قالا: «تنازعنا في ابن الخطاب فاشتبه علينا أمره فقصدنا أحمد بن إسحاق القمي صاحب أبي الحسن العسكري عليه السلام بمدينة قم وقرعنا عليه الباب، فخرجت إلينا صبية عراقية من داره، فسألناها عنه، فقالت: هو مشغول بعيده فإنه يوم عيد ... فلما خرج وسألاه عنه هذا اليوم - وكان التاسع من شهر ربيع الأول - فقال دخلت في مثل هذا اليوم على سيدي أبي الحسن علي بن محمد العسكري، فقال: إني لأعرف لهذا اليوم اثنين وسبعين اسما، وكان يوم التاسع من شهر ربيع الأول قال أمير المؤمنين: هذا يوم الاستراحة ... » الخ. بحار الأنوار: 31/ 125 - 128.

2۔ أحمد بن إسحاق بن عبد الله بن سعد بن مالك بن الأحوص الأشعري، أبو علي القمي، كان الرسول بين القميين وأئمتهم فيأتي إليهم ويأخذ المسائل عنهم، ذكره الكليني فيمن رأى إمام الشيعة الغائب في كتاب الحجة من الكافي، وقال شيخ الطائفة: «وقد كان في زمان السفراء المحمودين أقوام ثقات ترد عليهم التوقيعات من قبل المنصوبين للسفارة أصلا ومنهم أحمد بن إسحاق»!، له: (كتاب علل الصوم) و (مسائل الرجال). رجال النجاشي: 1/ 234. الطوسي، الغيبة: ص 414.

ہاتھوں ان پر اور ان کے دین پر اور ان کی سلطنت پر جو آفت ٹوٹی تھی وہ ظاہر ہی ہے اس لیے وہ تو اس دن کو یوم العید بتاتے ہیں، رہا تاریخ کا معاملہ تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت بلا اختلاف 28 ذی الحجہ کو واقع ہے اور یکم محرم کو آپ مدفون ہوئے،[1] اگر ان کے بقول ائمہ یہ عید مناتے تھے تو تاریخ کی تبدیلی کیوں کی؟ ویسے شیعہ خود بھی اس کے معترف ہیں کہ ائمہ کے زمانہ میں اس عید کا وجود نہ تھا اس کا موجد اول احمد بن اسحاق ہی ہے۔

1۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت چھبیس(26) ذی الحجہ تیئس (23) ہجری بروز چہار شنبہ بمطابق 31 اکتوبر 644 عیسوی کو نماز فجر میں ابولؤلؤ مجوسی کے خنجر سے زخمی ہوئے، تین راتیں زخمی حالت پر زندہ رہے، 29 ذی الحجہ بمطابق تین نومبر کو وصال ہوا، یکم محرم سن چوبیس (24) ہجری کو روضۂ اطہر میں آسودۂ خاک ہوئے، حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی، یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس باب میں روایات اور تعبیرات کا اختلاف ہے، اور یہ مسئلہ چوں کہ از قبیل عقائد یا اعمال نہیں ہے، محض علمی و تاریخی ہے، اس لیے اس میں زیادہ الجھنے کی یا بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں ہے، البداية والنهاية للحافظ ابن كثير الدمشقي میں ہے: "فاتفق له ان ضربه ابو لؤلؤة فيروز المجوسي الاصل الرومي الدار وهو قائم يصلي في المحراب صلاة الصبح من يوم الاربعاء لاربع بقين من ذي الحجة من هذه السنة بخنجر ذات طرفين..." ومات رضى الله عنه بعد ثلاث ودفن يوم الاحد مستهل المحرم من سنة اربع وعشرين بالحجرة النبوية الى جانب الصديق عن اذن ام المؤمنين عائشة رضي الله عنها في ذلك وفي ذلك اليوم حكم امير المؤمنين عثمان بن عفان رضي الله عنه، قال الواقدي رحمه الله حدثني ابو بكر بن اسماعيل بن محمد بن سعد عن ابيه قال طعن عمر يوم الاربعاء لاربع ليال بقين من ذي الحجة سنة ثلاث وعشرين ودفن يوم الاحد صباح هلال المحرم سنة اربع وعشرين فكانت ولايته عشر سنين وخمسة اشهر واحدا وعشرين يوما وبويع لعثمان يوم الاثنين لثلاث مضين من المحرم قال فذكرت ذلك لعثمان الاخنس فقال ما اراك الا وهلت توفي عمر لاربع ليال بقين من ذي الحجة وبويع لعثمان لليلة بقيت من ذي الحجة فاستقبل بخلافته المحرم سنة اربع وعشرين وقال ابو معشر قتل عمر لاربع بقين من ذي الحجة تمام سنة ثلاث وعشرين وكانت خلافته عشر سنين وستة اشهر واربعة ايام وبويع عثمان ابن عفان، وقال ابن جرير حدثت عن هشام بن محمد قال قتل عمر لثلاث بقين من ذي الحجة سنة ثلاث وعشرين فكانت خلافته عشر سنين وستة اشهر واربعة ايام وقال سيف عن خليد بن وفرة ومجالد قالا استخلف عثمان لثلاث من المحرم فخرج فصلى بالناس صلاة العصر وقال علي بن محمد المدائني عن شريك عن الاعمش او جابر الجعفي عن عوف بن مالك الاشجعي وعامر بن ابي محمد عن اشياخ من قومه وعثمان بن عبدالرحمن عن الزهري قال طعن عمر يوم الاربعاء لسبع بقين من ذي الحجة والقول الاول هو الاشهر والله سبحانه وتعالى اعلم". (خبر سلمة بن قيس الأشجعي والأكراد، ج:7، ص:138، ط: مكتبة المعارف)

نوروز کی تعظیم

چھٹے نوروز کے دن کی تعظیم کے یہ بھی مجوسیوں کی عید ہے،[1] ابن فہد نے مہذب نامی کتاب میں لکھا ہے کہ یہ سب دنوں میں بڑا دن ہے اور اس تعظیم کا مقصد اسلام میں محض جاہلیت کے رسوم رائج کرنا ہے بطریق صحیح امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

کوئی شخص نوروز کے دن حلوہ و فالودہ لایا آپ نے دریافت فرمایا آج کیا خاص بات ہے جو یہ لائے ہو اس نے کہا آج نوروز کا دن ہے اس پر آپ نے فرمایا "نیروزنا کل یوم و مهرجاننا کل یوم" ہمارا ہر دن نوروز ہے ہمارا ہر سورج ہر دن طلوع ہوتا ہے۔[2]

یہ دراصل ایک دقیقہ کی طرف اشارہ ہے کہ نوروز کی ایک ہی بات تو نہیں ہے کہ آفتاب اپنی حرکت و رفتار خاص سے معدل النہار سے عرض شمالی میں رہنے والوں کی طرف رخ کرتا ہے اور ان سے نزدیک تر ہوتا ہے اس کی وجہ سے ابدان واجسام میں گرمی و حرارت پیدا ہوتی ہے اور قوت نامیہ بھڑک اٹھتی ہے اور نفس نباتی تازگی حاصل کرتا ہے مگر یہی بات روزانہ طلوع آفتاب کے وقت زیادہ پائی جاتی ہے کیونکہ اولی سے جو سب سے تیز اور سب سے ظاہر حرکت ہے دائرہ افق سے گزر کر اہالیان افق پر نور افشانی کرتا ہے قوت بصر کو جلا بخشتا ہے روح میں تازگی و بشاشت پیدا کرتا ہے اور بہت سے انسانی منافع مثلاً زراعت، تجارت، صنعت و حرفت میں بہتری کا باعث ہوتا ہے گویا موت کے بعد آثار حیات نمودار ہوتی ہیں جیسا کہ ارشاد فرمایا:

1۔ بوب العاملي بابا في كتابه الوسائل (8/ 172) بعنوان: (استحباب صلاة يوم النيروز والغسل فيه والصوم ولبس أنظف الثياب والطيب وتعظيمه وصب الماء فيه) وبوب له المجلسي أيضا في كتابه وأخرج عن المعلى بن خنيس عن الصادق أنه قال: «إذا كان النيروز فاغتسل والبس أنظف ثيابك وتطيب بأطيب طيبك وتكون ذلك اليوم صائما». بحار الأنوار: 59/ 101. ومع ذلك لديهم نهي الرسول عن أعياد المشركين فقد أخرج النوري عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: «إن الله تعالى أبدلكم بيومين يوم النيروز والمهرجان الفطر والأضحى». مستدرك الوسائل: 6/ 32.

2۔ أخرجها البيهقي في السنن الكبرى: 9/ 235؛ البخاري في التاريخ الكبير: 4/ 200؛ الخطيب البغدادي في تاريخ بغداد: 13/ 326. ومن الإمامية ابن حيون في دعائم الإسلام: 2/ 328؛ النوري في مستدرك الوسائل: 6/ 353

جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاسًا وَالنَّوْمَ سُبَاتًا وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا[1]

رات کو تمہارے لیے لباس نیند کو ارام و سکون اور دن کو پھیلانے والا بنایا، یا فرمایا:

وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا، وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ، وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا[2]

ہم نے تمہاری نیند کو ارام رات کو لباس اور دن کو معاش بنایا۔

تو اگر اس میں عید بنانے کی کوئی بات ہے ہی تو اس وقت کو بناؤ کیونکہ یہ منافع ہر روز اسی وقت فیض عام کی طرح نوع بشر کو حاصل ہوتے ہیں اگر عقلمند اس معاملہ میں غور کریں تو اسے پتہ چلے گا کہ دن رات کے ایک چکر میں سال میں آنے والے چار موسموں کی کیفیات پائی جاتی ہیں کہ صبح سے لے کر دو پہر تک فصل ربیع کی کیفیت ہے کہ سبزہ تر و تازہ اور پھول کھلے ہوتے ہیں، حیوانی مزاج نشاط میں ہوتے ہیں، جب آفتاب نصف النہار پر پہنچا تو گویا اپنی حرکت خاص سے سرطان پر آیا موسم گرما کی کیفیت کا اغاز ہوا پژ مردگی رونما ہوئی یبوست، خشکی جسموں میں غالب آنے لگی اور جب غروب کی طرف جھکا تو گویا میزان میں آیا کہ فصل خرید کی کیفیات شروع ہوئی اور جب آدھی رات ہوئی تو گھٹاؤ سے بڑھاؤ کی طرف رواں ہوا تو گویا اب راس جدی پر آیا اور موسم سرما کی کیفیات کا آغاز ہوا شبنم برف کی طرح برسنا شروع ہوئی۔

ظالم بادشاہ کو سجدہ جائز ہے

ساتویں جابر و ظالم بادشاہوں کے لیے سجدہ جائز قرار دینا،[3] آخون باقر مجلسی اور ان کے دوسرے علماء نے اسے جائز رکھا ہے حالانکہ قواعد کلیہ شرعیہ کے یہ بات سری خلاف ہے جیسا کہ فرمایا:

لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ[4]

1۔ سورة الفرقان، الآية : 47

2۔ سورة النبا، الآية : 9، 10، 11

3۔ بحار الأنوار: 12/ 339.

4۔ سورة فصلت، الآية : 37

چاند سورج کو سجدہ مت کرو سجدہ اسی ذات اللہ کو کرو جس نے ان کو پیدا کیا اگر تم اسی کی عبادت کرنا چاہو۔ یا ارشاد فرمایا:

أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ[1]

اس اللہ کو سجدہ کیوں نہیں کرتے جو آسمانوں اور زمین میں پوشیدہ چیزوں کو نکالتا ہے اور جو ان کو بھی جانتا ہے جو تم چھپا کر یا اعلانیہ کرتے ہو۔

غرض بہت سی آیات ہیں جو دلالت کرتی ہیں کہ سجدہ خاص طور پر شریعت مصطفوی میں اسی ذات برحق اللہ تعالی کے لیے خاص ہے جو طاقت والا ہے اور ہر پوشیدہ و ظاہر چیز کا جاننے والا ہے۔

اور یہاں حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سجدہ کرنے سے استدلال یکسر غلط ہے اور بے اصل بات ہے اس لیے کہ انسانوں کے احکام کو فرشتوں کے معاملہ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا (اس کے علاوہ وہاں خاص طور پر اللہ تعالی کا حکم صریح تھا کہ آدم کو سجدہ کرو وہ تعمیل حکم الہی تھی اور کسی دین و مذہب اور شریعت کا اس وقت نہ کوئی وجود تھا نہ یہ مکلفین کا سجدہ اصطلاحی تھا)

اسی طرح یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں کا سجدہ بھی نظیر نہیں بن سکتا کہ وہ اول تو اصطلاحی سجدہ نہ تھا[2] دوسرے سابقہ شریعتوں سے تمسک اس وقت درست ہو سکتا ہے کہ ہماری شریعت میں اسے منسوخ نہ کیا گیا ہو اور یہ سجدہ ہماری شریعت میں منسوخ کر دیا گیا ہے اگر یہ منسوخ قرار نہ دیا گیا ہوتا تو پھر اس کے زیادہ حقدار حضور صلی اللہ علیہ وسلم جناب امیر اور جناب سیدین و دیگر ائمہ رضی اللہ عنہم ہو سکتے تھے، یہ جابر و ظالم شاہ عباس و طہماسپ کیوں حقدار ہوئے؟

1۔ سورۃ النمل، الآیۃ: 25

2۔ الجامع لأحکام القرآن: 1/ 289.

مسائل فقہیہ

اب احکام کے ذکر کرنے کے بعد ہم مسائل فقہیہ کو لیتے ہیں:

نجس پانی کو پاک قرار دینا

ان کے نزدیک وہ پانی پاک ہے جس سے استنجا کیا گیا ہو اور ابھی محل استنجا بھی پاک نہ ہوا ہو اور اجزاء نجاست پانی میں تحلیل ہو گیا ہوں تا آنکہ پانی کا وزن بھی بڑھ گیا ہو۔[1]

یہ مسئلہ قواعد شرع کے صریحاً خلاف ہے کیونکہ شرعی حکم "وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ"[2] یہ نبی تم پر گندی اور پلید چیزیں حرام کرتا ہے، اور یہ مسئلہ ائمہ کی روایات کے بھی مخالف ہے جیسا کہ قرب الاسناد نامی کتاب کے مرتب نے علی بن جعفر سے انہوں نے اپنے بھائی موسیٰ بن جعفر سے روایت کی ہے اور جیسا کہ ابو جعفر طوسی نے عبد اللہ بن سنان اور ابی بصیر دونوں سے اور ان دونوں نے ابی عبد اللہ سے روایت کی اور جس طرح کتاب المسائل میں علی بن جعفر سے روایت ہے کہ:

أنه قال سألت أخي موسى بن جعفر عن جرة فيها ألف رطل من ماء وقع فيه أوقية بول هل يصح شربه أو الوضوء منه؟ قال: لا، النجس لا يجوز استعماله.[3]

کہتے ہیں کہ میں نے اپنے بھائی موسیٰ بن جعفر سے اس مٹکے کے بارے میں پوچھا جو جس میں ایک ہزار رطل پانی ہو مگر اس میں ایک اوقیہ پیشاب پڑ گیا ہو کہ کیا ایسا پانی پینا جائز ہے اور اس

1۔ عن محمد بن النعمان أنه قال لأبي عبد الله (عليه السلام): أخرج من الخلاء، فأستنجي الماء فيقع ثوبي في ذلك الماء الذي استنجيت به؟ فقال: لا بأس به، ليس عليك شيء. (وسائل الشيعة إلى تحصيل مسائل الشريعة، باب طهارة ماء الاستنجاء،3/ 501، ط: مؤسسة آل البيت عليهم السلام لاحياء التراث و مثلهم في كتبهم مثل شرائع الإسلام: 1/ 22؛ مختلف الشيعة: 1/ 236)

2۔ سورة الاعراف ، الاية : 157

3۔ مسائل جعفر بن علي: ص 198 . وأخرجها الهمداني في مصباح الفقيه: 1/ 30 ، 31؛ والعاملي في وسائل الشيعة: 1/ 156

سے وضو صحیح ہو جائے گا آپ نے فرمایا نہیں وہ نجس ہے اس کا استعمال جائز نہیں۔

اور اس میں لطف کی بات یہ ہے کہ اثنا عشری مذہب اسی کے موافق بھی ہے کہ جب پانی ایک کُر سے کم ہو تو وہ نجاست پڑ جانے سے ناپاک ہو جاتا ہے[1] مگر اس کے باوجود معلوم نہیں استنجا کے پانی میں مکانات کے اس بار دبرد ہو جانے کے بعد وہ کون سے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں کہ اس کی نجاست پڑ جانے کے بعد بھی پانی ناپاک نہیں ہوتا۔

اس مسئلہ نیز عنقریب آنے والے دوسرے مسائل سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک انسانی براز ایسا ہی پاک ہے جیسا ہندوؤں کے ہاں گائے کا گوبر پاک ہے، اگر کوئی اثنا عشری اس مسئلہ سے انکار کرے تو ابن مطاہر حلی کی کتاب منتہا ابھی دنیا سے نابود نہیں ہوئی ان کے کتب خانوں میں یقیناً موجود ہوگی اسے کھول کر دیکھئے جس میں اس نے استنجے کے پانی کی پاکی بیان کر کے دوبارہ اس کے استعمال کے جواز پر پورے فرقہ کا بیان کیا ہے۔

شراب کی طہارت کا مسئلہ

دوسرا مسئلہ شراب کی طہارت کا ہے جس کے متعلق ابن بابویہ، جعفی اور ابن عقیل کی نصوص موجود ہیں کہ پاک ہے،[2] یہ مسئلہ بھی صریح قرآنی آیت کے خلاف ہے:

إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ[3]

شراب، جوا، بت اور پانسے نجس اور کار شیطان ہے۔

---

1 ۔روی الكليني عن أبي بصير قال: «سألت أبا عبد الله عليه السلام عن الكر من الماء كم يكون مقداره؟ قال: إذا كان الماء ثلاثة أشبار في مثله ثلاثة أشبار ونصف في عمقه في الأرض، فذلك الكر من الماء». الكافي: 3/ 3؛ الطوسي، تهذيب الأحكام: 1/ 42.

2 ۔ قال: «لا بأس بالصلاة في ثوب أصابه خمر لان الله تعالى حرم شربها ولم يحرم الصلاة في ثوب أصابته». من لا يحضره الفقيه: 1/ 73.

3 ۔ سورة المائدة، الاية: 90

لغت میں رجس سخت نجاست کو کہتے ہیں(ان اشیاء اعمال میں ظاہری اور معنوی دونوں قسم کی نجاستوں کاذکر ہے)اس لیے خنزیر کے بارے میں فرمایا" فَإِنَّهُ رِجْسٌ "(1) بلاشبہ وہ مجسمہ نجاست ہے۔

اور پھر یہ ائمہ کی ان روایات کے بھی خلاف ہیں جو خود شیعوں کی کتابوں میں موجود و مذکور ہیں صاحب قرب الاسناد اور صاحب کتاب المسائل دونوں نے یہ روایات بیان کی ہیں اور ابو جعفر طوسی نے ابو عبداللہ سے یوں روایت بیان کی ہے" أنه قال: لا تصل في الثوب قد أصابه الخمر "(2)جس کپڑے پر شراب لگ گئی ہواس سے نماز مت پڑھو۔

مذی پاک ہے

تیسرامسئلہ مذی کا ہے کہ یہ اسے پاک کہتے ہیں،(3) جو صحیح اور متفق علیہ حدیث کے خلاف ہے راوندی نے موسیٰ بن جعفر سے انہوں نے اپنے باپ دادا سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ فرمایامیں نے نبی کریم سے مزید متعلق دریافت کیاتو آپ نے فرمایاجس کو یہ بات پیش آئے وہ حشفہ کو دھولے،(4) اور ابو جعفر طوسی اگرچہ مذی کی نجاست پر صریح روایت بیان کرتا ہے مگر نہ اس پر فتویٰ دیتا ہے نہ اس پر عمل رکھتا ہے۔

1۔ سورة الانعام، الاية: 145

2۔ عن عمار الساباطي عن أبي عبد الله عليه السلام قال: لا تصل في بيت فيه خمر ولا مسكر لان الملائكة لا تدخله، ولا تصل في ثوب أصابه خمر أو مسكر حتى تغسل. (الاستبصار فيما اختلف من الاخبار، باب الخمر يصيب الثوب والنبيد المسكر، 1/ 189، ط: دار الكتب الاسلامية تهران)

3۔ قال الطوسي: «المذي والودي لا ينقضان الوضوء ولا يغسل منهما ثوب». الخلاف: 1/ 37. وقال الحلي: «اتفق أكثر علمائنا على أن المذي لا ينقض الوضوء، ولا أعلم فيه مخالفا إلا ابن الجنيد فإنه قال: إن خرج عقيب شهوة ففيه الوضوء». مختلف الشيعة: 1/ 260.

4۔ روى عن علي قال: كنت رجلا مذاء فكنت أستحي أن أسأل النبي صلى الله عليه وسلم لمكان ابنته، فأمرت المقداد فسأله فقال «يغسل ذكره ويتوضأ» وكذا روى الترمذي عنه قال: سألت النبي صلى الله عليه وسلم أي بواسطة المقداد عن المذي فقال «من المذي الوضوء، ومن المني الغسل»(صحيح الجامع: رقم 5910)

مذی ناقض وضو نہیں ہے

چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے ہاں مذی کے نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا،[1] حالانکہ خود ہی ائمہ سے اس کے خلاف روایات بیان کرتے ہیں تو اسی نے یعقوب بن یقطین سے اس نے ابی الحسن سے روایت کی کہ "المذي منه الوضوء"[2] مذی نکلنے سے وضو کرنا چاہیے اور راوندی نے جناب علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ " عن علي قال لأبي ذر أسأل النبي صلى الله عليه وسلم عن المذي فسأل فقال: يتوضأ وضوءه للصلاة"[3] آپ نے کہا میں نے ابوذر سے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مذی کے متعلق پوچھنا انہوں نے پوچھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی وجہ سے وضو کرو ایسا وضو جو نماز کے لیے کرتے ہو۔

ودی پاک ہے

پانچواں مسئلہ یہ ہے کہ یہ ودی کو بھی پاک کہتے ہیں، جو گاڑھے پیشاب کو کہتے ہیں، اور پیشاب تینوں شریعتوں کے اجماع کے مطابق ناپاک بلکہ دوسرے باطل دینوں میں بھی ایسا ہی ہے۔[4]

ودی ناقض وضو نہیں ہے

چھٹا مسئلہ یہ کہ ودی کے نکلنے سے بھی ان کے ہاں وضو نہیں ٹوٹتا،[5] حالانکہ یہ ائمہ کی روایات کے

1۔ قال الطوسي: «فأما المذي والودي فإنهما لا ينقضان الوضوء، والذي يدل على ذلك ... »، وروى عن زيد الشحام قال: «قلت: لأبي عبد الله المذي ينقض الوضوء؟ قل: لا ولا يغسل منه الثوب ولا الجسد، إنما هو بمنزلة البزاق والمخاط». تهذيب الأحكام: 1/ 17.

2۔ أخرجها الطوسي في تهذيب الأحكام: 1/ 19. وعلق في كتابه الآخر: «ويمكن أن نحمله على ضرب من التقية؛ لأن ذلك مذهب أكثر العامة». الاستبصار: 1/ 95. ويعني بالعامة أهل السنة.

3۔ النوادر: ص 45؛ النوري، مستدرك الوسائل: 1/ 237.

4۔ كما قال ابن إدريس في السرائر: 1/ 116.

5۔ أخرج الطوسي عن الصادق قال: «الودي لا ينقض الوضوء إنما هو بمنزلة المخاط والبزاق». تهذيب الأحكام: 1/ 21

خلاف ہے، راوندی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حدیث مرفوع نقل کی ہے کہ " الودي فيه الوضوء "[1] ودی کے نکلنے سے وضو کیا جائے، اس کے علاوہ بھی لوگوں نے ابی عبد اللہ سے اسی قسم کی روایات بیان کی ہیں۔

عضو مخصوص تین بار جھٹکنے کے بعد پاک ہوتا ہے

ساتواں یہ کہتے ہیں کہ پیشاب کرنے کے بعد عضو مخصوص کو تین مرتبہ جھٹک دو، اس کے بعد جو کچھ اس سے نکلے وہ پاک ہے اس سے وضو نہیں ٹوٹتا،[2] یہ مسئلہ بھی صریح خلاف شرع ہے، کیونکہ ہر دو ر راستوں سے نکلنے والی ہر چیز ناپاک بھی ہے اور وضو کو توڑنے والی ہے، اور اس سے پہلے عضو کے جھاڑنے کو بعد کی طہارت اور وضو نہ ٹوٹنے میں کیا دخل ہے، اور کیا واسطہ؟

یہ تو وہی بات ہوئی جو صابیوں کے دساتیر میں پائی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص وضو کر کے تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز کی نیت باندھ لے تو درمیان نماز وضو توڑنے والی کوئی بات پیش آجائے تو اس سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، اس کی مثال تو اس شخص سے ملتی جلتی ہے جس نے کسی کی ملاقات کی خاطر فرش فروش کا اہتمام کیا، لباس آرائش کا بھی خیال کیا، مگر جب وہ ملاقاتی آیا، تو فرش فروش بھی اٹھا دیا اور خود بھی ننگا ہو کر اس سے ملا اور یہ توجیہ کرنے لگا کہ یہ سب اہتمام تو اس کے اعزاز میں تھا، اب دوران ملاقات میں ننگا ہو گیا تو کیا ہوا۔

اور پھر یہ بات ائمہ کی روایات کے بھی مخالف ہے کہ ابن عیسیٰ نے ابی جعفر سے روایت کی ہے " أنه كتب إليه هل يجب الوضوء إذا خرج من ذكر بعد الاستبراء؟ قال: نعم "[3] کہ ان سے تحریراً یہ پوچھا گیا کہ پاکی کے بعد اگر عضو مخصوص سے کوئی چیز نکلے تو کیا وضو واجب ہو جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں!

1۔ النوادر: ص 45؛ النوري، مستدرك الوسائل: 1/ 327.

2۔ أخرج الكليني عن ابن مسلم قال: «قلت لأبي جعفر عليه السلام: رجل بال ولم يكن معه ماء؟ قال: يعصر أصل ذكره إلى طرف ذكره ثلاث مرات وينتر طرفه، فإن خرج منه بعد ذلك شيء فليس من البول ولكنه من الحبائل». الكافي: 3/ 19؛ والطوسي في تهذيب الأحكام: 1/ 356.

3۔ تهذيب الأحكام: 1/ 28؛ الاستبصار: 1/ 49.

گھریلو مرغا، مرغی کی بیٹ پاک ہے

خانگی مرغا مرغی کی بیٹھ کو بھی یہ پاک کہتے ہیں، [1] حالانکہ ائمہ کی نصوص سے اسکی نجاست وناپاکی ثابت ہے، اوران کی معتبر کتب میں یہ لکھا ہوا بھی ہے مثلا محمود بن حسن طوسی کی روایت بحوالہ فارس یوں ہے:

أنه كتب رجل إلى صاحب العسكر يسأله عن زرق الدجاج يجوز الصلاة فيه؟ فكتب: لا.[2]

جناب حسن عسکری سے ایک شخص نے لکھ کر فتویٰ پوچھا کہ مرغ کی بیٹھ کا کیا حکم ہے اس کے ملوث کپڑے سے نماز جائز ہے؟ آپ نے جواب لکھا نہیں۔

اور ویسے بھی یہ بات خود ان کے قاعدہ کے بھی خلاف ہے کہ حلال جانور کی بیٹھ ناپاک ہے، ابن مطہر نے منتہی میں اس پر نص نقل کی ہے، ان سب کے باوجود مرغوں اور مرغیوں میں کیا خوبی پیدا ہوگئی کہ ان کی بیٹھ پاک ہوگئی!

وضو میں مکمل چہرہ دھونا فرض نہیں ہے

وضو میں ان کے نزدیک تمام چہرہ کا دھونا فرض نہیں حالانکہ نص قرآنی " فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ "[3] صراحتاپورے چہرہ کو دھونے پر دلالت کرتی ہے، انہوں نے حد فرض اس فاصلہ سے مقرر کی ہے جو انگوٹھے اور بیچ کی انگلی میں ہے جب کہ ان کو پیشانی کے اوپر والے حصہ سے لے کر نیچے تک کھینچیں اس اندازہ کی نہ شریعت میں کوئی اصل وبنیاد ہے نہ ائمہ سے اس قسم کی کوئی روایت منقول ہے جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ جبکہ آپ مسجد

1۔ عن جعفر، عن أبيه، عن علي عليه السلام أنه قال: لا بأس بخرء الدجاج والحمام يصيب الثوب.(وسائل الشيعة إلى تحصيل مسائل الشريعة،باب حكم زرق الدجاج وبول الخشاف وجميع الطير، 2/ 1013، ط: دار الحياء التراث العربي بيروت لبنان)

2۔ المرجع السابق

3۔ سورة المائدة ، الاية : 6

کوفہ کے برآمدہ میں بیٹھے حضور ﷺ کے وضو کی نقل کرکے لوگوں کو دکھا رہے تھے پورا چہرہ دھویا اور حاضرین نے اسے دیکھا اور اس کی روایت کی، اس کے غلط اور باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اگر انگوٹھے اور بیچ کی انگلی کو کشادہ کر کے اور پھیلا کر اوپر سے نیچے کی جانب کھینچیں گے تو ٹھوڑی کے متصل اگر وہ دونوں جانب سے گلے کا حصہ بھی گھیر یں گی تو گویا گلے کے اتنے حصہ کا دھونا بھی فرض ہوگا، حالانکہ گلے کو چہرہ میں کوئی شامل نہیں کرتا، اور اگر ہر دو انگلیوں کو پیشانی کے مقابلہ میں پھیلائیں اور آہستہ آہستہ تنگ کرتے جائیں تو تنگ کرنے کی حد کیا ہے؛ یہ معلوم نہیں ہوئی اور شرعی اندازے تو مکلفین کو بتانے کے لئے ہوتے ہیں نہ کہ چھپانے کے لئے![1]

غسل جنابت کے ساتھ وضو حرام ہے

کہتے ہیں کہ غسل جنابت کے ساتھ وضو حرام ہے،[2] ان کا یہ مسئلہ بھی حدیث کے صریح خلاف ہے، اس لئے کہ حضور ﷺ ہمیشہ اس غسل سے پہلے وضو فرماتے اور پھر تمام بدن پر پانی ڈالتے یہ سنت تواتر کے ساتھ ثابت ہے،[3] اور ان کی یہ بات ائمہ کی روایت کے بھی خلاف ہے، چنانچہ کلینی نے محمد بن مبشر کے حوالہ سے ابی عبداللہ سے روایت کی، اور حسن بن سعد نے حضرمی سے اور اس نے ابی جعفر سے، دونوں نے کہا کہ پہلے وضو کرے پھر غسل کرے، جب آپ سے غسل جنابت کی کیفیت معلوم کی گئی![4]

1۔ الكافي للحلبي: ص 83؛ الهداية: ص 62و مختلف الشيعة: 1/ 287.

2۔ قال المفيد: «وليس على المجنب وضوء مع الغسل، ومتى اغتسل على ما وصفناه فقد طهر للصلاة، وإن لم يتوضأ قبل الغسل ولا بعده، وإن ارتمس في الماء للغسل من الجنابة أجزأه عن الوضوء للصلاة». المقنعة: ص 61؛ النراقي، مستند الشيعة: 1/ 128.

3۔ في صحيح البخاري أن ميمونة رضي الله عنها قالت: «وضع رسول الله صلى الله عليه وسلم وضوءا لجنابة، فأكفأ بيمينه على شماله مرتين أو ثلاثا، ثم غسل فرجه ثم ضرب يده بالأرض أو الحائط مرتين أو ثلاثا، ثم مضمض واستنشق وغسل وجهه وذراعيه، ثم أفاض على رأسه الماء ثم غسل جسده، ثم تنحى فغسل رجليه، قالت: فأتيته بخرقة فلم يردها فجعل ينفض بيده». كتاب الغسل، باب من توضأ في الجنابة: 1/ 106، رقم 270.

4۔ أخرجه الطوسي في تهذيب الأحكام: 1/ 140؛ الاستبصار: 1/ 126.

غسل نوروز سنت ہے

یہ غسل نوروز کو بھی سنت کہتے ہیں،(1) ابن فہد نے بھی یہی کہا ہے، یہ بھی دین میں ان کا گھڑا ہوا اور بناوٹی مسئلہ ہے جس کو ان کی کتابوں میں کسی نے بھی جناب پیغمبر علیہ السلام یا جناب امیر رضی اللہ عنہ یا دوسرے ائمہ سے روایت نہیں کیا کہ انہوں نے نوروز کے دن غسل کیا ہو، نہ عرب اس نوروز کو جانتے تھے، جانتے بھی کیسے یہ تو کافر مجوسیوں کی عید کا دن تھا، جب ان کے صحیح جانشین پیدا ہو گئے تو انہوں نے ڈھٹائی سے اپنے ہاں اس کو رواج دے لیا مسلمانوں کو مجوسیوں کی عید سے کیا سروکار؟

تیمم میں فقط ایک ضرب کافی ہے

تیمم میں یہ دو ضربوں کے بجائے ایک ضرب بتاتے ہیں،(2) حالانکہ ائمہ کی روایات اس کے خلاف بول رہی ہیں، علاء(3) نے محمد بن اسلم سے روایت کی کہ اس نے اپنے دادا سے تیمم کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ ایک مرتبہ چہرہ کے لئے اور ایک مرتبہ دونوں ہاتھوں کے لئے ضرب لگائے،(4) لیث مرادی نے ابی عبد اللہ اور اسماعیل بن حزم نے جناب رضا سے بھی ایسی ہی روایت کی ہے،(5) اس روایت میں پیشانی پر مسح کا اضافہ بھی کر دیا ہے، حالانکہ شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔(6)

1۔ في الوسائل للعاملي (8/ 172) باب: (استحباب صلاة يوم النيروز والغسل فيه والصوم ولبس أنظف الثياب والطيب وتعظيمه وصب الماء فيه) ويوب له أيضا المجلسي وأخرج عن المعلى بن خنيس عن الصادق أنه قال في يوم النيروز: «إذا كان النيروز فاغتسل والبس أنظف ثيابك وتطيب بأطيب طيبك وتكون ذلك اليوم صائما». بحار الأنوار: 59/ 101.

2۔ ينظر الناصريات للمرتضى ص 84، والغنية لابن زهرة ص 85، وشرائع الإسلام للحلي 1/ 71.

3۔ العلاء بن رزين القلاء، يروي عند الإمامية عن الصادق، قال عنه النجاشي: «ثقة وجها». رجال النجاشي: 2/ 153.

4۔ عن محمد بن مسلم عن أحدهما قال سألته عن التيمم فقال: مرتين: مرة للوجه ومرة لليدين-(الطوسي في تهذيب الأحكام: 1/ 210؛ والاستبصار: 1/ 172.)

5۔ الطوسي في تهذيب الأحكام: 1/ 209؛ والحر العاملي في وسائل الشيعة: 3/ 361.

6۔ قال الطوسي: «إن المسح يجب في التيمم ببعض الوجه وهو الجبهة والحاجبان». تهذيب الأحكام: 1/ 61.

لباس یا جگہ ناپاک ہو تو نماز جائز ہے

ان کے ہاں ایک مسئلہ یہ ہے موزہ، ٹوپی، ازار بند، پائیتابہ، کمر بند (پٹکا) اور عمامہ اور جو کچھ نمازی کے بدن پر ہو، جسکی چوڑائی پر نماز جائز نہ ہو، اگر اس پر نجاست لگ جائے چاہے وہ مخفف ہو یا غلیظ، جیسے انسانی براز، تو نماز جائز ہے، نماز میں کوئی خلل نہیں ہوتا،[1] یہ مسئلہ بھی حکم قرآنی کے بالکل خلاف ہے، وہاں تو حکم ہے "وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ"[2] اپنے کپڑے پاک کرو، اور ظاہر ہے یہ تمام چیزیں عرف و شرع میں لباس و کپڑوں کے زمرہ میں شمار ہوتی ہیں۔

نمازی کے کپڑوں پر خون لگا ہو تو حرج نہیں

ایک مسئلہ یہ ہے کہ نمازی کے بدن کے کپڑے مثلاً ازار، کرتے، پاجامہ خون و پیپ میں بھر جائیں، تو بھی نماز جائز ہے،[3] حالانکہ خون و پیپ اپنا ہو یا دوسرے کا بلاشبہ نجاست اور ناپاک ہے۔

خلاف قبلہ رخ ہو تو نماز جائز ہے

ایک مسئلہ یہ کہ نفل نماز میں نمازی خواہ کھڑا ہو یا بیٹھا، اور ایسے ہی سجدہ تلاوت کہ ان میں قبلہ کی سمت کے خلاف رخ کرنا جائز ہے،[4] دین میں ان کی طرف سے یہ ایسا اضافہ ہے جس کی اجازت شریعت نے نہیں دی، سواری اور سفر کا استثنا تو شریعت میں ہے مگر اور کسی حالت میں قبلہ سے رخ ہٹانے کی اجازت نہیں، پیغمبر ﷺ اور ائمہ کی روایات میں ان دو حالتوں کے سوا اس کا کوئی ثبوت نہیں:

1۔ قال المفيد: «وإن أصابت تكته أو جوربه [نجاسة] لم يحرج بالصلاة فيها، وذلك مما لا تتم الصلاة بهما دون ما سواهما من اللباس». المقنعة: ص 36.

2۔ سورة المدثر، الآية :4

3۔ عن ليث قال: «قلت لأبي عبد الله عليه السلام الرجل تكون فيه الدماميل والقروح فجلده وثيابه مملوءة دما وقيحا؟ فقال: يصلي في ثيابه ولا يغسلها ولا شيء عليه». تهذيب التهذيب: 1/ 258.

4۔ بن بابويه، المقنع: ص 153؛ ابن إدريس، السرائر: 1/ 105. وقال العاملي في سجود التلاوة: «ولا يشترط الطهارة ولا استقبال القبلة على الأصح». الدروس: ص 84.

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ [1]

تم جدھر سے نکلو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیرو اور تم جہاں بھی ہو اپنا منہ اسی طرف رکھو۔

اب اس عموم میں سے پیغمبر علیہ السلام جس صورت کو مستثنیٰ اور علیحدہ فرمادیں وہی قابل تسلیم ہوگی، آپ کے علاوہ کسی کی یہ تاب اور مجال نہیں کہ اپنی عقل سے کوئی استثنا کر سکے، اس مسئلہ میں ان کے شیخ مقداد نے کچھ انصاف سے کام لیا ہے اور اپنی تصنیف کنز العرفان فی احکام القرآن میں اعتراف کیا ہے کہ یہ مسئلہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔ [2]

خشک انسانی غلاظت پر نماز جائز ہے

ایک مسئلہ یہ کہ اگر کوئی ایسی جگہ ہے جہاں خشک انسانی غلاظت بھی ہوتی ہے اگر وہ غلاظت نمازی کے کپڑوں یا بدن پر نہ چپٹے تو اس پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا جائز ہے، [3] حالانکہ نماز کی جگہ کا پاک ہونا شریعت کے تسلیم کردہ اور مقرر کردہ مسائل میں سے ہے!

نجس پانی سے ہاتھ دھو کر نماز جائز ہے

مسئلہ اگر کوئی دونوں ہاتھ کہنیوں تک اور دونوں پاؤں گھٹنوں تک ایسے نالہ اور جوبچہ میں داخل کر دے جس میں بول و براز بھرا ہوا ہو، تو غلاظت صاف کر کے بغیر ہاتھ پاؤں دھوئے نماز پڑھنا جائز ہے، اسی

1۔ سورة البقرة، الاية :150

2۔ قال ابن المطهر الحلي: «وأوجب ابن أبي عقيل الاستقبال في النافلة كالفريضة إلا في موضعين: حال الحرب والمسافر يصلي أينما توجهت به راحلته ... » وروى آثارا عن الأئمة تؤيد ذلك، ولم يرد على المرويات وأدلة ابن أبي عقيل إلا بفلسفة حيث قال: «والجواب أن الاشتراك في المقتضي يستلزم الاشتراك في الاقتضاء، وقد بينا اشتراك العلة وهي الضرورة». مختلف الشيعة: 2/ 74.

3۔ قال الطوسي: «إذا كان موضع سجوده طاهرا صحت صلاته، وإن كان موضع قدميه وجميع مصلاه نجسا إذا كانت النجاسة يابسة لا تتعدى إلى ثيابه وبدنه». الخلاف: 1/ 176.

طرح ایسے ہی غلاظت سے پر حوض میں غوطہ لگا کر، اور غلاظت کو بدن سے اتار کر بغیر بدن دھوئے بھی نماز پڑھنا جائز ہے،"[1] ظاہر ہے ایسی صورت میں پانی سے دھوئے بغیر بدن پاک نہیں ہو سکتا جرم نجاست بدن سے اتار دینے سے پاکی حاصل نہیں ہوتی نہ ناپاکی کا اثر زائل ہوتا ہے، اس کام کے لئے ہی اللہ تعالی نے پانی بنایا ہے:

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لِيُطَهِّرَكُمْ بِهِ[2]

اور آسمان سے پانی اتارتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ تم کو پاک کرے، اور فرمایا"

وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا[3] اور نازل کیا آسمان سے پاک کرنے والا پانی۔

نماز سے فراغت کے بعد ناپاکی معلوم ہو تو نماز درست ہے

مسئلہ اگر کوئی نمازی نماز سے فارغ ہو کر یہ دیکھے کہ اس کے کپڑوں پر خشک پاخانہ یا کتے بلی کی غلاظت، یا خون و منی لگی ہوئی ہے تو اس کی نماز درست ہو گئی،[4] طوسی نے کتاب تہذیب میں یہ مسئلہ لکھا ہے، اور دوسروں نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے، ظاہر ہے شروع میں کپڑوں کا پاک ہونا فرائض وشرائط نماز میں سے ہے۔

ننگا آدمی اعضاء مخصوصہ پر مٹی لگا کر نماز پڑھ سکتا ہے

مادر زاد برہنہ صرفت عضو مخصوص اور اس کے معلقات پر گیلی مٹی لگا کر بلا ضرورت و مجبوری نماز پڑھ لے تو ان کے ہاں جائز ہے،[5] یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ شرع میں عام حالات خصوصا نماز، و عبادات اور

1۔ كل نجاسة في البدن أو الثوب في حال الاضطرار، بأن لا يتمكن من تطهير بدنه أو تحصيل ثوب طاهر للصلاة فيه، ولو لكون ذلك حرجا عليه، فيجوز له حينئذ أن يصلي مع النجاسة-(منهاج الصالحين، للسيستانی، 1/ 149)

2۔ سورة الانفال، الاية : 11

3۔ سورة الفرقان، الاية : 48

4۔ روى عبد الرحمن بن أبي عبد الله قال: «سألت أبا عبد الله عليه السلام عن الرجل يصلي وفي ثوبه عذرة إنسان أو سنور أو كلب أيعيد صلاته؟ قال: إن كان لم يعلم فلا يعيد». تهذيب الأحكام: 2/ 359، وأخرجها الكليني. الكافي: 3/ 404؛ العاملي، وسائل الشيعة: 3/ 475.

السرائر، لابن إدريس: 1/ 252.

مناجات میں ستر عورت کی کتنی تاکید ہے اسی وجہ سے ان کے متاخرین میں سے ایک جماعت نے اس کی قباحت اور برائی محسوس کر کے جمہور کا قول تسلیم نہیں کیا اور ائمہ واہل بیت کے آثار سے دلیل لا کر اس کو غلط اور باطل ثابت کیا ہے۔[1]

نجاست کے ساتھ نماز درست ہو جائے گی

مسئلہ اگر کوئی شخص، داڑھی مونچھ، بدن اور اپنے کپڑوں کو مرغ کی بیٹ سے لتھیڑے یا اس کی داڑھی، مونچھ یا رخسار پر اس کے پیشاب کے چھینٹے پڑھائیں، یا عضو مخصوص کو پیشاب کرنے کے بعد تین مرتبہ جھٹک دے یا مذکورہ جگہوں پر مذی مل لے تو ایسی صورت میں دھوئے دھلائے بغیر نماز درست اور جائز ہو گی۔[2]

حالت نماز میں چلنا پھرنا جائز ہے

نماز کی حالت میں چل کر ایسے خمیر کو جسے کتا، بلی کھانا چاہتے ہوں اٹھا کر دسترس سے باہر جگہ پر رکھ دینا جائز ہے، اگر چہ چلنے کی مسافت شرعی دس گز کے برابر ہو، اس سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا،[3] حالانکہ فعل کثیر خصوصاً ایسا کام جس کا نمازہ سے کوئی تعلق نہ ہو باجماع روایات شرعیہ نماز کو باطل کر دیتا ہے،

1۔ روي عن علي بن جعفر عن موسى الكاظم أنه قال: «سألته عن رجل عريان وحضرت الصلاة فأصاب ثوبا نصفه دم أو كله أيصلي عريانا؟ فقال: إن وجد ماء غسله وإن لم يجد ماء صلى فيه ولم يصل عريانا؛ ولأن طهارة الثوب شرط وستر العورة شرط أيضا فيتخير». ابن بابويه، من لا يحضره الفقيه: 1/ 248؛ الطوسي، تهذيب الأحكام: 2/ 224.

2۔ يروي الإمامية أن الطهارة للصلاة غير مهمة عن أئمة أهل البيت الطاهرين، فقد أخرج الطوسي عن زرارة قال: «قلت لأبي عبد الله عليه السلام إن قلنسوتي وقعت في البول فأخذتها فوضعتها على رأسي ثم صليت؟ فقال: لا بأس». تهذيب الأحكام: 2/ 357. وقال ابن بابويه: «ومن أصاب قلنسوته أو عمامته أو تكته أو جوربه أو خفه مني أو بول أو دم أو غائط فلا بأس بالصلاة فيه، وذلك لأن الصلاة لا تتم في شيء من هذا وحده». من لا يحضره الفقيه: 1/ 73.

3۔ أخرج العاملي عن الحلبي أنه سأل «أبا عبد الله – عليه السلام – عن الرجل يخطو أمامه في الصلاة خطوة أو خطوتين أو ثلاث، قال: نعم لا بأس». وسائل الشيعة: 5/ 191؛ وفي رواية أخرى أن الحلبي سأل الصادق «عن الرجل يقرب نعله بيده أو رجله في الصلاة؟ قال: نعم». وسائل الشيعة: 7/ 287.

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ ، فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ[1]

اللہ کی حاضری میں سکون سے کھڑے ہو اگر کوئی خوف کی حالت ہو تو پیدل یا سواری پر جیسا موقعہ ہو نماز پڑھ لو، اور جب امن کی حالت ہو تو جس طرح تم کو سکھایا گیا ہے اس کے مطابق نماز پڑھو۔

بعض سورتوں کی قرأت سے نماز فاسد ہو جاتی ہے

یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی بعض سورتوں کے پڑھنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، مثلاً سورۃ السجدہ اور تین سورتیں اور،[2] حالانکہ قرآن مجید میں آیت "فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ"[3] قرآن کا جو حصہ آسان یاد ہو پڑھو، عموم پر ناطق ہے اور خود یہ فرقہ بھی اپنے ائمہ سے ایسی روایت بیان کرتا ہے کہ نماز ہر سورت سے جائز ہے، اور مزے کی بات یہ کہ یہ اس نماز کو بھی جائز بتاتے ہیں جس میں نمازی کوئی قرآت پڑھے اور دل میں یہ سمجھتا جائے کہ یہ قرآن منزل کا حصہ نہیں ہے بلکہ عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے دوستوں کے تحریف کردہ قرآن کا حصہ ہے۔

حالت نماز میں کھانا پینا جائز ہے

ان میں کے بعض عین حالت نماز میں کھانا پینا جائز بتاتے ہیں، چنانچہ ان کے ایک معتبر فقیہ ابو القاسم نجم الدین نے شرائع الاحکام میں بصراحت اس کو بیان کیا ہے،[4] حالانکہ متفق علیہ احادیث میں نماز کی حالت

1۔ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: 238

2۔ سور لقمان وحم السجدۃ والنجم وسورۃ العلق، روى ابن بابويه عن الصادق أنه قال: «ولا تقرأ في الفريضة بشيء من العزائم الأربع». من لا يحضره الفقيه: 1/ 306. وفسر الإمامية هذه الرواية بقولهم: «لأن في هذه السور سجودا واجبا إن يفعله تبطل الفريضة بالزيادة فيها». الطوسي، الاقتصاد: ص 180؛ الحلبي، الكافي: ص 18.

3۔ سورۃ المزمل، الآیۃ: 20

4۔ للمحقق الحلي ودليله: «لعدم وجود نص في إبطال الأكل والشرب للصلاة». شرائع الإسلام: 1/ 101.

میں کھانے پینے کی ممانعت بیان کی گئی ہے، اور اس پر تو اس فرقہ کا اجماع ہے کہ اگر کسی رات کی صبح کو روزہ رکھنے کا ارادہ ہو تو اس رات کو عین وتر کی نماز میں تشنگی محسوس ہو تو پانی پینا جائز ہے۔(1)

نماز میں عضو خاص میں انتشار ہو تو کوئی حرج نہیں

اگر کوئی کسی حسینہ سے بغلگیر ہو جائے اور اس حالت میں انتشار ہو، اور وہ عضو کو مقابل کے عضو کے مقابلہ میں رکھے اور اس کی وجہ سے مذی اس کی پنڈلی تک بہہ آئے تو ایسی حالت میں بھی نماز جائز ہے،(2) طوسی، ابو جعفر اور ان کے دوسرے مجتہدین کا یہی فتویٰ ہے! یہ ایسی حرکت ہے جو مقاصد شرع کی کھلم کھلا تردید کرتی ہے اور مناجات باری کی حالت کے صاف منافی ہے۔

نمازی عضو خاص سے کھیلتا رہے تو نماز نہیں ٹوٹتی

اگر کوئی نمازی عین حالت نماز میں عضو مخصوص اور معلقات کے ساتھ مشغول رہے حتی کہ تندی و انتشار کی نوبت بھی آجائے اور اس کی وجہ سے مذی بھی بہہ نکلے تو نماز میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔(3)

1۔ فقد روى ابن بابويه عن سعيد الأعرج أنه قال: «قلت لأبي عبد الله عليه السلام جعلت فداك إني أكون في الوتر وأكون قد نويت الصوم وأكون في الدعاء وأخاف الفجر، وأكره أن أقطع على نفسي الدعاء وأشرب الماء وتكون القلة أمامي، قال: فقال لي: فاخطِ إليها الخطوة والخطوتين والثلاث واشرب وارجع إلى مكانك، ولا تقطع على نفسك الدعاء». من لا يحضره الفقيه: ١/ 494؛ العاملي، الوسائل: 7/ 280.

2۔ لأن رواياتهم تقول إن الحركة والمذي لا يبطلان الصلاة أو ينقضان الوضوء، فمثل هذه الحركة أيضا لا تبطلهما، روى الطوسي: «عن ابن أبي عمير عن غير واحد من أصحابنا عن أبي عبد الله - عليه السلام - قال: ليس في المذي من الشهوة ولا من الانعاظ ولا من القبلة ولا من مس الفرج ولا من المضاجعة وضوء ولا يغسل منه الثوب ولا الجسد». تهذيب الأحكام: ١/ 19؛ الاستبصار: ١/ 174.

3۔ روى الكليني عن محمد بن مسلم قال: «سألت أبا جعفر عليه السلام: عن المذي يسيل حتى يصيب الفخذ؟ فقال: لا يقطع صلاته ولا يغسله من فخذه، إنه لم يخرج مخرج المذي إنما هو بمنزلة المخاط». الكافي: 3/ 40. وروى الطوسي بإسناده عن معاوية بن عمار قال: «سألت أبا عبد الله - عليه السلام -: عن الرجل يعبث بذكره في الصلاة؟ فقال: لا بأس به». تهذيب الأحكام: 1/ 346.

ائمہ کی قبور کی طرف رخ کرنا نماز میں جائز ہے

ان میں کے بعض نے ائمہ کی قبور کی طرف ثواب و تقرب کی نیت سے رخ کر کے نماز پڑھنا جائز کہا ہے،[1] حالانکہ حضور ﷺ کے فرمایا:

لعن الله اليهود والنصارى اتخذوا قبور أنبيائهم مساجد[2]

اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبور کو سجدہ گاہ بنالیا۔

بغیر عذر کے ظہر و عصر و مغرب کو جمع کرنا جائز ہے

انہوں نے ظہر و عصر اور مغرب عشاء کی نمازوں کو بغیر عذر اور بغیر سفر کے جمع کرنے کو جائز قرار دیا ہے،[3] جو صراحتاً قرآنی فرمان کے خلاف ہے:

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى[4]

اپنی نمازوں کی حفاظت کرو خاص کر درمیانی نماز۔

---

1 ـ بوب الطوسي بابا بعنوان: (فضل الكوفة والمواضع التي يستحب فيها الصلاة منها، وموضع قبر أمير المؤمنين عليه السلام والصلاة والدعاء عنده). تهذيب الأحكام: 6/ 30، ثم أورد روايات عديدة في فضيلة الدعاء والصلاة عند هذا القبر. وأخرج العاملي عن شعيب العقرقوفي: «قلت لأبي عبد الله عليه السلام: من أتى قبر الحسين عليه السلام له من الأجر والثواب؟ قال: يا شعيب ما صلى عنده أحد ودعا إلا استجيب عاجله وآجله، قلت: زدني، قال: أيسر ما يقال لزائر الحسين عليه السلام: قد غفر لك فاستأنف اليوم عملا جديدا». وسائل الشيعة: 14/ 538.

2 ـ متفق عليه. وعند الإمامية أخرج الطوسي عن الصادق أنه قال: «عشرة مواضع لا يصلى فيها: الطين والماء والحمام والقبور ... ». تهذيب الأحكام: 2/ 219؛ وأخرجة العاملي في وسائل الشيعة: 5/ 142.

3 ـ منها ما رواه الكليني عن أحمد بن عباس الناقد قال: «تفرق ما في يدي وتفرق حرفائي فشكوت إلى أبي محمد عليه السلام فقال لي: اجمع بين الصلاتين الظهر والعصر ترى ما تحب». الكافي: 3/ 287؛ الطوسي، تهذيب الأحكام: 2/ 263.

سورة البقرة، الآية : 237

إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا[1]

مومنوں پر نماز اوقات کی تعیین کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔

چار نمازیں ملا کر پڑھنا مستحب ہے

امام غائب کے خروج کے انتظار میں ظہر، عصر، مغرب اور عشا چاروں نمازوں کو ملا کر پڑھنا ان کے نزدیک مستحب ہے۔

قصر اور اتمام کے بعض مسائل

عام یا تجارتی سفر میں پوری نماز پڑھنے کا حکم لگاتے ہیں مگر روزہ چھوڑنے سے منع کرتے ہیں حالانکہ شریعت میں نماز روزہ کا ایک ہی حکم ہے، یعنی رعایت دونوں عبادتوں میں ہے، ابن ادریس، ابن معلم اور طوسی وغیرہ نے اس فرق کی تصریح کی ہے،[2] حالانکہ ان کی کتابوں میں ائمہ کی ایسی روایات موجود ہیں جن سے فرق نہ کرنے کا ثبوت ملتا ہے، چنانچہ معاویہ بن وھب نے ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے:

أنه قال «وإذا قصرت أفطرت وإذا أفطرت قصرت».[3]

میں جس حالت میں نماز قصر کرتا ہوں تو روزہ نہیں رکھتا اور جب روزہ نہیں رکھتا تو نماز میں قصر کرتا ہوں۔

یہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کو قیام کم اور سفر زائد درپیش ہو جیسے سواری کو کرایہ پر ملانے والا کشتیوں کے ملاح وغیرہ یا وہ تجار جو پیشوں اور منڈیوں کی تلاش میں ہر وقت پابرکاب رہتے ہوں ان سب کے لئے جائز ہے کہ دن کی نمازیں قصر کریں اور رات کی پوری پڑھیں، اگرچہ دوران سفر پانچ ہی دن کے قیام کی نوبت آئے،

1۔ سورة النساء، الاية : 103

2۔ السرائر: 1/ 234و المفيد، وينظر كتابه المقنعة: ص 374والخلاف: 1/ 201و الحلي في إرشاد الأذهان: 1/ 303؛ والعاملي في الدروس: 1/ 221.

3۔ ابن بابويه، من لا يحضره الفقيه: 1/ 437؛ الطوسي، تهذيب الأحكام: 3/ 220.

چنانچہ ابن زہرہ، ابن سراج اور ابو جعفر طوسی نے نہایہ اور مبسوط میں اس کے متعلق نص بیان کی ہے،[1] حالانکہ اس صورت کے خلاف ائمہ کی روایات ان کے علم میں آچکی ہیں کہ انہوں نے دن رات میں کوئی فرق نہیں کیا، محمد بن بابویہ نے اپنی صحیح میں ایک امام کی یہ روایت بیان کی ہے:

أنه قال «المكاري والملاح إذا جد بهما سفر فليقصرا».[2]

کرایہ پر کام کرنے والا اور ملاح اگر ان کو سفر کی عجلت ہو تو وہ قصر کرلیں۔

عبد الملک نے بھی جناب صادق علیہ السلام سے ایسی ہی روایت بیان کی ہے۔[3]

مکہ مدینہ اور کوفہ میں قصر جائز نہیں ہے

نماز جن سفروں میں قصر کی جاتی ہے ان میں سفر مکہ، مدینہ، کوفہ اور کربلا کو شامل نہیں کرتے ان کے جمہور کا یہی مذہب ہے چار مقامات کے سفر میں قصر نہ کریں اور مختار، مرتضی اور بعض دوسرے کہتے ہیں کہ مشاہد ائمہ[4] کے لئے سفر کا یہی حکم ہے حالانکہ یہ مسئلہ آیت قرآنی " وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ "[5] کے خلاف ہے کہ اس میں سفر مطلق ہے اور جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ بھی تمام اسفار میں قصر کرتے تھے، اور اوپر محمد بن بابویہ کی جو روایت بیان ہوئی وہ بھی اطلاق پر دلالت کرتی ہے۔[6]

---

1 ـ ينظر الحلي في شرائع الإسلام: 1/ 101؛ وابن إدريس في السرائر: 1/ 246.

2 ـ الطوسي، تهذيب الأحكام: 3/ 215؛ العاملي، وسائل الشيعة: 8/ 491.

3 ـ الطوسي، تهذيب الأحكام: 3/ 215؛ العاملي، وسائل الشيعة: 8/ 491.

4 ـ أي إلى المشهد المنسوب إلى علي. وقد تقدم الكلام عن فضل الكوفة عند الإمامية. وينظر العاملي في وسائل الشيعة: 5/ 248 وما بعدها والنوري في المستدرك: 3/ 396.

5 ـ سورة النساء، الآية: 101

6 ـ قال زين الدين العاملي: «فيتعين القصر إلا في أربعة مواطن: مسجدي مكة والمدينة المعهودين ومسجد الكوفة والحائر الحسيني ...». ويعني بالأخير (كربلاء) ثم قال: «وألحق بعضهم به مشاهد الأئمة». اللمعة الدمشقية: 2/ 333، 334؛ والرأي نفسه للحلي في قواعد الأحكام: ص 83.

امام کی عدم موجودگی میں جمعہ ترک کرنا

ان کے ہاں امام کی عدم موجودگی میں نماز جمعہ چھوڑ دینے کا حکم ہے،[1] حالانکہ قرآن مجید میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللهِ[2]

مسلمانو! جب نماز جمعہ کے لئے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو۔

اس آیت میں امام کی موجودگی کی کوئی قید نہیں۔

میت پر نوحہ اور جزع فزع جائز ہے

اگر کسی کا بیٹا، باپ یا بھائی مر جائے تو اس کے لئے جزع و فزع کرنے اور کپڑے پھاڑنے کو جائز قرار دیا ہے،[3] اور عورت کے لئے تو ہر میت پر ایسا کرنا جائز ہے، حالانکہ تمام شرائع میں مصیبت کے وقت صبر کی تلقین کی گئی اور رونا پیٹنا، اور واویلا، حرام کہا گیا ہے، اور صحیح احادیث میں تو یوں آیا ہے:

ليس منا من حلق وسلق وخرق[4]

وہ ہم میں سے نہیں جو کسی کی موت پر سر منڈائے، یا نوحہ کرے اور کپڑے پھاڑے۔

اور ان الفاظ سے بیان کیا گیا ہے:

1۔ قال الطباطبائي عن صلاة الجمعة: «وفي زمان الغيبة مستحبة جماعة وفرادى، ولا يشترط فيها شرائط الجمعة». العروة الوثقى: 1/ 742؛ وينظر ما قاله زين الدين العاملي، اللمعة الدمشقية: 1/ 301.

2۔ سورة الجمعة، الآية : 9

3۔ أخرج العاملي تحت باب (كراهة الصياح على الميت وشق الجيوب على غير الأب والأخ والقرابة). ثم أورد روايات عن أكثر من إمام أنه قد شق ثوبه. وسائل الشيعة: 3/ 273 وما بعدها.

4۔ أخرجه مسلم أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: «أنا بريء ممن حلق وسلق وخرق». قال النووي: «الصلق والسلق: هي التي ترفع صوتها عند المصيبة، والحالقة هي التي تحلق شعرها والخرق هو شق الثوب عند المصيبة». (المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، باب تحريم ضرب الخدود وشق الجيوب والدعاء بدعوى الجاهلية، 2/ 110، ط: دار إحياء التراث العربي بيروت)

ليس منا من شق الجيوب ولطم الخدود[1]

وہ ہم میں سے نہیں جو گریبان پھاڑے یا گال پیٹے۔

پانی میں غوطہ لگانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے

پانی میں غوطہ لگانے سے ان کے ہاں روزہ ٹوٹ جاتا ہے،[2] حالانکہ روزہ توڑنے والی چیزیں کھانا پینا اور جنسی فعل، بالاجماع ہیں، اسی لئے ان میں سے بہت سوں نے جب صحیح آثار اس مسئلہ کے خلاف پائے تو روزہ نہ ٹوٹنے کے قائل ہو گئے۔[3]

لڑکے سے بد فعلی کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا

ایک عجیب وغریب مسئلہ ان کے ہاں یہ بھی ہے جن کو ان کی اکثریت مانتی ہے کہ لڑکے کے ساتھ خلاف وضع فطری عمل کیا جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا،[4] حالانکہ ائمہ سے اس کے خلاف مروی ہے، اور اس بات پر تمام امت کا اجماع ہے کہ جو فعل وحرکت انزال کا موجب ہو وہ مفسد بھی ہے چاہے کسی راستے سے ہو![5]

1۔ متفق عليه. وأخرجه من الإمامية العاملي، مسكن الفؤاد: ص 180؛ النوري، مستدرك الوسائل: 2/ 452.

2۔ وعليه إجماع الطائفة كما قرر الطوسي في النهاية: ص 131؛ والطباطبائي في العروة الوثقى: 2/ 200.

3۔ قال الطوسي بعد إيراده الأخبار المتناقضة عن الأئمة في كتب الطائفة: «يجوز الحمل على التقية، أو أنه يختص بإسقاط القضاء والكفارة، وإن كان الفعل محظورا ... ولست أعرف حديثا في إيجاب القضاء والكفارة أو إيجاب أحدهما على من ارتمس في الماء». الاستبصار: 2/ 85. قال الحلي: «واختاره ابن إدريس وهو مذهب ابن أبي عقيل ... » ثم قال: «والأقرب عندي أنه حرام غير مفطر ولا يوجب شيئا». مختلف الشيعة: 3/ 401.

4۔ لأن الرجل إذا أولج في الدبر ثم أنزل فلا غسل عليه بإجماع الطائفة، وينسبون الروايات في ذلك إلى الأئمة، روى الطوسي بإسناده عن أبي عبد الله عليه السلام قال: «في الرجل يأتي المرأة في دبرها وهي صائمة؟ قال: لا ينقض صومها وليس عليها غسل». تهذيب الأحكام: 4/ 319؛ العاملي، وسائل الشيعة: 2/ 200.

5۔ روى الكليني عن أبي جعفر أنه قال: «في الرجل يعبث بأهله في نهار رمضان حتى يمني قال: إن عليه الكفارة مثل ما على الذي يجامع». الكافي: 4/ 102؛ تهذيب الأحكام: 4/ 206.

جانور کی کھال کھانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا

ان میں سے بعض کے نزدیک جانور کی کھال کھانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا اس کا کھانا بھی جائز ہے بعض کہتے ہیں پتے کھانے (مثلاً پان) سے روزہ میں فرق نہیں پڑتا، بعض دوسرے کہتے ہیں کہ جو چیزیں عادتاً نہیں کھائی جاتیں ان کے کھانے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا،[1] اور اس کے باوجود غوطہ زن پر قضا اور کفارہ دونوں باتیں واجب قرار دیتے ہیں اگرچہ غوطہ کے وقت اس کی ناک اور گلے میں ایک بوند پانی بھی نہ گیا ہو،[2] اس افراط و تفریط کے کیا کہنے! یہ صورت تو شریعت کے مقاصد اور احکام کے اسباب و علل سے دور جا پڑنے کی ہے۔

عاشورہ کے دن عصر تک روزہ جائز ہے

ان کے نزدیک عاشورہ کے دن کا روزہ عصر تک رکھنا مستحب ہے،[3] حالانکہ کسی شریعت میں بھی روزہ کے معاملہ میں دن کے ٹکڑے نہیں کئے گئے کہ بعض وقت میں روزہ ہو اور بعض میں نہ ہو، یہ تو مسلمانوں کا روزہ نہ ہوا ہندوؤں کا برت ہوگیا، کہ وہ دن میں بعض چیزیں کھانا جائز سمجھتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ سارے دن کا روزہ رکھیں۔

18 ذوالحجہ کا روزہ مستحب ہے

18 ذی الحجہ کو روزہ رکھنا ان کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے،[4] حالانکہ کسی پیغمبر یا امام نے خصوصیت

---

1 ـ الطباطبائي، العروة الوثقى: 2/ 200؛ فقه الخوئي: 12/ 68.

2 ـ أخرج الحر العاملي عن إسماعيل بن عبد الخالق قال: «سألت أبا عبد الله عليه السلام هل يدخل الصائم رأسه في الماء؟ قال: لا ولا المحرم». الوسائل: 12/ 509. وينظر الطوسي، النهاية: ص 132؛ فقه الخوئي: 12/ 157.

3 ـ عندهم عن عبد الله بن سنان قال: «سألت أبا عبد الله عن صيام عاشوراء، فقلت: ما قولك في صومه؟ فقال لي: صمه من غير تبييت وأفطره من غير تشميت ولا تجعله يوم صوم كاملا، وليكن إفطارك بعد صلاة العصر بساعة على شربة ماء ...». أخرجه العاملي، وسائل الشيعة: 10/ 459.

4 ـ يسمونه عيد الغدير، روى العاملي تحت عنوان: (استحباب صوم يوم الغدير وهو الثامن عشر من ذي الحجة)، وينسبون للصادق قوله: «صيام يوم غدير خم يعدل عند الله عز وجل في كل عام مائة حجة ومائة عمرة مبرورات متقبلات وهو عيد الله الأكبر». وسائل الشيعة: 10/ 442. والرواية عند الطوسي في تهذيب الأحكام: 3/ 143.

کے ساتھ نہ اس دن کا روزہ رکھا نہ اس دن کے روزہ کا کوئی ثواب بیان کیا۔

اعتکاف کے لئے مسجد جمعہ نبی یا وصی ضروری ہے

ان کے نزدیک اعتکاف صرف ان مساجد میں جائز ہے جن میں نبی، یا وصی نے جمعہ قائم کیا ہو ان کے علاوہ دیگر مساجد میں جائز نہیں،[1] یہ مسئلہ بھی قرآن مجید کے صریحاً خلاف ہے کہ قرآن مجید میں "وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ"[2] اور تم مسجدوں میں اعتکاف کرتے ہو، آیا ہے اس میں ہر مسجد شامل ہے، پھر اعتکاف کرنے والے کے لیے خوشبو سونگھنا، عطر لگانا بھی ان کے ہاں سخت ناجائز ہے![3] حالانکہ مساجد میں جانے کے لئے خوشبو لگانا بالاجماع سنت ہے! اور معتکف تو خوشبو لگانے کا زیادہ حقدار اور مستحق ہے کہ وہ مسجد میں قیام کرتا ہے جو فرشتوں کی ہمنشینی کی جگہ ہے، اور فرشتوں کو خوشبو سے اُنس اور بدبو سے وحشت و نفرت ہے، اور یہ بات جملہ شرائع سے ثابت ہے۔

زکوۃ صرف سونے یا چاندی کے سکوں پر ہے

زکوۃ کے معاملہ میں ان کے ہاں یہ مسئلہ ہے کہ سونا چاندی اگر سکوں کی شکل میں نہ ہو تو اس پر زکوۃ واجب نہیں،[4] اور اگر سکوں کی شکل میں بھی ہو مگر وہ رائج نہ رہے ہوں دوسرے ان کی جگہ رواج پاگئے ہوں تو

1۔ قال ابن بابويه: «اعلم أنه لا يجوز الاعتكاف إلا في خمسة مساجد: في المسجد الحرام ومسجد الرسول صلى الله عليه وسلم ومسجد الكوفة ومسجد المدائن ومسجد البصرة، والعلة في ذلك أنه لا يعتكف إلا في مسجد جامع جمع فيه إمام عدل». المقنع: ص 71؛ المرتضى، الانتصار: ص 96.

2۔ سورة البقرة، الآية: 187

3۔ قال الطوسي: «وعلى المعتكف أن يتجنب ما يتجنبه المحرم من النساء والطيب والكلام الفاحش والمماراة والبيع والشراء ولا يفعل شيئا من ذلك». النهاية: ص 167؛ الحلي، مختلف الشيعة: 3/ 589؛ العاملي، اللمعة الدمشقية: 2/ 157.

4۔ روى الكليني عن الصادق والكاظم أنهما قالا: «ليس على التبر زكاة، إنما هي على الدنانير والدراهم». الكافي: 3/ 518؛ الطوسي، تهذيب الأحكام: 4/ 7.

ان سکوں پر بھی زکوۃ واجب نہیں،[1] اس سلسلہ میں ان کے ہاں حیلہ کی یہ شکل بھی جائز ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس چاندی سونے کا بہت سا سکہ ہو اور آخر سال تک وہ اس کی ملکیت میں بھی ہے، اگر سال ختم ہونے سے ایک دو دن پہلے بھی وہ ان سکوں کا زیور، کھلونے، برتن یا کوئی سامان آرائش بنوالے تو ان سے زکوۃ ساقط ہو جائے گی۔[2]

ان مسائل میں اگر غور و تدبر سے دیکھا جائے گا تو معلوم ہو گا کہ مقاصد شرع سے یہ کتنے دور جا پڑے اور نص صریح کی مخالفت پر کتنے جری اور دلیر ہو گئے ہیں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ[3]

جو لوگ سونے اور چاندی کو جوڑ جوڑ کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک اور سخت عذاب کی بشارت دیجئے۔

اور نبی اکرم ﷺ یا ائمہ کے کلام میں جہاں کہیں زکوۃ کی فرضیت کا ذکر آتا ہے وہاں سونے چاندی ہی کا نام آتا ہے دراہم و دنانیر کا نام نہیں آتا (اس لیے جس چیز میں بھی چاندی سونا پایا جائے گا اس پر وہ فرضیت لاگو ہو گی)

مال تجارت پر زکوۃ نہیں

اموال تجارت پر بھی ان کے ہاں زکوۃ واجب نہیں جب تک لین دین رد و بدل اور الٹ پھیر میں ان کی نقدی نہ بن جائے،[4] اور ایسے مال میں بھی زکوۃ کو واجب نہیں کہتے جس کا کوئی عورت یا مرد مالک ہو اور پھر

1۔ تقدم قول العاملي « ... وإن هجرت فلا زكاة ... » ويعني إن لم تعد تلك الدنانير الذهبية متداولة بين الناس. اللمعة الدمشقية: 2/ 30.

2۔ قال العاملي: «أما النقدان فيشترط فيهما النصاب والسكة، وهي النقش الموضوع للدلالة على المعاملة الخاصة بكتابة وغيرها، وإن هجرت فلا زكاة في السبائك والممسوح، وإن تعومل به ... ولو اتخذ المضروب بالسكة آلة للزينة وغيرها لم يتغير الحكم ..». اللمعة الدمشقية: 2/ 30؛ وقريب منه ما قاله الطباطبائي، العروة الوثقى: 2/ 373.

3۔ سورة التوبة، الآية: 34

4۔ العاملي، اللمعة الدمشقية: 2/ 37؛ الطباطبائي، العروة الوثقى: 2/ 304.

اس نے اسے اپنے سرمایہ قرار دے لیا، [1] اور نہ اس مال میں زکوۃ ہے جو کمائی کی خاطر خرید اگر پھر اسے سرمایہ بنانے کی نیت کر لی یا اس کے برعکس حالانکہ شارع علیہ السلام کا حکم "أدوا زكاة أموالكم" [2] اپنے مالوں کی زکوۃ دو صاف ہے اور ان مذکورہ چیزوں کے مال ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

مستحق صاحب نصاب بن جائے تو اس سے زکوۃ واپس لی جائے

اگر کوئی نادار، فقیر، مستحق کے زکوۃ زکوۃ کے پیسہ پر قابض مالک اور متصرف ہونے کے بعد امیر ہو جائے تو ان کے نزدیک وہ زکوۃ واپس لے لینے کا حکم ہے، [3] حالانکہ کسی کا مال رضامندی کے بغیر لینا کسی بھی شریعت میں جائز نہیں زکوۃ لیتے وقت اس کا مستحق ہونا شرط ہے تمام عمر کے لیے یہ شرط نہیں۔

استطاعت حج کا مسئلہ

ان کے ہاں ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس اتنی رقم ہے کہ سفر حج اور آمد و رفت کے تمام اخراجات نیز اہل خانہ کے تا واپسی اخراجات بخوبی پورے ہو سکتے ہیں مگر اس کو یہ گمان ہے کہ واپس گھر آ کر مزید ایک ماہ سے زائد یہ رقم پوری نہیں پڑے گی تو اس پر حج فرض نہیں، [4] ابو القاسم [5] نے شرائع میں اور دوسروں نے اس پر نص کی ہے حالانکہ شارع نے حج کو استطاعت کی شرط سے مقید کر کے فرض فرمایا ہے اور استطاعت کی تفسیر یہ ہے کہ اس کا پیسہ سفر خرچ سواری خرچ اور آمد و رفت کی مدت میں اس کے اہل خانہ کے خرچ کو کافی ہو سکے اگر واپسی پر پیسہ ختم ہو جائے تو اس سے استطاعت میں کوئی نقصان پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ظاہر ہے واپس آ

1۔ لا يرون الزكاة في عروض التجارة. ينظر ابن المطهر الحلي، قواعد الأحكام: ص 91.

2۔ أخرجه الترمذي وابن حبان والحاكم. وهو عند الإمامية حيث أورده العاملي عن أبي إمامة في وسائل الشيعة: 1/ 23.

3۔ العروة الوثقى: 2/ 354.

4۔ من لا يحضره الفقيه، باب استطاعة السبيل إلى الحج، 2/ 418، ط: الحوزة العلمية قم المقدسة

5۔ هو أبو طالب محمد بن الحسن بن يوسف بن علي ابن المطهر المعروف عند الإمامية بالمحقق الحلي. وقد ذكر في كتابه شروط الحج فقال: «أن يكون له ما يمول عياله حتى يرجع، فاضلا عما يحتاج إليه، ولو قصر ماله عن ذلك لم يجب» شرائع الإسلام: 1/ 361. ونقل المرتضى الإجماع عليه، الناصريات: ص 105، ابن زهرة، الغنية: ص 86.

کرہر شخص اپنی سابقہ یا نئی معاش میں لگ جاتا ہے بیکار نہیں بیٹھتا (صرف استطاعت کارخ بدلے گا پہلے خرچ کرنے کی استطاعت میں لگا ہوا تھا اب کمانے کی استطاعت میں مشغول ہو سکے گا)

حج میں ستر عورت فرض نہیں ہے

ان کے بعض کہتے ہیں کہ حج میں ستر عورت فرض نہیں ہے، ایام جاہلیت کی طرح برہنہ ہو کر طواف کرنے کو بھی جائز کہتے ہیں مگر یہ شرط لگاتے ہیں کہ اپنی شرمگاہ کو مٹی یا کسی چیز سے اتنا لتھیڑے کہ کھال نظر نہ آئے، گو اس کی شکل دکھتی رہے اس میں کوئی حرج نہیں،[1] (کیا ننگے ہندو جوگیوں سے سرقہ تو نہیں) اس طرح تو انہوں نے رسم جاہلیت کو زندہ کیا ہے ملت حنفیہ سے اس کا کیا ربط و تعلق،[2] حالانکہ قرآن مجید میں "خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ"[3] مسجد میں جاتے وقت اپنا لباس لے لو کا صاف حکم ہے اور روایات بھی اس مسئلہ کے خلاف موجود ہیں اور خانہ خدا کے طواف کے وقت تو ادب کا امتحان سے زیادہ لحاظ رکھنا چاہیے وہاں ننگا ہو کر خانہ خدا کی بے حرمتی اور اپنی رسوائی نہ کرے اور اہل جاہلیت کی مشابہت اختیار کرکے شیطان کی سواری نہ بنے۔

اسی کے ساتھ طرفہ تماشا یہ بھی ہے کہ اگر احرام کی حالت میں زنا سرزد ہو جائے تو اثنا عشریہ کے نزدیک حج میں کوئی نقصان اور خلل نہیں ہوتا اور ننگوں میں یہی نہ ہوگا تو پھر کیا ہوگا جب کوئی بے حیائی پر کمر

1۔ ستر العورة حال الطواف على الأحوط- (المعتمد في شرح المناسك، 4/ 331، ط: منشورات مدرسة دار العلم) وقال في هامشه: والعمدة في المقام الروايات الناهية عن الطواف عريانا وهي مروية بطرق كثيرة منا ومن العامة ولكنها جميعا ضعيفة السند-

2۔ أخرج الإمام أحمد عن زيد بن أثيع قال: «سألنا عليا رضي الله عنه بأي شيء بعثت؟ يعني يوم بعثه النبي صلى الله عليه وسلم مع أبي بكر رضي الله عنه في الحجة، قال: بعثت بأربع لا يدخل الجنة إلا نفس مؤمنة ولا يطوف بالبيت عريان ومن كان بينه وبين النبي صلى الله عليه وسلم عهد فعهده إلى مدته ولا يحج المشركون والمسلمون بعد عامهم هذا». الإمام أحمد، المسند: 1/ 79، رقم 594؛ الترمذي، السنن، كتاب الحج، باب كراهية الطواف عريانا: 3/ 222، رقم 871. وأخرجه الإمامية أيضا بلفظ قريب عن ابن عباس، العاملي، وسائل الشيعة: 13/ 44.

3۔ سورة الاعراف، الاية : 31

باندھ لے تو جو چاہے کرے،[1] حالانکہ اللہ تعالی کا فرمان واضح اور صاف ہے کہ "فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ "[2] حج میں نہ جماع ہے نہ بدکاری اور نہ دنگا فساد، زنا سے بڑھ کر رفث اور کیا ہوگا؟

حالت احرام میں دوسری بار شکار پر کفارہ نہیں

احرام کی حالت میں اگر شکار عمداً کیا تو اس پر کفارہ واجب ہوگا اور اگر دوبارہ پھر ایسا ہی کیا تو کفارہ نہیں،[3] یہ ان کا مسئلہ ہے حالانکہ دوسری مرتبہ میں تو پہلے کی نسبت قصور زیادہ ہے کہ اس میں اصرار اور ڈھٹائی کا تاثر ملتا ہے۔

جہاد صرف پانچ اوقات کے ساتھ مخصوص ہے

ان کے ہاں جہاد صرف پانچ اوقات کے ساتھ مخصوص ہے،(1) سرور کائنات ﷺ کے عہد مبارک میں (2) جناب امیر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں (3) حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح سے پیشتر کے وقت (4) حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ہم رکابی میں (5) میں امام مہدی کی سرکردگی میں۔[4]

(حضرت علی اور جناب سبطین رضی اللہ عنہم کی ہمراہی میں انہوں نے جیسے جہاد کیا اس کا کچا چٹھا آپ اوراق گزشتہ میں ملاحظہ فرما چکے اب امام مہدی کے ساتھ کیسا جہاد کرتے ہیں دیکھنا چاہیے)

ان کے مذکورہ پانچ اوقات یا زمانوں کے علاوہ ان کے نزدیک جہاد و عبادت تو کیا جائز بھی نہیں حالانکہ جہاد سے متعلق یہ نص:

1۔ قال ابن زهرة: «ومن وطئ قبل الوقوف بعرفة، وإن وطئ بعد الوقوف بالمشعر الحرام لم يفسد حجه وكان عليه بدنة ..». الغنية: ص 159. وينظر ما قاله الحر العاملي في اللمعة الدمشقية: 2/ 356.

2۔ سورة البقرة، الاية: 197

3۔ وكذلك الروايات المنقولة عن الأئمة في كتبهم. منها ما رواه ابن أبي عمير في (الصحيح) قال: «قلت لأبي عبد الله – عليه السلام –: محرم أصاب صيدا؟ قال: عليه كفارة، قلت: فإن عاد؟ قال: عليه كلما عاد». الطوسي، تهذيب الأحكام: 5/ 372.

4۔ قال المجلسي: «ولا جهاد إلا مع الإمام». بحار الأنوار: 99/ 10.

" الجهاد ماض إلى يوم القيامة "(1) جہاد قیامت تک جاری ہے، بتواتر ثابت ہے

اس کے علاوہ قرآن مجید کی وہ آیات جو جہاد کی ترغیب وتاکید کے لیے وارد ہوئی ہیں ان میں کسی وقت اور زمانہ کی قید نہیں بعض آیات تو ایسی ہیں جو صراحتاً اسباب پر دلالت کرتی ہیں کہ جہاد ان اوقات خمسہ کے علاوہ بھی عبادت اور اجر عظیم کا باعث ہے مثلاً خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے رفقا کے حق میں یہ آیت "يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ "(2) کہ وہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے ہیں، اور خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کے لشکر کی شان میں یہ آیت "قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ إِلَى قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ "(3)

اب یہ دیکھیے کہ جب ان کے نزدیک پانچ اوقات کے علاوہ جہاد فاسد ہے تو فاسد جہاد کے مال غنیمت کی تقسیم بھی شرعی لحاظ سے درست نہ ہوگی تو ایسی صورت میں جو لونڈیاں کسی کے قبضہ میں ہوں گی وہ نہ ان کی ملک ہوں گی اور نہ ان سے نفع اٹھانا جائز ہوگا، اس گتھی کو سلجھانے کے لیے انہوں نے ایک انوکھا فتوی گھڑا ہے صاحب رقع مزورہ(4) نے اس فتویٰ کی نسبت امام صاحب الزمان کی طرف کی ہے کہ یہ لونڈیاں سب امام کی ملک ہیں اور ائمہ اپنی لونڈیوں کو اپنے شیعوں کے لیے حلال سمجھتے تھے(5) گویا اس حیلہ سے گرفتار شدہ باندیاں

1۔ المعجم الأوسط، للطبرانی، 5/ 95، ط: دار الحرمين القاهرة

2۔ سورة المائدة، الاية: 54 روى الطبري عن الضحاك في تفسير الآية قوله: «هو أبو بكر وأصحابه لما ارتد من ارتد من العرب عن الإسلام جاهدهم أبو بكر وأصحابه حتى ردهم إلى الإسلام». تفسير الطبري: 6/ 283؛ وينظر الدر المنثور للسيوطي: 3/ 102.

3۔ سورة الفتح، الاية: 16 وفسر الطبري أولئك القوم بأنهم أهل فارس والروم، ومعلوم أن قتال هؤلاء كان في عهد أمير المؤمنين عمر بن الخطاب رضي الله عنه. تفسير الطبري: 26/ 82

4۔ ويسميها الإمامية ب (التوقيعات المقدسة)، وهي كتب ادعوا أنها بخط الإمام المنتظر

5۔ قال المفيد: «الأنفال لرسول الله صلى الله عليه وسلم في حياته، وهي للإمام القائم بعده». تهذيب الأحكام: 4/ 132. لأن الدنيا عند الإمامية للإمام يتصرف فيها كيف يشاء. روى ابن بابويه القمي عن أبي بصير عن الصادق أنه قال: «إن الدنيا للإمام يضعها حيث يشاء ويدفعها حيث يشاء ...». من لا يحضره الفقيه: 2/ 39.

شیعوں کے لیے حلال ہوئیں کتنے رکیک اور واہیات ہیں یہ حیلے کے حیلہ گھروں پر زمین و آسمان سے پھٹکار پڑنی چاہیے اور بے حیائی اور بے باکی تو دیکھیے کہ جن فقہی کتابوں میں دین و ایمان کی باتیں موزون ہوتی ہیں ان میں ایسی شرمناک باتیں اپنا دین و مذہب بتا کر انہوں نے درج کی ہیں۔

اس سلسلہ میں جب اہل سنت ان کو کہتے ہیں کہ اگر ان اوقات کے علاوہ جہاد جائز ہی نہ تھا تو خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جہاد میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں اسیر ہونے والی خولہ بنت جعفر یمامیہ پر جن کے بطن سے جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں جناب امیر رضی اللہ عنہ کا تصرف کیسے درست تھا،[1] کہ نہ تو بقول تمہارے وہ جہاد کا وقت درست تھا اور نہ ہی خلیفہ وقت کی تقسیم درست تھی اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ وہ روایت صحیح ثابت ہے کہ جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے ان کو آزاد کر کے پھر عقد کیا تھا لیکن یہ اتنا نہیں جانتے کہ مالک ہوئے بغیر آزاد کرنے کی تک ہی کیا ہے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لہذا پہلے آپ اس کے مالک ہوئے پھر آزاد کیا اور آزاد کرنا خود ایک تصرف ہے لہذا مدعا ثابت ہوا۔

عقد نکاح یا معاملات خرید و فروخت صرف عربی زبان میں جائز ہیں

ان کے نزدیک عقد نکاح یا معاملات خرید و فروخت صرف عربی زبان میں جائز ہیں کسی اور زبان میں جائز نہیں،[2] حالانکہ کسی بھی شریعت میں دنیاوی معاملات میں لغات کا ہرگز اعتبار نہیں کیا اور نہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں خراسان اور فارس کے لوگوں کو اس کی تکلیف دی کہ وہ اپنے معاملات عربی زبان میں طے کیا کریں بلکہ نکاح اور خرید و فروخت کے معاملات جو وہ اپنی زبانوں میں طے کر رہے تھے ان کو بدستور جاری اور نافذ و جائز رکھا اور یہ بات عقل میں بھی نہیں آتی کہ ان معاملات نکاح و خرید و فروخت طلاق کی صحت میں عربی زبان کا کسی قسم کا دخل ہو کیونکہ ان معاملات میں اصل مقصد تو دلی منشا کا ظاہر کرنا ہوتا ہے اور وہ عادتاً

1۔ ولكن «الحنفية» التي تسرى بها الإمام علي وولدت له محمد بن الحنفية رضوان الله عليه هي من بني حنيفة في اليمامة أسرت أيام خلافة رسول الله صلى الله عليه وسلم أبي بكر الصديق. انظر المناقشة في هذه المسألة بين السيد عبد الله السويدي وملا باشي كبير مجتهدي الشيعة في زمان نادرة شاه سنة 1156 في رسالة مؤتمر النجف ص 31.

2۔ قال العاملي عن عقد الزواج: «ولا يجوز بغير العربية مع القدرة». اللمعة الدمشقية: 5/ 20 ويشمل هذا البيع أيضا.

ہر قوم اپنی ہی زبان میں کرتی ہے۔

باپ کی موجودگی میں ولی دادا ہوتا ہے

ان کے ہاں باپ کی موجودگی میں چھوٹے بچے کے مال کا مختار دادا ہوتا اور وہی ولایت کا حق رکھتا ہے[1] حالانکہ شرع اور عرف دونوں میں یہ طے شدہ بات ہے کہ ہر معاملہ میں ولی اقرب کے ہوتے ہوئے ولی ابعد کا کوئی عمل دخل حاصل نہیں ہوتا۔

تجارت میں مومن سے نفع لینا مکروہ ہے

ایک مسئلہ یہ ہے کہ تجارت میں مومن سے منافع لینا مکروہ ہے،[2] حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "وَ أَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ"[3] اللہ نے حلال کی اور "إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ"[4] مگر یہ کہ وہ تجارت تمہاری باہمی رضامندی سے ہو اس میں مومن وغیرہ مومن دونوں برابر ہیں کیونکہ تجارت کی بنیاد اور خرید و فروخت کا مقصد منافع ہی ہوتا ہے۔

اور پھر ہر عہد اور ہر شہر میں ساری امت کا عمل بھی سراسر اس کے خلاف ہے اگر کوئی شخص دارالاسلام میں تجارت کا پیشہ اختیار کرنا چاہے تو یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ تجارت کر سکے اور اس طرح ایران، خراسان، عراق، عرب اور یمن جیسے ملک تو تجارت کے فائدہ سے محروم ہوں گے حالانکہ انبیاء وائمہ نے مومنین کے درمیان تجارتی معاملات قائم کیے اور نفع لینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

1۔ عن أبي عبد الله عليه السلام قال: "إذا زوج الأب والجد كان التزويج للأول، فإن كانا زوجا في حال واحدة فالجد أولى" (من لا يحضره الفقيه، باب الولي والشهود والخطبة والصداق، 3/ 395، ط: الحوزة العلمية قم المقدسة)

2۔ قال (المحقق) الحلي: «ويكره مدح البائع ... والربح على المؤمن إلا لضرورة ...». شرائع الإسلام: 2/ 27.

3۔ سورة البقرة، الآية : 275

4۔ سورة النساء، الآية : 29

شے مرہونہ پر قبضہ کیے بغیر رہن جائز ہے

کہتے ہیں کہ رہن شدہ چیز پر مرتہن کا قبضہ ہوئے بغیر رہن جائز ہے حالانکہ شرع میں قبضہ کو رہن کی ضروریات اور لوازمات میں سے شمار کیا گیا ہے "فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ"[1] ارشاد ربانی ہے قبضہ کے بغیر وہ فائدہ مرتب نہیں ہوتا جو رہن سے مقصود ہے اس لیے کہ رہن رکھنے والے کو رہن شدہ قبضہ میں دخل نہیں وہ ملک تو راہن کی ہے اس کی اجازت کے بغیر مرتہن کوئی فائدہ اور نفع نہیں اٹھا سکتا جو کچھ ہے یہی قبضہ تو ہے کہ جس کے ذریعے بوقت ضرورت قرض وصول کر سکتا ہے اگر یہ بھی نہ ہو تو راہن کا فائدہ کیا ہے اس کے علاوہ یہ مسئلہ ائمہ کی روایت صحیحہ کے بھی خلاف ہے چنانچہ محمد بن قیس نے جناب باقر و صادق علیہما السلام ہر دو سے یوں روایت بیان کی ہے "أنهما قالا : لا رهن إلا مقبوض "[2] ان دونوں نے فرمایا رہن قبضہ کی صورت ہی میں صحیح ہے۔

مرہونہ لونڈی سے جماع جائز ہے

اگر کسی شخص نے کسی کی لونڈی راہن رکھی تو ان کے نزدیک اس سے ہمبستری جائز ہے،[3] حالانکہ یہ کھلا زنا ہے۔

ام ولد کو رہن رکھنا جائز ہے

ان کے ہاں اگر کوئی اپنی حرم یعنی مملوکہ لونڈی کو جس کے بطن سے بچہ پیدا ہو چکا ہو اور جسے فقہا کے عرف میں ام ولد کہتے ہیں کسی کے پاس رہن رکھے تو یہ جائز ہے بلکہ یہ تک جائز ہے کہ رہن رکھنے والے کو اجازت دے دے کہ وہ اس کے آگے پیچھے جس راہ سے چاہے جنسی فعل کر سکتا ہے،[4] اب اس پر کیا تبصرہ کیا

1۔ سورة البقرة، الاية : 283

2۔ وسائل الشيعة للعاملي: 18/ 383.

3۔ قال الطوسي: «وإن أقرض شيئا وارتهن على ذلك وسوغ له صاحب الرهن الانتفاع به جاز له ذلك سواء كان ذلك متاعا أو مملوكا أو جارية أو أي شيء كان ...». النهاية: ص 116.

4۔ توقف الطوسي في هذا لكن غيره من فقهاء الإمامية أباح ذلك، قال ابن إدريس: «والذي عندي أنه إذا أباح المالك له وطأها من غير اشتراط في القرض ذلك، فإنه جائز حلال». السرائر: 2/ 65.

جائے اس مسئلہ میں جو قباحت ہے یا یہ قواعد شرح کے جس قدر مخالف ہے وہ سب پر روشن ہے حقیقت یہ ہے کہ اسے یہی فرقہ اپنے ماتھے کا جھومر بنا سکتا ہے۔

اجازت کے بغیر کفیل بنانا جائز ہے

مسئلہ ہے کہ اگر کوئی اپنا قرض کسی دوسرے پر اتار دے تو دوسرا اسے معنی یا نہ مانے ہر حال میں ادائیگی قرض اس پر واجب ہے، ابو جعفر طوسی اور اس کے استاد ابن النعمان نے اس پر نص کی ہے،[1] اس حکم کا انوکھا پن یہی ہے کہ کسی شریعت میں یہ دھاندلی اور زبردستی پن نہیں ہے کہ ایک کا قرض دوسرے کے قبول کیے بغیر اس کے سر تھوپ دیا جائے اگر کہیں اس مسئلہ پر عمل درامد شروع ہو جائے تو ایسی ہڑبونگ اور شورش برپا ہو گی کہ باید و شاید ہر فقیر اپنے قرضداروں کو مارکیٹوں اور ساہوکاروں کے حوالہ کر جائے اور صاحب ثروت تاجروں ساہوکاروں کا حال کنگلے فقیروں کے قرضوں میں لوٹ جائے تو کتنا عجیب تماشہ ہو گا۔

امانت سے انکاری ہونا جائز ہے

ایک مسئلہ یہ ہے کہ کسی نے کسی کا مال چھین جھپٹ کر یا دھوکہ فریب سے غصب کر کے کسی کے پاس امانت رکھ دیا اور پھر امانت رکھوانے والا مر گیا تو امین پر واجب ہے کہ وہ اس امانت سے انکاری ہو جائے حالانکہ امانت سے انکار کی اللہ تعالی نے بڑی سخت ممانعت فرمائی ہے غصب کا گناہ تو غاصب کے سر ہے اس امانت دار کو امانت کا انکار کس طرح جائز ہو گا؟ جھوٹ بول کر یہ جھوٹی قسم کھا کر وہ آخرت کی جوابدہی اور پکڑ سے کس طرح بچے گا؟ اور دنیا میں اس کے لیے یہ جائز ہی کہاں ہو گا؟

غصب شدہ مال فقیروں کو خیرات کر دیا جائے

یہ بھی ان کا مسئلہ ہے کہ اس غصب شدہ مال کا مالک ایک سال کی تلاش و جستجو کے باوجود نہ مل سکے تو یہ مال فقیروں کو خیرات کر دیے جائے حالانکہ غیر کے مال میں بغیر مالک کی اجازت خیرات کرنا شرع میں جائز نہیں اللہ تعالی کا فرمان ہے:

1۔ أي المفيد، نص عليه في المقنعة: ص 219؛ الطوسي، النهاية: ص 323.

إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا[1]

اللہ تعالی تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کو لوٹاؤ۔

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

أد الأمانة إلى من ائتمنك ولا تخن من خانك[2]

جس نے تجھے امین بنایا اس کی امانت اسے لوٹا اور جو تجھ سے خیانت کرے تو اس سے خیانت نہ کر۔

ابن مطہر حلی نے بھی اس حدیث کی صراحتاً تصحیح بیان کی ہے۔[3]

غاصب پر حاکم کا ظلم درست ہے

مسئلہ ہے کہ ایک شخص نے کسی کا مال غصب کیا اور اپنے مال میں رلا ملا دیا کہ دونوں کی پہچان یا علیحدگی ممکن نہ رہی مثلاً دودھ دہی گھی ہوں شکر اور پانی وغیرہ تو حاکم کو چاہیے کہ غاصب کا مال رَلا ملا مال اس شخص کے حوالے کر دے جس کا مال غصب ہوا تھا،[4] سبحان اللہ! اس عدل و انصاف کے کیا کہنے یہ تو غاصب پر کھلم کھلا ظلم ہے کیونکہ جس کو غاصب کا مال دیا جا رہا ہے اس کا غاصب کے مال میں کیا حق پہنچتا ہے کیونکہ اس سارے مال میں غاصب کا بھی تو مال شامل ہے اور پھر ظلم کا علاج تدارک ظلم سے نہیں کیا جا سکتا۔

مرہونہ لونڈی سے لطف اندوزی جائز ہے

ایک مسئلہ ان کا یہ بھی ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی لونڈی کسی کے پاس رہن رکھی اور اس کو اجازت دے دی کہ جب چاہے اس سے لطف اندوز ہو تو یہ جائز ہے امانت دار کو یہ حق ہو جاتا ہے کہ خوب آزادی سے

1۔ سورة النساء، الاية: 58

2۔ أحمد وأبو داود والترمذي؛ صحيح الجامع: رقم 240.

3۔ رواه الإمامية عن الأئمة في الكافي: 8/ 293؛ وتهذيب الأحكام: 6/ 348.

4۔ انظر بالتفصيل المجلد الثاني من كتاب تذكرة الفقهاء لابن مطهر الحلي، الصفحة: 199، ط: منشورات المكتبة المرتضوية لاحياء الآثار الجعفرية

پھرے اڑائے ، اسی طرح اگر کوئی یوں کہہ دے کہ اس لونڈی کے تمام منافع تیرے لیے بحال کیے تو دوسرے شخص کے لیے اس لونڈی سے لطف اندوزی حلال طیب ہو جاتی ہے،[1] اور ان کے ہاں شرمگاہ کو اس کے نام کی شرع یا تمام منافع کی آڑ میں عاریتاً دینا جائز ہے اور ام ولد کو ہمبستری کے لیے عاریت دینا بھی روا ہے[2]

یہ تمام مسائل قرآن مجید کے احکامات کے بالکل مخالف ہیں اس لیے کہ قرآن مجید میں تو یہ فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ، إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ، فَمَنِ ابْتَغَى وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْعَادُونَ[3]

اور وہ لوگ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ہاں مگر اپنی بیویوں اور مملوک کالونڈیوں پر استعمال کرتے ہیں تو ان پر ملامت نہیں ہے اور جو کوئی ان کے علاوہ کوئی اور صورت چاہے تو وہی حد سے گزرنے والے ہیں۔

سمجھدار بچے کی نگرانی جائز نہیں

یہ کہتے ہیں ہوشیار اور سمجھدار بچہ اپنے وارثوں سے بھٹک کر کسی کے پاس پہنچ جائے تو اسے اپنی نگرانی میں لینا اور اپنے گھر میں اس کی نگہداشت کرنا جائز نہیں،[4] حالانکہ ہوشیار بچہ بھی گم ہو سکتا ہے اور پھر اس کی نگرانی وحفاظت نہ کرنا اس کی ہلاکت کا باعث ہو سکتا ہے وہ اپنی کم عمری کے سبب نہ نقصان رساں چیز کا دفاع کر سکتا ہے اور نہ اپنی بقا کا منافع حاصل کر سکتا ہے لہذا اس کو اپنی حفاظت پر نگہداشت میں لینا جانوروں کی نگہداشت سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔

1۔ قال الطوسي: «وإن أقرض شيئا وارتهن على ذلك وسوغ له صاحب الرهن الانتفاع به جاز له ذلك سواء كان ذلك متاعا أو مملوكا أو جارية أو أي شيء كان ... ». النهاية: ص 116.

2۔ روى الكليني عن أبي العباس البقباق قال: سأل رجل أبا عبد الله عليه السلام ونحن عنده عن عارية الفرج؟ فقال: حرام، ثم مكث قليلا وقال: ولكن لا بأس بأن يحل الرجل جاريته لأخيه. الكافي: 3/ 141.

3۔ سورة المومنون ، الاية : 5، 6، 7

4۔ نقل ذلك الكيدري في إصباح الشيعة: ص 333.

اجارہ صرف عربی زبان میں معتبر ہے

ان کے نزدیک اجارہ عربی زبان میں اس کا معاملہ کیے بغیر معتبر نہیں،[1] اجرت پر کوئی چیز لینا مثلاً سواری کے لیے کوئی گاڑی یا جانور وغیرہ یا مثلاً رہنمائی کے لیے کوئی گائیڈ وغیرہ۔

مجاہد یا سیکورٹی گارڈ تنخواہ کا مستحق نہیں

یہ مسئلہ بھی ان کے ہاں ہے کہ اگر کوئی شخص کافروں سے جہاد کرنے کے لیے لشکر میں بھرتی ہو جائے یا ڈاکوؤں کے قلع قمع میں پولیس و سیکورٹی میں نوکر ہو جائے تو امام مہدی کی عدم موجودگی کے سبب وہ تنخواہ کا مستحق نہیں کیونکہ امام کی غیر موجودگی کے سبب جہاد فاسد ہے صحیح نہیں ہے،[2] لہذا تنخواہ کا معاہدہ بھی صحیح نہیں ہو گا۔

غیر کی باندی سے منافع حاصل کرنا حلال ہے

ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر ایک شیعہ نے اپنی ام ولد لونڈی کو کسی شخص کے پاس گھریلو کاموں وغیرہ کے لیے نوکر رکھا، یا اور اس کی شرمگاہ کو کسی دوسرے شخص کے لیے حلال کر دیا تو اس کی گھریلو خدمات ایک شخص کے لیے ہوں گی اور جن سے خدمات دوسرے شخص کے لیے۔[3]

ہبہ بغیر عربی زبان کے درست نہیں

ان کے نزدیک ہبہ عربی زبان کے بغیر درست نہیں،[4] اب کوئی لاکھ بار کہے کہ میں نے تجھے یہ چیز بخش دی یا دے دی وہ ہبہ معتبر نہیں ہو گا۔

1۔ قال العاملي عن عقد الزواج: «ولا يجوز بغير العربية مع القدرة». اللمعة الدمشقية: 5/ 20 ويشمل هذا البيع أيضا.

2۔ قال المجلسي: «ولا جهاد إلا مع الإمام». بحار الأنوار: 99/ 10.

3۔ توقف الطوسي في هذا لكن غيره من فقهاء الإمامية أباح ذلك، قال ابن إدريس: «والذي عندي أنه إذا أباح المالك له وطأها من غير اشتراط في القرض ذلك، فإنه جائز حلال». السرائر: 2/ 65.

4۔ قال العاملي عن عقد الزواج: «ولا يجوز بغير العربية مع القدرة». اللمعة الدمشقية: 5/ 20 ويشمل هذا البيع أيضا.

لونڈی ہمبستری کے لیے کسی کو دینا جائز ہے

ان کے نزدیک اپنی زر خرید مملوک کا لونڈی کو جنسی تلذذ کے لیے کسی کو بخشا درست ہے اور شرمگاہ عاریتاً دینا بھی جائز ہے۔[1]

صدقہ واپس لینا جائز ہے

ان کے اکثر کے ہاں صدقہ واپس لے لینا جائز ہے،[2] حالانکہ قرآن مجید میں "لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ"[3] اپنے صدق باطل مت کرو کا حکم ہے اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا "العائد في صدقته كالكلب يعود في قيئه"[4] اپنا دیا ہوا صدقہ واپس لینے والا ایسا ہے جیسے کتا اپنی خیر کو چاٹ لے۔

بلی کو وقف کرنا جائز ہے

ان کے ہاں بلی کو وقف کرنا جائز ہے،[5] اب خدا جانے بلی میں وہ کون سا نفع نظر آیا یا فائدہ دیکھا کہ اس کا وقف جائز قرار دیا۔

لونڈی کی شرمگاہ کا وقف جائز ہے

ان کے ہاں کا ایک متفقہ مسئلہ یہ بھی ہے کہ لونڈی کی شرمگاہ کا وقف جائز ہے اگر وہ لونڈی کرائے پر چلے یا کسی کے ساتھ متعہ میں جائے تو جس کے لیے وہ وقف کی گئی ہے اس کو وہ کمائی کھانا جائز ہے شیر مادر کی

1۔ توقف الطوسي في هذا لكن غيره من فقهاء الإمامية أباح ذلك، قال ابن إدريس: «والذي عندي أنه إذا أباح المالك له وطأها من غير اشتراط في القرض ذلك، فإنه جائز حلال». السرائر: 2/ 65.

2۔ قال المرتضى: «ومما انفردت به الإمامية القول بأن من وهب شيئا غير قاصد به ثواب الله تعالى ووجهه جاز له الرجوع فيه ما لم يتعوض عنه، ولا فرق في ذلك بين الأجنبي وذي الرحم». الانتصار: ص 267.

3۔ سورة البقرة، الاية: 264

4۔ صحيح البخاری، باب هبة الرجل لامرأته والمرأة لزوجها، 3/ 158، ط: دار طوق النجاة

5۔ نقل ذلك (المحقق) الحلي، شرائع الإسلام: 2/ 444؛ و (العلامة) الحلي، قواعد الأحكام: ص 215.

طرح ہضم کر سکتا ہے۔[1]

ضرورت اور خواہش کے باوجود نکاح نہ کرنا مستحب ہے

ایک مسئلہ یہ بھی ان کے ہاں ملتا ہے کہ خواہش اور ضرورت ہونے کے باوجود نکاح نہ کرنا مستحب ہے یہ مسئلہ انبیاء واوصیاء کی سنت کے صریحا خلاف ہے ان حضرات نے خود بھی نکاح کیے اور دوسروں کو بھی اس کا حکم دیا انہوں نے چونکہ خواہشات کو پورا کرنے کا شیطانی طریقہ شرمگاہوں کو کرائے پر چلا کر یا ہبہ کر کے یا عاریت دے کر اختراع کر لیا ہے،[2] اس لیے یہ کیوں نکاح کا جھنجھٹ پالیں یا اس کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھائیں۔

بعض دنوں میں نکاح مکروہ ہے

ان کا کہنا ہے جن ایام میں چاند برج عقرب میں ہو[3] یا تحت الشعاع[4] ان ایام میں نکاح مکروہ ہے حالانکہ یہ امور مقاصد شرع کے خلاف ہیں، جن کا مقصد نجوم پرستی کی بیخ کنی ہے یہ بات ملت حنیفیہ کے تو خلاف ہے البتہ صابئین کے موافق ہے۔

1۔ قال (المحقق) الحلي: «يصح وقف المملوكة، ينتفع بها مع بقائها ويصح قبضها». شرائع الإسلام: 2/ 444.

2۔ رغم أنهم يروون عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: «من أحب أن يلقى الله طاهرا مطهرا فليستعفف بزوجة». أخرجه ابن بابويه، من لا يحضره الفقيه: 3/ 385.

3۔ نسبوا إلى الصادق أنه قال: «من تزوج والقمر في العقرب لم يرَ الحسنى». أخرجه الكليني، الكافي: 8/ 275؛ الطوسي، تهذيب التهذيب: 7/ 407.

4۔ رووا عن سليمان الجعفري عن أبي الحسن الرضا أنه قال: «من أتى أهله في محاق الشهر فليسلم لسقط الولد». الكليني، الكافي: 5/ 499؛ ابن بابويه، من لا يحضره الفقيه: 3/ 402؛ الطوسي، تهذيب الأحكام: 7/ 411. وقرر (المحقق) الحلي بأن الجماع مكروه في ثمانية أوقات: «ليلة خسوف القمر وليلة كسوف الشمس وعند الزوال وعند غروب الشمس حتى يذهب الشفق الحمر وفي المحاق وبعد طلوع الفجر إلى طلوع الشمس وفي أول ليلة من كل شهر إلا في شهر رمضان، وفي ليلة النصف وفي السفر إذا لم يكن معه ماء يغتسل به وعند هبوب الريح ...». شرائع الإسلام: 2/ 547؛ وينظر ما قاله العاملي، اللمعة الدمشقية: 5/ 93.

نو برس سے کم عمر کی لڑکی سے صحبت حرام ہے

ان کے ہاں نو برس کی عمر تک لڑکی نہ پہنچ جائے خواہ وہ کتنی ہی تگڑی اور جسم و جان والی ہو اس سے صحبت حرام ہے،[1] شرع میں اس کی کوئی اصل نہیں اسی حرام کہہ کر مذہب کا رنگ دینا انہی کا کام ہے۔

حلال نکاح میں جماع کی تعداد مقرر کرنا جائز ہے

یہ کہتے ہیں کہ حلال نکاح میں شرط کے طور پر زمانہ متعین میں جماع کی تعداد مقرر کرنا جائز ہے، مثلاً یہ کہ دن رات اتنی مرتبہ یا ایک ماہ میں اتنی مرتبہ یہ فعل کروں گا اور پھر ہر دو پر شرط کے موافق مطالبہ و مواخذہ کا حق ہے،[2] حالانکہ قرآن کریم میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَلَكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا[3]

ان سے کوئی خفیہ وعدہ نہ کرو جو کہو تو رو طریق کے موافق کہو۔

انہوں نے منکوحہ مملوکہ مانگی ہوئی وقف کی ہوئی اور امانت رکھی ہوئی یا متوعہ لونڈی کے ساتھ خلاف وضع فطری فعل کو جائز قرار دیا ہے[4] حالانکہ قرآن میں حیض کی حالت میں صحبت کی ممانعت ہے اور علت ممانعت نجاست و گندگی بتائی ہے جب حیض کے راستہ کی حرمت کا باعث گندگی ہے تو پاخانہ کی گندگی و نجاست کے باعث اس کے راستہ کی حرمت کیوں نہ ہوگی کہ اس کی ناپاکی تو اس راستہ کے آنتوں کے ہر وقت متصل رہنے اور ان میں اور ان میں نجاست کے بھرے رہنے سے زیادہ قابل حرمت ہے نبی کریم ﷺ نے صراحت کے

1۔ عن الصادق أنه قال: «لا يدخل بالجارية حتى يأتي لها تسع سنين أو عشر سنين». الكافي: 5/ 398؛ الطوسي، تهذيب التهذيب: 7/ 410.

2۔ ينظر الينابيع الفقهية: 38/ 486.

3۔ سورة البقرة، الآية: 235

4۔ أخرج الكليني عن صفوان بن يحيى قال: «قلت للرضا عليه السلام: إن رجلا من مواليك أمرني أن أسائلك عن مسألة هابك واستحيى منك أن يسألك، قال: وما هي؟ قلت: الرجل يأتي امرأته في دبرها؟ قال: له ذلك». الكافي: 5/ 54؛ وأخرجها أيضا الطوسي، تهذيب الأحكام: 7/ 415.

ساتھ فرمایا ہے کہ جو شخص عورت سے غیر فطری راستہ کے ذریعے فعل کرے اس پر لعنت "ملعون من أتى امرأة في دبرها"[1] اور یہ بھی فرمایا "اتقوا محاش النساء"[2] عورت کے غیر فطری راستہ میں عمل سے بچو۔

یہ وہ حدیث ہے جس پر سب کا اتفاق ہے مقداد نے بھی اس کی تصریح و تائید کی ہے نیز اس حدیث میں وجہ حرمت کی طرف بھی اشارہ ہے محشة کے لغوی معنی بیت الخلاء کے ہیں تو اس لفظ کا اشارہ یہ ہے کہ یہ جگہ بھی بیت الخلاء کی طرح گندی نجس ناپاک اور قابل احتراز ہے اسی طرح آپ ﷺ کا یہ قول بھی ہے:

"إن هذه الحشوش محتضرة"[3] حشوش یعنی بیت الخلا بچنے کی چیزیں ہیں۔

فنی تشریح سے ناواقف بعض لوگوں کے دل میں یہ بات کھٹک سکتی ہے کہ پیشاب بھی تو ناپاک و نجس ہے اس کے راستہ کو حلال کیوں کیا گیا تو سطور ذیل سے ان کی تشفی ہو سکتی ہے فن تشریح میں یہ بات طے شدہ ہے کہ عورت کی جائے مخصوص بناوٹ کے لحاظ سے تین سوراخوں پر مشتمل ہے اوپر کا سراخ وہ ہے جس کا سلسلہ مثانہ تک پہنچتا ہے اور اسی سوراخ سے پیشاب خارج ہوتا ہے اسی کے ساتھ دوسرا باریک سوراخ ہو رہا ہے جو آنتوں سے ملا ہوا ہے جس سے کبھی کبھی ہوا خارج ہوتی ہے اور ان دونوں سے نیچے تیسرا کشادہ سوراخ ہے جنسی فعل اسی میں ہوتا ہے یہ رحیم سے ملا ہوا ہوتا ہے بچہ اور حیض و نفاس کا خون اسی سے نکلتا ہے اور یہ راستہ اسی وقت نجس و ناپاک ہوتا ہے جب حیض کا خون جاری رہتا ہے اور اسی زمانہ میں جنسی فعل بھی حرام ہے اس کے علاوہ یہ راستہ ایسا نجس نہیں رہتا کہ جنسی فعل جس وجہ سے نہ انجام دیا جا سکے بخلاف پاخانہ کے مقام کے کہ اس کا راستہ ایسی آنتوں سے ملا ہوا ہے جو ہر وقت گندگی و بول و براز سے بھری رہتی ہیں اس لیے یہ راستہ جنسی فعل کے لیے دائماً ممنوع ہے۔

1۔ مسند الامام احمد بن حنبل، 16/ 157، ط: مؤسسة الرسالة

2۔ عن جابر بن عبد الله الأنصاري قال: «إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: استحيوا فإن الله لا يستحي من الحق، لا يحل إتيان النساء في حشوشهن». سنن الدارقطني: 3/ 288، رقم 160؛ الطحاوي، شرح معاني الآثار: 3/ 45؛ قال المنذري: «ورواته ثقات». الترغيب والترهيب: 3/ 199. وحسنه في صحيح الجامع برقم 934.

3۔ مسند ابی داؤد الطیالسی، 2/ 62، رقم: 714، ط دار هجر مصر

متعہ دوریہ جائز ہے

یہ متعہ دوریہ کو بھی جائز کہتے ہیں، ہمارے ملک اور زمانہ کے اثنا عشری گو اس کے جواز کا انکار کرتے ہیں مگر ان کے محققین اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں اس کے جواز کا ثبوت موجود ہے،[1] اس متعہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک پوری جماعت کسی ایک عورت سے متعہ کر لیتی ہے اور ان میں سے ایک شخص اپنی باری مقرر کر لیتا ہے اور اپنی باری میں اس سے جنسی فعل کرتا ہے،[2] حالانکہ کسی بھی مذہب میں ایک رحم میں دو نطفوں کا جمع کرنا درست قرار نہیں دیا گیا بلکہ آدمی کو حیوانات سے جدا اور ممیز کرنے والی چیز دراصل نسب کی حفاظت ہی ہے اسی لئے نسب کی حفاظت کو بھی ان پنچ ضروری اور اہم تحقیقات میں شامل کیا گیا ہے جن کی حفاظت کا حکم ہر ملت و مذہب نے دیا ہے جو یہ ہیں، (1) حفاظت نفس (جان) (2) حفاظت دین (۳) حفاظت عقل (4) حفاظت نسب (5) حفاظت مال، یہی وجہ ہے کہ ہر شریعت میں، قصاص، جہاد، حدود قائم کرنے، نشہ آور اشیاء کو حرام ٹھہرانے زناکاری کا انسداد کرنے، متعہ، چوری اور غصب، ان کے متعلق بڑے سخت اور تاکیدی احکام ہیں، ان سب کا تعلق تحفظات خمسہ بالا سے ہے وہ بالکل کھلا اور صاف ہے، اور متعہ کی صورت میں تحفظ نسب کی اہمیت اور ضرورت کا صاف انکار ہوتا ہے، پھر حیا، عفت، غیرت، عزت اور ناموس جو تمام ملتوں اور مذہبوں میں پسندیدہ اوصاف مانے جاتے ہیں سب کا جنازہ نکل جاتا ہے، اور بری اور ناپسندیدہ باتوں کو پنپنے کا موقعہ مل جاتا ہے اور اگر کوئی ہوش مند متعہ کی گہرائی میں جھانکے تو اسے وہ تمام مفاسد اور برائیاں نظر آجائیں گی جو اس عقد فاسد کی تہہ میں پوشیدہ ہیں اور جو سب کی سب شرع کے خلاف اور حکم الٰہی کی ضد ہیں، مثلاً:

1۔ روى المفيد عن الصادق أنه قال: «ما من رجل تمتع ثم اغتسل إلا خلق الله من كل قطرة تقطر منه سبعين ملكا يستغفرون له إلى يوم القيامة ويلعنون متجنبيها إلى أن تقوم الساعة». المتعة: ص 9؛ خلاصة الإيجاز: ص 43؛ وأخرجها العاملي في (باب استحباب المتعة) وسائل الشيعة: 21/ 61.

قال العاملي: «المتعة لا تنحصر في عدد أو نصاب وإنما تصح بالكتابية». اللمعة الدمشقية: 5/ 284 – 285.

2۔ وهناك نوع آخر أخبث من هذا يسمى عندهم بالمتعة الدورية وهي أن يحوز جماعة امرأة فيتمتع بها۔ (الغدير، 3/ 306، ط: دار الكتاب العربي بيروت لبنان)

الف: یہ فعل اولاد کو ضائع بلکہ ہلاک کرنے کا ذریعہ بنتا ہے کیونکہ جب کوئی شخص، محلہ، محلہ، یا بستی بستی اور ملک ملک متعہ کرتا پھرے گا تو ظاہر ہے اول تو اسے پتہ نہ چلے گا کہ اس کے نطفہ کے گل بوئے، کہاں کہاں کھلے، پتہ چل بھی جائے تو سب کو اپنے زیر تربیت رکھ کر ان کی حفاظت کیسے کرے گا، اور ان کو یہ کیسے یقین ہو گا کہ وہ اس کی اولاد ہے، لا محالہ ایسے بچے آوارہ گردوں کی طرح پلے بڑھیں گے اور اس کے لئے ان کی غور و پرداخت کے لئے ان تک پہنچنا نا ممکن ہو گا ایسے حالات میں ان کے ضیاع اور ہلاکت میں کیا شبہ رہا، اور اگر وہ بچہ لڑکی ہوئی تو اور بھی رسوائی کا باعث ہو گا، ان کے لئے ہم قوم اور ہم نسل اور ہم کفو شوہر ملنا تصور میں بھی نہیں آسکتا۔

ب: متعہ کی صورت میں باپ یا بیٹے کی ممتوعہ سے ہمبستری کا واقعہ خارج از امکان نہیں بلکہ خطرہ تو اس بات کا بھی ہے کہ بیٹی، پوتی، نواسی، بہن، بھانجی، اس راستہ میں نہ ٹکرا جائیں جو سب کی سب محرمات میں سے ہیں اور ایسا ہونا ناممکنات میں سے نہیں خصوصاً ایک طویل مدت گزرنے کے بعد، اس لئے کہ ایک آدھ ماہ تک تو حمل قرار پا جانے کا پتہ ہی نہیں چلتا اور پھر اگر متعہ دوران سفر ہو، اور سفر بھی طویل ہو، ہر منزل پر ایک متعہ ہو، اور ہر متعہ میں نطفہ قرار پائے اور ان سے لڑکیاں پیدا ہوں اور دس، پندرہ، بیس سال بعد یہی شخص یا اس کا بیٹا یا بھائی انہیں منزلوں میں سفر پر نکلیں، تو ہو سکتا ہے محرمات میں سے کسی سے مڈبھیڑ ہو جائے، اور وہ متعہ یا نکاح کر لے۔

ج: جس نے بہت سے متعہ کیے ہوں گے اس کے میراث کی تقسیم ناقابل عمل ہو گی کیونکہ یہی پتہ نہ ہو گا کہ کون کون وارث ہیں اور وہ کہاں کہاں ہے اور جب تک یہ معلوم نہ ہو گا وارث کا معاملہ نفاذ سے رکا رہے گا۔

د: اسی طرح متعہ سے پیدا ہونے والی اولاد کی میراث بھی تقسیم نہیں ہو سکے گی کہ اس کو معلوم نہیں کہ اس کے باپ یا بھائی کون کون کہاں کہاں ہیں اور جب تک تمام ورثاء کی تعداد کا پتہ نہ لگے میراث کیسے تقسیم ہو سکتی ہے اسی طرح ان ورثاء کی جنس کا حال ہے کہ کون ہو رہا تھا کون مرد اور کون میراث کے سلسلے میں ایک دوسرے کا حاجب ہے یا ایک دوسرے کو کون محروم کرتا ہے یہ ساری تفصیلات جب تک معلوم نہ ہوں گی وارثوں کے حصے مقرر نہیں ہو سکتے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مت کے حلال ہونے کی صورت میں نظام شریعت خصوصاً نکاح اور میراث کے معاملات سارے درہم برہم ہو جائیں اس کی پوری تفصیل جاننے کے خواہش مند حضرات فوائد القلوب کا مطالعہ فرمائیں جو اہل سنت کے ایک محقق عالم کی تصنیف ہے۔

اور لونڈیوں یا امہات الاولاد کے حلال کر دینے میں متعہ سے بھی زیادہ خرابیاں لازم آتی ہیں اور یوں ان کے حلال کرنے سے پوری نوع انسانی میں عظیم فساد برپا ہو جاتا ہے اور اسی فساد کی پیش بندی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب محکم میں جماع حلال کے صرف دو طریقے مقرر فرمائے ایک علی الاعلان بموجودگی گواہان نکاح صحیح دوسرے ملک یمین کی شکل یعنی شرعی طریقہ سے مملوکہ لونڈی کے ان دونوں طریقوں اور عقدوں سے عورت کا کسی مرد سے خصوصی تعلق فرشتہ قائم ہو جاتا ہے اور اس کی نگرانی اور حفاظت میں ہوتی ہے اولاد اور وارثوں کے مناسب دیکھ بھال حفاظت و نگہداشت عمل میں آتی ہے چنانچہ اسی مضمون کو تاکید کے ساتھ دو صورتوں میں ذکر فرمایا یعنی سورہ مومنون اور سورہ معارج میں ارشاد ہے "إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ"(1) اور دونوں جگہ ان آیات کے آخر میں ٹکڑا بھی جوڑا ہے " فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ"

اور ظاہر بات ہے کہ ممتوعہ عورت نہ تو بیوی ہے ورنہ اس کے لیے لوازم زوجیت میراث طلاق عدت نان و نفقہ سب واجب ہوتے اور نہ ہی ایسی عورت ملک یمین میں داخل ہے ورنہ خرید و فروخت، ہبہ اور اطاق کے احکام اس پر لاگو ہوتے اور اس کا اقرار تو خود شیعہ کرتے ہیں کہ متعہ کی صورت میں مابین عورت و مرد زوجیت کے تعلقات و احکامات متحقق نہیں ابن بابویہ کی کتاب اعتقادات میں واضح طور پر یہ لکھا موجود ہے کہ:

"ہمارے نزدیک عورت کے حلال ہونے کے صرف چار اسباب ہیں نکاح، ملک یمین، متعہ، تحلیل"(2)

اور اللہ تعالیٰ نے بھی یہ ارشاد فرمایا ہے کہ:

اگر تم کو یہ ڈر ہو کہ کئی بیویوں میں انصاف نہ کر سکو گے تو صرف ایک بیوی پر اکتفا کرو یا اپنی خواہشات ان لونڈیوں سے پوری کرو جو تمہاری ملک ہیں۔(3)

1۔ سورۃ المومنون، الآیۃ:6، سورۃ المعارج، الآیۃ:30

2۔ قال ابن بابویہ في مکان آخر: «اعلم أن وجوه النكاح الذي أمر بها الله عز وجل أربعة أوجه: نكاح الميراث ... نكاح المتعة ... ملك اليمين ... نكاح التحليل». فقه الرضا: ص 232، 233.

3۔ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ۔ (سورة النساء، الآية:3)

قاعدہ ہے کہ بیان صریح کے مقام پر سکوت ہو تو وہ حصر کے لیے ہوتا ہے یہاں یہ مقام چاہتا تھا کہ ان تمام صورتوں کا ذکر ہو جاتا جس میں عدل وانصاف واجب نہیں مگر سکوت بتاتا ہے کہ حلال صورتیں بس دو ہی ہیں اور عدل کا تعلق صرف نکاح ہی بیویوں سے ہے اگر حصر مقصود نہ ہوتا تو متعہ اور تحلیل کا بیان سب سے پہلے ہوتا کیونکہ نکاح اور ملک یمین میں تو کچھ نہ کچھ حقوق قائم و واجب ہوتے ہیں جن کے ترک سے ظلم متصور ہے بخلاف متعہ کے کہ اس میں تو اجرت مقررہ کے کچھ اور واجب ہی نہیں ہوتا رہا تحلیل[1] تو وہ حلوہ بے دودھ ہے اس میں زیادہ سے زیادہ حلال کرنے والے کا احسان مند ہونا پڑتا ہے اس کے سوا واجب کچھ ہوتا ہی نہیں اللہ تعالی نے فرمایا:

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّى يُغْنِيَهُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهِ[2]

اور جو نکاح کی استطاعت نہیں رکھتے انہیں چاہیے کہ وہ پاک دامن رہیں تا آنکہ اللہ تعالی اپنے فضل سے انہیں صاحب استطاعت کر دے۔

اگر متعہ اور تحلیل جائز ہوتے تو اللہ تعالی عفت و پاک دامنی کا حکم کیوں دیتا یہ حکم تو اسی لیے دیا کہ وہ حلال راستوں کی استطاعت نہیں رکھتے تھے اور صرف وہی راستے تھے جن کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا یہ بھی اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا أَنْ يَنْكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِنْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ - إلى قوله - ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنكُمْ وَأَنْ تَصْبِرُوا خَيْرٌ لَكُمْ[3]

اور جس میں یہ استطاعت نہ ہو کہ وہ پاک دامن مومن عورت سے شادی کر سکے تو اپنی مملوکہ لونڈی سے نکاح کرے اور یہ ایسے شخص کے لیے ہے کہ جو (زنا میں مبتلا ہونے کا) ڈر رکھتا ہو اور

1۔ نكاح التحليل عند الإمامية: «هو أن يحل الرجل أو المرأة فرج الجارية مدة معلومة، فإن كانت لرجل فعليه قبل تحليلها أن يستبرئها بعد أن تنقضي أيام التحليل، وإن كانت لامرأة استغنى عن ذلك». فقه الرضا: ص 233.

2۔ سورة النور، الآية:33

3۔ سورة النساء، الآية:25

اگر صبر کر سکو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔

اگر متعہ اور تحلیل جائز ہوتے تو لونڈیوں کے نکاح میں ڈر خوف اور صبر کی ضرورت ہی کیا تھی[1] اور یہ جو کہتے ہیں کہ آیت "فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً"[2] پس تم نے ان سے جو فائدہ اٹھایا ہے تو اب ان کو ان کا مہر بطور فرض کے ادا کرو، متعہ کے بارے میں نازل ہوئی،[3] غلط ہے اس کی روایت بحوالہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یا دوسرے صحابہ سے کرنا کھلم کھلا جھوٹ اور افتراء ہے گو کہ بعض غیر معتبر تفاسیر اہل سنت میں یہ روایت نقل کی گئی ہے[4] مگر چونکہ یہ بات نظم قرآن کے خلاف ہے اور جو تفسیر بھی نظم قرآن کے خلاف ہو وہ اگرچہ صحابی سے مروی ہونے اور قبول کرنے کے لائق نہیں کیونکہ اللہ تعالی نے اول محرمات کا بیان " حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ "تمہاری مائیں تم پر حرام کی گئیں، سے "إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ "تک کیا، پھر فرمایا" وَأُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَلِكُمْ "ان محرمات کے سوا تمہارے لیے حلال کی گئی، مگر ان شرائط کے ساتھ کہ "أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ "مہر و نان نفقہ میں اپنے مال خرچ کرو، اور ان شرطوں کی وجہ سے تحلیل فروج یا مانگے میں دینا دونوں صورتیں غلط اور باطل ہو گئیں اس لیے کہ یہ تو مفت کا سودا ہے نہ ہلدی لگے نہ پھٹکڑی، پھر آگے فرمایا "مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ "ان کو اپنے لیے مخصوص کر لو دوسرے سے ربط ضبط پیدا نہ کر لیں اس کی نگہداشت رکھو، یہ نہیں کہ شہوت رانی کا تقاضہ پورا کرنا اور کڑوا پانی نکالنا مقصود ہو تو اس شرط سے متعہ بھی باطل ہوا کیونکہ متعہ میں احتیاط و اختصاص قطعا منظور نہیں ہوتا کیونکہ متعہ والی عورت تو کسی ایک کی ہو کر رہتی ہی نہیں آج اس کی بغل میں تو کل کسی دوسرے کی پھر نکاح کے ہونے پر بنا

1۔ أخرج الكليني عن أبي بصير قال: «سألت أبا جعفر عليه السلام عن المتعة فقال: نزلت في القرآن». الكافي: 5/ 448؛ وينظر أبواب المتعة في وسائل الشيعة: 21/ 5 وما بعدها.

2۔ سورة النساء، الآية: 24

3۔ روى ذلك الكليني، الكافي: 5/ 448؛ الطوسي، تهذيب الأحكام: 7/ 250؛ تفسير العياشي: 1/ 233.

4۔ ينظر ما قاله القرطبي في الجامع لأحكام القرآن: 5/ 130؛ وابن كثير في التفسير: 1/ 475.

رکھتے ہوئے فرماتے ہیں "فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ"[1] یعنی جب تم نے نکاح میں مہر ادا کیا اور لطف صحبت بھی اٹھالیا تو اب تم پر پورا مہر لازم آگیا اگر صحبت نہ ہوتی تو نصف مہر لازم ہوتا۔

اب اس نظم قرآنی کے خلاف اس آیت کو پہلی عبارت سے کاٹ دینا اور ابتدائے کلام اور محمول کرنا باعتبار عربیت قطعاً و صریحاً غلط و باطل ہے حرف فا قطع اور ابتداء کلام سے معنی ہوتی ہے وہ تو پچھلے کلام اگلے کلام سے ربط قائم کرنے کے لیے لائی جاتی ہے یہ ایک روایت کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس آیت میں "منھن" کے بعد "الی اجل مسمی" کا اضافہ کر کے پڑھتے تھے، تو اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس روایت کی صحت میں ہی کلام ہے کسی معتبر کتاب میں اس کا سراغ نہیں ملتا،[2] اگر روایت ثابت بھی ہو تو یہ قرأت منسوخہ ہوگی اور احکام کے ثبوت میں قرأت منسوخہ کام نہیں دیتی کیونکہ منسوخ ہونے کے بعد نہ وہ قرآن رہی نہ حدیث خاص کر اس صورت میں جب کہ اس کے صریح مخالف دوسری آیات موجود ہوں اور اگر سب باتوں کو نظر انداز کر کے مان لیں تو بھی یہ روایت متعہ پر دلالت نہیں کرتی اس لیے کہ "الی اجل مسمی "استمتاع سے متعلق ہے عقد سے نہیں، اور متعہ میں مدت کا تعین نفس عقد سے ہوتا ہے استمتاع کے ساتھ نہیں تو گویا پھر معنی یوں ہوں گے پس اگر اپنی منکوحہ عورتوں سے ایک مدت معین تک لطف اندوز ہو لیں تو تمام مہر ادا کریں اس عہد کے بڑھانے کا اس وقت یہ مطلب ہو گا کہ کوئی یہ خیال نہ کر بیٹھے کہ جب نکاح کی تمام مدت گزر جائے گی جب مہر واجب ہو گا جبکہ رواج اور عرف میں یہ مشہور ہے کہ ایک تہائی مہر معجل رکھتے ہیں اور تہائی کو موجل بقاعدہ کہ تاخیر عورت کے تصرف واختیار سے حاصل ہوتی ہے ورنہ شریعت کے لحاظ سے تو ایک مرتبہ کی صحبت کے بعد عورت کو مہر کا مطالبہ کرنے کا حق ہے اگر "الی اجل مسمی "کی قید کو عقد سے متعلق مانیں گے تو اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ شیعوں کے نزدیک متعہ مدت العمر تک درست نہ ہو حالانکہ یہ شیعوں کے اجماع سے درست ہے۔

1۔ سورة النساء، الآية: 23، 24

2۔ قال الطبري: «وأما ما روي عن أبي بن كعب وابن عباس من قراءتها: (فما استمتعتم به منهن إلى أجل مسمى)، فقراءة بخلاف ما جاءت به مصاحف المسلمين، وغير جائز لأحد أن يلحق في كتاب الله تعالى شيئا لم يأت الخبر القاطع». تفسير الطبري: 5/ 13.

اور آیت "وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا" کا سیاق بھی نکاح ہی ہے یعنی اگر اتنی مالی استطاعت نہ رکھتے ہوں کہ ازاد عورتوں کا مہر اور نان ونفقہ برداشت کر سکیں تو اپنی ہم مذہب لونڈی سے نکاح کر لیں اب مسلسل و مربوط کلام کو بیچ سے کاٹ کر درمیانی عبارت کو متعہ پر محمول کرنا تو کلام اللہ کی کھلی تحریف ہے اور اگر آیت کے سیاق پر غور کیا جائے تو اس سے متعہ کی حرمت صاف معلوم ہو جائے گی اس لیے کہ ایت میں لونڈی کے نکاح میں اکتفا کی ہے اگر اگلے کلام میں متعہ کو حلال کرنا ہوتا تو پھر " وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا" کیوں فرمایا جاتا کیونکہ آزاد عورتوں کے نکاح پر قدرت نہ رکھنے کی صورت میں متعہ کی وجہ سے جنسی خواہش پورا کر لینے میں رکاوٹ ہی کیا تھی بلکہ وہ تو ہر نئی چیز نئی لذت دیتی ہے کے مصداق یہ سورت تو بہتر اور خوب تر تھی پھر لونڈیوں سے نکاح کو اس قید واپس پابندی کے ساتھ حلال کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ پانچ مذکورہ بالا آیات قرآنی متعہ کی حرمت پر صاف اور واضح دلالت کرتی ہیں اور ایک آیت جسے شیعہ اپنے خیال وگمان کے مطابق متعہ کے حلال ہونے کی دلیل بناتے ہیں سطور بالا میں اس کی حالت بھی واضح ہو گئی کہ در حقیقت معاملہ الٹا ہے، پھر ایک بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اس معاملہ میں شیعوں کا رخ استدلال ہے جبکہ مخالف کا انکار اور منکر کے لیے احتمال بشک ہی کافی ہے اس کے لیے ضروری نہیں کہ اس کا خیال ظاہر اور سمجھ میں آنے والا بھی ہو گا، رہا استدلال تو اگر اسے احتمال وشک کی ہوا بھی لگ جائے تو اسے نام معتبر اور باطل کر دیتی ہے چہ جائے کہ وہ قوی اور غالب سمجھا جائے۔

پندرہ مرتبہ پے درپے پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے

رضاع کے معاملہ میں ان کے ہاں یہ مسئلہ ہے کہ بچہ پندرہ مرتبہ پے درپے بلا فاصلہ دودھ پیے [1] تو حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے پے درپے نہ ہو تو حرمت ثابت نہیں، [2] حالانکہ شریعت میں ابتداء دس مرتبہ

1۔ روى الطوسي عن عمر بن يزيد قال: «سمعت أبا عبد الله يقول: خمسة عشر رضعة لا تحرم». تهذيب الأحكام: 7/ 314.

2۔ نقل الطوسي عن المفيد قوله: «الذي يحرم من الرضاع عشر رضعات متواليات لا يفصل بينهن برضاع امرأة أخرى». ثم روى عن الصادق أنه قال: «لا يحرم من الرضاع إلا ما أنبت اللحم وشد العظم». تهذيب الأحكام: 7/ 312.

کا جو حکم تھا وہ بھی اجماع امت سے منسوخ ہو گیا،[1] پانچ کی مزید تعداد اور پے در پے کی قید تو سرے سے تھی ہی نہیں یہ اسی فرقہ کا گھڑا ہوا اضافہ ہے اور منسوخ شدہ حکم کو باقی رکھنا اپنی طرف سے شریعت بنانا ہے اور حکم الٰہی کی مخالفت ہے حالانکہ یہ خود ہی اپنے ائمہ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ:

"مدت رضاع میں مطلقاً دودھ پینا حرمت کا سبب ہے خواہ دس مرتبہ ہو خواہ اس سے کم"[2]

جبکہ یہ احتیاط کا مقام ہے اس لیے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ احتیاطاً زیادہ والی سورت پر عمل کرنا چاہیے حرمت نکاح کا معاملہ ہے بارات ذمہ یقینی طور پر ثابت ہونی چاہیے چنانچہ ان کے شیخ مقداد نے کنز العرفان میں کفارہ کی بحث کے تحت اس بات کی تصریح کی ہے کہ اس صورت میں زیادہ احتیاط والی جانب پر عمل کرنا واجب ہے۔[3]

طلاق عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں دینے سے واقع نہیں ہوتی

ایک مسئلہ ان کے ہاں یہ ہے کہ طلاق عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں دینے سے واقع نہیں ہوتی[4] یہ ایسا ظاہر البطلان مسئلہ ہے کہ محتاج بحث ہی نہیں لیکن عجیب تر بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے "انت مطلقة" تجھ کو طلاق دی گئی ہے یا "انت طالق" تجھے طلاق ہے تو بھی ان کے نزدیک طلاق نہیں ہوتی جب تک "طلقتک" میں نے تجھ کو طلاق دی نہ کہے حالانکہ شریعت نے ان دونوں صیغوں کو بھی طلاق

---

1 ـ روى مسلم: «كان فيما أنزل من القرآن عشر رضعات معلومات يحرمن ثم نسخن بخمس معلومات» وللتفاصيل الفقهية ينظر ابن حزم، المحلى: 10/ 13؛ ابن قدامة، المغني: 8/ 138؛ الكاساني، بدائع الصنائع: 4/ 7.

2 ـ في رواية أخرجها الكليني عن صفوان بن يحيى قال: «سألت أبا الحسن عليه السلام عن الرضاع ما يحرم منه فقال: سأل رجل أبي عليه السلام عنه فقال: واحدة ليس بها بأس وثنتان حتى بلغ خمس رضعات، قلت: متواليات أو مصة بعد مصة؟ فقال: هكذا قال له». الكافي: 5/ 439؛ وسائل الشيعة: 20/ 381.

3 ـ وحرموا ما لم يحرمه الله، فعندهم لا يحل للبالغ أن يتزوج من (القابلة) التي أشرفت على ولادته أو الزواج من ابنتها، حالها كحال الأم من الرضاعة، كما في رواية نسبها ابن بابويه إلى الصادق، من لا يحضره الفقيه: 3/ 410.

4 ـ قرر ذلك ابن إدريس في السرائر: 2/ 278؛ وقال (المحقق) الحلي: «ولا يقع الطلاق بالكناية ولا بغير العربية مع القدرة على التلفظ باللفظة المخصوصة ولا بالإشارة إلا مع العجز عن النطق». شرائع الإسلام: 3/ 17.

شمار کیا ہے اس میں شاید یہ شبہ نکالیں کہ یہ دونوں صیغے وضع اصلی کے لحاظ سے اخبار کے لیے ہیں تو طلقتک بھی ایسا ہی ہے بلکہ ان معاملات میں انشائی صیغے کسی ترکیب میں وضع ہی نہیں ہوتے ہر جگہ یہی اخباری الفاظ کام میں آتے ہیں مثلاً انت حر یا انت عتیق تو آزاد ہے اور پھر یہ خود بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایک شخص دوسرے سے پوچھے "هل طلقت فلانة" کہ تو نے فلاں کو طلاق دی اور وہ جواب میں نعم ہاں کہے تو ایسی صورت میں طلاق واقع ہو جاتی ہے حالانکہ یہاں تو صاف طور پر اخبار ہوا ہے انشاء نہیں ورنہ استفہام کے جواب میں یہ کیسے استعمال ہوتا کیونکہ انشاء سے استفہام کا جواب نہیں ہوتا۔

بغیر گواہوں کے طلاق واقع نہیں ہوتی

یہ کہتے ہیں کہ گواہوں کی موجودگی کے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی جس طرح نکاح نہیں ہوتا[1] حالانکہ شریعت نے بوقت طلاق گواہوں کی موجودگی کو لازم اور ضروری قرار نہیں دیا چنانچہ حضور اکرم ﷺ کے عہد مبارک سے لے کر ائمہ کے ضمانت تک پوری امت کا اسی پر عمل رہا کہ بروقت طلاق کبھی گواہوں کی تلاش نہ کی گئی اور ان کی موجودگی کو ضروری نہیں سمجھا گیا البتہ طلاق رجعی اور مطلق طلاق کے وقت دو گواہوں کی موجودگی کو مستحب سمجھا گیا اور وہ بھی رفع نزاع کی خاطر کہ اس کا موقع نہ اس لیے نہیں کہ ہے نکاح کی طرح دو گواہوں کے بغیر طلاق اور رجعت صحیح نہ ہو اور نکاح و طلاق میں جو فرق ہے وہ بالکل ظاہر ہے نکاح میں اعلان اس لیے ضروری ہے کہ زنا سے امتیاز پیدا ہو اور کسی کو شک کی گنجائش نہ رہے۔

اور اعلان کی کم سے کم حد دو گواہ مقرر کی گئی وخلاف طلاق کے کہ اس میں نہ کسی چیز سے تمیز دینے کی ضرورت ہے نہ اس میں کسی قسم کی تہمت کا خدشہ اس لیے اعلان کی بھی ضرورت نہیں ترک صحبت و جماع ہی کو تو طلاق کہتے ہیں اس میں تہمت کی کون سی بات ہے پس طلاق کا معاملہ بھی خرید و فروخت اجارہ اور دوسرے معاملات کا سا ہے اگر بنظر احتیاط کے کوئی فریق معاملہ سے مکر نہ جائے گواہ کر لیں تو کوئی حرج بھی نہیں کہ کل

1۔ قال ابن بابويه: «باب الطلاق اعلم أن الطلاق لا يقع إلا على طهر من غير جماع بشاهدين عدلين في مجلس واحد بكلمة واحدة، ولا يجوز أن يشهد على الطلاق في مجلس رجل، ويشهد بعد ذلك الثاني». المقنع: ص 113.

کلاں مقدمہ وغیرہ کی نوبت آجائے تو گواہ گواہی دے سکیں اور عدالت میں عقد و معاملہ کا اس بات ہو سکے ورنہ بطور شرط ضروری نہیں۔

شوہر کی موجودگی میں کنایات سے طلاق نہیں ہوتی

اگر شوہر موجود ہو تو ان کے ہاں کنایات سے طلاق واقع نہیں ہوتی،[1] شوہر کی حاضری وعدم حاضری کی قید سراسر خلاف شرع ہے کیونکہ شرع میں شوہر کی حاضری وعدم حاضری کا تعلق طلاق نہ ہونے میں ہرگز نہیں کیا گیا یہ فرق پیدا کر کے اپنی طرف سے انہوں نے نئی شرع بنائی ہے۔

مقطوع الذکر کی مطلقہ کی عدت نہیں ہوتی

مقطوع الذکر موجود الخصیتین شخص نے اگر کسی عورت سے شادی کر لی اور خلوت صحیحہ کے بعد اس کو طلاق دے دی تو ان کے ہاں ایسی مطلقہ کی عدت نہیں ہے، حالانکہ یہ خود اس شخص سے ثبوت نسب کے قائل ہیں کہ اگر اس عورت کے کوئی بچہ ہو جائے تو ان کے نزدیک وہ مقطوع الذکر کا ہوگا،[2] جبکہ نطفہ قرار پانے کا احتمال ثابت ہو گیا تو اس صورت میں عدت کیوں واجب نہیں ہوگی؟ کیونکہ عدت تو ہے ہی نطفہ قرار پانے کی معلومات کے لیے۔

اور طبی قواعد سے ایسے شخص سے نطفہ قرار پانے کا امکان ثابت اور صحیح ہے اس وجہ سے کہ محل منی تو خصیتین ہیں اور وہ صحیح وسالم ہے اس لیے باہمی رگڑ سے اخراج منی کا احتمال ہے اور ہو سکتا ہے کہ رگڑ کے وقت منی مرد کے سوراخ سے نکل کر عورت کے رحم کے منہ میں پہنچ جائے اور وہ اسے جذب کرے اور اسی سے بچہ پیدا ہو جائے، بخلاف اس صورت کے اگر خصیتین کٹے ہوئے ہوں تو تولید منی کا امکان ہی نہیں گو عضو مخصوص صحیح وسالم ہو۔

بغرض اذیت جماع ترک کرنے سے ظہار نہیں ہوتا

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو اذیت دینے اور ضرر پہنچانے کی غرض سے جنسی فعل ترک کر دے تو ظہار ان

1۔ قال الطوسي: «إذا كتب بطلاق زوجته ولم يقصد بذلك الطلاق لا يقع بلا خلاف، وإن قصد به الطلاق عندنا أنه لا يقع به شيء». الخلاف: 2/ 449

2۔ ويلحق ولد الخصي أو المجبوب ،شرائع الإسلام 3/ 651

کے نزدیک نہیں ہوتا،[1] حالانکہ شارع کا مقصد تو ظہار کا کفارہ واجب کرنے سے یہی ہے کہ رسائی کا دروازہ بند کیا جائے لہذا ضرر پہنچانے کے وقت بھی کچھ واجب نہ ہو تو شارح کے مقصود کے خلاف لازم آتا ہے اور پھر ایسا سمجھنا نص کتاب اللہ احادیث رسول اللہ ﷺ اور آثار ائمہ سے بھی ٹکراتا ہے کیونکہ ان میں ایسی کوئی قید نہیں اور یہ ساری روایات ان کی اپنی کتابوں میں موجود ہیں۔[2]

کفارہ ظہار میں 18 روزے کافی ہیں

یہ کہتے ہیں کہ ظہار کرنے والا اگر کفارہ کی ادائیگی سے قاصر ہو اور 18 روزے رکھ لے تو اس کے لیے کافی ہے[3] اس مسئلے کا کوئی تعلق نہ اللہ کی کتاب سے ہے نہ ہی شرع میں اس کی کوئی اصل و بنیاد ہے بلکہ نص قرآنی تو اس کے خلاف ہے اس لیے ظاہر ہے یہ تو خود دین گھڑنا ہے۔

لعان کے لئے بیوی مدخول بہا ہونی ضروری ہے

یہ لعان (زنا کی تہمت لگانا) میں یہ شرط لگاتے ہیں کہ بیوی مدخول بہا ہو،[4] حالانکہ زنا کی تہمت میں جو

1۔ قال المرتضى: «ومما انفردت به الإمامية القول: بأن الظهار لا يثبت حكمه إلا مع القصد والبينة». الانتصار: ص 141؛ العاملي، اللمعة الدمشقية: 5/ 299.

2۔ روى العاملي عن الصادق أن رجلا سأله عن: «رجل قال لامرأته أنت علي كظهر أمي أو كيدها أو كبطنها أو كفرجها أو كنفسها أو ككعبها أيكون ذلك الظهار وهل يلزمه ما يلزم المظاهر؟ قال: المظاهر إذا ظاهر من امرأته فقال: هي علي كظهر أمه أو كيدها أو كرجلها أو كشعرها أو كشيء منها ينوي بذلك التحريم فقد لزمه في كل قليل منها». وسائل الشيعة: 22/ 316.

3۔ وهذا عندهم في كل كفارة فيها صيام شهرين متتالين أو إطعام ستين مسكينا، ككفارة الجماع في نهار رمضان وكفارة القتل الخطأ. أخرج الكليني في الكافي: 4/ 385؛ والطوسي في تهذيب الأحكام: 4/ 205؛ وابن بابويه، من لا يحضره الفقيه: 2/ 332. وقال ابن بابويه: «ومتى عجز عن إطعام ستين مسكينا صام ثمانية عشر يوما». من لا يحضره الفقيه: 3/ 527.

4۔ قال الطوسي: «ولا يكون اللعان بين الرجل وامرأته إلا بعد الدخول بها، فإن قذفها قبل الدخول بها كان عليه الحد وهي امرأته لا يفرق بينهما». النهاية: ص 251.

عار و شرمندگی مدخول بہا کو ہوتی ہے غیر مدخول بہا کو اتنی نہیں ہوتی اور لعان ہوتا ہی اس تہمت کی شرمندگی دور کرنے کے لیے ہے علاوہ عظیم یہ بات قرآنی نص کے بھی خلاف ہے قرآن مجید میں ہے:

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنْفُسُهُمْ[1]

جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگاتے ہیں اور سوائے اپنے آپ کے اور کوئی گواہ نہیں۔

تو اس میں تو مدخول بہا کی کوئی قید نہیں، اس فرقہ کے ایسے ہی الٹے پلٹے اور واہی تباہی مسائل واحکام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جب اور جہاں مقاصد شریعت کو سمجھنے اور اس کی گہرائی تک پہنچنے سے قاصر رہے تو از خود اپنی عقل ناقص و نارسا سے غلط سلط مسائل تراش لئے۔

لفظ عتق سے آزادی نہیں ہوتی

کہتے ہیں کہ لفظ عتق سے بھی عتق واقع نہیں ہوتا،[2] (عتق یعنی غلام کا آزاد کرنا) اس حکم کو مضحکہ خیز کے علاوہ کیا کہا جائے۔

فک رقبہ سے بھی غلام آزاد نہیں ہوتا

اسی طرح یہ بھی کہتے ہیں کہ فک رقبہ سے بھی غلام آزاد نہیں ہوتا،[3] حالانکہ قرآن مجید میں چند جگہ فک رقبہ سے عتق کو تعبیر کیا گیا ہے گویا اس کی حقیقت شرعی بھی یہی قرار پاتی ہے، ارشاد ربانی ہے:

فَكُّ رَقَبَةٍ ، أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ[4]

غلام آزاد کرنا، یا بھوک کے دن میں کھانا کھلانا۔

1۔ سورة النور،الاية: 6

2۔ قال الطوسي: «العتق لا يقع إلا بقوله (أنت حر) مع القصد والنية، ولا يقع العتق بشيء من الكنايات ..». الخلاف: 3/ 15.

3۔ صرح به (العلامة) الحلي في (إرشاد الأذهان)، الينابيع الفقهية: 32/ 388.

4۔ سورة البلد،الاية: 13، 14

آزادی صرف اثنا عشریہ کی صحیح ہے

کہتے ہیں لونڈی غلام اگر اثنا عشری نہ ہوں تو ان کا عتق صحیح نہیں،[1] کتاب وسنت میں تو اس کی کوئی اصل نہیں اور آئمہ کی روایات ماسبق کی رو سے بھی یہ غلط ہے کیونکہ ان کی رو سے اہل سنت کا ایمان بھی صحیح ہے اور نجات کی بشارت دینے والا بھی، اب کوئی وجہ اگر ہو سکتی ہے تو ان کا تعصب اور بغض ہی ہو سکتا ہے۔

غلام مجذوم یا اندھا ہو جائے تو خود بخود آزاد ہو جاتا ہے

ایک مسئلہ یہ ہے کہ غلام اگر جزام کی بیماری میں مبتلا ہو جائے یا اندھا، یا اپاہج ہو جائے تو وہ خود بخود آزاد ہو جاتا ہے، مالک کے آزاد کرنے کی ضرورت نہیں رہتی،[2] حالانکہ یہ قاعدہ شرعیہ کے خلاف ہے، شریعت میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ ناقص یا عیب دار مال مالک کی اجازت وارادہ کے بغیر اس کی ملک سے نکل جائے، پھر یہ مقاصد شریعت کے بھی خلاف ہے کیونکہ اعتاق غلام کے نفع کی خاطر ہوتا ہے، اور صورت بالا میں تو اس کی آزادی اس کی بربادی اور ہلاکت کے مترادف ہو گی، اس لئے کہ ان جسمانی عوارض کی وجہ سے تو وہ کسب معاش اور تلاش روزگار کے قابل نہیں رہا اور کھانا کپڑا جو مالک کے ذمہ تھا اب اس کے ذمہ آپڑا، اب ایسی حالت میں وہ بیچارہ کہاں جائے اور کیا کرے گا اگر یہ کہا جائے کہ اس کا نفع یہ ہے کہ وہ خدمت سے چھوٹ گیا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی معذوری اور لاچاری کی حالت میں مالک کو خدمت لینے کا حق ہی کہاں پہنچتا ہے، روٹی کپڑا تو اس کی ملک کا معاوضہ ہے یہ خدمت کا بدلہ نہیں ہے، بہت سے لونڈی غلام دائمی امراض یا کسی اور عارضہ کی بنا پر خدمت سے تھک بھی تو جاتے ہیں ہاں یہ حکم نوکر ومزدور پر تو لاگو ہو سکتا ہے کہ جب تک وہ خدمت انجام نہ دے اس کو مزدوری اور تنخواہ نہیں دیتے جب کام سے رہ جاتا ہے موقوف کر دیتے ہیں تو یہ حکم غلام پر چسپاں نہیں ہوتا۔

1۔ قال (العلامة) الحلي في (إرشاد الأذهان): «ويكره عتق المخالف» أي الذي يخالف مذهب الإمامية. الينابيع الفقهية: 32/ 389.

2۔ أخرج الطوسي عن السكوني عن جعفر عن أبيه عن علي رضي الله عنه أنه قال: «العبد الأعمى والأجذم والمعتوه لا يجوز في الكفارات؛ لأن رسول الله صلى الله عليه وسلم أعتقهم». تهذيب الأحكام: 8/ 324؛ العاملي، وسائل الشيعة: 22/ 397.

لونڈی فقط آقا کا نطفہ گر جانے سے ام ولد ہو جاتی ہے

کہتے ہیں کہ لونڈی کے پیٹ سے آقا کا نطفہ گر جائے تو وہ ام ولد ہو جاتی ہے،[1] یہ عجیب مسئلہ ہے کیونکہ اس صورت میں تو ہر لونڈی جس کے ساتھ ہمبستری کی گئی ہو ام ولد بن جائے گی، کیونکہ جو عورتیں حمل اور بچہ کی تولید نہ چاہیں وہ صحبت کے بعد نطفہ گرا دیتی ہیں۔

اور یہ بات تجربہ کی ہے کہ رحم میں تو بقدر تولید ہی نطفہ رہتا ہے باقی گر جاتا ہے، یہ اتنا نہیں جانتے کہ نطفہ کا نکلنا اگر دلیل بن سکتا ہے اس بات کی کہ نطفہ نے رحم میں قرار نہیں پکڑا اور جب نطفہ ہی رحم میں نہیں ٹھہرا تو وہ لونڈی ام ولد کیسے ہو گئی، اس کا ام ولد ہونا تو رحم میں نطفہ کے قرار پکڑنے پر ہے، ورنہ صرف قرار پکڑنے پر بلکہ اس کی پوری خلقت پر اگر کسی کے پاس کسی چیز کا کوئی جز ہے تو نہیں کہہ سکتے کہ اس کے پاس پوری چیز ہے۔

مرتہن کے جماع سے بچہ ہو جائے تو لونڈی اس کی ام ولد ہو گی

یہ مسئلہ بھی ان کے ہاں ملتا ہے کہ اگر کسی نے کسی کے پاس اپنی لونڈی گروی رکھ دی اور اس نے اس کے ساتھ جنسی فعل کیا اور اس کے ہاں لڑکا پیدا ہو گیا تو وہ لونڈی مرتہن کی ام ولد ہو گئی،[2] حالانکہ مرتہن کا فعل تو صاف زنا تھا کہ اسے نہ حق ملکیت حاصل تھا نہ حق تحلیل اور تحلیل کا حق ہو تب بھی یہ حق اسے ام ولد نہیں بناتا جسے یہ فرقہ بھی تسلیم کرتا ہے۔[3]

بیوی کی شوہر کی اجازت کے بغیر منعقد نہیں ہوتی

یہ کہتے ہیں کہ ایسے فعل پر جو نہ واجب ہو اور نہ اس سے کوئی فعل قبیح ترک کرنا منظور ہو بیٹے کی قسم باپ

1۔ قال الراوندي: «أم الولد: هي التي تلد من مولاها سواء ما وضعته تاما أو غير تام وإن سقطت نطفة». فقه القرآن: 2/ 213.

2۔ قرر ذلك الطوسي في (المبسوط). الينابيع الفقهية: 32/ 366.

3۔ الينابيع الفقهية: 37/ 61.

کی اجازت کے بغیر اور بیوی کی شوہر کی اجازت کے بغیر منعقد نہیں ہوتی،[1] یہ مسئلہ بھی قرآنی احکام کے صریح خلاف ہے، کہ ان آیات میں اس قید کا کوئی ذکر نہیں مثلاً: وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُمُ الْأَيْمَانَ[2] لیکن وہ تمہاری پکی قسموں پر مواخذہ کرے گا۔

ہاں تورات میں یہ ذکر ہے کہ بیوی کی نذر خاوند کی اجازت کے بغیر اور چھوٹے بچے کی نذر بغیر باپ کی اجازت کے منعقد نہیں ہوتی، اس حکم کے متعلق یہ بھی پتہ نہیں کہ تحریف شدہ ہے یا غیر تحریف شدہ! اگر اصلی بھی ہو تو بالغ و نابالغ کے یمین، نذر و نیاز میں بہت بڑا فرق ہے، لیکن جب قرآن مجید پچھلی آسمانی کتابوں کا ناسخ ہے تو قرآن کے خلاف توریت سے دلیل لانا یہودیت کے سوا اور کیا ہے! اس فرقہ کے نزدیک تو عورت کی نفل نذر بھی شوہر کی اجازت کے ساتھ مشروط ہے جو اطلاق قرآن کے مخالف ہے قرآن مجید میں "وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ"[3] اپنی نذریں پوری کریں، اور "يُوفُونَ بِالنَّذْرِ"[4] اپنی نذریں پوری کرتے ہیں، فرمایا ہے اور اس میں کوئی کہیں قید و شرط نہیں۔

پیدل حج کی نذر مانی تو یہ نذر ساقط ہو جاتی ہے

ایک مسئلہ یہ ہے کہ پاپیادہ حج کی نذر مانی تو یہ نذر ساقط ہو جاتی ہے،[5] حالانکہ ان کی یہ بات بھی نص قرآنی کے خلاف ہے۔

1۔ قال الحلي: «ولا تنعقد يمين ولد مع والده إلا مع إذنه ولا المرأة مع زوجها إلا بإذنه ولا المملوك مع مولاه إلا بإذنه وذلك فيما عدا الواجب وترك القبيح، أما فيما ..... فينعقد دون إذنهم». الينابيع الفقهية: 16/ 24. وينظر أيضا كلام قريب من هذا عند ابن بابويه، المقنع: ص 137؛ الكيدري، إصباح الشيعة: ص 482.

2۔ سورة المائدة ،الاية:89

3۔ سورة الحج ،الاية:29

4۔ سورة الدهر ،الاية:07

5۔ صرح بذلك في كتابه الخلاف: 3/ 303، ونقله عنه منهم الكيدري في إصباح الشيعة: ص 484.

نذر فقط دل کے ارادے سے لازم ہو جاتی

نذر کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ وہ دل کے ارادے سے لازم ہو جاتی ہے چاہے منذر کے الفاظ ظاہر و پوشیدہ زبان سے ادا نہ کئے جائیں اس کا نام انہوں نے نذر ضمیر رکھا ہے،[1] حالانکہ شریعت میں وہ امور جو اقوال سے تعلق رکھتے ہوں دلی ارادہ سے لازم نہیں ہوتے، مثلاً یمین، نکاح، طلاق، عتق، رجعت، بیع، اجارہ، ہبہ اور صدقہ وغیرہ وغیرہ، اس سلسلہ میں متفق علیہ صحیح حدیث بھی موجود ہے:

إن الله تجاوز لي عن أمتي ما وسوست به صدورها، ما لم تعمل أو تكلم[2]

بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کے ان وسوسوں سے در گزر فرمائی جو ان کے سینوں میں کھٹکتے رہتے ہیں تا آنکہ وہ ان پر عمل نہ کرلیں یا زبان پر نہ لے آئیں۔

حدود میں قاضی کا حکم نافذ نہیں ہوتا

یہ مسئلہ بھی ان کے ہاں ہے کہ حدود میں قاضی کا حکم نافذ نہیں ہوتا،[3] اس کے نفاذ کے لئے وہ امام معصوم ہونا چاہیے، لہذا امام کی غیر موجودگی میں یا امام کا تسلط نہ ہونے کی صورت میں جیسا کہ اکثر اوقات یا پورا زمانہ ایسا ہی گزرا کسی امام کا تسلط قائم نہ ہو سکا، حدود کا ناقابل نفاذ رہ جانا لازم آیا اور اگر امام معصوم ہو بھی تو وہ سر من رائے، کربلائے معلی اور نجف اشرف میں ہو گا، فیض آباد اور بنگالہ میں کون حدود قائم کرے گا، اور اگر کوئی ان کا نائب ہو جو ان کی تقرری اور اجازت سے حدود جاری کر سکے تو پھر اللہ تعالیٰ کی بلا واسطہ اجازت میں

---

1 ۔ بعموم قوله عليه السلام: إنما الأعمال بالنيات، إنما لكل امرئ ما نوى ، وإذا انتفى العمل عند انتفاء النية، وجب أن يتحقق عند تحققها. ولأن المناط في العبادات اللفظية الاعتقاد وهو هنا حاصل، واللفظي إنما هو لإعلام الغير ما في الضمير والله تعالى عالم بسرائر القلوب، فيتحقق عقد النذر بعقد الضمير عليه وإن لم يوجد لفظ، ولقوله تعالى (وإن تبدوا ما في أنفسكم أو تخفوه يحاسبكم به الله) .(المهذب البارع في شرح المختصر النافع، للعلامة جمال الدين أبي العباس أحمد بن محمد بن فهد الحلي، 4/ 137، ط: مؤسسة النشر الإسلامي قم)

2 ۔ صحيح البخاري، باب الخطإ والنسيان في العتاقة والطلاق ونحوه، ولا عتاقة إلا لوجه الله،3/ 145 رقم: 2528

3 ۔ العاملي، اللمعة الدمشقية: 3/ 62.

آخر کون سی بات ہے یا کون سی کمی رہ گئی ہے کہ حدود کا نفاذ نہ ہو سکے ارشاد ہے "فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً"[1] ان کو اسی کوڑے مارو، یا" الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ"[2] کہ زانی مرد و عورت میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ یا فرمایا" وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا"[3] چور مرد ہو یا عورت ہر ایک کے ہاتھ کاٹ ڈالو، اور شریعت کے دیگر تمام عبادات، معاملات، اور کفارات میں جب امام کی موجودگی ضروری نہیں تو حدود کے نفاذ میں ان کی حضوری کیوں لازمی قرار دی جاتی ہے کیونکہ یہ حدود بھی مکان شہر و ملک کے حق میں عبادات ہی ہیں اور حد زدہ شخص کے حق میں کفارات انہیں امام کی موجودگی سے وابستہ کیوں کیا جائے! اور عبادت و کفارہ سے کیوں محروم رکھا جائے۔

قاضی پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے

یہ قاضی کے لئے پڑھا لکھا ہونے کی شرط بھی لگاتے ہیں،[4] حالانکہ قرآن و سنت میں ان کی یہ زائد کردہ شرط پر کوئی دلیل نہیں بلکہ اس کے خلاف پر دلیل ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ بلاشبہ فیصلہ صادر فرمانے اور اسے نافذ کرنے کا منصب بھی رکھتے تھے، اور اس سلسلہ میں کوئی خامی، کوئی کمی آپ ﷺ میں نہ تھی اس دلیل سے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللهُ[5]

اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف کتاب حق اس لئے نازل فرمائی تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کی دکھائی ہوئی روشنی میں فیصلہ فرمائیں۔

1۔ سورة النور ،الاية:4

2۔ سورة النور ،الاية:2

3۔ سورة المائدة ،الاية:38

4۔ كما في اللمعة الدمشقية: 2/ 417؛ الدروس الشرعية: 2/ 65.

5۔ سورة المائدة ،الاية:38

حالانکہ امی تھے علم کتاب نہیں سیکھا تھا جیسا کہ قرآن شاہد ہے:

وَمَا كُنتَ تَتْلُو مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ [1] آپ نے اس کتاب قرآن مجید سے پہلے کوئی کتاب پڑھی تھی نہ آپ نے داہنے ہاتھ میں کبھی قلم پکڑا تھا۔

پھر ضامنی نامے، قاضی کے مہری خطوط وغیرہ دکھانا پڑھنا دراصل قضا کے منشیوں کا کام ہے [2]۔ قاضی خود یہ کام نہ کر سکے تو اس کی قضا میں کون سا فرق آتا ہے، علاوہ ازیں ان کے محدثین نے خود اپنے ائمہ سے ایسی روایات بیان کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ علم کتابت قضا میں ضروری نہیں ہے۔

مردہ بیٹی کی امانت کا دعویٰ مسموع ہو گا

ان کی کتاب الدعویٰ میں بڑے انوکھے اور عجیب مسائل ملتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ جو عورت جسکی لڑکی مر چکی ہو عدالت میں یہ دعویٰ دائر کرے کہ میں نے اپنی لڑکی کے پاس فلاں فلاں سامان، خادم وغیرہ بطور امانت سپرد کئے تھے تو ان کے نزدیک یہ دعویٰ بلا گواہ و ثبوت قابل قبول ہے، ابن بابویہ نے تو اس پر نص کی ہے، حالانکہ یہ بات قواعد شرع کے صاف خلاف ہے، اس لئے کہ بلا گواہ کوئی دعویٰ قابل سماعت نہیں:

لَوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ [2]

وہ اپنے دعویٰ کے چار گواہ کیوں نہیں لائے پس جب یہ گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں۔

شریعت کا مقصد گواہوں سے اقوال و حقوق کا تحفظ ہے اور اس صورت میں یہ مقصد ہاتھ سے جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر کسی دشمن نے کسی پر زنا کی تہمت لگائی، اور گواہ پیش نہ کر سکا تو کہتے ہیں کہ اسے قسم لے کر چھوڑ دینا چاہیئے، اس پر قذف کی حد نہ لگانی چاہیئے ان کے شیخ مقتول نے اپنی کتاب مبسوط میں نص بیان کی ہے۔[3] حالانکہ شرع نے حدود میں قسم کا کوئی اعتبار نہیں کیا اور مدعی حد زنا پر گواہ پیش نہ کر سکنے صورت میں حد قذف

1۔ سورة العنكبوت ،الاية:48

2۔ سورة النور ،الاية:13

3۔ هو عند الطوسي في كتابه المبسوط، نقلا عن الينابيع الفقهية: 33/ 212.

رکھنا واجب قرار دیا ہے، قرآن میں اس پر حکم موجود ہے اور اس صورت میں تو دشمنی اور دروغ گوئی پر وزنی دلیل ہے تو اس سے چشم پوشی کیسے کی جاسکتی ہے اور اس سے حسن ظن کس طرح قائم ہو سکتا ہے؟

دس سالہ لڑکے کی قصاص میں شہادت معتبر ہے

کتاب الشھادات میں بھی اسی طرح کے عجائب غرائب جمع کیے ہوئے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ دس سالہ نابالغ لڑکے کی شہادت قصاص سے متعلق معتبر ہے،[1] حالانکہ نابالغ بچہ کسی مقدمہ میں بھی شہادت کا اہل نہیں، چہ جائیکہ قصاص کا معاملہ جس میں ایک جان کے ضائع ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے کسی بچہ کی شہادت کیسے قبول ہو سکتی ہے قرآن مجید کہتا ہے:

"وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ"[2] اپنے مردوں میں سے دو کی گواہی طلب کرو۔

کتاب الصید والذبائح کے چند مسائل

کتاب الصید والذبائح میں قرآنی حکم کی مخالفت کرتے ہوئے اہل کتاب کے شکار کو حرام کہتے ہیں،[3] اور اہل سنت کے ذبیحہ کو بھی مردار کہتے ہیں،[4] اور ذبح کے وقت اگر قبلہ رو نہ ہوں تو اس ذبیحہ کو بھی حرام کہتے ہیں،[5] ان امور پر ان کے پاس کوئی شرعی دلیل نہیں نصوص کا عموم ان کی اس زائد شرط کی تردید کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

1۔ حكموا بجواز شهادة الغلام إذا بلغ العشر سنين، ينظر: الكافي: 7/ 377؛ تهذيب الأحكام: 6/ 251.

2۔ سورة البقرة ،الاية:282

3۔ أخرج الكليني عن إسماعيل بن جابر قال: «قلت لأبي عبد الله عليه السلام: ما تقول في طعام أهل الكتاب؟ فقال: لا تأكله». الكافي: 6/ 264.

4۔ قال المفيد: «ولا تأكل من ليس على دينك في الإسلام». المقنعة: ص 571. ويعني بالدين من لا يعتقد مذهب الإمامية. وقال ابن حمزة: «وذبيحة الكافر والناصب حرام». الوسيلة: ص 361. ويقصد بالناصب أهل السنة.

5۔ أخرج الكليني عن محمد بن مسلم قال: «سألت أبا جعفر عليه السلام عن رجل ذبح ذبيحته فجهل أن يوجهها إلى القبلة؟ قال: كل منها، فقلت: فإنه لم يوجهها؟ قال: لا تأكل منها ... وقال عليه السلام: إذا أردت أن تذبح فاستقبل القبلة». الكافي: 6/ 233؛ الطوسي، تهذيب الأحكام: 9/ 59.

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ[1]

جو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو، اسکو کھاؤ اگر اس کی آیات پر تمہارا ایمان ہو!۔

غیر رواجی آلات سے شکار ناجائز ہے

کہتے ہیں کہ اگر غیر رواجی آلات سے کوئی شکار کرے تو وہ شکار اس کی ملکیت میں نہیں آتا،[2] حالانکہ اس میں رواجی اور بغیر رواجی ہونے کا کوئی فرق نہیں ہے۔

کتاب الاطعمہ کے بعض مسائل

کتاب الاطعمہ بھی عجائب کا مجموعہ ہے مردار جانور کے دودھ اور بچہ دانی کو حلال کہتے ہیں،[3] اس گیہوں کی روٹی کو حلال جانتے ہیں جس کا آٹا نجس پانی سے گوندھا گیا ہو، اور وہ نجس پانی اس آٹے میں استعمال کیا ہو کہ آٹا پتلا ہو گیا ہو اور آٹے کے تمام اجزاء میں پانی کے سب اجزاء سرایت کر گئے ہوں، چنانچہ حلی نے کتاب تذکرہ میں اسی طرح لکھا ہے۔[4]

---

1 ـ سورة الانعام ،الاية:118

2 ـ إصباح الشيعة للكيدري: ص 378.

3 ـ أخرج ابن بابويه عن زرارة عن أبي عبد الله قال: «سألته عن الأنفحة تخرج من الجدي الميت؟ قال: لا بأس به، قلت: اللبن يكون في ضرع الشاه وقد ماتت، قال: لا بأس به، قلت: والصوف والشعر وعظام الفيل والبيض يخرج من الدجاجة؟ فقال: كل هذا لا بأس به». من لا يحضره الفقيه: 3/ 342؛ الطوسي، تهذيب التهذيب: 9/ 76. مع أن الراويات عندهم عن الأئمة تعارض ذلك، حيث أخرج الطوسي عن علي رضي الله عنه أنه: «سئل عن شاة ماتت فحلب منها لبن؟ فقال عليه السلام: ذلك حرام». تهذيب الأحكام: 9/ 76؛ الاستبصار: 4/ 89. لكن حملها الطوسي على التقية لأنها توافق مذاهب العامة!

4 ـ قال الطوسي في النهاية: «فإن استعمل شيء من هذه المياه النجسة في عجين يعجن به ويخبز لم يكن به بأس بأكل ذلك الخبز لأن النار قد طهرته». الينابيع الفقهية: 1/ 197.

اسی طرح وہ کھانا جس میں مرغی کی بیٹھ گر کر گھل مل گئی ہو،[1] یا وہ شوربہ، فالودہ شربت، جس کو عورت یا مرد کے استنجے کے پانی سے تیار کیا گیا ہو یا ان میں مرغی کی کچھ بیٹ پڑ گئی ہو، یہ سب چیزیں ان کے نزدیک پاک وطیب اور کھانے کے قابل ہیں، اسی طرح اس کر میں (یہ ایک بڑا پیانہ ہے جس میں بارہ وسق وزن آجاتا ہے) جس میں بے شمار آدمیوں نے استنجا کیا ہو حیض ونفاس کا خون بھی کہیں پڑا ہوا ہو، مذی، وردی، مرغی کی بیٹھ بھی اس میں پڑی ہو اور سب گھل مل کر یک جان ہو چکے ہوں، کتے کا پیشاب بھی اس میں پڑ گیا ہو، اگر ایسے پانی سے جوس، فالودہ، تیار کریں اور اس سے روزہ افطار کریں تو یہ حلال وطیب ہے،[2] اور اگر اس کو صرف افطار کے وقت پئیں یا اس کا شربت بنائیں تو بھی جائز وحلال ہے۔

اگر تین پاؤ کے قریب آش (پتلا حریرہ وغیرہ) پکائیں اور پاؤ بھر دم مسفوح بہنے والا خون ڈال دیں یا اس میں گھوڑے گدھے کا پیشاب پڑ جائے تو بھی حلال ہے، حالانکہ قرآنی احکام میں یہ سب چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں، چنانچہ ارشاد ہے:

وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ[3]

اور حرام کرتا ہے ان پر گندی ونجس چیزیں۔

بھوکے کے لئے کھانا چھین کر کھانا جائز ہے

ایک شخص بھوکا ہے دوسرے آدمی کے پاس کھانا ہے مگر وہ معمول کی قیمت سے زیادہ قیمت طلب کرتا ہے اور بھوکے کے پاس بوجہ امیر ومال دار ہونے کے اتنی دولت ہے کہ وہ یہ مہنگا کھانا بآسانی خرید سکتا ہے پھر بھی

1۔ روى الطوسي عن الزبير قال: «سألت أبا عبد الله عليه السلام عن البئر تقع فيه الفأرة أو غيرها من الدواب فتموت، فيعجن من مائها أيؤكل ذلك الخبز؟ قال: إذا أصابته النار فلا بأس به». تهذيب الأحكام: 1/ 413؛ من لا يحضره الفقيه: 1/ 14.

2۔ لأن النار عندهم تطهر هذه النجاسات، قال الطوسي: «والنار تطهر كلما يكون في القدر من اللحم والتوابل والمرق إذا كانت تغلي، ووقع فيها مقدار أوقية دم أو أقل». النهاية: ص 587.

3۔ سورة الاعراف، الاية: 157

اگر وہ زبردستی اس سے چھین کر وہ کھانا کھالے تو اس کے لئے جائز ہے، اور حلال بھی![1]

مسائل فرائض (میراث)

مسائل فرائض (میراث) میں ان کے ہاں یہ مسئلہ ہے پوتے کی موجودگی میں یا دوسری اولاد ہونے کی صورت میں دادا کا کوئی حصہ نہیں ہے، یہ مسئلہ ان اخبار و روایات کے خلاف ہے جو ان کی اپنی کتابوں میں موجود ہیں،[2] چنانچہ سعد بن خلف نے اپنی صحیح میں جناب ابی حسن کاظم علیہ السلام سے روایت کی ہے وہ کہتا ہے:

سالته عن بنات الابن والجد قال للجد الثلث والباقي لبنات الابن[3]

میں نے آپ سے دادا اور پوتیوں کے بارہ میں پوچھا تو آپ نے کہا ایک تہائی حصہ دادا کا ہے اور باقی پوتیوں کو ملے گا۔

دیت میں ماں شریک بھائی بہن کو حصہ نہیں ملے گا

مقتول کی دیت میں سے ماں کی طرف سے جو بھائی بہن ہو ان کو حصہ نہیں دیتے۔[4]

بیوی کو زمین سے میراث کا حصہ نہیں ملتا

اور بیوی کو زمین یا زمین کی قیمت میں سے بھی حقدار نہیں سمجھتے،[5] لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ قاتل کو

---

1 ـ شرائع الإسلام، للحلي: 4/ 45.

2 ـ اعترف الطوسي بأن هذا خلاف التنزيل فقال: «وذكر أصحابنا أن ولد الوالد مع الأبوين لا يأخذ شيئا، وذلك خطأ لأنه خلاف لظاهر التنزيل والمتواتر من الأخبار». النهاية: ص 359؛ وينظر ما قاله العاملي في وسائل الشيعة: 26/ 111.

3 ـ روي الصدوق بلفظ اخر: عن أبي الحسن موسى عليه السلام قال: سألته عن بنات الابنة وجد، فقال: للجد السدس، والباقي لبنات الابنة (من لا يحضره الفقيه، 4/ 281، ط: منشورات جماعة المدرسين في الحوزة العلمية قم المقدسة)

4 ـ قال المفيد: «ولا يعطى الإخوة والأخوات من قبل الأم شيئا، وكذلك الأخوال والخالات، ولا يورثون من الدية شيئا». المقنعة: ص 701؛ وينظر العاملي، اللمعة الدمشقية: 8/ 37.

5 ـ نسب الكليني وغيره إلى الباقر أنه قال: «لا ترث النساء من عقار الأرض شيئا». الكافي: 7/ 128. وأخرج ابن بابويه رواية قريبة عن الصادق، من لا يحضره الفقيه: 4/ 347؛ والطوسي، تهذيب الأحكام: 9/ 299.

مقتول کے ترکہ اور اس کی دیت سے وراثت کا حصہ دیتے ہیں خواہ اس نے غلطی اور شبہ میں بڑکرات قتل کیا ہو،[1] حالانکہ " القاتل لا یورث "[2] قاتل کو ورثہ نہیں ملتا، حکم عام ہے اسی طرح آیات قرآنی سے بیوی اور بھائی بہنوں کو ورثہ ملنے کا بھی حکم عام ہے زمین اور دیت کی تخصیص اس میں کہاں سے ثابت؟ میت کے ترکہ میں قرآن، تلوار، انگوٹھی اور اس کی پوشاک، بغیر کسی حق اور معاوضہ کے بڑے بیٹے کے لئے مخصوص کرتے ہیں،[3] اور اس میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں سمجھتے حالانکہ یہ بھی قرآنی حکم کے خلاف ہے، اور اس بیٹے کی میراث سے باپ کو محروم کرتے ہیں جس نے ایک میراث یا قصور سے بادشاہ قاضی یا کوتوال کے روبرو فارغ خطی دیدی ہو، یا در حقیقت یہ شرع کا حکم نہیں بلکہ قانون توراہ چنگیز خانی ہے، اور بعض چچاؤں، چچازادوں اور دادیوں کو مطلقا میراث سے محروم رکھتے ہیں۔[4]

وصایا کے مسائل میں مظروف کو ظرف کے تابع کرتے ہیں

اور وصایا کے مسائل میں مظروف کو ظرف کے تابع کرتے ہیں مثلاً ایک شخص نے وصیت کی میرا فلاں صندوق فلاں شخص کو دیا جائے تو اگر اس صندوق میں کچھ مال واسباب نقد وزیورات وغیرہ رکھے ہوئے ہیں تو ان کے نزدیک وہ سب اشیاء وصیت میں داخل ہوں گی۔[5]

---

1 ـ وقال المفيد :قاتل العمد لا يرث المقتول إذا كان يشبيه ويرثه إذا قتله خطأ. (مختلف الشيعة ،لابن مطهر الحلي،9/ 64، ط: مؤسسة النشر الإسلامي قم)

2 ـ عن هشام بن سالم، عن أبي عبد الله قال: قال رسول الله (صلى الله عليه وآله) :لا ميراث للقاتل .(وسائل الشيعة إلى تحصيل مسائل الشريعة، باب ان القاتل ظلما لا يرث المقتول، 26/ 30 ، ط: مؤسسة آل البيت عليهم السلام لإحياء التراث)

3 ـ أخرج الكليني وغيره عن حريز عن الصادق أنه قال: «إذا هلك الرجل فترك بنين فللأكبر السيف والدرع والخاتم والمصحف، فإن حدث به حدث فللأكبر منهم». الكافي: 7/ 85؛ تهذيب الأحكام: 9/ 275؛ الاستبصار: 4/ 144 .

4 ـ ينظر الوسيلة لابن حمزة: ص 392.

5 ـ يشير الألوسي إلى ما نسبه الكليني إلى الرضا أن رجلا سأله: «عن رجل أوصى لرجل بصندوق، وكان فيه مال؟ فقال الورثة: إنما لك الصندوق وليس لك المال، فقال أبو الحسن عليه السلام: الصندوق بما فيه». الكافي: 7/ 44؛ الطوسي، تهذيب الأحكام: 9/ 211 . قال: «ولو أوصى بصندوق أو سفينة أو جراب دخل في المظروف». الينابيع الفقهية: 34/ 122 .

تحلیل فرج فقط دو سال ہے

لونڈی کی شرمگاہ کی تحلیل سال دو سال کے لئے جائز بتاتے ہیں ہیں۔ [1]

مجنون اور پاگل پر حدود کا اجراء ہو گا

مجنون اور پاگل پر حدود کا اجراء ان کے ہاں واجب ہے جب کہ اس نے عاقل عورت سے زنا کیا ہو، [2] حالانکہ اس کے خلاف متفق علیہ صحیح حدیث موجود ہے "رفع القلم عن ثلاثة: عن المجنون حتى يفيق" [3] تین افراد سے قلم اٹھالیا گیا وہ غیر مکلف ہیں مجنون و پاگل سے جب تک کہ وہ اچھا نہ ہو جائے۔

عورت کا عورت سے رگڑ کرنا موجب رجم ہے

اس عورت پر بھی رجم واجب کہتے ہیں جو اپنے شوہر سے ہمبستری کے بعد کسی باکرہ عورت سے رگڑ کرے جس سے وہ حاملہ ہو جائے اور اس باکرہ کنواری عورت کو سو کوڑے لگائے جائیں، [4] حالانکہ رگڑ کو کسی نے بھی زنا میں شمار نہیں کیا اور نہ شرع میں وہ زنا سمجھا گیا ہے۔

---

1 ـ قال الراوندي: «اعلم أن الإماء يستباح وطؤهن بإحدى ثلاثة أشياء: العقد عليهن بإذن أهلهن وبتحليل مالكهن الرجل من وطئهن وإباحة ذلك له، وإن لم يكن هناك عقد وبأن يملكهن فيستبيح وطأهن بملك الأيمان». فقه القرآن: 2/ 126.

2 ـ روى الكليني عن أبان بن تغلب قال: «قال أبو عبد الله عليه السلام: إذا زنى المجنون أو المعتوه جلد، وإن كان محصنا رجم». الكافي: 7/ 192؛ الطوسي، تهذيب الأحكام: 10/ 19.

3 ـ أخرجه أحمد والنسائي وابن خزيمة والحاكم. وهو في صحيح الجامع برقم 3512. وأخرجه الإمامية عن علي رضي الله عنه في كتبهم المعتبرة، فأخرجه المفيد في الإرشاد: 1/ 194؛ ابن أبي الحديد، شرح نهج البلاغة: 12/ 205؛ المجلسي، بحار الأنوار: 5/ 303؛ العاملي، وسائل الشيعة: 28/ 23.

4 ـ روى الطوسي أن الحسن بن علي بن أبي طالب سأل عن: «امرأة جامعها زوجها، فقامت بحرارة جماعه فساحقت جارية بكرا، فألقت عليها النطفة فحملت، فقال - عليه السلام -: في العاجل تؤخذ هذه المرأة بصداق

کافرہ کی اولاد کو ابن الزانیہ کہنے سے قذف واجب ہے

اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے کو ابن زانیہ کہہ کر پکارے گو اس کی ماں کافرہ ہو تو اس پر حد قذف کو واجب کہتے ہیں،[1] حالانکہ قرآنی حکم میں حد قذف محصنات کے معاملہ کے ساتھ مخصوص ہے، اور کافر عورت محصنہ نہیں ہوتی اس کے مسلمان بیٹے کی حرمت تعزیر کا سبب حد کے معاملہ کے ساتھ ہے، مگر حد جاری کرنے کا سبب نہیں بنے گا۔

اندھے سے قصاص نہیں لیا جائے گا

اگر کوئی نابینا مسلمان کسی کو بے خطا بے قصور قتل کر دے تو ان کے نزدیک اس نابینا سے قصاص نہیں لیا جائے گا،[2] حالانکہ قصاص کی آیت بینا و نابینا سب کو شامل ہے۔

بھوکے کے لئے قتل جائز ہے

ایک آدمی بھوکا ہے، دوسرے مسلمان کے پاس کھانا ہے، مگر وہ اس بھوکے کو نہیں دیتا، تو ان کے نزدیک اس بھوکے کو حق ہے کہ کھانا رکھنے والے مسلمان کو قتل کر کے اس سے کھانا لے لے اور کھا جائے، اس فعل کی وجہ سے نہ اس پر قصاص واجب ہے نہ دیت، حالانکہ دنیا کی کسی شریعت میں بھی کھانا نہ دینا قتل کے جواز کی وجہ نہیں ہے!

هذه البكر لأن الولد لا يخرج حتى يذهب بعذره، وينتظر حتى تلد ويقام عليها الحد ويلحق الولد بصاحب النطفة، وترجم المرأة صاحبة الزوج». تهذيب الأحكام: 7/ 422. وينظر للتفصيل ابن فهد، المهذب: 5/ 61.

1ـ قال الطوسي: «إن قال لمسلم: أمك زانية أو يا ابن الزانية، وكانت أمه كافرة أو أمة كان عليه الحد تاما». النهاية: ص 784؛ العاملي، اللمعة الدمشقية: 9/ 167.

2ـ أخرجه الطوسي وغيره عن محمد الحلبي قال: «سألت أبا عبد الله عليه السلام عن رجل ضرب رأس رجل بمعول فسالت عيناه على خديه، فوثب المضروب على ضاربه فقتله؟ فقال أبو عبد الله: هذان متعديان جميعا فلا أرى على الذي قتل الرجل قودا لأنه قتله وهو أعمى، والأعمى جنايته خطأ». تهذيب الأحكام: 10/ 233؛ العاملي، وسائل الشيعة: 29/ 399.

ذمی قاتل کا مال اور اولاد مقتول کے ورثاء کا ہوگا

اگر کوئی ذمی کسی مسلمان کو قتل کردے تو ان کے نزدیک اس ذمی کا تمام مال واسباب مسلمان مقتول کے وارثوں کو دے دیا جائے، رہی ذمی کی ذات تو مقتول کے وارثوں کو یہ اختیار ہے کہ چاہے اسے غلام بنائیں چاہے قتل کریں،[1] ان کا یہ مسئلہ بھی شرع کے خلاف ہے، کیونکہ شریعت میں صرف قصاص کا حکم ہے نہ اس کا مال لینا جائز ہے نہ اسکو غلام بنانا، اسی سلسلہ میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی ولی کی چھوٹی اولاد کو مقتول کے ورثاء اپنا لونڈی، غلام بنالیں گے حالانکہ یہ قرآنی آیت "وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ"[2] کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا، کے سراسر خلاف ہے۔

حاصل تحریر یہ کہ دینی احکام ومسائل میں بہت سے مسئلے ان کے دماغی اختراع اور من گھڑت ہیں، نمونہ کے طور پر صفحات گذشتہ میں جو تحریر کیا گیا وہ اس مدعا کے ثبوت کے لئے کافی ہے! صاحب فہم وشعور، اور اہل عقل ودانش پر ان کے دین وایمان، اور اصول وفروع کی حقیقت پوری منکشف ہوجائے گی اور یہ بھی بخوبی ذہن نشین ہوجائے گا کہ ان اصول کو جو سراسر دروغ اور فروع بے فروغ کی نسبت آئمہ کرام کی طرف کرنا اور ان جلیل القدر ہادیان شرع ودین کا مذہب بتانا، چوٹی کے جھوٹ اور اعلیٰ درجہ کے بہتان وافتراء کے سوا کچھ نہیں، اور لطف یہ کہ ان کا یہ خود ساختہ مذہب اور روایات کے بھی مخالف ہے جو خود ان کے نزدیک ان کے راویوں کے حوالہ سے انہیں کی کتابوں میں منقول ومروی ہیں۔

1۔ قال ابن حمزة: «وإن قتل كافر حرا مسلما أو كفارا وأسلموا قبل الاقتصاص كان حكمهم حكم المسلمين، وإن لم يسلموا دفعوا برمتهم مع أولادهم وجميع ما يملكونه إلى ولي الدم إن شاء قتل واسترق الأولاد وتملك الأموال، وإن شاء استرق القاتل أيضا». الوسيلة: ص 345.

2۔ سورة الانعام ،الاية : 164

باب دہم

جواب مطاعن خلفاء راشدین و کبار صحابہ رضی اللہ عنہم

تلاش بسیار اور جستجوئے بے حد کا حاصل یہ معلوم ہوا کہ اس عالم دنیا میں کوئی ایسا نہیں جس کے حق میں بدزبانوں اور بدگویوں اور عیب چینوں نے زبان طعن وقدح درازنہ کی ہو!

دہریوں نے ذات الٰہی جل شانہ تک میں کلام کیا، انبیاء کرام علیہم السلام کی عصمت کے انکار میں معتزلہ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ختمی مرتبت نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم تک کو موضوع کلام بنایا، اور چھوٹے سے لے کر بڑے گناہ تک ان سے منسوب کیے اور مزے کی بات یہ کہ ثبوت میں قرآن واحادیث کے حوالے دیے یہودی فرقہ عصمت ملائکہ کے معاملہ میں اسی غلط روش پر چلا، نواصب وخوارج نے جناب امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ اور اہل بیت کی شان میں یہی وتیرہ رکھا اور آخر میں ابن سبا یہودی اور اس کے پیروں نے جو مختلف فرقوں اور ناموں موسوم ہوتے رہے خلفاء ثلاثہ کبار صحابہ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اعلی وارفع شان میں مطاعن کا دروازہ کھولا ہے اور اپنی ناقص وناکارہ عقل اور گمان فاسد میں حوالوں کے لیے اہل سنت کی کتابوں کو سامنے لائے لیکن دانشوروں اور عقلمندوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ یہ سب کچھ ایسا ہے جیسے چاندنی پر کتے بھونک رہے ہوں، جس سے ان عالی قدر ومنزلت اور عالم وعالمیان کے نزدیک مقدس وبزرگ اور محترم شخصیات کی عزت وقدر اور احترام میں ذرہ بھر بھی کمی نہیں آتی کسی شاعر نے کہا ہے:

وإذا أتتك مذمتي من ناقص فهي الشهادة لي بأني كامل

جب کسی کمینے سے تو میری برائی سنے تو سمجھ لے کہ وہ میرے لیے اس بات کی گواہی ہے کہ میں کامل ہوں۔

ان خلفاء کرام صحابہ عظام اور امہات المومنین رضی اللہ عنہم کی عظمت بزرگی اور بڑائی کی سب سے پہلی وجہ تو یہی ہے کہ باوجود انتہائی عناد اور پرلے درجے کا کینہ رکھنے کے باوجود یہ دریدہ دہن اب تک صرف یہی چند شبہات سامنے لاسکے جو غور وفکر کے ابتدائی مرحلہ میں ہی غبار بن کر ہوا میں اڑ جاتے ہیں، اور ان کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا حالانکہ ان بزرگوں کی عیب جوئی کے موقع کی تلاش میں انہوں نے ایڑھی چوٹی کا زور لگایا، اور مقدور سے بڑھ کر سعی وکوشش کرڈالی اور پھر ایسا شخص جو گوشہ نشین نہیں تھا ریاست عامہ کا بار اس کے کندھوں پر تھا مخلوق خدا

کے ساتھ طرح طرح اور نوع بنوع معاملات سے اس کا ربط وضبط تھا اور وہ لاکھوں کی تعداد رکھنے والی ایک امت کا والی و نگران تھا اس کا سابقہ دوستوں کے ساتھ دشمنوں سے بھی تھا وہ امن وجنگ دونوں حالتوں سے گزرا اس نے اپنی زندگی میں صرف دس بارہ کام ایسے کیے ہوں جن پر دشمنوں اور بدزبانوں نے انگشت نمائی کی ہو اور گرفت پائی ہو جبکہ دوران بحث وہ قابل غریب باتیں بھی محل تعنہ بن سکی ہوں تو کیا دنیا کے لیے اس کی عظمت کے اعتراف کے لیے اتنا کافی نہیں ہے دنیا تو اس کے گن گاتی اور اسے سراہتی ہے جو ایک گھر بستی کا مالک ہو اور زندگی بھر وہ روزانہ دو چار غلطیوں کے علاوہ اپنے سارے کام اور انتظام ٹھیک چلاتا ہو تو کیا ستم کی بات نہیں کہ اس کو قابل ستائش سمجھنے کے بجائے نشانہ طعن بنایا جائے جو اتنی بڑی ملت کی سیاست کاری اور انتظامی امور میں مشغولیت کے باوجود دس پانچ غلطیوں اور وہ بھی موہوم سے زیادہ نہ کر سکا جن پر دشمنوں نے انگلی دھری۔

مطاعن ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

طعن نمبر 1: حضرات حسنین رضی اللہ عنہما نے ممبر سے اتر جانے کا کہا

کہتے ہیں کہ ایک روز آپ خطبہ دینے ممبر پر چڑھے تو جناب حسنین رضی اللہ عنہما نے کہا اے ابو بکر رضی اللہ عنہ ہمارے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کے ممبر سے اتر جاؤ![1] ان کے قول سے معلوم ہوا کہ آپ اس کے اہل نہ تھے۔

جواب: جناب حسن رضی اللہ عنہ کی پیدائش رمضان 3ھ[2] اور جناب حسین رضی اللہ عنہ کی شعبان 4ھ[3] کی اور حضور اکرم

1۔ روي ان الحسن بن علي ع جاء الى ابي بكر وهو على منبر رسول الله ص فقال :انزل عن مقعد ابي !فقال له ابو بكر: صدقت بابي انت، مقعد ابيك لا مقعد ابي !وبعث الي علي ع، فجاء به، فقال: يا ابا الحسن، ما هذا الذي جرى؟ فقال علي ع: والله ما امرته بذلك .فقال ابو بكر: صدقت والله ما اتهمتك".(الاحتجاج على اهل اللجاج ، 1/ 119، ط: دار النعمان للطباعة والنشر)

2۔ ولد الحسن بن علي عليهما السلام في شهر رمضان في سنة بدر، سنة اثنين بعد الهجرة.وروي أنه ولد في سنة ثلاث۔ (الأصول من الكافي، باب، مولد الحسن بن علي صلوات الله عليهما، 1/ 461، ط: دار الكتب الاسلامية)

3۔ ولد الحسين بن علي عليهما السلام في سنة ثلاث۔ (الأصول من الكافي، باب، مولد الحسن بن علي صلوات الله عليهما، 1/ 463، ط: دار الكتب الاسلامية)

ﷺ کے وصال 11ھ[1] کے ابتدا میں ہوا اسی لیے عہد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں یہ حضرات بالاجماع کم سن تھے یہی چھ سات سال کے، اب یہاں دو صورتیں ہیں یا تو شیعہ ان حضرات کے اقوال و افعال کو اس کم عمری کے باوجود معتبر تسلیم کریں گے اور ان پر اپنے احکام کی بنا رکھیں گے یا صغر سنی کے سبب ان کو اہمیت نہ دیں گے اور نہ ان سے احکام نکالیں گے۔

پہلی صورت میں ترک تقیہ لازم آتا ہے جو ان کے نزدیک واجب ہے[2] اور پھر جناب رسول اللہ ﷺ کی مخالفت بھی لازم آتی ہے کہ آپ ﷺ نے چہار شنبہ سے لے کر دوشنبہ تک جناب صدیق رضی اللہ عنہ کو پنج وقتہ نمازوں میں اپنا خلیفہ بنایا اور اس اثنا میں آپ جمعہ وہ خطبہ کے فرائض بھی آپ ﷺ کی نیابت میں انجام دیتے رہے۔[3]

اسی طرح جناب امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کی مخالفت بھی لازم آئے گی کہ آپ بھی جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز ادا فرماتے رہے اور آپ کے جمعہ و خطبہ کی نیابت کو بھی تسلیم کیا[4] اور دوسری صورت میں نہ کوئی نقص لازم آتا ہے اور نہ کوئی قباحت کی بات ہے بچوں کا یہ فائدہ ہے کہ وہ اپنوں کی جگہ کسی دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ناسمجھی میں ایسی ہی بات کہتے اور کرتے ہیں تو ان کے قول و فعل سے استدلال نہیں کیا جاتا۔

1۔ مات يوم الاثنين ضحى من ربيع الأول في السنة الحادية عشرة من الهجرة-(جمع الوسائل في شرح الشمائل، باب ما جاء في وفاة رسول الله ﷺ:202/2،ط: المطبعة الشرفية، مصر، طبع على نفقة مصطفى البابي الحلبي وإخوته)

2۔ اعتقادنا في التقية أنها واجبة، من تركها كان بمنزلة من ترك الصلاة -(الاعتقادات للشيخ الصدوق، باب الاعتقاد في التقية، ص :107، ط: دار المفيد طباعة)

3۔ عن أبي موسى، قال: مرض النبي صلى الله عليه وسلم، فاشتد مرضه، فقال: «مروا أبا بكر فليصل بالناس» قالت عائشة: إنه رجل رقيق، إذا قام مقامك لم يستطع أن يصلي بالناس، قال: «مروا أبا بكر فليصل بالناس» فعادت، فقال: «مري أبا بكر فليصل بالناس، فإنكن صواحب يوسف» فأتاه الرسول، فصلى بالناس في حياة النبي صلى الله عليه وسلم-(صحيح البخاري، باب أهل العلم والفضل أحق بالإمامة،1/ 136، ط: دار طوق النجاة)

4۔ ثم قام وتهيأ للصلاة وحضر المسجد ووقف خلف أبي بكر وصلى- (تفسير القمي لأبي الحسن علي بن إبراهيم القمي،2/ 159، ط: مكتبة آية الله كاشف الغطاء)

اور ہر چند انبیاء کرام اور ائمہ کمالات نفسانیہ اور مراتب ایمانیہ میں عام مخلوق سے ممتاز ہوتے ہیں مگر احکام بشری خواص صغر سنی اور خصائص طفولیت ان میں بھی کار فرما رہتے ہیں اسی لیے مقتدا بننے کے لیے کمال عقلی کی حد تک پہنچنا ضروری قرار دیا گیا ہے چالیس سال سے قبل شاذ و نادر مثالوں کو چھوڑ کر منصب رسالت کسی کو عطا نہیں ہوا عربی میں ایک مثل ہے "الصبی صبی ولو کان نبیا" بچہ بچہ ہی ہے اگرچہ وہ نبی ہو۔

طعن نمبر2: مالک بن نویرہ کا قتل

دوسرا اعتراض ان کا یہ ہے کہ مالک بن نویرہ کی خوبصورت بیوی سے نکاح کے لالچ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے امیر الامراء تھے مالک بن نویرہ کو جو مسلمان تھے نہ صرف قتل کیا بلکہ قتل ہی کی رات کو اس عورت سے نکاح کر کے فعل زوجیت بھی کیا اور اس کی عدت پوری ہونے کا بھی انتظار نہ کیا کیونکہ عدت میں نکاح جائز نہیں اور یوں گویا زنا کے مرتکب ہوئے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہ ان پر حد لگائی نہ قتل کا قصاص لیا جبکہ دونوں سزاؤں کا نفاذ ان پر واجب تھا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس پر ناراض بھی ہوئے اور فرمایا اگر میں امیر ہوتا تو تم سے قصاص لیتا۔

جواب: دراصل جو واقعہ پیش آیا اس کی تعبیر ان لوگوں نے صحیح بیان نہیں کی اور جب تک صحیح حالات معلوم نہ ہوں اس وقت تک اعتراض کی بے وقعتی ظاہر ہے سیرت و تاریخ کی معتبر کتابوں میں اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ مدعی نبوت طلیحہ بن خویلد اسدی کی مہم سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ جب فارغ ہو کر نواح بطاح کی طرف متوجہ ہوئے تو اطراف و جوانب کی طرف فوجی دستے روانہ کیے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور طریقے کے مطابق ان کو ہدایت کی کہ جس کو قبیلہ گروہ پر چڑھائی کرو وہاں سے تمہیں اذان سنائی دے تو وہاں قتل وغیرہ سے بعض رہو اور اگر اذان کی آواز نہ سنائی دے تو اسے دار الحرب قرار دے کر پوری فوجی کاروائی کرو اتفاقاً اس دستہ میں جناب ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے جو مالک بن نویرہ کو پکڑ کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس لائے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بطاح کی سرداری ملی ہوئی تھی اور اس کے گرد و نواح کے صدقات کی وصولی بھی اسی کے سپرد تھی، جناب ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے اذان سننے کی گواہی دی مگر اسی دستہ کی ایک جماعت نے کہا کہ ہم نے اذان کی آواز نہیں سنی، مگر اس سے پیشتر گرد و نواح کے معتبرین کے ذریعہ یہ بات حتمی اور ثبوتی طور پر معلوم ہو چکی

تھی کہ نبی کریم ﷺ کے وصال کی خبر سن کر مالک بن نویرہ کے اہل خانہ نے خوب جشن منایا عورتوں نے ہاتھوں میں مہندی رچائی ڈھول بجائے اور خوب فرحت و شادمانی کا اظہار کیا اور مسلمانوں کی اس مصیبت پر خوش ہوئے پھر مزید ایک بات یہ ہوئی کہ مالک بن نویرہ سے سوال و جواب کے دوران حضور اکرم ﷺ کے لیے اس کے منہ سے ایسے الفاظ نکلے جس کے کفار و مرتدین اپنی گفتگو میں عادی تھے اور استعمال کرتے تھے یعنی "قال رجلکم او صاحبکم "[1] (تمہارے آدمی یا تمہارے ساتھی نے ایسا کہا) علاوہ ازیں یہ بات بھی منکشف ہو چکی تھی کہ حضور اکرم ﷺ کے وصال کی خبر سن کر مالک بن نویرہ نے وصول شدہ صدقات بھی اپنی قوم کو یہ کہہ کر واپس کر دیئے تھے کہ اچھا ہوا اس شخص کی موت سے تم نے مصیبت سے چھٹکارا پالیا، ان حالات اور اپنے سامنے اس کی گفتگو کے انداز سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اس کے ارتداد کا یقین ہو گیا اور آپ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا،[2] ادھر جب مدینہ میں اس واقعہ کی اطلاع پہنچی پھر جناب ابو قتادہ رضی اللہ عنہ بھی آپ سے ناراض ہو کر دار الخلافہ پہنچے اور قصور وار حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ہی ٹھہرایا تو ابتداء حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہی خیال تھا کہ خون ناحق ہوا اور قصاص واجب ہے مگر جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو طلب فرما کر تفتیش حال کی ان سے پورا واقعہ پوچھا اور حالات واقعات کا سارا راز آپ پر منکشف ہوا تو آپ نے ان کو بے قصور قرار دے کر ان سے کچھ تعرض نہیں کیا اور انہیں اسی سابقہ عہدہ پر بحال رکھا۔

اب اس واقعہ کو سامنے رکھ کر اور فقہی مسئلہ میں غور کر کے دیکھ لیا جائے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر زنا و قتل کی حد کیسے واجب ہو سکتی ہے اب رہی یہ بات کہ عربی عورت کو بھی ایک حیض بقدر عدت گزارنی ضروری ہے اور اتنا انتظار بھی نہیں ہوا تو اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر واقعہ سچ بھی ہے تو یہ اعتراض حضرت خالد پر

1۔ هذه اللفظة ثابتة حيث أوردها الفسوي في البدء والتاريخ: 5/ 160؛ وابن الجوزي، المنتظم: 4/ 78.

2۔ ایک شیعہ عالم مالک بن نویرہ کے ارتداد کے بارے میں لکھتا ہے: ولو كانت الصحبة أيضا مانعة من الخطأ في الدين والآثام لكانت مانعة لمالك بن نويرة وهو صاحب رسول الله صلى الله عليه وآله على الصدقات ومن تبعه من وجوه المسلمين من الردة عن الاسلام۔ (الافصاح في إمامة أمير المؤمنين، للشيخ مفيد، ص: 41، ط: مؤسسة البعثة قم)

ہوتا ہے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر کیوں؟ پھر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نہ معصوم تھے نہ امام عام لیکن بات یہ نہیں دراصل یہ قصہ ہی من گھڑت ہے اسی لیے کسی مستند و معتبر کتاب میں اس کی کوئی روایت نہیں ملتی بعض غیر معتبر کتابوں میں یہ روایت ملتی بھی ہے تو اس کا جواب بھی ساتھ ساتھ اسی روایت میں موجود ہے کہ مالک بن نویرہ نے اس عورت کو ایک عرصہ سے طلاق دے رکھی تھی اور رسم جاہلیت کی پائیداری میں اسے یوں ہی گھر میں ڈال رکھا تھا اس رسم جاہلیت کے توڑنے پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی تھی:

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ[1]

جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں روکے نہ رکھو۔

لہٰذا اس عورت کی عدت تو کب کی پوری ہو چکی تھی اور نکاح حلال ہو چکا تھا تو اگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فوری نکاح کر لیا تو اعتراض کی کیا بات ہے فقہاء اہل سنت کا یہی مذہب ہے۔[2]

اس باب میں چونکہ اعتراضات اہل سنت پر کیے جا رہے ہیں اور انہی کے مذہب اور روایات سے اعتراضات کو ثابت کرنا بھی مقصود ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اہل سنت ہی کی روایات اور مسائل کا لحاظ رکھا جائے ورنہ تو مقصد حاصل نہیں ہو گا، استیعاب کا ایک حوالہ ملاحظہ کیجیے:

وأمره أبو بكر الصديق على الجيوش، ففتح الله عليه اليمامة وغيرها، وقتل على يده أكثر أهل الردة، منهم مسيلمة ومالك بن نويرة.[3]

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو یعنی خالد رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر بنایا پس اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ یمامہ اور دوسرے مقامات فتح کرائے اور ان کے ہاتھوں بہت سے مرتدین قتل کرائے

1۔ سورة البقرة، الآية: 232

2۔ واصطفى خالد امرأة مالك بن نويرة، وهي أم تميم ابنة المنهال، وكانت جميلة، فلما حلت بنى بها۔ (البداية والنهاية، لابن كثير، 6/ 354، ط: دار إحياء التراث العربي)

3۔ الاستيعاب في معرفة الأصحاب، 2/ 429، ط: دار الجيل، بيروت

ان میں سے مسیلمہ کذاب اور مالک بن نویرہ بھی تھے۔

دوسرا جواب: چلو مان لیا کہ مالک بن نویرہ مرتد نہ تھا مگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اس کے ارتداد کا شبہ تو پیدا ہو گیا تھا اور " والقصاص تندرئ بالشبهات "[1] اور شبہ کی صورت میں قصاص ختم ہو جاتا ہے۔

تیسرا جواب: جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ رسول اللہ تھے سنیوں یا شیعوں کے خلیفہ تو نہیں تھے کہ ان کی فرمائش اور خواہش کے مطابق کام انجام دیتے وہ جس ذات اقدس کے خلیفہ تھے ان کا اسوہ ان کے سامنے تھا انہیں اسی کی پیروی کرنی اور انہی کی سنت پر عمل کرنا تھا اور اس ذات محترم و مقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں انہیں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے سیکڑوں اسے قسم کے مشتبہ افراد کو قتل کیا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی تعرض نہ فرمایا۔

چنانچہ اہل سیرت و تاریخ کا اس قصہ کی صحت پر اجماع ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ جناب خالد رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجا تو آپ نے ایک قوم پر چڑھائی کی وہ لوگ اسلام تو لے آئے تھے لیکن قواعد و تعلیمات اسلام سے ابھی روشناس نہیں ہوئے تھے جب ان پر حملہ ہوا تو اپنے اسلام کے اظہار کے لیے یہ الفاظ ان کے منہ سے نکلے " صبأنا صبأنا " ہم صابی ہیں ہم صابی ہیں، ان کا مطلب تو یہ تھا کہ اپنے سابق دین سے پھر گئے اور اسلام لے آئے جناب خالد رضی اللہ عنہ نے ان کے قتل کا حکم دے دیا اسی لشکر میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی جانب سے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی ایک دستہ کے سردار تھے انہوں نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ ان کو قتل نہ کرو قید میں رکھو، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ بہت ملول اور رنجیدہ ہوئے بہت افسوس ظاہر فرما کر یہ الفاظ فرمائے " اللهم إني أبرأ إليك مما صنع خالد "[2] اے اللہ میں تیری جناب میں خالد نے جو کچھ کیا اس سے مبرا ہوں۔

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر حد جاری کی نہ کوئی قصاص و دیت دلائی اس لیے اس نظیر کی موجودگی میں اسی قسم کے شبہ یا اس سے زیادہ شبہ کی صورت میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جناب خالد بن

1۔ المبسوط للسرخسي، ج 16 الصفحة 114، ط: دار المعرفة بيروت لبنان

2۔ البداية والنهاية، لابن كثير، 4/ 358، ط: دار إحياء التراث العربي

ولید سے کوئی تعرض نہیں کیا تو کون سا قصور کیا خصوصاً اس صورت میں کہ آپ نے بیت المال سے اس کی دیت دلا بھی دی ہو آپ پر طعن و اعتراض وہی کر سکتا ہے جس کا دل بغض و کینہ کی آلائش سے آلودہ ہو۔

چوتھا جواب: کیوں جناب مالک بن نویرہ کا قصاص نہ لینا اگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے لیے باعث طعن ہے تو ذی النورین الشہید حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص نہ لینے پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے متعلق آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ اس لیے کہ ان کا قتل تو بلا وجہ بلا سبب تھا واقعہ میں کوئی سبب تھا نہ وہم و گمان میں کوئی بات!

پانچواں جواب: حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے قصاص لینا اس وقت واجب ہوتا جب مالک بن نویرہ کے ورثہ اس کا مطالبہ کرتے اور اس قسم کے مطالبہ کا بالکل ہی کوئی ثبوت نہیں بلکہ اس کے بھائی متمم بن نویرہ(1) نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنے بھائی کے مرتد ہو جانے کا اعتراف کیا حالانکہ یہ بھائی وہ تھا جو اپنے بھائی مالک سے عشق کی حد تک محبت کرتا تھا عمر بھر اس کی جدائی میں تڑپتا پھڑکتا رہا ہمیشہ اس کے فراق میں چاک گریبان آہ و فغاں کرتا رہا چنانچہ اس کے مرثیے عرب بھر میں ضرب المثل مانے گئے اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

وكنا كندماني جذيمة حقبة — من الدهر حتى قيل لن يتصعدها

فلما تفرقنا كأني ومالكا — لطول اجتماع لم نبت ليلة معا(2)

عمر کے ایک خاص حصے تک ہم دونوں بھائی جزیمہ کے دو مصاحبوں کے مانند تھے کہ لوگ یہ کہنے لگے کہ یہ ہرگز بھی وہم جدا نہ ہوں گے لیکن جب ہم جدا ہو گئے تو میری اور مالک کی اتنے عرصہ کی ایک جائے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ہم نے ایک رات بھی ساتھ نہ گزاری ہو۔

چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنی سابقہ رائے پر جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ان کی تھی

1۔ أسلم هو وأخوه وكان حسن الإسلام وله شعر في مراثي أخيه. الاستيعاب: 4/ 1455؛ الإصابة: 5/ 763

2۔ الأغاني: 15/ 299.

متأسف اور نادم ہوئے آپ نے اس کا برملا اعتراف کیا کہ جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں جو فیصلہ کیا وہ عین حق اور بالکل درست تھا اور مبنی بر انصاف اور اس کی سب سے بڑی اور واضح دلیل یہ ہے کہ آپ نے اپنے عہد میں جناب خالد رضی اللہ عنہ سے کوئی تعرض نہیں فرمایا نہ ان پر حد جاری کی نہ قصاص لیا حالانکہ حدود کے معاملہ میں آپ بہت سخت اور متشدد تھے اور کسی رو رعایت سے کام نہ لیتے تھے۔

طعن نمبر 3: اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں آپ رضی اللہ عنہ نے تاخیر کی

تیسرا طعن اور اعتراض یہ کرتے ہیں کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے سلسلے میں آپ نے تاخیر کی صورت اختیار کی حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس لشکر کو رخصت فرمایا تھا لوگوں کا نام بنام تقرر فرمایا اور آخر وقت تک اس پر بہت زور دیتے اور تاکید فرماتے رہے بلکہ اس کی تیاری کے سلسلہ میں یوں ارشاد فرماتے "جهزوا جيش أسامة، لعن الله من تخلف"[1] اسامہ کے لشکر کو سامان مہیا کرو جو اس سے پیچھے ہٹے اس پر اللہ کی لعنت ہے۔

جواب: سب سے پہلے تو یہ بات متعین ہونا ضروری ہے کہ ان لوگوں کا یہ اعتراض حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر کس حیثیت اور پہلو سے ہے کیا اس وجہ سے کہ آپ نے اس کے لیے تیاری نہیں کی یا یہ صورت تھی کہ آپ اس میں شریک نہیں ہوئے، اگر مد نظر پہلی صورت ہے تو یہ سفید جھوٹ ہے وہاں تو صورت یہ تھی کہ آپ رضی اللہ عنہ نے دیگر صحابہ کی آراء کے علی الرغم میں جیسے اسامہ کی ہر پہلو سے تیاری کی اس سلسلہ کی تفصیل اور صحیح صورت حال یوں تھی کہ 26 سفر بروز دوشنبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا انتقام لینے اور رومیوں سے جہاد کی غرض سے لشکر ترتیب دیا جائے سہ شنبہ کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کو اس لشکر کا امیر مقرر فرمایا 28 صفر چہار شنبہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض آخری لاحق ہوا پر دوسرے روز علالت کے باوجود دست مبارک سے نشان (علم) تیار فرمایا اور ارشاد فرمایا" أغز بسم الله في سبيل الله فقاتل من

---

1 ـ ليست العبارة الأخيرة في كتب أهل السنة رغم دعاوى الإمامية، ينظر ابن حيوان، دعائم الإسلام: 1/ 40؛ المجلسي، بحار الأنوار: 27/ 324. والحلي، نهج الحق: ص 263.

کفر باللہ "[1] اللہ کے نام سے اللہ کے راستے میں غزوہ کرو اور اللہ کے منکروں سے جنگ کرو، پھر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اس علم کو لیے باہر نکلے اور جناب بریدہ الحصیب رضی اللہ عنہ کو دیا کہ انہیں لشکر کا علمبردار مقرر کیا گیا تھا اور مدینہ سے چل کر مقام جرف میں آ ٹھہرے کے سارے لشکر کی اجتماع گاہ یہی پہلی منزل تھی کہ جو آئے لشکر میں ملتا جائے ادھر کبار صحابہ مہاجرین وانصار، حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، عثمان غنی، سعد بن وقاص، ابو عبیدہ بن جراح، سعید بن زید، قسادہ بن عمان اور سلمہ بن اسلم رضی اللہ عنہم اس لشکر کے شایان شان تیاریوں میں مصروف تھے خیمے اور دیگر سامان روانہ کر چکے تھے اور خود بھی روانگی کے لیے کہ چہار شنبہ کے غروب اور پنج شنبہ کی ابتدائی ساعتوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض میں شدت اختیار کر لی اور مدینہ میں بے چینی جانثاروں میں ہل چل مچ گئی شب پنج شنبہ عشاء کی نماز کے لیے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جانشین مقرر فرمایا اور اس خدمت کے لیے آپ کو نامزد فرما دیا تا آنکہ 10 ربیع الاول کی تاریخ اور دو شنبہ کا دن آیا کہ اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض میں کچھ تخفیف معلوم ہوئی تھی حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو کنار محبت و رحمت میں لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں دعا فرمائی اور فی امان اللہ کہا، مگر یک شنبہ کو مرض میں اچانک اضافہ ہو گیا ادھر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ دو شنبہ کی صبح روانگی کا ارادہ کر چکے تھے اور روانہ ہونے ہی کو تھے کہ ان کی والدہ ام ایمن رضی اللہ عنہا کا قاصد یہ پیغام لایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر عالم نزع طاری ہے۔

حضرت اسامہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم گرتے پڑتے واپس مدینۃ النبی آئے بریدہ الحصیب نے وہ علم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ مبارک کے دروازے پر گاڑ دیا جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم منزل آخرین میں جاں گزین ہو چکے اور جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مسند خلافت کے لیے منتخب کر لیے گئے تو آپ نے حکم دیا کہ علم اسامہ کے گھر کے دروازے پر نصب کیا جائے بریدہ کو حکم ہوا کہ اسامہ رضی اللہ عنہ کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر لشکر کو از سر نو ترتیب نے اور جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کو کوچ کا حکم ملا چنانچہ وہ مدینۃ النبی سے روانہ ہوئے اور پہلا پڑاؤ جرف میں کیا۔

اسی دوران بعض قبائل عرب کے مرتد ہونے اور ان کے مدینہ منورہ پر چڑھائی کی تشویش ناک خبر ملی

1۔ الطبقات الکبری لابن سعد، 2/ 190

تو سارے صحابہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے وقت بڑا نازک ہے حالات دگر گوں نظر آتے ہیں ایسے وقت اتنا بھاری لشکر دور دراز کی مسافت پر بھیجنا خلاف مصلحت ہے ایسا نہ ہو کہ عرب مدینہ خالی دیکھ کر شورش برپا کر دیں اور فتنہ اٹھ کھڑا ہو اور اہل مدینہ کسی افت و مصیبت میں گھر جائیں مگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ قبول نہیں فرمایا اور یہ فرمایا کہ اگر مجھے یہ معلوم بھی ہو جائے کہ اسامہ کے لشکر کی روانگی کے سبب میں مدینہ میں درندوں کا لقمہ بن جاؤں گا تب بھی مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی خلاف ورزی کے مقابلہ میں یہ صورت منظور ہو گی، البتہ اسامہ رضی اللہ عنہ سے بصورت درخواست اتنا کہا کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو مدینہ ٹھہرنے کی اجازت دے دو کہ مدینۃ النبی کی حفاظت و انتظام میں مجھے ان کے مشورہ کی ضرورت ہو گی، چنانچہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کی اجازت سے مدینۃ النبی واپس آگئے، اور باقی لشکر جوں کا توں یکم ربیع الثانی کو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں روانہ ہوا، اور جہاں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے جام شہادت نوش فرمایا تھا اسی رخ چل پڑا تھا اس مقام کا نام ابنیٰ تھا۔

یہ ہے اصل قصہ اور واقعہ جو روضۃ الصفا، روضۃ الاحباب، حبیب السیر اور شیعوں وسنیوں کی دیگر معتبر کتابوں میں بیان کیا گیا ہے اور اگر مقصود اعتراض دوسری صورت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ رفاقت اسامہ سے بچھڑ گئے اور ان کا ساتھ نہ دیا تو واقعہ اور صورت بالا کو مد نظر رکھا جائے تو اس اعتراض کا کوئی جواز نظر نہیں آتا اور نہ اس کے جواب کی ضرورت باقی رہتی ہے تاہم چند جوابات ملاحظہ ہوں:

1۔ رئیس وقت کو یہ اختیار ہے کہ اگر ایک آدمی کا تقرر اس نے کسی جگہ کیا ہے تو ضرورت کے وقت وہ کسی دوسرے منصب پر بھی اس کا تبادلہ کر سکتا ہے اور اس وقت اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ پہلی خدمت سے اس کو بری و ذمہ کر دیا یہاں بھی صورت یہی تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اول یہ حکم فرمایا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ جیش اسامہ میں شریک ہو کر جہاد کے لیے جائیں وہ اس کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی ہوئی کہ وہ میرے نائب نماز کی خدمت انجام دیں تو وہ خدمت سپرد فرمادی اس کا مطلب ہوا کہ لشکری خدمات سے آپ کو چھٹی مل گئی، اس صورتحال پر اعتراض وہی کر سکتا ہے جو یا تو عقل سے پیدل ہو نا یا اپنا بغض و کینہ نکالنے کے لیے اعتراض برائے اعتراض کا قائل ہو شرعی نقطہ نظر سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ جہاد سے پہلے کی ابتدائی صورت

فرض کفایہ ہے اور لشکر اسامہ رضی اللہ عنہ کی تیاری بھی اسی نوعیت کی تھی اس لیے آپ رضی اللہ عنہ کا لشکر اسامہ کے ساتھ نہ جانا کوئی قابل اعتراض نہیں اور نہ آپ رضی اللہ عنہ پر کوئی الزام آتا ہے۔

دوسری طرف صورتحال یہ اکثر بدل گئی تھی آپ ولی الامر خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے پوری ملت کی فلاح وبہبود کی ذمہ داری آپ پر تھی کفار و مرتدین کا جو فتنہ سر اٹھا رہا تھا اس کو فروخت کرنا فرض عین تھا اس کو آپ کیسے نظر انداز فرما سکتے تھے، لہذا یہ کہنا درست ہوگا کہ آپ نے فرض عین کی ادائیگی کی خاطر فرض کفایہ کو ترک فرمایا یہی حکم شرعی بھی ہے اور پھر اب تو پوزیشن بدل گئی تھی اب تو لشکر کی تیاری ساز و سامان کی فراہمی لوگوں کو اس کی ترغیب دلانا اور ہمہ قسم مدد و ضروریات کا خیال رکھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہونے کی حیثیت سے آپ رضی اللہ عنہ ہی کو سرانجام دینے تھے اور ان سب کاموں کا سہرا اب تو آپ ہی کے سر تھا اور ان کا اجر و ثواب آپ ہی کے نام لکھا جاتا تھا۔

2۔ دشمن کی سرکوبی کے لیے کسی امیر کی سرکردگی میں چند اشخاص کے نامزدگی سیاست تمدنی و مدنی کی ذمہ داریں میں سے ایک ذمہ داری ہے جو حاکم وقت کے ثواب دید سے متعلق ہوتا ہے وہ حکم منزل من اللہ نہیں ہوتا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اس انتظام اور سیاست مدنی کا بہت جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے کاندھوں پر آیا، اب یہ امور آپ کی صوابدید سے وابستہ ہوئے کہ جس کو چاہیں جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ متعین کر دیں، اور جس کو مناسب سمجھیں اپنے ساتھ رکھیں خود شرکت کرنا چاہیں شریک ہو جائیں نہ چاہیں تو نہ جائیں ان کے اتنے رد و بدل سے فرمان اور حکم رسول کی مخالفت لازم نہیں آتی، مخالفت تو تب ہوتی کہ آپ رضی اللہ عنہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی جگہ کسی اور کو امیر لشکر مقرر فرماتے یا یہ مہم اور لشکر کی روانگی کے ارادہ کو ترک کر دیتے یا دشمنوں سے صلح کر لیتے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ملک وملت اور دینی مصالح اور جزوی امور میں وقتی طور پر رد و بدل رئیس وقت خلیفہ بادشاہ کی ثواب دید سے متعلق و وابستہ ہوتے ہیں ان میں وہ اپنی عقل ورائے کو پورا دخل دینے کا پورا پورا مجاز ہے اور اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام نہ شرعی حیثیت سے تھے اور نہ ان سے متعلق کوئی وحی نازل ہوئی تھی۔

رہا لعنت والا جملہ تو اہل سنت کی کتابوں میں یہ موجود نہیں ہے بالفرض اس کو صحیح مان لیں تو اس کے یہ

معتی ہوں گے کہ اس مہم میں اسامہ ؓ کو تنہا چھوڑ دینا اور جناب زید بن حارثہ کے انتقام کے لیے رومیوں کے خلاف اس جہاد سے پہلو تہی کرنا اور شریک نہ ہونا حرام ہے اور جناب ابو بکر صدیق ؓ جب خدمت امامت سے گراں بار ہوئے تو بلاشبہ ان تمام امور سے آپ مستثنیٰ قرار پائے (جس طرح اس لشکر کی روانگی کے سلسلہ میں حضور اکرم ﷺ نے اپنی شرکت کے علاوہ دیگر تمام امور کا انتظام فرمایا ان کی انجام دہی کے لیے بتاکید اصرار فرمایا اسی طرح عدم موجودگی کے سبب آپ ﷺ کے نائب نے سوائے اپنی شرکت کے یا حضرت اسامہ ؓ کی اجازت سے فاروق اعظم ؓ کے رخ جانے کے تمام امور عین نبی کریم ﷺ کی منشا اور ان کے انتظامات کے مطابق یہ مہم روانہ فرمائی اور ہر طرح کے ساز و سامان جہاد کا ان کے لیے انتظام فرمایا، از مترجم نعمانی) چنانچہ شہرستانی نے اپنی کتاب الملل والنحل میں لکھا ہے کہ یہ لعنتی جملہ من گھڑت اور افتراء محض ہے کسی فارسی میں نوشت و خواند کی صلاحیت رکھنے والے شخص نے محدثین اہل سنت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو اور وہ اپنی کتاب سیر میں یہ جملہ نقل کرے تو اس سے اہل سنت کو الزام دینا خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں اس لیے کہ اہل سنت کے نزدیک وہی حدیث معتبر ہے جو محدثین کی معتبر کتب مدون میں ہو اور جس کی صحت کا حکم بھی اس کے ساتھ مذکور ہو بے سند حدیث ان کے لیے ناقابل توجہ ہے اور نالائق اعتماد۔

3۔ حضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت صدیق اکبر ؓ کے منصب میں انقلاب آگیا پہلے آپ کا شمار عام مومنین میں تھا لیکن اب امت محمد ﷺ کے خلیفہ اور پیغمبر ﷺ کے نائب و جانشین ہیں جب کسی شخص کے منصب میں انقلاب آجائے اور وہ ایک منصب سے دوسرے منصب پر فائز ہو جائے تو حکم شرع کے بموجب موجودہ منصب کے احکام جاری ہوتے ہیں پہلی حیثیت و منصب والے نہیں، مثلاً جب پیٹ کا بچہ پیدا ہو جائے، پھر وہ جوان و بالغ ہو جائے یا پاگل اچھا ہو جائے، مقیم مسافر ہو جائے، مسافر اقامت اختیار کرلے، غلام آزاد ہو جائے، رعیت حاکم بن جائے، عام آدمی قاضی و جج بن جائے، فقیر مالدار، مالدار فقیر ہو جائے، زندہ موت کی راہ لگ جائے میراث ولایت میں قریب تر رشتہ دار فوت ہو جائے اور اسی قسم کے بے شمار ایسی نظیرے ہیں کہ پہلی حالت گزرنے کے بعد اس پر دوسری حیثیت وہ حالت کے احکام نافذ ہوں گے بچہ نابالغ ہے تب تک معصوم ہے بالغ ہونے پر وہ مکلف ہو گا اب اس پر معصومیت کی حالت والے احکام نافذ نہیں ہوں گے مکلف والے احکام جاری ہوں گے۔

اب جب جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جانشین رسول ہوئے تو اب اسامہ کی ماتحتی والا حکم باقی نہیں رہا اب اس لشکر کے ساتھ ان کا وہی رویہ ہونا چاہیے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی حیات کے وقت تھا اور اس معاملہ میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بقدم رہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس لشکر کے ساتھ خود تشریف نہیں لے جارہے تھے کہ ایک امر کسی کا مرحلہ سامنے تھا اور اب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی اس لشکر کے ساتھ نہیں جاسکتے تھے اس لیے کہ موجودہ منصب کا اب یہ تقاضا تھا کہ وہ مرکز کی حفاظت بنفس نفیس فرمائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری تیاری اور اہتمام کے ساتھ بہر صورت اس لشکر کی روانگی چاہتے تھے، اور جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں چاہتے تھے، جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہی کیا اور لشکر کو پوری تیاری اور بڑے اہتمام کے ساتھ باہر صورت بھیجا اور اسامہ ہی امیر لشکر رہے آپ رضی اللہ عنہ نے اعتراضات و مشوروں کے باوجود جناب اسامہ رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر رکھا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی رفاقہ کے مشوروں اور مثال ملکی اور قوانین جنگ کے علی الرغم ان کی عمارت کو باقی رکھا اور مشوروں کے جوابات میں یہ جواب مرحمت فرمایا کہ ابو بکر کی کیا مجال کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ امیر کو ہٹا دے۔

اس حالمہ میں کوئی ہوش مند آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ والے معاملہ میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کوئی قابل اعتراض طرز عمل اختیار کیا ہو۔

4۔ بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لیے یہ نیابت نماز بھی باعث استثناء نہیں نہ مہمات خلافت کی مشغولی یا مدینہ اور ناموس رسول کی حفاظت کا عذر کام آسکتا ہے آپ اس پر معمور تھے کہ رومیوں کی لڑائی کے لیے جناب اسامہ کے ساتھ نکلیں تاکہ تخلف کا الزام نہ آئے اور جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایسا نہیں کیا وہ اسامہ کے لشکر کے ساتھ نہیں گئے اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائے گا کہ آپ کی عصمت میں فرق آگیا لیکن امامت میں عصمت شرط ہے کہاں عدالت البتہ ضروری ہے تو چھوٹے موٹے ایک آدھ گناہ کے ارتکاب سے عدالت بھی مجروح نہیں ہوتی اور اس بات پر سنی تو اعتقاد رکھتے ہی ہیں شیعہ بھی اس کے قائل ہیں کہ جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نہ فاسق تھے اور نہ ان سے کبھی کوئی کبیرہ گناہ سرزد ہوا۔

5۔ پانچواں جواب یہ ہے کہ حضرات شیعہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یا ان جیسے بعض دوسرے بزرگوں پر اہل سنت کے کیسہ علم سے ٹٹول ٹٹال کر دو چار روایات کے ذریعہ جو طعن و اعتراض کرتے ہیں وہ انہیں اول تو ثابت

نہیں کر پاتے اور بالفرض ان کے دو چار طعن ثابت بھی ہوں تو ان کو یہ چاہیے کہ پہلے تو جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب اور جنت کے درجات عالیہ کی بشارت کی روایات کو جو اہل سنت بحوالہ آیات قرآنی احادیث رسول اخبار ائمہ و دیگر اہل بیت سے ثابت کرتے ہیں جن میں سے بعض خود شیعوں کے نزدیک ان کی کتابوں میں بطریق صحیح منقول بھی ہیں ایک پلڑے میں رکھیں اور اس کے مقابلہ میں اپنے مزعومہ من گھڑت اور افتراء پر مبنی متعین کی گٹھڑی رکھنے پھر پلڑوں کا رخ دیکھ کر ہم سے جواب کا مطالبہ کریں۔

6۔ شیعوں کے نزدیک رسول اللہ کا حکم وجوب کے لیے متعین نہیں ہے جیسا کہ مرتضی نے کتاب درر اور غرر میں اس کی دلیل لکھی ہے (1) لہذا اگر خاص جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ ثابت بھی ہو جائے کہ وہ اسامہ کے ساتھ جائیں اور وہ نہ جائیں تو انہی کے قواعد کے مطابق کوئی خرابی لازم نہیں آتی ممکن ہے یہ حکم مندوب یعنی مستحب ہو جس کا ترک موجب گناہ نہیں!

اب رہا لعنت والا جملہ تو اس کا ایک جواب دو یہ جملہ ہماری کتابوں میں نہیں اوپر گزر چکا دوسرے جواب یہ ہے کہ اگر موجود بھی ہو تو لفظ من عام ہے شیعی کتب اصول میں اس کی تصریح موجود ہے لہذا اس وعید میں اکیلے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی نہیں جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی داخل ہوں گے تو ان کے متعلق جو تمہارا جواب ہو گا وہی جواب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہمارا بھی ہو گا پھر اگر وہ کہیں کہ اگر یہ وعید تو ان لوگوں کے لیے ہے جو جیسے اسامہ رضی اللہ عنہ کے لیے نام بنام نامزد کیے گئے تھے تو ہم کہیں گے کہ پھر "جهز وجیش اسامه" کا خطاب ان متعین اور نامزد حضرات کی طرف نہیں ہو سکتا کیونکہ جیسے اسامہ ہی کو یہ کہا جائے کہ جیسے اسامہ کے لیے سامان اکٹھا کرو کیا بات ہوئی لامحالہ ماننا پڑے گا کہ یہ خطاب عام تھا اور سب مسلمان اس کے مخاطب تھے اور لعنت کا جملہ اسی کے ساتھ چسپاں ہے لہذا اس سے نامزد حضرات کی تخصیص ثابت نہیں ہوتی۔

7۔ جیسا کہ باب نبوت میں گزرا کہ شیعوں کے ہاں یہ ثابت ہے کہ حضرت آدم حضرت یونس علیہم السلام نے اللہ تعالی

1۔ قال: «إن مجرد أمر الرسول عليه الصلاة والسلام لا يقتضي الوجوب». الأمالي: ١/ 55 و أضواء على السنة المحمدية لمحمود أبو رية، الصفحة ٤٥۔

کے بلاواسطہ براہ راست حکم کے خلاف ورزی کی (نعوذ باللہ) تو اگر امام و خلیفہ سے رسول کے ایک حکم کی خلاف ورزی ہو گئی تو وہ وجہ طعن کیوں ہے کہ نائب بہر حال نائب ہے وہ اصل سے بہر حال کم تر ہوتا ہے۔

طعن نمبر 4: آنحضرت ﷺ نے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کبھی دینی امور سپرد نہیں کئے

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے کبھی کوئی ایسا کام ذمہ نہیں کیا جو اقامت دین و شرع سے تعلق رکھتا ہو اور جس شخص میں ایک بھی دینی امر کی ولایت کی قابلیت نہ ہو وہ ولایت عامہ کی قابلیت کیسے رکھ سکتا ہے!

جواب: اس اعتراض کا جواب کئی پہلوؤں سے دیا جا سکتا ہے۔

1۔ ان کا یہ دعویٰ سراسر جھوٹ بہتان اور محض فریب ہے دونوں فرقوں کی سیر و تاریخ کی کتابوں سے بالاتفاق یہ ثابت ہے اور صحیح بھی ہے کہ یہ احد کی شکست کے بعد جب یہ خبر ملی کہ ابو سفیان شکست واپس پائی پر بہت نادم ہے اور مدینۃ النبی پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا ہے تو حضور ﷺ نے اس کے مقابلہ کے لیے جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو متعین کر کے آپ کو رخصت کیا چوتھے سال غزوہ بنی نظیر میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر مقرر فرما کر حضور ﷺ دولت خانہ تشریف لے گئے چھٹا سال جب حضور ﷺ غزوہ بنی لحیان کے لیے تشریف لے گئے تو آپ کی آمد کی خبر سن کر یہ قبیلہ پہاڑ کی چوٹیوں پر قلعہ بند ہو گیا آپ ﷺ نے دو ایک روز وہاں قیام فرما کر مختلف اطراف میں فوجی دستے روانہ فرمائے ان میں سب سے اچھا دستہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے زیر کمان تھا جو کراع الغمیم کی سمت روانہ ہوا۔

غزوہ تبوک کے وقت حضور ﷺ نے اعلان فرمایا کہ لشکری مدینۃ النبی سے نکل کر ثنیۃ الوداع کے مقام پر جمع ہو اور ان کے امیر جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ چنانچہ آپ ہی کے صوابدید پر سارے کام انجام پائے غزوہ خیبر کے موقع پر جب حضور ﷺ کو درد شقیقہ لاحق ہوا تو قلعہ کا محاصرہ کا معاملہ درپیش تھا تو حضور ﷺ نے جناب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا کر قلعہ پر حملہ کا حکم دیا اس دن جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے بڑی سخت لڑائی لڑی، ساتواں سال آپ رضی اللہ عنہ ہی کو بنی کلاب کی سرکوبی کے لیے روانہ فرمایا اور سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کو مع رسالہ آپ رضی اللہ عنہ کے ہم رکابی میں رکھا پھر آپ نے بنو کلاب سے جنگ کی ایک جماعت کو تہ تیغ کیا ایک

جماعت کو قیدی بنالیا اور بنو فزارہ پر بھی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی امیر لشکر تھے چنانچہ حاکم نے سلمہ بن اکوع سے یہ روایت بیان کی ہے کہ:

أمر رسول الله ﷺ علينا أبا بكر فغزونا ناسا من بني فزارة فلما دنونا من الماء أمرنا أبو بكر فعرسنا فلما صلينا الصبح أمرنا أبو بكر فشننا الغارة عليهم [1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر بنایا چنانچہ ہم نے بنو فزارہ سے جنگ کی جب ہم پانی کے قریب پہنچے تو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہمیں وہاں شب بسری کا حکم دیا چنانچہ ہم نے وہاں رات گزاری صبح کی نماز کے بعد جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم سے ہم نے حملہ کیا۔

معارج اور حبیب السیر میں مسطور ہے کہ غزوہ تبوک کے بعد ایک اعرابی (دیہاتی) نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ عربوں کی ٹکڑی وادی الرمل میں مقیم ہے جو شب خون مارنے کا ارادہ رکھتی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر بنایا ان کو اپنا نشان دے کر اس ٹولی کی سرکوبی کے لیے روانہ فرمایا۔

اسی طرح جب بنی عمرو بن عوف کی خانہ جنگی ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ظہر کے بعد ملی آپ فوراً ہی اصلاح احوال اور صلح وصفائی کی غرض سے وہاں تشریف لے گئے اور جاتے وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرما گئے کہ نماز کے وقت میں نہ آسکوں تو ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہنا کہ وہ نماز پڑھائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا اور عصر کی نماز جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ [2]

نواں سال جب حج فرض ہوا تو اسی سال بعض وجود کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لے جانا ملتوی رہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک بہت بڑی جماعت کے ساتھ مکہ مکرمہ

1۔ تاریخ الأمم والملوك المعروف تاریخ الطبری، 2/ 288، ط: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات بيروت لبنان

2۔ عن سهل بن سعد الساعدي: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم ذهب إلى بني عمرو بن عوف ليصلح بينهم، فحانت الصلاة، فجاء المؤذن إلى أبي بكر، فقال: أتصلي للناس فأقيم؟ قال: نعم فصلى أبو بكر۔(صحيح البخاري، باب من دخل ليؤم الناس، فجاء الإمام الأول، فتأخر الأول أو لم يتأخر، جازت صلاته ،1/ 137، ط: دار طوق النجاة)

روانہ فرمایا تاکہ وہاں جا کر خود بھی ادائیگی مناسک حج میں مشغول ہوں،[1] اور دیگر موجودہ افراد کو اس عظیم الشان عبادت کے قواعد سے آگاہ کریں اور سنہ وفات کے ربیع الاول کے عشرہ اول کی شب پنج شنبہ سے دوشنبہ کی صبح تک کی نمازوں کے لیے نائب مقرر فرمانا تو اتنا مشہور واقعہ ہے کہ محتاج بیان نہیں۔[2]

اب آپ غور کریں کہ وہ دینی امور جن کا تعلق رئیس امام خلیفہ سے ہو سکتا ہے وہ جہاد نماز اور حج یا تین ہی تو ہیں اور ان تینوں میں آنحضرت ﷺ نے اپنی موجودگی میں خلیفہ اول جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا نام بنایا اب وہ کون سا دینی امر رہ گیا ہے جس میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نیابت ولایت یا امامت کے لیے قطعاً قابلیت نہیں رکھتے تھے۔

2۔ ہم اسے تسلیم کر لیتے ہیں کہ جیسے یہ کہتے ہیں ایسا ہی ہوگا لیکن اس کا سبب وہ نہیں جو یہ بیان کرتے ہیں بلکہ وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی نظر مبارک میں ان کا منصب و درجہ وزیر و مشیر کا تھا کہ اہم دینی امور کے فیصلہ کے وقت آپ ﷺ ان کی موجودگی کو ضروری خیال فرماتے اور ان کی موجودگی ہی میں اس قسم کے امور طے فرماتے اور رسم ریاست اور معمول سلطنت ہی یہی ہوتا ہے کہ بڑے پایا کے امراء وزراء کی حاضری دربار میں اہم اور ضروری خیال کی جاتی ہے ان کو عملداری اور فوجداری کے لیے نہیں بھیجتے اور فوجی دستوں پر امیر نہیں کیا کرتے اس لیے کہ اہم اور بلند مرتبہ امور ان کی غیر موجودگی کا سبب ابتری کا شکار ہوتے ہیں اور یہ وجہ خود آپ ﷺ نے ظاہر فرمائی چنانچہ حاکم نے حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ:

> میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے یہ سنا کہ میں چاہتا ہوں کہ دور دراز کی جگہوں پر لوگوں کو دین کی تعلیم و ترویج کے لیے بھیجوں جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو بھیجا تھا حاضرین نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کے پاس تو ان کے پاؤں کے افراد موجود ہیں مثلاً ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا" إنه لا غنى لي عنهما، إنهما من الدين كالسمع

1۔ روى أبو هريرة: «أن أبا بكر الصديق رضي الله عنه بعثه في الحجة التي أمره النبي صلى الله عليه وسلم عليها، قبل حجة الوداع يوم النحر في رهط يؤذن في الناس: أن لا يحج بعد العام مشرك ولا يطوفن بالبيت عريان». (مسند أبي يعلى الموصلي، 1/ 100، رقم: 104، ط: دار المأمون للتراث دمشق)

2۔ صحيح البخاري، باب أهل العلم والفضل أحق بالإمامة، 1/ 136، ط: دار طوق النجاة

والبصر "بات یہ ہے کہ میں ان دونوں سے بے نیاز نہیں ہونا چاہتا کیونکہ دین کے لیے یہ دونوں آنکھ کان کی طرح ہیں۔[1]

علاوہ ازیں حضور ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے چار وزیر مرحمت فرمائے دو اہل زمین سے یعنی ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اور دو آسمان سے یعنی جبرائیل و میکائیل علیہم السلام۔[2]

3۔ اگر کسی کی نااہلی کی دلیل ہی یہ ہے کہ اس کو کسی اہم کام کے لیے بھیجا نہ گیا ہو تو یہ حضرت جناب حسنین رضی اللہ عنہما کے متعلق کیا کہیں گے کہ ان کو بھی جناب امیر علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کسی ذمہ داری کے کام سے باہر نہیں بھیجا تو کیا یہ ان کو بھی امامت کا نااہل سمجھتے ہیں جبکہ ان کے علاتی بھائی جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کو بہت سے کاموں پر مامور فرمایا کرتے تھے حتیٰ کہ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے والد محترم آپ ہی کو لڑائیوں اور خطرناک کاموں کے لیے کیوں بھیجتے ہیں اور حسنین رضی اللہ عنہما کو اپنے پاس سے جدا نہیں کرتے آخر اس میں کیا راز ہے اس کا جواب انصاف پسند امام زادے نے اپنی شان شایان دیا اور فرمایا کہ ہمارے باپ کی اولاد میں جناب حسنین رضی اللہ عنہما ان کے لیے ایسے ہیں جیسے انسان کے لیے دو آنکھیں اور دوسری اولاد ان کے لیے ہاتھ پاؤں ہیں تو جب تک ہاتھ پاؤں سے کام نکل سکے آنکھوں کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت اور انسانی فطرت بھی یہی ہے کہ آنکھ پر کوئی آفت آئے تو بلا اختیار ہاتھ اس کی ڈھال بن جاتا ہے۔

طعن نمبر 5: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا

پانچواں اعتراض یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کے امور کا متولی بنایا اور پوری امت کا ان کو خلیفہ بنا دیا حالانکہ حضور ﷺ کے عہد مبارک میں وہ صرف ایک سال

1۔ الحاكم في المستدرك والطبراني في الأوسط، قال الهيثمي في مجمع الزوائد: «وفيه حماد بن عمر النصيبي وهو متروك»: 9/ 156.

2۔ عن أبي سعيد الخدري، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما من نبي إلا له وزيران من أهل السماء ووزيران من أهل الأرض، فأما وزيراي من أهل السماء فجبريل وميكائيل، وأما وزيراي من أهل الأرض فأبو بكر وعمر.(سنن الترمذى، 6/ 57، رقم: 3680، ط: المطبعة السلفية، القاهرة)

کے لیے صدقات کی وصولی پر مامور ہوئے تھے پھر اس خدمت سے معزول ہوئے اور پیغمبر علیہ السلام کے معزول کردہ کو پھر بحال کرنا اور خدمت سپرد کرنا پیغمبر علیہ السلام کی کھلم کھلا مخالفت ہے!

جواب: 1۔ یہ اوندھی منطق کسی انتہائی بے وقوف ہی کی طرف سے پیش کی جا سکتی ہے کہ حضرت عمر فاروق معزول کیے گئے یہ خود کہتے ہیں کہ ان کو وصولی صدقات کی خدمات ایک سال کے لیے سپرد کی گئی تھی جب انہوں نے یہ خدمت ایک سال تک انجام دے کر وہ کام سر انجام دے دیا اور اپنی ذمہ داری پوری کر دی تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ معزول کر دیے گئے اگر معزول اسی طرح ہوتا ہے تو کیا یہ لوگ بعض موت انبیاء وائمہ کو بھی معزول سمجھتے ہیں؟

2۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معزول ہی مانا جائے تو ان کی معزولی حضرت ہارون علیہ السلام جیسی ہو گی کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے واپس تشریف لائے تو یہ نیابت وخلافت سے سبک دوش ہو گئے لیکن پھر جب مستقل نبی ہوئے تو اس سبک دوشی نے آپ کی قابلیت ولیاقت امامت ونیابت میں کوئی نقص پیدا نہیں کیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں ایسا کیوں نہ سمجھا جائے جن کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا:

لو كان من بعدي نبي، لكان عمر [1] میرے بعد اگر کوئی اور نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔

معلوم ہوا کہ ان کے سبک دوشی ان کے لیاقت امامت وخلافت پر بالکل اثر انداز نہیں ہوئی۔

3۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت تو اس وقت لازم آتی کہ آپ اس کی ممانعت فرما دیتے اور پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ ان کو بر سر کار کرتے اور معاملہ ایسا ہے ہی نہیں اس لیے مخالفت لازم ہی نہیں آتی یہاں تو صورت یہ ہے کہ ایک کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سپرد نہیں فرمایا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے وہ ان کے سپرد کیا اگر مخالفت رسول کے یہ معنی ہوں کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا ہو وہ دوسرے نے کر دیا تو نعوذ باللہ پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نبرد آزما ہونا بھی مخالفت ہو گی۔

1۔ مسند الامام احمد بن حنبل، 28/ 624، رقم: 17405، ط: مؤسسة الرسالة

طعن نمبر 6: حضرت ابوبکر و عمر پر عمرو بن العاص اور اسامہ کا امیر بننا

یہ اعتراض ہے کہ حضور ﷺ نے جناب شیخین رضی اللہ عنہما پر جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرمایا اسی طرح حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ماتحتی میں دونوں حضرات کو دیا اگر یہ حضرات سرداری و ریاست کی قابلیت رکھتے یا ان میں افضلیت اور اولیت ہوتی تو ان کو سردار بناتے اور دوسروں کو ان کا ماتحت کرتے۔

جواب: اس طعن اور اعتراض کے رد میں کئی پہلوؤں سے گفتگو ہو سکتی ہے اور جواب دیا جا سکتا ہے۔

اول: ان حضرات کو امیر نہ بنانا ان کی عدم لیاقت اور عدم افضلیت کو ثابت کرتا ہے تو لامحالہ ان کو امیر بنانا ان کی قابلیت اور افضلیت کو ثابت کرے گا مگر پہلے تو ایک سوال در پیش ہے کہ کیا شیعہ حضرات عمرو بن عاص اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہما کے لیاقت امامت اور افضلیت کا اعتقاد رکھتے ہیں اور اسے ماننے کو تیار ہیں اگر ان کا جواب اس بات میں موجود ہو تو اہل سنت کو اس کے جواب کی ضرورت پڑے گی ورنہ نہیں۔

دوم: مفضول کو افضل پر امیر بنانا نا افضل میں کسی کوتاہی اور برائی کو ثابت کرتا ہے اور نہ مفضول میں افضلیت اور امامت کبریٰ کے لیے لیاقت پیدا کرتا ہے کیونکہ اکثر و بیشتر کسی خاص کام میں کسی کو سربراہ بنا دینا کسی خاص جزئی مصلحت پر مبنی ہوتا ہے یعنی وہ خاص کام مفضول ہی کے ہاتھوں انجام پا سکتا ہے افضل کا وہ شایان شان نہیں ہوتا جیسا کہ حضرت عمر بن عاص کی سربراہی میں ہوا کیونکہ وہ جوڑ توڑ اور حیلہ و تدبیر اور چکر دے کر کام نکالنے میں مشاق تھے اور مقصد بھی یہی تھا کہ جنگی چالوں اور حیلہ و تدبیر سے دشمن کو مات دی جائے اور اس کا قلع قمع کر دیا جائے ایک دوسری بات یہ بھی کہ وہ دشمنوں کی عیاریوں چالوں اور گھاتوں کو خوب سمجھتے اور ان کے پوشیدہ راستوں سے بخوبی واقف تھے جبکہ افضل حضرات اتنے واقف نہ تھے اس کی مثال ایسی ہے کہ چور پکڑنے یا راستہ کو خطرات سے پاک کرنے کے لیے محافظوں اور فوجداروں ہی کا انتخاب ہوتا ہے، امیر وغیرہ کے سپرد ایسی خدمات نہیں ہوتی یا کسی خاص کام کی سربراہی میں سربراہ کے لیے تسلی و تشفی مقصود ہوتی ہے جیسے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں کہ شامی اور رومی افواج کے ہاتھوں ان کے والد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ شہید ہو چکے تھے اس لیے ان کو اس مہم کا سربراہ بنایا گیا تاکہ اپنے ہاتھوں ان کا انتقام لیں اور یوں ان کے دل کو صبر اور قرار آئے۔

سوم: حضور ﷺ کا ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر جن کو ملت اسلام کی سربراہی کی مسند آراستہ

کرنی ہے اور ہزاروں لاکھوں ماتحتوں سے سابقہ پیش آتا ہے ان کو اس کی بھی تربیت ہو جائے کہ ماتحتی کے زمانہ میں کیا عالم ہوتا ہے کیا جذبات ہوتے ہیں کیا مراحل در پیش ہوتے ہیں اور اپنے سربراہوں کے ساتھ کیا معاملات پیش آتے ہیں زیر دستوں اور ماتحتوں کی کس طرح دیکھ بھال غور و پرداخت ہوتی ہے یہ ساری باتیں اسی وقت معلوم ہوتی ہیں جب آدمی خود بھی اس عالم سے گزرا ہو اور خود بھی کسی کا محتاط رہ چکا ہو تو گویا یہ تابعداری اور ماتحتی ایک مرحلہ تربیت و تعلم ریاضت و سلیقہ عبارت تھی تاکہ ایسے لوگوں کے جذبات و خیالات اور حالات سے واقفیت کی بنا پر آگے چل کر ان سے کام لینے یا ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوئی کمی و کوتاہی باقی نہ رہے۔

چنانچہ ان حضرات نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو تربیت پائی تھی اسی کا طفیل تھا کہ ہر دو حضرات رضی اللہ عنہما اپنے امراء اور اپنے لشکریوں کو ایسی خوش اسلوبی اور حسن انتظام کے ساتھ رکھتے تھے کہ جس سے بہتر سے بہتر انتظام اور اچھے ثمرات حاصل ہوتے تھے پیادہ سے لے کر کمانڈر تک اپنے امیر کا وفادار اور ان کے حکم کی بجا آوری میں ہمہ دم مستور اور مشتاق رہتا نہ امراء کے دماغ میں بغاوت و خود مختاری کے جذبات بھڑکتے، نہ لشکریوں میں اپنے فرائض سے غفلت رکاوٹ و سستی راہ پاتی یا بے رغبتی ظاہر ہوتی، نہ امیر اپنے لشکریوں پر ظلم و تعدی کرتے، نہ لشکری حکم عدولی کا تصور تک کرتے یا بغاوت کی سوچتے، رعایا امن چین سے تھی اور مطمئن زندگی گزارتی تھی، غنائم و فتوحات میں روز بروز اضافہ اور زیادتی تھی یہ حالات وواقعات واقفان فن سیرت پر روز روشن کی طرح عیاں ہیں اور اتنے ہی یقینی جیسے گزرا ہوا کل ایسے امور واقعہ میں شیعوں کی کوئی دھاندلی اور ایچ پیچ نہیں چلتی ان کا زور تو وہمی باتوں یا شیخ چلی کی گھاتوں میں ہی چلتا ہے کہ اگر یوں ہوتا خوب ہوتا اور یوں ہوتا تو بہتر ہوتا۔

طعن نمبر 7: حضرت ابو بکر نے آنحضرت کی مخالفت کرتے ہوئے عمر کو خلیفہ بنایا

اعتراض ہے کہ انتخاب خلیفہ میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز کے خلاف کیا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ بنایا جبکہ باوجود اس کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قطعی طور سے یہ جانتے تھے کہ کیا بات مسئلے حق ہے اور کیا فساد ہے اور پھر آپ کو اپنی امت سے جس قدر شفقت و مہربانی اور رافت تھی وہ بھی ظاہر ہے مگر اس سب کے باوجود آپ نے اپنی امت پر کسی کو خلیفہ نہیں بنایا۔

جواب: اول تو یہ بات سفید جھوٹ ہے اور بہتان کے ہاں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت پر کسی کو خلیفہ نہیں بنایا گیا

شیعہ یہ نہیں کہتے کہ حضور اکرم ﷺ نے جناب علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرمایا(یہ بغض ابو بکر رضی اللہ عنہ میں اتنے بدحواس ہوئے کہ اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مار لی اور بالواسطہ یہ مان گئے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کو بھی حضور ﷺ سے سند امامت حاصل نہیں کیونکہ کسی میں جناب امیر یقیناً شامل ہیں)لہٰذا اگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے مطابق میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کر دیا تو ان شیعوں کو تو یہ کہتے ہوئے شرمانا چاہیے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی مخالفت کی یہ جواب تو شیعہ معتقدات کی بنیاد پر ہے اور اگر گفتگو کی بنا معتقدات اہل سنت پر ہو تو محققین اہل سنت نماز وحج میں جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کے قائل ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو اپنے محبوب محمد ﷺ کے رمز شناس آپ کے کاموں کے دقیقہ سنج اور آپ کے اشاروں کے رازدان تھے ان کے لیے یہ اشارات کافی تھے اور جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے فیصلہ کو تحریری شکل صرف اس لیے دی کہ آپ کے پیش نظر یہ بات تھی کہ عرب وعجم کے نو مسلم تصریح وتخصیص کے اور بدوں وفاقی عہد نامے کے اس سے واقف نہ ہو سکیں گے۔

دوسرے آپ ﷺ کا صراحت کے ساتھ خلیفہ مقرر نہ کرنا اس بنا پر تھا کہ آپ ﷺ وحی ربانی اور الہام سبحانی سے بالیقین یہ جانتے تھے کہ آپ کے بعد جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی خلیفہ ہوں گے برگزیدہ اصحاب اس پر اتفاق کریں گے اور کسی دوسرے کو اس میں دخل اندازی کتاب ومجال نہ ہوگی چنانچہ اہل سنت کی کتب صحیحہ میں ایسی احادیث موجود ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں مثلاً "فأبى علي إلا تقديم أبي بكر"[1] آپ ﷺ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تقدیم کے سوا کوئی صورت قبول نہ کی، یا حدیث "ويأبى الله والمؤمنون إلا أبا بكر"[2] اللہ اور مسلمان ابو بکر کے علاوہ کسی کو قبول نہ کریں گے، یا حدیث " أنه الخليفة من بعدي "[3] میرے بعد وہی خلیفہ ہیں۔

1۔ عن علي قال: قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم: سألت الله أن يقدمك ثلاثا، فأبى إلا تقديم أبي بكر- (كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال، 12/ 515، رقم: 35680، ط: مؤسسة الرسالة)

2۔ صحيح مسلم، باب من فضائل ابى بكر الصديق، 4/ 1857، رقم: 2387، ط: دار إحياء التراث العربي بيروت

3۔ من حديث خيثمة بن سليمان القرشي الأطرابلسي، 1/ 101، ط: دار الكتاب العربي لبنان

جب یہ یقین تھا تو پھر خلیفہ بنانے اور عہد نامہ لکھنے کی کیا ضرورت رہ گئی تھی چنانچہ صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ مرض آخری میں آپ نے جناب ابو بکر اور ان کے صاحبزادے کو بلایا بھی تھا کہ اس سلسلہ میں ایک تحریر لکھوادیں مگر پھر فرمایا کہ جب اللہ تعالی اور مسلمان خود بخود سوائے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے کسی اور کو خلیفہ نہیں بنائے گئے اب لکھنے کی حاجت کیا ہے اس لیے آپ نے ارادہ ترک فرمادیا بخلاف جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے نہ آپ پر وحی اترتی تھی نہ آپ کو اس کا قطعی علم تھا نہ ہی قرائن سے اس کا پتہ چلا سکتے تھے کہ لوگ بلا شک وشبہ میرے بعد جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنالیں گے ہاں اپ اپنی سوجھ بوجھ سے یہ ضرور یقین رکھتے تھے کہ دین وملت کے لیے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت اصلح اور مفید ہوگی اس لیے یہ بات ان کے لیے بمنزلہ فرض ضروری تھی کہ جس بات میں امت کی بہتری اور صلاح ہے اس کو روبہ عمل لائیں، بحمد للہ آپ کی عقل سلیم نے صحیح کام کیا کہ شوکت دین انتظام امور سلطنت اور کافروں کی خواری حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں جس قدر ہوئی تاریخ عالم اس کی مثال میں نظیر پیش کرنے سے عاجز وقاصر ہے۔

تیسرے یہ کہ خلیفہ نہ بنانا ایک الگ بات ہے اور اس سے منع کرنا الگ بات مخالفت اس وقت تو ہوتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خلیفہ بنانے سے منع فرمادیتے اور جناب صدیق رضی اللہ عنہ اس کے باوجود خلیفہ مقرر فرماتے یہ روایت مخالفت کی نہیں ہے کہ جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ فرمایا وہ کام صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کرلیا اس تسلیم نہ کرنے کی صورت میں یہ لازم آتا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے جناب حسن رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لیے منتخب فرماکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت فرمائی ہو۔

طعن نمبر 8: ابو بکر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ میرے پیچھے شیطان لگا ہوا ہے

اعتراض کرتے ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کہتے تھے "إن لي شيطانا يعتريني فإن استقمت فأعينوني، وإن زغت فقوموني"[1] میرے ساتھ ایک شیطان لگا ہوا ہے اگر میں سیدھا چلوں تو میرا ہاتھ بٹاؤ اور اگر

1۔ الطبقات الكبرى لابن سعد وتاريخ الطبري. ورواية ابن سعد عن الواقدي وهو ضعيف بإجماع المحدثين، أما الطبري فرواها عن شعيب بن إبراهيم كاتب سيف بن عمر قال الذهبي عنه: (فيه جهالة). ميزان الاعتدال: 3/ 377؛ أما سيف بن عمر فحاله ليس بأحسن من حال الواقدي. فهذه رواية لا تصلح للاحتجاج ضعيفة الإسناد.

ٹیڑھے راستے پر چلوں تو مجھے سیدھا کر دو، اور جس کے پیچھے شیطان لگا ہوا ہو اور اسے راہ بھٹکا دے وہ امامت کے قابل نہیں۔

جواب: اول یہ ہے کہ یہ روایت اہل سنت کی معتبر کتابوں کی رو سے صحیح نہیں اس لیے ایسی روایت سے ان کو الزام نہیں دیا جا سکتا بلکہ جو صحیح روایت ثابت شدہ ہے وہ اس کے خلاف ہے وہ یہ کہ اپنی وفات کے وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بلا کر جو وصیت فرمائی وہ یہ تھی:

واللہ ما نمت فحلمت، وما شبهت فتوهمت، وإني لعلى السبيل ما زغت، ولم آل جهدا. وإني أوصيك بتقوى الله تعالى[1]

بخدا میں نہیں سویا کہ خواب پریشان دیکھتا نہ شبہ میں پڑا کہ توہمات میں الجھتا میں یقیناً سیدھے راستے پر ہوں بہکا نہیں میں نے کوشش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور میں تم کو بھی اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں۔

البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اور مسئلہ خلافت طے ہونے پر آپ نے پہلا خطبہ جو دیا وہ یہ تھا:

"اے رسول کے ساتھیو! میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ تو ہوں لیکن دو باتوں کی مجھ سے ہرگز امید نہ رکھنا ایک وحی کی دوسرے شیطان سے عصمت کی"

آپ کا یہ خطبہ مسند امام احمد اور اہل سنت کی دوسری کتب میں موجود ہے اس خطبہ کے آخر میں یہ بھی ہے کہ:

"میں معصوم نہیں ہوں پس تم پر میری اطاعت انہی امور میں فرض ہے جو خدا کی شریعت اور پیغمبر کی سنت کے موافق ہوں ان کے خلاف اگر میں کچھ کہوں تو اسے نہ مانو بلکہ مجھے ٹوکو"[2]

1۔ ابن عساكر في تاريخ دمشق: 30/ 415.

2۔ «يا أصحاب الرسول أنا خليفة الرسول فلا تطلبوا مني الأمرين الخاصين بالنبي صلى الله عليه وسلم: الوحي والعصمة من الشيطان» ... وفي آخرها: «إني لست معصوما فإطاعتي فرض عليكم فيما وافق الرسول وشريعة الله تعالى من أمور الدين، ولو أمرتكم بخلافها فلا تقبلوه مني ونبهوني عليه».(مسند امام احمد بن حنبل،

اور یہ وہ عقیدہ ہے جس پر سارے مسلمانوں کا اتفاق ہے جو سراسر انصاف پر مبنی ہے چونکہ لوگ ریاست پیغمبر کے عادی تھے اور اپنی ہر مشکل وحی الٰہی کی طرف رجوع کر کے حل کرتے تھے اور پیغمبر کی معصومیت کے سبب آپ ﷺ کی ہر بات بے چوں وچرا قبول کیا کرتے تھے اس لیے اب بدلے ہوئے حالات میں خلفائے رسول ﷺ کے لیے یہ ضروری تھا کہ لوگوں کو یہ بتائیں کہ یہ دونوں خصلتیں پیغمبر کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں انہی میں پائی جاتی ہیں ان کے علاوہ کسی میں نہیں چاہے وہ ان کا نائب ہو اور نائب چاہے خود رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا ہو یا امت نے انہیں اپنا امیر اور نائب رسول منتخب کیا ہو۔

دوسری بات یہ کہ کلینی میں جناب صادق رحمہ اللہ سے بطریق صحیح روایات صحیح موجود ہیں:

"کہ ہر مومن کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے جو اس کو بہکانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے"[1]

حضور ﷺ کی ایک صحیح حدیث میں یہ ارشاد بھی ملتا ہے:

"ما منكم من أحد إلا وقد وكل به قرينه من الجن" تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے ساتھ ایک جن مصاحب مقرر نہ کیا ہو صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ کا بھی کوئی شیطان ساتھی ہے آپ ن ﷺ ے ارشاد فرمایا ہاں ہے تو پر اللہ تعالیٰ نے اس پر مجھے غلبہ دے دیا ہے اس لیے میں اس کے شر سے بچا رہتا ہوں۔[2]

اب قابل غور بات یہ ہے کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ یہ معاملہ ہے اور اس کی وجہ سے کار و منصب نبوت میں کوئی فرق نہیں پڑتا تو جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت و امامت میں کیوں فرق پڑے گا کیونکہ خلیفہ و

---

1 ۔ ولفظه: «ما من مؤمن إلا وقد وكّل به أربعة شيطانا يغويه يريد أن يضله، وكافرا يغتاله، ومؤمنا يحسده وهو أشدهم عليه، ومنافقا يتتبع عثراته». الكافي: 2/ 251.

2 ۔ عن عبد الله بن مسعود، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «ما منكم من أحد، إلا وقد وكل به قرينه من الجن» قالوا: وإياك؟ يا رسول الله قال: «وإياي، إلا أن الله أعانني عليه فأسلم، فلا يأمرني إلا بخير». (صحيح مسلم، باب تحريش الشيطان وبعثه سراياه لفتنة الناس وأن مع كل إنسان قرينا، 4/ 2167، رقم:2814، ط: دار إحياء التراث العربي بيروت)

امام کا متقی ہونا ضروری ہے اور شیطانی خطرہ متقی کو بھی دامن گیر رہتا ہے لیکن تقوی کی برکت سے وہ شیطان کی چالوں کو بھانپ جاتا ہے اور اس کے دام میں آنے سے بچ جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ(1)

بے شک وہ لوگ جو متقی ہیں جب انہیں شیطان کی طرف سے وساوس پیش آتے ہیں تو وہ فورا متنبہ ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

ہاں اس شخص کے خلافت و امامت کو ضرور نقصان پہنچتا ہے جو شیطان سے مات کھا جائے اور اس کے پیچھے لگ جائے اپنی لگام اس کے ہاتھ میں دے دے اور جو وہ کہے کرے، اور پھر توبہ تلا کر کے تلافی بھی نہ کرے ارشاد ربانی ہے:

وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُونَ(2)

اور شیطان کے چیلے گمراہی میں گھسیٹے لیے جاتے ہیں پھر وہ کوئی کمی نہیں چھوڑتے۔

اور یہ مرتبہ ہے فسق و فجور کا جو لیاقت امامت و خلافت میں بالاجماع یقینا خلل انداز ہوتا ہے۔

تیسرے اگر جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایسا فرمایا بھی ہو تو اس کے باوجود آپ کے منصب خلافت و امامت میں کوئی فرق نہ آئے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے کیونکہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جو بالاجماع خلیفہ برحق ہیں اپنے ساتھیوں سے برملا اسی قسم کا کلام فرمایا کرتے تھے آپ کے یہ اقوال خود شیعوں کی اصح الکتب نہج البلاغہ میں موجود ہیں ایک قول آپ کا اسی کتاب کے اوراق ماسبق میں ملاحظہ کر چکے ہیں یعنی:

فلا تكفوا عن مقالة بحق أو مشورة بعدل، فإني لست في نفسي بفوق أن أخطئ ولا امن من ذلك في فعلي (3)

1۔ سورة الاعراف، الاية: 201

2۔ سورة الاعراف، الاية: 202

3۔ نهج البلاغة، 2/ 201، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

حق بات کہنے اور صحیح مشورہ دینے سے باز نہ رہو کیونکہ میں خطا کے صدور سے بالاتر نہیں ہوں اور نہ اپنے کاموں میں اس کے سرزد ہونے پر مطمئن ہوں۔

اور پھر اس سے کس کو انکار کی مجال ہے کہ شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکایا اور ان کے ذریعہ اپنا مقصد میں کامیاب ہوا تھا ان کے بہکاوے میں آنے کے سبب سے ہی تو آپ جنت سے اس خاکدان تیرہ و تار میں بھیج دیئے گئے تھے، حالانکہ وہ خلیفہ تھے اور خلیفہ رسول بھی نہیں بلکہ خلیفۃ اللہ تھے ان کے پاس تو "إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً"[1] کی خدائی سند بھی تھی، اور کون حضرت داؤد علیہ السلام کے خلیفہ فی الارض ہونے سے منکر ہوگا کہ وہ خلافت پر "إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ"[2] کی دلیل قاہر رکھتے تھے، پھر وہ بھی شیطان کی وجہ سے اوریا کی بیوی کے معاملہ میں کتنے پریشان ہوئے بالآخر تنبیہ الٰہی کا نشانہ بنے اور توبہ استغفار کی نوبت آئی اور کیا کہیں گے اوراد خوان شیعہ جنہوں نے جناب سجاد علیہ السلام کا صحیفہ کاملہ دیکھا ہوگا آپ کی دعا گوش ہوش سے سنی ہوگی کہ آپ اپنے لیے کیا ارشاد فرما رہے ہیں:

"قد ملك الشيطان عناني في سوء الظن وضعف اليقين، فأنا أشكو سوء مجاورته لي، وطاعة نفسي له"[3]

بدگمانی اور یقین کی کمزوری کے معاملہ میں شیطان میری باگ پر قابض ہو گیا اور میں اس کے برے پڑوس اور اپنے نفس کے اس کے پیچھے لگ لینے کی شکایت کرتا ہوں۔

اور اب دونوں حضرات کی عبارات کو میزان عدل میں تول لیجیے ایک پلڑے میں جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے الفاظ "يعتريني" اور "ان زغت" کو رکھیے اور دوسرے میں جناب سجاد علیہ السلام کے "ملك عناني و طاعة

1۔ سورة البقرة، الاية: 30

2۔ سورة ص، الاية: 26

3۔ الصحيفة السجادية، ص: 172، ط: مؤسسة الإمام المهدي عليه السلام

نفسي "رکھیے اور اسی کے ساتھ اس قضیہ حملیہ کو بھی پیش نظر رکھیے جو آپ کے کلام میں واقع ہے جو نسبت بالجزم بین الطرفین سے وقوع طرفین پر دلالت کرتا ہے (یعنی آپ کے کلام سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کی باگ شیطان نے قبضہ میں لے لی تھی اور آپ کا نفس اس کی پیروی کرنے لگا تھا)

دوسری طرف جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قضیہ شرطیہ بھی قابل لحاظ ہے "ان زغت" جو وقوع طرفین کا ہرگز متقاضی نہیں (یعنی آپ بطور شرط فرما رہے ہیں کہ اگر میں کجرو ہو جاؤں اور کجرو ہو جاؤں اور کجرو ہو گیا میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے وہ معمولی فہم و شعور رکھنے والے سے بھی پوشیدہ نہیں) اور یہاں یہ بات بھی سمجھ لینا چاہیے کہ صرف شیطان کے گھات میں لگنے سے کیا نقص و نقصان ہے جبکہ وہ مقصد میں ناکام رہے (اگر آپ کی جیب محفوظ ہے تو کسی جیب تراش کے پیچھے لگنے سے آپ کا کیا نقصان ہے) بلکہ یہ تو فضیلت و تعریف کی بات ہے (کہ آپ اتنے بیدار اور چوکرنے اور اس کے حربوں سے اتنے واقف تھے کہ وہ عمر بھر سر پٹکتا رہا مگر آپ کو انگلی تک نہ لگا سکا آپ پر قابو پانا تو دور کی بات ہے) اور آخر میں سورہ یوسف میں 13 پارہ کی پہلی آیت کے یہ حصہ اور دیکھ لیجئے:

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي [1]

میں اپنے نفس کو بریٔ الذمہ نہیں کرتا وہ تو بے شک بری باتوں ہی کا حکم دینے والا ہے ہاں یہ کہ میرا رب رحم فرمائے۔

تقاضہ دین و دیانت تو یہی ہے کہ اس ایت کی موجودگی میں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے صرف اس کلمہ کے باعث آپ کو منصب خلافت سے نہیں گرانا اور اس کو موجب طعن و اعتراض نہ بنانا چاہیے۔

(مگر ہم کو ان سے وفا کی ہے امید............... جو نہیں جانتے وفا کیا ہے)

طعن نمبر 9: بیعت ابی بکر بغیر غور و فکر کے اچانک ہوئی

نواں اعتراض یہ ہے کہ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا "ألا إن بيعة أبي

1۔ سورة يوسف، الآية: 53

بکر کانت فلتة وقي الله المؤمنين شرها، فمن عاد بمثلها فاقتلوه"[1] بے شک ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت اچانک تھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس کے ضرر سے بچا لیا اب اگر دوبارہ کوئی ایسا کرے تو اسے قتل کر دو، صحیح بخاری کی روایت کے گو الفاظ مختلف ہیں مگر مطلب ان کا بھی یہی ہے لہذا یہ روایت صریح طور پر یہ ثابت کرتی ہے کہ جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت اچانک بے مشورہ اور بے تامل عمل میں آئی اور بغیر اس کے کہ ان کی بیعت کے اسباب پر روشنی ڈالی جاتی کوئی دلیل دی جاتی ان کو خلیفہ بنا دیا گیا گویا آپ کی خلافت کی کوئی بنیاد نہیں تھی اور یوں آپ خلیفہ برحق نہ ہوئے۔

جواب: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایک صاحب یہ کہتے تھے کہ عمر رضی اللہ عنہ اگر مر گئے تو میں فلاں شخص سے بیعت کر کے اس کو خلیفہ بناؤں گا جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بھی تو شروع میں ایک دو حضرات نے بیعت کی تھی اور خلیفہ ہو گئے تھے اور پھر سارے مہاجرین و انصار ان کے پیچھے ہوئے صحیح بخاری میں بھی یہ بات مذکور ہے تو دراصل جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا مذکورہ بالا کلام اس شخص کے جواب میں تھا اور اس سے آپ یہ بتانا چاہتے تھے کہ ایک دو آدمیوں کی اچانک بیعت بغیر غور و فکر اور ارباب حل و عقد سے مشورہ کے درست اور صحیح نہیں اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں جو ہوا وہ اگرچہ اچانک اور بلا رائے و مشورہ ہوا تھا مگر نتیجہ وہ متمکن و برقرار رہے اور لوگوں نے اسے قبول کر لیا گویا حق بحق دار رسید کا معاملہ ہوا اور کوئی ناحق بات نہیں ہوئی۔

رہا آپ رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں دلائل کا سوال وہ تو پہلے سے موجود تھے مثلاً نماز کی امامت سپرد کرنا اور دوسرے حالی مقالی قرائن جو ان معاملات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ برتتے تھے اور جن سے تمام صحابہ

---

1 ـ ليس في الصحيح اقتلوه؛ فالحديث أخرجه البخاري عن ابن عباس أن عمر بن الخطاب قال: «... ثم إنه بلغني أن قائلا منكم يقول والله لو قد مات عمر بايعت فلانا فلا يغترن امرؤ أن يقول إنما كانت بيعة أبي بكر فلتة وتمت ألا وإنها قد كانت كذلك ولكن الله وقى شرها وليس فيكم من تقطع الأعناق إليه مثل أبي بكر من بايع رجلا من غير مشورة من المسلمين فلا يتابع هو ولا الذي تابعه تغرة أن يقتلا ...» (صحيح البخاري، باب رجم الحبلى من الزنا إذا أحصنت،8/ 168، رقم: 6830، ط: دار طوق النجاة)

بی ﷺ پر آپ کی افضلیت ثابت ہوتی تھی ان امور کی وجہ سے کسی دوسرے آدمی کو آپ رضی اللہ عنہ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اگر کوئی دوسرا ایسا کرے تو اسے قتل کر دینا چاہیے کہ اس نے معروف طریقہ انتخاب کو جو واجب ضروری ہے نظر انداز کیا اور مسلمانوں میں فتنہ و فساد کا سبب بنا۔

جناب فاروق رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا کلام سے شیعوں نے دانستہ ایک جملہ نقل نہیں کیا کہ کہیں ان کے اعتراض کی کمزوری ظاہر نہ ہو جائے آپ رضی اللہ عنہ نے آخر میں "وایکم مثل أبي بکر "تم میں سے کوئی ابو بکر کا ہمسر ہے، کہ ان سے افضلیت و نیکی و بھلائی میں بڑھا ہوا ہو اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ اس کے حق میں بھی مشورہ غور و فکر کی حاجت نہیں پس معلوم ہوا کہ آپ کے الفاظ "وقي الله شرها" کہ یہی معنی ہے کہ سقیفہ بنی سعدہ میں گو آپ کی خلافت میں عجلت کی گئی مگر اللہ تعالیٰ نے اس عجلت کے ضرر سے مسلمانوں کو بچا لیا اور یہ عجلت ہی رفع فساد کا سبب بن گئی اور جو خطرہ درپیش تھا وہ وہ میں نہ آ سکا یہ معلوم ہی ہے کہ حضور ﷺ کے وصال کے بعد نیابت کے سلسلے میں انصار مدینہ رضی اللہ عنہم چاہتے تھے کہ یہ منصب انصار کے پاس آئے اس وقت اگر گفتگو بحث و تمحیص اور مشاورت کی راہ اختیار کی جاتی تو حالات بے قابو ہو جاتے۔

یہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی بیدار مغزی روشن ضمیری اور دانائی تھی کہ آپ نے فتنہ کے سدباب کے لیے وہ راہ اختیار کی کہ بعد میں موافق و مخالف سب نے اسے محسوس کیا اسی کو راہ ثواب مانا اور رضا و رغبت سے اس کو قبول کیا اور برقرار رکھا کسی نے اسے ناحق نہیں کہا اور نہ کسی کے خیال و وہم میں یہ بات آئی کہ اس منصب پر کوئی نااہل مقرر کر دیا گیا ہے۔

اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اس قول بالا سے یہ مراد تو ہرگز نہ تھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت صحیح نہ تھی کسی ناگزیر صورت سے بچنے کے لیے اس کو قبول کیا گیا یا ان کے خلافت درست نہیں تھی کیونکہ سب سے پہلے بیعت کرنے والے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور جناب ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ دونوں ہی تھے دوسروں نے پھر اس کے بعد بیعت کی، بیعت کے وقت ان دونوں حضرات نے کہا تھا "انت خیرنا وافضلنا "آپ ہم میں سے

بہترین اور افضل ترین ہیں،[1] اور کسی بھی مہاجر یا انصاری نے اس جملہ کو نہیں جھٹلایا بلکہ تسلیم کیا اس کا صرف ایک ہی مطلب ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جناب صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت، نیکی و بھلائی مسلم اور قطعی الثبوت تھی اور انصار رضی اللہ عنہم کا اختلاف بھی صرف اس بات پر تھا کہ خلیفہ انصار میں سے بھی ہونا چاہیے۔ اس پر نہ ان کو اعتراض تھا نہ خلاف کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلافت کے لائق نہیں۔

چنانچہ اہل سنت کی صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ جناب سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے اس مجلس کے بعد آپ سے بیعت کر لی تھی اور خود جناب علی مرتضیٰ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی نہ صرف بیعت فرمائی بلکہ ابتدا میں عدم بیعت کا عذر بھی بیان فرمایا اور شکایت بھی کی کہ ہم سے مشورہ کیوں نہ لیا گیا اور جب جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے صورتحال کا تجزیہ کر کے بتایا کہ انصار کی پرخاش اور حالات کو دگرگوں ہونے سے بچانے کی خاطر یہ عجلت کی گئی تو ان دونوں حضرات نے اس کی تدبیر کی تحسین فرمائی اور اسے بھی مان لیا،[2] اہل سنت کے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم میں یہ قصہ بطور تواتر اسی طرح منقول و مشہور ہے۔

اور اگر ان شیعوں کو جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ کے متعلق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ قول دلیل کے طور پر بہت پسند ہے تو تقاضائے شرافت و انصاف ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے وہ تمام اقوال جو جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ذات یا خلافت کے بارے میں آپ نے فرمائے ہیں وہ بھی قبول کریں انہیں سامنے رکھ کر موازنہ کریں کہ اس قول کو باقی اقوال سے کیا نسبت ہے؟ ایسی عجیب بات یہ اعجوبہ فرقہ ہی کہہ سکتا ہے جناب فاروق رضی اللہ عنہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے معتقد نہ تھے اور اسے درست نہ سمجھتے تھے۔

1۔ أي حين اجتمعنا في منزل رسول الله ﷺ ولم يجتمع الأنصار. وفي نسخة (من خيرنا) أي أبو بكر رضي الله عنه. (هامش صحيح البخاري، باب رجم الحبلى من الزنا إذا أحصنت،8/ 168، رقم: 6830، ط: دار طوق النجاة) ويدل عليه أن عمرا وأبا عبيدة قالا له: «أنت خيرنا وأفضلنا»، فلم ينكر عليهما أحد من المهاجرين والأنصار. تاريخ الطبري: 2/ 134؛ البداية والنهاية: 5/ 246.

2۔ ثم قام على فعظم من حق أبي بكر وذكر فضيلته وسابقته ثم قام إلى أبي بكر فبايعه (كشف الغمة في معرفة الأئمة، 2/ 103، ط: دار الأضواء بيروت لبنان)

طعن نمبر 10: ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا علی رضی اللہ عنہ کے ہوتے میں بہتر نہیں

دسواں اعتراض یہ ہے کہ جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ "إني لست بخير منكم وعلي فيكم"[1] علی (رضی اللہ عنہ) کی موجودگی میں میں تم میں کا اچھا نہیں ہوں، اگر وہ اس قول میں سچے تھے تو قابل امامت نہ ہوئے کہ افضل کے ہوتے ہوئے مفضول لائق امامت نہیں اور اگر ان کا قول یہ جھوٹ تھا تو ویسے قابل امامت نہ رہے کہ جھوٹ فسق ہے اور فاسق امام ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ روایت اہل سنت کی کسی کتاب میں بھی موجود نہیں نا طریق صحیح نہ بطریق ضعیف اب پہلے تو وہ اہل سنت کی کسی کتاب سے یہ روایت کھوج کھاج کے لائیں اور پھر جواب مانگیں شیعوں کے من گھڑت غلط سلط روایات کا سہارا لے کر اہل سنت پر الزام لگانا نہ صرف انتہائی نادانی ہے بلکہ ایک قسم کا سفلہ پن بھی ہے۔

دوسری بات یہ کہ چلو شیعوں کے دلداری میں ہم اسے مان لیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ جناب سجاد رحمہ اللہ نے اپنے صحیفہ کاملہ میں جو شیعوں کے نزدیک متعدد صحیح و معتبر طریقوں سے مروی ہے یوں فرماتے ہیں "أنا الذي أفنت الذنوب عمره"[2] میں وہ شخص ہوں جس کی تمام عمر گناہوں میں گزری۔

اب اگر آپ کا قول سچا ہے تو امامت کے قابل نہ رہے کیونکہ مرتکب کبیرہ گناہ فاسق امامت کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اگر اس قول میں جھوٹے ہیں تو بھی امامت کے لائق نہ رہے کہ جھوٹ فسق ہے اور فاسق میں امامت کی صلاحیت نہیں اب شیعہ حضرات اس کا جواب دیں اہل سنت کی طرف سے وہی جواب اپنے اعتراض کا سمجھ لیں۔

جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے متعلق روایت بالا میں بعض شیعہ علماء نے یہ الفاظ اضافہ کیے ہیں کہ آپ

1۔ ليست في كتب السنة بل من موضوعات الشيعة: أوردها ابن شاذان، الفضائل: ص 132؛ المفيد، الفصول المختارة: 1/ 246؛ ابن طاوس، الطرائف: 2/ 402؛ ابن مطهر الحلي، نهج الحق: ص 264.

2۔ الصحيفة السجادية، ص: 100، ط: مؤسسة الإمام المهدي عليه السلام

رضی اللہ عنہ نے "أقيلوني أقيلوني"[1] بھی فرمایا جس کے معنی ہیں کہ اپنی بیعت مجھ سے واپس لے لو گویا آپ خلافت سے استعفیٰ دے رہے ہیں اور جو امامت سے استعفیٰ دے وہ امامت کے قابل نہیں ہوگا اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس قول بالا کے ساتھ ساتھ شیعوں کا یہ اعتقاد بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رسالت پر نبوت سے استعفیٰ دے دیا اور یہ نبوت حضرت ہارون علیہ السلام کو سنبھلوا دی ایسی صورت میں اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا خلافت سے استعفیٰ مان بھی لیا جائے تو وہ موسیٰ علیہ السلام کے استعفیٰ کی طرح ہوگا بلکہ اس سے ہلکا ہی ہوگا کیونکہ نبوت پر اس حالت پر تو براہ راست اللہ تعالیٰ کے حکم سے فائض ہوئے تھے اس لیے اس سے استعفیٰ زیادہ قبیح اور برا ہے، اس کے مقابلہ میں خلافت سے استعفیٰ میں کیا برائی رہ جائے گی جبکہ خود شیعوں کے بقول یہ خلافت لوگوں نے مصلحت وقت کے تحت آپ کو دے دی تھی اور یہ حق بھی نہ تھی خدا نے تو ان کو مامور نہیں فرمایا تھا اور جو ریاست لوگوں کی سپرد کردہ ہو اس کو قبول کرنا اور ہمیشہ اس پر فائض رہنا ضروری بھی تو نہیں اور جن مسائل یعنی انصار مدینہ کی پرخواست کا دفیہ مرتدین کا قلع قمع اور مدینہ النبی کو اعراب کی شورش سے بچانا کی وجہ سے یہ خدمت امامت سپرد ہوئی تھی جب خاطر خواہ ان میں کامیابی ہو چکی اس وقت استعفیٰ میں قباحت کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔

پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ امامت و خلافت کی ذمہ داریوں کے بوجھ و مشقت کو بلحاظ دنیا و آخرت برداشت کر لینا کوئی ہنسی کھیل بھی نہیں جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مصالح امت کے پیش نظر یہ گراں باری برداشت کر لی تھی فتنوں کے فروغ ہو جانے اور امن چین کے بعد اگر انہوں نے چاہا کہ اپنا بوجھ ہلکا کریں اور کسی دوسرے کے کاندھے پر یہ بوجھ ڈالیں اور خود آزادی کی زندگی بسر کریں تو یہ موجب طعن کیوں ہو شیعہ روایات

---

1 ـ الرواية عن أبي الجحاف داود بن أبي عوف قال: «لما بويع أبو بكر أغلق بابه ثلاثا يقول: أيها الناس أقيلوني بيعتكم، كل ذلك يقول له علي: لا نقيلك ولا نستقيلك، قدمك رسول الله صلى الله عليه وسلم». فضائل الصحابة لأحمد بن حنبل: 1/ 151 ووردت في كتاب الإمامة والسياسة المنسوب لابن قتيبة، وهو ليس له كما أثبت المحققون، وفي سندها تليد بن سليمان، قال عنه ابن معين: ليس بشيء كذاب، وقال أبو داود: رافضي خبيث يشتم أبا بكر وعمر (ميزان الاعتدال: 2/ 77). فالرواية من وضعه. أما زيادة: «وعلي فيكم» فليست في شيء من كتب أهل السنة

کے مطابق تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بے طمعی ظاہر ہوتی ہے کہ آپ کو خلافت میں امامت کا کوئی لالچ نہیں تھا آپ تو اسے اپنے سر سے ٹالنا چاہتے تھے مگر لوگ ہی اس پر راضی نہ تھے عام و خاص سب ہی اس منصب کو آپ سے متعلق رکھنے پر مصر تھے یہ بات نہ ہوتی تو آپ کی زبان پر یہ الفاظ کیوں آتے ورنہ اقتدار و ریاست تو وہ چیز ہے کہ چھوٹوں بھی کسی کو مل جائے تو مر کر بھی اسے چھوڑنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہو اس کے لیے تو لوگ قریبی تعلق اور رشتوں تک کو قربان کر دیتے ہیں بڑی سلطنت ریاست کی بات رہی الگ ایک گاؤں کی جاگیر بھی ہو تو بھی کوئی اپنی مرضی سے اسے چھوڑ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا چہ جائے کہ ایسی ریاست جو آپ کو حاصل تھی اور دنیا و آخرت کے اعزاز کی حامل تھی اس کو چھوڑنے اور دوسروں کو دے دینے پر آمادہ ہونا تو آپ کی انتہائی بے طمعی اور زہد کا نتیجہ تھا۔

اور حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے متعلق تو خود شیعوں کے معتبر کتابوں اور صحیح روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شہادت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد آپ خلافت کا منصب سنبھالنے پر تیار نہ تھے لوگوں کی انتہائی اصرار اور مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہ کے بہت زور دینے پر آپ نے اسے قبول فرمایا،[1] تو اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی لوگوں کی محبت جانچنے اور اپنی خدمات پر لوگوں کے تاثرات و پسندیدگی معلوم کرنے کے لیے ایسا کیا ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اور اس سے آپ کے منصب خلافت میں کون سا نقص و قصور ہے۔

طعن نمبر 11: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پیغام رساں بنا کر پھر منع کر دیا

گیارواں طعن یہ ہے کہ سورۃ براءت جب نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ مکہ جاؤ اور حج کے اجتماع میں لوگوں کو یہ سورۃ سناؤ پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور کہا کہ سورۃ براءت سنانے کی خدمت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کیجئے کہ یہ جا کر سنائیں چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے روانہ کیا اور فرمایا کہ ان سے براءت تم

1۔ رووا عن علي رضي الله عنه أنه قال للناس بعد أن قتل عثمان رضي الله عنه: «دعوني والتمسوا غيري فأنا لكم وزيرا خير مني لكم أميرا»، ثم قال: «اتركوني فأنا كأحدكم، بل أنا أسمعكم وأطوعكم لمن وليتموه أمركم فأبوا عليه وبايعوه». نهج البلاغة (بشرح ابن أبي الحديد): 1/ 169، 170.

لے لو اور جا کر اہل مکہ کو سناؤ، پس جو شخص سے ایک حکم قرآنی کی ادائیگی کی قابلیت نہ رکھتا ہو اس کو تمام مخلوق کے حقوق کی ادائیگی پر یا پوری شریعت اور قرآن کی احکام رسانی پر کس طرح امین ٹھہرایا جا سکتا ہے اور اس کو امام مانا جا سکتا ہے؟

جواب: اس روایت میں عجیب خلط ملط یا گڑبڑ ہے اس کی بڑی اچھی مثال یہ شعر ہے:

چہ خوش گفتہ است سعدی در زلیخا　　　الا یا ایھا الساقی ادر کاسا وناولھا

(مطلب یہ ہے کہ زلیخا نامی کتاب میں الا یا ایھا ...الخ والا مضمون شیخ سعدی نے بہت خوب کہا ہے مگر نہ زلیخا سعدی کی کتاب ہے اور نہ دوسرا مصرا اس میں ہے یہ حافظ شیرازی کا مصرعہ ہے جو دیوانے حافظ میں ایک غزل کا مصرعہ اولی ہے)

یا اس کی مثال اس فتوی کی طرح ہے جو مشہور ہے کہ خشن خشین معاویہ رضی اللہ عنہ کی تین لڑکیوں کا کیا حکم ہے اس اشارہ و کنایہ سے قطع نظر اس معاملہ کی تفصیل ملاحظہ ہو کے اہل سنت کی روایات اس بارے میں مختلف ہیں اکثر روایات اس مضمون کی ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نیابت کے طور پر امیر حج مقرر فرما کر روانہ کیا تھا اس وقت سورہ برات نازل نہیں ہوئی تھی آپ کی روانگی کے بعد یہ سورت نازل ہوئی جس میں مشرکین کے نقض عہد کا ذکر ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ سورت دے کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے روانہ فرمایا کہ ان تازہ احکامات کو بھی لوگوں تک پہنچائیں اب بھلا اس سے کہاں معلوم ہوا کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کو معزول کیا گیا، میں بلکہ یوں کہنا صحیح ہو گا کہ دو کاموں کے لیے دو حضرات کو نامزد فرمایا ان روایات سے شیعوں کے تمسک کی گنجائش کہاں رہی کیونکہ تمسک کا دارومدار تو جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے معزول ہونے پر ہے اور جب اس کام کے لیے ان کا ذکر اور ہوا ہی نہیں تو عزل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور بیضاوی، مدارک، زاہدی، تفسیر نیشاپوری، جذب القلوب اور مشکوۃ کی شروح میں اس روایت کو اختیار کیا ہے اور اہل حدیث کے نزدیک بھی یہی قابل ترجیح ہے اور تفسیر معالم، تفسیر حسینی، معارج روضۃ الاحباب حبیب السیر اور مدارج میں یوں مذکور ہے کہ:

اول حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اس سورت کی تبلیغ و تلاوت کا حکم فرمایا تھا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو

اس کے لیے نامزد فرمایا اس میں دو احتمال ہیں اول یہ کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو معزول فرما کر ان کی جگہ جناب علی رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا۔

دوم یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کا شریک کار بنایا کہ دونوں مل کر اسے انجام دیں چنانچہ روضۃ الاحباب، بخاری و مسلم اور دوسرے تمام محدثین کی روایات اس دوسری صورت کی روایات کو قوی بتاتی ہیں کیونکہ ان سب نے اتنی بات متفقہ طور پر روایت کی ہے کہ یوم النحر کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی متعین کردہ جماعت کے ساتھ جا کر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ اعلان و منادی کا حکم دیا تھا کہ " لا يحج بعد العام مشرك، ولا يطوف بالبيت عريان "[1] اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لیے نہیں آئے گا اور نہ کوئی ننگا ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرے گا، یہ روایت بتا رہی ہے کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ معزول نہیں ہوئے تھے ورنہ دوسرے کے فرائض میں مداخلت نہ کرتے اور نہ اعلان کنندہ کا تقرر کرتے لہٰذا اس شق میں عزل ثابت نہ ہوں گے سب شیعوں کو اس کا حوالہ دینے کا حق نہیں پہنچتا اب رہا احتمال اول کے آپ کا فرمان "لا يؤدي عني إلا رجل مني "[2] میرے ذمہ کی چیز کو وہی شخص ادا کرے گا جو مجھ سے ہو گا، بظاہر اس احتمال کو تقویت دیتا ہے۔

نیز نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ سورت برأت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے لے کر تم پڑھو تو اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ کا معزول کرنا بے لیاقتی یا عدم قابلیت پر مبنی صحیح نہیں تھا اس لیے کہ بالاجماع یہ بات ثابت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ امیر الحج بدستور تھے اس منصب سے آپ معزول نہیں ہوئے تھے تو آپ رضی اللہ عنہ میں جب حج کی سرداری کی لیاقت تھی جس میں ہزاروں مسلمانوں کی اصلاح مد نظر ہوتی ہے، اور جس میں بہت سے احکام و فرائض کی ادائیگی سے سابقہ پڑتا ہے خطبات دیئے جاتے ہیں، بے شمار مسائل لکھائے جاتے ہیں اور گونا گوں نوع بنوع معاملات پیش آنے پر بر وقت فتویٰ صادر کرنے پڑتے ہیں جس کے لیے بہت ہی زیرکی اور سوجھ بوجھ اور وافر علم درکار ہوتا ہے ایسے اوصاف کے حامل میں چند آیات قرآنیہ کو با آواز بلند پڑھ کر سنانے کے قابلیت

1۔ مسند الامام احمد بن حنبل، 1/ 183، رقم 4، ط: مؤسسة الرسالة

2۔ السنة لابن ابي عاصم، باب: من كنت مولاه فعلي مولاه، 2/ 609، رقم: 1384، ط: المكتب الإسلامي بيروت

کیوں نہ ہو گی ایسی خدمت تو ہر قاری اور حافظ باسانی انجام دے سکتا ہے جناب صدیق اکبر کے اس وقت کے خطبات اور اقامت فریضہ کا اسلوب جو آپ سے ظہور میں آیا صحیح نسائی اور حدیث کی دوسری کتابوں میں متعدد اسناد و ترک سے منقول ہے اور اہل سیر کا اس پر اجماع ہے کہ اس سفر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء فرمائی نمازیں آپ کی امامت میں پڑھیں اور ادائیگی مناسک حج میں آپ کی پیروی کرتے رہے۔

سیرت واحادیث کی کتابوں میں صحت کے ساتھ یہ بات بھی ثابت ہے کہ جب حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ مدینۃ النبی سے بعجلت روانہ ہوئے اور منازل سفار تیز رفتاری سے خطا کرتے ہوئے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جا ملے تو آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ کی اواز سن کر بے چین ہوئے اور یہ سمجھ کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود تشریف لے آئے ہوں گے لشکر کو ٹھہرا لیا اور انتظار کرتے رہے لیکن جب حضرت علی رضی اللہ عنہ پہنچے تو بعد ملاقات دریافت فرمایا"انت امیر او مامور"[1] آپ بطور امیر آئے ہیں یا بحیثیت معمور قدم رنجہ فرما ہوئے، آپ نے فرمایا بطور معمور آیا ہوں پس آپ روانہ ہوئے اور ترویہ سے ایک روز پہلے (7 ذی الحجہ) آپ نے خطبہ دیا اور دین و شریعت کے مطابق مناسک حج کے لوگوں کو تعلیم دی لہذا معلوم ہوا کہ آیات کی قرأت کا کام ان سے کسی اور وجہ سے واپس لیا ہو گا عدم لیاقت و قصور قابلیت اس کا سبب نہیں ہو سکتا کیونکہ آسان کام سے معزول کرنا اور اہم و جلیل القدر امور کی انجام دہی کے لیے عمارت کا باقی رکھنا ایسی بات ہے کہ معمولی سوجھ بوجھ والا بھی ایسا نہیں کر تا چہ جائے کہ ایسی ذات گرامی سے جو تھی یہ وقوع پذیر ہوتی یا حکم الہی بھی خلاف ہے حکمت نازل ہو تا (معاذ اللہ)

اور وہ وجہ یہ تھی کہ عہد توڑنے یا معاہدہ کرنے اور صلح و جنگ کی بنیاد رکھنے میں اہل عرب کی یہ عادت تھی کہ ان چیزوں پر سردار قوم یا اسی کا ہم رتبہ بیٹا داماد وغیرہ کی عدم موجودگی میں عمل نہیں کرتے تھے اور اسے نام معتبر جانتے تھے ان کے علاوہ کوئی بلند مرتبہ شخصیت بھی ہوتی تو اس کو کوئی اہمیت نہ دیتے اور یہ طریقہ کسی نہ کسی صورت میں اب تک جاری تھا کہ دو گروہوں میں باہم کوئی مناقشہ کھڑا ہو جائے اور لڑائی جھگڑے اسے نمٹانا ہو تو حالی موالی دوست احباب نوکر چاکر سب ہی شامل ہو جاتے ہیں اور اگر معاملہ صلح و صفائی اور عہد

1۔ عمدة القاري شرح صحيح البخاري، للعيني ،كتاب التيمم ، 4/ 78

معاہدہ کا ہو تو وہ گروہ کے سردار کی ذاتی شرکت کے علاوہ نہ کوئی طے کرتا ہے اور نہ اس کا کوئی اعتبار و اعتماد ہوتا ہے اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ منیٰ کی وسیع و عریض وادی میں جہاں لاکھوں کا اجتماع ہے اور ہر شخص کے کانوں تک سورہ برأت کے احکام پہنچانے ہیں کتنا سخت محنت اور جفاکشی کا کام تھا اور یہ کام امیر الحج سے کیسے انجام پا سکتا تھا جبکہ ان کے ذمہ اعمال حج کی دیکھ بھال لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد سے لوگوں کو بچائے رکھنا اور احرام کے ٹوٹ جانے اور دیگر جنایات حج کے وقوع پذیری کی روک تھام تھا جیسے اہم امور بھی ہوں اور پھر وقت بھی محدود ہو اور اسی محدود وقت میں قرآنی احکامات لوگوں کے کانوں میں پڑ بھی جاتے ہوں تو لامحالہ دوسرے آدمی کا ہونا لازمی ولابدی ہے اور چونکہ یہ کام بھی اپنی جگہ مہتم بالشان ہے تو وہ دوسرا آدمی عظیم المرتبہ ہی ہونا چاہیے، لہذا حضور ﷺ نے اس کے لیے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اس کام کا امیر مقرر فرمایا تاکہ دونوں مہمات بحسن و خوبی انجام پا جائیں اور لوگوں کی نظروں میں ہر کام مقصود بالذات کی حیثیت رکھے اگر برات خوانی کا کام بھی جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے منادوں سے لینے پر اکتفا کیا جاتا تو لوگوں کو خاص کر مشرک اعراب کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ عہد و پیمان کا مسئلہ پیغمبر علیہ السلام کے نزدیک زیادہ اہم اور ضروری نہ تھا کہ اس کے لیے آپ نے کوئی مستقل آدمی مقرر نہ فرمایا۔

یہاں باریک بین علماء اہل سنت نے ایک لطیف نکتہ بیان فرمایا ہے کہ یہ موقع رحمت الٰہی اور قہر الٰہی دونوں صفات کے ورود و ظہور کا تھا حج کے ورود رحمت الٰہی کا مظہر تھا تو کفار کا نقض عہد قہر الٰہی کا مرجع اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بفرمان نبی ﷺ "أرحم أمتي بأمتي أبو بكر"[1] آپ امت محمد ﷺ میں سے امت پر سب سے زیادہ مہربان ہونے کے سبب مظہر صفت رحمت الٰہی تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ "اسد اللہ" ہونے کے باعث مظہر صفت قہر الٰہی تھے اس لیے حج کی امارت جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے حوالہ ہوئی تو کفار کے نقض عہد کے انجام بد سے آگاہ کرنے کی ذمہ داری جناب علی رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوئی تاکہ مجمع پر کہ جس میں مسلمان بھی تھے کفار بھی دونوں صفتوں جمال و جلال الٰہی کا فیضان ہو مسلمان انوار جمال سے شرابور ہوں تو کفار جلال الٰہی سے بے

1۔ سنن الترمذی، 6/ 135، رقم: 3790، ط: دار الغرب الإسلامي بيروت

بیعت زدہ، اور پھر مزے کی بات یہ کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے بھی معاون و مددگار رہے جیسا کہ بخاری کی روایت بحوالہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ میں ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی متعین کردہ جماعت کے ساتھ کیا ہی تھا مگر خود بھی گاہ بگاہ عملاً اس خدمت دین میں حصہ لیتے رہے چنانچہ ترمذی وحاکم میں بحوالہ ابن عیاش ثابت ہے کہ "فكان علي ينادي بهذه الكلمات فإذا عي قام أبو بكر ينادي بها"[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ سورہ برات کا اعلان فرماتے جب آپ تھک جاتے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر اعلان کرنے لگتے اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "فإذا بح قام أبو هريرة فنادى بها"[2] جب آپ بیٹھتے تو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہو جاتے، حاصل کلام یہ کہ جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ سے سورۃ برأت سنانے کی ذمہ داری لے لینے کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ مسئلہ نقض عہد کو عرب کے قاعدہ کے مطابق ہی انجام دیا جائے تا کہ ان کے لیے یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ ہم کو ہمارے آئین ورسم کے بموجب نقض عہد سے آگاہی نہ ہوئی کہ ہم اپنی راہ اختیار کرتے اور اپنا خیال اپ کرتے چنانچہ معالم، زاہدی، بیضاوی، شرح تجرید، مواقف، صواعق، شرح مشکوۃ اور دوسری کتابوں میں یہی وجہ لکھی ہے۔

اس لیے صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت کے ایک ماہر انصاری کو معاہدہ لکھنے کے لیے طلب فرمایا تو سہیل بن عمرو نے جو مشرکین کا نمائندہ مصالحت تھا بولا اے محمد ہم کسی اور کے لکھے ہوئے معاہدے کو قبول نہیں کرتے یہ معاہدہ تمہارے چچازاد علی رضی اللہ عنہ کو لکھنا چاہیے[3] اس کا حوالہ مدارج ومعارج اور سیرت کی دوسری کتابوں میں اسی طرح مذکور ہے۔

اس اعتراض کا ایک اور جواب یہ ہے کہ ہم مانے لیتے ہیں کہ جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ کو سورۃ برات کی تبلیغ

1۔ مطالب السؤول في مناقب آل الرسول (ع) لمحمد بن طلحة الشافعي، الصفحة 106

2۔ شواهد التنزيل، للحاكم الحسكاني، ج 1، الصفحة 314، مجمع أحياء الثقافة الاسلامية

3۔ عن البراء بن عازب رضي الله عنهما، قال: لما صالح رسول الله صلى الله عليه وسلم أهل الحديبية، كتب علي بن أبي طالب بينهم كتابًا-(صحيح البخاري،باب: كيف يكتب هذا،3/ 184، ط: دار طوق النجاة)

ے معزول فرمادیا مگر ایسے عدالت کا معزول کرنا جس کی عدالت کی گواہی بیسوں جگہ نبی کریم ﷺ نے اور قرآنی آیات نے دی ہو کسی خاص مسئلے حت ہی کی بناپر ہو سکتا ہے یہ عزل ریاست وامامت کی عدم صلاحیت کی بنا پر ہرگز نہ تھا خصوصا جبکہ اسے نہ وہ خدمت انجام دینے کا موقع ملا ہو اور نہ اس سے کوئی قصور یا خیانت سرزد ہوئی ہو اور اس کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنا ایک فیصلہ ہے کہ آپ نے عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کو بحرین کی ولایت سے معزول کر دیا جو حضور ﷺ کے ربیب خاص تھے اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے مخلص ساتھی اور حمایتی تھے ذاتی طور پر وہ بڑے عابد و زاہد، امین و عالم، متقی بھی تھے اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے بطور عذر ایک تحریر بھی دی جو ان شیعوں کی اصح الکتب نہج البلاغہ اور دوسری صحیح کتابوں میں موجود بھی ہے کہ:

أما بعد فإني قد وليت النعمان بن عجلان الزرقي على البحرين، ونزعت يدك بلا ذم لك ولا تثريب عليك. فلقد أحسنت الولاية وأديت الأمانة. فأقبل غير ظنين ولا ملوم ولا متهم ولا مأثوم.[1]

حمد و صلاۃ کے بعد واضح ہو کے میں نے نعمان بن عجلان دورقی کو بحرین کا والی بنادیا ہے اور تم سے یہ عہدہ لے لیا ہے لیکن اس کا سبب نہ تمہاری کوئی برائی ہے اور نہ تم پر کوئی الزام ہے تو تم نے حکومت بڑی اچھی طرح اور امانت داری سے چلائی بس تم اجاؤ نہ تم پر کوئی بدگمانی ہے نا ملامت نہ تم ملزم اور نہ مجرم ہو۔

اور یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ عمرو بن سلمہ باعتبار دین و حسب و نسب نعمان بن عجلان دورقی سے افضل تھے کاروبار حکومت بھی انہوں نے بڑے اچھے طریقے سے اور نہایت دیانت کے ساتھ انجام دیا تھا نہ ان کی کوئی غلطی تھی، نہ قصور، نہ عدم لیاقت ظاہر ہے کہ اسباب عزل میں سے جب کوئی بات نہیں تھی اور جملہ عیوب و قصور سے وہ بری تھے تو کوئی خاص مصلحت ہی موجب عزل ہوگی، ادھر اگر جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ ایک قرآنی حکم کی

1۔نهج البلاغة، ومن كتاب له عليه السلام إلى عمر بن أبي سلمة المخزومي، 3/ 67، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

ادائیگی کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے تھے تو ایسی صورت میں ان کو امیر حج بنانا کیا معنی رکھتا ہے جبکہ بلحاظ عہدہ مرتبہ یہ اہم اور عظیم تر منصب ہے اور پھر ایسا کام پیغمبر معصوم ﷺ سے سرزد ہونا قابل تسلیم ہے اگر آپ کا عزل واقع بھی ہوا ہے تو اس کی وجہ کوئی مصلحت خاص ہی ہو سکتی ہے قابلیت ولیاقت کا قصور ہرگز ہرگز نہیں۔

طعن نمبر12: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو وراثت نہیں دی

بارہواں اعتراض یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت بی بی فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو حضور اکرم ﷺ کے ترکہ میں سے ورثہ نہیں دیا اس پر بی بی بتول الزہرا رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا کہ اے ابو قحافہ کے بیٹے تم تو اپنے باپ سے ورثہ پاؤ اور میں اپنے بابا جان کا ورثہ نہ پاؤں یہ کہاں کا انصاف ہے،[1] اور آپ کو محروم کرنے کے لیے صرف ایک شخص کی یعنی اپنی روایت کو دلیل کے طور پر پیش کیا کہ میں نے رسول خدا ﷺ سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ ہم انبیاء نہ کسی سے میراث لیتے ہیں اور نہ کوئی ہم سے میراث پاتا ہے،[2] حالانکہ یہ حدیث نص قرآنی "يُوصِيكُمُ اللهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ"[3] اللہ تعالی تم کو تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ عورت سے دگنا ہے، کے خلاف ہے اس لیے کہ یہ حکم قرآنی عام ہے نبی اور غیر نبی دونوں کو شامل ہے اسی طرح دوسری نص یعنی کہ " وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُودَ"[4] یعنی سلیمان داؤد کے وارث ہوئے بھی اس کے خلاف ہے یا ایک اور آیت " فَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا، يَرِثُنِي وَيَرِثُ

1۔ قالت: يا ابن قحافة أنت ترث أباك وأنا لا أرث أبي؟(الرواية من وضع الإمامية فليست في مصدر تاريخي ولا في أي من كتب أهل السنة. وأخرجها من الإمامية: ابن رستم الطبري، دلائل الإمامة: 34؛ المفيد رسالة حول حديث نحن معاشر الأنبياء لا نورث: ص 25؛ الطبرسي، الاحتجاج: 1/ 102)

2۔روي الهيثمي: وعن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إنا لا نورث ما تركنا صدقة.(مجمع الزوائد ومنبع الفوائد9/ 40، ط: دار الكتب العلمية بيروت لبنان)

3۔سورة النساء، الآية:11

4۔ سورة النمل، الآية:16

مِنْ آلِ يَعْقُوبَ [1] اپنی عنایت سے مجھے ایک ولی بیٹا بخشئے جو میرا بھی وارث بنے اور آل یعقوب کا بھی، ان سب سے معلوم ہوا کہ انبیاء خود بھی وارث ہوتے ہیں اور ان کے وارث بھی ان سے میراث پاتے ہیں۔

جواب: اس اعتراض کے دو رخ ہیں ایک ظاہر ایک پوشیدہ ظاہر تو یہ کہ صرف اپنی روایت پر انحصار کر کے ان کو محروم کر دیا اور پوشیدہ یہ کہ اپ نے بغض و عداوت کی وجہ سے خاتون جنت رضی اللہ عنہا کو ترکہ نہیں دیا یہ بات اعتراض میں کھلے الفاظ میں گو نہیں کہی گئی مگر اعتراض کی اصل بنیاد ان کے نزدیک یہی ہے تو جواب یہ ہے۔

یہ بات صحیح نہیں کہ آپ نے محض اپنی سنی ہوئی بات کو حجت بنا کر آپ کو میراث نہیں دی یا آپ ان سے بغض و عداوت رکھتے تھے اس لیے ایسا کیا اس کی دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ تقسیم ہوتا تو ازواج مطہرات کو بھی حصہ ملتا جس میں خود آپ کی لخت جگر عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور اپنے رفیق و دوست حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں تو آپ کو دیگر امہات المومنین رضی اللہ عنہن یا اپنی اور اپنے دوست کی بیٹیوں یا ان کے باپ بھائیوں سے عداوت تھی کہ ان کو بھی محروم رکھا اور پھر نصف ترکہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے حصہ میں اتا تھا اور وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی ابتدا ہی سے آپ کے رفیق و مشیر تھے ان سے کیا عداوت تھی کہ ان کو بھی ترکہ نہ دیا تو معلوم ہوا کہ بغض و عداوت کا الزام غلط لغو اور ان کا من گھڑت ہے۔

اب رہ گئی یہ بات کہ صرف اپنی روایت کی بنیاد پر حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو ورثہ نہیں دیا ہے بلکہ جھوٹ اور صریح دروغ گوئی ہے اس لیے کہ اہل سنت کی کتابوں میں اس روایت کے راویوں میں ان حضرات کے اسماء گرامی موجود ہیں جناب حذیفہ بن الیمان، حضرت زبیر بن العوام، جناب ابو ہریرہ، جناب عباس، جناب علی مرتضی، جناب عثمان غنی، جناب عبد الرحمن بن عوف اور جناب سعد بن وقاص رضی اللہ عنہم ان حضرات کی جلالت قدر اور عظیم المرتبی سے کون واقف نہیں پھر ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جن کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے انہیں عین حیات ہی جنتی ہونے کی بشارت مل چکی تھی اور حذیفہ رضی اللہ عنہ کے متعلق تو خود ان کے ملا عبد اللہ مشہدی

1۔ سورۃ مریم، الآیۃ: 6

نے اپنی کتاب اظہار الحق میں حضور نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ" ما حدثکم به حذیفة فصدقوه "[1] حذیفہ تم سے جو حدیث بیان کرے اس کی تصدیق کرو یعنی سچ سمجھو، اور ایک راوی ان میں حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ بھی ہیں جو شیعہ اور سنی دونوں کے بالاجماع عقیدہ کے مطابق صادق ہیں اگر عائشہ صدیقہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہم کی روایات اس معاملہ میں ان کے نزدیک معتبر نہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کو یہ کیا کہیں گے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مالک بن اوس بن حدثان النضری سے یوں روایت کی ہے:

ان عمر بن الخاب قال بمحضر من الصحابة فيهم علی والعباس وعثمان و عبدالرحمن بن عوف والزبير بن العوام وسعد بن وقاص أنشدكم بالله الذي به تقوم السماء والأرض، هل تعلمون أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: «لا نورث ما تركنا صدقة» يريد رسول الله صلى الله عليه وسلم نفسه، قال الرهط: قد قال ذلك، فأقبل عمر على علي وعباس، فقال: أنشدكما بالله، هل تعلمان أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ذلك؟ قالا: قد قال ذلك.[2]

جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے ایک مجمع کو مخاطب کر کے جس میں حضرت علی، عباس، عثمان غنی، عبد الرحمن بن عوف، زبیر بن عوام اور سعد بن وقاص رضی اللہ عنہم موجود تھے کہا کہ میں تم کو اس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے زمین و آسمان بر قرار ہیں کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم میراث نہیں چھوڑتے ہم جو کچھ چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے سب نے فرمایا بخدا ہاں! پھر آپ نے خصوصیت سے حضرت علی و عباس کی طرف متوجہ ہو کر

1 ـ نفحات الأزهار في خلاصة عبقات الأنوار، للسيد علي الميلاني، 5/ 25، ط: المطبعة مهر

2 ـ صحيح البخاري، باب حبس نفقة الرجل قوت سنة على أهله، وكيف نفقات العيال، 7/ 63، رقم: 5358

فرمایا میں تم کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں آیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا
دونوں حضرات نے جواباً فرمایا بخدا بے شک ایسا فرمایا۔

پس معلوم ہوا کہ ان کی حدیث باعتبار قطعیت آیت قرانی کے برابر ہے کیونکہ مذکورۃ الذکر اصحاب بالا کی فرداً فرداً روایت موجب یقین ہے چہ جائیکہ اس پوری جماعت کی متفقہ حدیث خصوصاً حضرت علی رضی اللہ عنہ جو کہ شیعوں کے نزدیک معصوم ہیں اور ان کے نزدیک معصوم کی حدیث یقین کرنے میں قرآن کے برابر ہے اور اس سے بھی قطع نظر خود شیعوں کی کتابوں میں ان کے تسلیم کردہ امام معصوم سے اسی قسم کی روایت موجود ہے چنانچہ محمد بن یعقوب رازی نے کافی میں ابی البختری کے حوالے سے جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ کی یہ روایت نقل کی ہے آپ نے فرمایا:

إن العلماء ورثة الأنبياء لم يرثوا ولم يورثوا درهما ولا دينارا، وإنما أورثوا أحاديث من أحاديثهم، فمن أخذ بشيء منها فقد أخذ بحظ وافر[1]

بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں کیونکہ پیغمبروں کی کوئی میراث نہیں اور ایک نسخہ میں ہے کہ وہ میراث میں درہم و دینار نہیں چھوڑتے ان کی میراث تو ان کے فرامین و اقوال ہیں جس نے ان میں سے اگر کچھ لیا تو گویا بہت بڑا حصہ پالیا۔

اور کلمہ انما کے متعلق شیعہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ قطعاً حصر کے لیے ہوتا ہے جیسا " انما ولیکم " کی بحث میں بیان ہو چکا لہذا معلوم ہوا کہ علم و احادیث کے سوا میراث میں کوئی اور چیز قطعاً نہیں چھوڑی تو انہی کے امام معصوم کے حوالہ سے ہی مدعا ثابت ہو گیا اور جواب ہی کے سلسلہ کی ایک بات یہ بھی ہے کہ جس شخص نے براہ راست بلاواسطہ حضور اکرم ﷺ سے جو حدیث سنی وہ اس کے لیے علم یقین کی موجب ہے اور اس کے لیے اپنے سنے ہوئے پر عمل کرنا لازم و ضروری ہے خواہ وہ حدیث کسی اور سے بھی سنے یا نہ سنے چنانچہ سنی شیعہ اصولی ہر دو کا اس پر اجماع ہے کہ حدیث کی تقسیم متواتر و غیرہ متواتر اس شخص کے لیے ہے جس

۱۔ الكافي: 1/ 32؛ المفيد، الاختصاص: ص 4؛ العاملي، وسائل الشيعة: 27/ 78.

نے حضور ﷺ کو نہ دیکھا ہو اور آپ کی احادیث دوسروں کے واسطے سے سنی ہوں اور جس نے آپ ﷺ کی زیارت کی آپ کی زبان مبارک سے احادیث سنی اس کے لیے یہ تقسیم متواتر وغیرہ متواتر نہیں ہے اس کے لیے تو وہ فرمان متواتر سے بھی بہت اونچا ہے تو اس معاملہ میں جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ زبان نبوت سے براہ راست سن چکے تو اب تفتیش و تحقیق کی انہیں ضرورت ہی کیا رہی!

اب رہا یہ سوال کہ یہ حدیث آیت کے خلاف ہے تو یہ بھی غلط اور جھوٹ ہے، اور معترض کی نا سمجھی کی دلیل کیونکہ گھر میں مخاطب امت ہے پیغمبر نہیں، لہذا یہ حدیث تعین خطاب واضح کرنے والی ہوگی آیت کی مخصص نہیں! اور اگر مخصص بھی مانیں تو آیت کی تخصیص تو لازم آئیگی مگر مخالفت نہیں، پھر اس آیت سے پہلے ہی بہت سی چیزوں کی تخصیص ہو چکی مثلاً کافر اولاد وارث نہیں، رقیق وارث نہیں، اور قاتل وارث نہیں، اور یہ خود شیعہ بھی اپنے آئمہ سے ایسی روایت بیان کرتے ہیں جس سے بعض وارثوں کو باپ کے ترکہ کی بعض چیزوں سے محروم کر کے ان کو خود لے لیتے ہیں، مثلاً تلوار، مصحف، انگوٹھی، بدن کا لباس، کہ بڑا بیٹا ان کو بغیر تقسیم خود لیتا ہے،[1] دوسرے وارثوں کا جو حصہ ان اشیاء میں بنتا ہے اس سے ان کو محروم کر دیتا ہے!

حالانکہ وہ اس روایت میں تنہا ہیں، اور اہل سنت کے نزدیک ان کی عصمت بھی ثابت نہیں، اور جناب امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لے کر سلسلہ کے آخری ایام تک تمام اہل بیت کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے اور ان کا عمل اس کی صحت پر مہر ہے دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ترکہ جب ان حضرات کے ہاتھ میں آیا تو کسی بھی وارث کو اس کا حصہ نہیں دیا حضرت عباس اور ان کی اولاد محروم رہی، ازواج مطہرات بھی اپنا حصہ نہ پا سکیں۔

پس اگر پیغمبری ترکہ میں تقسیم میراث جاری ہوتی تو یہ محترم و گرامی قدر حضرات جو شیعوں کے نزدیک معصوم بھی ہیں، ایسی کھلم کھلا حق تلفی کیسے روا رکھتے کیونکہ علماء حدیث، اور اہل سیر و تاریخ کے اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ کا متروکہ مثلاً خیبر و فدک یا اور بعہد فاروق اعظم رضی اللہ عنہ میں حضرت عباس و حضرت

---

1 ـ أخرج الكليني وغيره عن حريز عن الصادق أنه قال: «إذا هلك الرجل فترك بنين فللأكبر السيف والدرع والخاتم والمصحف، فإن حدث به حدث فللأكبر منهم». الكافي: 7/ 85؛ تهذيب الأحكام: 9/ 275؛ الاستبصار: 4/ 144.

علی ﷢ کے دست تصرف میں رہے، پھر جناب عباس سے حضرت علی کے قبضہ میں آئے، پھر جناب حسین بن علی کے پاس پھر جناب حسین بن علی کے پاس پھر علی بن حسین اور حسن بن حسن کے پاس اور دونوں اس پر متصرف رہے پھر زید بن علی برادر حسن بن حسن کے پاس پھر مروان کے امیر ہونے کے بعد اس کے قبضہ میں آئے، اور مروانیوں کے ہاتھوں منتقل ہوتے ہوئے حضرت عمر بن عبد العزیز ﷫ کے قبضہ میں پہنچے آپ غایت درجہ منصف مزاج تھے آپ نے صاف کہہ دیا کہ جس ترکہ کو جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنی پیاری لخت جگر جناب سیدہ فاطمہ الزہراء ﷞ کو نہیں دیا میں اس کا مالک کسی طرح ہو سکتا ہوں میرا اس میں کوئی حق نہیں، پس آپ نے یہ ترکہ اولاد فاطمہ ﷞ کی طرف منتقل فرمادیا،[1] پس ائمہ معصومین اور اہل بیت کرام کے عمل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ترکہ نبی ﷺ میں میراث کی کوئی گنجائش نہیں، اور آیت میراث نے حدیث مذکورسے تخصیص پائی۔

اب ہم آیت "وَوَرِثَ سُلیمان" کی بحث کی طرف آتے ہیں کہ بقول شیعہ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انبیاء خود بھی وارث ہوں اور ان کی میراث تقسیم بھی ہو، مگر یہ مضمون اس حدیث قطعی کے خلاف ہے جو آئمہ معصومین سے ثابت ہے، اس مشکل گتھی کو حل کرنے کے لئے بھی ہم قول معصوم کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور کتب شیعہ سے اس کا سراغ وجواب تلاش کرتے ہیں کلینی نے جناب ابی عبد اللہ ﷫ سے ایک روایت بایں الفاظ نقل کی ہے:

أن سليمان ورث داود وأن محمدا ورث سليمان[2]

سلیمان ﷤، داؤد ﷤ کے وارث ہوئے اور محمد ﷺ سلیمان کے وارث ہوئے۔

گویا معلوم ہوا کہ یہ وراثت کمالات نفسانی اور علم ونبوت کی وراثت ہے مال واسباب متروکہ کی وراثت نہیں ہے، قرینہ عقلیہ بھی قول معصوم کا تائید کرتے ہوئے اسی وراثت کا پتہ دیتا ہے کیونکہ باتفاق مورخین

1۔ سنن ابی داؤد، باب في صفايا رسول الله صلى الله عليه وسلم من الأموال، 3/ 143، رقم: 2972، ط: المكتبة العصرية، صيدا بيروت

2۔ الكافي: 1/ 224؛ الصفار، بصائر الدرجات: ص 135.

حضرت داؤد علیہ السلام کے انیس لڑکے تھے،[1] قاعدہ میں تو سارے ہی آپ کے وارث ہوتے حالانکہ آیت میں اللہ تعالی نے خصوصیت و امتیاز کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حق میں حکم فرمایا، تو پتہ چلا کہ وراثت جس سے حضرت سلیمان علیہ السلام کو امتیاز حاصل تھا اور دوسرے بھائی اس سے محروم تھے وہ وراثت علم نبوت کی تھی یہ دوسرے بھائیوں کو کہاں نصیب تھی۔

پھر ایک بات یہ کہ سب ہی کو معلوم تھا کہ ہر لڑکا اپنے باپ کی میراث پاتا ہے اور اس کے مال کا مالک بنتا ہے تو اس کی خبر دینا تو لغو ہے اور کلام الہی لغو پر مشتمل نہیں ہو سکتا وہ اس سے پاک ہے، اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ایسی عام بات بیان کرنا جو تمام عالم میں مشترک ہے ان کے لئے باعث اعزاز کب ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالی اس کو ان کے فضائل و مناقب کے طور پر بیان فرمائے، اور اسی آیت کا اگلا حصہ خود بتا رہا ہے کہ اس وراثت سے مراد وراثت علم ہے "وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ"[2] لوگو سنو! ہم کو پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے۔

علم کے لئے وراثت کا لفظ استعمال کرنا مجاز ہے

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ علم کے لئے وراثت کا لفظ استعمال کرنا مجاز ہے اور مال کے لئے اصل و حقیقت تو بلا ضرورت ہم حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجازی معنی کیوں مراد لیں؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس ضرورت سے کہ معصوم کا قول جھوٹا نہ پڑے، اس کے علاوہ ہم اسے بھی تسلیم نہیں کرتے کہ وراثت مال کے معنی میں حقیقت ہے، یہ تو فقہا کے یہاں کثرت استعمال کی وجہ سے اس معنے کے لئے مخصوص ہو گئی بھلے منقولات عرفیہ، ورنہ در حقیقت وراثت کا اطلاق علم و منصب پر ہی صحیح ہے اور مجاز بھی مان لیں تو یہ مجاز اتنا متعارف اور مشہور ہے خصوصا قرآنی استعمال میں کہ وہ حقیقت ان حد تک پہنچ گیا ہے اللہ تعالی نے فرمایا:

1۔ نقله القرطبي في الجامع لأحكام القرآن: 13/ 164. وروى الكليني وغيره عن الصادق أنه قال: «... وكان لداود أولاد عدة ...». الكافي: 1/ 278؛ الجزائري، قصص الأنبياء: ص 343.

2۔ سورة النمل، الآية: 16

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا[1]

پس ان کے بعد والے ان کے جانشین ہوئے جو کتاب کے وارث بنے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ[2]

جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے چنا تھا ان کو کتاب کا وارث بنایا۔

اب آیئے آیت "يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ" کی طرف تو بداہت عقلیہ بتاتی ہے کہ یہاں وراثت سے قطعی طور پر وراثت منصب مراد ہے، کیونکہ لفظ آل سے مجازاً خود حضرت یعقوب علیہ السلام کی ذات مراد ہو تو یہ لازم آتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا متروکہ مال واسباب ان کے زمانہ سے لے کر حضرت زکریا علیہ السلام کے زمانہ تک جو تقریباً دو ہزار سال کا عرصہ ہے بغیر تقسیم شدہ باقی و برقرار ہو، اور اب حضرت زکریا علیہ السلام کی وفات پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حصہ ان کو پہنچے اور یہ بڑا مغالطہ ہے، اس لئے کہ اگر وہ مال حضرت زکریا علیہ السلام کی وفات سے پہلے تقسیم شدہ ہو تو وہ مال تو حضرت زکریا علیہ السلام کا ہوا اور یرثنی میں داخل ہوا، اب آل یعقوب کا مال کہاں گیا، جس کے یحییٰ علیہ السلام وارث ہوں گے اور اگر آل یعقوب سے مراد اولاد یعقوب ہو تو پر یہ لازم آتا ہے کہ تمام بنی اسرائیل خواہ زندہ ہوں یا مر چکے ہوں سب کے وارث حضرت زکریا علیہ السلام ہوں، یہ مغالطہ پہلے سے بھی زیادہ سخت ہے، لہٰذا اس آیت کا حوالہ اس جگہ لانا اسی فرقہ کی جولانی طبع یا حماقت کی نشانی ہے۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے سوال میں دو لفظ فرمائے ہیں ولیا یرثنی گویا اللہ تعالیٰ نے ایسا ولی طلب فرمایا جو صفت وراثت سے متصف ہو یعنی اس میں وارث بننے کی قابلیت وصلاحیت بھی ہو، لہٰذا اگر یہاں خاص علمی وراثت مراد نہ ہو گی تو یہ صفت محض لغو وبے کار ثابت ہو گی اور اس کے ذکر کا کوئی فائدہ مرتب نہ ہو گا کیونکہ بیٹا تمام شریعتوں میں باپ کا وارث ہوتا ہی ہے، اور لفظ ولی سے وارث مال بلا تکلف سمجھی جاتی ہے۔

1۔ سورۃ فاطر، الآیۃ:32

2۔ سورۃ الاعراف، الآیۃ:169

ایک اور بات یہ بھی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے نفوس قدسیہ کی تمام تر توجہات اور مساعی اللہ تعالیٰ کی طرف مبذول اور منعطف ہوتی ہیں، اس عالم فانی سے ان کے دل کا رشتہ کٹا ہوا ہوتا ہے اسی لئے امتاع دنیا کی طرف نام کو بھی راغب نہیں ہوتے، خاص طور پر حضرت زکریا علیہ السلام کہ دنیا و متاع دنیا سے ان کی بے تعلقی اور بے اعتنائی تو مشہور و معروف ہے! ان کے لیئے عادتاً یہ محال تھا کہ وہ مال و متاع کی وراثت سے جس کی قدر ان کے نزدیک ذرہ خاک کے برابر بھی نہیں تھی، خائف ہوں اور اس کے صدمہ، ملال و اندوہ کا اظہار اللہ تعالیٰ کی جانب میں کریں (کہ اے اللہ مجھے ایسا بیٹا دے جو میرے مال کا وارث بنے ورنہ یہ مال بے وارث رہ گیا تو غیر مستحقوں کے ہتھے چڑھ جائے گا وغیرہ وغیرہ از مترجم نعمانی) کیونکہ یہ عمل تو مال کی محبت اور اس سے انتہائی دلی شغف کا پتہ دیتا ہے، جس کا حضرت زکریا علیہ السلام کے متعلق کوئی بھول کر بھی تصور نہیں کر سکتا، اور پھر یہ بھی ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو یہ ڈر اور خطرہ تھا کہ کہیں چچازاد بھائی مال و دولت کو بے جا خرچ نہ کر ڈالیں یا واہیات اور فضول میں ضائع نہ کر ڈالیں تو اس ڈر اور خطرہ کا یہ موقع و مقام ہی نہیں کیونکہ جب آدمی کی آنکھ بند ہوئی مال وارثوں کا ہوا اب وہ اس مال کے مالک ہیں جا خرچ کریں یا بیجا ساری ذمہ داری ان کے سر ہے مرنے والے سے اس سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی نہ اسے کوئی سزا ملے گی، دوسرے اگر ان کے دل میں ڈر تھا تو جناب الٰہی میں اس کا عرض کرنا کیا ضروری تھا، اس کا مداوا اور دفعیہ تو خود ان ہاتھ میں تھا کہ وفات سے پہلے بہت مال و دولت راہ خدا میں لٹا جائیں اور صدقہ و خیرات کر دیتے، اور بدکار وارثوں کو محروم کر جاتے، اور انبیا علیہم السلام کو موت سے آگاہی دی جاتی ہے اور اختیار بھی ملتا ہے تو گویا اچانک موت کا خطرہ بھی نہ تھا، لہذا معلوم ہوا یہاں وراثت سے حضرت زکریا علیہ السلام کی مراد مال کی وراثت تھی ہی نہیں یہاں تو وہ منصب کی میراث کے لئے وراثت ملنے کی التجا کر رہے ہیں، اور اس خطرہ کے پیش نظر کر رہے ہیں کہ کہیں میرے بعد بنی اسرائیل کے شریر و بدقماش لوگوں کو (وارث نہ ہونے کی وجہ ہے) ایسا موقعہ اور غلبہ حاصل نہ ہو جائے کہ وہ احکام الٰہی کی تحریف کر ڈالیں ربانی شریعت میں ترمیم و تنسیخ کرنے لگیں اور میرے علم کی حفاظت نہ کر کے اسپر عمل پیرا نہ ہوں اور یوں دنیا میں عظیم فتنہ و فساد کا دروازہ کھول دیں اس لئے بیٹے کی دعا کی، کہ وہ میرا وارث بن کر میرے علوم نبوت کی پیروی و اشاعت کا سبب ہوگا، احکام الٰہی اس کے ذریعہ فروغ پائیں گے، خاندان میں یہ سلسلہ ایک نسل کم از کم اور باقی

اب ان کا اصیت پن دیکھئے کہ پہلے تو طعن کرتے رہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے میراث کا حق بنتے ہوئے بھی میراث نہیں دی اور جب ان کے ائمہ معصومین کے طرز عمل اور ان کی روایات سے یہ بات ثابت کر دی گئی کہ مترو کہ طاہر صلی اللہ علیہ وسلم میں میراث جاری نہیں ہوتی تو اب پینترا بدل کر ایک اور دعویٰ تراشا اور ایک طعن کر ڈالا ملاحظہ ہو۔

طعن نمبر 13: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے باغ فدک سیدہ رضی اللہ عنہا کو نہیں دیا تھا

کہ باغ فدک[1] جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جناب سیدہ فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کو نہیں دیا حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ہبہ کر دیا تھا، ان کے دعویٰ کو ناقابل سماعت قرار دے کر انہیں گواہ پیش کرنے کے لئے کہا اور جب جناب سیدہ رضی اللہ عنہا نے گواہی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ام ایمن رضی اللہ عنہا کو پیش کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس گواہی کو رد کر دیا اور فرمایا ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں ہونی چاہئیں، اس پر جناب سیدہ رضی اللہ عنہا ناراض ہو گئیں اور آپ سے بول چال بند کر دی حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا تھا "من أغضبها أغضبني"[2] جس نے ان کو غصہ دلایا اس نے مجھے ناراض کیا۔

جواب: اس اعتراض کا یہ ہے کہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کا دعویٰ ہبہ اور گواہی میں جناب علی وام ایمن یا بروایت دیگر جناب حسنین رضی اللہ عنہم کو پیش کرنے کی روایات افتراء اور جھوٹ ہیں کیونکہ اہل سنت کی کتابوں میں اس معاملہ کی کسی کوئی روایت موجود نہیں لہٰذا اس کا سہارا لے کر اہل سنت پر الزام لگانا اور ان سے جواب طلب کرنا نادانی

4۔ نبی کی وراثت اس لیے بھی نہیں ہوتی کہ لوگ کہیں یہ گمان نہ کرنے لگیں کہ نبی بھی العیاذ باللہ عام دنیا داری کی طرح اپنی اولاد اور آئندہ نسلوں کے لیے مال جمع کر کے رکھتے تھے بلکہ نبی کی تو شان یہ ہے "لا یدخر لغد" کہ نبی تو دوسرے دن کے لیے بھی کچھ باقی نہیں رکھتا چہ جائیکہ اولاد کے لیے جمع کرے۔

5۔ اگر نبی کی اولاد میں وراثت چلنے کا قانون ہوتا تو ممکن تھا کہ کوئی بدبخت جائیداد کے حصول کی غرض سے نبی کو ہلاک کرنے کی کوشش کرتا جو کہ اس کی دنیا و آخرت دونوں کو برباد کر دیتی۔ (زبدۃ الشمائل شرح شمائل ترمذی، باب ما جاء فی میراث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ص:244، ط: دار الایمان)

1۔ فدک ایک شہر کا نام تھا جو مدینہ منورہ سے شمال جانب تقریباً تین منزل کی مسافت پر واقع تھا، حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں تحریر فرماتے ہیں: واما فدك وهي بفتح الفاء والهملة بعدها كاف بلد بينها و بين المدينة ثلاث مراحل - (فتح الباری، 6/ 151) اور فدک کی فاء اور دال دونوں زبر سے ہیں اور آخر میں کاف ہے یہ ایک شہر ہے جس کے درمیان اور مدینہ منورہ کے درمیان تین منزل کا فاصلہ ہے۔

2۔ ابن المطهر الحلي في نهج الحق: ص 263.

اور دھاندلی ہے، اہل سنت کی کتابوں میں جو روایت ملتی ہے وہ اس کے برعکس اور مخالف ہیں چنانچہ مشکوٰۃ بحوالہ ابو داؤد جناب مغیرہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب جناب عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ ہوئے تو تمام بنو مروان کو جمع کیا اور فرمایا:

إن رسول الله صلى الله عليه وسلم: «كانت له فدك، فكان ينفق منها ويعود منها على صغير بني هاشم، ويزوج منها أيمهم، وإن فاطمة سألته أن يجعلها لها فأبى»، فكانت كذلك في حياة رسول الله صلى الله عليه وسلم، حتى مضى لسبيله، فلما أن ولي أبو بكر رضي الله عنه، عمل فيها بما عمل النبي صلى الله عليه وسلم، في حياته حتى مضى لسبيله، فلما أن ولي عمر عمل فيها بمثل ما عملا حتى مضى لسبيله، ثم أقطعها مروان، ثم صارت لعمر بن عبد العزيز، قال عمر يعني ابن عبد العزيز: فرأيت أمرا منعه رسول الله صلى الله عليه وسلم فاطمة عليها السلام، ليس لي بحق، وأنا أشهدكم أني قد رددتها على ما كانت يعني على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم[1] وابی بکر وعمر

بے شک رسول اللہ ﷺ کے پاس فدک تھا آپ اس کی آمدنی خرچ فرماتے ہاشمی بچوں کی غور و پرداخت اور بیواؤں کے عقد میں میں صرف فرماتے آپ کی بیٹی جناب فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے سوال کیا کہ آپ فدک کی آمدنی میرے لیے مقرر فرمادیں مگر آپ نے اس سے انکار فرمادیا اور آپ کی حیات تک فدک کا معاملہ بدستور رہا اور جب جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ والی ہوئے تو انہوں نے بھی اس معاملہ کو اسی طرح رکھا جس طرح حضور ﷺ نے رکھا تھا یہاں تک کہ ان کا بھی وصال ہو گیا، پھر جناب عمر خطاب رضی اللہ عنہ والی ہوئے تو آپ نے وہی راہ عمل اختیار کیا جو حضور

1۔ سنن ابی داؤد، باب في صفايا رسول الله ﷺ من الأموال، 3/ 143، رقم :2972، ط: المكتبة العصرية، صيدا بيروت

اب ان کا ڈھیٹ پن دیکھئے کہ پہلے تو طعن کرتے رہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے میراث کا حق بنتے ہوئے بھی میراث نہیں دی اور جب ان کے ائمہ معصومین کے طرز عمل اور ان کی روایات سے یہ بات ثابت کر دی گئی کہ متروکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم میں میراث جاری نہیں ہوتی تو اب پینترا بدل کر ایک اور دعویٰ تراشا اور ایک طعن کر ڈالا، ملاحظہ ہو۔

طعن نمبر 13: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے باغ فدک سیدہ رضی اللہ عنہا کو نہیں دیا تھا

کہ باغ فدک[1] جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جناب سیدہ فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کو نہیں دیا حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ہبہ کر دیا تھا، ان کے دعویٰ کو ناقابل سماعت قرار دے کر انہیں گواہ پیش کرنے کے لئے کہا اور جب جناب سیدہ رضی اللہ عنہا نے گواہی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ام ایمن رضی اللہ عنہا کو پیش کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس گواہی کو رد کر دیا اور فرمایا ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں ہونی چاہئیں، اس پر جناب سیدہ رضی اللہ عنہا ناراض ہو گئیں اور آپ سے بول چال بند کر دی حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا تھا "من أغضبها أغضبني"[2] جس نے ان کو غصہ دلایا اس نے مجھے ناراض کیا۔

جواب: اس اعتراض کا یہ ہے کہ حضرت زہراء رضی اللہ عنہا کا دعویٰ ہبہ اور گواہی میں جناب علی وام ایمن یا بروایت دیگر جناب حسنین رضی اللہ عنہم کو پیش کرنے کی روایات افتراء اور جھوٹ ہیں کیونکہ اہل سنت کی کتابوں میں اس معاملہ کی کسی کوئی روایت موجود نہیں لہذا اس کا سہارا لے کر اہل سنت پر الزام لگانا اور ان سے جواب طلب کرنا نادانی

4۔ نبی کی وراثت اس لیے بھی نہیں ہوتی کہ لوگ کہیں یہ گمان نہ کرنے لگیں کہ نبی بھی العیاذ باللہ عام دنیاداری کی طرح اپنی اولاد اور آئندہ نسلوں کے لیے مال جمع کر کے رکھتے تھے بلکہ نبی کی تو شان یہ ہے "لَا یَدَّخِرُ لِغَدٍ" کہ نبی تو دوسرے دن کے لیے بھی کچھ باقی نہیں رکھتا چہ جائیکہ اولاد کے لیے جمع کرے۔

5۔ اگر نبی کی اولاد میں وراثت چلنے کا قانون ہوتا تو ممکن تھا کہ کوئی بد بخت جائیداد کے حصول کی غرض سے نبی کو ہلاک کرنے کی کوشش کرتا جو کہ اس کی دنیا و آخرت دونوں کو برباد کر دیتی۔ (زبدۃ الشمائل شرح شمائل ترمذی، باب ماجاء فی میراث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ص: 244، ط: دار الایمان)

1۔ فدک ایک شہر کا نام تھا جو مدینہ منورہ سے شمالی جانب تقریباً تین منزل کی مسافت پر واقع تھا، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فتح الباری میں تحریر فرماتے ہیں: واما فدك وهي بفتح الفاء والهملة بعدها كاف بلد بينها وبين المدينة ثلاث مراحل - (فتح الباری، 6/ 151) اور فدک کی فاء اور دال دونوں زبر سے ہیں اور آخر میں کاف ہے یہ ایک شہر ہے جس کے درمیان اور مدینہ منورہ کے درمیان تین منزل کا فاصلہ ہے۔

2۔ ابن المطهر الحلي في نهج الحق: ص 263.

اور دھاندلی ہے، اہل سنت کی کتابوں میں جو روایت ملتی ہے وہ اس کے برعکس اور مخالف ہیں چنانچہ مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد جناب مغیرہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب جناب عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ ہوئے تو تمام بنو مروان کو جمع کیا اور فرمایا:

إن رسول الله صلى الله عليه وسلم: "كانت له فدك، فكان ينفق منها ويعود منها على صغير بني هاشم، ويزوج منها أيمهم، وإن فاطمة سألته أن يجعلها لها فأبى"، فكانت كذلك في حياة رسول الله صلى الله عليه وسلم، حتى مضى لسبيله، فلما أن ولي أبو بكر رضي الله عنه، عمل فيها بما عمل النبي صلى الله عليه وسلم، في حياته حتى مضى لسبيله، فلما أن ولي عمر عمل فيها بمثل ما عملا حتى مضى لسبيله، ثم أقطعها مروان، ثم صارت لعمر بن عبد العزيز، قال عمر يعني ابن عبد العزيز: فرأيت أمرا منعه رسول الله صلى الله عليه وسلم فاطمة عليها السلام، ليس لي بحق، وأنا أشهدكم أني قد رددتها على ما كانت يعني على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم[1] وابى بكر وعمر

بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فدک تھا آپ اس کی آمدنی خرچ فرماتے ہاشمی بچوں کی غور و پرداخت اور بیواؤں کے عقد میں میں صرف فرماتے آپ کی بیٹی جناب فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے سوال کیا کہ آپ فدک کی آمدنی میرے لیے مقرر فرمادیں مگر آپ نے اس سے انکار فرمادیا اور آپ کی حیات تک فدک کا معاملہ بدستور رہا اور جب جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ والی ہوئے تو انہوں نے بھی اس معاملہ کو اسی طرح رکھا جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا تھا یہاں تک کہ ان کا بھی وصال ہو گیا، پھر جناب عمر خطاب رضی اللہ عنہ والی ہوئے تو آپ نے وہی راہ عمل اختیار کیا جو حضور

1۔ سنن ابی داؤد، باب في صفايا رسول الله ﷺ من الأموال، 3/ 143، رقم: 2972، ط: المكتبة العصرية، صيدا بيروت

صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب ابو بکر نے اختیار کی تھی آپ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد مروان نے اسے جاگیر بنا لیا، اور اب اسی صورت میں یہ میری تحویل میں آیا تو میں نے سوچا کہ جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لخت جگر کو نہیں دیا میرے لئے اس میں حصہ نہیں نہ میں اس کا مستحق ہوں لہذا میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اسکی پہلی حیثیت بحال کر دی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم و جناب ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے عہد میں تھی۔

تو جب ہبہ کی حقیقت ہی فی الواقع ثابت نہیں ہے تو دعویٰ کا پیش کرنا اور ایسے حضرات کی گواہی دینا جو شیعوں کے نزدیک معصوم ہیں اور ہمارے نزدیک بھی صادق و معتبر ممکن ہی نہ رہا اور نہ اس کی کوئی گنجائش باقی رہی!

اس کا ایک جواب دوسرے پہلو سے یہ ہے کہ شیعہ و سنی دونوں کا اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ ہبہ کی ہوئی چیز جس کی ہبہ کی گئی ہو اوہ اس وقت تک اس کی ملکیت میں نہیں آتی جب تک اس کے قبضہ و تصرف میں نہ آجائے اور یہ بات ہر گروہ کے اجماع سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں فلک سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے قبضہ و تصرف میں نہیں آیا تھا بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ و تصرف میں تھا اور آپ اس پر مالکانہ تصرف فرمایا کرتے تھے پس جناب سیدہ نے دعوی کیا تو جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کی تکذیب نہیں کی بلکہ ایک مسئلہ فقہیہ بیان فرمایا کہ صرف ہبہ سے ملک ثابت نہیں ہوئی تاوقتیکہ قبضہ ثابت نہ ہوں قبضہ ثابت ہونے کی صورت میں کسی گواہ و شاہد کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور بالفرض جناب امیر المؤمنین وام ایمن رضی اللہ عنہم بطریق اخبار اسی ہبہ کا اظہار کیا ہو گا تو اس کو شہادت کی تردید کہنا جہالت کی بدترین صورت ہے یہ ایک مرد اور ایک عورت کی گواہی پر فیصلہ نہ کرنا ہے ان کی شہادت رد کرنا نہیں ہے اور شہادت تو یہ ہے کہ گواہ پر تہمت لگائیں اور اسے جھوٹا قرار دیں، شاہد کی تصدیق کرنا اور چیز ہے اور شہادت کے موافق حکم لگانا اور چیز ہے، یہاں جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے شہادت کی تصدیق تو کی لیکن چونکہ شہادت نامکمل تھی اس لئے فیصلہ شہادت کی صورت حال پر دیا اور جو اتنا کودن اور بیوقوف ہو کہ ان دونوں باتوں میں فرق نہ کر سکے اور حکم نہ کرنے کو گواہ یا مدعی کی تکذیب سمجھے، علماء کے نزدیک وہ قابل خطاب ہی کب ہے قرآنی نص و حکم کے مطابق جب شرعی مسئلہ ہی یہ ہے کہ گواہوں میں دو مرد یا ایک مرد و دو عورتیں نہ ہوں تو کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا تو ایسی صورت میں حکم شرع کی وجہ سے جناب

صدیق رضی اللہ عنہ مجبور تھے حکم وفیصلہ کیسے دے سکتے تھے۔

اب رہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے حق میں کہ "فمن أغضبها أغضبني" اس موقعہ پر لانا لغت عرب سے ناواقفیت اور نادانی کی دلیل ہے اس لئے کہ اغتضاب غصہ دلانا یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو اپنے قول یا فعل سے بالارادہ غصہ دلائے اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کی ایذاء رسانی کا قصد تو کیا تصور تک نہیں کر سکتے تھے، وہ تو بار بار ان الفاظ معذرت سے تعلق خاطر کا اظہار فرماتے رہتے تھے:

والله يا ابنة رسول الله إن قرابة رسول الله أحب إلي أن أصل من قرابتي [1]

اللہ کی قسم ہے رسول اللہ کی لخت جگر صلہ رحمی کے لئے مجھے رسول اللہ کی قرابت اپنی قرابت سے زیادہ محبوب ہے۔

جب غصہ دلانے کا آپ سے فعل سرزد ہی نہیں ہوا تو آپ اس وعید کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں، ہاں ہو سکتا ہے کہ تقاضائے بشریت سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کو غصہ آیا ہوں مگر وعید اغضاب پر مبنی ہے غضب پر نہیں، اس لئے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اس سے کیا خوف وخطر! اگر وعید کے یہ الفاظ ہوتے "مَنْ غَضِبَ عَلَيْهِ غَضِبْتُ عَلَيْهِ" (آپ جس پر غصہ ہوئیں میں بھی اس پر غصہ ہوا) تو البتہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے خوف کا مقام تھا۔

اس کے علاوہ سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا خانگی معاملات میں کئی بار جناب علی مرتضی رضی اللہ عنہ پر غصہ ہوئیں ان میں سے ایک موقعہ وہ تھا جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو جہل کی بیٹی کو اپنے لئے نکاح کا پیغام دیا، تو سیدہ رضی اللہ عنہا افسردہ وگریاں باباجان صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شاکی ہوئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی معاملہ میں خطبہ دیا جس میں فرمایا:

"ألا إن فاطمة بضعة مني يؤذيني ما آذاها ويريبني ما رابها، فمن أغضبها أغضبني" [2]

1۔ مسند الامام احمد بن حنبل، 1/ 223، رقم: 55، ط: مؤسسة الرسالة

2۔ وهذه المناسبة التي قال بها النبي ﷺ الحديث توضحه، أخرج البخاري عن المسور بن مخرمة قال: «إن عليا خطب بنت أبي جهل، فسمعت بذلك فاطمة فأتت رسول الله ﷺ فقالت: يزعم قومك أنك لا تغضب لبناتك، وهذا

ترجمہ: فاطمہ میرے بدن کا ٹکڑا ہیں جس نے اس کو ایذاء پہنچائی اس نے مجھ کو ایذاء پہنچائی جس نے ان کو فکر وتردد میں ڈالا مجھے فکر وتردد میں ڈالا جس نے ان کو غصہ دلایا اس نے مجھے غصہ دلایا۔

ایک دوسرا موقعہ وہ تھا کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ جناب سیدہ سے ناراض ہو کر گھر سے نکل کر مسجد میں جا کر بغیر کچھ بچھائے ننگی زمین پر سو گئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ زہراء کے پاس تشریف لائے اور دریافت فرمایا" أين ابن عمي؟ "میرے چچا کے بیٹے کہاں ہیں، جناب سیدہ رضی اللہ عنہا نے کہا" غاضبني فخرج ولم يقل عندي "[1] مجھ سے رنجش کی اور نکل گئے، گھر میں قیلولہ بھی نہیں کیا، یہ دونوں صحیح الثبوت اور متفق علیہ روایات ہیں اور یہ بات تو بہت مشہور وواضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بتقاضائے بشریت اتنا غضبناک ہوئے کہ بڑے بھائی اور رسول ہونے کے باوجود جناب ہارون علیہ السلام کے سر وڈاڑھی کے بال پکڑ کر ان کو جھنجھوڑ ڈالا حالانکہ یہ یقینی بات ہے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو غصہ دلانے کا کوئی قصد وارادہ نہیں کیا تھا کیونکہ نبی کو غضبناک کرنا کفر ہے اور یہ بات بلاشک درست ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام غضبناک ہوئے، لہذا اگر یہ معاملہ غضبناک کرنے کا ہوتا تو معاذ اللہ حضرت ہارون علیہ السلام منصب رسالت پر کہاں رہتے۔

ایک اور جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ ہم مانے لیتے ہیں کہ جناب سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا میراث نہ ملنے یا دعویٰ ہبہ تسلیم نہ کئے جانے کے سبب ناراض ہوئیں اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بات چیت بند کر دی، لیکن اسی کے ساتھ شیعوں اور سنیوں کی صحیح روایات میں یہ بات بھی تو ثابت ہے کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ بات شاق گذری اور جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے در دولت پر تشریف لے جا کر جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنا سفارشی بنایا تاآنکہ سیدہ رضی اللہ عنہا آپ سے خوش دل ہوئیں۔

علي ناكح بنت أبي جهل، فقام رسول الله ﷺ، فسمعته حين تشهد يقول: أما بعد أنكحت أبا العاص بن الربيع فحدثني وصدقني، وإن فاطمة بضعة مني وإني أكره أن يسوءها، والله لا تجتمع بنت رسول الله ﷺ وبنت عدو الله عند رجل واحد فترك علي الخطبة».(صحيح البخاري، باب ذكر أصهار النبي ﷺ، منهم أبو العاص بن الربيع، 5/ 22، رقم: 3729، ط: دار طوق النجاة)

1۔صحيح مسلم، 7/ 124، ط: دار الفكر بيروت لبنان

اہل سنت کی روایات تو مدارج النبوت، کتاب الوفاء، بیہقی، اور شروح مشکوۃ میں موجود ہیں بلکہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی شرح مشکوۃ میں یہ مذکور ہے کہ قضیہ کے بعد حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر تشریف لے گئے گرمی کا موسم تھا دروازہ پر دھوپ میں کھڑے ہوئے اور معذرت پیش کی اور سیدہ آپ سے راضی اور خوش ہو گئیں، ریاض النضرہ میں بھی یہ قصہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اور فصل الخطاب بیہقی میں بروایت شعبی یہ قصہ منقول ہے، اور ابن السمان نے کتاب الموافقہ میں اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ روایت بیان کی ہے کہ گرمی کے ایک دن جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت سیدہ بتول الزہراء رضی اللہ عنہا کے دروازہ پر تشریف لائے اور فرمایا اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نور نظر، لخت جگر میں دروازہ سے اسوقت تک نہیں ٹلوں گا جب تک آپ مجھ سے راضی نہ ہو گی، اسوقت حضرت علی رضی اللہ عنہ جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور آپ کو قسم دے کر کہا کہ ناراضگی ختم کر دیں چنانچہ آپ نے اظہار خوشنودی فرمایا اور راضی ہو گئیں۔ (1)

1۔ سیدہ فاطمۃ الزہراء کی ناراضگی کے متعلق روایات میں جو الفاظ آئے ہیں وہ مختلف ہیں بعض میں تو فغضبت فاطمة آیا ہے اور بعض روایات میں فوجدت فاطمة آیا ہے اور صحیح بخاری کتاب المغازی میں فاطمة علی ابی بکر آیا ہے، اور لفظ وجدت جس طرح بمعنی غضبت آتا ہے جو غصہ پر دلالت کرتا اسی طرح بمعنی حزنت بھی آتا ہے جو حزن، غم اور رنج پر دلالت کرتا ہے۔
لامع الدراری میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے بخاری شریف کی روایت میں جو غضبت کے الفاظ ہیں اس کے بارے میں فرمایا کہ "درحقیقت راوی نے اپنی سمجھ کے مطابق روایت بالمعنی کرتے ہوئے غضبت کے الفاظ کہہ دیئے"۔(لامع الدراری ،باب مایکرہ من ذبح الابل ،7/ 290)
بعض علماء کا خیال ہے کہ "فوجدت فاطمة علی ابی بکر ۔۔۔۔۔الخ " کے الفاظ یہ اصل روایت کا حصہ ہی نہیں ہیں بلکہ امام زہری کی طرف سے ادراج ہے، اور امام زہریؒ اس بارے میں مشہور ہیں کہ روایت بیان کرتے ہوئے درمیان میں اپنے الفاظ بھی بیان کر دیتے ہیں اور بسا اوقات اس کی وضاحت بھی بیان نہیں کرتے جس کی وجہ سے ان کے اپنے کلام کو بھی روایت کے الفاظ سمجھ لیا جاتا ہے، امام مالک کے شیخ ربیعۃ الرائ امام زہری سے کہا کرتے تھے: یا ابا بکر اذا حدث الناس برایک فاخبرهم انه رایک ،واذا حدث الناس بشیئ من السنة فاخبرهم انه سنه فلا یظنون انه رایک ۔(الفقیہ والمتفقہ، للخطیب بغدادی،2/ 148)اور حافظ نے بھی النکت علی ابن الصلاح میں لکھا ہے:
وکذا کان الزهری یفسر الاحادیث کثیرا ،وربما اسقط اداة التفسیر ۔(النکت علی ابن الصلاح،1/ 829)اور ان الفاظ کے مدرج ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق کی طرف حضرت فاطمہ کا میراث کے سلسلہ میں مراجعت کا واقعہ تقریباً 36 طرق سے مروی ہے ان 36 میں سے 25 طرق کا مدار امام زہریؒ پر ہے اور 11 طرق ان کے علاوہ دوسرے راویوں سے مروی ہیں، امام زہری کے علاوہ جو گیارہ طرق ہیں ان میں کہیں بھی حضرت فاطمہ کی حضرت ابو بکر صدیق سے ناراضگی اور قطع تعلق کا ذکر نہیں ہے، اور امام زہری کے بھی 25 میں سے 9 طرق

اب رہے شیعہ تو ان میں سے زیدیہ بعینہٖ اہل سنت کی روایات کے مطابق روایت کرتے ہیں اور امامیہ میں سے محجاج السالکین کے مصنف اور دیگر علمائے شیعہ یوں روایت کرتے ہیں:

أن أبا بكر لما رأى أن فاطمة انقبضت عنه وهجرته ولم يتكلم بعد ذلك في أمر فدك كبر ذلك عنده فأراد استرضاءها فأتاها فقال لها صدقت يا ابنة رسول الله فيما ادعيت، ولكني رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقسمها فيعطي الفقراء والمساكين وابن السبيل بعد أن يؤتي منها قوتكم والصانعين بها. فقالت: افعل فيها كما كان أبي رسول الله صلى الله عليه وسلم يفعل فيها. فقال: ولك الله على أن افعل ما كان يفعل ابوك. فقالت: والله لتفعلن؟ فقال: والله لفعلن ذلك. فقال: اللهم اشهد. فرضيت بذلك وأخذت العهد عليه. وكان أبو بكر يعطيهم منها قوتهم ويقسم الباقي على من ذكر.[1]

جب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے مجھ سے کبیدہ خاطر ہو کر تعلقات توڑے ہیں اور فدک کے معاملہ میں کوئی بات نہیں اٹھائی تو آپ پر یہ بہت شاق گزرا آپ نے ان کو راضی کرنا چاہا، آپ ان کے پاس آئے اور کہا اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی، آپ اپنے دعوی میں سچی ہیں لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دیکھا ہے اس کی آمدنی میں سے تم کو اور اس میں کام کرنے والوں کو دینے کے بعد باقی فقیروں مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم فرمادیا

میں اس ناراضگی کا ذکر نہیں ہے 16 طرق میں اس کا تذکرہ ہے تو اس حساب سے 36 میں سے 20 طرق میں ناراضگی کا ذکر نہیں ہے، اور جن میں ہے وہ صرف امام زہری کی روایات ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ یہ امام زہری کی طرف سے ادراج ہے ورنہ ان کے علاوہ جن گیارہ طرق سے یہ واقعہ مروی ہے ان میں بھی اس کا تذکرہ ہوتا۔ (رحماء بینھم ،1/ 127،126)

1۔ وذكر ابن المطهر الحلي في كتابه (منهاج الكرامة) أنه لما وعظت فاطمة أبا بكر في فدك ردها عليها، فسقط الطعن كله من كلامهم. منهاج السنة النبوية: 6/ 30

کرتے تھے اس پر جناب فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آپ بھی اسی طرح کریں جیسے میرے والد رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ کی قسم میں تمہارے لئے وہ کام کروں گا جو کچھ تمہارے والد ﷺ کیا کرتے تھے تو آپ بولیں بخدا تم ایسا ہی کرو گے ابو بکر پھر فرمایا بخدا میں ضرور کروں گا اس پر سیدہ فاطمہ نے فرمایا اے اللہ تو گواہ رہ! پس آپ ان سے راضی ہوگئیں اور اس پر عہد لیا پھر ابو بکر اس کی آمدنی سے آپ کو دیا کرتے اور باقی کو فقیروں مسکینوں اور مسافروں پر تقسیم کرتے۔

یہ محجاج السالکین اور معتبر کتابوں کی عبارت ہے ،ان کی اس عبارت سے صاف معلوم ہوا کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جناب سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے دعوی کی تصدیق فرمائی لیکن رسول اللہ ﷺ کا اس میں تا حین حیات تصرف کرنا اور اس پر قبضہ نہ کرنا انہوں نے ملک کے مخالف سمجھا جیسا کہ پوری امت کے نزدیک طے شدہ بات ہے اب جب (انہیں لوگوں کے حوالہ کے مطابق) جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے دعوی کی تصدیق فرمادی تو پھر ام ایمن اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے گواہ بنانے کی کیا ضرورت رہ گئی تھی، (جس کو اپنے طعن میں بیان کیا) بفضلہ تعالیٰ امامیہ ہی کی روایات سے حق ظاہر ہو گیا، اور یہ لوگ جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر شہادت کے رد اور دعوی کے تخارج کرنے کی تہمت لگاتے تھے سراسر جھوٹے ثابت ہوئے وَاللہ یحقّ الْحَقّ وَیُبطل الباطل اور اللہ تعالیٰ حق کو حق ثابت کرتا ہے اور باطل اور کو باطل۔

جب علماء شیعہ نے یہ دیکھا کہ ہبہ والا شوشہ تو ناکام ہو گیا کہ قبضہ کے بغیر جب ملکیت نہیں ہوئی تو اس شرعی مسئلہ پر جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کو کیوں غصہ آیا، اور اس میں جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کیا قصور تو ہمارے زمانہ کے شیعی علماء اس دعوے سے بھی منحرف ہو گئے اور ایک دوسرا دعوی گھڑ دیا اور ایک اور اعتراض جڑ دیا جو یہ ہے۔

طعن نمبر 14: سیدنا ابو بکر نے نبی کریم ﷺ کی وصیت کے باوجود سیدہ کو فدک نہ دیا

کہ حضور ﷺ نے تو سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے لئے فدک کی وصیت فرمائی تھی مگر جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو فدک پر قبضہ نہیں دیا اور یوں انہوں نے پیغمبر ﷺ کی وصیت کی خلاف ورزی کی۔

جواب: اس کا کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے۔

اول تو محترم جناب سیدہ ﷞ کی طرف سے وصیت کا دعویٰ، اس کے ثبوت میں اہل سنت یا شیعہ حضرات کی معتبر کتابوں سے بطور شہادت حوالہ سامنے لائیں پھر اس کے جواب کا مطالبہ کریں۔

دوسرے شیعوں اور سنیوں کا اس پر اجماع ہے کہ وصیت اور میراث دونوں ایک ہی چیز ہیں لہذا جس مال میں میراث جاری نہیں ہوگی اس میں وصیت کیسے چلے گی؟ اس لئے کہ وصیت اور میراث دونوں میں موت کے بعد ملکیت منتقل ہوتی ہے اور انبیاء ﷤ بعد وصال کسی چیز کے مالک نہیں رہتے وہ ملکیت خدا کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، اور بیت المال اس کا نگران ہوتا ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ "الانبیاء لا یشھدون ملکا مع اللہ"[1] پیغمبر اللہ کے ہوتے کسی چیز کو اپنی ملک نہیں سمجھتے، ان کے قبضہ و تصرف میں جو اشیاء ہوتی ہیں، اسے وہ عاریت سمجھتے ہیں اور اسے استعمال فرماتے ہیں، اسی لئے ان پر زکوۃ بھی فرض نہیں ہوتی نہ ان کے ترکہ سے قرضہ چکایا جاسکتا ہے، اور مال عاریت میں نہ وصیت نافذ ہوتی ہے نہ میراث اور جب ائمہ معصومین کی روایت سے انبیاء کرام ﷤ کے اموال میں میراث کا جاری نہ ہونا قطعی طور سے ثابت ہو گیا تو وصیت کا جاری نہ ہونا بطریق اولی ثابت ہوا کیونکہ توریث تو وصیت سے بمراتب قوی تر ہے! اور وصیت اس سے ضعیف تر۔

تیسرے کسی مخصوص فرد کیلئے وصیت اس وقت درست ہوتی ہے، جب وصیت کرنے والے سے اس سے قبل کوئی بات خلاف وصیت صادر نہ ہوئی ہو اور اس معاملہ میں حضور ﷺ پہلے ہی یہ فرما چکے تھے "ما ترکناہ صدقة"[2] ہم جو بھی چھوڑیں وہ صدقہ ہے، اس لیے جو آپ کا مال تھا وہ فی سبیل اللہ وقف ہوا اب اس میں وصیت کی گنجائش کہاں رہی۔

چوتھے ہم وصیت کی بات کو درست بھی مان لیں تو جناب صدیق اکبر ﷛ کو ذاتی طور پر یہ معلوم نہ ہوگی اور

1۔ الشفاء بتعریف حقوق المصطفی (ﷺ) الباب الأول (في أمر الدين وعصمة الأنبياء) الفصل الرابع (في عصمة قلوبهم وجوارحهم) 2/ 152، ط: دار الفكر (بيروت)

2۔ صحيح بخاري، كتاب الفرائض ، باب :قول النبي صلى الله عليه وسلم "لا نورث ما تركنا صدقة"8/ 151، رقم: 6725، ط: دار طوق النجاة

شاہدوں کے ذریعہ اس کا ثبوت نہ ہوا تو آپ تو اس میں معذور سمجھے جائیں گے، لیکن جناب امیر رضی اللہ عنہ کو اپنی خلافت کے وقت کیا عذر ہو سکتا تھا، کہ آپ نے بھی اس وصیت پر عملدر آمد نہیں فرمایا اور بدستور اس کی آمدنی سابقہ مصارف پر ہی صرف فرماتے رہے اگر آپ نے اپنا حصہ راہ خدا میں دے دیا تو جناب حسنین رضی اللہ عنہما اور آپ کی بہنوں کو اپنی والدہ کی میراث سے کیوں محروم فرمایا؟ شیعوں نے اس کے چار جواب دیئے ہیں مگر چاروں میں سقم اور خامیاں ہیں ہم یہاں سے ان کو بیان کرتے ہیں۔

شیعہ کے بعض مغالطے اور ان کا جواب

1۔ اہل بیت غصب کی ہوئی چیز کو واپس نہیں لیتے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ذاتی مکان فتح مکہ کے بعد غاصب سے واپس نہیں لیا۔

مگر ان کا یہ جواب غلط اور مغالطہ آمیز ہے اس لئے کہ عہد عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ میں خود انہوں نے جناب باقر رحمۃ اللہ علیہ کے قبضہ میں فدک دیا اور وہ انہی کے زیر تصرف رہا تا آنکہ خلفاء عباسیہ کا دور آیا اور وہ اس پر قابض و متصرف ہوئے، پھر 206ھ میں مامون عباسی نے اپنے عامل قثم بن جعفر کو لکھا کہ فدک اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا کے قبضہ میں دیدے اس وقت امام علی رضی اللہ عنہ اس پر قابض و متصرف ہوئے پھر متوکل عباسی نے اس پر قبضہ جمایا تو پھر معتضد نے اپنے عہد میں واپس کر دیا جب مکتفی نے دوبارہ قبضہ کر لیا تو معتضد نے دوبارہ اس کو لوٹا دیا چنانچہ قاضی نور اللہ نے مجالس المؤمنین میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے لہذا اگر ان شیعوں کا مذکورہ بالا جواب درست ہے تو اہل بیت کے ان قابل احترام بزرگوں نے اسے کیسے قبول کر لیا، اور ان کے پاس اس کا کیا جواب وجواز ہے کہ ان کے نزدیک فدک کی طرح خلافت بھی تو غصب کر لی گئی تھی، تو حضرت عثمان غنی شہید رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے کیوں قبول فرمالیا اور جناب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اس مغصوبہ شے کو چھین لینے کی ایسی کوشش وسعی کیوں فرمائی کہ جس کے نتیجہ میں آپ کی شہادت تک کی نوبت پہنچی۔

2۔ دوسرا جواب ان کا یہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے طریق عمل کی اقتداء فرمائی کہ ملک سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

یہ جواب بھی سراسر باطل ہے کیونکہ دیگر ائمہ اہل بیت نے جناب امیر رضی اللہ عنہ اور سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے طریق

عمل کی اقتدا کیوں نہیں کی اور فدک کو اپنے زیر تصرف لا کر اس سے کیوں نفع اندوز ہوئے، پھر یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جناب سیدہ کی یہ اقتداء فرض تھی یا نفل؟ اگر فرض تھی تو دوسرے ائمہ نے یہ فرض کیوں ترک کیا، اور اگر نفل تھی تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے نفل کی خاطر فرض کیوں چھوڑا؟ یعنی حقدار کو حق پہنچانا اور پھر اقتداء تو کسی شخص کے اختیاری افعال میں کی جاتی ہے نہ کہ اضطراری افعال میں، اگر سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا ظلم و ستم کے سبب فدک سے فائدہ نہ اٹھا سکیں تو وہ تو سراسر مجبور تھیں اور مظلومیت و بے بسی میں کسی کی پیروی واقتداء کے کیا معنی؟ اور اگر اقتدا بھی کرتے تو خود اس سے فائدہ نہ اٹھاتے بچوں کو ان کی میراث اور حق سے تو محروم نہ فرماتے۔

3۔ تیسرا جواب تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ نے جو اس سلسلہ میں گواہی دی تھی وہ اپنے مفاد کی خاطر نہیں دی تھی بلکہ اللہ کی خوشنودی کے لئے دی تھی۔

یہ جواب بھی قباحتوں سے پر ہے، اول تو یہ کہ جو لوگ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے متعلق اپنے دل میں بدگمانی رکھتے ہوں گے وہ وہی تو ہوں گے جنہوں نے ہبہ و وصیت میں آپ کی شہادت کو رد کیا ہو گا اور ایسے حضرات اب جناب امیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں زندہ ہی کیا تھے! وہ کیسے جان سکتے تھے کہ آپ کا فائدہ نہ اٹھانا اس نقطہ خیال پر مبنی تھا، دوسرے یہ کہ جب جناب امیر رضی اللہ عنہ کی اولاد اس سے متمتع اور مستفید ہو گئی تو نواصب و خوارج کو تو یہ بدگمانی کرنے کا تو موقعہ مل جائے گا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے یہ سب کچھ اپنی اولاد کی خاطر اور ان کو نفع پہنچانے کے لئے کیا خاص کر زمین، ملک اور باغ میں تو انسان اپنے ذاتی نفع سے زیادہ اولاد کا مفاد پیش نظر رکھتا ہے، ایسی صورت میں تقاضائے دور اندیشی یہ تھا کہ اولاد کرام کو وصیت فرما جاتے کہ تم اس سے ہر گز ہر گز فائدہ نہ اٹھانا کہ کہیں میری شہادت و گواہی مجروح نہ ہو جائے اس وقت اولاد کے سامنے بھی دو نظریں ہوتیں اور اسے قبول نہ کرنے کا داعیہ قوی ہوتا۔

4۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ تقیہ پر عمل کے طریق پر مبنی ہے۔

مگر اس جواب میں سقم اور خرابی یہ ہے کہ سارے ہی امامیوں کا یہ مذہب ہے کہ جب امام حالت جنگ وقتال میں ہو یا خروج کے وقت میں ہو تو اس وقت قطعاً تو یہ حرام ہو جاتا ہے اسی لئے جناب حسین رضی اللہ عنہ نے کوئی تقیہ نہیں کیا یہاں تک کہ راہ خدا میں جان ہار دی، لہٰذا اگر جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں تقیہ فرمایا یا تو وہ امامیوں کے نزدیک معاذ اللہ فعل حرام کے مرتکب ہوئے اور پھر اگر ان تمام باتوں سے قطع نظر بھی کر لی

جائے تو شیخ ابن مطہر حلی نے اپنی کتاب منہاج الکرامہ میں ایک ایسی بات لکھ دی ہے جو اس اشکال کی جڑ ہی اکھاڑ پھینکتی ہے اور پھر جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر طعن و اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہتی، اور وہ یہ ہے:

انہ لما وعظت فاطمة ابا بكر في فدك كتب لها كتابا وردها عليها[1]

جب حضرت فاطمہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو فدک کے سلسلہ میں نصیحت فرمائی تو آپ نے ایک تحریر لکھ کر جناب سیدہ کو بھیجی اور فدک انہیں کو لوٹا دیا۔

اب اس روایت کو صحیح مان لینے کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ذمہ جو بھی دعویٰ ہو ہبہ کا ہو یا میراث و وصیت کا ساقط ہو جاتا ہے اور شیعوں کا یہ منہ نہیں رہتا کہ اب وہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ پر کوئی طعن یا اعتراض کریں۔

البتہ دو شبہے اب بھی شیعہ و سنی دونوں کے دلوں میں کھٹکتے ہیں، اول تو یہ کہ مان لیا جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کا دعویٰ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے نزدیک پایہ ثبوت کو نہیں پہنچا لیکن جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کی اگر مرضی اس کو لینے میں تھی تو جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے اتنا توقف کیوں کیا، اول ہی مرحلہ پر کیوں نہ دے دیا کہ بات اتنی نہ بڑھتی اور نوبت رنجش تک نہ پہنچتی اور نہ صلح و صفائی کی ضرورت رہتی۔

اس شبہ کو یوں دفع کیا جا سکتا ہے کہ اس مقدمہ میں جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بڑے خلجان میں پڑ گئے تھے اگر جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کی دلجوئی مقدم رکھتے ہیں تو دین میں دو بڑے رخنے پیدا ہو جاتے ہیں، اول یہ کہ اس کے بعد لوگ یہ یقین کر لیں گے کہ امور مؤمنین میں خلیفہ فرق مراتب کرتے اور رعایت سے کام لیتے ہیں کہ لحاظ والوں کو بغیر ثبوت دعویٰ ہی ان کا حق دے دیتے ہیں جبکہ عام لوگوں سے ثبوت دعویٰ کی خاطر گواہ طلب

1۔ وذكر ابن المطهر الحلي في كتابه (منهاج الكرامة) أنه لما وعظت فاطمة أبا بكر في فدك ردها عليها، فسقط الطعن كله من كلامهم. منهاج السنة النبوية: 6/ 30

امام محمد باقر رحمہ اللہ، امام زین العابدین رحمہ اللہ کا قول نقل کرتے ہیں جس کو شیعہ سنی دونوں نے اپنی کتب میں ذکر کیا ہے: عن كثير النواء قال قلت لابی جعفر اخبرنی عن ابی بكر و عمر اظلما من حقكم شيئا؟ قال لا اومنزل القرآن على عبده ليكون للعالمين نذيراً ما ظلما نا من حقنا ما يزن حبة خردل ۔ (كتاب فضائل ابی بكر الصديق لابی طالب محمد بن علی بن الفتح الحربی العشاری ،المتوفی 446ھ مطبوعہ مصر)

فرماتے ہیں، اور یہ بدگمانی دین میں اتنے بڑے فساد کا سبب بنتی کہ قیامت تک اس کا تدارک نہ ہو پاتا بعد میں آنے والے حکام و قاضی اپنے دستور العمل میں اسی کو نظیر بنا کر من مانے فیصلے کیا کرتے اور جگہ جگہ ناحق، نرمی و سستی رعایت و جانبداری اس دستاویز کے پیش نظر عمل میں لاتے۔ دوسرے یہ کہ اگر سیدہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو فدک دے دیتے تو لامحالہ آپ کو اس کا مالک بنا دیتے اور وارث کی ملکیت درحقیقت مورث کے ملک ہے کیونکہ یہ اسی کا تو نائب ہے تو اس صورت میں اس زمین کا خاندان نبوت میں واپس لے آنا ہو گا، حالانکہ بفرمان رسول امین صلی اللہ علیہ وسلم "ما ترکناه صدقة" یہ صدقہ رسول تھی اور صدقہ کی واپسی کو آپ نے ایسا برا فرمایا ہے گویا کتے کا قے کر کے چاٹ لینا ہو گا تو آپ سے ایسی سنگین چوک کیسے ہو سکتی تھی!

یہ دو دینی وجوہات آپ کے پیش نظر تھیں اس کے علاوہ ایک دنیاوی وجہ بھی سامنے تھی کہ سیدہ الزہراء رضی اللہ عنہا کا مطالبہ پورا کر دینے کی صورت میں اسی قسم کے مطالبات حضرت عباس و امہات المؤمنین رضی اللہ عنہم کی طرف سے بھی اگر پیش ہو جاتے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ایسی الجھن میں پڑ جاتے کہ کچھ بنائے نہ بنتا، ان ہی باتوں کے پیش نظر مجبوراً آپ نے بحکم حدیث نبوی:

"المؤمن إذا ابتلي ببليتين اختار أهونهما "(1)

جب مومن دو بلاؤں میں گھر جاتا ہے تو وہ ان دونوں میں سے جو ہلکی ہو اسے اختیار کر لیتا ہے۔

یہی صورت اختیار فرمائی کہ گو وقتی طور پر ناگوار ہو گا مگر اس کا تدارک ہو سکتا ہے، جیسا کہ ہو گیا، مگر دوسری صورت کا کوئی تدارک ممکن نہ تھا اور پھر دین میں جو فساد پیدا ہوتا اس کی قیامت تک ذمہ داری آپ کی گردن پر رہتی، اس صورت میں یہ شرعی مسئلہ بھی طے ہو گیا کہ بغیر گواہوں کے دعویٰ قابل تسلیم نہیں، اور یہ بھی کہ پیغمبر کے مال میں میراث و وصیت نافذ و جاری نہیں ہو سکتی! اور اپنے اختیار شرعی سے بیت المال کی ملکیت بطور گزارہ بصورت فدک جناب سیدہ کو دے کر رنجش و ناراضگی کا ازالہ بھی فرمالیا۔

1۔تفسير الآلوسي، الآلوسي، ج 4، الصفحة 221و الكافي، جلد 2، صفحه 241

سیدہ کے جنازے میں خلیفہ الرسول کی شرکت

دوسرا شبہ یہ ہے کہ جب جناب ابو بکر صدیق و جناب سیدہ رضی اللہ عنہا میں باہمی صلح وصفائی ہو چکی تھی اور دونوں جانب سے کدورت مٹ چکی تھی جیسا کہ شیعہ و سنی دونوں کی روایات سے ثابت ہوا تو پھر اس کی کیا وجہ تھی کہ جناب سیدہ نے اپنے جنازہ پر جناب صدیق رضی اللہ عنہ کا آنا گوارا نہ کیا اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے آپ کو راتوں رات خاموشی سے دفن کر دیا؟

اس شبہ کا ازالہ یہ ہے کہ جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کی یہ وصیت خصوصی نہیں تھی عمومی تھی اور اس کا محرک غایت جذبہ ستر پوشی و حیا تھا، جیسا کہ صحیح روایت سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ آپ نے مرض وفات میں ارشاد فرمایا کہ مجھے اس سے حیا آتی ہے کہ مرنے کے بعد میرا جنازہ (مردوں کی طرح) کھلا سب لوگوں کے سامنے لایا جائے چنانچہ اس وقت جنازوں کا ایک سا معمول تھا مرد و عورت کے جنازے ایک ہی طرح اٹھائے جاتے تھے آپ کی یہ بات سن کر اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے کہا میں نے حبشہ میں دیکھا ہے کہ وہاں جنازہ کو کھجور کی شاخوں سے کجاوہ کی طرح بناتے ہیں جناب سیدہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا مجھے بنا کر دکھاؤ جب اسماء نے بنا کر دکھایا تو آپ بہت مسرور ہوئیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد سے کسی نے آپ کو اتنا مسرور اور اس طرح مسکراتا نہیں دیکھا تھا، آپ نے اسماء کو وصیت کی کہ تم اور جناب علی رضی اللہ عنہ مجھ کو غسل دینا اور کسی کو میرے پاس نہیں آنے دینا، اسی وجہ سے جناب امیر رضی اللہ عنہ نے جنازہ پر کسی کو نہ بلایا۔

ایک قول یہ ہے کہ جناب عباس رضی اللہ عنہ نے چند اہل بیت کے ساتھ نماز جنازہ پڑھ کر رات ہی دفن کر دیا ، بعض روایات میں یہ ہے کہ دوسرے دن جناب شیخین اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں تعزیت کے لیے گئے تو سب ہی نے شکایت کی کہ ہم کو آپ نے خبر کیوں کی کہ ہم جنازہ کی شرکت کا ثواب حاصل کرتے ، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا کہ فاطمہ (رضی اللہ عنہا) وصیت کر چکی تھیں کہ جب میں دنیا سے جاؤں تو مجھے رات میں دفن کرنا تا کہ میرے جنازہ پر کسی نامحرم کی نظر نہ پڑے لہذا میں نے ان کی وصیت پر عمل کیا، اور کس کو اطلاع نہیں کی، مشہور روایت یہی ہے، فصل الخطاب میں یوں روایت ہے کہ جناب ابو بکر، عثمان غنی، عبد الرحمن بن عوف اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم نماز عشاء کے وقت تشریف لائے اس سے قبل جناب سیدہ مغرب و

عشاء کے مابین وفات پا چکی تھیں یہ 3 رمضان سہ شنبہ کی رات تھی، آنحضرت ﷺ کی وفات کو پورے چھ ماہ گزرے تھے آپ کی عمر مبارک 28 سال تھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کہنے پر آپ جناب صدیق پیش امام ہوئے اور چار تکبیروں کے ساتھ آپ نے یہ نماز ادا فرمائی۔ (1)

(اختلاف روایات آپ نے ملاحظہ فرمایا، آخری روایت کو اگر فریق ثانی بھی قبول کرے تو طعن و اعتراض ختم ہو جاتا ہے لیکن اعتراض برائے اعتراض کی روش رکھنے والے حضرات سے ایسی توقع کہ قبول حق کا کھلے دل مظاہرہ کریں خیال خام ہو گا۔ از مترجم نعمانی)

اور اس امر پر کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ کی جنازہ پر عدم حاضری محض وصیت ہی کی بنا پر تھی کسی کدورت و رنجش کو اس میں کوئی دخل نہیں تھا ایک دلیل عقلی بھی شاہد ہے کہ کدورت و ناراضگی اس کا سبب ہوتا تو یہی بات مد نظر ہو سکتی تھی کہ جناب صدیق رضی اللہ عنہ آپ کا جنازہ نہ پڑھائیں، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ باجماع مورخین ہر دو فرقہ شیعہ و سنی جناب حسن رضی اللہ عنہ کا جنازہ جب باہر لایا گیا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جناب سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو جو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے مدینے کے عامل تھے اشارہ کر کے فرمایا کہ اگر میرے نانا ﷺ کی یہ سنت ہوتی کہ امام جنازہ امیر وقت ہو تو تم کو کبھی آگے نہ کرتا، اس سے معلوم ہو گیا کہ جناب سیدہ نے آپ کو نماز کی خاطر وصیت کر کے آنے سے نہیں روکا تھا جناب حسین رضی اللہ عنہ خلاف وصیت کیسے کرتے! اور جناب صدیق رضی اللہ عنہ اور جناب سعید رضی اللہ عنہ میں جو فرق مراتب ہے وہ ظاہر ہی ہے۔

اور پھر ابھی چھ مہینے کی تو بات تھی کہ سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے پدر بزرگوار ﷺ نے جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ کو تمام انصار و مہاجرین کا پیش امام بنایا تھا اور اس معاملہ میں بڑا اہتمام و تاکید فرمائی تھی تو اس بات کا احتمال ہی کہاں

1۔عن ابن عمر قال: «صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم على ابنه إبراهيم، وكبر عليه أربعًا، وصلى على السوداء فكبر عليها أربعًا، وصلى على النجاشي فكبر عليه أربعًا، وصلى أبو بكر على فاطمة بنت النبي صلى الله عليه وسلم فكبر عليها أربعًا، وصلى عمر على أبي بكر فكبر عليه أربعًا، وكبرت الملائكة على آدم عليه السلام أربعًا.(معجم ابن الأعرابي ،باب الباء،ج:1،ص:53،رقم الحديث:57،ط:دار ابن الجوزي)

پیدا ہو سکتا ہے کہ آپ نے اس واقعہ کو فراموش فرما دیا ہو اور بابا جان صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر فرمودہ امام المسلمین کو اپنے جنازہ کی نماز پڑھانے سے منع فرمایا ہو۔

(یہ سوچ چار پانچ صدی بعد کے کسی امامی کی تو ہو سکتی ہے خیر القرون کے بیت نبوت کے افراد تو کیا ایک عام مسلمان کی بھی نہیں ہو سکتی کہ وہ سوچے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کو امام نماز بنایا ان سے نماز جنازہ نہ پڑھوائی جائے، از مترجم نعمانی)

طعن نمبر 15: ابو بکر رضی اللہ عنہ کو شرعی مسائل کا علم نہیں تھا

پندرھواں اور آخری طعن کا یہ ہے کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو شرعی مسائل بھی معلوم نہ تھے۔[1] اور جس کو شرعی مسائل معلوم نہ ہوں وہ سنی اور شیعہ دونوں کے نزدیک قابل امامت نہیں کیونکہ ان دونوں کے ہاں احکام شرعیہ کا جاننا شرط امامت ہے اور دعویٰ کے لئے وہ تین دلیلیں پیش کرتے ہیں:

1۔ کہ آپ رضی اللہ عنہ نے چور کے بائیں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور اتنا نہ سمجھ سکے کہ شرع میں حد کے طور پر دائیں ہاتھ کا کاٹنا متعین ہے۔

جواب: اس دلیل کا یہ ہے کہ جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم سے بائیں ہاتھ کے کاٹنے کا موقعہ دو بار آیا، ایک بار جبکہ چور تیسری بار چوری کا مرتکب ہوا تھا چنانچہ نسائی نے حارث بن حاطب لخمی سے، اور طبرانی وحاکم نے روایت کی ہے اور حاکم نے کہا ہے کہ یہ صحیح الاسناد ہے اور اکثر علماء کے نزدیک حکم شرعی بھی یہی ہے، اور مشکوٰۃ میں بحوالہ ابوداود اور نسائی میں جابر رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ روایت کی گئی ہے:

جيء بسارق إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: «اقتلوه» فقالوا: يا رسول الله، إنما سرق، قال: «اقطعوه» فقطع. ثم جيء به الثانية، فقال: «اقتلوه»، فقالوا: يا رسول الله، إنما سرق قال: «اقطعوه» فقطع. فأتي به الثالثة فقال: «اقتلوه» قالوا: يا رسول الله إنما سرق، فقال: «اقطعوه». ثم أتي به

---

1 ـ هذه من مطاعن الإمامية في الصديق. ينظر: البياضي، الصراط المستقيم: 2/ 305؛ المجلسي، بحار الأنوار: 30/ 510.

الرابعة، فقال: «اقتلوه» قالوا: يا رسول الله، إنما سرق، قال: «اقطعوه».[1]

ایک چور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا آپ نے کاٹنے کا حکم فرمایا پس کاٹا گیا پھر دوبارہ لایا گیا آپ ﷺ نے حکم دیا کاٹو چنانچہ کاٹا گیا پھر تیسری بار لایا گیا اور آپ نے حکم دیا کہ کاٹو پس کاٹا گیا پھر چوتھی مرتبہ لایا گیا تو آپ نے پھر کاٹنے کا حکم فرمایا چنانچہ کاٹا گیا۔

اور امام محی السنہ بغوی نے شرح السنہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت بیان کی ہے کہ حضور ﷺ نے چور کے بارے میں فرمایا:

إن سرق فاقطعوا يده، ثم إن سرق فاقطعوا رجله، ثم إن سرق فاقطعوا يده، ثم إن سرق فاقطعوا رجله[2]

کہ اگر کوئی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دو پھر بھی چوری کرے تو اس کا پاؤں کاٹو پھر چوری کرے تو اس کا دوسرا ہاتھ کاٹو پھر بھی چوری کرے تو دوسرا پاؤں کاٹو۔

اور محی السنہ نے یہ بھی کہا ہے کہ:

اتفق أهل العلم على أن السارق إذا سرق أول مرة تقطع يده اليمنى، ثم إذا سرق ثانيا تقطع رجله اليسرى، واختلفوا فيما إذا سرق ثالثا، بعد قطع يده ورجله، فذهب أكثرهم إلى أنه تقطع يده اليسرى، ثم إذا سرق رابعا تقطع رجله اليمنى، ثم إذا سرق بعده يعزر، ويحبس، وهو المروي عن أبي بكر رضي الله عنه، هو قول قتادة، وإليه ذهب مالك، والشافعي، وإسحاق بن راهويه.[3]

1۔ المجتبى من السنن المعروف بالسنن الصغرى للنسائي، باب قطع اليدين والرجلين من السارق، 8/ 90، رقم: 4978، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية حلب

2۔ معرفة السنن والآثار، للبيهقي، باب قطع اليد والرجل في السرقة، 12/ 411، رقم: 17187، ط: دار قتيبة (دمشق بيروت)

3۔ شرح السنة للبغوي، باب السارق يسرق بعد قطع يده اليمنى -الخ، 10/ 326، ط: المكتب الإسلامي دمشق، بيروت

اس بات پر اہل علم کا اتفاق ہے کہ پہلی مرتبہ چور کا سیدھا ہاتھ کاٹا جاتا ہے پھر جب دوسری بار چوری کرے تو اس کا بایاں پاؤں کاٹا جاتا ہے اور اس کا ایک ہاتھ وپاؤں کاٹنے کے بعد تیسری مرتبہ چوری کرے تو اس کے بارے میں علماء کی آراء میں اختلاف ہے مگر اکثریت کے نزدیک اس کا بایاں ہاتھ کاٹا جائے اور جب چوتھی مرتبہ چوری کرے تو اس کا دایاں پاؤں کاٹا جائے پھر اگر اس کے بعد بھی چوری کرے تو اسے حد کی بجائے سزا دی جائے گی اور قید کیا جائے گا ابو بکر رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے قتادہ کا یہی قول اور امام مالک کا یہی مذہب ہے۔

پس جب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حکم فرمارہے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عین مطابق ہے تو اعتراض کی گنجائش کہاں رہی جناب صدیق رضی اللہ عنہ پر فقہ حنفی کی آڑ میں الزام دینا حماقت کے سوا کیا ہے اور دوسری مرتبہ آپ نے بایاں ہاتھ اس وقت کاٹنے کا حکم دیا جب آپ کے سامنے ایسا چور پیش ہوا جس کا دایاں ہاتھ اور بائیں پاؤں چوری کی حد میں پہلے سے کٹا ہوا تھا اس واقعہ میں بھی اکثر علماء کا یہی مذہب ہے کہ اس وقت اس کا بایاں ہاتھ کاٹنا چاہیے جناب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب موطا میں بروایت عبدالرحمن بن قاسم یہ قصہ نقل کیا ہے جنہوں نے اسے اپنے باپ سے سنا کہ:

> یمن کا ایک شخص جس کا ایک ہاتھ، بایاں پاؤں کٹا ہوا تھا، جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس بطور مہمان آیا اور آپ کے گھر پر ٹھہرا یمن کے عامل کی شکایت کی کہ اس کے بے قصور مجھ پر ظلم کیا اور میرا پاؤں کاٹ ڈالا، وہ رات کا اکثر حصہ نوافل و تہجد میں گزارتا جسے دیکھ کر جناب صدیق رضی اللہ عنہ بھی کہہ اٹھے کہ تیری رات تو چوروں کی سی نہیں نہیں لگتی، انہیں دنوں آپ کی زوجہ محترمہ اسماء بنت عمیس کا ایک زیور ہو گیا معلوم ہونے پر سب اہل خانہ اس کو تلاش کرنے لگے چراغ جلا کر کونے کھدرے دیکھے گئے کہ کہیں ادھر ادھر نہ گر پڑا ہو، اور وہ لنجا لنگڑا مہمان بھی تلاش کرنے والوں کے درمیان گھومتا پھرتا رہا اور یہ بھی کہتا جاتا کہ خدا اس ظالم کو سزا دے جس نے چوری کر کے بھلے اور نیک لوگوں کے گھر کو غم و فکر سے بھر دیا بالآخر تھک ہار کر اور مایوس ہو کر لوگوں نے تلاش ختم کر دی چند روز بعد وہی زیور ایک سنار کے ہاں پکڑا گیا تفتیش پر

اس نے بتایا کہ ایک لنگڑا شخص مجھے فروخت کر گیا ہے، آخر اس چور نے بھی اپنے جرم کا اقرار کر لیا تب جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس کا بایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اس کا اپنے آپ بد دعا دینا مجھے اس کی چوری سے زیادہ ناگوار لگتا تھا۔ (1)

ان دو واقعات وروایات کے علاوہ کسی روایت سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے بایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہو اوران کے بارے میں بھی معلوم ہو گیا کہ آپ نے کوئی غلط حکم نہیں دیا تھا اس لئے آپ پر طعن واعتراض کا کوئی جواز نہیں یہ سراسر تعصب وعناد پر مبنی ہے!

طعن ھذا کے متعلق دوسری دلیل

دوسری دلیل طعن 15 کے سلسلہ کی یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے لواطت کے مجرم کو زندہ آگ میں جلا دیا حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور سزا زندہ جاندار کو آگ میں جلانے سے منع فرمایا ہے۔

جواب: اس کا جواب مختلف عنوانات سے دیا جا سکتا ہے، اول یہ کہ لوطی کو جلا دینے کا قصہ جو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ روایت ضعیف ہے جس کو اہل سنت کو الزام دینے میں حجت قرار نہیں دیا جا سکتا صحیح روایت وہ ہے جو سوید بن غفلہ نے جناب ابوذر رضی اللہ عنہ سے یوں روایت کی ہے "أنه أمر به فضربت عنقه ثم أمر به فأحرق"(2) آپ کے حکم سے اس کی گردن ماری گئی، پھر آپ نے حکم دیا تو اس کو جلایا گیا اور مردہ کو عبرت کی خاطر جلا دینا درست ہے جس طرح مردہ کو عبرت کی خاطر سولی پر کچھ عرصہ کے لئے لٹکا رہنے دینا

1۔ الموطأ ،مالك بن أنس بن مالك، 5/ 1221، رقم: 3089، ط: مؤسسة زايد بن سلطان آل نهيان للأعمال الخيرية والإنسانية أبو ظبي الإمارات

والحكم نفسه ثبت عن علي رضي الله عنه في كتب الإمامية، فقد روى ابن بابويه وغيره عن الباقر قال: «كان أمير المؤمنين عليه السلام إذا سرق الرجل أولا قطع يمينه، فإن سرق ثانيا قطع رجله اليسرى، فإن سرق الثالثة خلده في السجن، فإن سرق في السجن قتله». من لا يحضره الفقيه: 4/ 64؛ ابن حيوان، دعائم الإسلام: 2/ 470؛ النوري، مستدرك وسائل الشيعة: 18/ 126.

2۔ تنزيه الأنبياء ، ص: 217، ط: دار الأضواء

کیونکہ مردہ کو تو اس عذاب کا کچھ احساس نہیں ہوتا دکھ درد کا مدار تو حیات پر ہے۔

اور مرتضیٰ جو شیعہ علما میں چوٹی کا شمار ہوتا ہے اور علم الھدی کے لقب سے مشہور ہے، اس روایت کے صحیح ہونے اور پہلی روایت کے غلط ہونے کا معترف ہے تو جو روایت نہ اہل سنت کے نزدیک صحیح ہے نہ شیعوں کے نزدیک، ایسی روایت کو طعن کا مدار ٹھہرانا نہ دلیل اتفاقی ہے، یعنی نہ دل کو تسکین دیتا ہے نہ دلیل الزامی ہے۔[1]

دوم یہ کہ ہم نے مان لیا کہ ایک خاص شخص کو جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جلوادیا لیکن جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تو ایسا واقعہ کئی مرتبہ پیش آیا، ایک واقعہ میں تو ایک پوری کی پوری جماعت کو آپ نے حوالہ آتش کرنے کا حکم فرمایا دوسری مرتبہ زندیقوں کی ایک بڑی جماعت کو جلادینے کا حکم دیا جن کے بارے میں بعض کہتے ہیں کہ وہ مرتد ہوگئے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ عبد اللہ بن سبا کے ساتھیوں میں سے تھے چنانچہ اہل سنت کی اصح الکتب بعد کتاب اللہ یعنی بخاری میں جناب عکرمہ رضی اللہ عنہ سے یوں روایت ہے:

أتي علي رضي الله عنه، بزنادقة فأحرقهم، فبلغ ذلك ابن عباس، فقال: لو كنت أنا لم أحرقهم، لنهي رسول الله صلى الله عليه وسلم: «لا تعذبوا بعذاب الله»[2]

علی رضی اللہ عنہ کے پاس زندیق لائے گئے آپ نے ان کو نذر آتش کر دیا جب یہ خبر (حضرت) ابن عباس رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا، میں اگر ہوتا تو ان کو نہ جلاتا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ کے عذاب کی طرح عذاب نہ دو!

پھر ایک اور مرتبہ بھی ایسے دو آدمیوں کو زندہ جلوادیا جو باہم لواطت کے جرم میں پکڑے گئے تھے، چنانچہ مشکوہ میں بحوالہ رزین، جناب ابن عباس وجناب ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

1۔ اسی شریف مرتضیٰ نے لوطی کو جلانے کا فعل سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی نسبت بھی تسلیم کیا ہے ملاحظہ فرمائیں: أن أبا بكر أتى برجل ينكح فأمر به فضربت عنقه، ثم أمر به فأحرق ولعل أمير المؤمنين (عليه السلام) احرقه بالنار بعد القتل بالسيف كما فعل أبو بكر، وليس ما روي من الاحراق بمانع من أن يكون القتل متقدما له. وقد روي قتل المتلوطين من طرق مختلفة عن الرسول صلى الله عليه وآله وكذلك روي رجمهما.(تنزيه الأنبياء ، ص: 217، ط: دار الأضواء)

2۔ صحيح البخاري، باب حكم المرتد والمرتدة واستتابتهم، 9/ 15، رقم: 6922، ط: دارطوق النجاة

"ملعون من عمل عمل قوم لوط"[1] وہ لعنت زدہ ہے جس نے قوم لوط جیسا فعل کیا۔

اور ایک روایت میں جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"ان عليا احرقها"[2] جناب علی رضی اللہ عنہ نے دونوں کو جلوا دیا۔

اور اس فرقہ کے بغض و عناد اور تعصب کو دیکھتے ہوئے یہ کچھ بعید بھی نہیں لگتا کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے متعلق اہل سنت کی ان روایات سے انکار ہی نہ کر بیٹھیں حالانکہ خود ان کا طرز عمل یہ ہے کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شان میں ضعیف و مردود روایات کو بھی مدار طعن بنا ڈالا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ خود شیعوں ہی کی معتبر کتابوں سے اس مضموں کی روایات سامنے لائی جائیں، شریف مرتضیٰ نے جو ان کا علم الھدیٰ ہے کتاب تنزیہ الانبیاء والائمہ میں ایک روایت بیان کی ہے:

"ان عليا أحرق رجلا أتى غلاما في دبره"[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو جلوا دیا جس نے ایک لڑکے کے ساتھ اغلام کیا تھا۔

اس روایت کے پیش نظر اب شیعوں کا کیا منہ ہے کہ وہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر زبان طعن دراز کریں کیونکہ اب تو ان کے فعل کی ایک معصوم کے عمل سے تصدیق ہو گئی۔

سوم: روایات اہل سنت سے ثابت ہے کہ جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جناب علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ اور کہنے سے لوطی کو جلایا تھا چنانچہ بیہقی نے شعب الایمان میں اس کی تخریج کی اور ابن ابی الدنیا سے صحیح اسناد سے محمد بن المنکدر سے اس کی روایت کی اور واقدی نے اپنی کتاب الردہ کے آخری ردہ بنی سلیم میں اس کو نقل کیا ملاحظہ ہو:

ان ابابكر لما استشار االالصحابة فى عذاب اللوطى قال على ارى تحرق

1۔ مسند الامام احمد بن حنبل، 5/ 84، رقم: 2914، ط: موسسة الرسالة

2۔ تنزیہ الأنبیاء، ص: 217، ط: دار الأضواء

3۔ تنزیہ الأنبیاء والأئمة، ص: 310

بالنار فاجمع رأى الصحابة على ذلک فامر به ابوبکر فاحرق بالنار[1]

جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو لوطی کی سزا کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میری رائے تو یہ ہے کہ اسے آگ میں جلا دیا جائے، چنانچہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس رائے پر متفق ہوگئے پس جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے حکم صادر فرمایا اور وہ جلا دیا گیا

بعض شیعہ راویوں نے مغالطہ دینے کے لئے جو یہ کہا ہے کہ فجاۃ سلمی کو جو راہزن تھا جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آگ میں جلوادیا اور وہ جل گیا، سراسر غلط ہے، صحیح یہ ہے کہ شجاع بن زبرقان کو جو لوطی تھا جناب امیر رضی اللہ عنہ کی رائے سے جلا دینے کا حکم فرمایا تھا اور اگر بالفرض بطور نظام مملکت راہزن کو جلا دینے کا حکم فرمایا تو یہ طعن کا سبب نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کا فعل معصوم کے فعل کے مطابق تھا۔

طعن ھذا کے متعلق تیسری دلیل

تیسری دلیل انہوں نے یہ دی کہ جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جدہ (دادی) اور کلالہ کا مسئلہ معلوم نہ تھا کیونکہ دوسروں سے معلوم کرتے۔

جواب: یہ ہے کہ اعتراض و طعن اہل سنت پر موجب الزام نہیں اس لئے کہ ان کے نزدیک بالفعل تمام احکام کا جاننا امامت و خلافت کے لیے شرط نہیں ہے، البتہ اجتہاد اور ملکہ استنباط ضرور شرط ہے اور مجتہد کا یہی کام ہے

---

1 ـ واتفقت روايات أهل السنة والشيعة الإمامية بأن من أشار على الصديق رضي الله عنه بحرق اللوطي هو علي رضي الله عنه ، فعن صفوان بن سليم: «أن خالد بن الوليد كتب إلى أبي بكر الصديق رضي الله عنهما في خلافته له أنه وجد رجلا في بعض نواحي العرب ينكح كما تنكح المرأة، وأن أبا بكر رضي الله عنه جمع الناس من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فسألهم عن ذلك، فكان من أشدهم يومئذ قولا علي بن أبي طالب رضي الله عنه، قال: إن هذا ذنب لم تعص به أمة من الأمم إلا أمة واحدة صنع الله بها ما قد علمتم، نرى أن نحرقه بالنار فاجتمع رأي أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم على أن يحرقه بالنار فكتب أبو بكر رضي الله عنه إلى خالد بن الوليد يأمره أن يحرقه بالنار». سنن البيهقي: 8/ 232. وأخرج النوري من الإمامية بإسناده عن جعفر بن محمد عن أبيه عن جده: «أن أبا بكر أوتي برجل ينكح في دبره، فقال: يا علي ما الحكم فيه؟ فقال: أحرقه بالنار، فإن العرب تأنف من المثلة، فأحرقه أبو بكر بقوله عليه السلام». مستدرك الوسائل: 18/ 79.

کہ اول وہ نصوص تلاش کرتا ہے احادیث کی چھان بین کرتا ہے اگر نص موجود ہو تو اس کے مطابق فتوئی صادر کرتا ہے اگر نص موجود نہیں پاتا تو ملکہ استنباط سے کام لے کر مسائل مستنبط کرتا ہے، جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد میں نصوص تدوینی شکل میں موجود نہیں تھیں اور احادیث کی روایات نے بھی شہرت نہیں پائی تھی اس لئے بوقت ضرورت مجبوراً صحابہ کی سنی ہوئی روایات کی جستجو فرماتے:

قال في (شرح التجريد) أما مسألة الجدة والكلالة فليست بدعا من المجتهدين، إذ يبحثون عن مدارك الأحكام ويسألون من أحاط بها علما، ولهذا رجع علي في بيع أمهات الأولاد إلى قول عمر، وذلك لا يدل على عدم علمه[1]

شرح تجرید میں بیان کیا ہے کہ جدہ اور کلالہ کا مسئلہ مجتہدین کے لئے کوئی انوکھا مسئلہ نہیں ہے کیونکہ یہ دلائل احکام پر بحث کرتے رہتے ہیں اور جس کو کوئی بات معلوم ہو اس سے دریافت کرتے رہتے ہیں اسی لئے حضرت علی نے امہات الاولاد کی بیع کے معاملہ میں حضرت عمر فاروق کے قول کی طرف رجوع کیا اور یہ آپ کی علمی کوتاہی پر دلالت نہیں کرتا۔

جناب صدیق رضی اللہ عنہ کی تحقیق و تفتیش تو یہ صاف بات بتاتی ہے کہ احکام دین میں آپ کو کتنی احتیاط ملحوظ تھی اور یہ کہ آپ قواعد شریعت میں شرائط کا پورا پورا لحاظ فرماتے تھے، یہی وجہ تھی کہ جب جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ نے جدہ کا مسئلہ ظاہر کیا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ تمہارے علاوہ کوئی اور بھی روایت ہے؟ یہ آپ کی احتیاط تھی ورنہ روایت میں تعدد شرط نہیں ہے، حقیقت میں تو یہ طرز عمل قابل ستائش تھا مگر برا ہو تعصب و عناد کا کہ ان کو تعریف و توصیف بھی قابل طعن نظر آتی ہے کسی شاعر نے کہا ہے:

چشم اندیش بر کندہ باد　　　عیب نماید ہنرش در نظر

بد اندیش کی آنکھ پھوٹ جائے کہ اس کی نظر میں ہنر بھی عیب دکھائی دیتا ہے؟

اگر اس سلسلہ میں کوئی شیعہ یہ کہے کہ امام کے لئے صرف اجتہاد کو کافی سمجھنا تو اہل سنت کا مذہب ہے

1۔ شرح التجريد لابن المطهر الحلي: ص 402.

ہمارے نزدیک تو تمام مسائل شرعیہ کا بالفعل جاننا امام کے لئے شرط ہے، تو ہم انہیں یاد دلائیں گے کہ جب تم نے مطاعن کی بنیاد اہل سنت کے مذہب پر رکھی ہے تو لا محالہ اس سلسلہ میں ان کی قرارداد بھی تسلیم کرنی چاہئے اور نہ پھر اہل سنت کے نزدیک جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی نفی جو اس باب کا موضوع ہے ثابت ہی نہ ہو سکے گی اور اس کی ساری تگ و دو لا حاصل رہے گی اور اگر یہ زبردستی اور دھاندلی پر ہی اتر آئیں تو ہم انہیں کے اصول پر بھی ان کو جواب دے سکتے ہیں، لیجئے ملاحظہ کیجئے!

جواب دوم: اگر جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو مسئلہ جدہ و کلالہ معلوم نہیں تب بھی ان کی خلافت میں کوئی نقص لازم نہیں آتا کیونکہ شیعی روایت کے مطابق جناب امیر رضی اللہ عنہ کو بھی بعض مسائل معلوم نہ تھے حالانکہ آپ بالاجماع امام برحق تھے، چنانچہ عبد اللہ بن بشر نے یہ روایت بیان کی ہے کہ:

أن علي بن أبي طالب سئل عن مسألة فقال: «لا علم لي بها، ثم قال: وأبردها على كبدي إن سئلت عما لا أعلم فأقول: لا علم لي بها[1]

جناب امیر رضی اللہ عنہ سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا مجھے معلوم نہیں اور پھر فرمایا میں اپنے دل کو مطمئن پاتا ہوں کہ مجھ سے وہ بات پوچھی گئی جسے میں نہیں جانتا۔

یعنی مجھے اس سے کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی کہ جو مسئلہ مجھ سے پوچھا گیا اس کا مجھے علم نہ تھا، سعد ان بن نصر نے بھی ایسی ہی روایت کی ہے، اسی طرح جناب امام ناطق بحق جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کو بھی بعض مسائل معلوم نہ تھے، جیسا کہ امامیہ میں کے صاحب قرب الاسناد نے اسماعیل بن جابر سے روایت کی ہے وہ کہتا ہے:

قلت لأبي عبد الله (عليه السلام): ما تقول في طعام أهل الكتاب، فقال: لا تأكله ثم سكت هنيئة ثم قال: لا تأكله ثم سكت هنيئة ثم قال: لا تأكله ولا تتركه تقول: انه حرام ولكن تتركه تتنزه عنه ان في آنيتهم الخمر ولحم الخنزير.[2]

1۔ عزاها المناوي إلى (مسند الدارمي). فيض القدير: 4/ 278

2۔ وسائل الشيعة إلى تحصيل مسائل الشريعة،24/ 211، ط: مؤسسة آل البيت عليهم السلام لاحياء التراث

میں نے ابی عبد اللہ سے اہل کتاب کے کھانے سے متعلق بات کی تو آپ نے کراہت کھائی، پھر تھوڑی دیر سوچا اور کراہت کھائی، پھر کچھ دیر سکوت کے بعد فرمایا مت کھاؤ، اور یہ ترک طعام بطور احتیاط ہے، اس لئے کہ ان کے برتنوں میں شراب اور سور کا گوشت ہوتا ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے طعام کے متعلق آپ علیہ السلام کو حتمی جواب معلوم نہ تھا اسی لئے بہت غور و خوض کے بعد بھی حکم صریح معلوم نہ ہو سکا لہذا ناچار احتیاط پر عمل کرنے کو فرمایا!

مطاعن عمر رضی اللہ عنہ

سیدنا فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ پر شیعوں نے 11 طعن توڑے ہیں ان میں سے ان کے خیال میں قصہ قرطاس بڑا وزنی ہے آپ بھی دیکھیے۔

طعن نمبر 1: قصہ قرطاس

روایت بخاری و مسلم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری مرض میں بروز جمعرات وصال سے چار روز پیشتر مکان میں موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ قلم دوات اور کاغذ میرے پاس لاؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دوں جس سے تم میرے وصال کے بعد نہ بھٹک و حاضرین اس کی تعمیل میں مختلف رائے ہوئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بولے ہمارے پاس تو اللہ کی کتاب قرآن موجود ہے اور وہ ہم کو کافی ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مرض کی شدت تھی بعض حضرات نے جناب فاروق رضی اللہ عنہ کی تائید کی اور بعض نے یہ کہا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طلب فرمارہے ہیں تو لے آؤ اس پر باہم جو گفتگو ہوئی اس میں بلند اواز کی وجہ سے شور کی صورت پیدا ہوئی اسی گفتگو کے دوران بعض نے یہ بھی کہا کہ مرض کی شدت کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمادیا شاید کچھ اور فرمانا چاہتے ہوں گے اس لیے بات کو واضح طور پر سمجھ لینے کی خاطر کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھا کہ اس فرمان سے آپ کا کیا ارادہ ہے اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس وقت تم میرے پاس سے اٹھ جاؤ کیونکہ رسول اللہ کے روبرو شور و شغب مناسب نہیں غرض اسی بحثا بحثی اور تنازع کے سبب اس تحریر کا معاملہ آیا گیا ہو گیا (اور بعد میں مرض کی کیفیت دیگر گوں ہونے کے سبب اس کا موقع نہ آیا) تو یہ ہے اہل سنت کی صحیح روایات کے مطابق قصہ قرطاس جس میں اپنی عادت اور خواہش کے

مطابق شیعوں نے رنگ آمیزی کر کے کیا سے کیا بنادیا اس قسم میں انہوں نے چند پہلو نکال کر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر طعن واعتراض کیے ہیں۔[1]

1۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو رد کیا جو بحکم آیت " وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى ، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى "[2] وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے وہ وہی فرماتے ہیں جن کی وحی کی جاتی ہے، اور وحی کو ٹھکرانا سراسر کفر ہے جیسا کہ فرمان الہی ہے " وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ "[3] جو خدا کے نازل کردہ کلام کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

2۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بھی کہا کہ آپ کو ہذیان اور اختلاط کلام کا عارضہ ہو گیا ہے حالانکہ انبیاء کرام علیہم السلام ان امور سے معصوم ہیں، جنون انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے بالاجماع جائز نہیں ورنہ ان حضرات علیہم السلام کے قول و فعل سے اعتماد اٹھ جائے گا حالانکہ ان کا قول و فعل تمام حالات میں قابل اعتماد اور لائق اتباع ہے۔

3۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو جھگڑا اور شوروشغب کیا حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور بلند آوازہ گناہ کبیرہ ہے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ[4]

اے مومنو! نبی کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو اور نہ ان سے چلا کر بولو جس طرح ایک دوسرے سے باہم چلا کر بولتے ہو ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں پتہ تک نہ چلے۔

4۔ امت کی حق تلفی کی اگر تحریر لکھ لی جاتی تو بعد میں امت گمراہی سے بچ جاتی مگر اب ہر وادی میں لوگ

1۔ صحیح البخاری، باب قول المريض قوموا عني، 7/ 120، رقم : 5669، ط: دار طوق النجاة

2۔ سورة النجم، الآية: 3، 4

3۔ سورة المائدة، الآية: 44

4۔ سورة الحجرات، الآية: 2

سراسیمہ اور پریشان ہیں اصول و فروع میں بے شمار اختلافات کا شکار ہیں لہذا اس سارے اختلاف کا سارا وبال عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی گردن پر ہے۔

یہ ہے اس طعن کی تقریر جس کا ان کے ہاں زور و شور تو بہت ہے مگر اس سلیقہ اور نظم و ترتیب کے ساتھ ان کی کسی کتاب میں نہیں ملتا اور جس انداز اور بے سلیقہ و بے نظم ملتا ہے اس سے کوئی صحیح طور سے ان کے مقصد دلی پر خاطر خواہ مطلع نہیں ہو سکتا بہر حال اب اس طعن کے سلسلہ کی ان باتوں کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔

جواب: ان چار باتوں کا اجمالی جواب تو یہ ہے کہ یہ سارے کام اکیلے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے سرزد نہیں ہوئے، موجودین حجرہ مبارک سب کے سب اس معاملہ میں دو گروہ ہو گئے تھے جن میں حضرت عباسؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے اب اگر یہ دونوں حضرات منع کرنے والوں میں تھے تو گویا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے سے متفق اور ان کے شریک تھے ایسی صورت میں یہ حضرات بھی ان مطاعن کا نشانہ ہیں، اور اگر یہ اجازت دینے والوں میں تھے تو پھر بھی بعض مطاعن سے یہ نہیں بچتے ان کا الزام ان پر بھی آئے گا مثلاً ایسے نازک وقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو اونچی آواز سے بولنا یا امت کی حق تلفی کا معاملہ کے ساتھیوں کے منع کرنے سے رک گئے نہ اس وقت لائے نہ بعد میں لائے، جبکہ موقع بھی تھا اور پوری فرصت بھی ملی اس وقت دوات قلم لا کر لکھوا لیتے اس وحی الٰہی کے رد میں ایک طرح سے یہ بھی شریک ہو گیا، لہذا یہ طعن اکیلے عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر نہیں لگتا دوسرے سب شرکا بھی شامل طعن ہیں جن میں سے بعض اتفاق شیعہ و سنی مطعون نہیں ہو سکتے تو جب طعن مطعون اور غیر مطعون سب کو شامل ہو تو وہ غیر معتبر ہو جاتا ہے اس اور جب وہ طعن ہی غیر معتبر ہوا تو اس کے جواب کی ضرورت ہی کیا رہی اور اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو طعن کی وجہ اول بھی سب میں مشترک ہے اس لیے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب مبارک "ایتونی بقرطاس" سارے ہی حاضرین سے تھا خاص حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے نہیں تھا لہذا اپ کا یہ حکم وجوب و فرضیت کی حیثیت سے تھا تو سارے کے سارے عدم تعمیل میں گنہگار ہوئے اور شریعت کے فرمان کے مخالف قرار پائے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نافرمانی کا سبب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بنے اور دوسروں نے آپ رضی اللہ عنہ کی بات مان کر حکم رسول کی بجا آوری سے منہ موڑا مگر "وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ" کی وعید میں بہر حال سب ہی داخل ہوئے گویا نعوذ باللہ عمر رضی اللہ عنہ کی مثال تو

شیطان کی سی ہوئی کے کافروں کو کفر پر اکساتا ہے اور دوسرے حضرات رضی اللہ عنہم کی مثال کافروں کے مانند ہوئی یہ بات بالکل صاف ہے کہ طعن اکیلے شیطان پر نہیں کیا جاتا ورنہ تو سارے کافر معذور سمجھے جائیں گے کہ وہ بے قصور ہیں بلکہ مجبور حالانکہ یہ قرآن ہی کے خلاف نہیں تمام شرائع سابقہ کے بھی خلاف ہے۔

اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم وجوب و فرضیت کے لیے نہیں بلکہ ارشاد و ہدایت کے طور پر تھا تو جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور دیگر موجودین رضی اللہ عنہم اس کے ترک کی بنا پر مورد طعن نہیں رہتے اور نہ ہی کسی وجہ سے ان کو قابل ملامت کہا جا سکتا ہے کیونکہ محض صلاح وارشاد پر مبنی احکام کی عدم تعمیل بالاجماع قابل گرفت نہیں ہوتی جیسا آگے ان شاء اللہ بیان کیا جائے گا (کی چاروں وجوہ کے جوابات علیحدہ علیحدہ ملاحظہ ہوں)

جواب وجہ اول: اس وجہ کا مدار اس مفروضہ پر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وحی کو رد کیا کیونکہ قول پیغمبر وحی ہوتے ہیں جن پر آیت قرانی دلیل ہے مگر اس صورت کے دونوں مقدمے غلط ہیں پہلی بات یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو رد نہیں کیا بلکہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آرام وراحت پہنچانا چاہا ان کو یہ گوارا نہ تھا کہ اس شدت مرض میں اپ کو کسی قسم کی مشقت و رنج پہنچایا جائے (جن کی آنکھوں پر تعصب بغض و عناد کی پٹی چڑھی ہو وہ معاملہ کا یہ دل آویز پہلو نہیں دیکھ سکتے) ہر محت اپنے محبوب کو ہر عالم میں راحت و آرام ہی میں دیکھنا چاہتا ہے اگر وہ محبوب اپنوں کے ساتھ فطری دل بستگی انس و محبت کے سبب بحالت شدت مرض و تکلیف ان کے فائدے اور مصلحت کی خاطر خود ان پر مشقت برداشت کر کے کوشش کرنا چاہے تو ہر محب چاہتا ہے کہ اس وقت ان کا دھیان ہٹا کر یا ٹال مٹول کر کے اس مشقت کے علم سے اس کو بچائے اس وقت یہ کہنا کہ اپ کو اس مشقت کے اٹھانے کی ضرورت نہیں آپ نے ہمیں جو کچھ بھی دے دیا ہے یا ہمارے لیے جو کچھ کر دیا ہے ہمیں بہت ہے کافی ہے تو اسے عدم تعمیل کوئی شقی القلب اور خود غرض ہی کہہ سکتا ہے انسانی معاشرہ میں اپنے عزیزوں اور بزرگوں کے ساتھ یہی رویہ اکثر و بیشتر رائج اور معمول بہی رہا ہے، بس یہاں بھی حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے جب یہ دیکھا کہ آپ اصحاب اور امت کے فائدے کی خاطر چاہتے ہیں کہ شدید مرض کی تکلیف کے وقت بھی اپنے اوپر تعب اور مشقت برداشت کر کے کوئی تحریر لکھوائیں یا بنفس نفیس خود لکھیں تو آپ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مزید مشقت کے بار ڈالنے کو گوارا نہیں فرمایا اور کمال ادب ملحوظ رکھتے ہوئے براہ راست

حضور ﷺ سے خطاب نہیں کیا بلکہ دوسرے رفیق واحباب سے کہا کہ اس وقت آپ ﷺ کو اس مشقت میں ڈالنے اور مزید تکلیف پہنچانے کی کیا ضرورت ہے مقصد یہ بھی تھا کہ حضور ﷺ کے گوشت مبارک تک بھی یہ رائے اور مشورہ پہنچے تا کہ آپ ﷺ بھی یہ جان جائیں کہ ایسی حالت میں مزید مشقت لا حاصل ہوگی۔

حسبنا کتاب الله کہہ کر آپ رضی اللہ عنہ نے تکمیل دین و اتمام نعمت رب العالمین والی آیت کی طرف بلیغ اشارہ کر دیا تھا اہل عقل کے نزدیک تو آپ رضی اللہ عنہ کی یہ دقت نظری قابل تحسین و صد آفرین ہونی چاہیے تھی نہ کہ موجب طعن، یہ آیت اس واقعہ سے تین ماہ پیشتر نازل ہو چکی تھی اس میں فرمایا گیا ہے:

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا[1]

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے بطور دین اسلام کو پسند کیا۔

گویا دین میں نسخ و تبدیلی نقص و زیادتی کا دروازہ بالکل بند کر دیا اور اس پر اہتمام و تکمیل کی مہر لگا دی جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا اشارہ اسی آیت کی طرف تھا اب ظاہر ہے کہ حضرت ﷺ کوئی ایسی نئی چیز تو لکھنا یا لکھانا چاہتے ہوں گے جو کتاب و شریعت میں نہ آچکی ہو کیونکہ یہ بات تکمیل دین کے وعدہ الٰہی کے مناسب نہ ہوتی پس معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ جو احکام سابق میں قرار پا چکے ہیں ان پر مزید تاکید فرمائیں اگر اہم احکام خدا اور رسول پر عامل رہنا چاہیں تو جو تاکیدات فرمان الٰہی میں موجود ہیں اور ﷺ جو تاکیدات وقتاً فوقتاً فرماتے رہے وہ ہمارے لیے کافی ہیں اس لیے بہتر ہے کہ آپ مزید مشقت نہ فرمائے اس وقت مناسب اور بہتر یہی ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ سکون اور راحت میں رہیں اور آپ رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ:

إن رسول الله ﷺ قد غلبه الوجع، وعندكم القرآن حسبنا، كتاب الله[2]

رسول اللہ ﷺ پر اس وقت مرض کی شدت غالب ہے ہمارے پاس اللہ کی کتاب ہے جو ہمیں کافی ہے۔

1۔ سورة المائدة، الاية: 3

2۔ صحيح البخاري، باب مرض النبي ﷺ ووفاته، 6/ 9، رقم: 4432، ط: دار طوق النجاة

اس ارادہ کی گواہی ہے لہذا معلوم ہوا اس واقعہ میں حکم رد کر دینے کی نسبت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف کرنا انتہائی کج فہمی نادانی یا انتہائی عداوت و بغض و عناد پر مبنی ہے۔

اور اسی طرح آپس میں ایک دوسرے کے امور میں مصلحت کو مد نظر رکھنا یا مشورہ سے مدد کرنا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین ہمیشہ سے ایک معمول بہ طریق رہا ہے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تو اس بار میں خاص خصوصیت اور جرات کے مالک تھے کہ بہت سے معاملات میں مثلاً منافق پر نماز جنازہ پڑھنے، ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو پردہ نشین کرنے، غزوہ بدر کے قیدیوں کو قتل کرنے اور مقام ابراہیم کو مصلی بنانے اور اسی قسم کے دیگر امور میں آپ کے مشورہ کے مطابق وحی نازل ہو چکی تھی اور بیشتر مقامات میں آپ کی ثوابدید کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالی بنظر احسان دیکھتے اگر اس قسم کے امر مصلحت کو پیش کرنے کے کام کو یہ شیعہ رد وحی یا قول پیغمبر کا رد کہیں گے تو بات جناب فاروق رضی اللہ عنہ تک ہی نہیں رہے گی بلکہ بعض جگہ جناب علی مرتضی رضی اللہ عنہ بھی آپ رضی اللہ عنہ کے شانہ بشانہ اس الزام میں شریک نظر آئیں چند مقامات دیکھیے تو۔۔۔

الف: بخاری شریف میں بطریق متعدد مروی ہے کہ ایک مرتبہ رات کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم جناب امیر اور سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے مکان پر تشریف لے گئے اور ان کو نیند سے بیدار کر کے ادائیگی تہجد کے لئے سخت تاکید فرمائی، قوما فصلیا (دونوں اٹھو اور نمانہ تہجد پڑھو) جواب میں جناب امیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "والله لا نصلي الا ما كتب الله لنا" اللہ کی قسم ہم نماز نہیں پڑھیں گے مگر وہی جو اللہ تعالی نے ہم پر فرض کی ہیں" وانما انفسنا بيد الله" اور ہمارے دل اللہ کے ہاتھ میں ہیں، وہ توفیق دیتا تو ہم تہجد بھی توپڑھتے، یہ جواب سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مکان سے واپس چلے آئے اس وقت آپ اپنی رانوں پر ہاتھ مارتے اور یہ فرماتے جاتے "وكان الإنسان أكثر شيء جدلا" انسان بہت ہی جھگڑالو ہے،[1] لہذا اس قصہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کی جانب سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرعی معاملہ میں جھگڑنا ثابت ہوتا ہے مگر چونکہ قرینہ صدق وراستی اور نیک نیتی پر گواہ تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ملامت نہ فرمائی۔

1۔ صحيح البخاری، باب قوله تعالى وكان الإنسان أكثر شيء جدلا، 9/ 106، رقم: 7347، ط: دار طوق النجاة

ب: صحیح بخاری میں موجود ہے کہ غزوہ حدیبیہ میں جب حضور ﷺ اور کفار کے مابین صلح نامہ لکھا جارہا تھا تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے لفظ رسول اللہ آنحضرت ﷺ کے القاب کے طور لکھ دیا رؤساء کفار نے اس لقب کے لکھنے پر اعتراض کیا کہ اگر ہم ان کو رسول اللہ مانتے تو پھر ہمارا جھگڑا ہی کیا تھا، حضور ﷺ نے ہر چند جناب علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ یہ لقب کاٹ دو مگر آپ اپنے جزو ایمان لقب کو کیسے کاٹ دیتے، اس لئے نہیں کاٹا اور حضور ﷺ کے حکم کو رد کر دیا بالآخر حضور ﷺ نے صلح نامہ آپ کے ہاتھ سے لیکر خود مٹایا۔[1]

لیکن اہل سنت اس قسم کے رویہ کو نہ مخالفت رسول جانتے ہیں نہ کہتے ہیں اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے اس مخالفانہ طرز عمل پر ان پر طعن بھی نہیں کرتے اس لئے جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر وہ کیوں طعن کریں گے! اور اگر شیعہ اس قسم کے امور کے قول رسول کی تردید کہنے پر ہی اصرار کر رہے ہیں تو پھر وہ اپنے پاؤں پر گویا خود ہی کلہاڑی ماریں گے، اور قیل و قال کی راہ اپنے اوپر تنگ کریں گے کیونکہ اس فرقہ کی اپنی کتابوں میں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے متعلق اس قسم کی مخالفت اور مصلحت اور مشورے پیش کرنے کے واقعات موجود و مرقوم ہیں چنانچہ شریف مرتضیٰ نے جو ان کے ہاں علم الھدیٰ کے لقب سے مشہور ہے اپنی کتاب الغرر والدرر میں جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے روایت درج کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

كان قد كثر على مارية القبطية أم إبراهيم في ابن عم لها قبطي كان يزورها، ويختلف إليها، فقال لي النبي صلى الله عليه وسلم: خذ هذا السيف وانطلق، فإن وجدته عندها فاقتله. قلت: يا رسول الله، أكون في أمرك إذا أرسلتني كالسكة المحماة، أمضي لما أمرتني، أم الشاهد يرى ما لا يرى الغائب؟ فقال لي النبي صلى الله عليه وسلم ": بل الشاهد يرى ما لا يرى الغائب " فأقبلت متوشحا بالسيف فوجدته عندها، فاخترطت السيف فلما أقبلت نحوه، عرف أني أريده، فأتى نخلة فرقى إليها، ثم رمى بنفسه على قفاه، وشغر برجليه، فإذا به أجب

1۔ صحيح البخاري، باب: كيف يكتب هذا: ما صالح فلان، 3/ 184، رقم:2698، ط: دارطوق النجاة

أمسح، ما له مما للرجال قليل ولا كثير، قال فغمدت السيف، ورجعت إلى النبي صلى الله عليه وسلم فأخبرته فقال: الحمد لله يصرف عنا أهل البيت.[1]

نبی کریم ﷺ کے صاحبزادے ابراہیم علیہ السلام کی والدہ جناب ماریہ قبطیہ اور ان کے چچازاد بھائی قبطی کے متعلق جس کی آپ کے ہاں آمد و رفت بھی لوگوں نے اتہام کے طور پر بہت باتیں بنائیں تو حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا یہ تلوار لو اور جاؤ، اگر وہ ان کے پاس ہو تو قتل کر ڈالو، میں وہاں گیا، وہ مجھے دیکھ کر اور میرا ارادہ بھانپ کر وہاں سے بھاگ کر کھجور کے درخت پر جا چڑھا، پھر وہاں سے گدی کے بل زمین پر اپنے آپ کو گرا کر دونوں ٹانگیں اوپر اٹھا دیں، تو میں نے دیکھا کہ اس کے تو مردانہ عضو ہے ہی نہیں یہ دیکھ کر میں نے تلوار میان میں ڈالی اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں واپس آکر ساری صورت واقعہ عرض کی تب آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے ہوئے فرمایا سب اللہ کے لئے ہے جو ہم اہل بیت سے ہر گندگی و برائی کو ٹالتا ہے۔

یہ روایت واضح کرتی ہے کہ جناب ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا اہل بیت سے تھیں اور آیت تطہیر میں داخل، اور خدا کا شکر ہے کہ رحمت سب کو شامل ہوئی اور نعمت سب پر عام (اب یہ شیعہ بتائیں کہ جب پیغمبر ﷺ کا ہر نطق وحی واجب الاتباع ہے تو یہاں جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اس پر عمل کیوں نہیں فرمایا ہمارے نزدیک تو آپ کا یہ فعل عین حق تھا اور آپ پر کوئی طعن یا اعتراض نہیں البتہ شیوں کے لئے لمحہ فکریہ ضرور ہے، از مترجم نعمانی) محمد بن بابویہ نے امالی میں اور دیلمی نے ارشاد القلوب میں یہ روایت بیان کی ہے:

أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أعطى فاطمة سبعة دراهم وقال: أعطيها عليا ومريه أن يشتري لأهل بيته طعاما فقد غلب عليهم الجوع، فأعطتها عليا وقالت: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم أمرك أن تبتاع لنا طعاما. فأخذها علي وخرج من بيته ليبتاع طعاما لأهل بيته فسمع رجلا يقول: من

---

1 ـ أضواء على السنة المحمدية، لمحمود أبو رية، ص: 45

بقرض المليّ الوفي؟ فأعطاه درهم.[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کو سات درہم عنایت فرما کر فرمایا کہ یہ علی رضی اللہ عنہ کو دے دینا اور کہنا کہ اس رقم سے اپنے اہل وعیال کے لئے کھانا لے آنا کیونکہ وہ بھوک سے بہت پریشان ہیں وہ رقم سیدہ نے جناب علی کو دی اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ان سے ہمارے لئے کھانا خرید لائیں آپ وہ رقم لے کر گھر سے نکلے کہ اہل خانہ کیلئے کھانا لے آئیں ہیں کہ ایک آدمی کو یہ کہتے سنا کہ پکے وعدہ پر کون قرض دیتا ہے آپ نے وہ درہم اسے دے ڈالے۔

اس قصہ سے تین باتیں معلوم ہوئیں (1) رسول اللہ کی مخالفت (2) دوسرے کے مال میں بلا اجازت تصرف (3) اہل وعیال کی حق تلافی، اور بہت ہی قریب عزیزوں یعنی بیوی بیٹوں کے ساتھ قطع رحمی، نیز یہ بات بھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد اور جگر کے ٹکڑیوں کو بھوکا رکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دکھ پہنچانا، لیکن یہ سب کچھ اللہ کے لئے اللہ کی اطاعت میں تھا اور نیت بخیر تھی اس لئے مقبول اور قابل تحسین وتعریف ہوا اس پر کوئی عتاب یا ناراضگی کا اظہار نہیں ہوا اور قرائن سے جناب امیر رضی اللہ عنہ کو یہ بات معلوم تھی کہ اصحاب حقوق یعنی بیوی بچے اس ایثار اور نیک کام پر رضامند اور خوش ہوں گے اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسے جائز قرار دیں گے۔

اب رہی بات دوسرے مقدمہ کی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام اقوال وحی ہیں، یہ دلیل عقلی اور نقلی دونوں لحاظ سے درست نہیں، عقلی دلیل سے تو اس طور کہ ہر سمجھ دار بخوبی جانتا ہے کہ رسول کے معنی پیغام پہنچانے والے کے ہیں اور جب اسکی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو مطلب ہوتا ہے "اللہ کا پیغام پہنچانے والا" اب رسالت کے معنی صرف یہ ہوئے کہ ان کے پاس اللہ کا پیغام آئے اور ان کے ذریعہ وہ پیغام ہم تک پہنچے یہ معنی نہیں کہ ان کا ہر فرمان اللہ کا پیغام آیت وَمَا يَنطِقُ۔۔۔الخ قرآن کے ساتھ خاص ہے "عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى" اس کی دلیل ہے یہ آیت پیغمبر کے تمام اقوال کو شامل نہیں اس کی مثال دنیاوی امور میں ہمارے سامنے روزمرہ رہتی ہے کہ کسی حاکم، عامل، یا بادشاہ کے ایلچی کی ہر بات اور ہر قول بادشاہ کی طرف سے نہیں

1۔ الأمالي: ص 470؛ إرشاد القلوب: 2/ 221؛ الفتال، روضة الواعظين: 1/ 126.

سمجھا جاتا، (یہاں ایک بات ضرور ذہن نشین کر لی جائے کہ حضور ﷺ کی پیغمبرانہ حیثیت کے علاوہ ایک اور حیثیت منشائے الہی سمجھنے والے کی بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کے بارے میں فرمایا ہے کہ "رسول تم کو جو کچھ دے پس اسے لے لو، اور جس بات سے روکے اس سے رک جاؤ یہ آیت میرے خیال میں اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ آپ رسول اللہ ہونے کے ساتھ مقتدا و پیشوا، اور مصلح امت بھی ہیں اور امت پر شفیق اور اس کے خیر خواہ بھی اس کے پیش نظر یہ کہا جائے گا کہ آپ کا ہر حکم خواہ اس کے ساتھ وحی کا حوالہ ہو یا نہ ہو، قابل اتباع ہو گا البتہ اس کی حیثیت متعین کرنے کے لئے کہ وہ حکم الہی ہے یا آپ کی رائے بطور مشورہ یا وہ واجب الاتباع ہے یا حکم استحسان اور مندوب آپ سے استفسار کیا جانا معیوب یا موجب طعن نہیں ہو گا اور ایسے حکم کی عدم تعمیل کو جو مندوب ہو یا قرائن سے معلوم ہو کہ یہ پہلو ملحوظ ہے یا مراد رسول سے گنجائش معلوم ہوتی ہو اسے رد وحی نہیں کہیں گے۔ از مترجم نعمانی)

اور عقلی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے تمام اقوال وحی منزل من اللہ کے درجہ کے ہوتے تو آپ کے بعض اقوال پر قرآن مجید میں گرفت او سرزنش نہ ہوتی حالانکہ بعض مقامات پر تو سرزنش کا لہجہ خاصا سخت بھی ہے، ایک جگہ ارشاد ہے "عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ أَذِنْتَ لَهُمْ"[1] اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے آپ نے ان کو کیوں اجازت دی، دوسری جگہ فرمایا "وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِنِينَ خَصِيمًا، وَاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ،وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنْفُسَهُمْ"[2] آپ خیانت کرنے والوں کے طرف دار نہ بنئے اللہ سے مغفرت طلب کیجئے بے شک اللہ تعالیٰ غفور بھی ہے رحیم بھی اور جو لوگ اپنا ہی نقصان کرتے ہیں آپ ان کی جوابدہی نہ کیجئے، ایک اور جگہ "لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ"[3] اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے سے فیصلہ نہ لکھ دیا گیا ہوتا تو آپ نے ان سے جو کچھ لیا ہے پاداش

1۔ سورة التوبة، الاية: 43

2۔ سورة النساء، الاية: 105، 106، 107

3۔ سورة الانفال، الاية: 68

میں دردناک عذاب کی صورت میں پکڑ ہوتی۔

دوسرے یہ کہ اگر ایسا ہوتا تو قبطی کے قتل کا حکم، طعام کی خرید، فقط رسول اللہ کے منانے اور تہجد کا حکم سارے منزل من اللہ ہوتے اور جناب امیر رضی اللہ عنہ رد وحی کے مرتکب قرار پاتے اور اگر ایسا ہوتا تو پھر و شاورھم فی الامر سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرنے کا حکم دینا بے معنی بات ہوئی، اور پھر بعض امور میں بعض صحابہ کی اطاعت کس معنی پر محمول کی جائے گی جس کی طرف آیت "لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ"[1] اگر وہ بہت سے کاموں میں تمہاری اطاعت کریں تو تم دشواری میں پڑ جاؤ، کا اشارہ کرتی ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ غزوہ تبوک کے موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اہل وعیال کی حفاظت ونگہداشت پر مقرر فرمایا تو آپ نے معترضانہ لہجہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا "أتخلفني في النساء والصبيان؟"[2] کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہیں، یعنی کیا میری حیثیت آپ کی نظر میں ایسی رہ گئی ہے کہ میدان جہاد میں شرکت کے بجائے عورتوں بچوں کے ساتھ رہوں، تو یہاں وحی الہی کے مقابلہ میں اعتراض کرنا کب جائز ہوتا اور اصول امامیہ کو دیکھا جائے تو ان کے ہاں تو تمام اقوال رسول نہ وحی ہیں اور نہ ان کے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام افعال واجب الاتباع ہیں۔

لہذا جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر طعن کے اس فاسد، باطل اور غلط مقدمہ کو جو نہ تو واقعہ کے مطابق ہے اور نہ خود ان کے آداب کے موافق اور نہ ہی مد مقابل کے مذہب کے موافق، اس طعن کی تکمیل وترویج کی خاطر ذکر کرنا تعصب وعناد، بغض وحسد کا بدترین مظاہرہ ہے۔

اب ہم اس معاملہ کو اقوال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے اونچی سطح پر رکھ کر تجزیہ کرتے اور کہتے ہیں کہ شیعہ وسنی ہر دو کے نزدیک مصلحت پیش کرنا، مشقت سے بچنے کی صورت نکالنا اور حکم الہی بلا واسطہ کو جو قطعی طور پر وحی منزل من اللہ ہے کے خلاف اصرار اور بار بار اس میں ترمیم کی درخواست رد وحی شمار نہیں ہوتا۔

1۔ سورۃ الحجرات، الآیۃ: 7

2۔ صحیح البخاري، باب مناقب علي، 5/ 19، رقم: 3706، دار طوق النجاۃ

چنانچہ شب معراج بسلسلہ نماز کی فرضیت حضور ﷺ نے بمشورہ پیغمبر اولوالعزم حضرت موسیٰ علیہ السلام نو مرتبہ مراجعت فرمائی اور بارگاہ الٰہی میں عرض پرداز ہوئے کہ اس حکم کو میری امت برداشت نہ کر سکے گی اس میں تخفیف فرما دیجئے یہ بات خود ابن بابویہ کے کتاب المعراج میں لکھی ہے اگر یہ امر رد وحی ہوتا تو پیغمبران عظام علیہما الصلوۃ والسلام سے اس کا صدور کیسے ہوتا! لہذا ایسے امور کو رد وحی کہنا کسی مومن سے تو متوقع نہیں ایسا تو کوئی ملحد و زندیق ہی کہہ سکتا ہے، اس کے علاوہ بلاواسطہ حکم الٰہی میں سوال و جواب اور لوٹ پلیٹ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں خود قرآن مجید میں موجود ہے:

وَإِذْ نَادَى رَبُّكَ مُوسَى أَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ، قَوْمَ فِرْعَوْنَ أَلَا يَتَّقُونَ ،قَالَ رَبِّ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَذِّبُونِ ، وَيَضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي فَأَرْسِلْ إِلَى هَارُونَ ، وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ، قَالَ كَلَّا فَاذْهَبَا بِآيَاتِنَا إِنَّا مَعَكُمْ مُسْتَمِعُونَ[1]

جب موسیٰ علیہ السلام سے تمہارے رب نے واضح طور پر کہا کہ فرعون کی ظالم قوم کے پاس جاؤ وہ نڈر اور بے خوف ہو گئی ہے تو موسیٰ نے کہا کہ اے میرے رب مجھے خطرہ ہے وہ مجھے جھٹلا دینگے۔ میرے سینہ کے اندر گھٹن بھی ہوتی ہے اور زبان بھی (بوجہ لکنت) نہیں چلتی، آپ ہارون کے پاس بھی وحی بھیجے اور ان کا ایک گناہ بھی مجھ پر ہے سو ڈرتا ہوں وہ مجھے قتل نہ کر دیں اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کی مجال نہیں تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ ہم تمہارے ساتھ ہی ہیں اور سنتے ہیں۔

اور پھر یہ بات شیعوں کے ہاں اصولی طور پر طے شدہ ہے کہ رسول ہی نہیں بلکہ خدا کے بھی بلاواسطہ حکم کا تقاضا یقینی وجوب نہیں ہوتا اس میں مندوب و مستحب کا احتمال بھی ہوتا ہے لہذا دونوں شقوں میں سے ایک شق کی وضاحت و تعین کے لئے استفسار اور لوٹ پلیٹ ہو سکتی ہے چنانچہ مرتضیٰ شریف کی الغرر و الدرر میں اس کا ذکر موجود ہے جب یہ بات ہے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اس حکم کے بارے میں استفسار اور اس کو لوٹانے میں کیا قصور اور کون سا گناہ تھا، ان کی نیت و ارادہ تو حضور ﷺ کی تکلیف و مشقت میں تخفیف تھا، اور ثبوت میں

1۔ سورة الشعراء، الآية: 10، 11، 12، 13، 14، 15

آیت قرآنی بھی پیش کر رہے تھے جس سے بھی بظاہر اس حکم کے مندوب ہونے کا پتہ چل رہا تھا۔

جواب وجہ دوم: کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اختلاط کلام (بہکی بہکی باتیں کرنا) کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی اور یہ بات بھی درست نہیں اس لئے کہ ان کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے اور یقین کے وہ کون سے ذرائع ہیں جو یہ بتائیں کہ "اهجر استفهموه" کیا یہ بات عجیب ہے پھر اسکو پوچھ لو کے الفاظ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے نکلے، اکثر روایات میں قالوا کا لفظ ہے جو کسی قائل کی تصریح نہیں کرتا، ممکن ہے یہ حامیان تحریر کے منہ سے نکلا ہو، اور استفہام انکاری کے طور پر اپنے قول کی تائید میں بولا ہو، اس کا مطلب یہ ہو گا کہ یہ تو طے شدہ ہے کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کوئی بہکی بات نہیں نکلتی، لہذا تعمیل حکم کے لئے یہ پوچھ لیں کہ آپ کیا لکھوانا چاہتے ہیں، اسی کے ساتھ احتمال دوسرے پہلو کا بھی ہے کہ مخالفین تحریر نے یہ بات بطور استفہام انکاری کہی ہو، یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بہکی بات کیوں کہنے لگے مگر آپ کے اس فرمان کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا پھر پوچھ کر دیکھ لو کہ واقعی کچھ لکھنا لکھانا ہی مراد ہے یا کچھ اور مقصد ہے اور بظاہر حالات بھی اس کلمہ کا نہ سمجھا جانا ہی محتمل تھا کیونکہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہ ہے کہ احکام الہی کو خدا کی طرف منسوب کر کے ذکر فرماتے اور یہاں آپ نے یہ نسبت ذکر کر کے یہ نہیں فرمایا "إن الله أمر لي ان اكتب لكم كتا با لن تضلوا بعدي" کہ اللہ تعالی نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ تمہارے لئے ایک تحریر لکھے جاؤں کہ میرے بعد تم بہک نہ سکو!

مانعین تحریر اس شبہ میں پڑھ گئے کہ ممکن ہے آپ نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق ہی فرمایا ہو مگر ہماری سمجھ میں نہیں آیا لہذا تحقیق کر لینی چاہیئے اور پھر بات قطعی طور پر سب کے علم میں تھی کہ آپ نے عمر بھر نہ کوئی تحریر لکھی نہ اس کی آپ کو مشق تھی اور نہ ہی بطور معجزہ ہی یہ ہنر آپ سے کبھی ظہور میں آیا، آپ کے امی ہونے کی تصدیق قرآن مجید نے بھی کی ہوئی تھی، پھر جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت کی نسبت اپنی طرف فرما کر یہ فرمایا کہ "اكتب له كتابا" کہ میں تمہارے لئے تحریر لکھوں، یہ اچھنبے کی بات تھی کہ آخر اس کے کیا معنی ہیں، اس کو پوچھنا چاہئے کیونکہ کلام پیغمبر کو ہذیان تو کہہ نہیں سکتے۔

علاوہ ازیں یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ قرآن مجید کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں لکھوایا

کرتے تھے بلکہ کسی اور تحریر کا پڑھنا پسند بھی نہیں تھا ایک مرتبہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ توریت کا نسخہ کہیں سے لائے اور اسے پڑھنے لگے تو آپ نے منع فرمادیا اور اس وقت آپ نے قرآن کے علاوہ کچھ اور بدست خود لکھنے کو فرمایا تو حاضرین کو بہت تعجب ہوا اور اسے سمجھنے سے عاجز رہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ بطور استفہام انکاری یا تعجبی کسی کی زبان پر یہ لفظ آگیا ہو اگر ان کو ہذیان کا یقین ہوتا یا آپ کے کلام پر ہذیان کا حق ہونا ان کے وہم و گمان میں بھی ہوتا تو یہ کبھی نہ کہتے کہ پھر پوچھو، بلکہ یہ کہتے اس کے پیچھے مت پڑو یہ تو ہذیان ہے اس کا کیا اعتبار!

اب یہاں اس جملہ اهجر .....الخ کی تفصیل ملاحظہ ہو، لغت عرب میں ھجر کے معنٰی اختلاط کلام کے ہیں کہ بات سمجھی نہ جائے اور یہ اختلاط دو قسم کا ہوتا ہے گرفتگی آواز کی وجہ سے گلا بیٹھ جانا، زبان پر خشکی کے غالب آجانے کے باعث اعضائے تکلم و گفتگو کے کمزور پڑ جانے کے سبب ایسا ہو جاتا ہے کہ الفاظ صحیح مخارج سے خاطر خواہ طور پر نہ نکل سکیں، الفاظ اچھی طرح ادا نہ ہوں یا ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوں یہ اختلاط کلام کی پہلی قسم ہے، یہ عارضہ پیغمبران کرام علیہم السلام کو بھی لاحق ہو سکتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں، مگر اس عارضہ کے لاحق ہونے سے کسی وقت پیغمبری میں کوئی نقص یا عیب ہرگز پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ مرض و بیماری کے اعراض و توابع ہیں، باتفاق اہل سیر، مرض الوصال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتگی آواز کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا احادیث کتب صحیحہ سے ہمیں یہ بات ملتی ہے۔

اختلاط کی دوسری قسم یہ کہ غشی (بے ہوشی) کے سبب اور تپ ہائے محرقہ میں دماغ کی طرف بخارات کے صعود کے باعث اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بے ربط یا خلاف مقصود کلام زبان پر جاری ہو جائے یہ کیفیت گو امور بدنیہ کے سبب پیدا ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ روح اور قوت مدرکہ پر اثر انداز ہو جاتی ہے اس لئے انبیاء کرام علیہم السلام کو یہ کیفیت لاحق ہونے اور نہ ہونے میں علماء کی آراء میں اختلاف ہے، جو حضرات اسے جنون پر قیاس کرتے ہیں وہ اسے انبیاء کے لئے ممتنع قرار دیتے ہیں اور جو حضرات اسے نیند پر قیاس کرتے ہیں وہ اسے جائز سمجھتے ہیں، اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس اختلاط کا دوسرا سبب یعنی بے ہوشی انبیا علیہم السلام کو بھی لاحق ہوتی ہے" وَخَرَّ مُوسَی

صَعِقًا"[1] موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے، تو قرآن مجید میں بھی آیا ہے، اسی طرح صور قیامت پھونکے جانے کے وقت سوائے موسیٰ علیہ السلام کے سب کا بے ہوش ہو جانا صحیح بھی ہے اور ثابت بھی "فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللهُ"[2] اور جب صور پھونکا جائے گا تو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب بیہوش ہو جائیں گے، مگر جسے اللہ چاہے وہ بے ہوش نہیں ہو گا، اور حدیث صحیح میں یوں آیا ہے کہ:

فأكون أول من يفيق، فإذا أنا بموسى آخذ بقائمة من قوائم العرش، فلا أدري أفاق قبلي أم جوزي بصعقة الطور[3]

سب سے پہلے ہوش میں آنے والا میں ہوں گا تو موسیٰ علیہ السلام نظر آئیں گے جو عرش کے پایوں میں سے ایک پایہ پکڑے کھڑے ہوں گے، اب یہ پتہ نہیں کہ وہ بیہوش ہوئے اور مجھ سے پہلے ہوش میں آگئے یا ان کی طور کی بے ہوشی آچکی بے ہوشی کا بدل ہو گئی۔

ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اپنی کرامت اور بزرگی کے ساتھ غشی و بے ہوشی کے وقت بھی اللہ تعالی انبیاء علیہم السلام کو اپنی مرضی کے خلاف قول و فعل کے صدور سے بچائے رکھتا ہے (ان کی عصمت اس حال میں بھی قائم و باقی اور فعال رہتی ہے) بہر حال میں ان سے رضائے الہی ہی کی بات صادر ہوتی ہے! اور یہ بالکل ظاہر ہے ایسی حالت کو جنون پر بالکل قیاس نہیں کیا جا سکا کیوں کہ جنون میں اول روز کے قوائے مدرکہ میں اختلال پیدا ہو کر جم جاتا ہے، اور یہ اختلال جاری رہتا ہے زائل نہیں ہوتا اسی لئے جنون کی حالت رہتی ہے بخلاف اس حالت کے کہ یہاں روح ہر اختلال سے بالکل محفوظ رہتی ہے البتہ اعضائے جسمانی مخالف اثر کے غلبہ پانے کی وجہ سے اور اس کے دفعیہ کے لئے روح کا مصروف بکار ہونے کے سبب روح کے زیر فرمان نہیں رہتے اسی لئے یہ حالت نہ جمتی ہے اور نہ دیر پا ہوتی ہے، یہ بالکل نیند کے مانند ہے جو انبیاء کو لاحق ہوتی ہے اور جاگنے میں اور اس میں بہت

1۔ سورۃ الاعراف، الآیۃ: 143

2۔ سورۃ الزمر، الآیۃ: 68

3۔ صحیح البخاري، باب قول الله تعالى ووعدنا موسى، 4/ 153، رقم: 3398، ط: دار طوق النجاة

فرق ہے، ہاں اتنا ہے کہ نیند میں ان حضرات کا قلب بیدار و آگاہ اور خبر دار رہتا ہے، مگر بے ہوشی میں بھی نیند کے وہ تمام آثار جو اعضا کے جسمانی آنکھ، کان سے متعلق ہیں مرتب ہوتے ہیں اور نماز کا قضا ہو جانا یا وقت کے گزر جانے کی خبر نہ ہونا یہ حالت ان حضرات کرام کو بھی پیش آتے ہیں جیسا کہ کافی کلینی میں حدیث لیلۃ التعریس کے ضمن میں مذکور ہے اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کو اپنی نمازوں میں سہو و نسیان لاحق ہوتا ہے چنانچہ امامیہ کی کتب صحاح میں انبیاء وائمہ سے سہو و نسیان کی روایات بیان کی گئی ہیں۔

اس واقعہ میں بھی جب حضور ﷺ سے وجوہ کثیر خلاف عادت شریفہ باتیں ظہور میں آئیں، جس کی تفصیل ابھی مذکور ہوئی ایسی حالت میں حاضرین میں سے کسی کو یہ وہم ہو گیا ہو کہ کہیں یہ کلام بھی اختلاط کلام کی قسم سے نہ ہو جو اس جیسی بیماری میں رونما ہو جاتا ہے تو اس میں بعید از عقل کیا بات ہے، اور نہ یہ محل طعن و تشنیع ہو سکتا ہے خصوصا ایسی حالت میں جبکہ آپ شدید درد سر اور دہکتے بخار میں مبتلاء بھی ہوں۔

اور دوسری روایت سے تو یہ معنی اور تعجب صاف سمجھا جا سکتا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں "ما شانہ اھجر استفھموہ" آپ کا یہ حال ہے کیا اختلاط کلام ہے ذرا پوچھو تو، اس پر کہنے والا ادب کی رعایت کرتے ہوئے اظہار یقین نہیں کرتا بلکہ بطور شک کہہ رہا ہے ممکن ہے، ایسا نہ ہو اور ہم بھی آپ کا مفہوم نہ سمجھ پا رہے ہوں دوبارہ دریافت کر کے بات کو واضح کر لینا چاہئے، اور یہ گفتگو تو اس تقدیر پر ہے کہ اختلاط کی دوسری قسم بے ہوشی مراد لیں، اور اگر قسم اول مراد لیں (اور حضور ﷺ نے حاضرین کے مشورہ کی وجہ سے اپنے پاس سے اٹھ جانے کے متعلق جو ارشاد فرمایا اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ آپ پر بے ہوشی طاری نہیں تھی بلکہ مرض کی شدت والی صورت تھی۔ن) تو اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ شدت مرض کی وجہ سے آپ کے فرمان کے الفاظ ممکن ہے ہم پورے طور پر نہ سمجھ سکے ہوں، اس لئے استصواب کر کے مراد متعین کرالیں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل پورے اور صحیح طور پر انجام دے سکیں اس صورت میں کوئی اشکال نہ رہا۔

جواب وجہ سوم: یہ وجہ سراسر غلط فہمی اور حق سے چشم پوشی پر مبنی ہے، اس لئے کہ حضور ﷺ کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنا بے شک ممنوع اور ناجائز ہے مگر اس قصہ میں تو کسی سے بھی یہ حرکت سرزد نہیں ہوئی، نہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے نہ کسی اور سے! اور حضور ﷺ کی موجودگی میں تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی

باہمی گفتگو کی آواز بند ہو ہی جاتی رہی ہے، اور حضور ﷺ نے اس سے کبھی منع نہیں فرمایا، بلکہ آیت قرآن مجید سے تو اس کا جواز معلوم ہوتا ہے آیت میں نبی ﷺ کی آواز پر اپنی آواز اونچی کرنے کی ممانعت ہے اگر آپ کی مجلس میں باہمی گفتگو میں بلندی آواز ممنوع ہوتی تو آیت کے الفاظ اس طرح ہوتے " لَا تَرفَعُوا أصواتكم بَيْنكُم عند النبی "(نبی کے پاس بیٹھ کر باہم بلند آواز سے نہ بولا کرو)

دراصل آیت کا مفہوم صحیح طور پر متعین کرلیا جائے تو یہ اعتراض کرنے کی گنجائش ہی نہ رہے میرے خیال میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب نبی ﷺ گفتگو فرمارہے ہوں تو آواز پر اپنی آواز بلند کر کے آپ کی گفتگو میں خلل نہ ڈالو کہ اس سے دوسرے لوگوں تک آپ کی آواز پہنچنے میں رکاوٹ ہوگی اور پورے مجمع تک آپ کی آواز صحیح طور پر نہ پہنچنے کے سبب احکام کی صحیح تبلیغ میں نقص واقع ہوگا اسی لئے آپ کی آواز پر آواز کا بلند کرنا گناہ کبیرہ اور حرام قرار پایا۔

حضور ﷺ سے گفتگو میں اس کا خیال رکھو کہ جس میانہ روی سے آپ گفتگو فرمارہے ہوں حاضرین کو بھی آپ سے گفتگو اسی لہجہ اور انداز میں کرنی چاہیے آپ نے کوئی بات نرم لہجہ میں فرمائی تو آیت کہتی ہے جواب بھی نرم لہجہ میں دو نہ کہ ایسے لہجہ میں بولو جو حضور کے لہجہ سے بلند ہو "کجهر بعضكم لبعض" سے ایک طرف تو مفہوم بالا کی تائید ہوتی ہے تو دوسری طرف باہم بلند آوازی کا جواز بھی نکلتا ہے، توضیح بالا اگر مدنظر رہے تو طعن کے لئے اس وجہ کا کوئی جواز نہیں رہتا اس لئے کہ واقعہ بالا میں نہ تو کسی نے آپ ﷺ کی گفتگو کے دوران بول کر آپ کی آواز دبا کر اپنی آواز بلند کی اور نہ کوئی آپس کی طرح حضور سے بولا۔

رہا شور وشغب تو مختصر سی جگہ جب کئی آدمی اکٹھے ہو کر معمول کی آواز میں بھی بحث مباحثہ کریں گے تو وہ بھی شور وشغب ہی لگے گا اور پھر اس وقت آپ بیماری اور درد والم کی جس حالت سے دوچار تھے اس میں تو دس بارہ آدمیوں کی سرگوشی بھی شور شغب ہی کی طرح باعث تکلیف ہوتی ہے، رہی یہ بات کہ اول حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آواز بلند کی یا جھگڑا شروع کیا، تو یہ بات کیسے معلوم ہوئی، ان کو یہ بات پہلے دلیل سے ثابت کرنی چاہیے، پھر زبان طعن دراز کریں، اور حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمانا "لاينبغی عندی تنازع "میرے پاس

بیٹھ کر جھگڑنا مناسب نہیں، بھی اسی مدعا کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ بلند آوازی ترک اولی کے ضمن میں آتی ہے کیونکہ لاینبغی کا لفظ حرام یا گناہ کبیرہ کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا کوئی یہ نہیں کہتا کہ زنا کرنا منع نہیں شرع میں اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات کیا ہوگی، اور "قوموا عنی "میرے پاس سے اٹھ کھڑے ہو، وہ مرض کی کیفیت کے پیش نظر تھا بیمار آدمی عموماً گفتگو سے دل تنگ ہوتا ہے گفتگو کی نوبت بھی آئے تو وہ چاہتا ہے کہ اہم ضروری کام کی بات ہو کر جلد یہ سلسلہ ختم ہو، اگر ایسی حالت میں کوئی بات سرزد ہو تو کسی دوسرے کے حق میں وہ طعن ہرگز نہیں ہو سکتی خصوصاً جبکہ خطاب عام ہو جس میں رائے کے موافق و مخالف سب شریک ہوں! (شیعوں کو قم یا عمر میں کون سی خوردبین سے نظر آگئی اور قم یا علی کو وہ خوردبین کیوں نہ دکھا سکی کہیں تعصب کی عینک تو آنکھوں پر چڑھی ہوئی نہ تھی) بروایت صحیح مروی ہے کہ اس بیماری کے دوران آپ کو لدود دوا کھلائی گئی تھی، افاقہ کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا "لا یبقی احد في البیت الا لد الا العباس "گھر میں سب کو دوا کھلایا جائے مگر عباس کو چھوڑ کر "فإنه لم یشهدکم "[1] کیونکہ وہ تم میں موجود نہیں تھے (غالباً صورت حال یہ تھی کہ حضور ﷺ کے پسند خاطر نہ ہونے کے باوجود اہل خانہ نے بطور علاج لدود کھلوایا تھا، ان میں ایسے افراد بھی ہوں گے جو اس کے کھلانے کے خلاف ہوں گے بعد افاقہ حضور نے گھر میں اس وقت موجود سب ہی افراد کو لدود کھلوایا چاہے اس نے کھلانے کی رائے دی ہو خواہ نہ کھلانے کی حضرت عباس اس سے مستثنیٰ ٹھہرے کہ وہ اس وقت گھر میں موجود نہ تھے نہ شریک رائے تھے) بیماری سے دل تنگی ایسی بات نہیں جو شان پیغمبری میں کسی قسم کے نقص کا سبب بنے اس لئے اس کی ضرورت نہیں کہ اس معاملہ میں انبیاء کرام علیہم السلام کے متاثر نہ ہونے کا عقیدہ رکھا جائے، امراض میں بدنی ضعف بھی تو ہو جاتا ہے اس سے ان کی شخصیت میں کیا نقص ہوتا ہے البتہ جسم وروح اس سے محفوظ و ممنون رہتے ہیں کہ ان کے فرائض ووظائف شرعی و دینی میں بیماری کے سبب کوئی خلل واقع ہو۔

1۔ الانتصار، للعاملی، 4/ 495، ط: دار السیرة بیروت لبنان

جواب وجہ چہارم: یہ وجہ بھی خیال باطل پر مبنی ہے حق تلفی اس وقت تو ہو سکتی تھی جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نئی بات آئی ہوئی ہوتی اور وہ امت کے حق میں نافع ہوتی اور پھر اس کو روک دیا جاتا اور الیوم اکملت کے نزول کے بعد یہ قطعی طور پر معلوم تھا کہ اب کوئی دین و شرع کی نئی بات نہیں ہوگی، محض مشورہ اور مصلحت کی پر کوئی بات تھی اور یہ وقت بھی مدینے کا تھا اور یہ کوئی عقلمند باور کرے گا کہ حضور ﷺ کی نبوت کا جو زمانہ تھا جس میں تئیس سال تک آپ قرآن مجید اور بے شمار احادیث کی تبلیغ فرماتے رہے اور پھر عام خلق اللہ اور خصوصاً اپنی امت پر جو شفقت و رافت اور ہمدردی آپ فرماتے رہے اس وقت جو بات آپ نے نہ فرمائی وہ ایسے تنگ و جز ک وقت میں آپ فرمانا یا لکھوانا چاہتے ہوں، اور وہ بھی ایسی بات جو دفع اختلاف کے لئے بمنزلہ تریاق ہو اور اس کو محض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منع کرنے پر باز رہے ہوں، اس کے بعد بھی تو حضور نبی کریم ﷺ پانچ روز حیات رہے تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو موجود نہ تھے اہل بیت ہی کی آمد و رفت رہی وہی زیادہ تر آپ کی خدمت میں حاضر رہے اس وقت ان حضرات ہی کو وہ بات آپ ﷺ تحریر فرما کر عنایت فرما دیتے یا ان کو لکھوا دیتے یا ان کا یہ عقیدہ تو نہیں ہے کہ اس وقت بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غائبانہ ناراضگی کے خیال سے آپ نے ایسا نہیں فرمایا؟

اس خیال کے باطل اور لغو ہونے کی عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر حضور نبی کریم ﷺ اس تحریر کے لکھنے یا لکھوانے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حتمی اور یقینی طور پر مامور ہوتے اور وقت و فرصت پانے کے باوجود کہ پنجشنبہ کا کچھ حصہ، جمعہ تا یکشنبہ، مزاج مبارک بعافیت رہا اس کے باوجود آپ نے اس طرف توجہ نہ فرمائی کیا اس سے آپ کے فرض تبلیغ میں تساہل کا الزام نہیں آتا؟ اور کون ایسا بدبخت ہے جو ایسی بات آپ کی طرف منسوب کرنے کا خیال تک اپنے دل میں لائے اسے تو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہئے؟ یہ بات تو آپ کی عصمت کے سراسر خلاف ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (1)

1۔ سورۃ المائدۃ، الآیۃ: 67

اے رسول آپ کے رب کی طرف آپ پر جو نازل کیا گیا اس کی تبلیغ فرمایئے اگر آپ نے ایسا نہ فرمایا تو آپ نے رسالت رب کا ابلاغ نہ فرمایا، اور اللہ تعالی لوگوں سے آپ کی حفاظت فرمائے گا۔

پھر ایسے وقت کہ وقت وصال سامنے تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خیال سے وعدہ الہی پر جو عصمت و محافظت کے لئے وارد ہو عدم اطمینان کا اظہار نہیں ہم اس کے تصور سے بھی خدا کی پناہ چاہتے ہیں! اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے طور پر کوئی تحریر لکھنا یا لکھوانا چاہتے تھے، تو اب یہ سوال ہے کہ آپ نے اپنے اس خیال سے رجوع فرمایا یا نہیں؟ اگر پہلی صورت ہے تو اب جناب فاروق رضی اللہ عنہ پر طعن کا سرے سے سوال ہی نہ رہا، بلکہ دیگر موافقات عمری کے ساتھ ایک یہ صورت بھی شامل ہوگئی جو آپ کی عزت میں اضافہ کے ساتھ آپ کی منقبت قرار پائے گی، اور آپ پر طعن کرنے والوں کے لئے موجب ذلت وبدبختی ہوگی۔

دوسری صورت میں لازم آئے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نافع اور مفید شے ترک فرمادی، آپ تو امت پر شفیق، مہربان اور غایت درجہ ہمدرد تھے ایسا کیسے فرما سکتے تھے آپ کے متعلق تو اللہ تعالی نے یہ فرمایا ہے:

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ[1]

بے شک تمہارے پاس تم میں سے ایک رسول آئے ان پر تمہاری تکلیف شاق گزرتی ہے اور تمہارے نفع کے لئے وہ بہت حریص میں مومنوں کے حق میں مہربان رحم دل ہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو تحریر لکھوانا چاہتے تھے وہ (1) سابق تبلیغ پر اضافہ اور کوئی نئی بات تھی (2) اسکی ناسخ یا مخالف تھی یا (3) اس کی تائید کرنے والی تھی، پہلی اور دوسری صورت میں تو آیت الیوم اکملت لکم----الخ کی تکذیب لازم آتی ہے، اور تیسری صورت میں امت کی کوئی حق تلفی لازم نہیں آتی خدا کی تاکید اس سے بالاتر تھی تو جب یہ امت اللہ تعالی کی تاکید کو خاطر میں نہیں لاتی وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید کی کیا قدر کرتی، اور اس خیال کے غلط و باطل ہونے کی فعلی دلیل یہ ہے کہ اسی حدیث قرطاس میں

1۔ سورۃ التوبۃ، الآیۃ: 67

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت بحوالہ ابن عباس رضی اللہ عنہما صحیحین میں موجود ہے:

اشتد برسول الله صلى الله عليه وسلم وجعه، فقال: «ائتوني أكتب لكم كتابا لن تضلوا بعده أبدا»، فتنازعوا ولا ينبغي عند نبي تنازع، فقالوا: ما شأنه، أهجر استفهموه؟ فذهبوا يردون عليه، فقال: «دعوني، فالذي أنا فيه خير مما تدعوني إليه» وأوصاهم بثلاث، قال: «أخرجوا المشركين من جزيرة العرب، وأجيزوا الوفد بنحو ما كنت أجيزهم» وسكت عن الثالثة أو قال فنسيتها،[1] وفي رواية :وفي البيت رجال، فيهم عمر بن الخطاب۔۔۔قال قد غلب عليه الوجع، وعندكم القرآن، حسبنا كتاب الله.[2]

جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا درد سر شدید تھا آپ نے فرمایا شانہ کی ہڈی میرے پاس لے آؤ تا کہ اس پر کچھ لکھوں تا کہ میرے بعد تم نہ بھٹکو، پس وہ (حاضرین جن سے خطاب فرمایا تھا) باہم بحث میں پڑے اور کہنے لگے یہ آپ کی کیا کیفیت ہے؟ کیا (درد کی وجہ سے) اختلاط کلام تو نہیں (فرمان کی وضاحت کے لئے) آپ سے پوچھو تو پس وہ آپ سے سوال وجواب کرنے لگے جس پر آپ نے فرمایا میرے حال کی فکر چھوڑو، تم جس حالت کو میری طرف منسوب کر رہے ہو میں اس سے بہتر حال میں ہوں (تم کو جو کہتا ہوں سنو) پھر آپ نے تین باتیں بطور وصیت فرمائیں (1) مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال باہر کرو (2) ایلچیوں کو میری طرح انعام دینا جاری رکھو، راوی کہتے ہیں کہ تیسری بات پر آپ خاموش ہوگئے یا یہ کہا کہ میں بھول گیا، ایک روایت میں ہے کہ گھر میں اس وقت جو لوگ تھے ان میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی تھے، انہوں نے

1۔ صحيح البخاري، باب مرض النبي ﷺ ووفاته، 6/ 9، رقم:4431، ط: دار طوق النجاة

2۔ صحيح البخاري، باب قول المريض قوموا عني، 7/ 120، رقم:5669، ط: دار طوق النجاة

فرمایا آپ درد کی شدید تکلیف میں ہیں (اپنی بحث سے آپ کو تنگ نہ کرو) تمہارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے، گمراہی اور بھٹکنے سے بچانے کیلئے حضور ﷺ کے بعد وہ کافی ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بولنے سے پہلے ہی لوگ بحث میں الجھ گئے تھے اور اپنے سوال وجواب سے حضور ﷺ کی تکلیف میں زیادتی کا موجب ہو رہے تھے کہ حضور ﷺ نے قصہ مختصر کرنے کے لئے ان کو تنبیہ فرما کر جو بات فرمانا چاہتے تھے فرمادی، دوبارہ ان سے یہ نہیں فرمایا کہ دوات قلم کاغذ لاؤ، اگر وہ کوئی وحی یا قطعی بات ہوتی اور آپ اس سے سکوت فرماتے تو یہ خلاف عصمت ہوتا، شیعہ خود اس کے اقراری ہیں کہ اس قصہ کے بعد حضور ﷺ مزید پانچ روز بقید حیات رہے، اور رفیق اعلیٰ سے دوشنبہ کو واصل ہوئے، تبلیغ وحی کے لئے اس مدت میں آپ کو کافی وقت اور فرصت ملی نیز یہ بات بھی اس روایت سے معلوم ہوگئی کہ آپ جو تحریر فرمانا چاہتے تھے وہ دینی امور میں سے کوئی بات نہ تھی بلکہ سیاست مدنیہ، مصالح مملکت اور دنیوی تدابیر کی قسم کی چیز تھی یہ محسوس فرما کر کہ حضرات کچھ کا کچھ سمجھ کر نئی الجھنوں کی طرف چل پڑے ہیں آپ نے تحریر کے قصہ کو برطرف کر کے اتنا مقصد بطور وصیت زبانی ہی ارشاد فرمادیا، اور تیسری جس کا اس روایت میں ذکر رہ گیا یا راوی اسے بھول گئے جیش اسامہ کی تیاری کے متعلق تھی جس کی صراحت دوسری روایت میں موجود ہے۔

اس دعویٰ کی پہلی دلیل تو یہ ہے کہ موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب دوسری بار دوات وہڈی کے لئے پوچھا تو آپ نے فرمایا تم مجھے جس کام میں مشغول کرنا چاہتے ہو میں اس وقت اس سے بہتر اور بالاتر کام میں مشغول ہوں یعنی مشاہدہ حق، اور قرب ومناجات الٰہی میں! اگر وہ تحریر دینی امور سے متعلق ہوتی یا کسی وحی کی تبلیغ کا معاملہ ہوتا تو وہ تو آپ ﷺ کی نظر میں سب سے بہتر اور خیر وبھلائی نیز فرض منصبی تھا، اس کو ثانوی درجہ میں کیسے رکھ سکتے تھے! علماء امت کا اس پر اجماع ہے کہ انبیاء کے حق میں تبلیغ وحی اور دینی احکام کی ترویج سے بڑھ کر کوئی عبادت بہتر نہیں، اس روایت سے بھی عیاں ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے دوسری بار اصحاب کرام کے سامنے اس عالم سے بے تعلقی اور وارفتگی کا اظہار فرمایا تو حاضرین پر تاسف وحسرت اور مایوسی غالب آنے لگی ان کی تسلی خاطر کے لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ فرمائے کہ حضور ﷺ کا یہ عتاب آمیز

خطاب کسی غصہ یا ناراضگی کی بنا پر نہیں بلکہ شدت تکلیف کے سبب ہے تم دل تھوڑا نہ کرو حضور ﷺ ذریعہ دین و احکام الٰہی کا جو ذخیرہ بشکل کتاب اللہ تمہارے پاس ہے تمہاری تربیت ہدایت اور تمہارے دین و ایمان کی حفاظت و پاسبانی کے لیے کافی ہے تو دراصل جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ کلام اس گفت و شنید کے بعد حاضرین کی تسلی و تشفی کے لیے ہے اور ان کے اس گمان کے ازالہ کے لیے ہے کہ کہیں ہماری گفتگو سے حضور ﷺ ہم سے ناراض نہ ہو گئے ہوں اور اس گمان کا قرینہ وہی ہے کہ آپ نے تحریر کے لیے دوبارہ قلم دوات طلب نہیں فرمائی جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کتابت سے روکنے کی غرض سے یہ کلام نہیں فرمایا تھا۔

بطور تتمہ کلام یہ بات قابل غور ہے کہ دونوں فرقوں کا اہل سیر کا اجماع ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس قصہ کے وقت وہاں موجود تھے آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر نہ ان حضرات پر جو حضور ﷺ کو اس شدت تکلیف میں مزید مشقت اور تکلیف سے بچانے کی خاطر کسی تحریر کے حق میں نہ تھے نہ اس وقت نہ آئندہ ان کی زندگی میں تا بوقت وفات جب آپ مسند خلافت پر متمکن تھے کوئی اعتراض و نکیر نہیں فرمائی اور نہ اس قسم کی کوئی روایت کسی سنی یا شیعی اپ کی جانب منسوب ہو کر بیان کی گئی لہذا اگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس معاملہ میں غلطی پر تھے تو آپ جو ان کے ہم نوا تھے آپ نے بھی اسے درست و جائز قرار دیا سوائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے جو ہنوز کم سن تھے کسی سے افسوس اور حسرت کا اظہار نہیں اگر اس معاملہ میں کسی معاملہ سے محرومی کی بات ہوتی تو اصحاب کبار خصوصا جناب امیر رضی اللہ عنہ خود اس کا ذکر فرماتے بطور اعتراض نہ سہی بطور تاسف ہی حرف شکایت زبان پر لاتے۔

اگر یہاں کسی کے دل میں یہ شبہ سر ابھارے کہ جب حضور ﷺ کا مقصد کسی اہم دینی بات کے تحریر کرانے کا نہ تھا تو آپ نے "لن تضلوا بعدی" الفاظ کیوں فرمائے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپ اس تحریر کے ذریعہ امت کو گمراہی میں پڑنے سے بچانا چاہتے تھے اور گمراہی کے معنی یہی ہیں کہ دین میں کوئی خلل رونما نہ ہو۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ لغت عرب میں ضلال عام ہے جس طرح دینی گمراہی کے لیے اس استعمال کرتے ہیں دنیاوی معاملات میں بد تدبیری کے لیے بھی مستعمل ہوتا ہے کلام الٰہی میں اس کی مثال حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا وہ قول ہے جو انہوں نے اپنے والد محترم حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسبت کیا:

"إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ "[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو مضبوط جتھا ہیں ان کو نظر انداز کر کے ایک اکیلی جان یوسف علیہ السلام کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں تو ان کا یہ رویہ معاملات دنیاوی کے لحاظ سے درست نہیں دوسری جگہ منہ در منہ کہا "إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ "[2] اور ان کے خیال میں دنیاوی لحاظ سے یہ روش یوں غلط تھی کہ دنیا میں بڑے اور طاقتور جتھا دار بیٹے ہی باپ کا دست و بازو ہوتے ہیں دشمنوں سے نمٹتے ہیں اور اس وقت وہی باپ کا سہارا بنتے ہیں ظاہر ہے برادران یوسف علیہ السلام کافر تو تھے نہیں کہ اس لحاظ سے ایسے عالی مرتبت پیغمبر باپ کو دین سے گمراہ بتاتے یا ایسا اعتقاد رکھتے ان کی مراد دنیاوی بے تدبیری ہی ہو سکتی ہے کہ کام کاج کے لائق لڑکوں کو جو ہر وقت خدمت کے لیے کمربستہ ہیں پیار نہیں کرتے دوست نہیں رکھتے اور کم عمر محنت و خدمت سے قاصر بیٹے کو محبت سے زیادہ عشق کی حد تک چاہتے ہیں، لہذا یہاں بھی ضلال سے تو باب ملکی میں خطا کاری ہے نہ دینی گمراہی۔

(چنانچہ بطور وصیت جو تین باتیں آپ ﷺ نے فرمائی وہ مدنی و ملکی معاملات سے ہی تعلق رکھتی ہیں مشرکین عرب کو جزیرہ سے نکالنا ایلچیوں اور سفراء کو انعامات سے نوازنا اور جیش اسامہ کی تیاری یہ سب باتیں کی تھے اور ایسی تدابیر تھیں جن کا براہ راست فائدہ ملک و مملکت کو پہنچتا ہے چنانچہ پہنچا، مشرکین عرب کی نال کہیں اور کہاں گڑی تھی کہ وہاں سے نکل کر شاہد و آباد رہتے نہ کہیں ان کی ننھیال ودھیال تھی نہ سسرال کے وہاں جا کر سر چھپا لیتی یہاں کے لوگ ان کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے لامحالہ انہیں عرب ہی میں رہنا تھا لہذا "فِي دِينِ اللهِ أَفْوَاجًا "[3] فوج در فوج مسلمان ہوئے سفراء کی آو بھگت انعام و اکرام سراسر مملکت کے فائدہ کی تدبیر تھی کہ ان پر اچھا تاثر قائم ہو گا تو منہ سے تعریف ہی نکلے گی اپنی اپنی مملکتوں میں جا کر وہ مسلمانوں کے لطف و عنایت خاطر تواضع اور جود و سخاوت کی تعریف کریں گے جن کے ذریعہ غیروں کے دلوں میں نفرت و

1۔ سورة يوسف، الاية: 8

2۔ سورة يوسف، الاية: 95

3۔ سورة النصر، الاية: 2

عداوت کے بجائے انس و محبت کی راہ کشادہ ہو گی کم از کم ان کی ریشہ دوانیوں سے تو مملکت بچا رہے گی جیش اسامہ والی تدبیر تو استحکام ملکی کے لیے اتنی موثر تھی کہ عرب وغیرہ سب پر دھاگ بیٹھ گئی اور بد خواہ و بد اندیش جو منصوبے رکھتے تھے سب خاک میں مل گئے اگر جیسے اسامہ بروقت روانہ نہ ہوتا تو خلافت راشدہ کے استحکام کا تو کیا سوال مکہ و مدینہ میں مسلمانوں کا ٹکنا محال ہو جاتا، از مترجم نعمانی)

اور اس پر دلیل قطعی یہ ہے کہ جب 23 سال تک وحی کا نزول قرآن وحدیث کی تبلیغ ان کی ہدایت کے اور ان کی گمراہی دور کرنے کے لیے کافی نہ ہوئے تو یہ چند سطور کی تحریر ان کی گمراہی اور بھٹکنے سے کیسے ہو جاتے ہیں پھر یہاں بکار خویش ہوشیار قسم کے لوگوں کے دل میں یہ بات بھی آ سکتی ہے کہ ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ خلافت کے متعلق کوئی تحریر لکھوانا چاہتے ہوں اور جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مداخلت سے یہ اہم کام کھٹائی میں پڑ گیا تو ان کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے ہم کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے لیے خلافت ہی کی بات منظور خاطر مبارک ہوتی تو اس کی دو ہی صورتیں ہوتی یا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا معاملہ ہوتا یا جناب علی مرتضی رضی اللہ عنہ کا۔

پہلی صورت کے متعلق اسی مرض کے دوران ایک اور مرتبہ آپ کے قلب مبارک میں اس کا داعیہ پیدا ہوا آپ نے ارادہ بھی فرمایا مگر پھر خود ہی اس کو ترک فرما کر معاملہ اللہ تعالی اور مسلمانوں کے اجتماعی شعور کے حوالے فرمایا اس ارادہ کے التوا میں نہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا دخل ہوا نہ کسی اور کا، آپ کے علم میں یہ ایک ہونے والی بات تھی اس لیے اس کے لکھنے کی ضرورت بھی نہ رہی، حدیث کی معروف اور مشہور کتاب صحیح مسلم میں ہے کہ اسی بیماری کے دوران حضور اکرم ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

ادعي لي أبا بكر، أباك، وأخاك، حتى أكتب كتابا، فإني أخاف أن يتمنى متمن ويقول قائل: أنا أولى، ويأبى الله والمؤمنون إلا أبا بكر[1]

تم اپنے والد اور بھائی کو میرے پاس بلا کے ان کے لیے ایک تحریر لکھوا دوں مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی آرزو مند اس کی ارزو کر رکھے اور کہے کہ میں اس کا حقدار ہوں کوئی دوسرا نہیں اور اللہ

1۔ صحيح مسلم، باب من فضائل أبي بكر الصديق رضي الله عنه، 4/ 1857، رقم: 2387

تعالیٰ اور مسلمان ابو بکر کے علاوہ قبول نہیں کریں گے۔

یہاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہاں تھے کہ انہوں نے اس وصیت کی تحریر سے روک دیا ہو۔

دوسری صورت ہوتی تو اس کے لیے کسی تحریر کی حاجت نہ تھی کیونکہ اس واقعہ سے پہلے میدان غدیر خم میں ہزاروں افراد کے مجمع میں امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی ولایت پر خطبہ دے چکے تھے اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کو ہر مومن مرد و عورت کا مولیٰ قرار فرما چکے تھے اور یہ قصہ مشہور عوام اور زبان زد خلق تھا اگر اتنی پابندی، تاکید، شہرت اور تواتر کے باوجود بھی عمل نہ کریں تو چند حضرات کے سامنے لکھی ہوئی نجی تحریر اس پر کیا اثر ڈالتی۔

خلاصہ کلام یہ کہ کسی بھی صورت میں اس تحریر سے روک دینے سے امت کی حق تلفی نہیں ہوتی نہ مہمات دینی پردہ خفا میں رہتے ہیں ان کا وہ خیال باطل بھی امام مہدی کی غیبت کے لغو خیال کا چربہ ہے کہ اس کی حقیقت بھی وسوسہ اور وہم کے سوا کچھ نہیں اور وہم کی بیماری کا علاج کسی کے پاس کوئی نہیں حتیٰ کہ لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں۔

طعن نمبر 2: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سیدہ رضی اللہ عنہا کا مکان جلا دیا تھا

دوسرا طعن واعتراض یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جناب سیدۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا مکان جلا دیا اور آپ کے پہلوئے مبارک میں تلوار کا کچوکا دیا کہ اس کے صدمہ سے آپ کا حمل ساقط ہو گیا۔(1)

یہ قصہ سراسر بہتان اور بد ترین افتراء اور جھوٹ ہے اس کی کوئی اصلیت نہیں اس لئے امامیہ حضرات کی اکثریت اس قصہ کی قائل ہی نہیں، اتنا کہتے ہیں کہ گھر جلانے کا ارادہ کیا تھا مگر وہ ارادہ عمل میں نہیں اس کا حالانکہ قصد وارادہ دل کی کیفیت ہے جس پر خدا کے سوا کوئی مطلع نہیں ہو سکتا۔

1۔ هذه القصة ثابتة عند الإمامية وتقول بأن عمر بن الخطاب أراد أن يحرق بيت فاطمة رضي الله عنها، وكان في البيت علي والحسن والحسين رضي الله عنهم، ولم يحرك علي رضي الله عنه ساكنا بل أخذ مربوطا من رقبته – وفق رواية الإمامية – بحبل أسود كي يبايع أبا بكر الصديق، والذي اشترك في هذه العملية ضده هم خيار الصحابة وكان يترأسهم بزعمهم عمر بن الخطاب، والرواية طويلة ينظر تفاصيها عند المفيد، الاختصاص: ص 185؛ الطبرسي، الاحتجاج: ص 83؛ ابن أبي الحديد في شرحه: 2/ 19؛ العياشي في تفسيره: 2/ 307؛ المجلسي، بحار الأنوار: 53/ 18. وغيرهم.

اگر ان کی مراد یہ ہو کہ آپ نے زبانی طور پر ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ ہمیں اس کو جلا دوں گا تو یہ ڈراوا اور دھمکی بھی ان لوگوں کے لیے تھی جو جناب سیدہ کے مکان کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتے جو ہر خائن کا ملجا اور جائے پناہ تھا اور جسے انہوں نے حرم مکہ کا درجہ دے رکھا تھا خلیفہ اول کے خلافت کے خلاف فساد انگیز مشورے کرتے اور منصوبے بناتے اور فتنہ و فساد برپا کرنے کی تدبیریں سوچتے خود جناب سیدہ زہراء ان کی نشست اور فساد انگیز حرکات سے شاکی اور نالاں تھی مگر حسن خلق کے سبب کھلم کھلا ان کو اپنے یہاں انے سے مانانہ کر سکتی تھیں جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان حالات کا علم ہوا حقیقت واقعہ سے آگاہی ہوئی تو آپ نے ان جمع ہونے والے فسادیوں سے کہا کہ اگر تم اپنی فساد انگیز حرکات سے باز نہ آئے تو گھر سمیت تم کو جلا دوں گا، جلانے کی دھمکی کی تخصیص ایک لطیف اور باریک استنباط پر مبنی ہے جو آپ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک سے فرمایا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو جو نماز کی جماعت میں شریک نہیں ہوتے اور امام کی اقتداء نہیں کرتے تھے اسی قسم کی دھمکی دی کہ اگر ترک جماعت کرتے رہے اور اس سے باز نہ آئے تو میں ان کو مع ان کے گھروں کے جلا دوں گا۔[1]

اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر فرمودہ پیش امام تھے اور یہ سازشی لوگ امام حق کے اقتداء چھوڑنے کے منصوبے بنا رہے تھے اور مسلمانوں کی جماعت سے رشتہ رفاقت توڑنے پر کام کر رہے تھے اس لیے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تہدید کے مستحق قرار پائے لہذا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے ملتا ہے جو فتح مکہ کے وقت ظہور میں آیا تھا جب فتح مکہ کے دن آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ ابن خطل (جو کفار کا شاعر تھا جس نے بارہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجو میں اشعار کہے اور روسیاہ ہوا) کعبہ میں جا چھپا ہے اور اس کے پردوں میں لپٹا ہوا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے آپ نے فرمایا وہ جہاں چھپا ہے وہیں اس کو قتل کرو اور کسی بات کا لحاظ نہ کرو تو ایسے لعنتی اور پھٹکار مارے رانندہ درگاہ الہی لوگوں کو خانہ خدا میں بھی پناہ نہیں تو خانہ زہرا رضی اللہ عنہا میں ان کو امان کیسے مل سکتی ہے اور جناب زہرا رضی اللہ عنہ کو ایسے

1۔ والذي نفسي بيده لقد هممت ان آمر بحطب فيحطب، ثم آمر بالصلاة فيؤذن لها، ثم آمر رجلا فيؤم الناس، ثم اخالف الى رجال فاحرق عليهم بيوتهم. (صحيح بخاري، كتاب الاذان، 1/131، رقم: 644، ط: دار طوق النجاة)

فسادیوں کی سزا پر تکدر کیوں ہونے لگا۔

علاوہ ازیں خود ان سے بھی ایسی صحیح روایات منقول ہیں کہ جناب زہرا رضی اللہ عنہا خود بھی ان لوگوں کو اس طرح جمع ہونے سے منع فرماتی تھیں سلسلہ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا وہ قول جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فعل سے بدرجہا کم ہے کہ شہادت ذوالنورین جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد جب آپ مسند آراء خلافت ہوئے تو وہ لوگ جو آپ کی خلافت کا تختہ الٹنے کے منصوبے اپنے ذہنوں میں رکھتے تھے، مدینہ منورہ سے بھاگ کر حرم مکہ میں جا پہنچے قاتلین عثمان سے قصاص کا مطالبہ کرنے والوں کے ہم نوا ہو گئے اور حرم محترم جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہو گئے تو ایسے لوگوں کو آپ نے قتل کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم اور اپنی ماں بلکہ ام المومنین کی حرمت و عزت کا کوئی پاس نہ کیا اس سلسلہ میں حرم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ تکلیف پہنچی اور جو اہانت و ذلت اٹھائی وہ اظہر من الشمس ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اس عمل کو صواب و درست ہی کہیں گے کیونکہ اس قسم کے اہم امور میں جو عام فتنہ و فساد کا سبب بن سکتے ہوں انفرادی مصلحتوں کو ملحوظ رکھنا اور فتنہ کے مبادی و مقدمات کو نظر انداز کر دینا ان کے کی کوشش نہ کرنا دین و دنیا کے معاملات میں بے تدبیری سمجھی جائے گی تو جس طرح سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کی جائے قیام و سکونت لائق عزت تھی اسی طرح ام المومنین جو حرم محترم رسول، آپ کی محبوب زوجہ اور محبوبہ الٰہی بھی تھی آپ بھی واجب الاحترام اور لائق تعظیم تھیں بلکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تو ڈرانے کی غرض سے اور تہدید و ترہیب کی بنا پر محض قول ہی صادر فرمایا تھا اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے تو اس کو عمل کی بھی آخری حد تک پہنچا دیا لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق زبان طعن دراز کرنا تعصب و عناد پر مبنی ہے حالانکہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ کا قول جناب امیر رضی اللہ عنہ کے فعل سے باعتبار درجہ بہت ہی کم اور ہلکا تھا۔

اب اگر اہل سنت پر الزام دینے کی خاطر فرق پیدا کر کے یہ کہا جائے کہ چونکہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خلافت برحق تھی لہٰذا نظام مملکت کی حفاظت ضروری اور اولیت رکھتی ہے اس کے مقابلے میں ام المومنین رضی اللہ عنہا کا پاس اور حرم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا لحاظ وہاں ساقط ہو گا اور خلافت جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ چونکہ ناحق تھی اس لیے خلافت فاسدہ کے انتظام کے تحفظ کے لیے جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کے مکان کے احترام کا لحاظ نہ کرنا وبال و قابل

اعتراض بات ہو گی تو یہ فرق ہمارے نزدیک انتہائی حماقت، نادانی اور بے عقلی کی بات ہے اس لیے کہ اہل سنت تو دونوں خلافتوں کو برابر سمجھتے اور برحق مانتے اور جانتے ہیں خصوصا ایسے وقت کے اعتراض حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر کیا جارہا ہے کیونکہ ان کے نزدیک تو جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حقیقت خلافت متعین ہو چکی تھی اور اس وقت جناب صدیق رضی اللہ عنہ کا کوئی ایسا مخالف اور ہمسر بھی میدان میں دعویٰ خلافت کے ساتھ موجود نہ تھا جس کی مخالفت کچھ بھی اہمیت رکھتی ہو تو منظم اور برحق خلافت کے خلاف سازشیں کرنا اور منصوبے بنانا خصوصا جبکہ جوش اسلام کی نشو نما ہو رہی تھی اور دین وایمان کے پودے نے جڑیں پکڑی تھی سزائے قتل کو واجب کرتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے سازشیوں کو اس وقت قتل بھی کر دیتے تو یہ جائز اور حق تھا انہوں نے تو صرف ذرا دھمکا کر ہی جان بخشی کر دی اور تعجب تو ان شیعہ فضلاء پر ہوتا ہے جنہوں نے اس واقعہ کو نمک مرچ لگا کر اور بڑھا چڑھا کر اپنا خبث و بغض سب پر عیاں کر دیا ہے کہ جن جوانوں کو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ذرا دھمکایا تھا ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذات بھائی جناب زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ بھی تھے اور اس کے بعد جناب سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا نے بنی ہاشم کے نوجوانوں اور زبیر رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر پر مجلس برپا کرنے اور اکٹھا ہونے سے منع فرمایا۔

سبحان اللہ! کیا انوکھی منطق ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف جناب زبان رضی اللہ عنہ فساد کے منصوبے بنائے تو وہ معصوم بے خطا اور واجب التعظیم ہوں اور جب یہی زبیر رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص طلب کرنے میں لہجہ تند و درشت رکھیں تو واجب القتل قرار پائیں جناب سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے مکان میں جب فتنہ وفساد برپا کرنے کے منصوبے بنائے سازشیں کریں تو مقبول و پسندیدہ ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب زوجہ جو بلاشبہ ام المومنین تھی کہ قیادت وہمرکابی میں قصاص کا دعوی یا قاتلین عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شکایت میں زبان کھولیں تو نامقبول اور مردود القول قرار دیئے جائیں ایسا لچر اور واہیات فرق اصول شیعہ ہی پر مبنی ہو سکتا ہے اگر وہ اہل سنت پر اپنے ہی اصولوں سے الزام تھوپنا چاہیں تو سیدھا سیدھا کہیں اس ایچ پیچ کی کیا ضرورت ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک جماعت پر جو سنت موکدہ تھی اور اس کا فائدہ صرف مکلفین تک محدود تھا اس کے ترک سے عامہ مسلمین کو کوئی خطرہ یا نقصان نہیں پہنچتا تھا اس سب کے باوجود ان تارکین جماعت کے

گھروں کو جلانے کی تہدید فرمائی تو ایسے فتنہ و فساد پر جس سے پوری ملت اسلامیہ کے متاثر اور خونچکاں ہونے کا خطرہ ہو اور دین کو ملیامیٹ کرنے کا سامان ہو تو ایسی سازش گاہ کو جلانے کی دھمکی کیوں جائز نہ ہو۔

اور جب حضور ﷺ جناب سیدہ زہرا رضی اللہ عنہا کے مکان میں اس وقت تک داخل نہ ہوں جب تک دروازے پر سے منقش دبا تصویر پردہ نہ اتار لیا جائے یا خانہ خدا حرم کعبہ میں اس وقت تک تشریف نہ لے جائیں جب تک وہاں موجود حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مجسمے نہ نکلوا دیں تو اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی متبرک اور مکرم مقام کو جہاں فتنہ انگیز تدابیر سوچی جارہی ہوں حاضرین سمیت جلا دینے کی دھمکی دیں تو اس میں گستاخی کیا بات ہے زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جاسکتی ہے وہ ادب کی رعایت نہ کرنے کی ہو سکتی ہے تو یہ معلوم ہو گیا ایسے اہم اور مہتم بالشان امور میں ادب کی رعایت اور لحاظ نہیں کیا جاسکتا جناب امیر رضی اللہ عنہ کا اپنا رویہ اس کا ثبوت اور دلیل ہے کیا وہ شیعہ لوگ دنیا کو یہ باور کراتا اور جناب امیر رضی اللہ عنہ پر یہ الزام رکھنا چاہتے ہیں کہ آپ محبوبہ رسول ام المومنین جناب عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ادب نہیں فرماتے تھے اور آپ کی نظر میں آپ کے لیے کوئی اعزاز کوئی احترام نہیں تھا، دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں تھا اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کبھی خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی اس کے باوجود آپ کا رویہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا اور اپ کے ہمراہیوں کے ساتھ جو درشت ہوا تو وہ نظم مملکت کی حفاظت کا تقاضہ تھا اس کو اہانت و بے قدری صدیقہ رضی اللہ عنہا پر محمول شیعہ ذہن ہی کر سکتا ہے لہذا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایسا فعل سرزد ہو جو فعل معصوم سے ملتا ہو تو وہ کس منطق سے محل طعن و تشنیع ہو سکتا ہے!

طعن نمبر 3: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے وصال کا انکار کیا

بطور طعن یہ کہتے ہیں کہ جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے وصال کا انکار کیا اور قسم کھائی کے آپ کا وصال نہیں ہوا یہاں تک کہ جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے سامنے یہ آیت پڑھی "إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ"[1] تم بھی مرو گے اور وہ بھی مریں گے۔

یہاں بھی بات سمجھ کے پھیر کی یا بغض و عناد کی ہے یا پھر اعتراض برائے اعتراض کا معاملہ ہے ورنہ

1۔ سورۃ الزمر، الآیۃ: 30

کیا ایسے شخص پر ایسی حالت میں طعن کیا جا سکتا ہے جو محبت رسول میں سر تا پا غرق ہو اور جو آپ ﷺ کے مرض کی شدت کے مشاہدہ اور اچانک رحلت کی اندوہناک خبر اور آپ ﷺ کے فراق کے صدمہ سے اپنے ہوش و حواس عقل و فہم سے اتنا بیگانہ ہو گیا ہو کہ اسے اپنی سدھ بدھ بھی نہ رہی ہو حتی کہ اسے اپنا اور اپنے باپ کا نام بھی یاد نہ آ رہا ہو نہ وہ یہ سمجھ پا رہا ہو کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے اگر ایسی مدہوشی و بے خبری میں انتہائی محبت کے باعث محبوب کی موت سے انکار کر بیٹھا ہو تو یہ طعن کا موقع نہیں تعریف کا مقام ہے (ایسی آنکھ توڑ دینے کے لائق ہے جو ہنر کو عیب دکھائے)

اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسی حالت میں آیت بالا ذہن میں حاضر نہ کر پائے ہوں تو یہ کون سی تعجب کی بات ہے۔ بہت سے لوگوں کو غم واندوہ اور جزع فزع کے عالم میں آیات قرآن یاد نہیں رہتی لیکن بہت بحکم بشریت یہ مستحق طعن اور لائق ملامت نہیں ہوئے خود انہی شیعوں کی صحیح روایات سے جو سابقاً بیان ہوئی ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کے وقت یہ بھی بھول گئے کہ وہ قریب ہے اور مکانیت سے پاک اور بری ہے حالانکہ آپ علیہ السلام اس وقت حیرت و مدہوشی کی کیفیت سے جو دوچار بھی نہ تھے۔

اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایسی حالت میں جو ان کے نزدیک قیامت سے کم نہ تھی حضور ﷺ کے وصال کے جواز سے بے خبری ہو گئی تو اس میں کون سا گناہ ہو گیا، نسیان لوازم بشریت سے ہے یاداشت ایک صدمہ عظیم کے سبب سن اور غیر موثر ہو گئی تھی ذہول و نسیان تو ہوش و حواس اور پوری بیداری ذہن کی حالت میں بھی محترم و مقدس حضرات سے وقوع پذیر ہوا ہے، حضرت یوشع علیہ السلام بالاجماع نبی معصوم تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاکید کے باوجود مچھلی کے دریا میں چلے جانے کے واقعہ کو بھول گئے اور خود حضرت موسیٰ علیہ السلام باوجود جناب خضر علیہ السلام سے پختہ وعدہ کر لینے کے پیش آمدہ واقعہ کی مذمت کے سبب اپنا قول یاد نہ رکھ سکے اور ایک دفعہ نہیں تین مرتبہ ایسا ہوا اور ابو البشر اور اصل انبیاء حضرت آدم علیہ السلام کے نسیان پر خود قرآن مجید میں شہادت موجود ہے اور نماز میں نبی کریم ﷺ کو نسیان لاحق ہونے کا بیان و ثبوت تو خود ان کی کتاب کلینی میں موجود ہے اور ابو جعفر طوسی اور دیگر امامیہ نے اس کو صحیح درست بتایا ہے اس کے علاوہ ابو جعفر طوسی نے عبد اللہ حلبی سے ایک روایت بیان کی ہے کہ:

أن الإمام أبا عبد الله عليه السلام كان يسهو في صلاته ويقول في سجدتي السهو «بسم الله وبالله، وصلى الله على محمد وآله وسلم»[1]

امام عبد اللہ اپنی نماز میں بھول جاتے تھے اور سجدہ صاحب میں بجائے تسبیح بسم اللہ و باللہ وصلی اللہ علیہ وسلم کہنے لگتے۔

پس اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس سانحہ قیامت خیز وہوش ربا میں ایک آیت بھول گئے تو طعن کی کیا بات ہے۔

طعن نمبر 4: حضرت عمر رضی اللہ عنہ شرعی مسائل سے ناواقف تھے

اعتراض یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بعض ایسے شرعی مسائل سے ناواقف تھے جن کا جاننا خلافت وامامت کے اہم امور میں سے ہے ان میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے ایک حاملہ عورت کو حالت حمل میں رجم کرنے کا حکم دیا اس پر جناب علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو منع کیا اور فرمایا "إن كان لك عليها سبيل فليس لك على ما في بطنها" اگر آپ کو اس عورت پر قابو ہے تو جو اس کے پیٹ میں ہے اس پر تو قابو نہیں یہ سن کر آپ نادم ہوئے اور فرمایا" لو لا علي لهلك عمر"[2] اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو گیا تھا۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ آپ ایک پاگل عورت کو رجم کرنا چاہتے تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو روکا اور یہ حدیث پڑھی:

سمعت رسول الله صلى الله عليه و سلم يقول "رفع القلم عن ثلاثة: عن النائم حتى يستيقظ، وعن الصبي حتى يبلغ، وعن المجنون حتى يفيق"[3]

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ تین شخصوں سے قلم اٹھایا گیا ہے سونے والے سے

1۔ تهذيب الأحكام للطوسي: 2/ 196؛ الكافي للكليني: 3/ 356

2۔ لا يصح فليس له سند في كتب أهل السنة: أخرجه ابن قتيبة وابن عبد البر بلا سند، ومع ذلك ذكرها الإمامية كثيرا كما في نهج الحق و كشف الصدق للحلي، ص: 277، ط: دار الهجرة إيران قم

3۔ صحيح البخاري، باب: لا يرجم المجنون والمجنونة، 8/ 165، ط: دار طوق النجاة

جب تک وہ بیدار نہ ہو جائے، بچے سے جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے، پاگل سے جب تک وہ اچھا نہ ہو جائے
تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے ابو شحمہ رضی اللہ عنہ پر جو دوران حد فوت ہو گئے تھے بحالت مردگی بقیہ کوڑے لگوائے حالانکہ مردہ کو حد لگوانا خلاف عقل بھی ہے اور خلاف شرع بھی۔
چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کو شراب پینے کی حد کا بھی علم نہ تھا وہ اپنے لوگوں کے صلاح مشورے سے مقرر کی ان باتوں سے پتہ چلا کہ آپ کو تو شریعت کی ظاہری باتوں کا بھی علم نہ تھا تو خلافت کی کیا لیاقت رکھتے ہوں گے؟"
جواب: ان اعتراضات کا یہ ہے کہ یہاں بھی یہ خیانت کی عادت بد سے باز نہیں آئے قصہ کا ایک ٹکڑا اخفا اور باقی کو ہضم کر گئے صرف اس لیے کہ طعن کر کے خود سے باطن ظاہر کرنے کا موقع ہاتھ سے نہ نکل جائے اور یہ رویہ معاند و حاسد ہی کا ہو سکتا ہے جیسا کہ یہود کہتے تھے "إِنَّ اللهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ"[1] اللہ تو فقیر ہے ہم مالدار ہیں۔

حاملہ کے رجم کا قصہ دراصل یہ ہے کہ آپ کو اس کے حاملہ ہونے کا علم نہ تھا اور ظاہر ہے حمل کا ظہور پورے دنوں ولادت کے قریب ہی ہوتا ہے اور جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کا علم تھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کیفیت سے مطلع فرمایا تو آپ نے بطور تشکر یہ کلمات فرمائے کہ اگر میں اس بات سے ناواقف رہتا اور عورت و بچہ اس حد کے اجراء سے ہلاک ہو جاتے تو پیٹ کے اس بچہ کی ہلاکت پر مجھے اتنا افسوس اور صدمہ ہوتا جو میری ہلاکت کے برابر ہوتا اگر علی رضی اللہ عنہ بروقت مجھے اطلاع نہ دیتے تو میں اندوہ غم سے ہلاک ہو جاتا۔ اب یہ بات بالاتفاق شیعہ و سنی امام پر لازم نہیں کہ زانیہ کے خود اقرار یا گواہوں کی شہادت کے بعد زانیہ سے یہ پوچھے کہ تو حاملہ ہے یا نہیں بلکہ یہ عورت کو خود چاہیے کہ وہ حاملہ ہو تو اس کو ظاہر کر دے تو ایسا حکم جو حقیقت حال سے ناواقفیت کی بنا پر صادر ہو اور اصل حقیقت کچھ اور ہو جس کا تقاضا اس کے خلاف ہو تو اسے زیادہ سے زیادہ حقیقت حال سے لاعلمی تو کہہ سکتے ہیں جو نہ امامت و خلافت میں نقص کا باعث ہے نہ نبوت میں اسے جہل و نادانی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔
دیکھیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بے خبری ہی کی بنا پر اپنے بھائی کی داڑھی پکڑی سر کے بال کھینچے اور ان پر غصہ ہوئے اور ان کی اہانت کی حالانکہ موسیٰ علیہ السلام بڑے بھائی کی عزت و تکریم کے حکم سے جاہل نہ تھے اور

1۔ سورۃ آل عمران، الآیۃ: 181

خود سرور عالم عالمیان ﷺ بار بار فرماتے تھے:

إنما أنا بشر، وإنكم تختصمون إلي، وإن بعضكم ألحن بحجته من بعض، فمن قضيت له بحق أخيه فإنما أقطع له قطعة من نار[1]

بے شک میں بشر ہوں تم اپنے جھگڑے میرے پاس لاتے ہو تم میں سے بعض دوسرے کے مقابلوں میں زیادہ چرب زبان ہوتا ہے اگر میں اس سے متاثر ہو کر اس کو اس کے بھائی کا حق دے دوں تو یہ نہ سمجھنا کہ میں نے اسے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دیا ہے۔

اور سنن ابی داؤد میں روایت ہے کہ جب ابیض بن حمال رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے کان نمک عطا فرمانے کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے بے اطلاعی کے سبب اسے مرحمت فرمادی بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کون تو تیار ہے بغیر کسی عمل وکاری گری کے اس سے تو نمک بنا بنایا نکل رہا ہے تو آپ ﷺ نے اسے یہ خیال فرما کر واپس لے لیا کہ یہ تو مسلمانوں کا حق ہے اور سب کا مفاد اس سے وابستہ ہے کسی ایک شخص کی ذاتی ملکیت میں آنا مناسب نہیں اسی طرح جامع ترمذی میں بروایت صحیح وائل بن حجر کندی سے منقول ہے کہ حضور ﷺ کے عہد مبارک میں ایک مسماۃ نماز میں شرکت کے لیے گھر سے نکلی گلی میں کسی نے اس کو پکڑ کر بالجبر زنا کیا اس کے شور مچانے پر زانی تو بھاگ گیا مگر کسی دوسرے راہگیر کی طرف عورت نے اشارہ کر دیا کہ اسی نے زبردستی مجھے بے آبرو کیا ہے لوگ ان کو پکڑ کر حضور ﷺ کی خدمت میں لے آئے حضور ﷺ نے سنگسار کا حکم جاری فرما دیا رجم شروع ہونے ہی والا تھا کہ اصل مجرم اقراری ہو گیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ یہ شخص بے گناہ ہے زنا میں نے کیا تھا تب رسول اللہ ﷺ نے بے قصور سے معذرت فرمائی اور اصل مجرم کو رجم کا حکم فرمایا۔

پھر ایک اور حدیث متفق علیہ جو دونوں فرقوں کی کتابوں میں مذکور ہے یوں مروی ہے:

أن النبي صلى الله عليه وسلم أمر عليا بإقامة الحد على امرأة حديثة بنفاس فلم يقم عليها الحد خشية أن تموت، فذكر ذلك للنبي صلى الله عليه وسلم

1۔ صحيح البخاري، باب إذا غصب جارية فزعم أنها ماتت۔۔۔الخ، 9/ 25، ط: دار طوق النجاة

فقال: «أحسنت، دعها حتى ينقطع دمها»[1]

نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا اس عورت پر حد جاری کرنے کا جو نفاذ کی حالت میں تھی مگر آپ نے اس ڈر سے کہ کہیں وہ مر نہ جائے اس پر حد نہیں لگائی اور اس کا اظہار حضور ﷺ سے کر دیا آپ نے فرمایا تم نے اچھا کیا اسے خون کی مدت گزر جانے اور خون بند ہو جانے تک ملتوی رکھو۔

ان سب کے علاوہ نواصب نے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ پر بھی اسی قسم کے طعن و اعتراض ثابت کیے ہیں مثلاً آپ رضی اللہ عنہ نے شراحہ حمدانیہ پر دونوں حد و درجم اور دریک وقت جاری کیں حالانکہ وہ شادی شدہ تھیں اور آپ کا یہ فعل شریعت کے تو یوں خلاف کے آنحضرت ﷺ نے ماعز اور غامدیہ کو رجم کیا اور عقل کے بھی خلاف ہے اس لیے کہ جب رجم کی سزا جو سخت ترین ہے اس پر جاری ہونی واجب ہے تو اس سے ہلکی سزا درے کیوں لگائے جائیں اہل سنت تو اس بابت اس فرقہ کو یہ جواب دیتے ہیں کہ ابتدا اس کے شادی شدہ ہونے کا علم نہیں تھا اس لیے کوڑے لگوائے مگر جب معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ ہے تو سنگسار کرایا (مگر شیعوں کے مذکورہ بالا طعن کی موجودگی میں اس کا کیا منہ ہے کہ وہ معاند کو کوئی مسکت جواب دے سکیں) تو اسے دو حدوں کا جمع کرنا نہیں کہہ سکتے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ حقیقت حال سے لاعلمی اور چیز ہے اور شرعی مسئلہ کا نہ جاننا اور چیز اور جو شخص اتنا جاہل ہو کے وہ ان دونوں میں فرق کرنے کی بھی تمیز نہ رکھے وہ قابل خطاب ہی کب ہے اور یہی صورت پاگل عورت کو رجم کرنے میں درپیش تھی کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اس کے پاگل ہونے کا علم نہ تھا چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بحوالہ عطا بن سائب رحمۃ اللہ علیہ ابوظبیان جنبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت بیان فرماتے ہیں کہ لوگ ایک عورت

1۔ أخرج أحمد عن علي رضي الله عنه: «إن خادما للنبي صلى الله عليه وسلم أحدثت فأمرني النبي صلى الله عليه وسلم أن أقيم عليها الحد، فأتيتها فوجدتها لم تجف من دمها فأتيته فأخبرته، فقال: إذا جفت من دمها فأقم عليها الحد أقيموا الحدود على ما ملكت أيمانكم» ورواه أبو داود والنسائي؛ ومن الإمامية ابن حيوان، دعائم الإسلام: 2/ 453؛ النوري، مستدرك وسائل الشيعة: 18/ 17.

کو بحر میں زنا پکڑ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لائے ثبوت جرم کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے اسے رجم کی سزا دی لوگ باگ اسے پکڑ کر سزا کے لیے لے جا رہے تھے کہ اتفاقاً حضرت علی رضی اللہ عنہ راہ میں مل گئے آپ نے پوچھا کہ اسے کہاں لے جا رہے ہو لوگوں نے بتایا کہ رجم کے لیے آپ رضی اللہ عنہ نے ان سے عورت کا ہاتھ چھڑایا اور خود اس کا ہاتھ پکڑ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں یہ پاگل ہے اور فلاں قبیلہ سے تعلق رکھتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجنون پر احکام تکلیف جاری نہیں ہوتے یہ حال معلوم ہونے پر جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے رجم کا حکم موقوف فرما دیا۔[1]

معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسئلہ تو جانتے تھے مگر اس کے پاگل پن سے واقف نہ تھے اس لیے اس کی حالت کا علم ہوتے ہی آپ نے اس کی سزا موقوف کر دی بہت سے پاگل ایسے ہوتے ہیں کہ جب تک وہ پاگل پنے کی کوئی حرکت نہ کریں بظاہر نارمل اور سمجھدار نظر آتے ہیں اس لیے کہ صورت تو پاگل و عاقل کی ایک سی ہی ہوتی ہے اس اور عقل سے کسی کا جنون معلوم نہیں ہوتا یہ عورت پکڑ دھکڑ سے لے کر اس بات جرم کے مرحلے اور سزا کا حکم جاری ہونے تک کی مدت سے گزری اور اس کی کسی بات اور کسی حرکت سے اس کا جنون ظاہر نہیں ہوا تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی امتحون ہوتے اور یہ مسئلہ اپنی جگہ طے ہے کہ امور عقلیہ وحسیہ سے عدم واقفیت نبوت کے لیے بھی نقص نہیں تو خلافت امامت میں کیسے نقص ہو گا۔

اور اوراق ماسبق میں شریف مرتضی شیعی کہ کتاب الغرر سے یہ روایت نقل کی جا چکی ہے کہ قبطی کے متعلق حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم نہیں تھا کہ وہ سالم العضو ہے یا مقطوع العضو جو جناب ماریہ رضی اللہ عنہا کے ہاں آتا تھا اور ان کا چچازاد بھائی تھا اسی طرح اس عورت کے متعلق بھی یہ علم نہ تھا کہ وہ تازہ زچہ ہے اور ایام نفاس میں ہے تو اگر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو کسی عورت کے حاملہ یا پاگل ہونے کے علم نہ ہو سکا تو خلافت و امامت کی کون سی شرط میں فرق آ گیا خلافت کی شرط احکام شرعی کا جاننا ہے حسیات اور عقلیات جزئیہ کا جاننا شرط نہیں اور بالفعل احکام شرعیہ کا جاننا نہ نبوت میں شرط ہے نہ خلافت و امامت میں ہاں نبی کو احکام شرعیہ بذریعہ وحی معلوم

1۔ المسند: 1/ 140، رقم 1183؛ الحاکم، المستدرك: 4/ 430.

ہوتے ہیں اور امام کو اجتہاد سے جس کا ماحصل یہ تھا کہ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے مرتدوں کو جلوا دیا تھا اس کی خبر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو ہوئی تو انہوں نے اس پر نکیر فرمائی کہ ان کو قتل کرنا چاہیے تھا جلانا نہیں چاہیے تھا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتدین کو قتل کرنے کا حکم فرمایا ہے اور آگ کے عذاب سے منع فرمایا ہے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کہنے کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا ابن عباس نے سچ فرمایا معلوم ہوا کہ اس قسم کی اجتہادی غلطی بھی موجب طعن و اعتراض نہیں نہ اس پر ملامت کی گنجائش ہے چہ جائے کہ بے خبری عدم علم وہ بھی ایسے موقع پر جہاں اس سے واقفیت و باخبر ہونا ضروری نہیں کیسے ملامت و طعن کا محل بن سکتے ہیں۔

یہاں ایک بڑی پیچیدہ اور مشکل صورتحال کا سامنا ہے خاص کر شیعوں کے لیے کیونکہ نواصب کو بہانہ ہاتھ آگیا ہے وہ کہتے ہیں کہ تین مرفوع القلم لوگوں کے لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ خود روایت بیان فرماتے ہیں مگر دوسری طرف کتب شیعہ میں یہ روایت ہے کہ:

ان علیا کان یامر باقامة حد السرقة علی الصبی قبل ان یحتلم[1]

جناب علی رضی اللہ عنہ نابالغ لڑکے پر چوری کی حد جاری کرنے کا حکم فرماتے تھے۔

محمد بن بابویہ قمی نے اپنی کتاب من لایحضرہ الفقیہ میں یہ روایت کی ہے، آپ رضی اللہ عنہ کا یہ عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے صریح خلاف ہے اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ نافذ ہو بھی جاتا تو ایک مخصوص پاگل عورت ہی اس کی زد میں آتی ہے لیکن جناب امیر رضی اللہ عنہ کے فرمان سے تو ہر بچہ کا ہاتھ چوری کی سزا میں کاٹا جائے گا اور یوں ہزاروں بچے لنجے ہو جائیں گے، اب اس کا وبال شیعوں پر ہے وہ کیا جواب دیتے ہیں وہ جانیں، اتنا ضرور ہے کہ یہاں وہ تقیہ کی اڑ بھی نہیں لے سکتے کیونکہ بچوں پر حد عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کا مذہب نہیں تھا، ہاں اگر پاگل عورت کو سزا دیتے تو تقیہ کا عذر چل سکتا تھا مگر وہاں تو خود آپ رضی اللہ عنہ ہی نے حق ظاہر فرما کر ان کو رجم سے روک دیا، ہاں اہل سنت کے مذہب کے مطابق یہاں کوئی اشکال نہیں اس لیے جناب امیر رضی اللہ عنہ کے حق میں اس شیعی روایت کو

1۔عن زرارة قال: سمعت أبا جعفر علیه السلام یقول: اتی علي علیه السلام بغلام قد سرق فطرف أصابعه۔(الفروع من الكافي ، باب حد الصبیان في السرقة، 7/ 233، ط: دار الكتب الاسلامیة)

تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ اسے افتراء اور بہتان قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک ابن بابویہ کا اس روایت کو بیان کرنا ہی اس کے کذب اور غلط ہونے کی واضح دلیل ہے اور اتنا تو اصب بھی جانتے ہیں کہ شیعی روایات کے حوالے سے وہ اہل سنت کو الزام نہیں دے سکتے۔

رہا مردہ پر حد لگانے کا معاملہ تو وہ تو سر تا پا جھوٹ اور افتراء کی پوٹ ہے اہل سنت کے ہاں اس کے متعلق کوئی روایت نہیں ملتی اس لیے ان کے جواب کی بھی کوئی ضرورت نہیں بلکہ صحیح روایات یہ ہیں کہ ابو شحمہ رضی اللہ عنہ حد لگائے جانے کے بعد بھی زندہ رہے البتہ دوران حد ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی تھی ممکن ہے اسی کو کسی نے مرنا سمجھ لیا ہو۔[1]

اور ان کا یہ اعتراض کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شراب نوشی کی حد کا علم نہیں تھا آپ نے دوسروں سے پوچھ پاس کر اس کی حد مقرر کی یہ ایک عجیب قسم کا طعن ہے کیونکہ جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کا نہ جاننا کوئی عیب یا ناپس کی بات نہیں جبکہ شرح میں اس کی حد بندی بھی نہ کی گئی ہو اس لیے کہ علم تو معلوم کے تابع ہوتا ہے جب ایک چیز موجود ہی نہیں تو اس کا علم کیسے ہو گا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں شراب کی حد متعین نہیں ہوئی تھی یوں ہی بلا تعین چابک بٹی ہوئی چادر جوتیوں یا ہاتھ کی چھڑی سے چند ضربات لگاتے تھے جناب صدیق اکبر کے عہد میں جب چند اصحاب کرام رضی اللہ عنہم نے اس کا تخمینہ لگایا تو گنتی چالیس تک پہنچی[2] اور

---

1 ـ فالرواية الصحيحة عن ابن عمر أنه قال: «شرب أخي عبد الرحمن بن عمر وشرب معه أبو سروعة عقبة ابن الحارث وهما بمصر في خلافة عمر، فسكرا فلما أصبحا انطلقا إلى عمرو بن العاص وهو أمير مصر فقالا: طهرنا فإنا قد سكرنا من شراب شربناه، فقال عبد الله فذكر لي أخي أنه سكر فقلت: ادخل الدار أطهرك ولم أشعر أنهما أتيا عمروا فأخبرني أخي أنه قد أخبر الأمير بذلك، فقال عبد الله: لا يحلق القوم على رؤوس الناس ادخل الدار أحلقك، وكانوا إذ ذاك يحلقون مع الحدود فدخل الدار، فقال عبد الله: فحلقت أخي بيدي، ثم جلدهم عمرو، فسمع بذلك عمر فكتب إلى عمرو: أن ابعث إلي بعبد الرحمن على قتب ففعل ذلك، فلما قدم على عمر جلده وعاقبه لمكانه منه، ثم أرسله فلبث شهرا صحيحا، ثم أصابه قدره فمات فيحسب عامة الناس إنما مات من جلد عمر، ولم يمت من جلد». أخرجها عبد الرزاق، المصنف: 9/ 232، 233.

2 ـ روى البخاري عن أنس: «أن النبي صلى الله عليه وسلم ضرب في الخمر بالجريد والنعال، وجلد أبو بكر أربعين». (كتاب الحدود، باب ضرب شارب الخمر، 8/ 157، رقم: 6773، ط: دار طوق النجاة)

جب خلافت عمر رضی اللہ عنہ میں ایسے واقعات نسبتاً زیادہ ہونے لگے تو تمام صحابہ کرام علیہم السلام مشورہ کے لیے جمع کیے گئے اور ان سے مشورہ طلب کیا گیا حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ اور بعض روایات کے مطابق جناب عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے آپ بھی جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ہم رائے تھے دونوں حضرات نے تجویز فرمایا کہ شراب نوشی کی حد کو حد قذف کے برابر یعنی اسی کوڑے رکھی جائے اس لیے کہ شراب پی کر آدمی مست ہو جاتا ہے اسی مستی میں وہ عقل سے بیگانہ ہو کر واہی تباہی بکتا ہے، گالی بھی دیتا ہے اور تہمت بھی لگاتا ہے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس لطیف استنباط کو پسند کیا اور اسی حد پر سب کا اجماع ہو گیا لہذا معلوم ہوا کہ شراب نوشی کی حد کے بانی مبانی تو خود جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہی ہیں اس لیے یہ کہنا کہ آپ کو حد خمر کا پتہ ہی نہ تھا انتہادرجہ کی بے عقلی کی دلیل ہے۔

خود امامیہ کے نزدیک بھی یہ قصہ اسی طرح ثابت ہے چنانچہ شیخ ابن مطہر حلی نے منہج الکرامہ میں اس کو روایت کیا ہے،[1] یہیں سے ان کے دوسرے اعتراض کا بھی جواب معلوم ہو گیا کہ یہ کہتے ہیں کہ شراب نوشی کی حد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی عقل ورائے سے حد خمر میں اضافہ کیا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں تو صرف چالیس کوڑے تھے تو اگر یہ اضافہ اور زیادتی ہی ہے تو جناب علی رضی اللہ عنہ کے اجتہاد اور مشورہ اور تمام صحابہ کے اتفاق سے ہے تو اکیلے عمر رضی اللہ عنہ ہی ہدف کیوں (انہوں نے تو ایک معصوم کی رائے سے یاد مقرر فرمائی تھی کیا یہ اس طرح بالواسطہ صحیح جناب امیر رضی اللہ عنہ پر طعن کے مرتکب نہیں ہوئے)

بعض کتب شیعہ میں اس کو دوسرے انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حد خمر میں اسی سے زیادہ کوڑے لگوائے اول تو یہ روایت صحیح نہیں بالفرض صحیح بھی ہو تو ہم کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے بھی حد خمر میں سو کوڑے لگوائے یعنی اسی پر بیس کا اضافہ فرما کر چنانچہ محمد بن بابویہ قمی نے کتاب من لا یحضرہ الفقیہ میں ایک روایت بیان کی ہے کہ جب نجاشی حارثی شاعر کو عین رمضان المبارک کے ایام میں شراب نوشی کرنے پر پکڑ کر لایا گیا تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اس کو سو کوڑے لگوائے بیس کوڑے رمضان المبارک کی

1۔ ونقله عنه ابنه المعروف عندهم بفخر المحققين فقال في حد شارب الخمر: «هو ثمانون جلدة، رجلا كان أو امرأة حرا كان أو عبدا». شرائع الإسلام: 4/ 319.

حرمت کے سبب اضافہ کیے۔ [1]

اہل سنت بہار تو ان دونوں واقعات کا صرف یہی جواب دیتے ہیں کہ امیر المومنین کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اتنا یا قدر واجب شرعی میں خیانت و بے حرمتی کے سبب اضافہ کر سکتا ہے جس پر جناب امیر رضی اللہ عنہ کا فعل واضح اور کھلی دلیل ہے لہذا اب صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر نہ طعن کی گنجائش ہے اور نہ کوئی وجہ جواز۔

طعن نمبر 5: عمر رضی اللہ عنہ نے سو کوڑوں کی جگہ سو شاخہ لکڑی مارنے کا حکم دیا

یہ ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حد میں سو کوڑے مارنے کے لیے درخت کی ایسی ٹہنی جس میں سو شاخیں تھی مارنے کا حکم دیا جو سراسر شریعت کے مخالف ہے کیونکہ از روئے حکم قرآن مجید سو کوڑے مارنے کی ہدایت ہے "فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ" [2] دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔

جواب یہ ہے کہ اس اعتراض کا مقصد عناد و تعصب اگر نہیں ہے تو جہالت تو یقینی ہے اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ عمل تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فعل کے موافق ہے چنانچہ مشکوۃ میں نیز شرح السنہ میں جناب سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ وہ ایک ناقص الخلقت بیمار شخص کو اس جرم میں کہ وہ محلہ کی ایک لونڈی سے زنا کر رہا تھا پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے لیے درخت کی ایک لمبی چھڑی لاؤ جس میں سو شاخیں ہوں اور اس سے ایک بار مارو ابن ماجہ نے بھی اسی جیسی ایک روایت بیان کی ہے [3] اور ایسے مریض کے متعلق جس کی صحت کے امید نہ رہی ہو اہل سنت کا یہی مذہب ہے فتاوی عالمگیری میں ہے:

1۔عمرو بن شمر، عن جابر يرفعه " أن أمير المؤمنين (عليه السلام) اتي بالنجاشي الحارثي الشاعر قد شرب الخمر في شهر رمضان فضربه ثمانين ثم حبسه ليلة ثم دعا به من الغد فضربه عشرين سوطا، فقال: يا أمير المؤمنين ضربتني ثمانين سوطا في شرب الخمر فهذه العشرون ما هي؟ فقال: هذا لجرأتك على شرب الخمر في شهر رمضان "(من لا يحضره الفقيه للشيخ الصدوق،4/ 55،ط: الحوزة العلمية في قم المقدسة)

2۔سورة النور،الاية: 2

3۔عن سعيد بن سعد بن عبادة قال: كان بين أبياتنا رجل مخدج ضعيف، فلم يرع إلا وهو على أمة من إماء الدار يخبث بها، فرفع شأنه سعد بن عبادة إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: «اجلدوه ضرب مائة سوط» قالوا: يا نبي الله، هو

والمريض إذا وجب عليه الحد إن كان الحد رجما يقام عليه للحال وإن كان جلدا لا يقام عليه حتى يمائل أي يبرأ ويصح إلا إذا كان مريضا وقع اليأس من برئه فحينئذ يقام عليه كذا في الظهيرية. ولو كان المرض لا يرجى زواله كالشلل أو كان خداجا ضعيف الخلقة فعندنا يضرب بعثكال فيه مائة شمراخ فيضربه دفعة ولا بد من وصول كل شمراخ إلى بدنه ولذا قيل لا بد حينئذ أن تكون مبسوطة كذا في فتح القدير.[1]

مریض پر اگر حد واجب ہو اور وہ رجم کی شکل میں ہو تو فی الوقت جاری کر دی جائے اور اگر کوڑوں کی شکل میں ہو تو فورا نافذ نہ کی جائے تا وقت کہ وہ بیماری سے نجات نہ پالے اور تندرست نہ ہو جائے اگر بیماری ایسی ہو کہ اس کے ازالہ اور صحت کی طرف سے نہ امیدی ہو تو حد اسی وقت جاری کی جائے جیسے کا مریض یا اگر وہ ناقص الخلقت اور ضعیف البدن ہو تو ہمارے نزدیک سو شاخوں والی چھڑی کی ایک ہی ضرب اس طرح ماری جائے کہ ہر شاخ اس کے بدن سے چھوئے ضرور فتح القدیر میں ایسا ہی مذکور ہے

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسی حد جس کو لگائی وہ ضعیف الخلقت پیدائشی کمزور ہی تھا قران میں بھی ایسے حیلہ کی طرف اشارہ ملتا ہے حضرت ایوب علیہ السلام جب اپنی قسم توڑنے نہ توڑنے کی فکر میں تھے تو اللہ تعالی نے ان کو یہ ترکیب بتائی" وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِب بِهِ وَلَا تَحْنَثْ "[2] ایک مٹھا تنکیوں کا لو اور اس کو مارو اور اپنی قسم نہ توڑو۔

أضعف من ذلك، لو ضربناه مائة سوط مات، قال «فخذوا له عثكالا فيه مائة شمراخ فاضربوه ضربة واحدة (سنن ابن ماجة، باب الكبير والمريض يجب عليه الحد، 2/ 859، رقم: 2574، ط: دار إحياء الكتب العربية)

1۔الفتاوى الهندية، كتاب الحدود، الباب الرابع في الوطء الذي يوجب الحد والذي لا يوجبه، 2/ 147، ط: دار الفكر

2۔سورة ص، الآية: 44

طعن نمبر 6: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نصاب شہادت کے باوجود مغیرہ رضی اللہ عنہ پر حد نہ لگائی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر یہ بھی اعتراض ہے کہ آپ نے جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر چار گواہوں کی گواہی کے باوجود زنا کی حد لگانے سے درگزر کیا اور ایک گواہ کو ایسا کلمہ سکھادیا کہ اس کے بعد حد جاری وثابت نہ ہو سکی یعنی جب چوتھا گواہ گواہی کے لیے آیا تھا تو اس نے کہا "أري وجه رجل لا يفضح الله به رجلا من المسلمين"[1] "میں ایک ایسے شخص کا چہرہ دیکھ رہا ہوں کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالی مسلمانوں میں کہ ایک شخص کو رسوا نہ کرے گا۔

جواب اس طعن کا یہ ہے کہ حد سے درگزر یا اسے ٹالنا اس وقت کہتے ہیں جب ثبوت مکمل ہو گیا ہو چونکہ چوتھے گواہ کی گواہی صحیح نہیں تھی اس لیے حد ثابت ہی نہیں ہوئی تو اسے ٹالنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے رہا گواہ کو سکھانے پڑھانے کا الزام تو یہ کھلا افترا اور محض بہتان ہے ابن جریر طبری امام محمد بن اسماعیل بخاری اپنی تاریخ میں اور حافظ عماد الدین بن اثیر حافظ جمال الدین ابو الفرج بن جوزی اور شیخ شمس الدین مظفر سبط بن جوزی اور دوسرے ثقہ مورخین بیان کرتے ہیں کہ:

جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بصرہ کے امیر تھے بصرہ کے لوگ شرارت پر تلے ہوئے تھے وہ چاہتے تھے کہ ان کو معزول کرائیں انہوں نے ایک سازش کے تحت ان پر زنا کی تہمت لگائی اور چند جھوٹے گواہ اکٹھے کیے کہ امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ان سے گواہی دلائیں اسی سازش کے تحت بصرہ میں اس الزام کی شہرت دی گئی یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک بھی یہ خبر پہنچی آپ نے ان سب کو بلوایا چنانچہ جناب مغیرہ مع چار گواہوں کے مجلس عدالت میں صحابہ کے روبرو جس میں جناب امیر المومنین خود بھی تشریف فرما تھے پیش کیے گئے اہل بصرہ نے بحیثیت مدعی دعویٰ دائر کیا کہ جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ نے ام جمیل نامی ایک عورت کے ساتھ زنا کیا گواہ گواہی کے لیے آئے تو ایک نے کہا میں نے ان کو اس کی دونوں رانوں کے بیچ میں دیکھا اس پر امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا "لا والله حتي يشهد انه يلج فيها ولوج المر و دفی الملحلة " نہیں خدا کی قسم اس وقت تک اس کی گواہی معتبر نہیں جب تک یہ گواہی نہ دے کہ اس نے عضو مخصوص کو اس طرح اندر جاتے دیکھا جس طرح سرمہ

---

1 ـ بحار الأنوار للمجلسي: 30/ 651؛ الصوارم المهرقة للمشهدي: ص 136.

دانی میں سلائی جاتی ہے، اس پر گواہ نے کہا" نعم اشهد علی ذلک "ہاں میں اسی کیفیت کی گواہی دیتا ہوں اس کے بعد دوسرے اور تیسرے گواہ میں بھی اسی طرح گواہی دی جب چوتھا گواہ جو زیاد بن ابیہ تھا گواہی کے لیے آیا تو اس سے پوچھا گیا کہ تم بھی اپنے ساتھیوں کی طرح گواہی دیتے ہو تو اس نے کہا میں اتنا جانتا ہوں کہ " إني رأيت مجلسا ونفسا حثيثا وانتهازا ورأيته مستبطنها أي مخفيها تحت بطنه ورجلين كأنهما أذنا حمار "میں نے ایک نشست گاہ پھولا ہوا سانس اور استادگی دیکھی اور ان کو اس کے پیٹ پر دیکھا دونوں پاؤں ایسے لگتے تھے جیسے گدھے کے دو کان اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ کیا تو نے ایسا دیکھا جس طرح سلائی سرمہ دانی میں جاتی ہے اس نے کہا نہیں اس طرح نہیں دیکھا۔[1]

اب اس صورتحال کی موجودگی میں کون کہہ سکتا ہے کہ شرعا حد ثابت ہوگئی اور یہ مقدمہ بند کرے کا تو تھا نہیں صحابہ کی کھلی مجلس میں سب پیش تھے سب کے سامنے سوال وجواب ہو رہے تھے اس گواہ کو سکھانے پڑھانے کا مرحلہ کہاں پیش آیا اگر بر سر مجلس جناب عمر رضی اللہ عنہ ایسا کرتے تو کیا صحابہ کرام جن میں جناب علی رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے اس کو گوارا فرما لیتے، یہ حضرات تو اتنا منصف مزاج عادل اور جری تھے کہ بر سر ممبر امیر المومنین کو ٹوکتے اور جواب طلبی سے بھی دریغ نہ کرتے تھے اور پھر یہ معاملہ تو حدود اللہ کا تھا امور شرع اور حدود کے اس بات میں کوئی خامی سستی اور رواداری برتی جاتی تو صادقوں اور عادلوں اور سچے مسلمانوں کی یہ جماعت کثیر جو اسی مقصد اور فیصلہ کے لیے جمع ہوئی تھی کب اسے برداشت کر سکتی تھی ان اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کی عادت تو امر ناحق و منکر کو چھپانے کی نہیں اشکارہ کرنے کی تھی وہ دین کے معاملہ میں نہ بیجا لحاظ کرتے تھے نہ بے جا رواداری برتتے تھے یہ سب کے سب ایسی غلط روش پر کیسے خاموش رہ سکتے تھے اور جس پر حد ثابت ہو چکی ہو اس کو یوں ہی اچھوتا کیسے جانے دیتے اگر امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے شاہد کو سکھایا ہوتا تو یہ حضرات فوراً ہی آپ کی گرفت کرتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ وصف خود شیعی روایات سے ثابت ہو چکا ہے کہ آپ قبول حق میں اتنے مستعد تھے کہ دینی امور میں ایک عورت کی بات سے قائل ہو گئے اور پھر ان کا یہ وصف تو ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دین کا کوئی اہم کام بغیر

1۔ تاريخ الطبري: 2/ 494؛ تاريخ اليعقوبي: 2/ 146؛ ابن الجوزي، المنتظم: 4/ 232؛ البداية والنهاية: 7/ 82.

صحابہ رضی اللہ عنہ کے مشورہ اور ان کی موجودگی کے انجام نہیں دیتے تھے اور شروع طعن میں جس کلمہ کی ادائگی شیعوں نے آپ کی طرف منسوب کی ہے وہ سراسر غلط ہے اور آپ پر بہت بڑا بہتان ہے۔

البتہ جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا تھا،(1) اور جس کی عزت و آبرو اور جان پر بنی ہو اور بخیال خویش جھوٹ و سازش کا شکار ہو وہ ایسی باتیں کہتا ہی ہے بات تو گواہ کی ہے کہ اگر وہ صرف اللہ کی رضا کی خاطر گواہی دینے آیا تھا تو وہ جناب مغیرہ رضی اللہ عنہ کی باتوں سے متاثر کیوں ہوا اور اس کا لحاظ کیوں کیا اور اگر گواہ مدعا علیہ کا لحاظ کرکے اور مدعا علیہ کے نقصان کی گواہی دلوائے یہ بات کسی بھی مذہب و شریعت میں نہیں اور اگر یہ مقولہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کا مان لیں تو یہ آپ کی فراست مومنانہ کا ایک نمونہ ہے کہ آپ جو صورت آئندہ سامنے آنے والی ہے اس کو بیان فرما رہے ہیں اور آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بار ہا ایسا ہوا کہ آپ نے قرائن اور مومنانہ بصیرت سے پتہ چلا کر کسی چیز یا واقعے کے متعلق فرمادیا کہ یہ ایسا ہے اور وہ واقعتا ویسا ہی ہوا محض شیعوں کے کہنے سے تو یہ نہیں مانا جاسکتا ان کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ کہ حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے گواہ سے یہ کہا کس کے سامنے کہا کون گواہ ہے اس کی دلیل کیا ہے اور یہ شیعہ حضرات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس دلی ارادہ سے کیسے واقف ہو گئے کہ آپ کے دل میں یہ بات تھی کہ گواہ گواہی سے منحرف ہو جائے دل کا حال تو صرف خدا جانتا ہے۔

اور اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حد ٹالنے والی بات سرزد ہونا مان لیا جائے تو آپ کا یہ فعل تو امام معصوم کے عمل کے مطابق ہو گیا ان پر اگر طعن روا ہے تو امام معصوم اس سے کہاں بچیں گے ان کے مدافعت میں اگر ان کے پاس کوئی جواب ہے تو اس کو یہاں بھی منطبق کر لیں محمد بن بابویہ نے کتاب من لا یحضرہ الفقیہ میں یہ روایت بیان کی ہے کہ:

أن رجلا جاء إلى أمير المؤمنين عليه السلام وأقر بالسرقة إقرارا موجبا للقطع، فلم يقطع يده(2)

---

1 ـ ليس في كتب أهل السنة بل في كتب الإمامية: ابن أبي الحديد، شرح نهج البلاغة: 12/ 227؛ بحار الأنوار: 30/ 648.

2 ـ من لا يحضره الفقيه: 4/ 62؛ وأخرجه أيضا الطوسي، تهذيب الأحكام: 10/ 127.

ایک شخص نے امیر مومنین علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آکر اس انداز میں چوری کا اقرار کیا کہ اس کا ہاتھ کاٹا جانا چاہیے تھا مگر آپ رضی اللہ عنہ نے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا۔

جب اس کے اقرار سے قطعیہ کی حد واجب ہو گئی تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اس پر حد کیوں جاری نہیں کی اور یہ حد کیوں ٹال دی گئی؟

طعن نمبر 7: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مہر کے مسئلہ میں ایک عورت نے لاجواب کر دیا

ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خطاب میں بڑے بڑے مہر باندھنے کی ممانعت فرمائی اور فرمایا کہ اگر زیادہ مہر کوئی حرمت وخوبی کی بات ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ حقدار تھے حالانکہ میں نے دیکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات اور صاحبزادیوں کے مہر پانچ سو سے زیادہ کے نہیں باندھے لہذا تمہیں چاہیے کہ سنت رسول پر سختی سے عمل کرو اور زیادہ مہر نہ باندھو آئندہ اگر کسی نے زیادہ مہر باندھا تو میں مقدار سنت سے زیادہ رقم بحق بیت المال ضبط کرلوں گا اس پر ایک خاتون اٹھی اور کہنے لگی عمر سنو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا"[1] اگر عورتوں کو مال کا ڈھیر دے ڈالو تو اس ڈھیر سے کچھ بھی واپس نہ لو، ایسی صورت میں تمہیں کیا حق ہے کہ مہر کی زائد از سنت رقم واپس لو اگرچہ ان کی مقدار کتنی ہی کیوں نہ ہو اس پر جناب نے فرمایا "کل الناس افقه من عمر حتی المخدرات فی الحجال"[2] دین کی سمجھ میں سب ہی عمر سے بڑھے ہوئے ہیں حتی کہ چھپر کھٹوں کی پردہ نشین عورتیں بھی۔

اس واقعہ میں شیعوں کے پیش نظر قابل اعتراض بات یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ ایک عورت کے مقابل لاجواب ہو گئے کوئی جواب نہ بن پڑا اور جو ایک عورت کو جواب دینے سے عاجز ہو وہ امامت کے قابل کا ہو سکتا ہے؟

جواب: اس کا یہ ہے کہ حقیقت وہ نہیں ہے جس پر شیعہ بغلیں بجائیں آپ رضی اللہ عنہ کی خاموشی اس لیے نہیں تھی کہ آپ رضی اللہ عنہ اس کا جواب باصواب دینے سے عاجز ہو گئے تھے بلکہ آپ رضی اللہ عنہ کتاب اللہ کے ادب واحترام کی بنا

1۔ سورة النساء، الآية :20

2۔ بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار، الطعن السادس، 30/ 655، ط: دار الرضا بيروت لبنان

پر خاموش ہو گئے تھے کہ وہ اپنے کو کتاب اللہ کے مقابل رکھ کر اس کے جواب سے گریز کر رہے تھے (نیز آپ یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ محترمہ کا مبلغ علم کتنا ہے قرآنی آیت کا مفہوم احادیث کی روشنی میں ان کو سمجھانے اور بتانے کا یہ موقع بھی نہ تھا کہ وہ کوئی محفل مناظرہ تو تھی نہیں جب آپ حضور ﷺ کی سنت کا حوالہ دے چکے تھے اس کے باوجود محترمہ یہ نہ سمجھ سکی کہ آپ کا یہی مفہوم ہوتا جو وہ سمجھ رہی ہیں تو آپ ﷺ زیادتی مہر کو ناپسند نہ فرماتے ایسے وقت آپ رضی اللہ عنہ کا سکوت ہی صحیح اور مناسب تھا، از مترجم نعمانی)

کیونکہ کتاب اللہ کے مقابلے میں چوں وچرا یا توجیہات و تاویلات بلند مرتبہ اہل ایمان کے شایان شان نہیں ان کے نزدیک اسلم راستہ یہی ہے کہ وہ قرآن کے ظاہری الفاظ کو تسلیم کر لیں اور اسی لیے آپ رضی اللہ عنہ نے سکوت اختیار فرمایا (دراصل ان محترمہ کو اعتراض زائد سنت میں اقدار کی واپسی پر تھا اور اسی کے ثبوت میں یہ قرآنی آیت پڑھی) اگر ان کی غرض حوالہ یہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بھاری بھاری مہر باندھنے سے راضی ہوتا ہے تو یہ بات تو جناب رسالت مآب ﷺ کی فہم مبارک کے صریحاً خلاف ہے کیونکہ احادیث صحیحہ میں کثرت و زیادتی مہر کی نفی منقول ہے خطابی نے غریب الحدیث میں یوں روایت کی ہے کہ:

أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: تياسروا في الصداق، إن الرجل يعطي المرأة حتى يبقى ذلك في نفسه عليها حسيكة[1]

نبی کریم ﷺ نے فرمایا مہر میں آسانی کرو آدمی اگرچہ بھاری مہر بھی عورت کو دیتا ہے مگر دل میں پھانس سی چبھی رہ جاتی ہے۔

ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ:

قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: خيرهن أيسرهن صداقا[2]

کہتے ہیں فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ عورتوں میں وہ عورت بہتر ہے جس کا مہر بہت ہلکا ہو۔

1۔ مصنف ابن ابی شیبة، باب غلاة الصداق، 6/ 174، رقم: 10398، ط: المجلس العلمي الهند

2۔ صحیح ابن حبان، ذکر الاخبار عن وصف خیر النساء۔۔۔الخ، 9/ 342، رقم: 4034، ط: مؤسسة الرسالة بيروت

عن عائشة قالت: قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم:من يمن المرأة تسهيل أمرها وقلة صداقها(1)

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتی ہیں کہ عورت کا مبارک ہونا اس کے مہر کا آسان وہلکا ہونا ہے۔

احمد و بیہقی کی مرفوع روایت ہے کہ:

أعظم النساء بركة أيسرهن مؤنة(2)

سب سے زیادہ بابرکت وہ عورت ہے جس کا مہر سب سے زیادہ ہلکا ہو۔

اس آیت سے زیادہ سے زیادہ مہر کی زیادتی کا جواز نکل سکتا ہے اگرچہ بکراہت ہو گا لیکن وہ نص کہاں ہے جو یہ متعین کر کے آیت میں لفظ قنطار سے مہر مراد ہے کیونکہ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ قنطار زیور، روپیہ، پیسہ اور ساز و سامان ہو جو مرد اپنی بیوی کو دیتے ہیں مہر نہ ہو اس لیے کہ اس قسم کے عطایہ وہدایہ جو ان عورتوں کو ہبہ کر دیے جاتے ہیں ان کو واپس لینا زیبا نہیں خاص کر ایسی صورت میں جبکہ اسے طلاق دے کر بے آسرا اور تکالیف معاش وغیرہ کے حوالے کر رہے ہوں ایسی حالت میں تو اس ہبہ کی واپسی اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہو گی جو خلاف شرع بھی اور خلاف مروت بھی اور امر جائز میں ممانعت مصالح ملی و ملکی پر بھی مبنی ہو سکتی ہیں وہ مسلمانوں کے لیے خیر غلط فخر و مباہات زمانہ سازی اور اسراف بے جا میں ناضائع کریں کہ یہ دوسرے حقداروں کی حق تلفی کا سبب بھی ہو سکتا ہے جس کا نتیجہ باہم تنازعات مقدمہ بازی لڑائی جھگڑے اور کسی بڑے فتنہ کی صورت میں نکل سکتا ہے اور مصالح ملکی ملی کی نگہداشت اور جائز اخراجات پر قدغن یا انہیں محدود کرنا خلیفہ وقت کا کام ہے ہر زمانہ میں اس کے نظائر ہر جگہ دیکھے جا سکتے ہیں۔

اب دیکھیے کہ طلاق ایک امر جائز ہے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جناب زید رضی اللہ عنہ کو اس سے منع فرماتے تھے

1۔صحیح ابن حبان، ذکر البيان بأن تسهيل الأمر وقلة الصداق،9/ 405، رقم: 4095، ط: مؤسسة الرسالة بيروت

2۔مسند الامام احمد بن حنبل، 42/ 54، ط: مؤسسة الرسالة بيروت

کہ وہ جناب زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق نہ دیں، علی ہذا لنکاح سنت نبی ہے مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اہل کوفہ سے فرماتے تھے کہ "يا أهل الكوفة! لا تزوجوا الحسن، فإنه مطلاق[1] للنساء" اے اہل کوفہ حسن رضی اللہ عنہ کی شادی نہ کراؤ کیونکہ وہ عورتوں کو طلاق بہت دیتے ہیں، حالانکہ ان کا فعل جائز تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جس کلام پر اعتراض ہے اس سے واضح طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مہر کی زیادتی کے جواز کے تو قائل تھے مگر انجام بد پر نظر فرما کر روکتے تھے۔

اگر ان محترمہ کا ایت سے مقصد مال کی واپسی حرام ہوتا ہو تو وہ حرمت خاوندوں اور شوہروں کے لیے ثابت ہوگی نہ کہ ان خلفاء یا حکام کے لیے جو ڈانٹ ڈپٹ کر اس سے روکیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالی نے فرمایا" وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا "اور اگر تمہارا ارادہ ایک بیوی کو چھوڑ کر دوسری کو لانا ہو اور ان میں سے ایک کو ڈھیروں مال دے دیا ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔

اور بحق بیت المال کی ڈانٹ بطور تنبیہ تھی ویسے جمہور اہل سنت کے نزدیک خلیفہ کو یہ حق ہے کہ اگر کسی فی الحال یا فی المعال فتنہ کا اندیشہ ہو تو جائز بات پر بھی قدغن لگا سکتا اور سزا دے سکتا ہے اور مال کو ضبط کرنا بھی ایک قسم کی سزا ہے۔

اور اعتراض میں یہ کہنا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس اپنی غلطی کا اقرار کیا ایک معاندانہ اور بے سروپا جھوٹ ہے کسی بھی روایت میں اس اقرار کی تصریح نہیں البتہ وہ جملہ آپ نے ضرور فرمایا جو ایک طرف تو آپ کی تواضع کثر نفسی اور اس نے اخلاق کی نشاندہی کرتا ہے کہ آپ نے سوچا کہ ایک ناواقف علوم قرآن اپنی سوچ سمجھ کے مطابق اپنی بات کی سند قرآن مجید سے لائی ہے اب اس کے استنباط کو دلائل صحیحہ سے غلط بتاؤں تو دل شکستہ ہو جائے گی اور پھر اس نے بات قرآن کی شاید جرأت نہ کرے اس لیے مناسب ہے کہ اس کی دلجوئی کی خاطر اپنے کو اس معاملہ میں معترف اور قائل کروں تاکہ اس کو بھی اور دوسروں کو بھی معنی قرآن میں غور و خوض اور اس کے دقائق اخذ کرنے کی امنگ پیدا ہو اور یک گونہ قرآن سے وابستگی رہے، تو دوسری طرف اس کے قول کی تردید

1۔ سیر أعلام النبلاء، 3/ 253، ط: مؤسسة الرسالة

بھرے مجمع میں اس کو شرمندگی سے بچانے کا مقصد بھی ظاہر کرتا ہے اس قصہ کے علاوہ دوسرے واقعات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ میں یہ وصف خاص طور پر تھا کہ اپ چاہتے تھے کہ لوگ کتاب اللہ سے وابستگی حاصل کریں اور قرآن پر غور و فکر اور مسائل کے اخذ و استنباط میں مشغول رہیں ورنہ کون رئیس وقت اور حاکم زمانہ ایسا بے نفس ہوتا ہے کہ اعیان حکومت یا مجمع احباب و معتقدین میں ایک نا سمجھ عورت کی سمجھ بوجھ کی تعریف و توصیف کے ساتھ اپنے کو قائل اور ملزم کے روپ میں پیش کرے اور اس کے سوال پر چپ ہو جائے۔

اگر بالفرض آپ رضی اللہ عنہ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا تو ان محترمہ کی گرفت کرنے اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ایک جواز تو موجود ہی تھا اور آپ اس کو اس معاملے میں سزا بھی دے سکتے تھے کیونکہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت کا ذکر کر رہے تھے اور وہ اس کے مقابلے میں قرآنی آیت لا کر نعوذ باللہ گویا یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت سے بے خبر تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا وہ مطلب نہ سمجھے جو میں سمجھی ہوں لیکن مقتدا یعنی دین و شریعت کی شان کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ ان کے نفوس پاک میں نفسانیت اور سخن پروری کی بو تک نہ آئے انہیں تو صرف حق کی تلاش اور اس کا اتباع منظور ہوتا ہے اور وہ حق خود ان کے اپنے پاس ہو یا دوسرے سے حاصل ہو اس لیے تمام اکابرین وارباب یقین اس منقبت عظیم میں باہم شریک و ہمسر ہیں جناب علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی اسی قسم کا ایک قصہ منقول ہے چنانچہ ابن جریر اور ابن عبد البر نے محمد بن کعب سے روایت کی ہے کہ:

قال: سأل رجل عليا رضي الله عنه عن مسألة، فقال فيها أفقال الرجل: ليس كذلك يا أمير المؤمنين ولكن كذا وكذا فقال علي رضي الله عنه: أصبت وأخطأت وفوق كل ذي علم عليم[1]

راوی کہتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے کوئی مسئلہ پوچھا آپ نے اس کے جواب میں کچھ فرمایا تو اس نے پلٹ کر کہا کہ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ ایسا ایسا ہے جناب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تو نے ٹھیک کہا ہم سے خطا ہو گئی اور ہر جاننے والے سے اونچا جاننے والا ہے۔

1۔ جامع بيان العلم وفضله، فصل في الإنصاف في العلم، 1/ 531، رقم: 865، ط: دار ابن الجوزي المملكة العربية السعودية

آپ کے اس قابل تعریف طرز عمل کو نواصب نے اسی طرح مورد طعن بنایا جس طرح بدخو بد فطرت شیعوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں کہا یہاں ایک بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اگر کسی ایک مسئلہ میں امام سے زیادہ کسی کو معلومات ہو یا اس مسئلہ کے نکات کا غیر امام کو علم ہو اور امام کی معلومات اور ذہن وہاں تک نہ پہنچا ہو تو یہ بات خلافت و امامت کے لیے عقد کو ناقص نہیں بناتی اور ان کے لیاقت میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام نبی ہونے کے ساتھ حکم الہی "إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ"[1] خلیفہ وقت بھی تھے مگر کسی دوسرے کا کھیت چر جانے والی بکریوں کا جو مقدمہ آپ کے سامنے آیا اس کے حکم کے سمجھنے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذہن تیز نکلا اور وہ معاملہ کو سمجھ گئے حالانکہ وہ اس وقت نہ نبی تھے نہ خلیفہ و امام بلکہ نو عمر ہی تھے اس کے باوجود معاملہ فہمی میں حضرت داؤد علیہ السلام سے سبقت لے گئے ابن بابویہ قمی نے من لا یحضرہ الفقیہ میں روایت احمد بن عمر حلبی لکھا ہے کہ:

> قال: سألت أبا الحسن عليه السلام عن قول الله عز وجل: وداود وسليمان إذ يحكمان في الحرث قال: كان حكم داود عليه السلام رقاب الغنم، والذي فهم الله عز وجل سليمان عليه السلام أن حكم لصاحب الحرث باللبن والصوف[2]
>
> میں نے ابی الحسن علیہ السلام سے اللہ کے فرمان وداؤد وسلیمان کے بارے میں پوچھا تو آپ نے کہا کہ داؤد علیہ السلام نے بکریاں دلانے کا فیصلہ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے سلیمان کو معاملہ سمجھا دیا کہ کھیت والے کا حق دودھ اور اون میں ہے۔

لہٰذا اگر ایک مسئلہ اللہ تعالیٰ کسی نادان عورت کو سمجھا دیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہ سمجھائیں تو ان کے خلافت و امامت میں اس سے کیا نقصان لازم آتا ہے وہاں حضرت داؤد علیہ السلام کی نبوت میں بھی تو اس واقعہ سے کوئی ناقص واقع نہیں ہوا اور ظاہر ہے خلافت و امامت تو نبوت کی نیابت ہے اور دنیا میں وہ کون ایسا ہے جس کو

1۔ سورة ص ، الاية : 26

2۔ من لا يحضره الفقيه، باب الحكم في نفش الغنم في الحرث، 3/101، رقم : 3415 ط: الحوزة العلمية قم المقدسة

کے بارے میں یہ تجربہ نہ ہوا ہو گے بعض اوقات بدیہی اور سامنے کی بات تک بھی ذہن نہیں پہنچتا اور عقل وفا نہیں اس سے کم تر لوگ فورا بعد کی تہہ کو پہنچ گئے اور انہوں نے اس نتیجہ پر اسے تنبیہ کیا مگر بغض و عناد نے جس کے دل پر قبضہ کر رکھا ہو اس کا کیا علاج ہے!

طعن نمبر 8: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خمس میں سے اہل بیت کا حصہ نہیں دیا

یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خمس میں سے اہل بیت کا حصہ ان کو نہیں دیا[1] اور یوں قرآن کے حکم کے خلاف کیا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ "[2] معلوم رہے کہ مال غنیمت میں سے جو کچھ تم پاؤ اس میں سے پانچواں حصہ اللہ اس کے رسول کے قرابت دار اور یتیموں مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

جواب: اس اعتراض کا یہ ہے کہ امامیہ مذہب کی رو سے یہ اعتراض صحیح نہیں اس لیے کہ ان کے نزدیک یہ آیت مصارف خمس کے بارے میں ہے استحقاق کے بارے میں نہیں ہے لہذا اگر امام وقت کی صواب دید کا تقاضا یہ ہو کہ ان بیان کردہ چار مصارف میں سے کسی ایک کے لیے وہ مخصوص کر دے تو اس کے لیے یہ جائز اور درست ہے امامیہ کی ایک جماعت کثیر کا یہی مذہب ہے چنانچہ ابو القاسم مصنف شرائع الاحکام نے جس کو امامیہ محقق کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور دوسرے علماء نے اس کی تشریح کی ہے اور اس کے ثبوت میں اپنے ائمہ سے روایات بیان کی ہیں لہذا اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دو سال اس خیال سے ان کو خمس نہ دیں کہ ان کو ضرورت نہ رہی ہو یا ان کے مقابلے میں دوسرے فرقے زیادہ حاجت مند ہوں تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے اور آیت کا مفہوم بھی یہی ہے کہ خمس ان چار طبقوں ہی کو دیا جائے ان سے باہر کسی کو نہ دیا جائے اور پھر ان میں سے خواہ ہر ایک کو دیا جائے خواہ ایک دو کو اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آیت زکوۃ "إِنَّمَا

1۔ من المطاعن التي ألفها الحلي في نهج الحق: ص 279.

2۔ سورة الانفال ، الاية : 41

الصَّدَقَاتُ...... الخ "(1) میں بھی مصارف زکوۃ کا ہی بیان مقصود ہے اور صحیح مذہب بھی یہی ہے اسی لیے اگر کوئی ان آٹھ طبقوں میں سے کسی ایک ہی طبقہ کو زکوۃ دے تو جائز ہے یہی حکم یہاں بھی ہے اور خود جناب علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں ذوی القربی کا حصہ خود نہیں لیا بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طریقہ کے مطابق بنی ہاشم کے فقراء اور مساکین کو دے دیا کرتے ان سے جو کچھ بچ رہتا وہ دوسرے مسلمان فقراء و مساکین میں بانٹ دیتے طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے بحوالہ محمد بن اسحاق روایت بیان کی ہے کہ:

أنه قال: سألت أبا جعفر محمد [بن علي] بن الحسين [بن علي بن أبي طالب]: إن أمير المؤمنين على بن أبي طالب لما ولى أمر الناس كيف كان يصنع في سهم ذوي القربى؟ فقال: سلك به والله مسلك أبي بكر وعمروزاد الطحاوي: قلت: وكيف؟ وأنتم تقولون ما تقولون؟ قال: إنه أوالله أما كان أهله يصدرون إلا عن رأيه.(2)

میں نے جناب ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو آپ نے ذوی القربی کے حصہ کے متعلق کیا طریقہ اختیار فرمایا تو آپ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم وہ اسی مسلک پر عمل پیرا رہے جو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا تھا، طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ٹکڑا مزید بیان کیا میں نے کہا اب آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے تو فرمایا خدا کی قسم آپ کے اہل آپ کی رائے کے خلاف نہیں چل رہے۔

اور تقسیم خمس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طریقہ عمل یہ تھا کہ اول اہل بیت کے نادار و مساکین کو عنایت فرماتے پھر جو بچ رہتا اسے بیت المال میں داخل کر کے بیت المال کے مصارف میں لگاتے رہتے اسی لیے اہل

1۔ سورة التوبة، الاية: 60

2۔ شرح معاني الآثار: 3/ 234؛ البيهقي، السنن الكبرى: 6/ 343.

پیے کو حضرت عمر ؓ کے خمس دینے کی روایات تعداد میں زیادہ بھی ہیں اور مشہور و متواتر بھی بہت ہیں ابو داؤد نے عبدالرحمن بن ابی لیلی سے بحوالہ حضرت علی ؓ یوں روایت کی ہے کہ:

"ان ابا بكر وعمر قسما سهم ذوي القربي"[1]

حضرت ابو بکر و عمر ؓ دونوں نے ذوی القربی کا حصہ ان کو تقسیم کیا۔

نیز ابوداؤد نے حضرت جبیر بن مطعم ؓ سے یہ بھی روایت کی ہے:

ان عمر كان يعطي ذوي القربي من خمسهم[2]

حضرت عمر ؓ ذی القربی کو خمس دیا کرتے تھے یہ حدیث صحیح ہے۔

اور حافظ عبدالعظیم منذری نے اس کی صحت کی تصریح کی ہے روایات کی روشنی میں اس مسئلہ کی تحقیق یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر ؓ دونوں خمس سے رسول اللہ ﷺ کے قرابت داروں کا حصہ نکالا کرتے تھے اور اس کو ان کے نادار اور مسکینوں میں تقسیم فرماتے تھے اس کے علاوہ بھی ان کے دیگر ضروریات اسی سے حل اور پوری فرمایا کرتے تھے اس کو میراث کے طور پر ہر غنی و فقیر محتاج وغیرہ محتاج کو نہیں دیتے تھے خود حضور اکرم ﷺ کا طرز تقسیم بھی یہی تھا اور احناف نیز امامیہ کی ایک بڑی جماعت کا اب بھی یہی مذہب و مسلک ہے جیسا کہ احکام الشرائع کے حوالہ سے اوپر مذکور ہوا ہدایہ میں بیان کیا گیا ہے:

وأما الخمس فيقسم على ثلاثة أسهم سهم لليتامى وسهم للمساكين وسهم لابن السبيل يدخل فقراء ذوي القربى فيهم ويقدمون ولا يدفع إلى أغنيائهم "
وقال الشافعي رحمه الله لهم خمس الخمس يستوي فيه غنيهم وفقيرهم ويقسم بينهم للذكر مثل حظ الأنثيين ويكون لبني هاشم وبني المطلب دون

1۔ شرح معاني الآثار: 3/ 293، عالم الكتب

2۔ لم اجد هذه الرواية

غيرهم لقوله تعالى: {وَلِذِي الْقُرْبَىٰ} من غير فصل بين الغني والفقير[1]

خمس تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک یتیموں کے لیے ایک مساکین کے لیے اور ایک مسافروں کے لیے جن میں فقراء ذوی القربی داخل ہیں اور مقدم ان کے غنی اور مالداروں کو نہیں دیا جاتا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس خمس کا ایک خمس نکالا جائے گا اور اس میں غریب اور مالدار سب برابر ہوں گے اس میں سے عورت کو اکہرا حصہ ملے گا مرد کو اس کا دگنا یہ تقسیم محدود ہوگی بنی ہاشم اور مطلب میں غیروں کو اس میں سے نہیں دیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قول ذوی القربی میں فقیر و غنی کی کوئی تمیز نہیں۔

اب سوچنے اور شرمانے کی بات یہ ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے موافق تھا اور بعد میں وہ معصوم کے فعل کے مطابق بھی ثابت ہوا اور امامیہ کی ایک بڑی جماعت کا مذہب بھی یہی قرار پایا تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر طعن کا کیا جواب اور کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔

رہی بات شافعی مسلک کے خلاف ہونے کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد تو تھے نہیں کہ اس بہانے ان کو ہدف طعن بنایا جائے اور پھر جب احناف و امامیہ آپ رضی اللہ عنہ کے طرز عمل کے مؤید ہیں تو شافعیہ کی مخالفت سے کیا ڈرنا اب غور طلب یہ مسئلہ رہ گیا کہ جب دینے اور نہ دینے کی دونوں روایات صحیح ہیں تو ہر دو قسم روایات میں تطبیق کی صورت کیا ہو تو ان میں تطبیق کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

1۔ چونکہ محتاجوں کو دیتے تھے اغنیا کو نہیں دیتے تھے جن کو ملا انہوں نے کہا دیتے ہیں جن کو نہ ملا وہ کہتے ہیں نہیں دیتے تھے۔

2۔ نفی و اثبات دینے کی وجوہ اور طریقہ سے متعلق ہے جس نے دینے کے متعلق کہا اس نے یہ مطلب لیا کہ مصرف کے مطابق دیا اور جس نے نہ دینے کے متعلق کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ وراثت کے طور پر نہیں دیا۔

1۔ الهداية في شرح بداية المبتدي ،كتاب السير ، باب الغنائم وقسمتها، فصل في كيفية القسمة، 2/ 390، ط: دار احياء التراث العربي بيروت لبنان

اس صورت میں ہر دو قسم کی روایات اپنی اپنی جگہ سے ہی درست ہیں اور اس تطبیق کی دلیل یہ ہے کہ مفصل روایات میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خمس میں سے قرابت داروں کا حصہ نکال کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے نام بنام خانہ بخانہ تقسیم نہیں کرتے تھے بلکہ یک مشت حضرت علی حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے سپرد فرماتے اور یہ ہدایت دیتے کہ اس میں سے فقراء کو دیں بیواؤں کا نکاح کرائیں کنواروں کی شادی کرائیں جن کے پاس خادم نہ ہوں ان کے لیے لونڈی، غلام خرید دیں بے گھروں کے گھر بنوا دیں شکستہ گھر والوں کے گھروں کی مرمت کرا دیں بے سواری والوں کو سواری دلوا دیں چنانچہ آپ کی خلافت کے آخر تک یہی معمول رہا آپ کی حیات مبارک کا آخری سال تھا تو بدستور سابق دونوں حضرات کو بلوا کر فرمایا کہ خمس میں سے ذوی القربی کا حصہ لے لیں جس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امسال بنی ہاشم میں کوئی محتاج و حاجت مند باقی نہیں رہا البتہ عام مسلمانوں میں فقراء کی تعداد بڑھ گئی ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ امسال یہ حصہ بھی ان مسلمانوں ناداروں میں تقسیم فرما دیں اس وجہ سے آپ کی خلافت کے آخری سال یہ حصہ ذوی القربی میں تقسیم نہیں ہوا اگرچہ اس مجلس سے اٹھنے کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ٹوکا کہ تم نے ایک غلطی کی تم کو وہ مال حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اپنے قبضہ میں لے کر فقراء مسلمین میں اپنے ہاتھ سے تقسیم کرنا چاہیے تھا ہو سکتا ہے بعد کے خلفاء تمہارے اس فعل کو صنعت بنا لیں اور یہ کہہ کر تم کو اس کے دینے سے انکار کر دیں کہ تم تو خود ہی اس کو موقوف کر چکے اور لینے سے انکار کر چکے ہو۔

اب ہر سہ مذاہب (حنفی شافعی امامی) کی روشنی میں مسئلہ خمس کی تفصیلی حیثیت ملاحظہ فرمائیے:

شیعہ کے نزدیک خمس کا حکم

شیعوں کے نزدیک جو شخص امام ہو وہ آدھا خمس خود لے لے اور آدھا یتیموں مسکینوں اور مسافروں کو بقدر حاجت و ضرورت بانٹ دے ان کے نزدیک سات چیزوں میں خمس واجب ہوتا ہے:

1۔ وہ مال غنیمت جو حربی کافروں سے ہاتھ لگے خواہ کتنا ہی ہو۔

2۔ کوئی کان ہو مثلاً فیروزہ، تانبہ، سونا، چاندی، گل ارمنی یا کسی بھی قسم کی ہو البتہ اس کے ضروری اخراجات مثلاً کھدائی صفائی وغیرہ کر کے باقی ماندہ کی قیمت بیس مثقال شرعی سونے جتنی ہو۔

3۔ دریا و سمندر سے غوطہ زنی سے جو کچھ حاصل ہو۔

4۔ حلال و حرام مال جو آپس میں رل مل جائیں۔

5۔ وہ زمین جو ذمی نے مسلمان سے خریدی ہو۔

6۔ جو دفینہ زمین سے نکلے اور۔

7۔ وہ نفع و فائدہ جو تجارت زراعت حرفت یا ان جیسے کسی پیشہ سے حاصل ہو۔[1]

جب یہ فائدہ اس شخص کے کل سالانہ اخراجات سے بڑھ جائے تو اس کا خمس دیا جائے۔

حنفیہ کے نزدیک خمس کا حکم

حنفیہ کے نزدیک پورے خمس کے تین حصے کیے جائیں گے ان میں سے دو حصے یتیموں مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم کیے جائیں گے البتہ یہ لحاظ رکھا جائے کہ پہلے ہاشمی یتیموں مسکینوں اور مسافروں کو دیے جائے ان سے بچ جائے تو پھر عام مسلمانوں کے یتیموں مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم ہو اور احناف کے نزدیک خمس تین چیزوں میں واجب ہوتا ہے:

1۔ مال غنیمت۔

2۔ کانِ منقطع (وہ کان جس سے نقش و نگار ارائش و زیبائش وغیرہ کی اشیاء نکلتی ہوں) جیسے سونا، چاندی، تانبا، رانگ، پارہ وغیرہ۔

3۔ زمین سے نکلنے والا دفینہ خزانہ۔[2]

شوافع کے نزدیک خمس کا حکم

اور شوافع کے نزدیک خمس کے پانچ حصے کیے جائیں ایک حصہ بنام رسول خلیفہ وقت کو دیا جائے دوسرا بنی ہاشم و بنی مطلب کے امیر و غریب میں بطریق میراث کے مرد کو دو حصے اور عورت کو ایک حصہ برابر تقسیم کیا

1۔ إصباح الشيعة للكيدري: ص 127؛ اللمعة الدمشقية للعاملي: 2/ 79.

2۔ ينظر السرخسي، المبسوط: 10/ 8؛ فتح القدير: 5/ 504.

جائے (یعنی امیر الغریب میں کوئی فرق نہ کیا جائے) باقی ماندہ تین حصے عام مسلمانوں کے یتیموں مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم کیے جائیں ان کے نزدیک خمس دو چیزوں میں واجب ہوتا ہے:

1۔مال غنیمت 2۔زمین سے بر آمد ہونے والا خزانہ۔(1)

اب اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تقسیم کو ان ہر سہ مذاہب مابعد پر جانچیں تو بظاہر حنفیہ اور اکثر امامیہ کے مذاہب سے بہت ملتی جلتی صورت نظر آئے گی کہ یک مشت حضرت عباس و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے سپرد کرتے بنی ہاشم کے ہر شخص کو تقسیم نہیں کرتے تھے۔

طعن نمبر 9: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دین میں بدعات جاری کیں

یہ ہے کہ دین میں آپ نے ایسی نئی باتیں نکالیں جن کا پہلے وجود نہ تھا مثلاً باجماعت تراویح کہ جو خود ان کے اعتراف سے بدعت ہے اور متفق حدیث یہ ہے کہ "من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد عليه"(2) جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے اور ہر نئی نکالی ہوئی بات گمراہی ہے۔

(ان مسکینوں کا وہ حال ہے کہ آنکھیں بند کر کے منہ کھول دیا اب انہیں پتہ نہیں کہ ہم غلط سلط کیا کہہ رہے ہیں کس کو کہہ رہے ہیں بات میں وزن بھی ہے یا نہیں یہی کیفیت اس طعن میں ہے اگر آنکھیں کھول کر انہوں نے اپنی ہی کتابیں پڑھی ہوتی تو معلوم ہو جاتا کہ) اس طعن سے اہل سنت کو الزام نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ خود انہی کی کتب حدیث سے بطریق شہرت و تواتر یہ ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک میں تین رات تراویح باجماعت ادا فرمائی دیگر نوافل کی طرح ان کو تنہا ادا نہیں فرمایا اور ترک جماعت پر بطور عذر یہ فرمایا" إني خشيت أن تفرض عليكم "(3) مداومت کی وجہ سے مجھے یہ اندیشہ ہے کہ یہ تم پر فرض نہ کر

1۔ روضة الطالبين للنووي: 2/ 322؛ مغني المحتاج للشربيني: 3/ 94

2۔ صحيح البخاري، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود، 3/ 184، رقم: 2697

3۔ مسند الامام احمد بن حنبل، 42/ 279، رقم: 25446، ط: مؤسسة الرسالة

دی جائے اور جب حضور ﷺ کے وصال کے بعد فرضیت کا خدشہ نہ رہا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی سنت ثابتہ کا اجراو احیا فرمادیا سنیوں اور شیعوں دونوں کے ہاں یہ اصولی قاعدہ مقرر و موجود ہے کہ جو حکم نص شارع کے مطابق کسی عذر و علت اور سبب سے مقید ہو تو جب وہ عذر و علت باقی نہ رہے تو وہ حکم بھی ختم ہو جاتا ہے اور ان کا یہ کہنا کہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو بدعت کہا تو گویا بدعت کا اعتراف کر لیا۔

تو دراصل یہ بھی ان کی سمجھ کا پھیر اور عناد کا مظہر ہے کیونکہ آپ نے یہ فرمایا تھا "نعمت البدعة هذه"[1] کیا ہی اچھی نئی بات ہے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ باجماعت ادائیگی پر ہیشگی نئی بات ہے اور چونکہ حضور ﷺ کا منشا مبارک پہلے سے معلوم تھا کہ عذر نہ ہوتا تو آپ ﷺ کے نزدیک اس پر مداومت پسندیدہ و مرغوب تھی اس لیے موان اور عذر اٹھ جانے پر حضور ﷺ کے پسند فرمودہ طریقہ کا اجرا آپ کے ذریعہ ہو رہا ہے تو آپ رضی اللہ عنہ کے لحاظ سے تو نئی بات ہے مگر منشا نبوت کے مطابق ہونے کی وجہ سے یہ نئی بات اچھی ہے اسے برا اور گمراہی کی بات کہنے کی کون مسلمان جرات کر سکتا ہے یہ حفظ مراتب کی بات ہے اسے معاند و حاسد اور بدگو کب سمجھ سکتا ہے یہی ایک بات نہیں اور بھی بہت سی ایسی باتیں ہیں جو جناب رسول رحمت ﷺ کے عہد مبارک میں نہ تھی مگر خلفاء وائمہ کے وقت میں اجماع امت سے ان کو وجود ملا ان کو بدعت نہیں کہیں گے۔

اور اگر کسی کو بدعت کا لفظ بہت ہی محبوب ہو تو اسے اجازت ہے کہ حسنہ کے لاحقہ کے ساتھ اسے بدعت حسنہ کہہ لے مگر بدعت سیاہ کہنے کا اصول شرع کی روشنی میں اسے ناحق ہے نہ اس کے پاس جواز اس لیے کہ حدیث (نئی بات) اس چیز کے ساتھ مخصوص ہے جس کی نہ کہ شریعت میں کوئی اصل و بنیاد ہو نہ خلفاء وائمہ اور اجماع امت سے اس کا ثبوت ملتا ہو اور اگر اس بات کو یہ شیعہ نہ مانے تو ان کی عید غدیر، جشن و تعظیم نوروز، قتل عمر کے دن نماز شکرانہ، لونڈیوں کی شرمگاہوں کی حلت، بعض اولاد کو ترکہ سے محروم کرنے کا فعل وغیرہ کیا بنے گا یہ صورت و حقیقت دونوں لحاظ سے بدعت سیئہ ہیں کیونکہ حضور ﷺ کے عہد مبارک میں تو کسی ذہن میں ان کا تصور تک بھی نہ تھا ان کا گمان فاسد ہے کہ یہ تمام امور ائمہ نے نکالے اور اختراع کیے ہیں اگر یہ

1۔ موطا الامام مالك، باب ما جاء في قيام رمضان، 1/ 114، ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت لبنان

بات ہے تو اہل سنت کے نزدیک خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم بھی ائمہ کا درجہ اور حکم رکھتے ہیں (اور ان کا یہ دعویٰ تمہارے دعووں کی طرح بے اصل و بے دلیل نہیں بلکہ) اس پر ایک مشہور حدیث کی دلالت بھی موجود ہے:

ومن يعش منكم بعدي فسيرى اختلافا كثيرا، فعليك بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين من بعدي، عضوا عليها بالنواجذ[1]

تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا اسے بہت اختلاف نظر آئیں گے اس وقت تم پر میری سنت اور میرے بعد کے خلفائے راشدین کی سنت پر عمل لازم ہے اس کو دانت گڑ کر پکڑلو۔

لہذا معلوم ہو گیا کہ خلفائے راشدین کی نکالی ہوئی بات بدعت کہہ کر رد کرنے کی چیز نہیں بلکہ حضور ﷺ کی سنت کی مانند مضبوطی سے تھامنے والی لائق عمل سنت ہے۔

طعن نمبر10: دادا کی میراث میں سو فیصلے نافذ کئے

شیعہ اپنی کتابوں میں لے گئے ہیں کہ " ان عمر قضى في الجد مائة قضية"[2] عمر نے دادا کی میراث کے بارے میں سو فیصلے نافذ کیے۔

لطیفہ ملاحظہ ہو کہ یہی عبارت نواصب نے جناب علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھی ہے اب پتہ نہیں اس جھوٹ گھڑنے میں پہل کس نے کی اور سرنامہ اپنے من پسند نام ٹانگ دیئے ممکن ہے جس استاد کے دونوں شاگرد ہیں اسی نے گھر کر ہر ایک کے حوالہ کر دی ہو البتہ اہل سنت کے ہاں یہ روایت قطعی موجود نہیں اس لیے انہیں اس کی طرف نہ توجہ کی ضرورت ہے نہ جواب کی فکر! امامیہ چونکہ روایات میں اختلاف اور ردو بدل کے عادی مشہور ہیں اس لیے اس کی جھلک یہاں بھی موجود ہے کسی نے یہ روایت ج (جد) سے کی ہے اور کسی نے ح (حد) سے اور بعض روایات میں حد الخمر کے الفاظ ہیں (بہر حال یہ ان کا معاملہ ہے اگر یہ خدا کو جدا کر دیں تو آپ کیا کریں گے)

1۔ المستدرك على الصحيحين، 1/ 96، ط: دار المعرفة بيروت لبنان

2۔ كشف المراد في شرح تجريد الاعتقاد، ص، 513، ط: مؤسسة النشر الاسلامي قم المشرفة

قاعدہ کے مطابق تو اس اعتراض کے جواب دینے کے ہم پابند نہیں تا ہم اپنے ان مہربانوں کی خاطر فرضی طور پر اسے مان لیں تو حد خمر والی روایت پر تو ہمیں اعتراض کی کوئی بات نظر نہیں آتی اس لیے کہ اس وقت تک کتاب و سنت میں اس کی کوئی حد مقرر نہ تھی اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق مختلف خیالات و تجاویز ہوتی تھیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی کسی اخری نتیجہ پر پہنچنے کے لیے ہر ایک کی رائے اور خیال جانچتے اور پرکھتے رہتے ہوں گے اور جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مجلس میں حضرت علی مرتضی و جناب عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما کی رائے باثواب پر اجماع منعقد ہو گی تو اختلاف قضیہ کا سوال ہی نہ رہا۔

اور اگر یہ جیم سے جد ہے تو یہ ان کا کھلا جھوٹ ہے اس لیے کہ جد کی میراث کے بارے میں تو اختلاف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے عہد میں بھی تھا اس بارے میں صحابہ کرام مختلف الخیال تھے بالآخر معاملہ دو اقوال پر ٹھہرا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول تھا کہ اسے باپ کی جگہ تصور کریں اور دوسرا قول حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو کہا کہ اس کو بھی ایک بھائی سمجھ کر شریک میراث کریں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان دونوں اقوال کی ترجیح میں متردد تھے اپ کا رجحان قول صدیق رضی اللہ عنہ کی ترجیح کی جانب تھا اس سلسلہ میں آپ بارہا حضرت ابی بن کعب اور حضرت زید بن ثابت نیز دوسرے کی بار صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھروں پر گئے دونوں جانب گفت و شنید ہوئی بحث مباحثہ ہوا دلیلیں دی گئیں اور یہ بات کسی طرح بھی عیب شمار نہیں کی جا سکتی یہ تو مفاد ملت کے لیے مسئلہ کی تعیین کا قابل تعریف عمل تھا ایسی صورت میں سینکڑوں دلیلیں دی جاتی ہیں ہر دلیل کا مدعا اور قضیہ جدا ہوتا ہے اس پر طعن کرنا انتہائی نادانی اور کور ذوقی کے سوا کچھ نہیں اس بحث مباحثہ کے نتیجہ میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قول آپ کے نزدیک قابل ترجیح قرار پایا سورۃ مسئلہ کی تشریح و تفہیم کے لیے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ آپ کو اپنے گھر لے گئے وہاں آپ نے ایک نہر کھودی اس میں سے شاخ ہیں شاخوں میں سے نالیاں نکالی اور اس نہر میں اسی انداز سے پانی چھوڑ کر کے تمام شاخوں اور نالیوں میں پہنچنے لگا پھر ایک ذیلی نالہ کا منہ بند کر دیا تو اس کا پانی پلٹ کر بیچ کی نالی میں آگیا اور اس کی مساوی سطح والی نیز اس سے نیچے والی نالیوں میں بہنے لگا مگر اوپر والی نالی میں نہیں چڑھا اس تصویر و تمثیل سے یہ ثابت ہو گیا کہ دادا سے بیٹے کو اور بیٹے سے بیٹوں کو جو کچھ پہنچا وہ اس سلسلہ کے رک جانے سے دوبارہ سارے کا سارا تنہا دادا کو واپس نہیں پہنچے گا دادا کی

قرابت اپنی جگہ پر ایک الگ قرابت ہے اور بھائیوں کی قرابت الگ ایک دوسرے کے قرابت باہم کسی دوسرے کی قرابت کو باطل نہیں کرتی اس تمثیل سے جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قول کی ترجیح پر مطمئن ہو گئے۔

طعن نمبر 11: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے متعہ اور حج تمتع سے منع کیا

آپ نے عورتوں سے متعہ کرنے اور حج تمتع کرنے سے منع کیا حالانکہ یہ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں جاری تھے اس طرح آپ نے گویا خدا کے حکم کو منسوخ اور اللہ کی حلال کردہ چیز کو حرام قرار دیا اور کتب اہل سنت میں آپ کا یہ اعتراف بایں الفاظ موجود ہے "متعتان كانتا على عهد رسول الله ﷺ وانا أنهى عنهما"[1] دو طرح کے جو متعے عہد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معراج تھے میں ان دونوں سے منع کرتا ہوں۔

جواب: اہل سنت کے نزدیک حدیث کی صحیح ترک کتاب مسلم میں روایت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سبرہ بن معبد جہنی نیز دیگر صحابہ میں روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یوں مروی ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کو حرام قرار دے دیا تھا صرف تین یوم کے لیے اجازت دی تھی پھر یہ حرمت تا قیام قیامت قرار دے دی گئی تین دن کی اجازت بھی جنگ اوطاس[2] کے موقع پر دی گئی تھی،[3] پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی متعہ کے حرام ہونے والی روایت تو اتنی متواتر و مشہور ہوئی کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی تمام اولاد اور محمد بن الحنفیہ کی ساری اولاد اس روایت کو بیان کرتے چلے گئے اور موطا، بخاری و مسلم اور دوسری متداول اور مستعمل کتابوں میں بہت سی سندوں کے ساتھ یہ روایات منقول ہیں۔

1۔ الحديث أخرجه أحمد عن جابر قال: «متعتان يفعل على عهد النبي صلى الله عليه وسلم فنهانا عنهما عمر رضي الله عنه فانتهينا». المسند: 3/ 325، رقم 14519؛ الطحاوي، شرح معاني الآثار: 2/ 146.

2۔ قال ياقوت الحموي: «أوطاس: وادٍ في ديار هوزان فيه كانت وقعة حنين للنبي صلى الله عليه وسلم ببني هوزان». (معجم البلدان: 1/ 281) والغزوة في السنة الثامنة للهجرة.

3۔ حديث سلمة بن الأكوع: «رخص رسول الله صلى الله عليه وسلم المتعة يوم أوطاس ثلاثا ثم نهى عنها به». (صحيح مسلم، كتاب النكاح، باب نكاح المتعة، 2/ 1023، رقم: 1405، ط: دار إحياء التراث العربي بيروت)

شیعون نے ان روایات میں یہ شبہ ڈالا کہ یہ حرمت غزوہ خیبر کے وقت تھی پھر جنگ اوطاس کے وقت دوبارہ حلال کر دیا گیا مگر ان کی شرارت نہیں تو بے خبری پر ضرور محمول ہے ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کو دراصل غزوہ خیبر کو خانگی گدھوں کے گوشت کی حرمت کی تاریخ ٹھہرایا گیا ہے حرمت متعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں البتہ عبارت ایسی ہے جس سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ دونوں کی حرمت کی تاریخ خیبر ہی ہے اسی وہم کو بعض محققین نے نقل کرتے ہوئے کہہ دیا ہے "نهى عن متعة النساء يوم خيبر"[1]

لیکن اگر حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ اس روایت میں تحریم متعہ کو خیبر کی تاریخ سے متعین فرماتے تو آپ رضی اللہ عنہ کا ابن عباس رضی اللہ عنہما پر رد و الزام درست کیسے ہوتا حالانکہ جب آپ نے ان کو الزام دیا تو یہی روایت پیش کی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کو متعہ جائز سمجھنے پر ان الفاظ سے ڈانٹا جھڑکا" إنك رجل تائه"[2] تم ایک پاگل آدمی ہو، لہذا جو شخص تحریم متعہ کی تاریخ غزوہ خیبر بتاتا ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے غلط استدلال کا مدعی ہے اور یہی دعوی اس کی جہالت وحماقت پر گواہی کے لیے کافی ہے اہل سنت کی ایک جماعت نے جناب عبد اللہ اور حسن محمد ابن الحنفیہ رحمہما اللہ کے دونوں صاحبزادوں سے روایت کی ہے جو انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے بیان کی کہ آپ نے فرمایا:

أمرني رسول الله صلى الله عليه وسلم أن أنادي بتحريم المتعة[3]

مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کے حرام ہونے کی منادی کرنے کا حکم فرمایا۔

پس معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں ایک یا دوبار متعہ حرام قرار پا گیا جس کو اس کی اطلاع ہو گئی وہ اس سے روک گیا اور جس کو خبر نہ ہو سکی وہ نہ رو کا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عہد آیا اور یہ معلوم ہوا کہ بعض جگہ یہ فعل ضرورت کی حد سے نکل کر رواج اور فیشن کی صورت اختیار کر گیا ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس کی حرمت بیان

1۔ موطا الامام مالك ، نكاح المتعة،3/ 778، رقم :1993، ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت ـ لبنان

2۔ مستخرج أبي عوانة، باب بيان الرد على ابن عباس في إباحة نكاح المتعة، 3/ 28، رقم : 4079، ط: دار المعرفة بيروت

3۔ حاشية إعانة الطالبين ، للدیار البكري، 3/ 322، ط: دار الفكر للطباعة والنشر و التوزيع

زبانی اور احکامات ریاست کی طرح اس کو شہرت دی، اور لوگوں کو ڈرایا دھمکایا یہاں تک کہ بالآخر اس کی حرمت ہر خاص و عام کے علم میں بھی آگئی اور ذہن نشین بھی ہو گئی کہ واقعی حضور ﷺ اس کی حرمت بیان فرما چکے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کلام سے یہی تو معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کے عہد مبارک میں یہ عمل ہوا اس سے یہ لازم تو نہیں آتا کہ وہ حلال ہونے کی شکل میں رائج بھی ہوا یا اس کے حلال ہونے کا حکم باقی بھی ہو پھر اگر احادیث و روایات سے قطع نظر بھی کر لی جائے تو قرآنی آیات سے صراحتاً اس کی حرمت کا پتہ چلتا ہے ان آیات میں شیعی تاویلات سے اگر کام لیا جائے جیسا کہ سابق اوراق ہمیں بیان کیا گیا ہے تو ان سے آیات کی تحریف لازم آتی ہے متعہ والی عورت کو یہ بیوی کیسے ثابت کر سکتے اور یہ درجہ اس کو کیسے دے سکتے ہیں جبکہ بیوی کے احکام مثلاً عدت طلاق، ایلاء و ظہار، اس سے صحبت سے درجہ حصان کا حصول، امکان لعان اور وراثت خود شیعوں کے نزدیک بھی اس پر لاگو اور منطبق نہیں ہوتے اور یہ ایک عام و ظاہر قاعدہ ہے کہ جب خبر پائی جاتی ہے تو وہ اپنے تمام لوازم کے ساتھ پائی جاتی ہے اور ابو بصیر نے اپنی صحیح میں جناب ابی عبد اللہ صادق علیہ السلام سے یوں روایت کی ہے کہ:

قال: سئل أبو عبد الله (عليه السلام) عن المتعة أهي من الأربع؟ فقال: لا، ولا من السبعين.(1)

آپ سے متعہ کے متعلق پوچھا کہ کیا وہ چار میں داخل ہے آپ نے فرمایا نہیں نہ چار میں نہ ستر میں۔

اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ممتوعہ بیوی شمار نہیں ہوتی ورنہ چار میں ضرور شامل ہوتی اور قرآن مجید میں جہاں کہیں عورتوں سے نفع اٹھانے کو جائز و حلال قرار دیا ہے وہیں احصان اور سفاح کی قید لگائی گئی ہے چنانچہ ارشاد ہے:

أُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ.(2)

اور ان عورتوں کے علاوہ دوسری عورتیں بھی تمہارے لیے حلال کی گئی ہیں اگر مال کے بدلے تم

1۔ الفروع من الكافي، باب انهن بمنزلة الإماء وليست من الأربع، 5/ 451، ط: دار الكتب الاسلامية

2۔ سورة النساء، الاية: 24

ان کو حاصل کرنا چاہو تو بیوی بناؤ مستی نکالنے کے لیے نہ اپناؤ۔

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ.[1]

(آج تمہارے لیے حلال کی گئیں) مسلمان پاک دامن عورتیں بھی اور ان قوموں کی پارسا عورتیں بھی جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی جب کہ تم ان کو ان کا معاوضہ یعنی مہر دے دو اور مقصد بھی بیوی بنانا ہو نہ کہ شہوت رانی۔

اور ظاہر ہے ممتوعہ میں احصان بیوی پان نہیں ہے اور خود شیعہ بھی اس کو احصان کا سبب نہیں سمجھتے نہ غیر شادی شدہ مت کرنے والے پر حد رجم لگاتے ہیں دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ متعہ کرنے والا مسافح (صرف مستی نکالنے والا) ہے کہ اس کی غرض ماء دافق (اچھلتا ہوا پانی نکالنا) اور اس پانی کے مقامات کو خالی کرنا ہے نہ اس سے مقصد گھر بسانا ہوتا ہے نہ حصول اولاد اور عزت وناموس کی حفاظت وغیرہ اہل سنت کے مقابلے میں حجت ودلیل کے طور پر شیعوں کے پاس لے دے کر صرف یہ آیت نازل ہے:

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً.[2]

پھر جس طرح تم ان سے متنفع ہوئے ہو تو ان کا جو مہر مقرر ہوا ہے وہ ادا کرو۔

اور اس کی بابت ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ متعہ کے حلال ہونے پر ہرگز دلالت نہیں کرتی اور استمتاع سے مراد فعل زوجیت ہے جس پر لفظ فا دلالت کرتی ہے اور ایک کلام کے دوسرے کلام کے بعد آنے یا اس کے کلام ثابت پر موقوف ہونے کو بتاتی ہے اور اس سے پہلے کی آیت میں نکاح اور مہر کا ذکر ہے اور یہ لوگ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کر کے یہ بات کہتے ہیں کہ یہ حضرات اس آیت کو " فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ الي اجل مسمي "پڑھتے تھے جس سے صاف متعہ کا پتہ چلتا ہے

1۔ سورۃ النساء، الآیۃ:5

2۔ سورۃ النساء، الآیۃ:24

ہیں کہ یہ قول قولہ کے ذیل میں آتا ہے اس لیے کہ ان کا منقول لفظ "إلى أجل مسمى" بالاتفاق قرآن میں موجود نہیں اور قرآن کے متواتر ہونے پر ہر دو فرقے شیعہ و سنی متفق ہیں تو یہ صحیح ہے تو اب ترجمہ دلیل میں یہ کیا پیش کرتے ہیں زیادہ سے زیادہ توجیہات یہ کہہ سکتے ہیں یہ ہو سکتی ہے کہ یہ روایت شاذہ منسوخہ ہے دیں اور منسوخ شدہ شاذ روایت کو جس کی صحیح سند مفقود ہو قرآن حکیم قطعی کے مقابلہ پر لاکھوں قرآنی نسخے قطعی ہونے کی وجہ سے ترک کرنا اور نظر انداز کرنا کس عقلی توجیہ کی بنا پر قابل توجہ ہے۔

اور پھر شیعہ و سنی دونوں میں یہ اصولی قاعدہ مقرر رہا یا شدہ ہے کہ علت حرمت کی دو دلیلیں جو قوت یقین میں مساوی ہوں باہم متضاد و متعارض ہوں تو حرمت کے حکم کو مقدم رکھنا چاہیے لیکن یہاں تو یہ دلیل متعارض نہیں بلکہ ایک صریح کذب اور جھوٹ ہے اس لیے کہ اس قرأت کو نہ تو اب تک کسی نے سنا ہے نہ عرب و عجم میں پھیلے ہوئے لاکھوں کروڑوں قرآنی نسخوں میں سے کسی میں یہ عبارت کبھی تھی تو پھر اباحت کو کیسے مقدم رکھ سکتے ہیں اور یہ لوگ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی نسبت سے جو یہ کہتے ہیں کہ آپ متعہ کو جائز سمجھتے تھے تو اے کاش یہ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما کے تمام مسائل پر کاربند ہوتے تو گمراہ نہ ہوتے اور صراط مستقیم پر تو چلتے ہوتے لیکن یہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما اس مسئلہ پر فرماتے کیا تھے متعہ خود جناب محترم رضی اللہ عنہ کی تشریح کے مطابق یوں ہے کہ آپ فرماتے تھے متعہ ابتداء عہد اسلام میں مضطر کیلئے تھا اور اب صرف مجبور کے لیے ایسا مباح ہے جس طرح کسی کے لیے خون خنزیر اور مردار عارضی بطریق خطابی حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے یوں روایت بیان کرتا ہے کہ:

قلت لابن عباس: هل تدري ما صنعت وبما أفتيت؟ سارت بفتياك الركبان، وقالت فيه الشعراء، قال: وما قالوا؟ قلت: قالوا:

قد قال لي الشيخ لما طال مجلسه ... يا صاح هل لك في فتيا ابن عباس هل لك في رخصة الأطراف آنسة ... تكون مثواك حتى يصدر الناس قال: إنا لله وإنا إليه راجعون، لا والله ما بهذا أفتيت، ولا هذا أردت، ولا أحللت منها

إلا ما أحل من الميتة والدم ولحم الخنزير.[1]

میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا سواروں نے آپ کا فتوی مشہور کر رکھا تھا اور اس پر اشعار بھی کہے ہیں آپ نے پوچھا وہ شعر کیا ہے میں نے کہا وہ کہتے ہیں کہ جب شیخ کی مجلس طویل ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ کیا آپ کو ابن عباس کے فتوے کے مطابق ایک نازک اندام، لطیف و نرم بدن اور خود سپرد عورت میں کوئی رغبت ہے جو لوگوں کی واپسی تک آپ کا ٹھکانہ ہو آپ نے فرمایا بہت خوب میں نے تو یہ فتوی نہیں دیا وہ متعہ مردار خون اور خنزیر کی طرح ہے۔

جامع ترمذی امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں روایت کی ہے:

قال: إنما كانت المتعة في أول الإسلام، كان الرجل يقدم البلدة ليس له بها معرفة فيتزوج المرأة بقدر ما يرى أنه يقيم فتحفظ له متاعه، وتصلح له شيئه، حتى إذا نزلت الآية: {إلا على أزواجهم أو ما ملكت أيمانهم}، قال ابن عباس: فكل فرج سوى هذين فهو حرام.[2]

آپ نے فرمایا ابتدائے عہد اسلام میں متعہ تھا کوئی شخص شہر و قصبہ میں اپنے کام سے آتا تھا وہاں کسی سے اس کی جان پہچان نہ ہوتی تو وہ کسی عورت سے اپنی مدت قیام کا یقین کر کے شادی کر لیتا تھا جو اس کے سامان کی حفاظت کرتی اور اس کی ہر چیز درست رکھتی تا آنکہ یہ آیت نازل ہوئی تب حضرت نے فرمایا صحبت کی ان دو صورتوں کے علاوہ ہر طریقہ حرام ہے۔

متعۃ الحج کی ممانعت کے الزام کا جواب

یہ تو عورتوں کے متعہ کا حال تھا اب رہا متعۃ الحج یعنی اشہر حج میں ایک ہی سفر میں یا ایک ہی احرام میں حج و عمرہ کرنا جو حج تمتع یا حج قران کی صورتیں ہیں اس سے آپ نے ہر گز منع نہیں فرمایا یہ آپ پر افترا و یا بہتان ہے

1۔ المعجم الكبير للطبراني، ومن مناقب عبدالله بن عباس واخباره، 10/ 259، رقم: 10601، ط: مكتبة ابن تيمية القاهرة

2۔ سنن الترمذي، باب ما جاء في تحريم نكاح المتعة، 2/ 421، رقم: 1122، ط: دار الغرب الإسلامي بيروت

البتہ آپ اس کو اولی سمجھتے تھے کہ آدمی آئے عمرہ کرے اور گھر لوٹ جائے پھر آئے اور حج کرے دوسرے معنوں میں حج کی تینوں قسموں میں سے آپ حج افراد کو اولی سمجھتے تھے اب بھی امام شافعی سفیان ثوری اور اسحاق بن راھویہ رحمہم اللہ کے نزدیک حج افراد ہی افضل ہے بعض اور فقہاء کا بھی یہی مذہب ہے اور اس افضلیت کی دلیل آیت: وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ۔۔۔الخ "[1] حج وعمرہ کو اللہ کے لیے پورا کرو، ہے اور اتمام کے معنی تفسیر آیت میں یوں مذکور ہیں "إتمامهما أن تحرم بهما من دويرة أهلك "[2] ان دونوں کے اتمام کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اہل بیوی بچے کی قیام گاہ سے دونوں کا احرام باندھے یعنی عمرہ کرکے گھر آئے پھر گھر سے احرام باندھ کر حج کو جائے پھر آگے ارشاد ہے "فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ "[3] پس اگر کوئی عمرہ کا فائدہ حج کے ساتھ اٹھائے تو اسے چاہیے کہ مطابق گنجائش ہدی واجب ساتھ لے جائے، ہدی یا قربانی متمتع پر فرض ہے جبکہ مفرد پر فرض نہیں اس سے معلوم ہوا کہ تمتع میں کوئی ایسی کمی ہے جسے پورا کرنے کے لیے حدی کو واجب قرار دیا اور تمام شرعی فرائض پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ حج میں حدیث قصور کی بنا پر ہی واجب ہوتی ہے ھدی کے ساتھ تمتع وقران بھی جائز ہے اور حدیث مبارک سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج افراد کو تمتع وقران دونوں سے زیادہ پسند فرمایا اس کی افضلیت کی واضح دلیل ہے اس لیے کہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر حج افراد ہی ادا فرمایا اور عمرۃ القضا اور عمرہ جعرانہ کے وقت صرف عمرہ ہی فرمایا حالانکہ عمرہ جعرانہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرصت بھی پائی مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج نہیں فرمایا اور مدینہ منورہ واپس تشریف لے گئے اور عقلا بھی حج وعمرہ دونوں کی افرادی ادائیگی ہی افضل معلوم ہوتی ہے کہ ہر ایک کے لیے احرام اور ادائیگی کے لیے جدا جدا سفر نیکیوں کے دوچند ہونے کا سبب ہوگا جیسے ہر نماز کے لیے تازہ وضو کا مستحب ہونا یا ہر نماز کے لیے جائے سکونت سے مسجد میں جانا۔

1۔ سورة البقرة، الاية:196

2۔ النكت والعيون المعروف تفسير الماوردي،1/ 254، ط: دار الكتب العلمية بيروت، لبنان

3۔ سورة البقرة، الاية:196

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہوں نے جس متعۃ الحج کو منع فرمایا اور اسے جاری نہ رکھا وہ متعۃ الحج دوسرے معنوں میں ہے یعنی حج کو فسخ کرکے عمرہ ادا کرنا اور بلا عذر عمرہ کے لیے حج کے احرام سے نکلنا اور اسی پر امت کا اجماع ہے کہ اس قسم کا متعۃ الحج بلا عذر حرام ہے ہاں حضور ﷺ نے اپنے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم سے مصلحتاً یہ فسخ کرایا تھا اور آپ ﷺ کا مقصد اس عمل سے جاہلیت کی ایک ناروا اور غلط رسم کو توڑنا تھا ایام جاہلیت میں وہ لوگ اشہر حج میں عمرہ کو بدترین گناہ سمجھتے تھے وہ کہتے تھے:

إذا برأ الدبر، وعفا الأثر، وانسلخ صفر، حلت العمرة لمن اعتمر.[1]

جب نشانات قدم مٹ جائیں سواری کی پیٹھ کے زخم اچھے ہو جائیں اور صفر کا مہینہ گزر جائے تو عمرہ کرنے والوں کے لیے عمرہ حلال ہو جاتا ہے۔

چونکہ یہ عمل مصلحتاً تھا اس لیے اسی وقت وزمانہ کے لیے مخصوص تھا دوسروں کے لیے یہ جائز نہیں کہ بلا عذر یہ فسخ کریں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نیز دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایت سے یہ تخصیص ثابت ہے چنانچہ مسلم رحمہ اللہ نے ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت یوں بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا "كانت المتعة في الحج لأصحاب محمد صلى الله عليه وسلم خاصة"[2] متعۃ الحج اصحاب محمد ﷺ کے لیے مخصوص تھا۔

اور نسائی نے حارث بن بلال رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ روایت کی ہے کہ:

قال: قلت: يا رسول الله، فسخ الحج لنا خاصة، أم للناس عامة؟ قال: «بل لنا خاصة»[3]

میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ یہ فسخ حج ہمارے لیے خاص ہے یا عام امت کے لیے بھی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ ہمارے لیے ہی مخصوص ہے۔

نووی رحمہ اللہ نے مسلم کی شرح میں لکھا ہے:

1۔ الجامع لأحكام القرآن المعروف تفسير القرطبي، 2/ 393، ط: دار الكتب المصرية القاهرة

2۔ الدر المنثور للسيوطي، 1/ 521، ط: دار الفكر بيروت

3۔ المعجم الكبير للطبرانى، 1/ 370، رقم: 1138، ط: مكتبة ابن تيمية القاهرة

قال المازري اختلف في المتعة التي نهى عنها عمر في الحج فقيل هي فسخ الحج إلى العمرة وقيل هي العمرة في أشهر الحج ثم الحج من عامه وعلى هذا إنما نهى عنها ترغيبا في الإفراد الذي هو أفضل لا أنه يعتقد بطلانها أو تحريمها وقال القاضي عياض ظاهر حديث جابر وعمران وأبي موسى أن المتعة التي اختلفوا فيها إنما هي فسخ الحج إلى العمرة قال ولهذا كان عمر رضي الله عنه يضرب الناس عليها ولا يضربهم على مجرد التمتع في أشهر الحج"[1]

مازری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس متعہ سے حج کے زمانہ میں روکا ہے اس میں اختلاف ہے بعض نے کہا ہے کہ وہ عمرہ کے لیے حج فسخ کرنے کی صورت ہے قاضی عیاض رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حضرت جابر، عمران بن حصین اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہم کی حدیث سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ متعہ جس میں اختلاف ہے وہ عمرہ کے لیے حج فسخ کرنا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایسا کرنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کی گوشمالی بھی کر دیتے تھے صرف تمتع پر نہیں مارتے تھے یعنی اشہر حج میں عمرہ کرنے پر۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا "وأنا أنهى عنهما" اس کا مطلب یہ ہے میں جو تمہارا والی وحاکم ہوں منع کرتا ہوں کہ تمہارے دلوں پر خاطر خواہ اثر ہو کیونکہ میں دینی معاملات میں جو سختی برتتا ہوں تم کو بخوبی اندازہ ہے اس لیے اس معاملہ میں تساہل نہ برتا رہا معاملہ اصل نہیں اور ممانعت کا سو قرآن مجید اور حدیث مبارک دونوں سے وہ پہلے ہی ثابت ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ"[2]

1۔ المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، 6/ 169، ط: دار إحياء التراث العربي بيروت

2۔ سورة المومنون، الآية:7

ان مذکورہ صورتوں کے علاوہ اگر کوئی اور صورت اختیار کرنا چاہیے پس وہ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں
یا" وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ۔۔۔الخ "(1) حج وعمرہ دونوں اللہ کے لیے پورے کرو مگر بعض لوگ اپنی لاپرواہی سے اور بعض دوسرے اپنی سرکشی اور فسق کی بنا پر قرآن وحدیث کا حکم کام ہی خاطر ملاتے ہیں ان کو حدود میں رکھنے اور سنی و کہی ہوئی بات پر کان دھرنے کے لیے صاحب اقتدار کا جبر اور سختی درکار ہوتا ہے اسی لیے یہ مقولہ مشہور ہوگیا ہے کہ بادشاہ قرآن کی نسبت زیادہ بندوبست کرتا ہے اور احکامات پر عمل کراتا ہے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا نہی کو اپنی طرف منسوب کرنا بھی اسی نقطہ پر مبنی ہے کہ ممانعت تو قرآن وحدیث کر چکے اب اس پر عمل میں کراؤں گا اس لیے میں ان دونوں باتوں سے تم کو منع کرتا ہوں۔

مطاعن عثمان غنی رضی اللہ عنہ

طعن نمبر 1: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ظالموں کو امیر بنایا

پہلا اعتراض یہ ہے کہ آپ نے مسلمانوں پر ایسے والی وحاکم مقرر فرمائے جن سے ظلم وزیادتی اور خیانت سرزد ہوئی اور نہ شائستہ امور کے وہ مرتکب ہوئے مثلاً ولید بن عقبہ جس نے شراب پی اور مستی ہی کی حالت میں صبح کی نماز کی امامت بھی کی اور دو رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھائیں اور کہا کہ دو رکعت میں تمہارے لیے بڑھاتا ہوں، اور جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو چاروں صوبوں کا مختار بنادیا بالآخر وہ اتنے طاقتور ہوگئے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں نہ ہونے والی باتیں ہوئیں اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مصر کا والی بنایا اور اس نے لوگوں پر اتنے مظالم کیے کہ لوگ تنگ آکر مدینہ منورہ پر چڑھ آئے اور بلوہ کیا، مروان کو اپنا وزیر اور منشی مقرر کیا جس نے جناب محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ سے دھوکہ کیا کہ خط میں "اقبلوہ "ان کی اطاعت کرو کہ بجائے "اقتلوہ "ان کو قتل کرڈالو لکھ دیا اور پھر اپنے عاملوں کی شکایات پر سکوت فرمایا اور ان کو معزول کرنے میں تامل سے کام لیا اور نوبت یہ آگئی کہ لوگ ان کے ہاتھوں تنگ آگیا، اور آپ کے خلاف ان عاملوں کے طرز عمل کے ساتھ نفرت پھیل گئی اور اس وقت ان کے معزول کرنے کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا بالآخر قتل وغارت گری ہوئی

1۔ سورۃ البقرۃ ، الآیۃ:196

جس کا کوئی تدارک نہ ہو سکا اب جو شخص ایسا بد تدبیر ہو جو امین و خائن اور عادل و ظالم میں تمیز نہ کر سکے جرم پوشاں ہو وہ امامت کے قابل نہیں ہو سکتا۔

جواب: اس اعتراض کا یہ ہے کہ امام کو یہ چاہیے کہ جس کو جس کام کا اہل سمجھے اس کے وہی کام سپرد کرے امام کے لیے علم غیب رکھنے کی شرط سوائے شیعوں نہ اہل سنت کے ہاں ہے اور نہ ہی کوئی اور طبقہ و طائفہ اس کا قائل ہے اور ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے حسن ظن رکھنا بھی اسلامی شعار ہے اور جناب عثمان شہید رضی اللہ عنہ نے یہی کیا انہوں نے جس کو کام کا آدمی سمجھا اس کے سپرد وہی کام کیا جس کو اپنے حسن ظن سے امین و عادل مطیع و اطاعت شعار دیکھا اسی کو امور سلطنت و ریاست سپرد کیے معاند و مخالف فرقہ کی خونہ آرائی سے ہٹ کر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے عمال و حکام خلیفہ سے محبت رکھنے کے علاوہ ان کے احکام کے تابعدار تھے فوج کشی اور دور دراز کے دیار و امصار کے فتح کرنے میں معرکہ آرائی میں چاق و چوبند اور بیدار مغزی میں نادرہ روزگار تھے ان کے فتوحات اور عالی تاریخ پر ثبت ہیں اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مغرب میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ اندلس تک جا پہنچا تو مشرق میں کابل و بلخ اور روم میں اسلام کا پرچم لہرایا رومیوں سے خشکی پر بھی نبرد آزما ہوئے تو بحری لڑائیاں لڑ کر بھی ان کو مفتوح کیا خلیفہ عثمانی رضی اللہ عنہ کے عہد میں عراق و عجم اور خراسان فتنہ و فساد کا گہوارہ رہ چکے تھے ان کی اتنی موثر گوشمالی کی گئی کہ فتنہ و فساد کا نشان تک لوگوں کے دلوں سے مٹا ڈالا اسلام کی اتنی شان و شوکت اور فتوحات کا یہ عظیم الشان سلسلہ تاریخ کے اوراق پر ثبت کرنے والا کیا اتنا ہی بودا تھا کہ وہ معمولی عمال حکومت سے عاجز آ جاتا اور ان کی گوشمالی نہ کر پاتا۔

بات دراصل یہ تھی کہ وہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا حسن تدبیر سے حل فرماتے تھے آپ کو امور جہاں بانی سے بے خبری نہیں تھی نہ وہ عوام کی نفسیات سے ناواقف تھے انہیں معلوم تھا کہ امراء و حکام کے بہت سے لوگ یوں ہی خواہ مخواہ بھی دشمن اور درپے آزار ہوتے ہیں اور جھوٹی سچی شکایتیں ان کا وتیرہ ہوتی ہیں وہ اپنے لیے تو عدل و انصاف کا شور و غوغہ بلند کیے رکھتے ہیں مگر جن کے وہ خلاف ہوتے ہیں اس کو وہ فوراً پھانسی پر چڑھانا چاہتے ہیں اس کے لیے عدل و انصاف کے معروف طریقے برتنے کے بھی روادار نہیں ہوتے اہل سنت کے نزدیک نہ جناب خلیفہ شہید رضی اللہ عنہ معصوم تھے نہ ان کے اعمال و حکام بے خطاب وہ بھی ان سازشیوں اور

غوغائیوں کی طرح انسان تھے اگر کوئی عامل وحاکم خائن یا بد دیانت نکلا یا اس نے نے ظلم وستم روا رکھا تو اس میں جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا کیا قصور جب کہ ان سے متعلق شکایات آپ نے کبھی نظر انداز بھی نہ کی جب کسی شکایت کی تحقیق کے بعد ثابت ہوا کہ شکایت درست ہے تو آپ نے متعلقہ فرد سے باز پرس بھی کی اور اس کو معزول بھی فرمایا مثلاً ولید اور جو عمال حکومت اسلامی ریاست کے رکن رکین تھے جن کی مدبرانہ مساعی سے اور جن کی جنگی مہارت سے اور بیدار مغزی سے اسلام اور مسلمانوں کو شوکت مل رہی تھی جو اسلام و ریاست کے وفادار تھے نہ ان کی طرف سے کوئی فتنہ اٹھا نہ سازش ہوئی اور جنہوں نے روم کی کامیاب لڑائی لڑی اور نمایاں فتوحات حاصل کی جیسا کہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ تو ان کو آخر کیوں معزول کرتے اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد گوشہ نشینی ہی اختیار کر لی تھی بعد کے جھگڑوں فتنوں میں انہوں نے مطلق دخل نہ دیا اسی سے ان کی اچھائی اور سلامتی فکر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ شکایات جہاں کی بھی ہوں ان میں ہاتھ عبداللہ بن سبا یہودی اور اس کے سازشی ٹولے کا تھا اوراق ماسبق میں اپ تفصیل سے پڑھ چکے ہیں مصر میں وہ بیٹھا ہوا اگ لگاتا اور بھڑکا تا رہا تھا وہ زیرک تھا پڑھا لکھا تیز و ترار اور چرب زبان تھا وہ یہودی سیاست کا ماہر اور منجھا ہوا تھا سیادت و قیادت کی ہوس نے کم اسلام دشمنی نے زیادہ اسے آتش زیر پا کر رکھا تھا جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس کی خواہش اعزاز کو مسترد کر کے اسے دھتکار دیا تھا ایسے عالم میں ایسا دشمن جو نہ کرتا تھوڑا تھا بہر حال حضرت شہید رضی اللہ عنہ نے اپنی ثوابدید اور مومنانہ ذمہ داریوں کا پورا پورا حق ادا کیا اور عزت و عظمت اسلام ملت مسلمہ کی نیک نامی کے لیے جو کچھ اپ کر گئے آپ کے بعد اس میں کوئی اضافہ نہ کر سکا کاتب تقدیر نے جب مقدر میں شہادت تحریر کر دی تھی تو اس کے اسباب بھی تو مہیا ہونے تھے لہذا تدبیر مصائب تقدیر نہ ہوئی فتنہ وفساد کا دروازہ بند نہ ہو سکا آپ رضی اللہ عنہ انہی حالات سے گزرے جن سے جناب امیر رضی اللہ عنہ کو اپنے زمانہ خلافت کے پہلے دن سے لے کر آخری لمحات تک گزرتے رہے حضرت امیر رضی اللہ عنہ بھی ہر چند بہترین تدابیر اور چیدہ مشورے خلافت پر ریاست کے امور کے انتظام کے سلسلہ میں عمل میں لاتے رہے مگر تقدیر نے ساتھ نہ دیا اور خاطر خواہ طریقہ پر مسند خلافت پر تمکن حاصل نہ ہوا یہی حال ہر دو اصحاب گرامی قدر رضی اللہ عنہما کا اپنی عمال وحکام کے سلسلہ میں رہا وہ بھی باہم یک دیگر ملتے

چلے تھے اتنا فرق البتہ تھا کہ حضرت عثمان شہید رضی اللہ عنہ کے عمال و حکام آپ کے ساتھ تسلیم و انقیاد و محبت و وفا سے پیش آتے رہے سرکشی اور بغاوت اور نافرمانی سے دور رہے شام اور حمص وغیرہ مسلسل اور باقاعدہ محاصل و خراج بھیجتے رہے جس کے سبب اہل اسلام دولت و ثروت کی زندگی کے دور میں داخل ہو گئے اور عیش و عشرت کی زندگی کے عادی ہوتے گئے اور یہی حد سے گزری ہوئی پُر عشرت زندگی فتنہ و فساد کا سبب بن گئی۔

ادھر جناب امیر رضی اللہ عنہ کے عامل اور حکام دین و ملت کے وفادار تو کیا ذاتی طور پر بھی آپ رضی اللہ عنہ کے مطیع و فرمانبردار نہ تھے ہر کام کو بگاڑتے چاروں طرف سے شکست کھا کر اور ذلیل ہو کر لوٹتے خیانتیں کر کے ظلم و ستم ڈھا کر دنیا و آخرت کی روسیاہی حاصل کرتے اور بھاگ نکلتے غیروں تک غیروں کا تو کیا ذکر خود آپ رضی اللہ عنہ کے اقارب اور چچازاد بھائیوں کا بھی یہی حال تھا اگر کسی کو اس بات میں شبہ ہو تو وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا وہ خط پڑھ لے جسے نہج البلاغہ نے درج کیا ہے واضح رہے نہج البلاغہ ان کے ہاں اصح ترین کتاب ہے اس خط میں اپنے چچازاد بھائی کو خطاب فرما رہے ہیں آپ کا یہ خط آپ رضی اللہ عنہ کے مشہور خطوط میں سے ہے اور اکثر کتب امامیہ میں ملتا ہے خط کا ابتدائیہ قابل توجہ ہے جناب امیر رضی اللہ عنہ کو اس روسیاہ سے جو حسن ظن تھا وہ بھی ملحوظ خاطر رہے:

أما بعد فإني كنت أشركتك في أمانتي، وجعلتك شعاري وبطانتي، ولم يكن رجل من أهلي أوثق منك في نفسي لمواساتي وموازرتي، وأداء الأمانة إلي. فلما رأيت الزمان على ابن عمك قد كلب، والعدو قد حرب، وأمانة الناس قد خزيت، وهذه الأمة قد فنكت وشغرت قلبت لابن عمك ظهر المجن ففارقته مع المفارقين، وخذلته مع الخاذلين، وخنته مع الخائنين. فلا ابن عمك آسيت، ولا الأمانة أديت. وكأنك لم تكن الله تريد بجهادك. وكأنك لم تكن على بينة من ربك. وكأنك إنما كنت تكيد هذه الأمة عن دنياهم وتنوي غرتهم عن فيئهم. فلما أمكنتك الشدة في خيانة الأمة أسرعت الكرة، وعاجلت الوثبة، واختطفت ما قدرت عليه من أموالهم المصونة لأراملهم وأيتامهم

اختطاف الذئب الأزل دامية المعزى الكسيرة، فحملته إلى الحجاز رحيب الصدر بحمله غير متأثم من أخذه كأنك لا أبا لغيرك حدرت إلى أهلك تراثا من أبيك وأمك. فسبحان الله! أما تؤمن بالمعاد؟أو ما تخاف نقاش الحساب؟ أيها المعدود كان عندنا من ذوي الألباب كيف تسيغ شرابا وطعاما وأنت تعلم أنك تأكل حراما وتشرب حراما؟ وتبتاع الإماء وتنكح النساء من مال اليتامى والمساكين والمؤمنين والمجاهدين الذين أفاء الله عليهم هذه الأموال وأحرز بهم هذه البلاد. فاتق الله واردد إلى هؤلاء القوم أموالهم، فإنك إن لم تفعل ثم أمكنني الله منك لأعذرن إلى الله فيك، ولأضربنك بسيفي الذي ما ضربت به أحدا إلا دخل النار.(1)

حمد و ثنا کے بعد واضح ہو کے میں نے تم کو اپنی امانت کا شریک کار کیا تم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا تم میرے اہل خانہ میں میرے نزدیک غم خواری رفاقت اور امانت داری میں سب سے زیادہ قابل اعتماد اور لائق بھروسہ تھے لیکن جب تم نے اپنے چچازاد کا برا وقت دیکھا اور دشمن کو آمادہ پیکار پایا اور لوگوں کی امانت داری خیانت کی شکل اختیار کر گئی اور یہ امت خونریزی میں ڈوب گئی تو تو منہ پھاڑ کر رہ گیا اور عین غم و اندوہ کے عالم میں اس کو دغا دے گیا اوروں کی طرح تو بھی اس سے بچھڑ گیا دوسروں کی طرح تو بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا اوت تو بھی خیانت کرنے والوں کا خیانت میں ساتھی بن گیا تو نے اپنے چچازاد کی ناہمدردی کی نہ اس کی امانت ادا کی، گویا تو اپنے جہاد میں مخلص نہیں تھا تجھے اللہ تعالی کی خوشنودی مد نظر نہ تھی، نہ اپنے رب کی طرف سے کسی کھلی دلیل پر قائم تھا گویا تم مکر و فریب سے دنیا کمانا چاہتا ہے اور دھوکے سے امت کے خزانے اڑا

1 ـ نهج البلاغة، ومن كتاب له عليه السلام إلى بعض عماله،3/ 65، 66، 67، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

لینے کی نیت رکھتا تھا، جب حالات کی ستم گری نے تجھے خیانت کا موقع دیا تو تو جھپٹ پڑا اور بے صبر ہو کر ان کا جتنا مال سمیٹ سکتا تھا لے بھاگا، یہ وہ مال تھا جو امت کے بیواؤں اور یتیموں کے لیے محفوظ رکھا گیا تھا جس طرح بدحال بھیڑیا خون آلود ہڈی ٹوٹی بکری کو لے بھاگتا ہے، اب تو وہ مال سمیٹ کر حجاز لے گیا ہے اور یوں اٹھائے ہوئے ہے گویا اس کے لینے میں تو نے کوئی گناہ نہیں کیا، تیرا باپ مرے (تیرا ناس ہو) گویا وہ تیرا جوڑا ہوا مال تھا یا تجھے اپنے ماں باپ کا ورثہ ملا تھا کیا کہنے یا تو آخرت کے عذاب سے نڈر ہو گیا ہے اور حساب لکھنے والوں کا تجھے کوئی خوف نہیں رہا، تو تو ہمارے نزدیک عقلمندوں کا انتخاب تھا تیرے حلق سے لقمہ کس طرح اترتا ہے جبکہ تو جانتا ہے کہ حرام کھا رہا ہے اور حرام پی رہا ہے، یتیموں، مسکینوں اور مجاہدوں کو اللہ تعالی نے جو مال دیا تھا اور جن کی خاطر اس نے ان شہروں کو سرسبز و شاداب بنا رکھا ہے اس مال سے تو لونڈیاں خرید رہا ہے عورتوں سے نکاح کرتا ہے اللہ تعالی سے ڈر، حق داروں کا مال واپس کر، اگر تو نے ایسا نہ کیا اور میں تجھ پر قابو پا گیا تو اللہ تعالی کے نزدیک تیرے معاملہ میں بری وذمہ ہو جاؤں گا اور تجھے اسی تلوار سے قتل کروں گا کہ اس سے میں نے جس کو مارا وہ جہنم رسید ہوا۔

اس خط کے پورے مضمون اور اس میں پوشیدہ کرب پر غور کیجئے اور اس عامل کے خیانت و خباثت کا اندازہ لگایئے اور پھر جناب شہید رضی اللہ عنہ کے پورے دور خلافت پر نظر ڈال جایئے کیا وہاں بھی کسی عامل سے ایسی خیانت و خباثت کا ثبوت ملتا ہے کیا وہاں بھی کوئی مال کھا کر اس طرح بھاگتا ملتا ہے؟ جنھوں نے امیر رضی اللہ عنہ کا ایک اور عامل منذر بن جارود تھا وہ بھی سخت خائن اور چور نکلا جب اس کے خیانت ظاہر ہوئی تو جناب امیر رضی اللہ عنہ انہوں نے اس کو بھی دھمکی آمیز خط لکھا آپ رضی اللہ عنہ کا یہ خط بھی مشہور خطوط میں شمار ہوتا ہے جو نہج البلاغہ کے علاوہ امامیہ کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے ملاحظہ ہو:

أما بعد فإن صلاح أبيك غرني منك، وظننت أنك تتبع هديه وتسلك سبيله،

فإذا أنت فيما رقي إلي عنك لا تدع لهواك انقيادا، ولا تبقي لآخرتك عتادا،

تعمر دنياك بخراب آخرتك، وتصل عشيرتك بقطيعة دينك.[1]

حمد وثنا کے بعد میں تیرے باپ کی نیک بختی کے سبب تیرے بارے میں دھوکہ کھا گیا اور میں یہ سمجھ بیٹھا کہ تو اپنے باپ کے نقش قدم پر ہوگا اور اسی کو راستہ پر چلتا ہوگا مگر ان خبروں سے جو تیرے متعلق مجھ تک پہنچی اچانک ہی یہ معلوم ہوا کہ تو اپنے خواہشوں کا اسیر ہے، اپنی آخرت کے لیے تیرے پاس کوئی ذخیرہ نہیں کیا تم اپنی آخرت برباد کر کے دنیا آباد کرنا چاہتا ہے اور اپنے دین کا رشتہ کاٹ کر اسے عزیز واقارب سے رشتہ توڑنا چاہتا ہے..... الی آخر المکتوب

خلاصہ کلام یہ کہ اہل سنت کے نزدیک حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے مابین اس معاملہ میں کوئی فرق نہیں کیونکہ ہر دو حضرات نے اپنی بہترین صوابدید کے مطابق جو کچھ حق سمجھا اور جو کام اپنے ذمہ لازم جانا اس کو عمل میں لائے اس میں ذرہ بھر کوتاہی نہیں فرمائی اپنے خیال اور حسن ظن کے مطابق عمال وحکام مقرر فرمائے نہ وہ کسی کے دل کا حال جانتے تھے اور نہ یہ جانتے تھے کہ آج جو اچھا ہے کل برا ہو جائے گا غیب کی خبر صرف خدا کو ہے ایسا بھی ہوا ہے کہ ظاہری اور دکھاوے کے اخلاق سے پیغمبر بھی متاثر ہوتے رہے وہ تو چونکہ ہم پر وحی کا نزول ہوتا رہتا تھا اس لیے اللہ تعالی بذریعہ ہے ان کا اندرون اپنے انبیاء پر ظاہر فرمادیتے اور ان کی کوئی سازش کوئی برا ارادہ اور منصوبہ کامیاب نہ ہو پاتا۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے "وَلِيُمَحِّصَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا"[2] تا کہ اللہ تعالی اہل ایمان کو خالص کرے یا یہ فرمایا "مَا كَانَ اللهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّى يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ"[3] اللہ تعالی مومنین کو ایسی حالت میں جو تم کو درپیش ہے چھوڑے نہیں رکھے گا جب تک خبیث کو طیب سے چھانٹ کر الگ نہ کردے۔

1۔ نهج البلاغة، ومن كتاب له عليه السلام إلى المنذر بن الجارود العبدي،3/ 132، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر

2۔ سورة ال عمران ، الاية:141

3۔ سورة ال عمران ، الاية:179

امام کے لیے ضروری نہیں کہ وہ غیب دان ہو اور اس کا حسن ظن پھر غلط نہ نکلے اس کو پہلے معلوم ہو جائے کہ اس سے کیا کچھ سرزد ہونے والا ہے، البتہ اس سلسلہ میں شیعوں کے بڑی دشواری اور مشکل ہے کیونکہ ان کے عقیدہ میں امام غیب دان ہوتا ہے اس بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ خیانت ظاہر ہونے سے پہلے اور کام سپرد کرنے سے پیشتری جان جایا کرتے تھے کہ فلاں خائن ہے وہ خیانت سے باز نہیں آئے گا، اس لیے کہ ان کے عقیدہ کے مطابق آپ رضی اللہ عنہ کے لیے گزشتہ و آئندہ کا علم حاصل ہونا ضروری ہے اور یہ کسی ایک دو کا خیال نہیں ان کے ہاں کا اجماعی مسئلہ ہے، محمد بن یعقوب کلینی اور دوسرے علماء نے مختلف روایتوں اور متحدہ طرق سے ثابت کر رکھا ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ جناب علی رضی اللہ عنہ ان کے نزدیک دیدہ و دانستہ خائنوں اور فسادیوں کو مسلمانوں کا والی مقرر فرماتے تھے اور بالآخر وہ خائن لوگ مال و دولت سمیٹ کر بھاگ جاتے اور یوں مسلمانوں کے حقوق طلب کرنے کا باعث ہوتے تھے اور پھر سوائے نصیحت ناموں، عتاب ناموں اور وعظ و نصیحت کے کوئی چارہ کار یا تدارک کی صورت نہ رہتی۔

ادھر بے چارے عثمان غنی رضی اللہ عنہ محاز اپنے حسن ظن پر (کیونکہ علم غیب تو ان کو تھا نہیں) عامل مقرر کر دیتے اور ان کی غلطیوں کا خمیازہ بھگتتے اور پشیمان و پریشان ہوتے، اب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک اور عامل کی داستان سنیے جس نے آپ کے محترم و مقدس خاندان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور کن کن اذیتوں سے انہیں دوچار کیا یہ مردود زمانہ جس کی اصل بھی قابل اعتراض رہی زیاد بن سمیہ[1] (عرف زیاد بن سفیان) جو ملک فارس و شیراز کا آپ کی طرف سے صوبہ دار تھا وہ اتنا بے حیا تھا کہ اپنی بے نسبی پر فخر کرتا اور اعلان اپنی والدہ پر جو ایک لونڈی تھی زنا کی گواہی دیتا تھا وہ قصہ یوں ہے کہ جناب ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے سے پیشتر حارث ثقفی مشہور طبیب کی لونڈی سمیہ نامی سے ناجائز تعلق قائم کیا جس کے نتیجہ میں اس نے ایک بچہ جنا چونکہ وہ حارث کی لونڈی تھی اور حارث ہی کے ایک غلام کی منکوحہ تھی اس لیے بچپن میں یہ لڑکا عبدالحارث کے لقب سے مشہور ہوا، جب وہ بڑا ہوا تو شرافت و بلاغت، خوش تقریری اور حسن بیانی کا بہت چرچہ ہوا اس کی

1۔ وقال الذهبي في " الميزان " في ترجمة زياد بن أبيه قال ابن حبان في " الضعفاء ": ظاهر أحواله المعصية، وقد أجمع أهل العلم على ترك الاحتجاج بمن كان كذلك. (العواصم والقواصم في الذب عن سنة أبي القاسم، لا يجوز لعن والدى رسول الله ﷺ، 8/ 160، مؤسسة الرسالة للطباعة والنشر والتوزيع، بيروت)

سوجھ بوجھ زیرکی و دانائی دور دور شہرت پاگئی، ایک روز قریش کے ایک سنجیدہ بزرگ عمرو بن عاص نے کہا اگر یہ لڑکا قریش کا ہوتا تو عرب کو اپنی لاٹھی سے ہانکتا ابو سفیان نے یہ سن کر کہا" و الله إني لأعرف الذي وضعه في رحم أمه" بخدا میں اس کو خوب جانتا ہوں جس کا یہ نطفہ ہے اس مجلس میں حضرت علیؓ کو موجود تھے آپ نے پوچھا ابو سفیان وہ کون تھا ابو سفیان نے کہا ہو میں ہوں آپ نے فرمایا بس رہنے دو ابو سفیان، اس پر ابو سفیان نے یہ اشعار پڑھے:

أما والله لولا خوف شخص   يراني يا علي من الأعادي

لأظهر أمره صخر بن حرب   ولم يخف المقالة في زياد

وقد طالت مجاملتي ثقيفا   وتركي فيهم ثمر الفؤاد[1]

بخدا اگر مجھے اس شخص کا ڈر نہ ہوتا جو مجھے دشمنوں میں شمار کرتا ہے تو اے علی صخر بن حرب (یعنی میں) اس لڑکے کے بھید کو ظاہر کر دیتا تو پھر یہ خوش گفتاری زیاد کی شمار نہ ہوتی بہت عرصہ میں نے قوم ثقیف سے اسے چھپائے رکھا اور اپنے جگر گوشوں کو ان کے پاس چھوڑے رکھا۔

زیاد نے بھی سن رکھا تھا اور بڑی ڈھٹائی اور بے حیائی سے کہتا تھا کہ میں اصل میں ابو سفیان کا نطفہ اور قوم قریش کا فرد ہوں حضرت علیؓ نے اس کو فارس کا حاکم بنایا تو نظم مملکت قائم کرنے، ان شہروں کی حالت درست کرنے اور فتنہ اور فساد پر قابو پانے میں اس کی کارکردگی بڑی شاندار رہی اور اس کی تدابیر اور تجاویز کے اچھے نتائج برآمد ہوئے یہ حالت دیکھ کر جناب معاویہؓ نے اس سے خفیہ رابطہ قائم کیا تاکہ وہ حضرت علیؓ کو چھوڑ کر ان سے آملے اور اس کو لالچ دیا کہ اگر وہ اس کے لیے تیار ہو تو اسے شریک نسب بھی کر لیا جائے گا، کیونکہ ایسا خوش تدبیر اور لائق فائق اور قوم کا آدمی اگر حریف سے کاٹ کر اپنے سے آملے تو یہ بڑی سیاسی کامیابی تھی آپ نے اس کو لکھا کہ اگر تم میرے پاس آ گے تو میں تجھے اپنا بھائی کہوں گا، اولاد ابو سفیان میں تجھے شامل قرار دوں گا کیونکہ تو آخر تو بھی ابی سفیان ہی کا نطفہ ہے اور تیری دانائی شرافت سمجھ بوجھ تیرے دعویٰ کی

---

1 ۔ بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار، 33/ 518

صداقت کے منہ بولتے گواہ ہیں، جب اس پخت و پز کی اطلاع حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملی تو آپ نے زیاد کو اس مضمون کا خط لکھا:

وقد عرفت أن معاوية كتب إليك يستزل لبك ويستفل غربك، فاحذره فإنما هو الشيطان يأتي المؤمن من بين يديه ومن خلفه وعن يمينه وعن شماله ليقتحم غفلته ويستلب غرته وقد كان من أبي سفيان في زمن عمر فلتة من حديث النفس ونزغة من نزغات الشيطان لا يثبت بها نسب ولا يستحق بها إرث، والمتعلق بها كالواغل المدفع والنوط المذبذب .[1]

مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ معاویہ نے تجھے خط لکھا ہے وہ تجھے بے وقوف بنا کر تیری تیزی کو ماند کرنا چاہتا ہے تو اس سے ڈرتے رہو وہ اس شیطان کے مانند ہے جو آدمی کو آگے سے پیچھے سے دائیں بائیں سے ہر طرف سے گھیرنے کی فکر میں رہتا ہے تاکہ جب اسے غافل یا بے فکر پائے تو قابو پا کر تباہ کر دے تم اس سے ہوشیار رہو اور عمر کے زمانے میں ابو سفیان کے منہ سے ایک بات نکل گئی تھی جو وسوسہ نفسانی یا شیطانی خیال ہی تھا کہ اس سے نہ کسی کا نسب ثابت ہو سکتا ہے نہ کسی میراث کا مستحق ہوتا ہے اور اس کو سند و ثبوت میں پیش کرنے والا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے زبردستی ہانک کر لایا گیا ہو اور جو ادھر میں لٹکا ہوا ادھر ادھر ہل رہا ہو۔

جب زیاد نے یہ پڑھا تو کہنے لگا "قال ورب الكعبة شهد ابي الحسن باني ابن ابو سفيان"

رب کعبہ کی قسم علی نے تو گواہی دی ہے کہ میں ابو سفیان کا بیٹا ہوں مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک آپ کا رفیق رہا ساتھ نہ چھوڑا اور جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے خلافت و سیادت کا معاملہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا اور ادھر جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے ساتھ ملانے کی حد سے زیادہ کوشش کی اور ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے اسی قول کو دلیل بنا کر جو جناب عمر بن عاص اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے روبرو کہا تھا اس کو اپنا بھائی قرار دیا اور 44

1- نهج البلاغة، ومن كتاب له عليه السلام إلى زياد بن أبيه،3/ 69، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر

ہجری میں زیاد بن ابو سفیان اس کا لقب تجویز کر کے تمام قلمروں میں اعلان کرا دیا کہ آئندہ سے اسے زیاد بن ابی سفیان کہا جائے اور یہ سعی و کوشش اس لیے کی کہ وہ مدبر شجاع اور بہت زیرک سردار تھا جمعیت بھی اس کے ساتھ بہت تھی اپنے ساتھ ملانے سے ان کی ریاست میں استحکام اور مضبوطی پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک امکانی خطرہ کا بھی سد باب تھا ممکن ہے وہ بغاوت کر کے ان کے لیے خطرات کا باعث بن جائے بہر حال جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی سیاسی تدبیر میں کامیاب ہوئے اور وہ آپ کا رفیق و معاون بن گیا۔

اس بد فطرت نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ وہ جانے کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی زندگی تک تو تھوڑا بہت ظاہری لحاظ برتا مگر آپ کی وفات کے بعد جب عراق کا گورنر بنایا گیا تو کوفہ پر قبضہ کے بعد سب سے پہلے جناب سعید بن شرح رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑ گیا آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے مخلص پر وفقاء میں سے تھے اور آپ کے بلند قدر خاندان کے دلی دوستوں میں سے گنے جاتے تھے اس کا ان کے درپہ آزار ہونا گویا خاندان و اولاد علی رضی اللہ عنہ سے عداوت و دشمنی کی ابتدا تھی جناب سعید کو جب اس کے ارادوں کی بھنک ملی تو وہ کوفہ سے نکل کر مدینہ منورہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس آگئے ان کا کوفہ میں گھر تھا اہل عیال تھے مال و اسباب تھا ان سب پر زیاد نے قبضہ کر لیا مال و اسباب لوٹ کر گھر جلا دینے کا حکم دے دیا جب یہ اطلاع جناب حسین رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوئی تو یہ خیال فرما کر کے آخر اتنے عرصہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کا رفیق و دوست رہا ہے لحاظ و مروت پر کچھ تو برتے گا آپ نے بطور سفارش اس کو خط لکھ دیا:

من حسين بن علي الي زياد أما بعد فإنك عمدت إلى رجل من المسلمين له ما لهم وعليه ما عليهم، فهدمت داره، وأخذت ماله، وحبست أهله وعياله، فإن أتاك كتابي هذا فابن له داره، وأردد عليه عياله وماله، وشفعني فيه[1]

حسین ابن علی کی طرف سے زیاد کو اما بعد تم نے ایک ایسے مسلمان شخص پر ہاتھ ڈالا ہے جس کے حقوق بھی وہی ہیں جو سب مسلمانوں کے ہیں اور اس کی ذمہ داریاں بھی وہی ہیں جو اور

---

1 ۔ شرح نهج البلاغة لابن ابي الحديد ، 16/ 194 ، ط: دار إحياء الكتب العربية

مسلمانوں کی ہیں تو نے اس کا گھر ڈھا دیا مال و اسباب پر قبضہ کر لیا یہ تو نے کیا کیا اب جب میرا یہ خط تجھ کو ملے تو تجھے چاہیے کہ اس کا گھر تعمیر کرا دے مال و عیال واپس کر دے کیونکہ میں نے اس کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے اس کے متعلق میری یہ سفارش مان لے۔

آپ علیہ السلام کے اس خط کے جواب میں بدبخت ناشکرے نے جو کچھ لکھا وہ ذیل میں ملاحظہ کیجئے:

من زياد بن أبي سفيان إلى الحسن بن فاطمة: أما بعد: فقد أتاني كتابك تبدأ فيه بنفسك قبلي، وأنت طالب حاجة وأنا سلطان وأنت سوقه، وتأمرني فيه بأمر المطاع المسلط على رعيته. كتبت إلى في فاسق آويته. إقامة منك على سوء الرأي ورضا منك بذلك، وأيم الله لا تسبقني به ولو كان بين جلدك، ولحمك وإن نلت بعضك غير رفيق بك ولا مرع عليك فإن، أحب لحم على أن آكله للحم الذي أنت منه، فسلمه بجريرته إلى من هو أولى به منك، فإن عفوت عنه لم أكن شفعتك فيه، وإن قتلته لم أقتله إلا لحبه أباك الفاسق. والسلام.[1]

زیاد بن ابی سفیان کی طرف سے حسین بن فاطمہ کی طرف تمہارا خط مجھے ملا جس میں تم نے میرے نام سے پہلے اپنا نام لکھا حالانکہ تم مجھ سے درخواست کر رہے ہو اور رعایہ ہو جبکہ میں حاکم ہوں تم نے یہ خط ایسے فاسق کے بارے میں لکھا ہے جس کو وہی بنا دے گا جو اسی جیسا یا اس سے بھی بڑا فاسق ہو گا اور اس سے بڑھ کر یہ بات ہوئی کہ وہ تمہارے پاس آیا اور تم نے اسے پناہ دے دی اسی وجہ سے وہ اپنی غلط رائے پر اڑا ہوا ہے اور اس پر راضی ہے خدا کی قسم اگر وہ تمہارے گوشت پوست میں بھی سما جائے تب بھی میری گرفت اس تک سب سے پہلے پہنچے گی بس مجھے وہ گوشت بہت مرغوب ہو گا جس کے اندر تم سمائے ہوئے ہو لہذا اس غلطی کی پاداش

1۔ شرح نہج البلاغة لابن ابي الحديد، 16/ 194، ط: دار إحياء الكتب العربية

میں تم اس کو اس کے حوالے کر دو جو تم سے بہتر ہے اگر میں بالفرض اس کو معاف کر بھی دوں تو یہ اس وجہ سے نہیں ہو گا کہ تم نے اس کی سفارش کی تھی اور اگر میں نے اس کو قتل کیا تو اس کی صرف یہ وجہ ہو گی کہ وہ تم سے رشتہ محبت رکھتا ہے۔

سرکشی اور گستاخی سے لبریز جب یہ خط حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ملا تو آپ نے وہی خط ملفوف کر کے اپنی تحریر کے ساتھ کے اصل واقعہ یہ تھا میں نے زیاد کو ایسا لکھا تھا جس کا اس نے یہ جواب دیا ہے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا جناب معاویہ رضی اللہ عنہ یہ خط پڑھ کر سخت غصہ ہوئے اور فوراً اپنے ہاتھ سے خط لکھ کر زیاد کو بھیجا:

من معاوية بن ابي سفيان الي زياد أما بعد، فإن الحسن بن علي بعث إلى بكتابك إليه جوابا عن كتاب كتبه إليك في أبن سرح، فأكثرت العجب منك، وعلمت أن لك رأيين أحدهما من أبي سفيان، والآخر من سمية، فأما الذي من أبي سفيان فحلم وحزم وأما الذي من سمية، فما يكون من رأى مثلها! من ذلك كتابك إلى الحسن تشتم أباه، وتعرض له بالفسق، ولعمري إنك الأولى بالفسق من أبيه. فأما أن الحسن بدأ بنفسه ارتفاعا عليك، فإن ذلك لا يضعك لو عقلت، وأما تسلطه عليك بالامر فحق لمثل الحسن أن يتسلط، وأما تركك تشفيعه فيما شفع فيه إليك، فحظ دفعته عن نفسك إلى من هو أولى به منك. فإذا ورد عليك كتابي فخل ما في يديك لسعيد بن أبي سرح وابن له داره، وارد د عليه ماله، ولا تعرض له، فقد كتبت إلى الحسن أن يخيره، إن شاء أقام عنده، وأن شاء رجع إلى بلده، ولا سلطان لك عليه لأبيد ولا لسان. وأما كتابك إلى الحسن باسمه واسم أمه، ولا تنسبه إلى أبيه، فإن الحسن ويحك! من يرمى به الرجوان وإلى أي أم وكلته لا أم لك! أما علمت أنها فاطمة بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم فذاك أفخر له لو

کنت تعلمه و تعقله![1]

معاویہ کی طرف سے زیاد کے نام حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے تمہارا وہ خط جو تم نے ان کے خط کے جواب میں لکھا تھا مجھے بھیجا ہے جس میں انہوں نے ابن شریح کی سفارش کی تھی جس کو پڑھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ تو دو نسبتوں کے درمیان پھنسا ہوا ہے ایک نسبت ابوسفیان کی ہے تو دوسری طرف سمیہ کی ابوسفیان کی نسبت سے تجھے بردبار متحمل اور ارادہ کا پختہ ہونا چاہیے اور سمیہ کی نسبت کا تقاضہ ہے کہ تیری رائے ایسے گھٹیا ہونی چاہیے جیسے ان لوگوں کی ہوتی ہے اور اس کا ثبوت تیرا وہ خط ہے جو تو نے حسین رضی اللہ عنہ کو لکھا جس میں تو نے ان کی والدہ کو گالی دی اور ان کو فاسق ٹھہرایا میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تو حسین سے زیادہ فسق کا اہل ہے اور تیرا باپ جب تو ایک غلام کی طرف منسوب کیا جائے ان کے باپ سے فسق کا زیادہ اہل ہے حسین رضی اللہ عنہ نے خود کو اونچا سمجھ کر اگر اپنا نام پہلے لکھ دیا تو کیا ہوا تجھے تو اس نے نہیں گھٹایا اور ان کی سفارش رد کر کے اس نیکی کو جو قبول سفارش کی صورت میں حاصل ہوتی تو نے اپنے سے بہتر کی طرف لوٹا دیا جب میرا یہ خط تجھے ملے تو دوسرے سعید بن شریح کو جو مال وم تیرے پاس ہے اس کے حوالے کر دو مال و عیال لوٹا دو گھر بنوا کر دو اور اس سے کسی قسم کی باز پرس نہ کرو میں نے حسین رضی اللہ عنہ کو خط لکھ دیا ہے کہ وہ اپنے دوست کو ان احکامات کی خبر کر دیں پھر اگر وہ چاہے تو ان کے پاس رہے اور چاہے تو اپنے شہر میں آ جائے بہر حال تیرے ہاتھ اور زبان کو ان پر کوئی اختیار نہیں اور تو نے جو حسین کو خط میں ان کے والد کی طرف منسوب کرنے کی بجائے والدہ کی طرف منسوب کیا ہے تو تمہاری یہ حرکت افسوسناک ہے حسین رضی اللہ عنہ تو وہ ہیں جو نہ کسی بدی سے ذلیل کیے جا سکتے ہیں نہ عزت و مرتبہ سے گرائے جا سکتے ہیں کیا تو نے ان کے والد کو حقیر جانا وہ علی بن ابی طالب ہیں اور ان کی والدہ کی طرف نسبت کی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں یہ نسبت تو اور بھی زیادہ

1۔ شرح نهج البلاغة لابن ابي الحديد، 16/ 194، 195، ط: دار إحياء الكتب العربية

قابل فخر ہے اگر تجھ میں کچھ سمجھ ہوتی۔

غرض ابن زیاد اور اس کی اولاد میں سے خاص کر عبید اللہ کی شرارت و گستاخی جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خاندان کے ساتھ جس قابل نفرت حد تک پہنچی ہوئی ہے وہ تاریخ کا حصہ ہے اس تفصیل کے بعد شیعہ حضرات کے لیے مشکل صورتحال یہ ہے کہ ابن زیاد جب ولد الزنا تھا اور ولد الزنا امامیہ کے نزدیک سور کی طرح نجس العین ہوتا ہے تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اس کو فارس کے لوگوں پر نیز مسلمانوں کے لشکر پر حاکم و امیر کیسے بنا دیا اور اس وقت چونکہ نماز پنجگانہ جمعہ و عیدین کے امامت بھی امیر کے ذمہ ہوتی تھی تو گویا یہی نطفہ ناطہ کی ایک مسلمانوں کو نمازیں بھی پڑھاتا رہا اور بقول امامیہ نمازیں تباہ کرتا رہا کیونکہ امامیہ کے ہاں یہ تحقیق و تصریح شدہ مسئلہ ہے کہ امامت سے نماز فاسد ہو جاتی ہے تو ایسی صورت میں شیعوں کا کیا منہ اور ان کو کیا حق ہے کہ وہ جناب عثمان غنی شہید رضی اللہ عنہ پر یہ طعن توڑیں اور اعتراض کریں کہ آپ رضی اللہ عنہ کے عمال ظالم یا خیانت پیشہ تھے!

طعن نمبر2: مروان کے باپ کو واپس مدینہ بلالیا

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ حکم بن ابی العاص[1] کو جو مروان کا باپ تھا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قصور کی بنا پر مدینہ بدر کر دیا تھا آپ نے اس کو پھر مدینہ واپس بلالیا۔

جواب: یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کو مدینہ سے اس بنا پر نکال دیا تھا کہ منافقین سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے اور کفار سے بعض معاملات میں تعاون بھی کرتا تھا جس کے وجہ سے مسلمانوں میں باہمی فتنہ انگیزی کی نوبت بھی آجاتی تھی تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بعد شیخین رضی اللہ عنہما کفر و منافقت کا حجاز میں عموما

---

1 ـ الحكم بن أبي العاص بن أمية بن عبد شمس القرشي الأموي، عم عثمان بن عفان، أسلم يوم الفتح، مات سنة 32هـ الإصابة: 2/ 104. وقال ابن تيمية: «قصة نفي النبي صلى الله عليه وسلم للحكم ليست من الصحاح، ولا لها إسناد يعرف به أمرها ... ولم تكن الطلقاء تسكن بالمدينة، فإن كان صلى الله عليه وسلم طرده فإنما طرده من مكة لا من المدينة، ولو طرده من المدينة لكان يرسله إلى مكة، وقد طعن كثير من أهل العلم في نفيه وقالوا: ذهب باختياره، وإذا كان النبي صلى الله عليه وسلم عزر رجلا بالنفي لم يلزم أن يبقى منفيا طول الزمان، فإن هذا لا يعرف بشيء من الذنوب، ولم تأت الشريعة بذنب يبقى صاحبه منفيا دائما». منهاج السنة النبوية: 6/ 226.

ہو مدینہ منورہ میں خصوصاً نام و نشان ہی مٹ گیا اور کافر و منافق سے دوستی اور تعاون اور اس کے سبب فتنہ انگیزی کا خدشہ ہی نہ رہا تو بقاعدہ طے شدہ کہ جب کوئی حکم کسی علت سبب اور وجہ سے مقید ہو تو علت کے ختم ہو جانے کے بعد وہ حکم بھی باقی نہیں رہتا مدینہ بدری کا حکم بھی اس سے اٹھ گیا اور جناب شیخین رضی اللہ عنہما نے بمصلحت اس کے مدینہ میں داخلہ کو پسند نہیں فرمایا کہ احتمال تو ابھی باقی تھا کہ یہ دونوں حضرات بنی تیم سے تھے اور حکم بنوامیہ میں سے تھا ایسا نہ ہو کہ عداوت دور جاہلیت کے سبب رگ جاہلیت جوش مار جائے اور مسلمانوں میں کسی نوع کی چہ میگوئیاں شروع ہو جائے۔

اور جناب غنی رضی اللہ عنہ کا تو وہ چونکہ بھتیجا تھا اس قسم کا کوئی خدشہ نہ تھا لہذا بطور صلہ رحمی آپ نے اسے مدینہ بلا لیا اور یہ اعتراض لوگوں نے خود حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے بھی کیا تھا کہ آپ نے حکم کو مدینہ میں کیسے بلا لیا جس کا انہوں نے کافی وشافی جواب اسی وقت دے دیا تھا کہ میں نے وصال سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی واپسی کی اجازت لے لی تھی جب ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے تو میں ان کے پاس گیا آپ نے دوسرا گواہ طلب فرمایا اسی طرح میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس بھی گیا شاید وہ مجھ تنہا کی گواہی قبول کر لیں مگر انہوں نے بھی دوسرا گواہ مانگا اب میں خود خلیفہ ہوں اپنے علم یقینی کے سبب ان کو بلا سکتا ہوں لہذا میں نے بلا لیا اس لیے اعتراض کی کوئی بات ہے نہ حکم رسول کی مخالفت کا سوال۔

اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اس قول کی شہادت اہل سنت کی کتابوں میں موجود ہے روایت صحیح یہ منقول ہے کہ مرض آخری میں ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کاش میرے پاس ایک مرد صالح عطا کے میں اس سے ہم کلام ہوتا ازواج مطہرات اور دوسرے خدام خانہ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بلوا لیں فرمایا نہیں پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ناموں پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار فرمایا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نام پر ہاں فرمائی چنانچہ جب اے تو تنہائی میں ان سے کچھ سرگوشی فرمائی ہو سکتا ہے لطف و مہربانی کی اس خاص ساعت میں آپ نے اس کی بھی خطا بخشی کرا لی ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرد صالح کی سفارش کو شرف قبول عطا فرما دیا ہو کہ دوسرے اسی وجہ سے اس سے باخبر نہ ہو سکے۔

پھر یہ بات بھی ثابت ہو گئی ہے کہ حکم نے آخر عمر نفاق و فساد کی عادت سے توبہ کر لی تھی اس لیے اس

کے بعد اس سے کوئی ایسی حرکت صادر نہیں ہوئی اور پھر عمر کے لحاظ سے بھی وہ کس بل نہیں رہا تھا [illegible] گیا تھا کہ کسی ضرر اور فتنہ کا اندیشہ بھی نہ رہا تھا۔

طعن نمبر 3: اپنے عزیز واقارب کو بہت زیادہ مال ودولت بخشنا

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اہل بیت اور اپنے عزیز واقارب کو بہت زیادہ مال ودولت بخشی اور بے انتہا اسراف کیا حتی کہ بیت المال کو کنگال کر دیا حکم بن ابی العاص جب مدینہ میں آیا تو اسے ایک لاکھ درہم دیئے اس کے بیٹے حارث بن حکم کو مدینہ کے بازاروں کا محصول عشور خزانہ اور منڈیاں عطا کی مروان کو افریقہ کا خمس دے ڈالا عبد اللہ بن خالد بن اسید بن ابی العاص بن امیہ جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آیا تو اسے بطور انعام تین لاکھ درہم دیے اپنی لڑکی کو مروارید کے دو دانے ایسے دیے جن کی قیمت جوہریوں اور تاجروں کے اندازے سے بھی زیادہ تھی دوسری لڑکی کو یعقوت وبیش قیمت جواہر سے جڑی ہوئی سونے کی انگیٹھی دی اور بیت المال کا کثیر روپیہ اپنی عمارتوں کی تعمیر باغات اراضی اور کھیتوں کی درستگی میں صرف کیا۔

عبید اللہ بن ارقم اور معیقیب دوسی نے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد سے داروغہ بیت المال کی خدمت پر مامور تھے یہ حالت دیکھ کر اپنی خدمت سے استعفی دے دیا اور اس خدمت سے سبکدوشی حاصل کر لی تو مجبور ہو کر یہ خدمت جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے سپرد کی ایک روز تقسیم اموال بیت المال کے بعد ایک لاکھ روپیہ کی بقایہ رقم جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بخش دی ظاہر ہے جب اپنے مال کو مسرفانہ طور پر خرچ کرنا بیجا فضول اڑانا شریعت کے لحاظ سے قابل ملامت ہے تو مسلمانوں کے اموال کو اس طرح فضول خرچیوں میں اڑانا کیوں نا قابل ملامت اور لائق مذمت ہو گا؟

جواب: یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی داد ودہش اور بخشش وعطا کو بیت المال سے بتانا اور پھر اس کی بنا پر آپ پر اعتراض کرنا سراسر افتراء بہتان اور صریح جھوٹ ہے آپ کا لقب غنی خلافت کا مرہون تو نہیں تھا آپ کی ثروت اور دولت مندی تو حصول خلافت سے پہلے سے چلی آ رہی تھی (لشکر اسلام کی مدد قحط کے وقت اہل مدینہ کے لیے آپ کا ایثار وامداد کون جھٹلا سکتا ہے اس کے علاوہ ہر ضرورت کے وقت آپ کی بیش از بیش داد ودہش کے واقعات سے معمور اسلامی تاریخ سے کون آنکھیں بند کر سکتا ہے) خصوصا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی

خلافت مبارکہ کے آخری دور میں جب فتوحات کثرت سے ہوئیں بے اندازہ غنائم حاصل ہوئے ہر سمت سے دولت کے انبار در انبار سمت سمت کر مدینہ منورہ آنے لگے اور ان سے حصہ پاکر نبی محتشم ﷺ کے جانثار اور چے رفیقوں رضی اللہ عنہم کے حالات بدل گئے آپ ﷺ کے بعض دور رفقاء اور صحابی جو کبھی نان شبینہ کی صبر ورضا کے ساتھ حالت گزار چکے تھے اسی اسی ہزار کے حصوں کے مالک قرار پائے (اور خود عالی جناب علی مرتضی رضی اللہ عنہ جو وہ دور بھی گزار چکے تھے کہ اہل وعیال کو فاقہ کی حالت میں دیکھ کر خود سرور عالم ﷺ نے کچھ درہم عنایت فرمائے تھے کہ ان سے بچوں کے لیے کھانا لے آئیں) حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اس دور میں وسعت وفراخی حاصل ہوئی بہتوں نے عمارتیں کھڑی کر لیں، باغات اور اراضیات خرید لیے اور جائیدادیں بنا لیں اس وقت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تاجر تو تھے ہی اس وقت ان کی تجارت کو اور بھی فروخت حاصل ہوا اور دولت وثروت میں بھی خوب اضافہ ہوا پھر آپ نہ تنگ دل صاحب دولت تھے اور نہ ہی آپ کا ہاتھ رکا ہوا تھا اپنے اور پرائے سب آپ کی داد ودہش سے فیض یاب ہوتے تھے آپ کے لطف وعنایت اپنے قبیلوں پر ہی نہ تھی آپ غلاموں یتیموں بیواؤں پر ہمیشہ اپنا مال ودولت لوٹاتے رہے اور صدقہ وخیرات کا کوئی راستہ کوئی موقع آپ کے ہاتھ سے نہ نکل پاتا آپ کا یہ معمول زبان زید خلائق ہے کہ آپ معمولاً ہر جمعہ ایک غلام خرید کر آزاد کیا کرتے تھے اور انصار ومہاجرین رضی اللہ عنہم کی روزانہ دعوت بھی آپ کے معمول میں شامل تھی جس میں پر تکلف کھانا کھلاتے تھے اس سلسلہ میں جناب حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ملاحظہ کیجئے:

شهدت مناديا ينادي: يا أيها الناس، اغدوا على أعطياتكم، فيغدون، ويأخذونها وافية يا أيها الناس، اغدوا على أرزاقكم فيأخذونها وافية، حتى والله سمعته أذناي يقول: اغدوا على كسواتكم، فيأخذون الحلل[1] واغدوا على السمن والعسل وقال الحسن وارزاق دارة وخير كثير

میں گواہ ہوں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی طرف سے صبح کے وقت یہ اعلان بذریعہ منادی کرا

1۔ الاستیعاب في معرفة الأصحاب،3/ 1041، ط: دار الجیل، بیروت

لیا جاتا کہ حضرات آیئے اور اپنے عطایا لے جایئے آیئے اپنی خوراک لے جایئے اور لوگ آتے تھے اور خوب لے جاتے تھے اور میرے کانوں نے یہ اعلان بھی سنا کہ آؤ اپنے لیے لباس لے جاؤ اور لوگ اپنی پوشاکیں حاصل کرتے اور اسی کے ساتھ گھی وشہد کے ناشتہ سے بھی لطف اندوز ہوتے حسن رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ خوراک وافر بھی ہوتی اور بہت عمدہ بھی ابو عمر نے یہ روایت استعاب میں کی ہے۔

آپ کی داد و دہش اور جود و سخا کا جو اندازہ لگانا چاہے تاریخ کا مطالعہ کر کے لگا سکتا ہے، اللہ کے لیے اللہ کے راستے میں خرچ کو کسی نے اسراف نہیں بتایا خود حدیث کی روح سے بھلائی میں خرچ کرنا اسراف نہیں "لا اسراف فی الخیر" اور اعزہ واقارب پر خرچ کرنا تو دگنے اجر کا موجب ہوتا ہے حدیث صحیح میں ہے کہ مسکین پر صدقہ صرف صدقہ ہے اور خویش واقارب پر صدقہ دو بھلائیاں رکھتا ہے ایک صدقہ اور دوسرا صلہ رحمی قرآن نے بھی اقارب کو دوسرے مصارف پر مقدم رکھا ہے:

وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ (1)

اور اس کی محبت پر مال دو اقربا کو یتامیٰ مساکین اور مسافروں کو۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے سالم بن جاد سے روایت بیان کی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کو جن میں جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بھی تھے اپنے پاس بلایا اور ان کو قسم دے کر پوچھا کہ سچ کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بخشش و عطیہ میں قریش کو دوسرے لوگوں پر مقدم خیال فرماتے تھے اور اسی طرح بنی ہاشم کو قریش پر اس پر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے سکوت کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر جنت کی کنجیاں میرے ہاتھ میں دے دی جائیں تو میں وہ بنی ہاشم کو دے دوں تا کہ ان میں سے کوئی باہر نہ رہ جائے بلکہ وہ سب سے پہلے جنت میں داخل ہو جائیں (2)

1۔ سورۃ البقرۃ، الایۃ :177

2۔ عن سالم بن جعد قال: دعا عثمان ناسا من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فيهم عمار بن ياسر، فقال: اني سائلكم، انشدكم الله، هل تعلمون ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يؤثر قريشا على سائر الناس، ويؤثر بني

لیکن ان تمام مصارف کو بیت المال سے سمجھنا بڑا تعصب اور عناد ہے خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے اس سلسلہ میں جب سوال کیا تو آپ نے فرمایا خلافت سے پہلے میرے پاس جتنی دولت تھی تم کو خوب معلوم ہے اور میری داد و دہش اور بخشش و عطایہ کی جو کیفیت ہے وہ بھی تم سب جانتے ہو یہ جانتے بوجھتے یہ بے جا شبہات اور عدل و تقوی کے خلاف گمان میرے بارے میں کیوں کرتے ہو۔

اب رہی وہ باتیں جن کا ذکر اس قصہ کے شروع میں آیا ہے یہ نقل دروغ ہے اور ان سے قصہ میں گڑبڑ پیدا کی گئی ہے بات کچھ اور ہے رنگ اس کو دوسرا دے دیا گیا ہے بیت المال کا نام اپنے جھوٹ میں زور پیدا کرنے کے لیے دے دیا ہے حالانکہ کسی روایت میں اس کا ذکر نہیں اور اصل قصہ بھی اتنا ہے کہ جناب غنی شہید رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کا نکاح حارث بن حکم کی بیٹی سے کیا اور ان کو اپنی ذاتی دولت میں سے بہو کی رونمائی کہہ لو یا اس وقت کا کوئی رواج ایک لاکھ روپیہ ان کو بھجوایا اور اپنی بیٹی ام رومان کو مروان بن حکم کے نکاح میں دیا، تو اس کو بھی ایک لاکھ روپیہ دیا اور یہ سب کچھ اپنے ذاتی مال و دولت سے دیا، بیت المال کا کوئی سوال ہی نہیں تھا اور نیت وہی صلہ رحمی اور خویش پن پر مبنی تھی جو حکم شرع کے ساتھ ساتھ مقبول و پسندیدہ عوام و خواص فعل تھا۔

اور مروان کو افریقہ کے خمس کی بخشش کی داستان بھی جھوٹی اور سراسر افترا ہے اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں پیادوں و سواروں کا ایک لاکھ کا لشکر دیار مغرب کی فتح کے لیے روانہ کیا جب وہ مغرب کے پایا تخت شہر افریقہ کے قریب پہنچا تو میدان کارزار وہیں جم مسلمانوں نے انتہائی جدوجہد اور کوشش سے وہاں فتح حاصل کی عرب حد و حساب مال غنیمت ہاتھ آیا جناب عبد اللہ مذکور رضی اللہ عنہ نے نقد رکوع کا خمس نکالا جو رواجی سکہ کے مطابق پانچ لاکھ دینار بنتا تھا اور یہ رقم دار اور خلافہ کو روانہ کی نقود کے علاوہ اسباب و مویشی کی صورت میں جو مال غنیمت تھا وہ مدینہ سے دور دراز کی مسافت باربرداری ناکافی ہونے اور اس پر اخراجات کے بار کی وجہ سے دار الخلافہ بھیجنے کی کوئی صورت نہ تھی اس وقت کے حالات اور سواری وغیرہ کی کیفیت کے ساتھ طویل مسافت کا جو کئی ماہ میں قطع ہوتی تھی تصور کیجئے اور پھر

هاشم على سائر قريش؟ فسكتوا. فقال عثمان: لو ان مفاتيح الجنة بيدي لدفعتها الى بني هاشم حتى يدخلوا من عند آخرهم.(فضائل الصحابة، 2/ 747، رقم : 1275، ط: مؤسسة الرسالة، بيروت)

سوچئے کہ امیر لشکر نے ان مشکلات اور دشواریوں کے مد نظر اس اسباب و مویشی کو فروخت کرنے کا کتنا مناسب فیصلہ کیا چنانچہ وہ اسباب غنیمت جو بیت المال کے خمس میں کا تھا امیر لشکر نے مروان کو ایک لاکھ درہم میں فروخت کر دیا مروان نے ایک لاکھ میں سے زیادہ رقم نقد ادا کر دی جو نقدی میں شامل کر کے مدینہ منورہ روانہ کر دی گئی اور بقایہ کے متعلق جناب عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے یہ وعدہ وعید ہوئے کہ وہ مدینہ پہنچ کر ادا کروں گا اور خلیفہ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔

ادھر اہل مدینہ کو بڑی گھبراہٹ اور سخت پریشانی تھی کہ کسی کا کوئی نہ کوئی رشتہ دار اس جہاد میں شریک تھا جو کالے کوسوں پرانے دشمن کی سرزمین پر برپا تھا سب کو اندازہ تھا کہ بڑی سخت لڑائی ہوگی مسافت بھی بڑی دور دراز کی ہے راستے اور سڑکیں بند ہیں نہ کوئی خبر نہ کسی کی اطلاع مجملاً خبر ملی بھی تو اتنی کہ دشمن بہت زیادہ بھی ہے اور قوی و طاقتور بھی، بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی ہے اور بہت آدمی شہید ہوئے ہیں ایسی ادھوری و نامکمل اور حوصلہ شکن خبر سے ہر ایک فکر مند پراگندہ حواس اور پریشان تھا ایسے پریشان عالم میں مروان کی آمد سے جو اموال غنیمت سے لدا پھدا تھا جو فتح کی خوشخبری کے ساتھ لشکریوں کے خطوط پیغامات اور تفصیلی خبریں لایا تھا اہل مدینہ کے لیے مژدہ جاں فضا تھا گھر گھر فتح کی خبر امن و سکون بن کر پہنچی اور سب کے لیے خوشی و مسرت اور فرحت و شادمانی کا سامان مہیا ہوا تاریخ کا اگر کوئی مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس دن اہل مدینہ نے مروان کو کس نیک اور بہترین دعاؤں سے یاد نہ کیا اور تعریف و تحسین کا کون سا پہلو تھا جس سے دریغ کیا بے انتہا دلی دعاؤں کا تحفہ اسے دیا گیا اور بہت تعریف و توصیف ہوئی اور اس وقت تک اس سے قابل شکایت کوئی بات سرزد بھی نہ ہوئی تھی کہ ان تمام باتوں پر اس کی وجہ سے پانی پھر جاتا لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس بشارت کے صلہ میں اور امانت داری اور دیانت سے اس اہم خدمت انجام دینے میں کہ اتنی دور دراز کی مسافت اور پرخطر راستوں اور طرح طرح کی مشقت برداشت کر کے مسلمانوں کی امانت بخیر و خوبی پہنچائی اور اہل مدینہ کو فرحت و شادمانی نصیب ہوئی اس باب میں کی بقایہ رقم کی ادائیگی اس کو معاف کر دی امام و خلیفہ وقت کو یہ اور اختیار ہے کہ بشارت دہندہ ملک و ملت کے لیے جاسوسی کی خدمت انجام دینے والوں اور مسلمانوں کے لیے خوشخبریاں لانے والے کو بیت المال سے انعامات دے اور پھر یہ کام بھی آپ نے تنہائی یا پوشیدہ طور پر نہیں

صحابہ کی موجودگی اور اہل مدینہ کی رضامندی سے کیا تو اب اعتراض وطعن کی اس میں کون سی بات ہے۔

یہاں اسراف کے معاملے میں ایک علمی لطیف نقطہ قابل غور ہے کہ انعام وعطیہ داد و دہش کیے جانے والی رکوم واموال کا استعمال سے جس سے یہ دیا جارہا ہے تناسب دیکھا جائے اور اسی کے مطابق حکم لگایا جائے مثلاً اگر ایک لاکھ روپیہ میں سے ایک روپیہ یا سو روپیہ یا ہزار روپیہ عطیہ دے دے تو وہ اسراف نہیں کہا جاسکتا اس لیے کہ ایک لاکھ سے ایک ہزار کی ایسی ہی نسبت ہے جیسے دس کی ایک ہزار سے اور تمام عقلی وحسی امور میں تناسب کی رعایت عقل کے مقتضی کے بھی مطابق ہے اور شرع کے بھی مثلاً کسی دوا میں جو دو جز گرم ہوں اور سو جز ٹھنڈے ہوں تو اس دوا کو سخت گرم ہر گز نہیں کہیں گے یہی معاملہ شرع کا ہے کہ اگر کسی جگہ ومقام کا خرچ ایک لاکھ روپیہ ہو اور وہاں سے پچاس ہزار وصول کیا جائے تو اس معاملہ کو عدل ہی کہا جائے گا ظلم وزیادتی اس کا نام رکھنا حکم شرع کے خلاف ہو گا اسی قیاس پر مقدار زکوۃ اور دیگر شرعی اندازوں اور غنیمتوں کی تقسیم میں تناسب کا لحاظ رکھا گیا ہے اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ بڑی رقم میں سے چند ٹکے نکال لینے یا بچ رہنے کو معمولی اور حقیر شے قرار دے کر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے (آج بھی اس کا امتحان کیا جاسکتا ہے اس طرح کے اگر ایک آدمی کا ایک سو روپیہ اور ایک روپیہ والا نوٹ گر جائے اور تلاش کے وقت سو والا مل جائے ایک والا نہ ملے تو وہ کہے گا جانے دو ایک سو کا تو مل گیا روپیہ والا نہیں ملتا تو نہ ملے یہاں اگر اس کی نظر میں تناسب کی اہمیت نہ ہوتی تو بنیے کی طرح حساب کی دمڑی تلاش کرنے کے لیے روپیہ کا تیل پھونکنے کی مثال یہ بھی قائم کر دیتا ہے کہ روپیہ کے نوٹ کے لیے ہلکان ہو جاتا جیسا اگر سو کا نہ ملتا تو ہوتا)

لہٰذا اب اگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی کی داد و دہش کو دیکھا جائے تو زمانہ خلافت کی وہ داد وداش جس پر طعن واعتراض کیے جاتا ہے اتنی حقیر معلوم ہو گی جیسے سوئی کے ناکہ پر پانی کی تری، اس لیے اگر بیت المال سے بفرض محال اس خرچ کو تسلیم کر لیا جائے تب بھی اسے اصراف نہیں کہا جاسکتا کروڑوں روپیہ پوری فراخ دلی سے راہ خدا میں بطیب خاطر لٹانے والے نے بیت المال سے چند لاکھ کی بخشش کر دی تو قاعدہ مذکورہ بالا کی روح سے یہ اسراف اور قابل اعتراض بات نہیں ہاں اگر ان مصارف کو ان کے مجموعی مصارف کے تناسب سے ہٹ کر دیکھیں تو اسراف کہا جاسکتا ہے لیکن اوپر معلوم ہو چکا کہ عقلی، حسی اور شرعی امور میں

تناسب کو نظر انداز کر کے افراط و تفریط کا حکم نہیں لگایا جا سکتا اگر کوئی لگائے تو وہ مردود ہے نا مقبول ہوگا اس لیے اس معاملہ میں حضرت غنی رضی اللہ عنہ پر اسراف کا الزام مردود اور نا قابل تسلیم ہے۔

اور عبداللہ بن خالد بن اسد کو تین لاکھ درہم دینے کا جو یہ لوگ کہتے ہیں تو شیعوں کا حال تو تقریباً ہر معاملہ میں "کاتا اور لے بھاگی" کا سا ہے ان کے لیے اتنا کافی ہے کہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا عہد اور تین لاکھ کی رقم بس نتیجہ نکالنے میں ان کو کیا دیر کہ لو جی فلاں کو عثمان رضی اللہ عنہ نے بیت المال کے تین لاکھ درہم دے ڈالے صحیح معاملہ کی کھوج سے انہیں کیا چڑھے، افتراء اور جھوٹ ان کے لیے شیر مادر ہے اس لیے یہ جو کہتے ہیں عموماً جھوٹ نکلتا ہے اور یہاں بھی وہ جھوٹ ہے صحیح بات یہ ہے کہ وہ قرضہ تھا جو باقاعدہ تحریر کے بعد ان کو دیا گیا تھا اہل مصر کے محاصرہ کے وقت یہی بات حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمائی بھی تھی اور عبداللہ رضی اللہ عنہ نے وہ روپیہ بیت المال کو ادا بھی کر دیا تھا۔

اسی طرح حارث بن حکم کے بازاروں کا عشر، چونگی وغیرہ کے سلسلہ میں جو کہا ہے وہ سب غلط ہے اس سلسلہ میں کوئی عطاو بخشش نہیں کی گئی بات صرف اتنی تھی کہ حارث کو ملازم رکھا گیا اور محتسبوں کی طرح اس کی یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ بازار کا گشت لگائے بھاؤ تاؤ کی دیکھ بھال رکھے لوٹ کھسوٹ ظلم و زیادتی نہ ہونے دے تول جوکھ کے ترازو، بٹوں کی جانچ رکھے ملازمت کو دو تین دن ہی ہوئے تھے کہ اہل شہر کی طرف سے شکایت ہوئی کہ اس نے بازار کی ساری کھجور کی گٹھلیاں خود خرید لیں دوسرے گاہکوں کو خریدنے کا موقع ہی نہیں دیا اور یوں دوسروں کے اونٹ بے چارہ رہ گئے کیونکہ یہ ان کے خوراک تھی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس کو ڈانٹ ڈپٹ کی اور نوکری سے اسی وقت برخواست کر کے اہل شہر کی شکایت کا برمحل ازالہ کر کے ان کی تسلی خاطر کی اس میں طعن و عیب کی کیا بات ہے یہ تو ان کا قابل تحسین اور لائق تعریف کارنامہ اور مبنی بر انصاف عمل ہے کہ قریبی رشتہ دار کے باوجود محض شکایت سنتے ہی اس کے خلاف کاروائی کر ڈالی۔

اسی طرح ارقم بن معیقیب دوسی کے استعفیٰ کا معاملہ ہے کہ اس میں بھی دھوکہ دھڑی سے کام لیا حقیقت کے بجائے اپنی طرف سے من گھڑت افسانہ تراش لیا صحیح بات یہ تھی کہ انہوں نے کبر سنی اور ضعف کے سبب اس محنت و مشقت طلب خدمت کی کماحقہ ادائیگی سے معذور ہو جانے کے بنا پر استعفیٰ دے دیا تھا اور

ان کے استعفی کا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مجلس میں خطبہ کے دوران اعلان کیا اور فرمایا:

ألا إن عبد الله بن الأرقم لم يزل على جرايتكم زمن أبي بكر وعمر إلى اليوم وإنه كبر وضعف وقد ولينا عمله زيد بن ثابت.[1]

لوگو عبد اللہ بن ارقم جناب ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ سے آج تک تمہارے بیت المال کے خزانچی رہے ہیں اب وہ بوڑھے اور کمزور ہو گئے اس لیے ہم نے ان کا کام زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے حوالہ کر دیا ہے۔

اور بطور اعتراض انہوں نے جو یہ بات کی ہے کہ آپ کی امارات باغات اور کھیت سب بیت المال کے پیسے سے بنے تو یہ بھی ان کا افترا اور جھوٹ ہے حقیقت یہ ہے کہ روپیہ کمانے کا جوہر اللہ تعالی نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی فطرت میں ودیعت فرمایا تھا اور جو ڈھب آپ کو سکھایا تھا اس کے نظیر بعد میں بھی نہیں دیکھی گئی کہ حق حلال طریقہ پر انتہائی عزت و وقار کے ساتھ بلا تعب و مشقت کسی نے اس قدر مال و دولت کمایا ہو اپ رضی اللہ عنہ اپنی حلال کی کمائی کو اللہ تعالی کی خوشنودی کی خاطر اس قدر فراخ دستی اور انبساط قلبی سے خرچ کرتے تھے کہ مضمون حدیث "نعم المال الصالح مع الرجل الصالح"[2] پاک آدمی کی ملک میں پاک مال کی اچھائی کا کیا کہنا کا صحیح مصداق بن گئے تھے۔

عہد خلافت سے پہلے کمائی کے بہت سے طریقے اپ اختیار فرماتے رہے اور خلافت کے بعد یہ تدبیر اور تجویز ذہن میں ائی کہ آپ اپنے قلمرو میں عراق ہو یا حجاز جہاں بھی بنجر و ناکارہ زمین ملتی خرید لیتے اور پھر غلاموں اور ملازموں کو کھیتی باڑی کے سامنے ازار دے کر اس افتادہ زمین کو قابل کاشت بنانے پر لگا دیتے کہ زمین کو آباد کرو اور اس کی آمدنی سے اپنی گزر بسر کرو جب زمین درست ہو جاتی تو باغ لگواتے اس میں میوہ دار درخت لگاتے کنویں اور نہریں بنواتے غرض ہر طرح سے اسے زمین کی ابادی اور سرسبزی میں کوشاں رہتے اور یہی وجہ

1۔ الرياض النضرة في مناقب العشرة، في مقتله وما يتعلق به، 3/ 92، ط: الكتب العلمية

2۔ صحيح ابن حبان بترتيب ابن بلبان، ذكر الإباحة للرجل الذي يجمع المال من حله إذا قام بحقوقه فيه، 8/ 6، رقم: 3210، ط: مؤسسة الرسالة بيروت

ہے کہ عرب کی زمین جو قحط زدہ بنجر اور بے آب و گیاہ تھی آپ کے عہد خلافت میں اتنی آباد اور سرسبز و شاداب ہو
گئی تھی کہ بڑے بڑے پر فضا علاقوں کے نظیر کہلانے کے مستحق تھی جگہ جگہ چشمے جاری تھے باغات لہلہاتے تھے
پھلوں سے درخت لدے ہوئے تھے کھیتیاں سرسبز و شاداب ہر طرف ہریالی تھی گویا زمین نے سبز [illegible]
ہے پھر سوائے ظالم ملازمین وہاں آباد ہو جاتے اور بس جانے سے صحراؤں وادیوں اور جنگلات میں [illegible]
شکاری کا خطرہ جاتا رہا اور چوروں ڈاکوؤں کا ڈر اور خوف جاتا رہا کہ وہ آبادیوں کی وجہ سے نکل بھاگے۔ مسافروں کے لیے
راستے بے خطر اور پر امن ہو گئے تجارتی قافلے بے کھٹکے آنے جانے لگے، راستے میں ان کو قیام گاہیں اور جا بجا پانی کے
لیے چاہ کی سہولت میسر آنے لگی مختلف ملکوں اور شہروں سے تجارت کو فروغ ہوا۔ جس سامان اور ضروریات
بعض اشیاء کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے میں آسانی ہو گئی اور یہ دو امور امن و خوشحالی آپ کی
وراثت آپ ﷺ کی عہد سعادت مہد میں نصیب ہوئے جو عرب میں عجائبات اور خرق عادات میں شمار ہوتے
تھے حدیث شریف میں ایک پیشین گوئی بایں الفاظ کی گئی ہے:

لا تقوم الساعة حتى تعود أرض العرب مروجا وأنهارا[1]

جب تک عرب کی زمین مرغزار اور نہروں والی نہ بن جائے قیامت نہیں آئے گی۔

اور آپ ﷺ نے عدی بن حاتم طائی سے فرمایا:

ان طالت بك حياة لترين الظعينة تسافر من حيرة النعمان إلى الكعبة لا

تخاف احدا إلا الله[2]

اگر تمہاری عمر بڑی ہوئی تو تم دیکھو گے کہ ایک اونٹ سوار عورت مقام حیرة النعمان سے کعبہ

تک تنہا سفر کرے گی اور اس کے دل میں خدا کے ڈر کے سوا کسی کا ڈر نہ ہو گا۔

1۔ مسند الامام احمد بن حنبل، 14/ 427، رقم: 8833، ط: مؤسسة الرسالة

2۔ روى البيهقي: لا يأتي عليك قليل حتى تخرج المرأة من الحيرة إلى مكة بغير خفير (السنن الصغير للبيهقي۔ باب حج المرأة، 2/ 135، رقم: 1476، ط: جامعة الدراسات الإسلامية، كراتشي باكستان)

اور یہی نہیں بلکہ حدیث شریف میں عہد عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی صراحت کے ساتھ بطور اظہار مسرت یہ فرمایا گیا کہ عثمان کے زمانہ میں مال و دولت کی کثرت ہوگی خزانہ بہت ہوگا لوگوں میں دولت کی بدولت تکلفات کا رواج ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی اس خوش تدبیری کا یہ اثر ہوا کہ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہ صرف اسے پسند کیا بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ہوئے من جملہ ان کے ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ہیں کہ آپ نے سواد ینبع، فدک، زہرا اور دوسرے گاؤں میں اسی ترکیب کو استعمال فرمایا اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے غافہ اور اس کے گرد و نواح میں اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ذی خشب اور جرف میں اسی تدبیر کو اختیار کیا اسی طرح دیگر اصحاب کرام رضی اللہ عنہم نے بھی جہاں جہاں موقع ملا ایسا ہی کیا چنانچہ مدینہ منورہ کے گرد نواح خوب سرسبز و شاداب اور آباد ہوگئے اگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا یہ عرصہ خلافت کچھ اور دراز ہو جاتا تو پورے حجاز کی سرزمین لالہ زار اور باغ و بہار ہوتی۔

اور جس طرح امام کی اجازت سے ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ استادہ و بنجر غیر مملوک کا زمین کو اپنے خرچ و محنت سے کار آمد و آباد کر سکتا ہے تو امام و خلیفہ کو اس حق سے محروم کرنے کا کیا جواب ہے اور اسے زمین کی کمائی خلیفہ کے لیے کیوں نہ حلال ہوگی اور کیوں اس کا تصرف ناجائز ہوگا صریح روایات اور تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ افتادہ و بنجر زمین میں کاشت کرتے غیر آباد کو آباد کراتے باغات لگواتے کنویں کھدواتے اور نہریں جاری کراتے اور یہ سب کچھ اپنے ذاتی روپیہ پیسہ سے کراتے اور اس کا صلہ وصول کرتے اور آمدنی میں روز بروز اضافہ ہوتا اور آپ کے زمانہ میں اہل مدینہ میں کون ایسا تھا جو کھیتی باڑی نہ کرتا یا باغات نہ لگواتا ہو۔

اور بیت المال کے بقیہ کو جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو دے دینے کا واقعہ بھی سچ نما جھوٹ ہے صحیح روایت یہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے ایک بیت المال سے مستحقین میں رقم تقسیم فرمانے کا حکم دیا مستحقین میں سے کوئی باقی نہ رہا اور رقم میں ایک ہزار درہم باقی بچ رہے تو آپ نے وہ رقم جناب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے سپرد کی اور فرمایا کہ اپنی صوابدید کے مطابق مسلمانوں کی ضروریات میں صرف کردیں چنانچہ انہوں نے یہ رقم مسجد نبوی کی مرمت و درستگی میں صرف فرمادی محب طبری نے اہل سنت کے گزشتہ واقعات کے ضمن میں اسے بیان کیا ہے۔

غرض بدگمانی کے مرض لاعلاج میں یہ بدگمان و متعصب لوگ اتنے آگے نکل گئے ہیں کہ جہاں کہیں

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا ذکر دیکھتے اور اس کے ساتھ آپ کی بے دھڑک اور فراخ دلانہ بخشش وعطا کا حال سنتے ہیں، تعمیر مساجد مقامات مقدسہ یا مسلمانوں پر دولت لٹانے کا اقربا کے امداد کا واقعہ پڑھتے ہیں تو آنکھ بند کرکے الزام لگا بیٹھتے ہیں کہ آپ نے یہ سب کچھ بیت المال کی رقم سے کیا اور یوں مسلمانوں کی رقم ضائع کرکے ان کی حق تلفی کی ہے اس خود ساختہ بدگمانی اور تعصب ونادانی کا تو کوئی علاج نہیں ان کی مثال تو لشکر درانی کے ان فوجیوں کی سی ہے کہ جب احمد شاہ ابدالی کے دور میں وہ دلی میں گھسے اور لوگوں کے مال واسباب کو اپنے تصرف میں لائے تو جب وہ شہر میں گھومتے اور سنہری مسجد اور منقش عمارتیں، سرائیں، مدارس وغیرہ دیکھتے تو بہت افسوس کرتے حتی کہ بعض تو روتے بھی اور سبب پوچھنے پر کہتے کہ ہمیں اس کا صدمہ ہے کہ ہمارے بادشاہ کے اموال کو کس بے دردی سے ضائع کیا گیا ہے اگر یہ ساری دولت سنبھال کر رکھی جاتی تو آج ہمارے بادشاہ کے کام آتی۔

طعن نمبر 4: کئی صحابہ رضی اللہ عنہم کو عہدوں سے معزول کیا گیا

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ آپ نے اپنے دور خلافت میں کئی صحابہ کو اپنے عہدے سے معزول کیا مثلاً جناب ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کو بصرہ کی عمارت سے معزول کرکے آپ کی جگہ عبد اللہ بن عامر بن کریز کو متعین کیا،(1) عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو مصر سے ہٹایا اور ان کی جگہ عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا،(2) حالانکہ یہ وہ ہیں جو مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملے تھے اور جن کا خون حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال کر دیا تھا اور فتح مکہ کے دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور پرزور سفارش کرکے ان کی خطا معاف کرائی پھر یہ دوبارہ اسلام میں داخل ہوئے جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو کوفہ کی ولایت سے معزول کیا(3) نیز جناب مغیرہ بن شعبہ کو بھی

1۔ والسبب شكاية أهل البصرة من أبي موسى، فذهبوا إلى عثمان رضي الله عنه وطلبوا أن يعزله. تاريخ الطبري: 2/ 604.

2۔ قال الطبري في حوادث سنة 27هـ: «لما ولي عثمان رضي الله عنه أقر عمرو بن العاص على عمله وكان لا يعزل أحدا إلا عن شكاة أو استعفاء شكاة»، ثم جاء أهل مصر يشكون عمرو بن العاص لعثمان، فعزله وولى مكانه سعد بن عبد الله. تاريخ الطبري: 2/ 597.

3۔ عزل عمار بن ياسر كان في خلافة عمر بن الخطاب سنة 22هـ كما ذكر الطبري وغيره .. ولما ولي علي لم يول عمارا الكوفة بل أقر أبا موسى، مما يدل على صحة العزل، وقد ذكر أنه غير عالم بالسياسة. تاريخ الطبري 2/ 544.

کوفہ سے ہٹایا، اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کوفہ کی قضا لے لی اور خزانوں کا داروغگی سے علیحدہ کیا۔[1]

جواب: اس طعن کا بے محل ہونا ہر سمجھدار پر واضح ہے کہ اگر ائمہ و خلفاء کو کسی ماتحت کے عزل و نصب کا اختیار نہ ہو تو پھر اس کی کیا عزت اور وقار رہے گا یہ ان کے اختیاری امور میں سے ہے جس کو چاہے مقرر کریں جس کو چاہے معزول کریں نہ ان پر یہ لازم ہے نہ یہ اس کے پابند ہیں کہ سابقہ اعمال ہی کو برقرار رکھیں ہاں اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ بلا قصور بلاوجہ معزول نہ کریں اور وجہ و سبب ذاتی کمزوری ہی نہیں مملکت کے مفاد اور انتظامی و سیاسی معاملات بھی ہو سکتے ہیں۔

اور ان حضرات کی معزولی بھی بلا سبب نہیں تھی ان کے اسباب تھے جن کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے جس کو دیکھنے ہی سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے حسن تدبیر کا پتہ چلتا ہے فی الحقیقت ان حضرات کی علیحدگی اور دوسرے حضرات کا ان کی جگہ تقرر انتظام و استحکام مملکت کے ساتھ دوسرے شہروں کے فتح کا سبب بھی بنا اور خلافت کی شان کچھ سے کچھ ہو گئی لشکر و افواج میں اس قدر اضافہ ہوا ولایت و مملکت کا دائرہ اس قدر کشادہ ہوا اور قلم رو اسلامی کا حلقہ اس قدر وسیع تر ہوا کہ قیصر و کسریٰ کی نسلوں نے خواب و خیال میں بھی نہیں دیکھا تھا اسلامی مملکت کا طول اگر اندلس سے قابل تک تھا تو عرض قسطنطنیہ سے عدن تک پھیلا ہوا تھا قاتلین عثمان دس بارہ سال صبر و چین سے اور بیٹھے رہتے تو ان کو ایران و خراسان کی طرح ہند و سندھ ترک و چین میں بھی علی علی کے نعرے لگانے کو مل جاتے ان بدبختوں کو یہ سوچنے کی بھی توفیق نہ ہوئی کہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کے ہاتھوں سے کام چھین کر گو بنو امیہ کو مسلط کیا مگر نام تو محمد و آل محمد کا بالا ہو رہا ہے، عبد اللہ بن عامر کریز کے طفیل ہی یہ مشہد شیراز نیشاپور و ہرات میں یا علی کا نعرہ لگانے کے قابل ہوئے اس لیے کہ خراسان اسی نے فتح کیا تھا اور بنو امیہ کی ترک و چین، ہند و سیند تک نارسائی ہی نے اس علاقے کے لوگوں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کے آوازے سے محروم رکھا اور وہاں کوئی بھی نہ جان سکا کہ علی رضی اللہ عنہ کون تھے ذیل میں ہم مجبوراً عزل و نصب

1۔ ذكر ابن حجر عن زيد بن وهب قال: «لما بعث عثمان إلى ابن مسعود يأمره بالقدوم إلى المدينة اجتمع الناس فقالوا أقم ونحن نمنعك أن يصل إليك شيء تكرهه، فقال: إن له علي حق الطاعة ولا أحب أن، أكون أول من فتح باب الفتن». الإصابة: 4/ 235.

کے اسباب کا اجمالی ذکر کرتے ہیں اور حوالہ میں شیعوں ہی کے معتبر مؤرخین ابن قتیبہ اور ابن اعثم وغیرہ کرتے ہیں تاکہ انہیں کچھ تو لاج آئے۔

حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کی علیحدگی اگر عمل میں نہ آتی تو سخت خلفشار اور فتنہ کا اندیشہ تھا جو اگر پھوٹ پڑتا تو ناقابل اعتدارک ہوتا کوفہ اور بصرہ دونوں تباہ ہو جاتے کیونکہ دونوں شہر کے لشکریوں میں سخت اختلاف و نفاق رونما ہو چکا تھا اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد ہی میں جناب ابو موسی رضی اللہ عنہ بصرہ کے گورنر تھے ان کی حدود فارس سے ملتی تھی جس کے زمیندار خاصے طاقتور تھے ان سے مقابلہ کے لیے آپ نے خلافت سے امداد شاہی چنانچہ پیشگاہ خلافت کی طرف سے کوفہ کے لشکر کو ان کی مدد و اعانت کے لیے مقرر کیا وہ کوفی لشکر ابھی بصرہ نہیں پہنچا تھا کہ راستہ میں رامہرمز سے لڑنے کی نوبت آگئی یہ فارس و اہواز کے درمیان ایک بڑا شہر تھا یہ لشکر ادھر مڑ گیا لڑائی ہوئی اسلامی لشکر کو نمایاں فتح حاصل ہوئی شہر بھی قبضہ میں آیا قلعہ بھی سرنگوں ہوا بے شمار مال و دولت لونڈی غلام ہاتھ آئے اس سے پہلے بصرہ کے لشکر بھی اس سے نبرد آزما ہوتے رہے تھے اس بنا پر جناب ابو موسی رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ مال غنیمت تنہا کوفی لشکر میں تقسیم نہ ہو بلکہ بصری لشکر کو بھی اس سے حصہ ملے اس لیے انہوں نے کوفی لشکر کو کہا کہ جن لوگوں سے تم لڑے جن کے مکانات تم نے تباہ و برباد کئے ان کو تو میں امان دے چکا تھا اور چھ ماہ کی مہلت ان کو دے چکا تھا اور تم کو تو میں نے صرف ڈرانے دھمکانے اور رعب ڈالنے کے لیے ملایا تھا تم تو ایک دم ان پر ٹوٹ پڑے اور جلد بازی سے کام لے لیا مگر کوفی لشکر نے بصری لشکر کو غنیمت میں شریک کرنے سے انکار کیا اور کہا یہ امان دینے کا قصہ افتراء اور جھوٹ ہے باہم رد و قدح نے شدت اختیار کر لی اور دونوں لشکروں میں جھگڑے کی بنیاد پڑ گئی جب اس قصہ کی خبر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ہوئی تو آپ رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے شریک کے لشکر بزرگ و محترم صحابہ مثلاً حذیفہ بن یمان، براء بن عازب اور عمران بن حصین، انس بن مالک اور سعید بن عمر انصاری رضی اللہ عنہم اس معاملہ کی تحقیق و تفتیش کریں اور یہ دیکھیں کہ ابو موسی رضی اللہ عنہ کی قسم کا کیا معاملہ ہے میں انہی حضرات کی تحقیق و تفتیش کے لحاظ سے اپنا فیصلہ دے دوں گا جناب ابو موسی رضی اللہ عنہ نے ان سب حضرات کے سامنے قسم کھائی تو خلافت کا حکم صادر ہوا کہ مال اور قیدی سب واپس کر دیے جائیں اور مدت معینہ امان تک ان کو بالکل نہ چھیڑا جائے۔

یہ فیصلہ کوفی لشکر کو ناگوار ہوا اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے ناراض ہو گئے کوفی لشکر کی ایک جماعت خلیفہ کے ہاں پہنچی اور اعتراض کیا کہ اگر واقعی امان دی گئی ہوتی تو بصرہ کے لشکریوں کو تو اس کے اطلاع ہوتی اور اگر ان میں یہ بات مشہور و معروف ہوتی حالانکہ لشکر میں کسی کو بھی اس کا پتہ نہیں اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے جھوٹی قسم کھائی ہے جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور قسم کے بارے میں ان سے استفسار کیا اس وقت بھی انہوں نے قسم کھا کر یہی کہا کہ میں نے سچی قسم کھائی ہے اس پر آپ نے فرمایا اگر معاملہ یوں تھا تو پھر ان لشکروں کو ان پر کیوں چڑھایا کہ انہوں نے وہاں جا کر یہ سب کچھ کیا قسم آپ کی اگر جھوٹی نہیں بھی ہے تب بھی ملکداری کے مصلحت کے خلاف یہ آپ کی بہت بڑی غلطی ہے سر دست میرے پاس کوئی مناسب آدمی نہیں کہ آپ کی جگہ مقرر کر دوں فی الحال آپ بصرہ جائیں صوبہ داری اور لشکر کی سرداری سنبھالیں جب مجھے کوئی کام کا آدمی مل گیا تو آپ کو معزول کر دوں گا رہا آپ کی قسم کا معاملہ سو وہ خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

اسی دوران آپ شہید کر دیے گئے اور امور خلافت کے والی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہوئے ادھر بصری لشکریوں نے بھی شکایتوں کی بھرمار کر دی داد و دہش میں کنجوسی کی شکایات دربار خلافت میں پہنچائیں کوفی لشکر پہلے ہی ان سے کبیدہ خاطر تھا ان حالات کو سامنے رکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غور کیا کہ اگر ان کو تبدیل نہ کیا گیا تو دونوں لشکر برافروختہ ہوں گے اور فرائض منصبی بد دلی سے انجام دیں گے، اور نتیجہ دونوں صوبوں کا حال ابتر ہو جائے گا لہذا مجبوراً ان کو وہاں سے ہٹا کر ان کی جگہ عبداللہ بن عامر بن کریز رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا جو برگزیدہ قریشی جوان تھے اور جب وہ بچے تھے تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعاب مبارک ان کے منہ میں ڈالا جوانی ہی میں جذبہ شہادت و نجات کے آثار سرداری وریاست کے علامات ان کے اقوال و اعمال و حرکات سے ہویدا تھے ان کا تقرر ان اطراف کے انتظام و انصرام اور دونوں لشکروں کی دل بستگی کے لیے واقعی بہت عمدہ اور کرامت ثابت ہوا۔

احمد بن ابی سیار نے تاریخ مرو میں روایت کی ہے کہ جب عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے خراسان فتح کیا تو اعلان کیا کہ میں اظہار تشکر میں یہاں اس جگہ سے احرام باندھ کر نکلوں گا چنانچہ وہ نیشاپور سے احرام باندھ کر نکلے سعید بن منصور نے بھی اپنی سنن میں ایسی ہی روایت بیان کی ہے۔

اور جناب عمر بن عاص رضی اللہ عنہ کا ازل اہل مصر کی بے شمار شکایات پر عمل میں آیا تھا عہد فاروقی میں بھی بعض امور کی وجہ سے معزول ہوئے مگر توبہ کر لینے پر بحال کر دیئے گئے تھے لیکن شیعوں کو توان دو حضرات کی معزولی کی بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرنا کچھ زیب نہیں دیتا اس لیے کہ یہ توان دونوں کو واجب القتل قرار دیتے ہیں انہیں تو حضرت شہید رضی اللہ عنہ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ایسے لوگوں کو انہوں نے معزول کیا جب وہ اسلام کے قابلیت ہی نہیں رکھتے تو اسلامی ریاست کا حق ان کو کیسے اور کیوں پہنچے اسی لیے بعض اہل سنت اس کو بطور لطیفہ یوں بیان کرتے ہیں کہ شیعوں کو تو یوں کہنا چاہیے تھا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کو معزول کرنے پر اکتفا کیوں فرمایا ان کو قتل کیوں نہیں کیا کہ تحکیم کے موقع پر امت کے حق میں بد اندیشی اور امام وقت کی شان میں بد سگالی کر ہی نہ پاتے۔

بعض خوش طبع حضرات نے اس کا جواب اس انداز سے دیا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تو یہ سمجھتے تھے کہ اگر میں ان دونوں کو ختم کر دوں تو پھر میری امامت ہر خاص وعام کے نزدیک ثابت اور مسلم ہو جائے گی اور چونکہ غیب کا علم امام کی خصوصیت ہے اس لیے شیعوں کو بھی انکار کا موقع نہ ہوگا مگر چونکہ آپ کے مزاج پر حیا و مروت غالب تھی اس لیے یہ سمجھ کر کہ اس میں شیعوں کے کھلم کھلا تکذیب ہوگی اور وہ بیچارے نادم و شرمندہ ہوں گے اس لیے ان کو صرف معزول کرنے پر اکتفا کیا اس پر اگر شیعہ یہ اعتراض کریں کہ جناب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ معزول کیے جانے کے لائق ہوتے تو حضرت علی کرم اللہ وجہ ان کو اپنی طرف سے ثالث کیوں مقرر کرتے تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے مجبوراً ان کو حکم بنایا راضی خوشی اور اختیاراً نہیں بنایا اور چلو یہ مان لیں کہ خوشی ہی سے بنایا تب بھی تو چوک ہوئی۔

فائدہ جلیلہ

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ شیخین رضی اللہ عنہما پر مطاعن اور اعتراضات سوائے شیعوں کے اور کوئی نہیں کرتا یہ مطاعن اہل سنت کی کتابوں میں شیعوں کی کتب سے ہی منقول ہوئے ہیں جو اکثر شیعی اصول پر منطبق ہوتے ہیں مگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر مطاعن باعتبار اکثر شیعہ اصولوں پر پورے نہیں اترتے، وجہ یہ ہے کہ آپ پر اعتراض کرنے والے شیعہ بھی ہیں اور خوارج بھی ہیں لہذا اعتراضات کی دو قسمیں ہو گئی ایک وہ جو

اصول شیعہ کے بموجب ہیں دوسرے خوارج کے اصول کے موافق اس لیے اہل سنت کی کتابوں میں دونوں اقسام ملا ملا کر کے بیان ہو جاتی ہیں اور شیعہ تو دانستہ کہ اعتراضات کی تعداد بہت معلوم ہو دونوں قسم کے اعتراضات تمیز و تفریق کے بغیر بیان کر جاتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ بعض اعتراضات جو شیعوں یا سنیوں کے کتب میں منقول و موجود ہیں وہ نہ اصول شیعہ کے مطابق ہیں نہ ان کے مذہب کے موافق چنانچہ جناب ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ پر اعتراض اسی نوع کا ہے اور حضرت عمرو بن عاص کی موقوفی پر اعتراض نہ اصول شیعہ پر منطبق ہوتا ہے نہ اصول خوارج پر اس لیے کہ یہ دونوں گروہ ان کی تکفیر کرتے ہیں اگرچہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو معزول کیا اس وقت ان سے کوئی قول و فعل موجب کفر سرزد نہیں ہوا تھا لیکن چونکہ آخر میں شیعوں اور خوارج کے نزدیک وہ کافر اور مرتد ہو گئے تھے اس لیے ایسی صورت میں تو ان کی موقوفی اور عزل حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی ایک کرامت سمجھی جانی چاہیے نہ کہ قابل اعتراض!

اور حضرت شہید رضی اللہ عنہ کی یہ بھی کرامت ہے کہ شیعہ آپ سے جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی موقوفی کی درخواست کرتے تھے آپ نے ان کو دکھایا کہ جناب عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو موقوف کر کے عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو ان کی جگہ مقرر فرمایا اگرچہ وہ ابتدائے اسلام میں مرتد ہو گئے تھے لیکن دوبارہ اسلام لانے کے بعد ان سے کوئی برا فعل سرزد نہیں ہوا بلکہ ان کی حسن و تدبیر اور نیک نیتی کے سبب مغرب کا پورا علاقہ فتح ہوا اور بے شمار خزانے دربار خلافت کو حاصل ہوئے حتی کہ مغربی جزائر پر بھی حملہ آور ہوئے اور غنائم حاصل کیے مورخین نے لکھا ہے کہ ان کے غنائم سے پچیس لاکھ دینار جمع ہوئے اور دیگر سامان زیورات اور مویشیوں وغیرہ کا تو کوئی حد و شمار نہ تھا اس کا پانچواں حصہ بیت المال کے لیے بھیجا جو مسلمانوں پر تقسیم ہوا اور باقی چار حصے اپنے لشکر میں شرعی طریقے پر تقسیم کیے ان کا لشکر میں بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم بھی تھے اور صحابہ کی اولادیں بھی وہ سب کے سب ان کی عادات و اطوار اور طرز عمل سے خوش تھے ان کے کسی طرز عمل پر ان کو کوئی اعتراض نہ تھا ان حضرات میں عقبہ بن عامر جہنی عبدالرحمن بن ابو بکر صدیق، عبداللہ بن عمرو بن عاص وغیرہ رضی اللہ عنہم تھے پھر جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا واقعہ شہادت پیش آیا تو خود کنارہ کش اور غیر جانب دار رہے کہتے تھے کہ ہم نے خدا سے عہد کیا ہے کہ کافروں سے جہاد و قتال کے بعد مسلمانوں سے قتال نہیں کریں گے آخر عمر تک عزلت گزین اور گوشہ نشین رہے۔

اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی موقوفی کی نسبت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف کرنا یہ سراسر خلاف واقعہ بات ہے ان کو تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کوفیوں کی شکایت پر موقوف کیا تھا اور ان کی موقوفی پر آپ نے یہ تاریخی کلمات فرمائے تھے:

من يعذرني من أهل الكوفة إن استعملت عليهم تقيا استضعفوه، وإن استعملت عليهم قويا فجروه.[1]

مجھے اہل کوفہ کے معاملہ میں کون معذور کہہ سکتا ہے اگر میں نے ان پر متقی عامل مقرر کیا تو اسے انہوں نے کمزور قرار دیا اور اگر کوئی قوی عامل ان پر مقرر کیا تو اس میں کیڑے نکالنے لگے۔

پھر ان کی جگہ جناب مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو حاکم مقرر کیا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب ان کو بھی رشوت ستانی سے متہم کیا جو سراسر جھوٹ اور افترا پردازی تھی مگر آپ نے رعایا کے پاس ایک خاطر کے سبب ان کو بھی موقوف کیا۔

اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کوفہ سے مدینہ کیوں بلایا اس کا حال بھی ان شاء اللہ آگے بیان کیا جائے گا اور ان سب باتوں سے قطع نظر خلیفہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ جس کو چاہے عامل مقرر کرے اور جس کو چاہے موقوف کر دے کسی کو اعتراض کا کیا حق اور طعن کی کیا مجال!

رہی یہ بات کہ صحابی کو موقوف کر کے غیر صحابی کو مقرر کرنا تو یہ واقعات تو خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں بھی وقوع میں آئے مثلاً حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کے ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب تھے جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں آپ کی طرف سے بحرین کے عامل تھے ان کو بلا وجہ و سبب اور بے قصور وہاں سے علیحدہ کیا اور اس کا اعتراف آپ رضی اللہ عنہ نے اس مراسلہ میں خود فرمایا جو ان کی معزولی کے سلسلہ میں ان کو لکھا گیا اور جس کی نقل بحوالہ نہج البلاغہ باب مطاعن ابو بکر رضی اللہ عنہ گزر چکی اور ان کی جگہ نعمان بن عجلان دورقی کو مقرر فرمایا جو نہ صحابی تھا نہ علم تقوی عدول و دیانت میں جناب عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کا عشر عشیر اسی

---

1 ۔ الرياض النضرة في مناقب العشرة، في مقتله وما يتعلق به، 3/ 89، ط: دار الكتب العلمية

طرح جناب قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علمبردار تھے اور خود صحابی و صحابی زادہ تھے جناب امیر رضی اللہ عنہ نے مصر کی گورنری سے معزول کر کے مالک اشتر کو ان کی جگہ مقرر فرمایا جو صحابی تو کیا صحابی زادہ بھی نہ تھا بلکہ فتنہ وفساد کی پوٹ تھا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اسی نے شہید کیا حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کو ورغلا کر بغاوت کا سبب بنا اور اس کو اس علم یقینی کے باوجود مصر کا عامل بنایا کہ جب وہ مصر پہنچے گا تو جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس کو برداشت نہ کریں گے اور وہ مصر پر چڑھائی کر دیں گے اور معاملات دگرگوں ہو جائیں گے۔

طعن نمبر 5: حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کا وظیفہ بند کر دیا

پانچواں اعتراض آپ رضی اللہ عنہ پر یہ ہے کہ جناب عبداللہ بن مسعود اور جناب ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کا عہد فاروقی سے جو سالانہ وظیفہ مقرر تھا اس کو بند کر دیا اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے ربذہ بدر کر دیا جناب عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو امر بالمعروف کے سبب ناراض ہوئے جناب عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو منافق کہا جناب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو اتنا مارا کہ آنت اترنے کی تکلیف لاحق ہو گئی کعب بن عبداللہ بہزی رضی اللہ عنہ کو کلمہ حق کہنے کی بنا پر اہانت و تحقیر کی، یہ لوگ جلیل القدر صحابہ تھے جن کے اہانت اہل سنت کے نزدیک انسان کی دیانت مجروح ہونے کا سبب ہوتی ہے تو جب اہل سنت کے نزدیک ان کے دیانت ہی برقرار نہ رہی تو ان کی امامت کیسے درست ہو گی۔

(روایت شیعہ کے مطابق) ان واقعات کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ شام میں تھے جب قاصدوں کے ذریعے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے افعال ناشائستہ ان کو معلوم ہوئے تو ان معائب کی برملا تشہیر اور ان پر کھلم کھلا تنقید اور نقطہ چینی کرنے لگے تو جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ابوذر تم کو لوگوں کے سامنے ذلیل کر دے اور تمہاری اطاعت سے ان کو نکالتے ہیں ان کا دفعیہ جلد از جلد کیا جانا چاہیے تب آپ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا " اشخصه الي علي مركب وعر وسائق عنيف "[1] ان کو میرے پاس تیز سواری اور تیز ہانکنے والے کے ہمراہ بھیجو چنانچہ جناب معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو اسی صورت سے

1۔ بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار، 31/ 279، ط: دار الرضا بيروت لبنان

مدینہ روانہ کیا جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو آپ ان پر غصہ ہوئے اور کہا تم کیوں لوگوں کو مجھ پر ڈھیل کرتے اور ان کو میری اطاعت سے نکالتے ہو تو ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکا ہوں کہ آپ نے فرمایا کہ جب حکم بن ابی العاص کی اولاد تیس آدمیوں تک پہنچے گی تو خدا کے مال کو اپنا مال ٹھہرائیں گے اور اللہ کے بندوں کو لونڈی غلام سمجھیں گے اور خدا کے دین میں حیلہ اور جھوٹ کو دخل دیں گے جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالی ان سے ناراض ہوگا اور بندگان خدا کو ان سے نجات بخشے گا مجلس میں جو صحابہ موجود تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ آپ میں سے کسی نے یہ حدیث سنی ہے سب نے انکار کیا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلوا کر ان سے دریافت کیا آپ نے فرمایا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث نہیں سنی البتہ یہ دوسری حدیث سنی ہے کہ "ما أظلت الخضراء ولا أقلت الغبراء أصدق لهجة من أبي ذر"[1] نہ کسی پر نیل گوں آسمان سایہ فگن ہوا اور نہ گرد آلود زمین نے کسی کو اٹھایا جو ابوذر سے بات میں سچا ہو، پاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غصہ ہوئے اور ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم شہر سے نکل جاؤ چنانچہ وہ ربذہ چلے گئے اور آخر دم تک وہیں رہے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بھی شام میں تھے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں اونٹوں کی ایک قطار کو جن پر نشہ اور شراب لدی ہوئی تھی جاتے دیکھا تو پوچھا یہ کیا ہے بتایا گیا کہ یہ شراب ہے جو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بغرض فروخت بھیجی ہے آپ چھری لے کر اٹھے اور شراب کی مشکیں اور پکالیں پھاڑ ڈالی اور ساری شراب بہ گئی، پھر اہل شام کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بری خصلتوں سے ڈرایا جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ قصہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا اور یہ بھی لکھا کہ آپ عبادہ رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس بلا لیں یہاں رہنے سے لشکر و ملک میں وہ فساد کا سبب بن جائیں گے چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو مدینہ بلوا لیا اور سخت ناراض ہوئے کہ مجھ پر اور معاویہ رضی اللہ عنہ پر کیوں نکتہ چینی کرتے ہو کیا اولوالامر کی اطاعت کرنا بھی نہیں جانتے جناب عبادہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا "لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق"[2] خدا کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔

1۔ بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار، 22/ 406، ط: دار الرضا بیروت لبنان

2۔ الخصال، للشيخ الصدوق، ص: 607، ط: الحوزة العلمية قم المقدسة

اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو جب عہدہ قضا اور خزانہ داری سے برطرف کیا اور ولید بن عقبہ کو حاکم بنایا تو جناب عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ولید کے ظلم و ستم سے آشفتہ خاطر ہو کر لوگوں کے سامنے ان کے معائب بیان کرنا شروع کر دیئے لوگوں کو کوفہ کی مسجد میں جمع کر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی برائیاں ان کے سامنے رکھیں اور کہا کہ لوگو اگر تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرو گے تو خدا کا غضب تم پر نازل ہو گا اور تم پر برے لوگ مسلط کر دیئے جائیں گے نیکوں کی دعائیں مقبول نہیں ہوں گی اور جب ان کو جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کی شہر بدری کی اطلاع ملی تو مجمع عام میں تقریر کی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر طنز کرتے ہوئے یہ آیت پڑھی "ثم أنتم هؤلاء تقتلون أنفسكم وتخرجون فريقا منكم من ديارهم"[1] پھر تم وہ لوگ ہو جو اپنی ہی کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی فریق کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو، ولید نے یہ واقعات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجے تو آپ نے ان کو کوفہ سے بلالیا جب وہ مسجد نبوی میں پہنچے تو اپنے غلام کو حکم دیا کہ وہ ان کو مارے غلام نے ان کو پیٹ کر مسجد سے نکال دیا ان کے قرآن کو جلا ڈالا اور ان کے گھر میں ان کو قید کر دیا اور سالانہ وظیفہ چار سال کے لیے بند کر دیا اسی حال میں ان کا انتقال ہو گیا انہوں نے وصیت کی کہ میری نماز جنازہ جناب زبیر رضی اللہ عنہ پڑھائیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نہ پڑھائیں بیماری کی خبر سن کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مزاج پرسی کو گئے تو ان سے کہا کہ اے ابن مسعود رضی اللہ عنہ میرے لیے خدا سے گناہوں کی معافی چاہو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا اے اللہ تو غفور رحیم ہے لیکن عثمان سے درگزر نہ کرنا تو اس سے میرا بدلہ نہ لے جب سب صحابہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے آزردہ خاطر ہوئے۔

اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ پر بھائی چارہ کے تعلق پر ناراضگی کا اظہار کیا تو جناب عبد الرحمن رضی اللہ عنہ شرمندہ ہوئے اور کہنے لگے کہ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ایسے نکلیں گے اب معاملہ تمہارے اختیار میں ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو کہا کہ عبد الرحمن رضی اللہ عنہ منافق ہیں اسے پرواہ نہیں کہ میرے منہ سے کیا نکل رہا ہے عبد الرحمن رضی اللہ عنہ نے سخت قسم کھائی کہ جب تک زندہ ہوں عثمان رضی اللہ عنہ سے بات نہیں کروں گا چنانچہ اسی جدائی کے عالم میں انتقال کیا، لہذا اگر عبد الرحمن رضی اللہ عنہ منافق تھے تو ان کی بیعت صحیح نہ رہی

1۔ جواهر التاريخ لعلي الكوراني العاملي، 2/ 161، ط: دار الهدى

اور اگر منافق نہ تھے تو قدرت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان پر نفاق کی تہمت لگانے کے سبب فاسق ہوئے اور فاسق امامت کے قابل نہیں۔

اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے پٹنے کا قصہ یہ ہے کہ تقریباً پچاس صحابہ رضی اللہ عنہم نے جمع ہو کر ایک خط لکھا اور اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے معائب لکھے اور جناب عمار رضی اللہ عنہ سے کہا تم یہ خط حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پہنچاؤ ممکن ہے وہ ان باتوں سے آگاہ ہو کر اپنی بد اطواریوں سے باز آجائیں اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر تم ان بدعات سے باز نہ آئے تو ہم تم کو معزول کر دیں گے اور کسی دوسرے کو تمہاری جگہ مقرر کر دیں گے جب آپ نے خط پڑھا تو اس کو زمین پر پھینک دیا اس پر عمار رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس خط کو حقیر نہ جانئے اسے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھ کر آپ کو بھیجا ہے خدا کی قسم میں آپ کے پاس نصیحت و خیر خواہی کے جذبے سے آیا ہوں اور آپ کے بارے میں خوفزدہ ہوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا اے ابن سمیہ تو جھوٹ بولتا ہے اور اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ ان کو ماریں چنانچہ انہوں نے اتنا مارا کہ بے ہوش ہو کر گر پڑے پھر آپ خود اٹھے اور ان کے پیٹ اور عضو مخصوص پر لاتیں ماریں کہ آپ کو فتق کی بیماری لاحق ہو گئی بے ہوشی ہی کے عالم میں ان کی چار نمازیں بھی قضا ہو گئیں جو ہوش میں آکر انہوں نے ادا کی فتق کے عارضہ کے سبب جس نے سب سے پہلے پاجامہ یا شلوار پہنی وہ عمار رضی اللہ عنہ ہی تھے، بنو مخزوم اس واقعہ سے بہت برہم ہوئے اور کہا کہ اگر عمار اس فتق کی بیماری سے مر گئے تو ہم ان کے بدلہ میں بنو امیہ کے ایک بڑے آدمی کو مار ڈالیں گے اس واقعہ کے بعد عمار رضی اللہ عنہ گھر میں گوشہ نشین ہو گئے تا آنکہ جناب امیر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے۔

کعب بن عبدہ بہزی رضی اللہ عنہ کا قصہ یوں ہے کہ اہل کوفہ کی ایک جماعت نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھا اور اس میں آپ کے ایک ایک عیب اور برائی لکھی اور لکھا کہ اگر برائیوں سے باز آجاؤ تو ٹھیک ہے ورنہ ہم آپ کی اطاعت سے نکل جائیں گے اطلاع شرط تھی سو ہم نے پوری کر دی یہ خط آپ تک پہنچانے کے لیے قافلہ کے کسی آدمی کو دے دیا کعب بن عبدہ نے بھی الگ سے ان کو ایک خط لکھا جس میں بڑے درشت اور سخت انداز میں آپ کو مخاطب کیا تھا وہ خط بھی اسی قاصد کو دے دیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہ خط پڑھ کر بہت غصہ ہوئے اور جناب سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ کعب بن عبدہ کو کوفہ سے نکال دو تاکہ وہ کوہستان چلا جائے

چنانچہ وہ ان کے گھر گئے ان کو برہنہ کیا اور بیس کوڑے لگائے اور پھر شہر بدر کر کے کوہستان کی طرف بھیج دیا۔

سعید بن العاص نے اشتر نخعی کی بھی توہین وتذلیل کی اس کا قصہ یوں ہے کہ جناب سعید جب کوفہ کے صوبہ دار ہوئے اور مسجد میں گئے تو سب لوگ آپ کے پاس آئے اور کوفہ اور مضافات کی خوبیاں بیان کرنے لگے عبدالرحمن بن حسین کو جو کوتوال شہر تھا بولا کہ کاش کوفہ کے مضافات ہمارے امیر کی جاگیر میں آجائیں اس پر اشتر نخعی بولا یہ کیسے ہو سکتا ہے اسے تو ہم نے تلوار سے فتح کیا ہے اور خدا تعالی نے ہمیں اس کا مالک بنایا ہے عبدالرحمن نے اسے ڈانٹا اور کہا کہ امیر اگر چاہیں تو یہ سارا علاقہ ضبط کر سکتے ہیں استر نے درستی اور سختی بھرتی تو اور لوگ بھی اس کی حمایت اور اپنی زمینوں کے پاس میں اٹھ کھڑے ہوئے اور عبدالرحمن کو اتنا مارا کہ وہ زمین پر گر پڑا، سعید نے یہ واقعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا تو آپ نے جواب دیا کہ اشتر اور اس کے مددگاروں کو کوفہ سے نکال کر شام بھیج دو چنانچہ وہ شام چلے گئے اور قتل عثمان رضی اللہ عنہ تک وہیں رہے پھر سعید بھی کوفہ کا انتظام نہ سنبھال سکے لوگ بلوہ کر کے ان پر چڑھ آئے اور وہ مدینہ چلے گئے اس وقت کوفہ کے سرداروں نے اشتر کو لکھا کہ تمہارے بھائیوں نے ایک عہد کر لیا اور قسم کھائی ہے سعید کو کوفہ سے نکال دیا ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر چڑھائی کا فیصلہ کر لیا ہے اس موقع کو غنیمت سمجھو اور ہم سے عامل ہو تا کہ سب مل جل کر یہ مہم سر کر لیں چنانچہ وہ فورا کوفہ پہنچا اور ثابت بن قیس کو توال شہر کو مار پیٹ کا نکال دیا کوفہ کی تمام فوجیں اشتر کے ساتھ مل گئیں اور قسم کھائی کہ اب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کسی عامل کو کوفہ میں نہ آنے دیں گے آخر آپ نے مجبور ہو کر انہی لوگوں کی خواہش کے مطابق حضرت ابو موسی اشعری کو کوفہ کا صوبہ دار مقرر کر کے بھیجا۔

جواب: اس طعن واعتراض کا اجمالی اور الزامی جواب تو یہ ہے کہ جن حضرات کے حوالہ سے شیعوں نے اپنے اعتراض کی بنیاد رکھی ہے ان میں سے اکثر تو خود ان کے نزدیک واجب القتل تھے وہ عزت واحترام کے قابل ہی کب تھے کیونکہ ان لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان صریح کو چھپایا ظالموں کی مدد سے اہل بیت کے حق کو طلب کیا اور شہادت حق سے خاموش رہے اور شیعہ منطق کی رو سے ایسے حضرات سے جو برتاؤ جناب امیر رضی اللہ عنہ کو کرنا تھا وہ اگر حضرت عثمان شہید رضی اللہ عنہ نے کر دیا تو ان پر طعن واعتراض کیوں؟ ان کی تعریف کرنی چاہیے۔

اور ایک دو حضرات جو شیعوں کے ہاں اس سلوک سے مستثنی بھی ہیں تو ان کا ایک دوسرا جرم ایسا تھا کہ

اس کی وجہ سے ان کو بھی عقوبت ملنی چاہیے تھی "التقية ديني ودين ابائي"[1] کے پیش نظر جب خود جناب امیر رضی اللہ عنہ خاموش تھے تو انہوں نے یہ جواب کیوں ترک کیا جناب امیر رضی اللہ عنہ کی تقلید کیوں نہ کی ان کو بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی باتوں کو خاموشی سے گوارا کرنا چاہیے تھا اور خاموش رہنا چاہیے تھا پھر ان دونوں کا جرم بے وفائی بھی ثابت ہو گیا کہ ذاتی معاملات کی وجہ سے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر نقطہ چینی کی ان کے مقابلہ پر آٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے ہاتھوں اہانت وغیرہ برداشت کی مگر عہد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں جب کہ نص امامت کے اظہار کا اصل موقع اور وقت تھا خاموش رہے جس کی وجہ سے جناب امیر رضی اللہ عنہ کا واجبی حق بھی طلب ہوا اور دین پیغمبر میں بھی خلل پڑا ایسے بے وفاؤں کو اچھا ہوا سزا ملی اس کی وجہ سے جناب عثمان پر طعن کیوں انہوں نے تو عین شیعہ فلسفہ کے مطابق ان پر گرفت فرمائی کہ تقیہ کیوں چھوڑا علی الاعلان بات کہنے کے مرتکب کیوں ہوئے۔

جواب 2: خلافت و امامت کا معاملہ اتنا اہم اور مہتم بھی شان ہے کہ اس کی حفاظت و بقا کے لیے اور اس میں برہمی اور انتشار پیدا کرنے والوں یا اس کی حرمت پر اثر اندازی کے وقت کسی قسم کا لحاظ و مروت کرنا سستی و غفلت برتنا مناسب اور زیبا نہیں خود جناب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حرم رسول ام المومنین رضی اللہ عنہا کا لحاظ و پاس نہیں فرمایا جناب طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری قدیم الاسلام رشتہ دار تھے دونوں کو قتل کیا اور محض خلافت کی حفاظت کی خاطر ورنہ یہ بات تو جناب امیر رضی اللہ عنہ بخوبی اور باوثوق جانتے تھے کہ یہ حضرات اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ رضی اللہ عنہ کی جان کے خواہاں نہیں تھے وہ تو صرف قاتلان عثمان کا مطالبہ کرتے تھے مگر جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خیال مبارک میں لشکر سے اس قدر فوج کا کٹ کر علیحدہ ہو جانا خلافت و مملکت میں خلل پیدا کرتا اور خلیفہ کا حکم ناقابل امر ٹھہرتا تھا اس لیے ان سے لڑائی لڑی اور رشتہ داری سسرال زوجیت اور صحبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سارے ہی علاقے نظر انداز فرما دیئے۔

اور جب کوفہ والوں کو جناب ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ نے جناب امیر رضی اللہ عنہ کی رفاقت سے باز رکھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے خاطر خواہ اس کی سرزنش کی اور مالک اشتر کے ذریعے ان کا گھر جلوا دیا گیا مال و اسباب لوٹا گیا اور آپ رضی اللہ عنہ نے اسے

---

1 ـ الاصول من الكافي، كتاب الايمان بالكفر، باب التقية، 2/ 219، ط: دار الكتب الاسلامية تهران

روا رکھا یہ باتیں ہر دو فرقہ کی تواریخ میں یکساں طور پر موجود ہیں تو گویا معلوم ہوا کہ امیر خلافت کے استحکام و حفاظت کے سلسلہ میں چھوٹی موٹی مصلحتیں تلف ہوتی ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ وجود خلافت اور استحکام خلافت سب سے مقدم اور نہایت اہم مصلحت ہے تو اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کی حفاظت وصیانت کے لیے بعض اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈرایا ہو یا اہانت کی ہو تو وہ موجب طعن کیوں جبکہ یہ ڈرانا یا اہانت قتل سے بہر حال کم ہی ہے۔

اور جنگ جمل کے بعد ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جس قدر توہین و تذلیل ہوئی تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے یہ جوابات تو وہ تھے جو شیعی فلسفہ و مذاق کے مطابق تھے لیکن اہل سنت نے صحیح روایات کی روشنی میں اس اعتراض و تعن کا جواب دیا ہے وہ یہ ہے کہ حضور رضی اللہ عنہ نے دیگر اصحاب کی موجودگی میں بھی اور علیحدگی میں بھی بار بار بتاکید فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ تم کو کسی وقت خلافت کی خلافت سے نوازے گا منافق اس شرف کو تم سے چھیننا چاہیں تو مزاحمت اور جھگڑنے کے بجائے صبر کرنا،[1] چنانچہ اہل سنت کی صحاح میں یہ روایت موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقا کی مجلس میں ایک روز فتنہ کا ذکر فرما رہے تھے کہ عنقریب واقع ہو گا اس ذکر سے رفقا کو سراسیمہ دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس وقت یہ راہ راست پر ہوں گے،[2] صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے اسے روایت کیا ہے پھر ایک مرتبہ اسی فتنہ کے ذکر کے دوران فرمایا کہ اس روز بیٹھا ہوا شخص کھڑے ہونے والے سے کھڑا ہونے والا چلنے والے سے اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہو گا۔[3]

1۔ يا عثمان إن الله عز وجل مقمصك قميصا، فإن أرادك المنافقون على أن تخلعه، فلا تخلعه لهم۔(مسند الامام احمد بن حنبل، 41/ 13، رقم : 24466، ط: مؤسسة الرسالة)

2۔ عن كعب بن عجرة، قال: ذكر رسول الله صلى الله عليه وسلم فتنة فقربها، وعظمها، قال: ثم مر رجل متقنع في ملحفة، فقال: " هذا يومئذ على الحق " فانطلقت مسرعا، أو قال: محضرا، فأخذت بضبعيه، فقلت: هذا يا رسول الله؟ قال: " هذا " فإذا هو عثمان بن عفان رضي الله عنه۔(مسند الامام احمد بن حنبل، 30/ 44، رقم : 18118، ط: مؤسسة الرسالة)

3۔ عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله ﷺ: ستكون فتن، القاعد فيها خير من القائم، والقائم خير من الماشي، والماشي خير من الساعي، ومن وجد ملجأ أو معاذا، فليعذ به(مسند الامام احمد بن حنبل، 13/ 207، رقم : 7796، ط: مؤسسة الرسالة)

مرض وصال میں ایک روز فرمایا" ليت عندي رجلا اكلمه "کاش اس وقت میرے پاس وہ شخص ہوتا جس سے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں اہل بیت کرام نے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا نام لے کر دریافت کیا کہ ان کو بلائیں تو آپ نے انکار فرمایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے بھی انکار فرمایا جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نام لیا گیا تو آپ نے فرمایا ہاں جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بہت دیر تک سرگوشی میں کچھ گفتگو فرماتے رہے مرض کی وجہ سے آپ لیٹے ہوئے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سر کو سینہ مبارک پر رکھے ہوئے وصیت فرمارہے تھے اور ان کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اس وقت بے اختیار باآواز بلند " الله المستعان، الله المستعان "کے الفاظ ادا ہو رہے تھے،[1] یہ روایت ازواج مطہرات اور اس وقت موجود دیگر خدام خانہ رضی اللہ عنہم نے بیان فرمائی ایک مرتبہ جناب ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو جنت کی بشارت دو اور کہو کہ تم پر عام بلوا ہو گا۔[2]

خلاصہ کلام یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس قطعی نصوص واحکام اور تاکیدی وصایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے موجود تھیں اور آپ ان وصایا پر ثابت قدم رہے جب آپ نے دیکھا کہ منافقین کے ساتھ کچھ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی لاعلمی اور ناواقفی یا کسی غلط فہمی کے سبب منافقین کے ہم آہنگ وہم آواز ہو رہے ہیں تو آپ نے یہ چاہا کہ یہ

---

1 ـ عن عائشة رضي الله عنها، أن رسول الله ﷺ قال: «ادع لي - أو ليت عندي - رجلا من أصحابي» قالت: قلت: أبو بكر؟ قال: «لا» . قلت: عمر؟ قال: «لا» . قلت: ابن عمك علي؟ قال: «لا» . قلت: فعثمان؟ قال: «نعم» قالت: فجاء عثمان، فقال: «قومي» ، قال: فجعل النبي ﷺ يسر إلى عثمان، ولون عثمان يتغير، قال: فلما كان يوم الدار قلنا: ألا تقاتل؟ قال: لا، إن رسول الله ﷺ عهد إلي أمرا، فأنا صابر نفسي عليه «هذا حديث صحيح الإسناد، ولم يخرجاه» (المستدرك على الصحيحين، فضائل أمير المؤمنين ذي النورين عثمان بن عفان رضي الله تعالى عنه، 3/ 106، رقم: 4543، ط: دار الكتب العلمية بيروت)

2 ـ عن أبي موسى، أنه كان مع النبي صلى الله عليه وسلم في حائط وبيد النبي صلى الله عليه وسلم عود يضرب به بين الماء والطين... ثم جاء رجل فاستفتح فقال: افتح له وبشره بالجنة على بلوى تصيبه أو بلوى تكون. قال: فإذا هو عثمان رضي الله عنه ففتحت له وبشرته بالجنة وأخبرته فقال: الله المستعان (مسند الامام احمد بن حنبل، 32/ 414، رقم: 19643، ط: مؤسسة الرسالة)

پہ مسلمان منافقوں کا ساتھ نہ دیں اس سلسلہ میں اپنے صوابدید کے مطابق ان حضرات کو مناسب تنبیہ بھی فرمائی مقصد ان کی خیر خواہی کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ ان حضرات کی آڑ لے کر یہ منافق و اوباش زور نہ پکڑیں۔

اہل سنت کے نزدیک عصمت خاصہ انبیاء ہے یہ حضرات بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کو معصوم نہیں جانتے تھے یہی وجہ ہے کہ عہد عثمان سے قطع نظر عہد صدیق و فاروق رضی اللہ عنہم حتی کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر حدود جاری ہوئیں، بلکہ خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مسطح بدری اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہما کو حد قذف میں پکڑا کعب بن مالک، مرارہ ابن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم جن میں سے دو حضرات شریک بدر بھی تھے غزوہ تبوک میں شریک نہ ہونے کے سبب بارگاہ نبوت سے نکال دیئے گئے اور سارے مسلمانوں کے مقاطعہ کا نشانہ بنے ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو رجم کیا گیا کئی حضرات پر شراب نوشی کی حد جاری ہوئی ان کے علاوہ بھی سزائیں ہوئیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی حسب موقع وحال بعض حضرات کو تنبیہ فرمائی مقصد صرف یہ تھا کہ منافق اور اوباش لوگوں کا ساتھ دے کر اپنا حشر ان کے ساتھ نہ کرائیں اور جو دنیا و آخرت میں ان کے لیے عذاب و رسوائی مقدر ہو چکی ہے اس سے بچ جائیں اور بحمد للہ ایسا ہی ہوگا کہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ میں کسی صحابی نے حصہ نہیں لیا منافقوں اور اوباشوں ہی کے دست و دامن خون عثمان رضی اللہ عنہ سے تر ہوئے اور چونکہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے امر مقدر کا علم ہو چکا تھا اس لیے نہ ان بد بخت کے حملہ کا بچاؤ کیا نہ کسی کو حمایت میں بلایا بلکہ صبر و رضا کے ساتھ جام شہادت نوش فرمالیا، جن حضرات کو آپ نے تنبیہ فرمائی یا گوشمالی کی وہ چونکہ عواقب و نتائج سے آپ کی طرح آگاہ نہ تھے اس لیے بعد میں ان سے معذرت بھی چاہی اگر غور کیا جائے اور انصاف سے کام کیا جائے تو اہل سنت کا یہ موقف درست نظر آتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حال ہو بہو جناب امیر رضی اللہ عنہ سے پورے طور پر ملتا ہے کہ ان کو بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی:

یا علي لا تجتمع الامة عليك بعدي وانك تقاتل الناكثين و القاسطين والمارقين[1]

1۔ عن عبد الله قال: «أمر رسول الله صلى الله عليه وسلم بقتال الناكثين والقاسطين والمارقين» (المعجم الكبير للطبراني، 10/ 91، رقم: 10053، ط: مكتبة ابن تيمية القاهرة)

اے علی میرے بعد تمہارے خلافت پر ساری امت متفق نہ ہوگی تمہیں عہد شکنوں بے انصافوں اور بد دینوں سے لڑائیاں لڑنی پڑیں گی۔

چنانچہ جب آپ مسجد مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو حتی المقدور فتنہ کے فرو کرنے اور مخالفوں سے قتل و قتال اور جنگ و جدال کے ذریعہ اپنے سے دور کرنے کی کوشش فرمائی نہ اس میں کوئی تامل فرمایا اور نہ کسی کے منصب و مقام کا کوئی لحاظ کیا نہ کسی مروت اور رعایت سے کام لیا اسی لیے آپ کی ان کاروائیوں کی زد میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی آئیں اور طلحہ و زبیر، یعلی بن منبہ اور ابو موسی اشعری دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی آئے مگر مقدر نے یاوری نہیں کی اس لیے امور خلافت حسب منشا انجام نہ پا سکے۔

ان اجمالی گزارشات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب آپ سلسلہ بسلسلہ تفصیلی جوابات ملاحظہ فرمائیں، طعن و اعتراض میں قصص واقعات جس انداز میں ذکر ہوئے وہ حسب دستور دجل و فریب کے سوا کچھ نہیں یہ ساری باتیں کی من گھڑت اور بناوٹی ہیں معتبر تاریخوں کا دامن ان کے ذکر سے خالی ہے، ان کتابوں میں واقعات کی جو اصل صورت حال ہے اس کے مطالعہ ہی سے اعتراضات کی قلعی کھل جاتی اور جواب خود بخود سامنے آ جاتا ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا قصہ

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا قصہ بحوالہ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ثقہ تابعین کی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مزاجاً بہت متشدد تھے، زبان بھی بے قابو تھی خود سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں آپ کے خدام سے الجھ پڑتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے گتھم گتھا ہوئے اور مادر پدر تک پہنچ گئے اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زبان درازی پر ڈانٹا اور فرمایا" أعيرته بأمه؟ إنك امرؤ فيك جاهلية"[1] کیا تم اسے ماں کے حوالہ سے عار دلاتے ہو، تم ایسے شخص ہو جس میں جاہلیت کا اثر ہے۔

عہد عثمانی میں لشکر شام میں جب انہیں قیام کا اتفاق ہوا تو فتوحات میں غنائم کی کثرت کے سبب بے شمار

---

1 ـ صحيح البخاري، كتاب الايمان، باب: المعاصي من أمر الجاهلية، ولا يكفر صاحبها بارتكابها إلا بالشرك، 1/ 15، رقم: 30، ط: دار طوق النجاة

دولت ہاتھ آنے کے باعث مہاجر و انصار لکھ پتی ہو گئے، تو جناب ابو ذر رضی اللہ عنہ نے سب پر اعتراضات شروع کر دیئے پہلا نشانہ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بنے اور حوالہ کے لئے آیت "وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ۔۔۔الخ"[1] سنانے لگے! اور اموال کو خرچ کرنا فرض بتانے لگے، جناب معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہر چند سمجھایا کہ یہاں خرچ کرنے سے مراد بقدر زکوۃ ہے سارا مال خرچ کرنا مراد نہیں ہے اور اس کی دلیل میراث وفرائض کی آیت ہے کیونکہ اگر سارے کے سارے مال کا خرچ کرنا فرض وواجب ہوگا تو متروکہ مال کی تقسیم کے کوئی معنی نہ رہیں گے مگر بات ان کی سمجھ میں نہ آئی وہ اپنے خیال پر اڑے رہے، اور ہر ایک کے ساتھ سختی اور درشتی سے پیش آنے لگے!

شامی لشکر نے جمہور امت کی روش سے ہٹ کر ان کی روش پر انگشت نمائی شروع کر دی اب وہ جدھر جاتے لوگ گروہ در گروہ ان کے گرد اکٹھا ہو جاتے اور ان کو چڑانے اور غصہ دلانے کے لئے جان بوجھ کر زور زور سے یہ آیت پڑھتے انہوں نے گویا یہ چڑ بنالی جب بات مذاق اور ہنسی ٹھٹھے اور مزاق تک پہنچ گئی تو جناب معاویہ نے سارا ماجرہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا آپ نے حکم دیا کہ ان کو مدینہ روانہ کر دیں، چنانچہ ان کی شایان شان عزت واحترام کے ساتھ ان کو مدینہ منورہ روانہ کر دیا گیا یہ شیعوں کی اپنی اپج ہے جو وہ کہتے ہیں کہ تیز رو سواری پر بھیجے گئے حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ان کے مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے ہی اہل مدینہ شام میں پیش آنے والے واقعات وقصے سن چکے تھے یہاں کے خوش طبع اور بچپن مزاج لوگ بھی ان کے پیچھے لگ گئے وہ بھی دل لگی اور مزاح کے لئے ان سے آیت کے معنے پوچھنے لگے اسی دوران حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے فوت ہو گئے آپ نے بے شمار دولت ترکہ میں چھوڑی، ادائیگی حقوق وصایا وغیرہ کے تقسیم ہوا تو آٹھواں حصہ چار عورتوں کو پہنچا ان میں سے ایک بیوی کو مرض وفات میں چونکہ طلاق دیدی تھی اس لئے اس کو پورے حصہ کے بجائے ایک مقررہ رقم دینے پر صلح کرلی تھی اور وہ اسی ہزار درہم سے زیادہ تھی (اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحیح ورثا کے حصہ

1۔ سورۃ التوبۃ ،الآیۃ: 34

میں کتنا مال خطیر آیا ہو گا؟) دل گی بازوں کو شوشہ ہاتھ آ گیا جناب ابوذر رضی اللہ عنہ کو منانے کے لئے جناب عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کی مال داری کا قصہ سنایا اس معاملہ میں ان کا ایک مزاج بنا ہوا تھا لہٰذا حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کے دوزخی ہونے کا فتویٰ لگا دیا اور جوش میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت صریحہ کو بھی بھلا بیٹھے، یہ معاملہ ایک نص صریح کے چونکہ خلاف تھا جناب کعب احبار رضی اللہ عنہ جو اہل کتاب کے علماء میں سے تھے اور عہد فاروقی میں مشرف باسلام ہو گئے تھے جناب ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے کہ جناب یہ بات بالاجماع ثابت ہے کہ ملت حنفیہ آسان ترین، کشادہ ترین مذہب ہے اور سارے مال کا خرچ کرنا تو یہودی مذہب میں بھی واجب نہیں جو بہت تنگ اور سخت مذہب ہے تو مذہب اسلام میں سارا مال خرچ کرنا کس طرح واجب ہو سکتا ہے، بات ذرا سوچ سمجھ کر کیا کیجئے آپ حسب عادت غصہ میں آ گئے اور فرمانے لگے ارے یہودی تجھے ان مسائل سے کیا واسطہ اور لاٹھی اٹھا کر انہیں مارنے دوڑے وہ وہاں سے بھاگے اور سیدھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نشستگاہ میں آ گئے اور آپ کی پیٹھ پیچھے چھپ گئے جناب ابوذر رضی اللہ عنہ غصہ میں بھرے وہاں پہنچے اور آؤ دیکھا نہ تاؤ اور لاٹھی کا وار کعب احبار پر کر دیا کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی اس کی زد میں آئے اور آپ کے پاؤں پر لاٹھی سے چوٹ لگی ان کی بدحواسی اور بے خودی دیکھ کر ہی حضرت شہید رضی اللہ عنہ نے خدام کو حکم دیا کہ انہیں پکڑو کہیں غصہ میں ایسی جگہ چوٹ نہ مار بیٹھیں کہ موت کا سبب بن جائے چنانچہ خدام نے انہیں پکڑا اور گھر چھوڑ آئے جب جوش ختم اور غصہ دور ہوا، تو آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہنے لگے میں اپنے اس خیال پر اتنا پختہ ہوں اور یہی میرا مذہب ہے کہ کل مال خرچ کرنے کو واجب سمجھتا ہوں مگر پہلے شامی اور اب اہل مدینہ نے مجھے نشانہ تضحیک بنا لیا ہے وہ مجھے چھیڑنے اور چڑھانے کے لئے میرے ارد گرد اکٹھا ہو جاتے ہیں، ہنسی مذاق اڑاتے ہیں اور مجھے پاگل کر دیتے ہیں، کہ ایسے واقعات کی نوبت آ جاتی ہے آپ مجھے مشورہ دیجئے میں کیا کروں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں اب بات تو ایسے ہی ہو گئی ہے کہ لوگ اب آپ سے مزا لینے کے لئے ایسی حرکتیں کرنے لگے ہیں، آپ اگر ان مجمعوں سے کنارہ کشی گوارہ کر سکیں تو بہتر صورت یہی ہے، اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ مضافات مدینہ میں سے کسی مقام پر سکونت اختیار کر لیں چنانچہ مدینہ منورہ سے تین منزل کی دوری پر واقع مقام ربذہ میں آپ تشریف لے گئے اور وہیں پر ہی بس گئے تھوڑے وقفہ مسجد نبوی کی زیارت اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ملاقات کے لئے آتے جاتے رہے!

ان حالات سے متعلق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کوئی شکایت آپ سے منقول نہیں جو بات ملتی ہے وہ یہی کہ آپ جناب شہید رضی اللہ عنہ کے انتہائی مطیع اور فرمانبردار تھے اور اس کی دلیل وہ قصہ ہے جو تمام مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ جب آپ ربذہ گئے اس وقت وہاں کا عامل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کوئی غلام تھا جو مسجد میں جماعت پنجگانہ کی امامت بھی کرتا تھا آپ کے پہنچنے پر جب نماز کا وقت آیا تو اس نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ مجھ سے افضل اور بہتر ہیں اس لئے امامت آپ ہی فرمائیں مگر آپ نے فرمایا تم عثمان رضی اللہ عنہ کے نائب ہو اور عثمان رضی اللہ عنہ مجھ سے افضل ہیں، اور نائب بھی اصل ہی کے حکم میں ہے اس لئے ضروری اور لازم ہے کہ امام تم ہی ہو، چنانچہ اس غلام نے امامت کی اور آپ نے اس کی اقتداء میں نماز ادا فرمائی، تو یہ ہے اصل قصہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا، مگر اس فرقہ کا وطیرہ ہی بغض وعناد کا ہے اس لیے قصوں میں حسب مطلب کاٹ چھانٹ اس کی عادت ہے، اور ایک قصہ سے دوسرے واقعہ کی پیوندکاری اس کا طریقہ اور نتیجہ خیالی تصویر اور وہی بت تراش کر اسی کو معبود بنالیتے ہیں۔ [1]

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا قصہ

اور جناب عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا قصہ بھی محض افتراء اور بہتان ہے، نہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی شکایت لکھی اور نہ ہی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کو مدینہ منورہ بلایا، کسی تاریخ سے اس کا پتہ نہیں چلتا بر خلاف اس کے معتبر تواریخ میں یوں مذکور ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب قبرص پر لشکر کشی کی تو جناب عبادہ رضی اللہ عنہ بھی شریک لشکر تھے اس لئے کہ اس جہاد کے فضائل اور اس میں شریک مجاہدین کی مغفرت کی شہادت خود فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم نیز اپنی بیوی ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا سے سن چکے تھے جزیرہ کی فتح کے بعد جو مال غنیمت حاصل ہوا اس میں سے خمس علیحدہ کر کے دار الخلافہ روانہ کر دیا اور باقی مال مسلمانوں میں تقسیم کرنے کے لئے خود جناب معاویہ رضی اللہ عنہ بیٹھے دوسری طرف چند صحابہ کرام جن میں جناب عبادہ، شداد بن اوس فہری، ابو درداء، واثلہ بن اسقع، ابو امامہ باہلی اور عبد اللہ بن بسر مازنی رضی اللہ عنہم تھے الگ گوشہ میں بیٹھے یہ دیکھ رہے تھے کہ تقسیم موافق سنت ہوتی ہے یا خلاف سنت اسی دوران دو فوجی دو گدھے لیے جناب عبادہ رضی اللہ عنہ کے سامنے

1۔ انظر بالتفصيل : أسد الغابة في معرفة الصحابة، أبو ذر الغفاري، 6/ 96، رقم: 5869، ط: دار الكتب العلمية

ے گزرے تو آپ نے پوچھا تم یہ گدھے کہاں لے جا رہے ہو اور یہ کس کام کے لیے ہیں لشکروں نے بتایا کہ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عنایت فرمائے ہیں تاکہ ان پر سواری کر کے سفر حج پر جائیں اس پر جناب عبادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ نہ تمہارے لیے حلال ہیں اور نہ معاویہ کی یہ بخشش جائز ہے یہ سن کر لشکری واپس امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس اۓ گدھے واپس کر کے کہنے لگے کہ جناب عبادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے ان کا لینا جائز نہیں اس لیے ہم ان کو کیسے لیں اور ان پر حج کر سکتے ہیں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جناب عبادہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر مسئلہ کی صورتحال معلوم کی تو آپ نے کہا:

شهدت رسول الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ في غزوة حنين والناس يكلمونه في الغنائم، فأخذ وبرة من بعير وقال: «ما لي مما أفاء الله عليكم من هذه الغنائم إلا الخمس، والخمس مردود عليكم»، فاتق الله يا معاوية واقسم الغنائم على وجهها، ولا تعطِ منها أحدا أكثر من حقه[1]

غزوہ حنین کے موقع پر جب لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے غنائم کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کا ایک بال ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ اس مال غنیمت میں میرے لیے خون سے ایک بال بھی نہیں ہے اور وہ خمس بھی تو تم مسلمانوں کے ہی صرف میں اتا ہے تو اے معاویہ اللہ سے ڈرو اور مال غنیمت اس طرح بانٹو کہ کسی کو اس کے حق سے زیادہ نہ دو۔

اس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا یہ مال غنیمت سنبھالو اور اپنی صواب دید پر اسے تقسیم کر دو اور مجھے اس بارے گراں سے ہلکا کرو میں تمہارا ممنون احسان ہوں گا چنانچہ جناب عبادہ رضی اللہ عنہ داروغہ تقسیم بنے اور جناب ابو امامہ اور ابو درداء رضی اللہ عنہما دونوں آپ کے معاون و شریک کار بنے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی عہد خلافت عطا کیے نظم باقی و جاری رہا جناب عبادہ رضی اللہ عنہ کی وفات شام میں ہوئی بیت المقدس میں مدفون ہوئے نہ وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے جدا ہوئے اور نہ مدینہ منورہ تشریف لائے لہذا یہ قصہ ہی جھوٹ ہے۔

1۔ تيسير الكريم المنان في سيرة عثمان بن عفان، 1/ 194، ط: دار التوزيع والنشر الإسلامية، القاهرة مصر

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قصہ

یہی حال حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ناخوشی کے قصہ کا ہے کہ یہ بھی افترا اور جھوٹ ہے کتب بھی اس کے بیان سے خالی ہیں صحیح واقعہ اس قدر ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے علم میں یہ بات آئی کہ قرات قرآن میں اختلاف کے سبب یہ نوبت آنے لگی ہے کہ لوگ اختلاف قرأت کو بہانہ بنا کر غیر منزل الفاظ بھی پڑھنے لگے ہیں تو آپ نے حضرت حذیفہ بن یمان اور دیگر جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے یہ انتظام فرمایا کہ تمام عرب و عجم ایک ہی مصحف پر متفق ہو جائیں اور باہم مختلف نہ ہوں اس سلسلہ میں حضرت ابی بن کعب اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے پاس جو مصاحف تھے ان میں قرأت شاذہ کے علاوہ بعض ادعیہ قنوت اور بعض تفسیر عبارات بھی درج تھیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت قرآن کے وقت بیان معنی کے طور پر فرمائی تھی ان مصاحف میں ان کی برقراری آئندہ چل کر فساد عظیم کا پیش خیمہ بن سکتی تھی اس لیے یہ نفس قرآن میں اختلاف ہوتا جو رفتہ رفتہ بیش از بیش خرابیوں اور برائیوں کا سبب بنتا ہے ان حضرات نے اپنے مصاحف میں ان کو برقرار رکھنے پر اصرار کیا مگر مصحف لینے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے غلاموں نے جبر سے کام لیا اور مار پیٹ کی بھی نوبت ائی مگر اس کی اجازت یا حکم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہر گز نہیں دی تھی اور جناب ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اپنا مصحف بخوشی بلا جبر دے دیا تھا اس لیے ان کے ساتھ نہ کوئی بات ہوئی نہ باہم کدورت کی نوبت ائی اس کے باوجود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہر ممکن و مناسب طریقہ سے آپ کو راضی کرنا چاہا اور عذر معذرت بھی پیش کی ایسی صورت میں خرین انصاف یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کوئی الزام نہیں آتا۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بنفس نفیس ان کے مکان پر گئے ان سے معافی چاہی ان کا وظیفہ ساتھ لے گئے تھے وہ دینا چاہا تو جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب مجھے ضرورت تھی اس وقت تو دیا نہیں اب سفر آخرت پر جا رہا ہوں تو آپ دے رہے ہیں میں نہیں لوں گا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا بچیوں کے کام آئے گا رکھ لیجئے تو فرمایا میں نے لڑکیوں سے کہہ دیا ہے کہ ہر رات سورہ واقعہ کا ورد کر لیا کریں کیونکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکا ہوں کہ جو کوئی ہر رات سورہ واقعہ پڑھے گا فاقہ میں مبتلا نہ ہو گا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے اُٹھ کر ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں گئے اور ان سے

درخواست کی کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو مجھ سے راضی کرا دیجئے چنانچہ آپ رضی اللہ عنہا نے متعدد مرتبہ کہلا کر بھیجا اس کے بعد پھر ایک مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہنے لگے اے عبد اللہ تم بھی اپنے بھائیوں سے یوسف علیہ السلام کی طرح کیوں نہیں کہہ دیتے "لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ"[1] آج تم پر کوئی ملامت نہیں اللہ تعالیٰ تم کو معاف فرمائے وہ ارحم الراحمین ہے یہ سن کر جناب عبد اللہ رضی اللہ عنہ چپ رہے کوئی جواب نہیں دیا۔[2]

لہٰذا اس معاملہ میں ان کو راضی کرنے اور اپنے قصور کی معافی چاہنے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اس سعی و کوشش کے بعد وہ بری الذمہ ہو گیا اب ان پر الزام بنائے عناد تو ہو سکتا ہے ازروئے دیانت و انصاف نہیں اور پھر جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ شکر رنجی دشمنوں کی سی نہیں بھائیوں اور عزیزوں کی طرح کی تھی جو بعض اوقات معمولی بات پر بھی ہو جاتی ہے اس شکر رنجی کی بنا پر نہ وہ آپ کی خلافت سے منکر ہوئے نہ یہ عقیدہ رکھا کہ وہ اس کے لیاقت نہیں رکھتے تھے چنانچہ سلمہ بن شفیق جو آپ کی خاص دوستوں میں سے تھے کہتے ہیں:

دخلت على ابن مسعود في مرضه الذي توفي فيه، وعنده قوم يذكرون عثمان فقال لهم: مهلاً فإنكم إن قتلتموه لا تصيبون مثله.[3]

میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس مرض وفات میں ایک دن گیا تو آپ کے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق باتیں کر رہے تھے اس وقت آپ نے کہا بس چپ کر جاؤ اگر کبھی تم نے ان کو قتل کر دیا تو ان جیسا کبھی نا پاؤ گے۔

غرض سیاست و انتظام ملکی میں اس قسم کے بے شمار چھوٹے بڑے واقعات پیش آتے ہیں اگر ان کو مطعن میں شمار کر لیں تو شیعوں کا تو کافیہ تنگ ہو جائے گا مثلاً وہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق کیا کہیں گے کہ

1۔ سورة يوسف، الآية: 92

2۔ اسد الغابة في معرفة الصحابة، 3/ 393، ط: دار الكتب العلمية، بيروت

3۔ الرياض النضرة في مناقب العشرة، 3/ 96، ط: دار الكتب العلمية

انہوں نے اپنے حقیقی بھائی حضرت عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بالکل چھوڑ دیا ان کا وظیفہ اتنا تنگ کر دیا کہ مجبور ہو کر جنگ صفین کے بعد وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے جا ملے اور جناب ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابی آپ کے خاص ساتھی تھے ان کو معزول کیا ان کا وظیفہ بند کیا اور ان سے تعلقات توڑ لیے حتی کہ وہ آپ سے الگ ہو کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف دار ہو گئے جناب عقیل اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہما صاحب وعزت میں حضرت ابوذر اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے کم تو نہیں اگر ان کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مستحق طعن ہیں تو یہ نادان یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جناب امیر داماد رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے تعاون کی زد میں آ جاتے ہیں کسی مسلمان کی تو یہ جرات نہیں کہ عظیم المرتبت اصحاب کرام تو رہے اپنی جگہ کسی عام صحابی رسول پر طعن کا خیال بھی دل میں لائے۔

حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا قصہ

یہی حال حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے قصہ کا ہے کہ اس کی بھی کوئی اصل وبنیاد نہیں اگر حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ آپ کی تولیت اور بھائی چارگی پر نادم تھے تو آخر ان کو صاف اور دو ٹوک انداز میں کہنے سے کیا بات مانع تھی؟ بات صرف اتنی صحیح ہے کہ ان دونوں حضرات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باہم اخوت کا رشتہ و تعلق جوڑا تھا اس تعلق کی بنا پر جناب عبد الرحمن رضی اللہ عنہ آپ سے خوش طبعی اور دل لگی بہت کرتے تھے اور یہ سب ہی جانتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بہت باحیا اور بامروت تھے حیادار آدمی عموماً خوش طبعی سے پریشان اور دل تنگ ہو ہی جاتا ہے ایک روز ان کی خوش طبعی اور دل لگی سے اس قدر پریشان ہوئے کہ یہ الفاظ آپ نے فرمائے "اني اخاف يا ابن عوف ان تسبط من رمي "[1] اے ابن عوف مجھے ڈر ہے کہ تو اپنے دل لگی سے مجھے مار نہ ڈالے، اور دوستوں اور ہم صحبتوں میں اس قسم کے واقعات اکثر پیش آتے ہیں مگر ان کی وجہ سے دل میں گرہ نہیں پڑتی دل صاف رہتے ہیں۔

جناب علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے بھی لوگوں کے ساتھ خوش طبعی کے واقعات ملتے ہیں چنانچہ دار قطنی نے زیاد بن عبد اللہ نخعی سے ایک روایت بیان کی ہے کہ ہم مسجد اعظم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معیت بیٹھے ہوئے

1۔ الطبقات الكبرى المعروف بہ "طبقات ابن سعد" 3/ 76، ط: دار الكتب العلمية، بيروت

تھے ان دنوں کوفہ کے مکانات صفا پوش تھے کہ اتنے میں موذن نے آکر کہا کہ یا امیر المومنین عصر کی نماز کا وقت ہو گیا آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ وہ بیٹھ گیا پھر دوڑی دیر بعد اور اسی طرح کہا اس پر آپ نے ازراہ دل گی فرمایا یہ کتا ہم کو سنت سکھاتا ہے۔[1]

دار قطنی ہی نے اسی زیاد مذکور سے ایک اور روایت بیان کی ہے کہ ایک شخص جناب مرتضی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور وضو کے بارے میں آپ سے پوچھا کہ دائیں ہاتھ سے شروع کرنا چاہیے یا بائیں سے آپ نے فرمایا دائیں سے شروع کرو یا بائیں سے پھر آپ نے منہ سے گوز کی آواز نکالی گویا وضو ٹوٹنے کا اظہار فرمایا پھر پانی منگایا اور وضو بائیں ہاتھ سے شروع فرمایا۔[2]

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا قصہ

اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا قصہ جس انداز میں بیان کیا ہے وہ بھی صحیح اہل سنت کی روایات کے مطابق یہ قصہ یوں ہے کہ ایک دن حضرت سعد بن ابی وقاص اور جناب عمار رضی اللہ عنہ مسجد میں آئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اطلاع بھجوائی کہ ہم مسجد میں بیٹھے ہیں آپ بھی مسجد میں آجائیں آپ کی طرف سے صادر شدہ بعض امور جو عوام کی شکایت کا سبب بنے ہوئے ہیں ان کے متعلق آپ سے گفتگو اور مشورہ کرنا ہے آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام کے ہاتھ کہلوا بھیجا اس وقت تو مجھے بہت سے کام در پیش ہیں اس وقت تو آپ لوگ جائیں اور فلاں روز ملاقات کا وعدہ ہے جو باتیں ہوں گی میں سنوں گا حضرت سعد رضی اللہ عنہ تو یہ سن کر چلے گئے مگر جناب عمار رضی اللہ عنہ نے پھر کہلوایا کہ آپ کو آج ہی ابھی آکر بات کرنی چاہیے آپ رضی اللہ عنہ انہوں نے پھر عذر کیا مگر عمار رضی اللہ عنہ نے تقاضا کیا مگر آپ رضی اللہ عنہ نے گزر

---

1 ۔ عن زياد بن عبد الله النخعي، قال: " كنا جلوسا مع علي رضي الله عنه في المسجد الأعظم، والكوفة يومئذ أخصاص، فجاءه المؤذن فقال الصلاة يا أمير المؤمنين للعصر، فقال: اجلس، فجلس ثم عاد فقال ذلك، فقال علي رضي الله عنه: هذا الكلب يعلمنا بالسنة۔ (سنن الدارقطني، 1/ 260، ط: دار الكتب العلمية بيروت لبنان)

2 ۔ (و ها هنا سنن وآداب ذكرها المشايخ) والسنة عند غسل رجليه أن يأخذ الإناء بيمينه ويكبه على مقدم رجله اليمنى ويدلكه بيساره فيغسلها ثلاثا ثم يفيض الماء على مقدم رجله اليسرى ويدلكه، كذا في المحيط۔ (الفتاوى الهندية، كتاب الطهارة، الباب الاول فى الوضوء، الفصل الثالث فى المستحبات 8/ 1 ط: دار الفكر)

فرمایا مگر عمار مُصر رہے اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خدام نے ان سے ہاتھاپائی کی مسجد سے گھسیٹ کر باہر نکال دیا اور کہنے لگے کہ شریعت میں اجازت کی حد تین مرتبہ ہے آپ حد شرعی سے بڑھ گئے لہذا آپ کو سزا دینا ضروری ہوا جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر ہوئی تو دوڑے ہوئے مسجد میں آئے لوگوں کو اکٹھا کیا عمار رضی اللہ عنہ کو بھی بلوایا اور قسم کھا کر کہا کہ غلام کی یہ حرکت نازیبا میرے ایماء و اجازت سے نہیں ہوئی اس غلام کو ڈانٹا ڈپٹا اور فرمایا "هذه يدي لعمار فليقتص مني إن شاء"[1] یہ میرا ہاتھ عمار کے سامنے ہے وہ اگر چاہیں تو مجھ سے اپنا قصاص لے سکتے ہیں اس پر جناب عمار رضی اللہ عنہ نے آپ کا ہاتھ چوما اور آپ سے راضی و خوش ہو گئے۔

اور اس کی واضح و قوی دلیل یہ ہے کہ محاصرہ کے ایام میں جناب عمار رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں شامل تھے جو بلوائیوں کو سمجھا بجھا کر اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے حقوق کو یاد دلا کر محاصرے سے روک رہے تھے اور جس دن آپ رضی اللہ عنہ کا پانی بند کیا گیا تو عمار رضی اللہ عنہ باہر آئے اور بلند آواز سے فرمایا "سبحان الله! قد اشترى بئر رومة وتمنعوه ماءها!"[2] سبحان اللہ جس نے بیر روم خریدا تم اس کا پانی بند کرتے ہو، پھر دوڑے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور کہا آج بلوائیوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کا پانی بند کر دیا ہے میں نے سمجھایا مگر وہ مانے نہیں کوئی ترکیب کرنی چاہیے کہ ان تک پانی پہنچ جائے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بلوائیوں سے کہنا سننا بیکار ہے وہ تو مانیں گے نہیں کوئی خفیہ تدبیر کرنی چاہیے آخر سعی و کوشش کر کے اونٹ کی ایک پکھال پانی بھر کر پہنچائی گئی لہذا جناب عمار رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر طعن کرنا تو اس مثل کا مصداق بنتا ہے کہ مدعی و مدعا علیہ راضی ہو گئے مگر منصف راضی نہیں ہوا۔

حضرت کعب بن عبدہ بہزی رضی اللہ عنہ کا قصہ

اور کعب بن عبدہ بہزی رضی اللہ عنہ کا قصہ پورا نہیں بیان کیا آدھا حصہ چھوڑ دیا، پورا قصہ یوں ہے کہ جب جناب کعب رضی اللہ عنہ کے پیٹنے کی اطلاع آپ کو ہوئی تو آپ نے جناب سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو ڈانٹ کر خط لکھا اور کہا

1۔ الرياض النضرة في مناقب العشرة، 3/ 98، ط: دار الكتب العلمية

2۔ المرجع السابق

کہ کعب کوئی عزت واحترام کے ساتھ میرے پاس بھیجو جب وہ آپ کے پاس پہنچے تو آپ نے کعب سے فرمایا تم نے مجھے بہت سخت خط لکھا یہ نہ مشورہ کا طریقہ ہے اور نہ بھائیوں کو نصیحت کرنے کا اصول نصیحت تو بڑے نرم اور دل نشین طریق پر کرنی چاہیے نہ کہ ڈانٹ ڈپٹ ہو خصوصاً خلفاء امراء کے معاملہ میں تو رفق و نرمی ہی لازم ہے فرعون باوجودیہ کہ مسلمہ شقی وبد بخت تھا مگر اس کے معاملے میں بھی اللہ تعالی نے اپنے اولوالعزم پیغمبر کو نرم روی کی تعلیم دی "فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا"[1] تم دونوں اس سے نرمی ورفق سے بات کرنا میں نے تمہارے مارنے پیٹنے کا حکم نہیں دیا تھا میرے حکم واجازت کے بغیر تمہیں پیٹا گیا ہے اس کے باوجود میں بدن سے قمیض اتارتا ہوں یہ چابک موجود ہے تم اپنا بدلہ مجھ سے لے سکتے ہو اس پر کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ کے اس منصفانہ جذبات وخیالات کو دیکھتے ہوئے میں اپنے معاملہ سے درگزر کرتا ہوں سخت الفاظ استعمال کرنے میں واقعی میں نے قصور کا ارتکاب کیا اس کے بعد جناب کعب رضی اللہ عنہ آپ کے مصاحب خاص کی حیثیت سے آپ کے پاس رہے۔

اشتر نخعی کا قصہ

اب رہا اشتر نخعی کا قصہ تو وہ اس طرح سے ہی جس طرح ان لوگوں نے بیان کیا ہے مگر وہ ناصحابی تھا نہ صحابی زادہ وہ تو کوفہ کا ایک فتنہ پرور اوباش تھا اس نے حاکم وقت کا لحاظ نہیں کیا خلیفہ کے عامل کی اہانت کی اور دوسروں کو بھی ورغلایا اگر ایسے شورہ پشتوں سے حاکم حکومت چشم پوشی کریں تو ایک فساد برپا ہو سکتا ہے، اشتر نخعی تو وہی ہے جس نے فتنہ کی بنیاد ڈالی اور بالاخر اس کی بھڑکائی ہوئی شورش نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جام شہادت پلایا مگر یہ اس کے بعد بھی فتنہ انگیزی سے باز نہ آیا حضرت طلحہ وحضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو اسی نے قتل کی دھمکیاں دے کر مدینہ چھوڑنے اور ام المومنین رضی اللہ عنہا کے دامن عافیت میں پناہ لینے پر مجبور کیا اور بالاخر جناب امیر رضی اللہ عنہ سے جنگ تک نوبت آئی اشتر نخعی کی یہ ساری فتنہ سامانیاں اور یہ حرکتیں جناب علی مرتضی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بد نظمی کا موجب بنی یہ ہمیشہ جناب امیر رضی اللہ عنہ پر حکم چلاتا تھا اس نے کبھی آپ کی ایسی اطاعت نہیں کی جیسی کسی خلیفہ وامام وقت کی جانی چاہیے تھی یہ باتیں نہ کوئی سربستہ راز ہیں نہ من گھڑت تاریخ کے اوراق میں محفوظ اور زبان زد خلائق ہیں۔

1۔ سورۃ طہ، الآیۃ : 44

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تو اس کے اور اس کے دوستوں کی فرمائش پر حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو والی کوفہ اور جناب حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما کو داروغہ خراج بھی مقرر فرمایا مگر فتنہ پرداز سرشت نے نچلا نہ بیٹھنے دیا سازشوں میں لگا رہا اہل مصر سے ساز باز کر کے آپ کو شہید کر دیا بعض روایات میں تو یہ ہے کہ خود بھی قتل میں شریک تھا قتل عثمان رضی اللہ عنہ کا واقعہ قیامت تک کے فتنہ کا سبب بنا اور اس فتنہ کے دروازے کو کھولنے والوں میں ایک نام اشتر نخعی کا بھی ہے ایسا شخص تو قتل کر دیا جاتا تو مناسب تھا کہ امت سے فساد کی جڑ کٹ جاتی اخراج اور ڈانٹ ڈپٹ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مروت و رحم دلی تھی کہ اسی تک نوبت پہنچ کر رہ گئی۔ (1)

طعن نمبر 6: حضرت عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے قصاص نہ لینا

چھٹا طعن اور اعتراض یہ کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جناب عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما(2) سے قصاص نہیں لیا حالانکہ انہوں نے ہرمزان بادشاہ اہواز جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مسلمان ہو گیا تھا قتل کر دیا تھا اور اس پر تہمت یہ لگائی کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک تھا اور پھر یہ تہمت بھی پایا ثبوت کو نہ پہنچی اور آپ نے ابولولو کی ایک کم عمر لڑکی کو مار ڈالا اور جفینہ نصرانی کو بھی اسی تہمت میں قتل کیا کہ وہ بھی قتل عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں شریک تھا، سب صحابہ جمع ہو کر آپ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے قصاص لیجئے جناب امیر رضی اللہ عنہ نے بھی یہی مشورہ دیا مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے دیت تو دے دی مگر قصاص نہیں لیا حالانکہ قصاص کا حکم کتاب اللہ سے ثابت ہے اور جو شخص کتاب اللہ کے حکم کا اجرا نہ کرے وہ امامت کے قابل نہیں۔

1۔ عن الشعبي، قال: لقي مسروق الأشتر، فقال: مسروق للأشتر: «قتلتم عثمان؟» قال: نعم قال: «أما والله لقد قتلتموه صواما قواما» (حلية الأولياء وطبقات الأصفياء، عثمان بن عفان وثالث القوم القانت ذو النورين، 1/ 57، رقم: دار الكتاب العربي بيروت)

2۔ یہاں اردو نسخہ مطبوعہ عالمی مجلس تحفظ اسلام ص:619 پر عبد اللہ بن عمر جبکہ فارسی نسخہ مطبوعہ مکتبۃ الحقیقۃ استنبول ترکی کے ص:652 پر عبید اللہ بن عمر ہے اور اسی طرح عربی نسخہ مطبوعہ مطبع السلفیہ القاہرہ کے جلد اول ص:264 پر بھی عبید اللہ بن عمر ہے اور یہی درست ہے اس لئے ہم نے اوپر عبید اللہ بن عمر لکھا ہے۔

جواب: جمہور علماء کے مذہب کے مطابق ابو لولو کی لڑکی کا قصاص نہیں لیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ مجوسیہ تھی اور اسی وجہ سے جفینہ نصرانی کا بھی ساس بھی واجب نہیں ہوتا کیونکہ نصرانی تھا اور مسلمان و نصرانی میں قصاص نہیں ہوتا اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح ارشاد موجود ہے:

لا يقتل مسلم بكافر[1] مسلمان کافر کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔

اب رہی بات ہرمزان کی کہ وہ بظاہر مسلمان تھا پھر بھی اس کا قصاص نہ لینے کی اہل سنت نے وجوہ بیان فرمائی ہیں:

اول: ہرمزان اہواز کا بادشاہ تھا اہل فارس کے ہاتھوں سے چونکہ اس کا ملک نکل چکا تھا جس کی وجہ سے ائمہ اسلام اور عام مسلمانوں پر یہ خار کھائے ہوئے تھا جنگ سے کامیابی کی امید کھو کر مکاری اور فریب سے کام لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے امان حاصل کی اس کے فریب کا قصہ تو بڑا مشہور ہے کہ جب وہ گرفتار ہو کر آیا تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا متفقہ فیصلہ تھا کہ اسے قتل کر دیئے جائے جب اسے خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا تو بڑی بے چینی کا اظہار کر کے پانی پلانے کی درخواست کی جب پانی کا پیالہ اسے دیا گیا تو کہنے لگا کہ پانی پینے اور سیر اب ہونے تک کی مجھے مہلت دی جائے تو پانی پی لوں ورنہ میں ادھر منہ پیالے سے لگاؤں اور ادھر میری گردن مار دی جائے تو کیا فائدہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اطمینان رکھ جب تک تو پانی نہ پی لے تجھے امان ہے کوئی تجھے نہ مارے گا اس مکار نے تمام حضرات کے سامنے دو تین مرتبہ اس کا اقرار کرایا پھر پانی زمین پر گرا دیا اور کہنے لگا اب مجھے قتل کرو گے تو نقض امان لازم آئے گا، جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ اس کی مکاری پر تعجب کے ساتھ فرمانے لگے کہ چالاک معلوم ہے تو ہوتے ہو بہتر ہے تم اسلام میں آجاؤ اس نے کلمہ پڑھا اور یوں مدینہ میں رہنے کی صورت نکال لی عراق کا کچھ علاقہ بھی بطور جاگیر اسے مل گیا یہاں رہ کر اس کو موقع ملا کہ وہ خلافت مآب رضی اللہ عنہ کے معمولات پر نظر رکھ سکے جب اس نے دیکھا کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے پاس نا حشم و خدم ہے نہ چوکی پہرا تو اسے بہت افسوس ہوا کہ ایسے بے احتیاط رئیسوں سے پیچھا چھڑانا کون مشکل بات تھی شاہان فارس ان حالات سے غافل ہی رہے اور ان کو قتل نہ کرا سکے چنانچہ اس نے ساز باز کی اور ابو لؤلؤ کو خفیہ طور پر بلا کر

1۔ صحيح البخاري، كتاب الدية، باب العاقلة، 9/ 11، رقم: 6903، ط: دار طوق النجاة

اسے حکم دیا اور شہادت امیر المومنین کا سانحہ پیش آیا جفینہ اور دوسرے کافروں کو بھی اس نے گانٹھ لیا تھا وہ سب اکٹھے ہو کر اس کام کے لیے ان تنہائی میں تدبیریں کرتے اور منصوبے سوچتے رہتے۔

چنانچہ عبید اللہ اور جناب عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے گواہ پیش کیے کہ ابو لؤلؤ اور جفینہ اس کے پاس آتے جاتے اور قتل امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے متعلق مشورے کرتے ہیں اور ہرمزان نے ہی آلہ قتل وہ دھاری خنجر تیار کرایا تھا اور کہتا تھا کہ وہ کون جواں مرد ہو گا جو اپنی قوم اور اپنے دین کی حمایت میں اس شخص سے بدلہ لے گا جس نے نہ ہماری عزت ہی مٹی میں ملائی دین و دولت کو بھی خاک میں ملا دیا چنانچہ اس کی انگیخت پر ابو لؤلؤ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم دینے والا ہرمزان ہی تھا تب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع میں یہ طے پایا کہ آلہ قتل لایا جائے اور جو صورت اس کی بیان کی گئی ہے اگر وہ اس کے مطابق نکلے تو شہادت پختہ اور ان تینوں کی شرکت قتل تسلیم کی جائے گی ورنہ نہیں جب وہ خنجر پیش ہوا تو وہ ہو بہو وہی تھا جس کے متعلق گواہوں نے گواہی دی تھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مسلک کے مطابق (اور یہی امام شافعی امام مالک اور دوسرے ائمہ رحمہم اللہ کا مذہب ہے) قتل کا حکم دینے والا خود واجب القتل ہوتا ہے اس لیے آپ نے قصاص نہیں لیا یہ حکم تو عام لوگوں کے بارے میں ہے لیکن خلفاء اور امامان ریاست کے متعلق یہ حکم ہے کہ ان کو قتل کرنے کا حکم دینے والا اگر بدلہ اور قصاص میں بھی نہ مارا جائے تب بھی از روئے سیاست اور تدبیر مملکت اس کا قتل از بس ضروری ہے۔[1]

1۔ قال القاضي أبو بكر بن العربي في (العواصم من القواصم) ص 107: كان ذلك والصحابة متوافرون والأمر في أوله وقد قيل: إن الهرمزان سعى في قتل عمر وحمل الخنجر وظهر تحت ثيابه. وفي تاريخ الطبري (5: 42) شهادة عبد الرحمن بن أبي بكر الصديق على الهرمزان مروية عن سعيد بن المسيب. وقال شيخ الإسلام ابن تيمية في منهاج السنة (3: 200): وقد قال عبد الله بن عباس لما طعن عمر – وقال له عمر: كنت أنت وأبوك تحبان أن تكثر العلوج بالمدينة – فقال ابن عباس: إن شئت قتلتهم. قال ابن تيمية: فهذا ابن عباس وهو أفقه من عبيد الله بن عمر وأدين وأفضل بكثير يستأذن عمر في قتل علوج الفرس مطلقا الذين كانوا في المدينة. لما اتهموهم بالفساد اعتقدوا جواز مثل هذا. وإذا كان الهرمزان ممن أعان على قتل عمر كان من المفسدين في الأرض المحاربين فيجب أنه يقتل بعمر بن الخطاب، فإنهم يعيدون لمقتل عمر ويسمون قاتله وهو أبو لؤلؤة (بابا شجاع الدين)

دوم: اگر اس کا احساس حضرت عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے لیا جاتا تو ایک بڑا ہنگامہ اور شورش برپا ہو جاتی کیونکہ بنو تیم بنو عدی بنو امیہ اور بنو تیم سارے کے سارے قصاص میں قتل کیے جانے کے خلاف تھے بلکہ بنو سہم تو خاص طور پر برہم اور آمادہ فساد تھے وہ تو کہتے تھے کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عبد اللہ سے قصاص لیں گے تو ہم خانہ جنگی شروع کر دیں گے چنانچہ جناب عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ رئیس بنو سہم نے تو بھرے مجمع میں با آواز بلند کہہ دیا تھا کہ بھائیو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کل امیر المومنین رضی اللہ عنہ قتل ہوئے اور آج ان کا بیٹا مارا جائے اللہ کی قسم ایسا ہرگز نہ ہو گا۔ (1)

اور یہ بات صحیح ہے کہ فتنہ فرو کرنے کی خاطر قصاص موقوف کر دیا جائے اور ورثاء مقتول کو درگزر یا دیت پر راضی کر لیا جائے تو درست ہے اور پھر اس بارے میں کیا کہا جائے گا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص بھی تو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے فتنہ کے خوف سے موقوف فرمایا تھا وہاں تو یہ بھی ہوا کہ بھروسہ عثمان رضی اللہ عنہ کو نا دیت دلائی گئی اور نہ ہی ان کو راضی کیا گیا یہاں تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہرمزان کے ورثاء کو اتنا مال و دولت دے کر راضی اور خوش کر دیا تھا کہ پھر وہ قصاص کا نام بھی زبان پر نہ لائے، اگر فتنہ کے خوف سے قصاص کی موقوفی کو وجہ اعتراض بنا لیا جائے تو جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خلاف نواصب کے طعن کا جواب نہ بن پڑے گا اس لیے صحیح جواب ہر دو اطراف یہی مناسب اور موضوع ہے کہ فتنہ کے خوف سے قصاص موقوف کیا گیا بلکہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں کسی خلش کی گنجائش بھی نہیں ہے کیونکہ انہوں نے ہرمزان کے ورثاء کو راضی کر لیا تھا۔

سوم: تیسری وجہ جیسا کہ بعض حنفیہ نے لکھا اور محمد بن جریر طبری اور دوسرے ائمہ مورخین نے اس کی تصریح

---

1 ۔ وقد غضب عثمان رضي الله عنه لتصرف عبيد الله، وعزم على معاقبته إلا إن بعض الصحابة منهم عبد الرحمن بن عوف وعمرو بن العاص رأوا أن مصلحة المسلمين الاكتفاء بالدية لعظم المصاب ولتجنب الفتنة، كما روى ابن عساكر: «عن نافع قال: رأى عبد الرحمن بن عوف السكين التي قتل بها عمر فقال: رأيت هذه أمس مع الهرمزان وجفينه، فقلت: ما تصنعان بهذه السكين؟، فقالا: نقطع بها اللحم فإنا لا نمس اللحم، فقال له عبيد الله بن عمر: أنت رأيتها معهما قال: نعم فأخذ سيفه ثم أتاهما فقتلهما، فأرسل إليه عثمان فأتاه فقال: ما حملك على قتل هذين الرجلين وهما في ذمتنا. فأخذ عبيد الله عثمان فصرعه حتى قام الناس إليه فحجزوه عنه قال وقد كان حين بعث إليه عثمان تقلد السيف فعزم عليه عبد الرحمن أن يضعه فوضعه». تاريخ دمشق: 38/ 61.

کی ہے کہ ہر مزان کے سارے ورثاء مدینہ منورہ میں موجود نہیں تھے کچھ فارس میں تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو طلب بھی فرمایا مگر غالباوہ ڈر کی وجہ سے نہیں آئے اور قصاص کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ سارے ورثاء حاضر ہوں اور مطالبہ کریں، ایسی صورت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لینا درست و جائز نہ تھا، لا محالہ ایسی صورت میں بغیر دیت اور کوئی صورت نہ تھی وہ بھی بیت المال سے دی جاسکتی تھی قاتل کے مال سے نہیں، کیونکہ کتب حنفیہ میں اس کی بھی تصریح ہے کہ امام عادل کے قتل میں جس نے کسی نوع کی مدد کی ہو گو وہ اس میں بالذات شریک نہ ہوا ہو وہ واجب القتل ہے۔

اور یہ بات کہ اس کے سارے ورثاء مدینہ منورہ میں موجود نہ تھے صرف اہل سنت کی ہی کتابوں سے نہیں معلوم ہوتی، شریف مرتضیٰ اور دوسرے امامیہ کے ہاں بھی اس کا مذکور ہے یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس موقعہ پر بعض شیعوں نے کچھ اور اعتراض بھی کئے تھے جن کا ذکر نصیر الدین طوسی نے اپنی کتاب تجرید میں کیا ہے، مگر شیعی مورخین نے ان کو اپنی تاریخوں سے حذف کر دیا ہے، اسی لئے ہم نے بھی ان کو مستقل طور پر ذکر نہیں کیا، اسی اعتراض کے ضمن میں اجمالی طور پر کچھ بیان کئے دیتے ہیں۔

ولید بن عقبہ پر حد جاری نہ کرنے کا اعتراض

ان اعتراضوں میں سے ایک اعتراض تو یہ ہے کہ جناب ولید بن عقبہ نے شراب پی مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس پر شراب کی حد جاری نہیں کی لیکن یہ روایت ہی غلط ہے یہی بات صاحب استیعاب نے کہی ہے اور طبری کہتے ہیں:

أنه تعصب عليه قوم من أهل الكوفة بغيا وحسدا، وشهدوا عليه زورا أنه تقيأ الخمر [1] اہل کوفہ نے ان سے تعصب برتا اور بغض وحسد کی بنا پر یہ جھوٹی گواہی دی کہ انہوں نے شراب کی قے کی۔

پھر یہ پورا قصہ بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا:

1۔ الاستيعاب في معرفة الأصحاب، 4/ 1555، ط: دار الجيل، بيروت

يا أخي، اصبر، فإن الله يأجرك ويبوء القوم بإثمك.[1] میرے بھائی تم صبر کرو اللہ تعالیٰ کو اس کا بدلہ عنایت فرمائے گا اور وہ لوگ تیرے گناہوں کا بوجھ اٹھائیں گے۔

اس کے بعد اصل صورت حال بیان کی ہے:

وهذا الخبر من نقل أهل الأخبار لا يصح عند أهل الحديث، ولا له عند أهل العلم أصل. والصحيح عندهم في ذلك ما رواه عبد العزيز بن المختار، وسعيد بن أبي عروبة، عن عبد الله الداناج، عن حصين بن المنذر أبي ساسان، أنه ركب إلى عثمان، فأخبره بقصة الوليد، وقدم على عثمان رجلان فشهدا عليه بشرب الخمر، وأنه صلى الغداة بالكوفة أربعا، ثم قال: أزيدكم، فقال أحدهما: رأيته يشربها، وقال الآخر: رأيته يتقيأها. فقال عثمان: إنه لم يتقيأها حتى شربها. وقال لعلي: أقم عليه الحد، فقال علي لابن أخيه عبد الله بن جعفر: أقم عليه الحد. فأخذ السوط وجلده، وعثمان يعد، حتى بلغ أربعين فقال علي: أمسك، جلد رسول الله ﷺ في الخمر أربعين، وجلد أبو بكر أربعين، وجلد عمر ثمانين، وكل سنة.[2]

اہل حدیث کے نزدیک اہل خبر کی یہ روایت صحیح نہیں اور نہ اہل علم کے نزدیک اس کی کوئی اصل بنیاد ہے ان کے نزدیک وہ روایت صحیح ہے جس کو عبد العزیز بن مختار اور سعید بن ابی عروبہ نے عبد اللہ الداناج سے روایت کیا ہے، اور اس نے حسین بن منذر ابی ساسان سے کہ وہ سوار ہو کر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ولید کے قصہ کی خبر دی، پھر دو آدمی بطور گواہ آئے اور انہوں نے اس کے شراب پینے کی گواہی دی اور یہ بھی کہا کہ اس نے فجر کی چار رکعت

1۔ الاستيعاب في معرفة الأصحاب، 4/ 1556، ط: دار الجيل، بيروت

2۔ الاستيعاب في معرفة الأصحاب، 4/ 1556، ط: دار الجيل، بيروت

پڑھائیں اور کہا یہ دو کی زیادتی میری طرف سے تمہارے لئے ہے ایک گواہ نے تو کہا میں نے اسے شراب پیتے دیکھا اور دوسرے نے کہا میں نے اسے شراب کی قے کرتے دیکھا اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس نے شراب پی تب ہی تو شراب کی قے کی اس لئے آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا اس پر حد جاری کر دیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بھتیجے عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے فرمایا ان کے کوڑے لگاؤ انہوں نے کوڑے مارنے شروع کئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی گنتی شروع کر دی جب چالیس کوڑے لگا چکے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا بس اب رک جاؤ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے چالیس چالیس کوڑے لگوائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی مگر یہ سب سنت ہیں۔

ایک اور روایت دیکھئے:

وروى ابن عيينة، عن عمرو بن دينار، عن أبي جعفر محمد بن علي، قال: جلد علي الوليد بن عقبة في الخمر أربعين جلدة بسوط له طرفان.[1]

ابن عیینہ نے بحوالہ عمرو بن دینار جناب ابی جعفر محمد بن علی باقر سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شراب کی حد میں ولید بن عقبہ کو چالیس کوڑے لگوائے کوڑا دو شاخہ تھا۔

اب آپ غور فرمالیں کہ ان کا اعتراض کہاں تک مبنی بر صداقت ہے۔

احد، بدر اور بیعت رضوان کے متعلق اعتراض

اور دوسرا اعتراض یہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جنگ احد میں ثابت قدم نہ رہے بھاگ اٹھے اور بیعت رضوان اور بدر میں آپ شریک نہ ہوئے۔

اب جہاں تک احد سے بھاگنے کا معاملہ ہے تو تیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوا سارے ہی تتر بتر ہو گئے تھے تو اعتراض صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کیوں؟ اور پھر اس معاملہ کو جب اللہ تعالیٰ نے معاف فرما کر رفت گذشت

1۔ الاستيعاب في معرفة الأصحاب، 4/ 1556، ط: دار الجيل، بيروت

کر دیا اور قرآن میں اس معافی کی آیت نازل فرمادی، تو اب تو کسی پر بھی اعتراض کی گنجائش نہ رہی، ترجمہ آیت: "جماعتوں کے ملنے والے دن جو لوگ تم سے منہ پھیر گئے تو در حقیقت ان کی بعض لغزشوں کے سبب شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیئے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ لغزش معاف فرمادی کیونکہ اللہ غفور رحیم ہے۔"(1)

اور بالفرض اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی بھاگتے تو شیعہ پھر بھی ان کو کہاں بخشتے دیکھو اس دن ثابت قدم رہنے والوں میں حضرت ابو بکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما سر فہرست رہے مگر شیعوں کے طعن سے ان کے سینے بھی فگار ہیں ثابت قدم رہنے والوں میں تیرہ مہاجر اور باقی انصار تھے، مگر ان میں سے اگر حضرات شیعہ نارک افگنی کا شکار ہیں! مہاجرین میں سے حضرت ابو بکر، حضرت عمر، جناب طلحہ، جناب عبد الرحمن بن عوف اور جناب سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم سارے کے سارے شیعہ دشمنی کا شکار ہیں یہی حال انصار رضی اللہ عنہم کا ہے۔

اہل سنت کے نزدیک ایسے موقعہ پر بھاگنا زیادہ سے زیادہ گناہ کبیرہ کے تحت آتا ہے جس سے لیاقت و قابلیت امامت متاثر نہیں ہوتی اور یہاں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی مل جانے کے بعد وہ گناہ بھی مٹ گیا تعصب سے خالی الذہن شخص کتب تاریخ و سیر کا مطالعہ کرے تو وہ ان بھاگنے والے حضرات کو معذور سمجھے گا کیونکہ سردار لشکر کے قتل کی افواہ کے بعد لشکر کا اپنی جگہ ڈٹے ہی رہنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے اور پھر یہ حضرات بھاگے ہی کہاں، لشکر گاہ میں ہی تتر بتر تھے کہ صورت حال کا صحیح علم ہوتے ہی سارے سمٹ آئے!

اب رہا بدر میں عدم شرکت کا واقعہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ بنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بی بی رقیہ رضی اللہ عنہا کی دیکھ بھال اور تیمارداری کے لئے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے آپ مدینہ میں رکے رہے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حکم سے بچوں اور اہل خانہ کی نگہداشت کیلئے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ غزوہ تبوک میں شریک ہو سکے تھے! اور اس صورت حال کی وجہ سے تو عدم حاضری حاضری سے بہتر شمار ہوتی ہے! یہ نادان خوب کو ناخوب سمجھ رہے ہیں یہی وجہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عثمان کو وہی اجر ملے گا جو بدر میں شریک دوسرے حضرات کو اور غنیمت میں بھی ایک آدمی کے برابر ان کا حصہ ہے!

1۔ إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ۔ (سورة ال عمران، الآية: 155)

رہی بیعت رضوان ! کہ وہ تو ہوئی ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وجہ سے وہ تو بذات خود اس بیعت کی غایت اور سبب تھے ! جب سوال یہ درپیش ہوا کہ کافروں سے جا کر کون سوال و جواب کرے تو کسی نے اس کی حامی نہ بھری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدمت پیغامبری اور سفارت کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا آپ تشریف لے گئے، تو یہ افواہ اڑ گئی کہ دشمنوں نے ان کو قتل کر دیا اور ایک بڑے لشکر کے ساتھ حملہ آور ہو رہا ہے تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے بیعت لی کہ عثمان رضی اللہ عنہ کا انتقام لینے کے لیے لڑتے لڑتے مر جائیں گے مگر منہ نہ موڑیں گے مگر بعد میں جب معلوم ہوا خبر جھوٹی تھی اور آپ زندہ ہیں تو لشکر میں تسلی و اطمینان پیدا ہوا اب ظاہر ہے کہ جو بیعت ان کی موت کی خبر کی بنا پر ہو رہی ہے وہ اس میں کسی طرح شریک ہو سکتے تھے، وہ موجود ہوتے تو بیعت رضوان ہی کہاں ہوتی اور پر یہ بھی تو دیکھو کہ اس موقعہ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سیدھا ہاتھ بائیں ہاتھ پر مار کر فرما رہے ہیں کہ یہ ہاتھ عثمان کا ہے یا بعض روایات کے مطابق یہ ہاتھ عثمان کے لئے ہے، یعنی اس کے ذریعہ عثمان بھی شریک بیعت شمار ہوں گے تو جس جگہ ایسا ذی حشم اور مولائے کائنات نائب موجود ہو تو وہاں ان کی عدم حاضری کا کیا نقصان اور ضرر ہے، غرض ان اعتراضات کے بودے پن کا احساس کر کے ہی اکثر علماء امامیہ نے ان کو اپنی کتابوں سے خارج کر دیا ہے۔

طعن نمبر 7: جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو بدل ڈالا

ساتواں اعتراض یہ ہے کہ جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو بدل ڈالا اس لئے کہ 10 تا 14 ذی الحجہ آپ نے منیٰ میں پوری نماز ادا فرمائی قصر نہیں کیا حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں عموماً اور اس جگہ خاص طور پر قصر فرماتے تھے اسی بنا پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کے طرز عمل پر اعتراض بھی کیا؟

جواب: تعصب ملاحظہ ہو کہ بات میں زور پیدا کرنے کیلئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اعتراض کا تو ذکر کیا مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جواب کو گول کر گئے جن حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ اعتراض کیا تھا وہ حقیقت حال سے واقف نہیں تھے ان کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں نے مکہ میں بھی ایک شادی کر کے یہاں بھی اپنا گھر بنا لیا ہے اب میں یہاں مسافر نہیں رہتا اس لئے قصر بھی نہیں کرتا اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ پر اعتراض نہیں کیا امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کا یہ جواب امام احمد، طحاوی، ابو بکر بن ابی شیبہ اور ابن عبد البر نے اپنی کتابوں

میں نقل کیا ہے روایت کے الفاظ یہ ہیں:

أن عثمان بن عفان صلى بمنى أربع ركعات، فأنكره الناس عليه، فقال: يا أيها الناس، إني تأهلت بمكة منذ قدمت، وإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقول: من تأهل في بلد فليصل صلاة المقيم(1)

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو منیٰ میں نماز پڑھائی تو چار رکعت پڑھائی جس پر لوگوں نے آپ پر اعتراض کیا تو جوابا آپ نے فرمایا کہ لوگو! جب سے میں آیا ہوں تب سے مکہ مکرمہ میں خانہ داری کر لی ہے شادی کر کے یہاں گھر لے لیا ہے، اور یہ بات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جو کوئی کسی شہر میں خانہ دار ہو جائے تو وہ اس شہر میں مقیم کی طرح نماز پڑھے۔

اس کے بعد تو کسی اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہی ایسی صورت میں تمام مذاہب کے علماء کے نزدیک قصر درست نہیں

طعن نمبر 8: مدینہ کی چراہ گاہ نقیع کو قرق کیا

حوالی مدینہ منورہ کی چراہ گاہ نقیع نامی کو قرق کر کے لوگوں کو اس چراہ گاہ سے روک دیا پھر آہستہ آہستہ اس کا رقبہ دوگنا کر کے رمنہ میں داخل کر دیا حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"المسلمون شركاء في ثلاث: الكلاء والماء والنار"(2)

تین چیزوں میں سارے مسلمان شریک ہیں پانی گھاس، چارہ اور آگ۔

نیز مدینہ کے بازار کو قرق کیا تا کہ ان کا گماشتہ جب تک کھجور کی گٹھلیوں کی خرید و فروخت سے فارغ نہ ہو جائے کوئی اور گٹھلیاں نہ خریدے، اور دریا کی کشتیوں کو قرق کیا تا کہ ان کے مال تجارت کے علاوہ کوئی اور مال نہ لے جائیں۔

جواب: چراہ گاہ کا قصہ صحیح ہے، اور اس کی وجہ آپ رضی اللہ عنہ نے خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے روبرو بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

1۔ مسند الامام احمد بن حنبل، 1/ 496، رقم: 443، ط: موسسة الرسالة

2۔ مصنف ابن أبي شيبة، 5/ 391

"لا حمى إلا لله ورسوله "[1] چراہ گاہ صرف اللہ اور اس کے رسول ہی کے لئے ہے، اور میں نے اس کو صدقہ اور بیت المال کے اونٹوں اور جہاد کے گھوڑوں کے لئے چراہ گاہ بنایا ہے اور چراہ گاہ کو رستہ ٹھہرایا ہے حضور ﷺ نے جہاد کے گھوڑوں اور صدقہ کے اونٹوں کے لئے خود چراگاہ بنائی ہے، اس پر صحابہ کرام نے فرمایا حضور ﷺ نے تو بہت مختصر سی چراہ گاہ بنائی تھی مگر آپ نے تو اس سے کئی گناہ بڑی بنائی؟ آپ نے فرمایا کہ اس وقت کے بیت المال اور اس وقت کے بیت المال میں موازنہ کرلو اور اسی تناسب سے چراہ گاہ میں زیادتی سمجھ لو آپ کے اس جواب کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تسلیم کرلیا اور خاموش ہو رہے!

بازار قرق کرنے والی بات سراسر غلط ہے، اتنی بات ضرور ہوئی کہ حارث بن حکم جو بازار کا داروغہ تھا اس نے اپنی طرف سے کچھ ایسی پابندی عائد کی تھی، اور یہ بات دو تین روز ہی چلی جب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوا داروغہ کو موقوف فرمادیا۔

رہا کشتیوں کا معاملہ، تو وہ ان کی ذاتی ملکیت کی کشتیاں تھیں، پہلے جب اور لوگوں کی اپنی کشتیاں نہیں تھیں تو وہ اپنا مال واسباب مع گماشتوں کے آپ کی ہی کشتیوں میں لایا کرتے تھے جب اور لوگوں نے بھی کشتیاں بنالیں تو آپ نے اپنی کشتیوں پر مال برداری کی ممانعت فرمادی کہ دوسروں کا مال بار نہ کریں یہ نہیں کیا جیسا کہ اعتراض سے تاثر ملتا ہے، کہ سب ہی کی کشتیوں کو قرق وپابند کردیا ہو پہلے اجازت دینا ان کا احسان تھا اب اگر آپ یہ احسان نہیں کررہے تھے تو اس میں ملامت وطعن کی کیا بات ہے؟

طعن نمبر9: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دوستوں کو جاگیریں دیں

نواں اعتراض یہ ہے کہ آپ نے اپنے دوستوں اور مصاحبوں کو بہت سی جاگیریں، اور ارضی قطعات عنایت فرمائے جو بیت المال کی ارضیات میں سے تھے اس طرح آپ نے گویا مسلمانوں کا حق تلف کیا۔

جواب: آپ نے اپنے رفیقوں یا مصاحبوں کو ارضی قطعات دیئے وہ تمام اس مقصد کے لئے تھے کہ افتادہ اور غیر آباد زمین کو آباد کریں کاشت شدہ زمین آپ نے کسی کو مرحمت نہیں فرمائی اس کی ساری تفصیلات کتب

1۔ مصنف ابن أبي شيبة، 5/ 391

تاریخ میں محفوظ ہیں، افتادہ اور بنجر زمین اگر آباد ہو جائے تو اس میں تو ملک اور قوم کی بھلائی ہے ملک آباد ہوتا ہے حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے اور خلق خدا کے رزق میں وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی ہے بھلا اس میں اچھائی کا کون سا پہلو ہے کہ ہزاروں ایکڑ زمین ناکارہ پڑی رہے، نہ ملک کے کام آئے نہ مخلوق خدا کے، بلکہ چوروں، ڈاکوؤں کی پناہ گاہ کے کام آئے! ملک آباد ہوں، زمین کا چپہ چپہ پر کاشت ہونے لگے تو ایک طرف خلق خدا کو آسودگی میسر آتی ہے دوسری طرف رہزنوں اور فسادیوں کے ٹھکانے بھی ختم ہو جاتے ہیں، یہ تو قابل تعریف کارنامہ تھا جو بغض و عناد رکھنے والوں نے طعن میں بدل ڈالا۔

اس کے علاوہ اہل سیر نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ آپ کے زمانہ میں یمن کے بہت سے شریف خانہ بدوش آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے ہم نے جہاد کی خاطر اپنا گھر اور زمینیں چھوڑی ہیں آپ انہیں جہاد کے علاقوں کے قرب وجوار میں زمینیں عنایت فرمائیں تاکہ دشمنان اسلام کے ساتھ جہاد میں دور دراز کی مسافت سے بھی بچیں، اور باری باری اس میں حصہ لے سکیں، اس وقت فارس کا علاقہ اس علاقہ کے زمیندار بہت سرکش تھے ان لوگوں کو آپ نے وہیں آباد کیا اور انہیں حدود میں ان کو ان کی متروکہ زمین کے بدلے قطعات اراضی عنایت فرمائے اور بعض صحابہ کی زمین بطور تبادلہ بھی ان کو دی، مثلاً جناب طلحہ رضی اللہ عنہ سے ان کی حضر موت والی زمین اُن کو دلوادی، اور ان کی حضرت علی کو، اور جناب اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ سے کندہ کی زمین لے کر، ان کو دوسری جگہ اس کے بدلہ دیدی، اور یہ سب کچھ باہمی رضامندی سے ہوا، اس میں طعن واعتراض کہاں سے نکل آیا۔ (1)

---

1 ـ قال الإمام أبو يوسف صاحب أبي حنيفة في كتاب (الخراج) ص 61 صبع المطبعة السلفية: وقد اقطع رسول الله صلى الله عليه وسلم وتألف على الإسلام أقواما وأقطع الخلفاء من بعده من رأوا أن في إقطاعه صلاحا (وضرب أبو يوسف الأمثلة على ذلك). وانظر باب القطائع ص 77 ، 78 من كتاب (الخراج) ليحيى بن آدم القرشي طبع السلفية أيضا. وذكر الإمام الشعبي بعض الذين اقطعهم عثمان فقال: «واقطع الزبير، وخبابا، وعبد الله ابن مسعود، وعمار بن ياسر، ابن هبار. فإن يكن عثمان أخطأ، فالذين قبلوا منه الخطأ أخطأوا، وهم الذين أخذنا عنهم ديننا» (انظر الطبري 4: 148). وأقطع علي بن ابي طالب كردوس بن هاني (الكردوسية)، وأقطع سويدا بن غفلة أرضا لدا ذويه. فكيف ينكرون على عثمان ويسكتون عن عمر وعلي؟ وللقاضي أبي يوسف كلام سديد في هذا الموضوع في كتاب (الخراج) ص 60 ، 62.

طعن نمبر 10: سارے ہی صحابہ ان کے قتل پر خوش تھے

شیعہ کہتے ہیں سارے ہی صحابہ ان کے قتل پر خوش تھے، ان کی ہجو اور مذمت کرتے تھے تین دن ان کا لاشہ یوں ہی ڈالے رکھا اور دفن کی کوشش نہ کی!

جواب: دروغ گو بر روئے تو، اس قسم کا اعتراض شیعوں کے سوا اور کوئی کر بھی نہیں سکتا صریح جھوٹ اور بہتان انہیں کا حصہ ہے! اگر سارے ہی صحابہ ان سے ناخوش تھے تو ان کے قصاص کیلئے لڑانے والے یہ طلحہ، زبیر عائشہ، معاویہ اور عمرو بن عاص وغیر ھم رضی اللہ عنہم کون تھے؟ اور یہ کس عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے لڑ رہے تھے، کیا انہوں نے کسی اور خیالی ورسمی عثمان کے لئے یہ ساری تگ و دو کی تھی سنیوں اور شیعوں دونوں کی تاریخیں موجود ہیں بلوہ مٹانے کی سارے صحابہ نے کوشش کی جب بلوائیوں نے ان کی کوئی بات نہ سنی تو انہیں حضرات نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مقابلہ کی اجازت مانگی آپ نے لڑائی کی اجازت نہ دی بڑی شدت سے ان کو روکا آپ کے منع کرنے پر وہ حضرات خاموش تو ہو گئے مگر آپ کی پانی اور دیگر تکالیف کے ازالہ میں آخر دم تک کوشاں رہے، اور تدبیر و حیلہ سے کام لیتے رہے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ انصاری جمعیت کے ساتھ آپ کے پاس آئے نوجوانان انصار نے ان سے کہا" إن شئت كنا أنصار الله مرتين "[1] آپ اجازت دیں تو ہم دوبارہ بھی انصار اللہ کا کردار ادا کریں۔

ادھر حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تمام مہاجرین کو لے کر آپ کے پاس آئے اور فرمانے لگے کہ آپ پر چڑھ دوڑنے والے یہ لوگ ہماری تلواروں کے زخم خوردہ ہیں، اس سے ڈر کر مسلمان ہوئے ہیں اب بھی ڈر سے ان کے ہوش خطا ہیں یہ ساری ہاؤ ہو اور لن ترانیاں صرف اس لئے ہیں کہ وہ بظاہر کلمہ گو ہیں اور آپ کلمہ کی عزت و حرمت کا پاس ولحاظ کرتے ہیں آپ حکم دیں ابھی ذرا دیر میں ان کو وہ بات یاد دلا دیں جو ان کے حافظہ

1۔ عن يحيى بن زيد بن ثابت قال: «لما حصر عثمان أتاه زيد بن ثابت فدخل عليه الدار، فقال له عثمان: أنت خارج الدار أنفع لي منك ههنا، فذب عني، فخرج فكان يذب الناس ويقول لهم فيه، حتى رجع لقوله أناس من الأنصار وجعل يقول: يا للأنصار كونوا أنصار الله مرتين انصروه، والله إن دمه». تاريخ ابن دمشق: 19/ 320؛ ابن الأثير، الكامل في التاريخ: 3/ 82.

سے محو ہو گئی ہے، اور ان کو ان کی حقیقت سے آگاہ کر دیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا صبر، حلم و مروت ملاحظہ ہو کہ آپ نے فرمایا ایسا نہ کہو میری جان کی خاطر اسلام میں رخنہ پیدا نہ کرو اس کے باوجود حضرات حسنین، عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن زبیر، ابو ہریرہ، عبد اللہ بن عامر بن ربیعہ، اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں موجود رہے اور جب بھی بلوائی ہلہ بولتے تو یہ حضرات مدافعت کرتے اور ان کو دھکیل دیتے۔[1]

ان کے علاوہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ذاتی غلاموں کی اچھی خاصی نفری موجود، اگر آپ ذرا بھی اشارہ فرمادیتے، تو بلوائیوں کو اپنی حقیقت معلوم ہو جاتی یہ سب حضرات نہتے بھی نہیں تھے ہتھیاروں سے مسلح اور پوری طرح تیار ہو کے آپ کے پاس آئے، وہ بلوائیوں سے دو دو ہاتھ کرنے کو سخت بے چین اور بے قرار تھے وہ کہتے تھے کہ ہم وہی تو ہیں جن کی تلوار کی تاب خراسان سے لے کر افریقہ تک کوئی نہ لا سکا صرف آپ اجازت دے دیں پھر دیکھئے ہم ان کا کیا حشر کرتے اور تماشا بناتے ہیں یہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانیں گے یہ سمجھ گئے کہ کلمہ کی حرمت کے سبب کوئی ہمیں نہیں چھیڑتا اسی لئے دیدہ دلیر ہو گئے ہیں اور سمجھانے بجھانے کو خاطر میں نہیں لاتے نہ آپ کی بات سنتے ہیں نہ صحابہ کرام کے کہنے پر کان دھرتے ہیں مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہی فرماتے رہے کہ میری رضامندی چاہتے اور میرے احسان و سلوک کا حق ادا کرنا چاہتے ہو تو اپنے ہتھیار رکھو اور اپنے اپنے گھر جاؤ، اور سنو، جو اپنے ہتھیار رکھ دے وہ میری غلامی سے آزاد ہے۔

"واللہ لان اقتل قبل الدماء احب الي من ان اقتل بعد الدماء"[2]

1۔ عن عبد الله بن رباح أنه قال: «انطلقت أنا وأبو قتادة إلى عثمان حين حصره القوم فلما خرجنا من عنده استقبلت الحسن بن علي بن أبي طالب داخلا عليه فرجعنا معه لننظر ما يقول له الحسن فقال يا أمير المؤمنين مرني بأمرك فإني طوع يديك فمرني بما شيء ت فقال له عثمان ابن أخ ارجع فاجلس في بيتك حتى يأتي الله بأمره فلا حاجة لنا في إهراق الدماء». تاريخ دمشق: 39/ 390 – 391. وفي رواية أخرى: «الحسن بن علي كان آخر من خرج من عند عثمان».

2۔ عن جابر بن عبد الله الأنصاري أن عليا أرسل إليه يعني إلى عثمان إن معي خمسمائة دارع فأذن لي فأمنعك من القوم فإنك لم تحدث شيئا يستحل به دمك قال جزيت خيرا ما أحب أن يهراق دم في سببي-(تاريخ الدمشق، حرف العين، عثمان بن عفان بن أبي العاص إلخ، 398/ 39، ط: دار الفكر)

خدا کی قسم مجھے یہ بات زیادہ محبوب ہے کہ میں خونریزی کرائے بغیر قتل کر دیا جاؤں، بجائے اس کے خونریزی کراؤں اور پھر قتل ہو جاؤں۔

مطلب یہ تھا کہ میرا قتل مقدر ہو چکا ہے میرے محبوب ﷺ اس سے آگاہ فرما چکے ہیں اگر تم لڑے بھی تب بھی میری شہادت نہیں ٹلے گی تو اس خونریزی کا کیا حاصل جس سے مقصد و مدعا بھی حاصل ہو۔

یہ بات فریقین کی تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادوں، اولاد ابو جعفر اور اپنے مصاحب خاص قنبر کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دروازہ پر متعین فرمادیا تھا نیز حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما نے بھی اپنے لڑکوں کو حفاظت کے لئے متعین کیا ہوا تھا کہ بوقت ضرورت بلوائیوں کا مقابلہ کریں، چنانچہ جب بھی بلوائی ہلہ بولتے تھے تو یہ حضرات پتھروں اور ڈنڈوں سے مار مار کر انہیں بھگا دیتے تھے اسی مدافعتی لڑائی میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے چوٹ کھائی، محمد بن طلحہ اور قنبر کے سر چھوٹے، مگر دروازہ سے بلوائیوں کو داخل نہ ہونے دیا برابر کے کسی انصاری کے گھر میں نقب لگا کر اندر گھسے اور آپ کو شہید کر ڈالا۔[1]

شیعوں کی صحیح ترین کتاب اس واقعہ کی گواہ ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ مروی ہیں "واللہ قد دفعت عنہ"[2] اللہ کی قسم میں نے خود ان کا دفاع کیا ہے، آپ جب بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لاتے، بلوائیوں کو کوڑے مار کر دور ہٹاتے، انہیں برا بھلا کہتے۔

کسی مومن کا یہ کام نہیں کہ اس تمام بات چیت اور معاملہ کو نفاق کہے اور ظاہر و باطن کے اختلاف پر محمول کرے خود جو منافق ہو وہی ایسی بات منہ سے نکال سکتا ہے اور ایسے پاک دل بزرگ کے دامن کو اپنے

1۔ وقال للحسن والحسين: اذهبا بسيفيكما حتى تقوما على باب عثمان فلا تدعى أحدا يصل إليه، وبعث الزبير ابنه عبد الله، وبعث طلحة ابنه على كره، وبعث عدة من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم أبناء هم ليمنعوا الناس من الدخول على عثمان... وقد رمى الناس عثمان بالسهام حتى خضب الحسن بالدماء على بابه وأصاب مروان سهم وهو في الدار وخضب محمد بن طلحة وشج قنبر مولى علي. (نسب قريش، نسب بني عبد شمس بن عبد مناف،عثمان بن عفان،مسير أهل الأمصار إلى عثمان إلخ،558/5، ط:دار الفكر)

2۔ شرح نهج البلاغة: 13/ 296

ناپاک خیال سے آلودہ کر سکتا ہے اور اگر اسوقت نفاق (تقیہ) کی گنجائش تم کہتے ہو تو کوفہ میں جبکہ آپ خلیفہ امام تھے، جو خطبہ مرحمت فرمایا اس میں کیوں قسم کھائی کہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو دفع کیا ہے اور آپ کی شہادت کے بعد بانگ دہل یہ کیوں فرمایا:

أيها الناس تدرون ما مثلي ومثلكم ومثل عثمان كمثل ثلاثة اثوار كن في أجمة ثورا بيض وثور اسود وثور احمر ومعهم أسد و كان الأسد لا يقدر عليهم لاجتماعهم عليه واتفاقهم فقال الأسد للثور الأسود والأحمر انه لا يدل الناس صح علينا الا الثور الأبيض فإنه مشهور بالبياض فلو تركتماني آكله فتصفوا الأجمة لنا ونعيش فيها فقالا له افعل فاكله ثم لبث مدة وقال للثور الأحمر انه لا يدل علينا الناس الا الثور الأسود بسواد لونه فان لوني ولونك لا يختلفان ويشبهان فان تركتني آكله فتصفو الأجمة لي ولك فقال افعل فاكله ثم لبث مدة وقال للثور الأحمر اني آكلك فقال دعى أنادي ثلاثة أصوات فقال ناد فصاح الا اني اكلت يوم اكل الثور الأبيض قالها ثلاثا ثم قال علي عليه السلام الا اني وهنت يوم قتل عثمان(1)

میری اور عثمان کی مثال ان تین بیلوں کی سی ہے جو ایک جنگل میں تھے ایک کالا، دوسرا سفید اور تیسرا سرخ تھا اس جنگل میں ایک شیر بھی تھا مگر تینوں کے اتفاق واتحاد کے سبب ان کا شکار نہیں کر سکتا تھا اس نے چال چلی اور کالے اور سرخ بیل سے کہا کہ اس جنگل میں ہمارے موجود ہونے کی کسی کو خبر نہیں ہو سکتی، اس لئے تمہارا اور میرا رنگ تو ایک سا ہے البتہ یہ سفید بیل جس کا اجلا رنگ سب کو نظر آجاتا ہے، ہم سب کو مروائے گا اگر تم کچھ نہ کہو تو میں اس کو کھا جاؤں، پھر دونوں کے

1۔ مستدرك نهج البلاغة الموسوم بمصباح البلاغة في مشكاة الصياغة، للطباطبائي، 1/ 66، ط: سنة 1388 هـ

لے جنگل میں کوئی خطرہ نہیں رہے گا، دونوں نے کہا ٹھیک ہے اسے کھا جاؤ چند دن گذرے تھے کہ سرخ بیل کے پاس آیا اور کہنے لگا ہم تم تو ہم رنگ ہیں یہ کالا ہم میں نہیں ملتا اسے بھی کھا جاؤں؟ سرخ بیل نے کہا کھا جاؤ، شیر اسے بھی چٹ کر گیا اب سرخ سے کہا اب تمہاری باری ہے اس نے کہا مجھے اتنی مہلت دو کہ میں تین دفعہ آواز نکالوں، شیر نے کہا ٹھیک ہے نکالو آوازیں! بیل نے کہا سنو! میں تو اسی دن کھالیا گیا تھا جب سفید بیل کھالیا گیا تھا پھر امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے بآواز بلند فرمایا، سنو! میں اسی دن سبک (بے قدر) ہو گیا تھا جس دن عثمان قتل کیے گئے۔

اور جناب عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہر روز صبح بلوائیوں کے پاس جاتے اور کہتے ان کو قتل نہ کر دینا کہ ان کے قتل کے نتیجہ میں فتنے اور فساد برپا ہوں گے اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ جو منافقین کے متعلق پورا علم رکھتے تھے اور جناب امیر رضی اللہ عنہ نے ان کے اس علم کی گواہی بھی دی ہے وہ ہمیشہ ڈرایا کرتے تھے کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل نہ کرنا کہ یہ امر فتنہ و فساد کا سبب بن جائے گا،[1] یہ قصہ شہرت و تواتر میں اس حد تک پہنچا ہے کہ فریقین کی کتابوں میں محفوظ و مذکور ہے اس کا اب کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اور آپ کا دفن نہ ہونا تو اس کا سبب بلوائیوں کا ہلڑ اور فساد تھا اور افراتفری جو ان اوباشوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ڈرا دھمکا کر پھیلا دی تھی اس کا باعث بنی، رات کو جب بلوائی نیند میں مدہوش تھے تو حضرات زبیر بن عوام، حکیم بن حزام، مسور بن مخرمہ، جبیر بن مطعم، ابو جہم بن حذیفہ بدری، یسار بن مکرم اور آپ کے لڑکے عمرو بن عثمان رضی اللہ عنہم نے شہیدوں کی طرح خون آلود کپڑوں میں نماز جنازہ ادا کر کے آپ کو دفن کیا جناب جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ کی امامت کی تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت بھی شریک تھی، جن میں حسن بصری، امام مالک کے دادا مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، آدمیوں کے علاوہ آپ کے جنازہ میں فرشتے بھی شریک تھے، چنانچہ حافظ دمشقی نے مرفوعاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ مبارک روایت کیے ہیں:

1۔ عن ابن عمر، قال: ذكر رسول الله صلى الله عليه وسلم فتنة، فقال: يقتل هذا فيها مظلوما لعثمان. (سنن الترمذي، باب في مناقب عثمان بن عفان، 6/ 71، رقم: 3708، ط: دار الغرب الإسلامي بيروت)

يوم موت عثمان تصلي عليه ملائكة السماء[1]

جس دن عثمان وفات پائیں گے آسمان کے فرشتے ان پر نماز جنازہ پڑھیں گے۔

اس روایت کی تائید ابن ضحاک کی روایت سے بھی ہوتی ہے جو بطریق سہم بن خنیس مروی ہے یہ شہادت کے واقعہ میں موجود تھے وہ کہتا ہے:

فلما أمسينا قلت لئن تركتم صاحبكم حتى يصبح مثلوا به فانطلقوا به إلى بقيع الغرقد فأمكنا له من جوف الليل ثم حملناه فغشينا سواد من خلفنا فهبناهم حتى كدنا أن نتفرق عنه فنادي لا روع عليكم أثبتوا فإنا جئنا لنشهد معكم فكان بن حيش يقول هم والله الملائكة عليهم السلام[2]

جب شام ہوئی تو میں نے لوگوں سے کہا اگر ہم نے اپنے سردار کو صبح تک اسی حال میں رہنے دیا تو یہ بلوائی ان کے ناک کان کاٹ کر مثلہ کر دیں گے ہمیں آدھی رات کے وقت ان کی لاش اٹھانے موقع ملا تو ہم ان کو لے کر بقیع کی طرف چلے تو اچانک ایک جماعت نے ہمیں پیچھے سے آگھیرا جس سے ہم ڈر گئے ہم ان کی وجہ سے بھاگنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک کسی نے پکار کر کہا ڈرو مت حوصلہ رکھو ہم بھی جنازہ میں شرکت کیلئے آئے ہیں، ابن خنیس کہتے تھے کہ وہ فرشتے تھے۔

اور یہ جو کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی ہجو اور برائی کیا کرتے تھے تو ان کی من گھڑت اور افتراء محض ہے، اس سلسلہ میں اہل بیت کی ایک روایت ملاحظہ ہو:

عن ابن عباس قال: رأيت النبي صلى الله عليه وسلم في المنام على برذون وعليه عمامة من نور متعمما بها وبيده قضيب من الفردوس فقلت: يا رسول الله إني

1۔ أخرجه: الطبراني، المعجم الأوسط: 3/ 287، رقم 3172؛ الديلمي، مسند الفردوس: 5/ 533، رقم 8999؛ ابن عساكر، تاريخ دمشق: 18/ 393.

2۔ الآحاد والمثاني، للضحاك، 1/ 128، ط: دار الدراية للطباعة والنشر والتوزيع السعودية الرياض

إلى رؤياك بالأشواق وأراك مبادرًا فالتفت إلي وتبسم وقال: "إن عثمان بن عفان أضحى عندنا في الجنة ملكا عروسا وقد دعينا إلى وليمته فأنا مبادر"[1]

جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حال میں دیکھا کہ گھوڑے پر سوار ہیں نورانی عمامہ زیب سر ہے، اور جنت کے کسی درخت کی چھڑی دست مبارک میں ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تو آپ کے دیدار کا مشتاق ہوں مگر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کہیں تشریف لے جانے کی عجلت ہے تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف توجہ فرمائی اور مسکراتے ہوئے فرمایا کہ عثمان بن عفان ابھی صبح ہمارے پاس جنت میں آئے ہیں اور اس طرح آئے ہیں جیسے شاہی دولہا، اور ہمیں ان کی دعوت ولیمہ میں بلایا گیا ہے اسی لئے میں ذرا جلدی میں ہوں۔

یہ روایت حسین بن عبد اللہ البناء الفقیہ نے بیان کی ہے، اور ابو شجاع دیلمی جو مشہور محدثین میں شمار ہوتے ہیں اور جن کو شیعہ بھی معتبر مانتے ہیں اپنی کتاب منتقی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی خواب اسی طرح بیان کرتے ہیں، اسی طرح اسی طرح حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا خواب بھی صحیح روایت کے ساتھ مشہور ہے جسے دیلمی مذکور نے بھی منتقی میں روایت کیا ہے:

عن الحسن بن علي قال «ما كنت لأقاتل بعد رؤيا رأيتها: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم واضعا يده على العرش، ورأيت أبا بكر واضعا يده على منكب رسول الله صلى الله عليه وسلم ، ورأيت عمر واضعا يده على منكب أبي بكر، ورأيت عثمان واضعا يده على منكب عمر، ورأيت دما دونه، فقلت: ما هذا؟ فقالوا: دم عثمان يطلبه الله تعالى به».[2]

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ جو خواب میں دیکھ چکا ہوں اس کے بعد

1۔ الرياض النضرة في مناقب العشرة، 3/ 76، ط: دار الكتب العلمية

2۔ أخرجه أبو يعلى في مسنده: 12/ 138؛ ابن عدي، الكامل في ضعفاء الرجال: 2/ 167

اب میں نہیں لڑوں گا میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ عرش پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں آپ کے برابر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے شانوں پر ہیں اور جناب عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر ٹکے ہوئے ہیں وہاں میں نے خون دیکھا اور اس کے بارے میں پوچھا کہ یہ کیا ہے تو جواب ملا یہ خون عثمان ہے جو اللہ تعالیٰ سے اپنا قصاص طلب کر رہا ہے؟

اور ابن سمان نے قیس بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے یوں روایت کی ہے:

قال سمعت عليا يوم الجمل يقول «اللهم إني أبرأ إليك من دم عثمان، ولقد طاش عقلي يوم قتل عثمان، وأنكرت نفسي، وجاءوني للبيعة فقلت: ألا أستحي من الله أن أبايع قوما قتلوا رجلا قال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: ألا أستحي من رجل تستحي منه الملائكة، إني لأستحي من الله أن أبايع وعثمان قتيل في الأرض لم يدفن بعد، فانصرفوا. فلما دفن رجع الناس يسألون البيعة فقلت: اللهم إني مشفق مما أقدم عليه. ثم جاءت عزيمة فبايعت. قال: فقالوا «يا أمير المؤمنين» فكأنما صدع قلبي»[1]

یوم الجمل کے موقعہ پر میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے سنا ہے اے اللہ میں تیرے سامنے خون عثمان سے برأت ظاہر کرتا ہوں جس دن ان کا قتل ہوا صدمہ سے عقل گم ہو گئی اور مجھے حد درجہ صدمہ و ناگواری ہوئی پھر وہ لوگ بیعت کے لئے میرے پاس آئے تو میں نے ان سے کہا کہ میں ان لوگوں سے نہ شرماؤں جنہوں نے عثمان کو قتل کیا، جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ جس سے فرشتے شرماتے ہیں کہ میں اس سے نہ شرماؤں مجھے اللہ تعالیٰ سے

1 ـ أخرجه الحاكم في المستدرك: 3/ 101.

حیا آتی ہے کہ وہ تو بے گور و کفن کشتہ پڑے ہوں اور میں بیعت لے لوں تو سب لوگ واپس چلے گئے، اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مدفون ہو چکے تو لوگ پھر واپس آئے اور بیعت پر اصرار کرنے لگے تو میں نے کہا، اے اللہ میں جو اقدام و بیعت کر رہا ہوں اس سے میں ڈر رہا ہوں، پھر مجھے موجودہ حالات کے پیش نظر، اس کی اہمیت کا خیال آیا تو میں نے بیعت کر لی بعد بیعت جب انہوں نے مجھے امیر المومنین کہہ کر پکارا تو ان کے ایسا کہنے سے میرا دل پارہ پارہ ہو گیا۔

اور اسی راوی نے جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہ روایت بیان کی ہے کہ:

أن عليا قال يوم الجمل «لعن الله قتلة عثمان في السهل والجبل»[1]

جناب علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے یوم جمل کے موقعہ پر فرمایا قاتلین عثمان پر اللہ لعنت کرے خواہ وہ زمین پر ہوں خواہ پہاڑ پر۔

اور اس روایت کا بھی یہی راوی ہے کہ:

أن عليا بلغه أن عائشة تلعن قتلة عثمان فرفع يديه حتى بلغ بهما وجهه فقال «وأنا ألعن قتلة عثمان، لعنهم الله في السهل والجبل» مرتين أو ثلاثا.[2]

جب حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا قاتلین عثمان پر لعنت فرماتی ہیں تو آپ نے اپنے ہاتھ چہرہ تک اٹھا کر دو تین مرتبہ فرمایا میں بھی قاتلین عثمان پر لعنت بھیجتا ہوں اللہ ان پر لعنت فرمائے وہ زمین میں ہوں یا پہاڑ پر۔

اور اسی راوی نے جناب عبد اللہ بن حسین بن حسین رضی اللہ عنہم سے یہ روایت بھی ذکر کی ہے کہ:

1۔ مصنف أبي شيبة في مصنفه: 7/ 538، ط: مكتبة الرشد الرياض

2۔ أخرج الرواية أبي شيبة في مصنفه: 7/ 539؛ نعيم بن حماد، الفتن: 1/ 171؛ الإمام أحمد، فضائل الصحابة: 1/ 455؛ ابن عساكر، تاريخ دمشق: 39/ 455.

قد ذكر عنده قتل عثمان فبكى حتى بلّ لحيته.[1] جب قتل عثمان کی خبر آپ تک پہنچائی گئی تو آپ زارو قطار روئے کہ آپ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔

ایک اور روایت ملاحظہ ہو:

عن جندب قال: دخلت على حذيفة فقال لي: ما فعل الرجل يعني عثمان؟ فقلت: أراهم قاتليه، فمه! قال: إن قتلوه كان في الجنة وكانوا في النار.[2]

حضرت جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو مجھ سے پوچھا کہ حضرت عثمان کے معاملہ کا کیا ہوا میں نے کہا میرا خیال ہے وہ بلوائی ان کو قتل کر ڈالیں گے تو آپ نے فرمایا اگر ان کو قتل کر دیں گے تو وہ جنت میں جائیں گے اور قاتلین جہنم میں۔

یہ ہیں اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال و اثرات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اور ان کے قتل کے بارے میں اور جناب حذیفہ رضی اللہ عنہ تو خود شاہوں کے نزدیک اس روایت کی بنا پر جو ان کی کتابوں میں موجود ہے صادق الحدیث (سچ بولنے والے ہیں) اور اگر ہم وہ ساری روایات، اقوال و تاثرات بیان کرنے لگیں جو قتل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں نیز ان کے جنتی ہونے اور ان قاتلوں کے جہنمی ہونے کے بارے میں صحابہ کرام اور تابعین عظام رحمہم اللہ سے منقول و ثابت ہیں تو اس کے بڑا دفتر درکار ہوگا۔

ان چند مشہور روایات سے بھی یہ ثابت ہوگا کہ یہ کہنا کہ آپ کا لاشہ تین دن بے گور و کفن پڑا رہا صریحاً جھوٹ اور افتراء ہے جس کی تکذیب و تردید تمام تاریخی کتابوں میں موجود ہے، اس لئے کہ اس بات پر تمام مؤرخین متفق ہیں کہ آپ کی شہادت 18 ذی الحجہ بروز جمعہ بعد عصر واقع ہوئی اور ہفتہ کی رات کو آپ کی تدفین عمل میں آئی، پھر جس ذات گرامی قدر کی نسبت سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شہادت موجود ہو کہ وہ بلا حساب کتاب جنت میں جائیں گے اور شہادت بھی ایسی جو تواتر کی حد تک ثابت ہے تو اب وہ کون سی شہادت ہے جس کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

1۔ الرياض النضرة في مناقب العشرة، 3/ 80، ط: دار الكتب العلمية

2۔ المرجع السابق

مناسب ہے کہ اس عنوان کو یہیں ختم کر کے دوسرے عنوانات کو لیں اہل انصاف اور صاحب بصیرت اہل ایمان کے لئے یہ بیان کردہ حصہ ہی کافی وشافی ہے اور ہدایت دینے والا تو اللہ ہی ہے۔

مطاعن ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

طعن نمبر 1: مکہ، مدینہ وبصرہ کا سفر اللہ کے حکم کے خلاف کیا

یہ پاک بی بی مکہ سے مدینہ گئیں اور وہاں سے بصرہ حالانکہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو اللہ تعالیٰ نے گھروں سے باہر نکلنے سے منع اور گھروں میں ٹھہرے رہنے کا حکم فرمایا ہے، لہذا کے لئے یہ کب مناسب تھا کہ رسول کی عزت کی حفاظت کرنے کے بجائے سولہ ہزار کے اوباش لشکر کے ساتھ نکل پڑتیں۔

جواب: اگر آیت حجاب، سے گھر میں ٹھہرے رہنا اور باہر مطلقاً نہ نکلنا مراد ہوتا تو نزول آیت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان محترمات طیبات کو نہ حج وعمرہ کے لئے جانے کی اجازت دیتے نہ غزوات میں ساتھ لے جاتے نہ ہی والدین سے ملاقات، مریضوں کی عیادت، اور مردوں کی تعزیت کے لئے باہر جانے کی اجازت مرحمت فرماتے، اس لئے آیت کا جو مطلب معترضین نے نکالا ہے وہ قطعاً غلط ہے، اس ممانعت اور حکم سے صرف حجاب اور پردہ کی تاکید مقصود ومراد ہے کہ دیگر چادر پوش عورتوں کی طرح کوچہ وبازار میں ادھر ادھر نہ پھرتی پھریں، اور سفر کرنے میں حجاب اور پردہ کے خلاف کوئی بات نہیں، آج اس گئے گزرے زمانے میں بھی پردہ نشین خواتین، ستر وحجاب کی پابندیوں کے ساتھ سفر کے لئے نکلتی میں خاص طور پر وہ سفر جو دینی ملی یا دنیاوی مصالح پر مبنی ہو، جیسے حج وعمرہ، جہاد وغیرہ۔

تو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ سفر بھی اس نوعیت کا تھا کہ مسلمانوں میں باہم رخنہ پڑ گیا ہے اس کی اصلاح ہو، اور امام عادل کے قتل کے قصاص کے مطالبہ میں سب مسلمان متفق وشریک ہوں آپ کا یہ سفر حج وعمرہ کے سفر کی مانند تھا آج بھی اگر یہ کہا جائے کہ فلاں عورت گھر میں بیٹھنے والی ہے باہر نہیں نکلتی تو اس سے کیا مطلب لیا جاتا ہے خود ہی غور کر لیں، انصاف کو کام میں لائیں ہٹ دھرمی نہ کریں۔

اگر اس سیدھے سادھے جواب سے ان کی تسلی نہ ہوتی ہو تو مجبوراً ہم ایک جواب اور دیتے ہیں کہ خلافت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں جب اہل بیت کے حقوق سلب ہوئے تو جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بقول شیعہ راوی بنت

رسول اللہ ﷺ خاتون جنت بی بی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو سوار کرکے مدینہ کے محلوں، اور انصار کے گھروں میں خانہ بخانہ رات کو گشت کراتے اور امداد و معاونت طلب فرماتے تھے، یہ روایت شیعہ حضرات کے نزدیک مشہور اور متواتر ہے اور ان کی کتابوں میں موجود ہے اب یہاں غور کا مقام ہے کہ ننگ و ناموس کے تحفظ کے معاملہ میں بیٹی، بیوی سے زیادہ نہ ہو تو کم بھی نہیں ہوتی اب دیکھئے ناموس رسول کے گھر سے سفر کے لئے نکلنے اور اپنے خیمہ یا مستقر میں قیام کرنے، اور دوسروں کے گھروں میں نہ جانے، اور دربدر پھرنے میں آخر کوئی تفاوت و فرق ہے یا نہیں؟ اور پھر دو تین گاؤں ضبط ہونے کا ضرر تو ذاتی اور انفرادی ہو سکتا تھا اور قتل خلیفہ نے تو پوری امت کو ہلا کر رکھ دیا تھا اس میں دنیا ہی نہیں دین کا بھی ایسا ضرر تھا جس کی لپیٹ میں پوری ملت مسلمہ آگئی تھی۔

تو ذاتی نقصان کے تدارک کے لئے سفر کرتے اور پوری ملت کے نقصان کی تلافی کرانے کے لئے سفر کرنے میں جو فرق وہ صاف ظاہر ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے، اس لئے جب وہ سفر قابل طعن نہیں تو یہ سفر کس منطق سے قابل اعتراض قرار پا سکتا ہے؟

ایک اور جواب یہ ہے کہ تمام ازواج مطہرات مثلاً ام المومنین حضرت ام سلمہ اور ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جو شیعوں کے نزدیک بھی محترم و مقبول و معتبر ہیں حج و عمرہ کے لئے گھروں سے باہر تشریف لے جاتی تھیں بلکہ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا تو اس سفر میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مکہ مکرمہ تک شریک سفر تھیں، اور آپ کی خواہش تو یہ تھی کہ ام المومنین حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہی آگے بھی جائیں مگر عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ نے جو آپ کے بیٹے تھے اپنی کسی مصلحت سے ان کو روک دیا۔

یہ عجیب دھاندلی ہے کہ اللہ تعالیٰ تو حجاب و ستر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ازواج مطہرات کو سفر کی اجازت مرحمت فرمائیں اور یہ خدائی خوار اس پر طعن و تشنیع کریں! ملاحظہ فرمایئے خدائی اجازت:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا[1]

1۔ سورۃ الاحزاب، الآیۃ: 59

اے نبی ﷺ اپنی بیویوں بیٹیوں اور مسلمان عورتوں کہا ہے کہ اپنے اوپر چادر ڈال رکھیں ان کے لئے ایک پہچان ہے تاکہ ایذا نہ پہنچائی جائیں اور اللہ غفور رحیم ہے۔

اور حدیث صحیح سے یہ ثابت ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور اکرم صلی ﷺ نے ارشاد فرمایا "اذن لکن ان تخرجن لحاجتکن "[1] اپنی ضروریات کے لئے تم لوگوں سے باہر نکلنے کی اجازت دے دی گئی، یہاں سفر کے لئے حج کا ہونا شرط ہے تو آپ رضی اللہ عنہا کے اس سفر میں سگے بھانجے حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ آپ کے ہمراہ تھے پھر آپ کی بہن ام کلثوم بنت ابی بکر کے شوہر جناب طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے اور دوسری بہن جناب اسماء بنت ابی بکر کے شوہر حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ بھی ہمرکاب تھے اور ان دونوں کی اولادیں بھی شریک سفر تھیں، ابن قتیبہ جس کی کتاب پر شیعوں کو کتاب اللہ سے زیادہ اعتماد ہے اپنی تاریخ میں رقم طراز ہے:

لما بلغها بيعة علي امرت ان يعمل لها هودج من حديد فيها موضع الدخول والخروج فخرجت وابنا طلحة والزبير معها[2]

جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی اطلاع ملی تو آپ نے ایک آہنی (ہودج) بنوایا ہیں میں اترنے چڑھنے کا راستہ بھی رکھا پھر جناب طلحہ کے دونوں بیٹوں اور جناب زبیر رضی اللہ عنہم کی معیت میں سفر کے لئے روانہ ہو گئیں۔

پھر ازواج مطہرات تو امہات المومنین ہیں اس حیثیت سے باعتبار احترام و عزت پوری امت ان کی اولاد ہے اسی لئے تمام علماء امت کا مذہب یہی ہے کہ امت کے کسی بھی فرد کی معیت میں ان کو سفر کرنا جائز ہے، یہی

1۔ تفسير ابن أبي حاتم لابن أبي حاتم الرازي، ج 10، الصفحة 3154

2۔ قال ابن قتيبة: فلما أتى عائشة خبر أهل الشام أنهم ردوا بيعة علي، وأبوا أن يبايعوه، أمرت فعمل لها هودج من حديد، وجعل فيه موضع عينيها، ثم خرجت ومعها الزبير وطلحة و عبد الله بن الزبير ومحمد بن طلحة.(الإمامة والسياسة المعروف بتاريخ الخلفاء، 1/ 72، ط: المطبعة أمير)

وجہ ہے کہ خلیفہ ثانی امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو سفر حج کے لئے بھیجا تو جناب عثمان غنی اور عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما کو ان کے ہمراہ روانہ کیا اور فرمایا تم ان کے سعادت مند بیٹے ہو اس لئے تم میں سے ایک ان کی سواری کے آگے رہے اور دوسرا پیچھے۔

اور ان سب سے قطع نظر خود قرآنی آیت کے الفاظ " وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى "[1] سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مطلق نکلنے سے منع نہیں فرمایا بلکہ جاہلیت اولی کے طریق پر بناؤ سنگار کی نمائش کرتے ہوئے نکلنے کو منع فرمایا، تو اب اس نہی سے استدلال نہیں رہا اب رہی یہ بات "وقرن فی بیوتکن" کی تو یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ شیعوں کے نزدیک امر وجوب کے لئے مستعمل نہیں تو پھر اس کے خلاف کرنے سے خرابی کیسے لازم آسکتی ہے۔

طعن نمبر 2: عائشہ رضی اللہ عنہا نے خون عثمان کے قصاص کے لئے سفر کیا

کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے خون عثمان شہید رضی اللہ عنہ کے قصاص کے لیے سفر اختیار فرمایا حالانکہ ان کا کوئی تعلق تھا نہ وہ وارث تھیں اور نہ کوئی رشتہ قرابت تھا اس سے معلوم ہوا کہ آپ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دشمنی و عناد تھا اسی لئے ان کے خلاف فتنہ برپا کیا جبکہ اس سے پہلے خود لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر برانگیختہ فرمایا کرتی تھیں، اور فرماتی تھیں "اقتلوا نعثلا"[2] چنانچہ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے:

أن عائشة لما أتاها أنه بويع لعلي. وكانت خارجة عن المدينة: فقيل لها: قتل عثمان. وبايع الناس عليا. فقالت: ما كنت أبالي أن تقع السماء على الأرض، قتل والله مظلوما، وأنا طالبة بدمه، فقال لها عبيد: إن أول من طعن عليه وأطمع الناس فيه لأنت، ولقد قلت: اقتلوا نعثلا فقد فجر، فقالت عائشة: قد

1۔ سورۃ الاحزاب، الآیۃ: 33

2۔ تاریخ الرسل والملوك، تاریخ الطبري، 4/ 459، ط: دار التراث بیروت

والله قلت وقال الناس، وآخر قولي خير من أوله، فقال عبيد: عذر والله ضعيف يا أم المؤمنين .ثم قال: منك البداء ومنك الغير ومنك الرياح ومنك المطر وأنت أمرت بقتل الإمام وقلت لنا إنه قد فجر(1)

جب آپ مدینہ منورہ سے باہر تھیں تب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیوہ کی ان کو اطلاع ملی، آپ کو بتایا گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قتل کر دیئے گئے اور لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی آپ نے اس وقت فرمایا آسمان بھی ٹوٹ پڑے تو بھی مجھے کوئی پرواہ نہیں اللہ کی قسم وہ مظلوم قتل کئے گئے اور میں ان کے خون کا مطالبہ کرتی ہوں عبید نے ان سے کہا سب سے پہلے جس نے لوگوں کو بھڑکایا اور ان کے قتل پر ابھارا وہ آپ ہی تھیں، اسوقت آپ نے کہا تھا کہ نعثل کو مار ڈالو کہ وہ تاجر ہو گیا ہے اس پر جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ بے شک میں نے ایسا کہا اور لوگوں نے بھی کہا اس پر عبید نے کہا کہ اس کی ابتداء بھی آپ نے کی اور اس میں تبدیلی بھی آپ ہی کی طرف سے ہو رہی ہے، آپ ہی کی طرف سے ہوا بھی ہے، اور آپ ہی کی طرف سے بارش بھی، امام کے قتل کا آپ ہی نے ہمیں حکم دیا کہ وہ فاجر ہو گئے ہیں۔

جواب: اس اعتراض کے جواب میں اول تو یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ خلیفہ عادل کے خون کا بدلہ لینا ہر مسلمان کا حق ہے ورثہ کے ساتھ حق مخصوص نہیں کیونکہ خلیفہ عادل اموال کی حفاظت اور فئ و غنائم کے انتظام قسم میں تمام مسلمانوں کا نائب ہوتا ہے پھر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو ام المؤمنین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم ہیں، اس مطالبہ کے کرنے کی عام مسلمانوں سے زیادہ حق دار ہیں، احکام الٰہی کے نفاذ کے لئے وہ کیوں تگ و دو نہ فرمائیں خصوصا قصاص جیسے اہم دینی معاملہ میں جبکہ وہ قصاص بھی ایک مظلوم کا ہو جسے خلافت و امارت کا مالک ہوتے ہوئے بلا کسی شرعی وجہ کے قتل کر دیا ہو، اور حضرت عائشہ و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے باہم دلی بغض و عناد کا تو کسی مسلمان کا دل میں تصور تک نہیں آسکتا ہر مسلمان ایسے خیال و تصور سے اللہ کی پناہ مانگتا ہے یہ

1۔ الإمامة والسياسة المعروف بتاريخ الخلفاء، 1/ 52، ط: المطبعة أمير

محترم و مقدس ہستیاں تو ایک دوسرے کے فضائل و مناقب میں رطب اللسان میں چنانچہ دیلمی نے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے یہ روایت بیان کی ہے وہ فرماتی ہیں کہ:

"قال رسول الله صلي الله عليه وسلم حب علي عبادة"[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علی رضی اللہ عنہ کی محبت عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔

آپ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ و جدال کا نہیں تھا، قتل سے باہم جو گتھی پڑ گئی اور دلوں میں جو گرہ لگ گئی تھی اس کی اصلاح اور باہم صلح وصفائی اور خون عثمان کا قصاص مقصد سفر تھا ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لیا جائے اور ان کو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لشکر سے نکال دیا جائے اور قاتلین عثمان کی دھمکیوں اور ڈراوے میں آکر جناب طلحہ وزبیر اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ چھوڑ کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے تھے مطمئن ہو کر جناب امیر رضی اللہ عنہ کے رفیق و معاون بنیں اور باہم اتفاق و مودت سے خلافت کا نظام حسن و خوبی کے ساتھ انجام پذیر ہوتا ہے، ادھر جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر مخالفین بھی حد سے زیادہ آگے نہ بڑھیں یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے جھٹلانا کسی کے بس میں نہیں کہ قاتلین عثمان نے بعد قتل، حضرات طلحہ و زبیر اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قتل کی دھمکیاں دیں اور علی الاعلان منافقانہ گفتگو کرتے رہے۔

رہی بات حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر لوگوں کے اکسانے کی تو یہ ابن قتیبہ، ابن اعثم کوفی اور ساطی کا پیشہ ورانہ جھوٹ اور افتراء ہے، یہ تو مشہور کذابوں میں گنے جاتے ہیں،[2] چنانچہ جنگ جمل اور دوسری لڑائیوں کی جو رپورٹنگ انہوں نے کی ہے وہ شیعہ و سنی دونوں کے نزدیک افتراء اور بہتان پر مبنی ہے (یہ جھوٹے اور مفتری واقعات میں کتربیونت سے آگے بڑھ کر واقعات تخلیق کرنے میں بدنام ہیں) یہ حد درجہ ناانصافی اور بغض و عناد کا گھناؤنا اظہار ہے کہ زوجہ محبوبہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اللہ اور رسول کی

1۔ قال المتقي الهندي: عن عائشة : ذكر علي عبادة.(كنز العمال في السنن الأقوال والأفعال، 11/ 601، رقم: 32894، ط: مؤسسة الرسالة)

2۔ قال الذهبي: ورأيت في مرآة الزمان أن الدارقطني قال: كان ابن قتيبة يميل إلى التشبيه، [منحرف عن العترة]، وكلامه يدل عليه.(ميزان الاعتدال في نقد الرجال،2/ 503، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان)

شہادت کو بالائے طاق رکھ کر چند اخوان الشیاطین جھوٹے اور بے ایمان کوفیوں کا دم چھلا بن جائیں اور ان کی اتباع و پیروی میں اپنے ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

الطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ أُولَئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ[1]

پاک باز عورتوں پاک مردوں کے لئے اور پاکباز مرد پاک عورتوں کے لئے زیبا ہیں ان کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں وہ اس سے پاک دامن ہیں ان کے لئے مغفرت اور اچھا رزق ہے۔

اہل سنت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بابت ابن قتیبہ کی بات کو کس طرح وقعت دے سکتے ہیں جبکہ ترمذی، ابن ماجہ اور ابو حاتم رازی نے بطریق متعدد یہ روایت کی ہے کہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں:

أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: يا عثمان إنه لعل الله يقمصك قميصا، فإن أرادوك على خلعه فلا تخلعه لهم. ثلاثا[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا اے عثمان شاید اللہ تعالی تمہیں کوئی پوشاک پہنائے اگر لوگ وہ پوشاک اتارنا چاہیں تو تم ان کی خاطر وہ پوشاک نہ اتارنا۔

طعن نمبر 3: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت فرمائی بلکہ اس پر جمی بھی رہیں اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نعیم بن حماد نے کتاب الفتن میں اور محمد بن مسکویہ نے تجارب الامم میں، اور ابن قتیبہ نے کتاب السیاست میں ایک روایت یوں بیان کی ہے کہ جب جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ایک لشکر راستہ میں ایک ایسے مقام سے گزرا جہاں پانی تھا تو وہاں کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا، جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے محمد بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا اس پانی کا کیا نام ہے، انہوں نے بتایا کہ اسے "حُوَأب" کہتے ہیں یہ سن کر آپ فرمانے

1۔ سورة النور ،الآية:26

2۔ سنن الترمذي، باب في مناقب عثمان بن عفان، 6/ 69، رقم: 3705، ط: دار الغرب الإسلامي بيروت

لگیں مجھے یہاں سے واپس لے چلو جناب محمد بن طلحہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا آخر کیوں؟ آپ نے فرمایا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی ازواج سے یہ فرماتے سنا ہے "كأني بإحداكن قد نبحها كلاب الحوأب، وإياك أن تكوني أنت يا حميراء"(1) "گویا میں تم میں سے اک پر حواب کے کتوں کو بھونکتا دیکھتا ہوں اے حمیرا تم وہ نہ ہونا، پس یہ ممانعت یاد ہونے کے باوجود آپ وہاں سے واپس نہ ہوئیں۔

جواب: جو روایات ان لوگوں نے بیان کی ہیں یہ بات تو ان سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے واپسی کا ارادہ فرمایا اور اہل سنت کی روایات میں بصراحت آپ کے یہ الفاظ ملتے ہیں کی " ردوني ردوني"(2) مجھے واپس لے چلو واپس لے چلو اسی کے ساتھ ان کی روایات میں بطور تتمہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے واپسی میں پس و پیش کیا مگر اہل لشکر نے اس سلسلہ میں آپ سے موافقت نہ کی اور باہم اختلاف رائے پیدا ہوا اسی دوران مروان بن حکم علیہ ما علیہ اور دوسرے لشکری قریب کے دیہات و آبادی سے اسی ایسے افراد کو بطور گواہ لائے یہ کہتے تھے کہ یہ پانی حواب نہیں کہلاتا بلکہ وہ کوئی اور پانی ہے اس گواہی کے بعد آپ رضی اللہ عنہا آگے روانہ ہوئیں یہ جواب تو روایت کے مقابلے میں روایت سے تھا اب از روئے درایت ایک اور جواب ملاحظہ فرمایئے کہ:

حدیث میں پانی پر سے گزرنے کی ممانعت نہیں ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مصیبت سے جو ان میں سے کسی ایک کو پیش آسکتی ہے اس سے خبردار فرما رہے ہیں اس حدیث سے نہیں سمجھتا اور مخالفت رسول پر اصرار وضد کی نسبت حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف کرنا کس طرح ممکن ہے خاص کر اس صورت میں جبکہ "إياك أن تكوني أنت يا حميراء" کے الفاظ اہل سنت کی معتبر و مستند کتابوں میں موجود ہی نہیں ہے اور اگر بالفرض موجود بھی ہوں تو ان کا مطلب وہی ہوگا جیسے کوئی سربراہ خاندان افراد خاندان کو اونچ نیچ سمجھاتے ہوئے آئندہ

1۔ الإمامة والسياسة المعروف بتاريخ الخلفاء، لابن قتيبة، 1/ 82، ط: المطبعة أمير

2۔ عن قيس بن أبي حازم قال: مرت عائشة بماء لبني عامر يقال له الحوأب، فنبحت عليه الكلاب، فقالت: ما هذا؟ قالوا: ماء لبني عامر. فقالت: ردوني ردوني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: «كيف بإحداكن إذا نبحت عليها كلاب الحوأب؟(مسند ابي يعلي الموصلي، 8/ 282، رقم: 4868، ط: دار المأمون للتراث دمشق)

پیش آنے والے خطرات وخدشات سے آگاہ کرے اور ان سے ڈرائے جناب رسالت مآب ﷺ کا ارشاد اسی قسم کی پیش بینی اور احتیاط کے لیے تھا یہ شرعی نہیں تھی جس کی مخالفت معصیت کہلاتی ہے صراحتاً شرعی نہیں کی عدم موجودگی میں آپ رضی اللہ عنہا کے عمل کو معصیت قرار دے کر طعن کرنا سوائے تعصب وبغض وعناد کے کچھ نہیں۔

یہ واقعہ اوراق گزشتہ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ ایک شب حضور اکرم ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لے گئے اور نماز تہجد کی تاکید فرمائی مگر آپ نے جواباً قسم کھا کر کہا کہ ہم سوائے فرض کے ہرگز کوئی نماز نہ پڑھیں گے "" واللہ لا نصلي الا ما کتب اللہ لنا" یہ سن کر حضور ﷺ واپس لوٹے تو اپنے زانو پیٹتے یہ فرماتے جارہے تھے انسان کتنا جھگڑالو ہے۔ (1)

اب ذرا دونوں جگہوں کے مخالفت کا موازنہ کرلیں تو کیا فیصلہ ہے شیعہ حضرات کا جناب امیر علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے متعلق حقیقت میں مناظر انصاف دیکھا جائے تو ام المومنین حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا تو اپنے اصرار میں معذور بھی تھیں مکہ مکرمہ سے روانگی کے وقت ان کو کہاں معلوم تھا کہ راستہ میں چشمہ حواب بھی پڑے گا اور اس پر سے گزرنا گزر بھی ہوگا اور پھر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ وہی مقام ہے تو واپسی کا ارادہ بھی کیا مگر لشکر نے اس کی معافقت نہ کی اس لیے اس پر عمل نہ ہو سکا اور پھر حدیث میں بھی اس کی تشریح نہیں ہے کہ اگر ایسا واقعہ پیش آجائے تو کیا کرنا چاہیے آپ کا مقصد سفر چونکہ باہم صلح وصفائی بین المسلمین تھا جو اپنی جگہ اہم تو ہے ہی مگر شرعاً اس کا حکم بھی ہے اسی کے پیش نظر آپ نے سفر جاری رکھا۔

طعن نمبر 4: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بصرہ کا بیت المال لوٹا

یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا لشکر بسرہ پہنچا تو اس نے بیت المال لوٹ لیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عامل عثمان بن حنیف انصاری رضی اللہ عنہ کو جو صحابی تھے اہانت کے ساتھ نکال دیا۔

جواب: یہ ہے کہ یہ واقعہ نہ آپ کے اشارہ سے ہوا اور نہ آپ کی مرضی سے ہوا اور جب آپ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے نہ صرف یہ کہ جناب عثمان انصاری رضی اللہ عنہ سے عذر ومعذرت کی بلکہ حد سے زیادہ ان کے دل جوئی فرمائی

1۔ صحیح البخاری، باب قوله تعالى وكان الإنسان أكثر شيء جدلا، 9/ 106، رقم: 7347، ط: دار طوق النجاة

اور ان کا دل خوش کرنے کے لیے مقدور بھر کوشش فرمائی۔[1] تاریخ میں اسی جیسا ایک اور واقعہ بھی محفوظ ہے کہ جناب امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک لشکری مالک اشتر اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں عہد عثمانی کے ایک گورنر ابو موسیٰ اشعری صحابی رضی اللہ عنہ کا کوفہ میں گھر جلایا گیا مال و اسباب لوٹا گیا،[2] تو کیا ان کے نزدیک یہ بھی طعن کی بات ہے اگر نہیں تو لشکریان عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں بیت المال لٹنے سے جناب صدیقہ پر طعن کیوں اگر ہو تو دونوں جگہ ہو ورنہ کہیں بھی نہیں جیسا کہ سنیوں کا مسلک کیا ہے اور پھر ان دونوں واقعات میں قابل لحاظ بغور ایک نمایاں اور بنیادی فرق بھی ہے یہاں بیت المال پر دست درازی ہوئی جس میں ان دست درازوں کا بھی حق و حصہ تھا جناب عثمان انصاری عامل بصرہ کی ذاتی املاک و اموال پر دست درازی نہیں کی گئی مگر وہاں ذاتی املاک لوٹی گئی جلائی گئی اور تباہ کر دی گئی۔

اور پھر یہاں جو کچھ ہوا آخری چارہ کار کے طور پر ہوا ان کے زندہ رہنے اور بقا کے لیے کوئی صورت

1۔ روى الطبري ما يدل على هذا من طريق سيف بن عمر، وأن من فعله واجترأ على عثمان بن حنيف كان بعض الغلمان من عسكر أم المؤمنين، ولم تكن تعلم بذلك فلما سمعت أمرتهم أن يطلقوا سراحه. تاريخ الطبري: 3/ 17. ومعروف كثرة الأعراب بين الفريقين. لكن الرواية التي احتج بها الشيعة واهية جدا لأنها رواية أبي مخنف المؤرخ الشيعي الواهي جدا، وسيف بن عمر أفضل منه بدرجات.

2۔ ذكر الطبري في حوادث سنة 36 هـ قال: كان علي رضي الله عنه قد خرج إلى البصرة، فوردت إليه الأنباء من الكوفة بأن أبا موسى الأشعري عامله عليها لا يوافقه الرأي في القتال، فأرسل إليه عمار بن ياسر ليستفهم الأمر، ولما كان مالك الأشتر من طلاب الفتنة فقد ألحّ على الأمير في الذهاب إلى الكوفة، فأذن له وهنا استغل مالك الأشتر الفرصة لإثارة أهل الكوفة على أبي موسى الأشعري، قال الطبري: «فأقبل الأشتر حتى دخل الكوفة، وقد اجتمع الناس في المسجد الأعظم، فجعل لا يمر بقبيلة يرى فيها جماعة في مجلس أو مسجد إلا دعاهم، ويقول: اتبعوني إلى القصر، فانتهى إلى القصر في جماعة من الناس، فاقتحم القصر فدخله وأبو موسى قائم في المسجد يخطب الناس ... فخرج عليه غلمان لأبي موسى يشتدون ينادون: يا أبا موسى هذا الأشتر قد دخل القصر، فضربنا وأخرجنا، فنزل أبو موسى فدخل القصر فصاح به الأشتر: اخرج من قصرنا لا أم لك، أخرج الله نفسك فوالله إنك لمن المنافقين قديما، قال: أجلني هذه العشية، فقال هي لك ولا تبيتن في القصر الليلة ودخل الناس ينتهبون متاع أبي موسى فمنعهم الأشتر، وأخرجهم من القصر وقال إني قد أخرجته فكف الناس عنه ...». تاريخ الطبري: 3/ 25، 82

چھوڑی نہیں گئی واقعہ یوں ہے کہ جناب طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما نے اول جناب عثمان انصاری رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ خلیفہ شہید رضی اللہ عنہ کے قصاص کی خاطر ہمارے ساتھ مسلمانوں کی ایک جمعیت آئی ہے ہم جو زاد راہ لے کر چلے تھے وہ ختم ہو گیا اگر آپ بیت المال کے اموال ہمارے پاس لے آئیں تو ان میں تقسیم کر دیے جائیں جناب عثمان رضی اللہ عنہ نے نہ صرف اس سے انکار کیا بلکہ آمادہ پیکار ہوئے اور حکم جاری کیا کہ کوئی لشکری بصرہ میں داخل نہ ہونے پائے کھانا پینا، دانہ چارہ سب بند کر دیا جب لشکر کی جان کے لالے پڑ گئے تو معاملہ برداشت سے باہر ہو گیا لشکر میں جو اکھڑ مزاج لوگ تھے اور اس وقت کے حالات کے مطابق ایسے لوگوں کو پورے طور پر قابو میں رکھا بھی نہیں جا سکتا تھا چنانچہ وہ حملہ کر کے شہر میں گھس گئے اور بیت المال کو جس میں ان کا حق بھی تھا لوٹ لیا تو ایسی صورت میں اعتراض اور برہمی کی کہاں گنجائش!

اور اس سب کے باوجود اہل سنت میں کوئی بھی جب حضرت عائشہ و طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم تک کو معصوم نہیں کہتا تو لشکریوں کی عصمت کا کون قائل ہو گا کہ ان سے اس قسم کے اعمال کے صدور سے عقیدہ میں فرق آئے اور جب جناب طلحہ زبیر رضی اللہ عنہما قتل کیے گئے ام المومنین زوجہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی توہین جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لشکریوں کے ہاتھوں وہ خوب پذیر ہوئی تو ان کے عقیدہ میں فرق کیوں نہیں پڑھا جبکہ باعتبار مراتب جناب عثمان انصاری کو جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کوئی نسبت ہی نہیں پھر اس قسم کے واقعات کے صدور سے ان کے عقیدہ میں کیوں خلل پیدا ہو گا جحش بن زیاد الضبی راوی ہے کہ میں نے احنف بن قیس کو یہ کہتے ہوئے سنا:

لما ظهر علي على أهل البصرة أرسل إلى عائشة: ارجعي إلى المدينة وإلى بيتك، قال: فأبت، قال: فأعاد إليها الرسول: والله لترجعن أو لأبعثن إليك نسوة من بكر بن وائل دمهم شفار حداد يأخذنك بها، فلما رأت ذلك خرجت.[1]

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہل جمل پر قابو پالیا تو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کہلوایا کہ آپ مدینہ منورہ واپس چلی جائیں آپ نے انکار فرمایا تو دوبارہ قاصد بھیجا کہ واللہ یا تو آپ واپس چلی جائیں گی

1۔ مصنف ابن أبي شيبة في الأحاديث والآثار، 8/ 720، ط: دار الفكر

یا پھر میں بکر بن وائل کی مجز برداشتوں کو بھیجو گا کہ وہ آپ کو ان کے ذریعہ قابو کر لیں گی جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ صورتحال دیکھی تو آپ مدینہ روانہ ہوئی ابو بکر بن شیبہ نے اپنی مصنف میں اسے روایت کیا۔

طعن نمبر 5: جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا راز افشا کر دیا

یہ ہے کہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا راز افشا کر دیا جس پر آیت قرآنی نازل ہوئی:

وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَى بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَذَا قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ[1]

جب نبی نے اپنی کسی بیوی سے بطور سرگوشی ایک بات کہی تو ان بیوی نے وہ بات بیان کر دی جس کو اللہ تعالی نے اپنے نبی پر ظاہر کر دیا کہ بعض کو یہ بات بتادی اور بعض سے چھپالی اور جب نبی نے اپنی بیوی کو بتایا کہ تم نے ایسا کیا تو وہ کہنے لگی آپ کو یہ کس نے بتایا آپ نے فرمایا مجھے علیم وخبیر خدا نے بتایا۔

جواب: مفسرین اس پر متفق ہیں کہ راز حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے افشا کیا تھا کیونکہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جناب ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دروازہ کی درز سے اپنے بستر پر دیکھا تھا اور جناب حفصہ رضی اللہ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے تھے کہ میں نے ماریہ کو اپنے لیے حرام کر لیا ہے تو تم میرا یہ راز چھپائے رکھنا کسی سے ذکر نہ کر دینا مگر آپ اس خوشی میں جو ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے حرام کر لینے کی خبر سے انہیں ہوئی تھی کتمان راز کی تاکید کو بھول گئیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر یہ راز فاش کر دیا،[2] اور اسی وجہ سے جناب ماریہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہ واقعہ کہہ ڈالا وہ تحریم کے معاملہ کے

1۔ سورة التحريم، الآية: 3

2۔ أخرج الطبري في تفسيره عن زيد بن أسلم: «أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أصاب أم إبراهيم في بيت بعض نسائه قال: فقالت: أي رسول الله في بيتي وعلى فراشي، فجعلها عليه حراما فقالت يا رسول الله كيف تحرم عليك الحلال فحلف لها بالله لا يصيبها فأنزل الله عز وجل يا أيها النبي لم تحرم ما أحل الله لك تبتغي مرضاة أزواجك». التفسير: 28/ 155؛ وأخرجه بلفظ آخر البيهقي، السنن الكبرى: 7/ 352؛، وأخرج النسائي رواية أخرى عن أنس:

بجائے راز کی بات اس واقعہ کو سمجھتی رہیں جو درز سے انہوں نے دیکھا تھا اس لیے تحریم کی بات کہہ ڈالی ان حالات کے پیش نظر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف افشاء راز کی نسبت کرنا محض تہمت و افتراء ہے۔

اور پھر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے متعلق اہل سنت کا جو عقیدہ ہے اس میں ان کا یہ عمل بھی کوئی خلل نہیں ڈالتا اس لیے کہ امر اگر وجوب کے لیے بھی ہو استحباب مقصود نہ ہو تا تب بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائے گا کہ خلاف وجود معصیت اور گناہ ہے اور آیت کا جملہ "إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللهِ"[1] صاف بتاتا ہے کہ اس معصیت سے توبہ مقبول ہے اور بالاجماع یہ بات بھی ثابت ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے توبہ کی اور وہ مقبول ہوئی اور آپ آخر دم تک ازواج مطہرات میں داخل رہیں اور خوشخبری پائی طبرسی کی مجمع البیان جو شیعوں کی معتبر تفسیر سمجھی جاتی ہے اس میں طبرسی کہتا ہے:

قيل. إن رسول الله قسم الأيام بين نسائه، فلما كان يوم حفصة قالت: يا رسول الله! إن لي إلى أبي حاجة فائذن لي أن أزوره. فأذن لها. فلما خرجت أرسل رسول الله! إلى جاريته مارية القبطية، وكان قد أهداها له المقوقس، فأدخلها بيت حفصة، فوقع عليها، فأتت حفصة. فوجدت الباب مغلقا، فجلست عند الباب. فخرج رسول الله ووجهه يقطر عرقا. فقالت حفصة: إنما أذنت لي من أجل هذا! أدخلت أمتك بيتي، ثم وقعت عليها في يومي، وعلى فراشي. أما ما رأيت لي حرمة وحقا؟! فقال: أليس هي جاريتي قد أحل الله ذلك لي أسكتي فهو حرام علي ألتمس بذلك رضاك فلا تخبري بهذا امرأة منهن، وهو عندك

«أن النبي صلى الله عليه وسلم كانت له أمة يطؤها فلم تزل به حفصة وعائشة حتى حرمها فأنزل الله تعالى هذه الآية ...». سنن النسائي: 7/ 71، رقم 3959. قال الحافظ ابن حجر: «وسنده صحيح ... وله شاهد مرسل أخرجه الطبري بسند صحيح عن زيد بن أسلم ...». فتح الباري: 9/ 376.

1۔ سورة التحريم، الآية: 4

أمانة.فلما خرج رسول الله قرعت حفصة الجدار الذي بينها وبين عائشة، فقالت: ألا أبشرك إن رسول الله قد حرم عليه أمته مارية، وقد أراحنا الله منها.وأخبرت عائشة بما رأت، وكانتا متصافيتين متظاهرتين على سائر أزواجه، فنزلت:(يا أيها النبي لم تحرم) فطلق حفصة، واعتزل سائر نسائه تسعة وعشرين يوما، وقعد في مشربة أم إبراهيم مارية حتى نزلت آية التخيير، عن قتادة، والشعبي، ومسروق. وقيل. إن النبي خلا في يوم لعائشة مع جاريته أم إبراهيم مارية القبطية، فوقفت حفصة على ذلك، فقال لها رسول الله: لا تعلمي عائشة ذلك، وحرم مارية على نفسه. فأعلمت حفصة عائشة الخبر، واستكتمتها إياه، فأطلع الله نبيه على ذلك، وهو قوله. (وإذ أسر النبي إلى بعض أزواجه حديثا) يعني حفصة، عن الزجاج، قال: ولما حرم مارية القبطية أخبر حفصة أنه يملك من بعده أبو بكر، ثم عمر، فعرفها بعض ما أفشت من الخبر، وأعرض عن بعض إن أبا بكر وعمر يملكان بعدي.[1]

کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج کے مابین باری کے دن مقرر فرما رکھے تھے ایک مرتبہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے اپنی باری کے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے اپنے والد سے کچھ کام ہے آپ اجازت فرمائیں تو میں ان سے مل آؤں آپ نے ان کو اجازت دے دی جب وہ چلے گئے تو حضور ﷺ نے ام ابراہیم جناب ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو بلوایا یہ شاہ مصر مقوقس کی طرف سے آپ کو ہدیہ کے طور پر ملی تھی آپ ان کو جناب حفصہ رضی اللہ عنہا کے مکان میں لے گئے اور صحبت فرمائی اسی دوران حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا واپس آگئیں گھر کا دروازہ بند پا کر باہر دروازہ ہی پر بیٹھ گئی جب کچھ

---

1 ـ مجمع البيان في تفسير القرآن ،للطبرسي، 10/ 56، ط: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات بيروت لبنان

دیر بعد رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے تو آپ کے چہرہ مبارک سے پسینہ ٹپک رہا تھا تب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کہنے لگی کہ آپ نے مجھے اس لیے اجازت دی تھی کہ میرے گھر میرے بستر اور میری باری کے دن اس لونڈی سے صحبت فرمائے آپ نے میری عزت اور حق کا کچھ خیال نہ فرمایا آپ ﷺ نے فرمایا کیا یہ لونڈی اللہ تعالیٰ نے میرے لیے حلال نہیں کی ہے اچھا شکوہ نہ کرو میں تمہاری دل جوئی کی خاطر اس کو اپنے لیے حرام کر لیتا ہوں مگر اس بات کا ذکر واقعی ازواج سے نہ کرنا یہ میرا راز تمہارے پاس امانت ہے جب رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے گئے تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا دوڑ کر اس دیوار کے پاس گئی جو ان کے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی مشترکہ تھی اور کہنے لگی خوشخبری سنو کہ حضور ﷺ نے اپنی لونڈی ماریہ رضی اللہ عنہا کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے اور یوں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے سکون وراحت مہیا فرمادی اور پورا واقعہ جو دیکھا تھا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سنا دیا باقی ازواج مطہرات کی نسبت ان دونوں بیویوں میں دوستی اور وتفاق کے باہم روابط زیادہ استوار تھے اس پر آیت تحریم (یا أیها النبي لم تحرم) نازل ہوئی تو آپ نے 29 روز تک اپنی ازواج سے کنارہ کشی اختیار فرما کر ام ابراہیم کے بالاخانہ پر قیام فرمایا تا آنکہ آیت تخیر نازل ہوئی بعض راویوں نے یہ کہا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری کے دن آپ ﷺ نے ماریہ قبطیہ سے خلوت فرمائی تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا وہاں موجود تھیں اور ان سے حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کا ذکر نہ کرنا اور آپ ﷺ نے ماریہ رضی اللہ عنہا کو اپنے اوپر حرام ٹھہرا لیا مگر بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے اس کی اطلاع اس تاکید کے ساتھ کہ کسی سے ذکر نہ کرنا حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کو کر دی جس کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو دے دی اس آیت میں مراد بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا ہیں حضور ﷺ نے جب جناب ماریہ رضی اللہ عنہا کو اپنے اوپر حرام ٹھہرا لینے کی خبر بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کو دی اسی کے ساتھ یہ خبر بھی دی تھی کہ میرے بعد جناب ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما خلیفہ ہوں گے انہوں نے خبر کا ایک حصہ افشا کر دیا اور دوسرا نہیں بتایا۔

اس روایت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے ہوا نہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور جناب حفصہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہ افشا خوشی و فرحت کی زیادتی کے سبب ہوا حضور ﷺ کی نافرمانی کا ارادہ ہرگز نہ تھا اور پھر عیاشی کی روایت جو اس نے جناب باقر رحمۃ اللہ علیہ سے حوالہ کی ہے اور وہ شیعوں کے نزدیک بہترین محدثین شمار ہوتا ہے وہ صاف رضامندی پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس سے شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت کا علم ہوتا ہے اور اس راز کے افشا پر کوئی عتاب بھی نہیں یہاں ایک اور مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ جب حضور ﷺ کو وحی الٰہی کے ذریعے حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت کا علم ہو گیا تھا تو اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا حکم امر الٰہی کے مخالف ہوتا اور انبیاء کرام علیہم السلام تو تقریر الٰہی کے خلاف دعا تک نہیں کرتے چہ جائیکہ خلافت کی تقرری و موقوفی کے احکام صادر فرمائے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے ایسا نہیں فرمایا یہ سب یاروں کی گھڑنت اور افترا ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبُشْرَى يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ، إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُنِيبٌ، يَا إِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَإِنَّهُمْ آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ[1]

جب ابراہیم علیہ السلام کا خوف دور ہوا اور بشارت پسر ملی تو وہ ہم سے قوم لوط کے معاملہ میں اصرار کرنے لگے کہ انہیں عذاب نہ دیا جائے وہ نرم دل بردبار اور خدا کی طرف رجوع کرنے والے اسی لیے یہ اصرار کر رہے تھے کہ ہم نے ان سے کہا ابراہیم اس اصرار سے گریز کرو تمہارے رب کا اس معاملہ میں حکم جاری ہو چکا عبد ان پر عذاب آئے گا جو لوٹایا نہیں جا سکتا۔

طعن نمبر 6: حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے غیرت کھانے کا اقرار

خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

ما غرت على أحد من نساء النبي صلى الله عليه وسلم ما غرت على خديجة وما

1۔ سورة هود، الآية: 74

رأيتها قط ولكن كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يكثر ذكرها.[1]

نبی کریم ﷺ کی ازواج میں سے سوائے خدیجہ رضی اللہ عنہا کے کسی کے حال پر مجھ کو غیرت نہیں آئی حالانکہ میں نے ان کو بالکل نہیں دیکھا مگر رسول اللہ ﷺ ان کا ذکر کثرت سے فرمایا کرتے تھے۔

جواب: غیرت اور رشک تو عورتوں کا طبعی تقاضہ ہے اور طبعی تقاضے پر کوئی گرفت نہیں ہاں غیرت ور شک کی بنا پر کوئی قول و فعل خلاف شرع سرزد ہو تو البتہ گرفت کا موقع ہوتا ہے حدیث صحیح میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ جناب رسالت مآب ﷺ کسی بیوی کے گھر میں تھے ایک دوسری زوجہ محترمہ نے آپ کے لیے عمدہ کھانا تیار کر کے بھجوا دیا مگر ان محترمہ نے غیرت کے مارے خادمہ سے تشت لے کر زمین پر پٹخ دیا کہ تشت تو ٹوٹا ہی کھانا بھی بکھر گیا آنحضرت ﷺ کھانے کی حرمت کے لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے بنفس نفیس خود اٹھے اور کھانا چننے لگے ساتھ ہی یہ بھی فرماتے جاتے "غارت امکم" مگر اس کے علاوہ نہ ان محترمہ رضی اللہ عنہا سے کچھ فرمایا نہ ناراض ہوئے،[2] جب اس معاملہ میں نبی محترم ﷺ کا اپنی محترمات کے ساتھ یہ سلوک و معاملہ ہے ایرے غیرے کو یہ حق کہاں پہنچتا ہے کہ ان امہات محترمات رضی اللہ عنہن کو اعتراض کا نشانہ بنائے اور اپنی عاقبت خراب کرے۔

کتب امامیہ میں تو ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق یہ درج ہے کہ انہوں نے ائمہ کے معاملے میں حسد و رشک کا اظہار فرمایا،[3] تو ان کے مقابلہ میں بھی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی غیرت کیا وزن رکھتی ہے اور کیسے

1۔ صحيح البخاري، باب تزويج النبي ﷺ خديجة وفضلها رضي الله عنها، 5/ 38، رقم: 3818

2۔ عن أنس، قال: كان النبي ﷺ عند بعض نسائه، فأرسلت إحدى أمهات المؤمنين بصحفة فيها طعام، فضربت التي النبي ﷺ في بيتها يد الخادم، فسقطت الصحفة فانفلقت، فجمع النبي ﷺ فلق الصحفة، ثم جعل يجمع فيها الطعام الذي كان في الصحفة، ويقول: «غارت أمكم» ثم حبس الخادم حتى أتي بصحفة من عند التي هو في بيتها، فدفع الصحفة الصحيحة إلى التي كسرت صحفتها، وأمسك المكسورة في بيت التي كسرت-(صحيح البخاري، باب الغيرة، 7/ 36، رقم : 5225، ط: دار طوق النجاة)

3۔ ذکر المجلسي: فنظر إليهم بعين الحسد وتمنى منزلتهم فتسلط الشيطان عليه۔۔۔الخ -(بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار، 26/ 273، ط: مؤسسة الوفاء بيروت لبنان

اس پر یہ لوگ اعتراض کر سکتے ہیں۔

طعن نمبر7: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑائی پر اظہار افسوس

حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا آخر عمر میں فرمایا کرتی تھیں:

قاتلت عليا ووددت أني كنت نسيا منسيا.[1]

میں علی رضی اللہ عنہ سے لڑ پڑی اور میری خواہش ہے کہ میں بھولی بسری ہوتی۔

جواب: ان الفاظ سے کوئی روایت بطریق صحیح منقول نہیں صحیح بات یہ ہے کہ یوم جمل کی یاد جب بھی آتی آپ بے اختیار اتنا روتی کہ چادر مبارک آنسوں سے تر ہو جاتی یہ رونا اس بنا پر ہوتا کہ کاش میں نکلنے میں جلدی نہ کرتی پہلے حالات کی تحقیق کیوں نہ کر لی غور و فکر کیوں نہ کیا کہ اتنا زبردست المیہ پیش آگیا اگر یہ اپنی لکھی ہوئی بات منوانے پر اتنے مُصر تو اہل سنت کی معتبر صحیح اور مستند کتابوں کی بات بھی تو سنے اور اسے قبول کریں جن میں ایسے ہی الفاظ جناب علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب ام المومنین رضی اللہ عنہا کے لشکر کو ہزیمت ہو گئی اور دونوں طرف کے کافی لوگ ہلاک وشہید ہو گئے تو آپ جب مقتولین کی لاشوں کے ملاحظہ کے لیے گئے تو اپنے زانو پیٹ پیٹ کر یہ فرما رہے تھے" يا ليتني مت قبل هذا وكنت نسيا منسيا"[2] اے کاش میں اس سے پہلے مر کر بھولی بسری بات کیوں نہ ہو گیا اگر جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایسا فرمایا بھی ہو تو وہ اسی قبیل سے ہو گا اور جہاں مقصد انصاف پسندی اور رجوع بحق ہو وہاں طرفین سے اسی قسم کے احساسات ندامت کا اظہار ہوتا ہے جو باہم مرتبہ شناسی پر مبنی ہوتا ہے کیا یہ تعجب اور دکھ کی بات نہیں کہ ایسے قابل قدر جذبات واحساسات کو بھی یہ لوگ مطاعن میں شمار کرتے ہیں۔

طعن نمبر8: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ میں اپنے والد اور ان کے دوست کو دفن کرایا

کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ مبارکہ کو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسکن تھا اپنے والد اور ان کے دوست حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا مقبرہ بنا دیا۔

1۔ الاعتقاد للبيهقي: ص 373؛ المنتظم لابن الجوزي: 5/ 95

2۔ قال علي يوم الجمل وددت اني كنت مت قبل هذا بعشرين سنة (كتاب السنة، ص: 196 ط: مكة المكرمة)

جواب: کتب اہل سنت میں جو احادیث صحیحہ مروی منقول ہیں ان سے ثابت ہے کہ گاہ بصراحت گاہ باشارہ آنحضرت ﷺ نے یہ خوشخبری دی ہے کہ یہ دونوں محترم حضرات آپ کے دیوار میں مدفون ہوں گے چنانچہ جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی تدفین وہاں پائی تو جناب علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

إني كنت لأرجو أن يجعلك الله مع صاحبيك فإني كثيرا أسمع رسول الله (صلى الله عليه وسلم) كنت أنا وأبو بكر وعمر وقمت أنا وأبو بكر وعمر وانطلقت أنا وأبو بكر وعمر (1)

میرا پختہ گمان تھا کہ اللہ تعالیٰ تم کو اے عمر تمہارے دونوں دوستوں کے ساتھ ملادے گا اس لیے کہ میں نے کئی مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے اس قسم کا کلام سنا کہ میں ابو بکر اور عمر وہاں تھے میں ابو بکر و عمر کھڑے تھے میں ابو بکر اور عمر چلے۔

لہذا آپ کے وہاں دفن ہونے کے جواز کا اس سے صاف اور کھلا حکم اور کیا ہوگا جو کمال رضامندی اور خوشنودی کا پتہ دیتا ہے اگر آنحضرت ﷺ کی صریح اجازت درکار ہوتی تو پھر جناب حسن رضی اللہ عنہ نے اس حجرہ میں دفن ہونے کی خواہش کا اظہار کیوں فرمایا تھا جبکہ آپ بخوبی جانتے تھے کہ اب اس قسم کی اجازت اور حکم شرعی کا حصول ناممکن اور محال ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ازواج مطہرات کے تمام حجرے ان کی ذاتی ملکیت تھے اس لیے کہ حضور ﷺ نے ان کو مالک بنادیا تھا اور ہر ایک کے لیے ایک ایک مکان نامزد فرمادیا تھا حکم فقہی کا بھی یہی تقاضہ ہے کہ جب ایک شخص اپنی کسی اولاد کے نام کوئی مکان بنائے یا خریدے اور پھر اس کو اسی کے قبضہ میں چھوڑے رکھے تو وہ اسی کی ملکیت ہو جاتا ہے دوسری اولاد یا وارثوں کا اس میں کوئی دخل نہیں رہتا اور یہی حکم ازواج و دیگر اقارب کا ہے ازواج مطہرات کی ملکیت کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اپنے مکانات میں مالکانہ تصرف فرماتی رہتی تھیں مثلا

1۔ روي العاملي: وذاك أني كنت أكثر أسمع رسول الله ﷺ يقول: جئت أنا وأبو بكر وعمر، ودخلت أنا وأبو بكر وعمر، وخرجت أنا وأبو بكر وعمر. فإن كنت لأرجو أو لأظن أن يجعلك الله معهما. (الانتصار، 6/ 478، ط: دار السيرة بيروت)

توڑ پھوڑ مرمت ان کو تنگ یا کشادہ کرنا دروازہ نکالنا وغیرہ اور یہی حال سیدہ فاطمۃ الزہرہ اور جناب اسامہ بن زید رضی اللہ عنہا کے حجروں کا بھی ہے کہ یہ دونوں اپنے اپنے گھروں کے مالک تھے، اور قرآن مجید کی آیت " وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ "(1) میں اشارہ قریب قریب تصریح کے ہیں۔

پھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا بموجودگی اصحاب کرام جن میں جناب امیر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اجازت طلب کرنا اور کسی کا بھی انکار نہ کرنا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حجرہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ملکیت میں تھا اور یہ سب ہی کو معلوم ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خلفاء کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر رکھتے اور معمولی تغیرات پر گرفت فرماتے تھے اگر اس معاملہ میں بھی وہ دیکھتے کہ کوئی امر خلاف شرع ہے تو وہ کبھی خاموش نہ رہتے لہٰذا اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تمام صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے نزدیک اپنے اپنے حجروں پر ازواج مطہرات کی ملکیت مسلم و ثبوت تھی کسی نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اجازت طلبی پر اعتراض نہیں کیا اور یہ بات تو شیعی کتب سے بھی ثابت ہے کہ سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے بھی اسی حجرہ مبارک میں اپنے جد اطہر صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے چاہی تھی یہ بات الگ ہے کہ ان کی وفات کے بعد مروان کی مداخلت کے باعث ایسا نہ ہو سکا اس سے سلسلہ میں سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ مع اہل و عیال اور سب دوست احباب مسلح ہو کر آمادہ پیکار بھی ہوئے مگر مروان نے فوری طور پر مسجد نبوی اور روضہ اطہر کے ارد گرد فوج متعین کر دی اور اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ اس معاملے میں جناب حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے ہمراہیوں کو گزند نہ پہنچ جائے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیچ میں پڑھ کر اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو سمجھا بجھا کر نیز مصلحت وقت دکھا کر آپ کے غصہ کو کم کیا اور معاملہ بغیر خون خرابے کے نمٹ گیا۔

لہٰذا اگر حجرہ شریف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ملکیت نہ تھا تو جناب سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے اجازت کیوں طلب فرمائی ایسی صورت میں مروان سے اجازت لینی چاہیے تھی کہ وہ حاکم وقت ہونے کی حیثیت سے بیت المال اور اوقاف بغیر پر متصرف تھا اور اس کے حکم کی وجہ سے جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اجازت بھی مفید نہ ہوئی اگر کسی کو

1۔ سورۃ الاحزاب، الایۃ:33

ن روایت سے انکار ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے ہاں کی کتاب فصول مہمہ فی معرفۃ الائمہ یہ دوسری کتابوں کا مطالعہ کرے، اس موقع پر اپنے دلی بغض وعناد سے مجبور ہو کر بہت سے شیعہ بطریق تہمت وافترا جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا پر یہ اتہام لگاتے ہیں کہ آپ حضرت حسن رضی اللہ عنہا کو اجازت دینے کے بعد پچھتائیں اور ایک خچر پر سوار ہو کر مسجد کے دروازہ پر آئیں دفن سے روکا میراث کا دعوی کیا اور جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ ان کا بونگا شعر پڑھا:

تجملت تبغلت وإن عشت تفيلت * لك التسع من الثمن وفي الكل تصرفت[1]

تم شتر سوار ہوئی خچر سوار ہوئی اور زندہ رہیں تو ہاتھی سوار بھی ہو گی تمہارا حصہ تو آٹھویں حصہ کا نواں حصہ ہے مگر تم تو سارا مال ہضم کر گئیں۔

حالانکہ انہیں شاید یہ پتہ نہیں کہ حدیث "نحن معاشر الانبیاء لانورث ولانورث"[2] انبیاء کی ہماری جماعت نہ کسی کے وارث ہوتے ہیں نہ ہمارا کوئی وارث ہوتا ہے، کی راوی خود حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا ہی ہیں اور پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو میراث طلب کرنے سے روکا تو آپ میراث کا دعوی کیسے کر سکتی تھی اور آپ کو سوار ہو کر مسجد کے دروازہ پر انے کی کیا ضرورت تھی تدفین آپ ہی کے حجرہ میں ہونی تھی اپنے حجرہ کا دروازہ بند فرمالیتی۔

اور جناب ابن عباس رضی اللہ عنہما کا جواب کیسے صحیح ہو سکتا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کل متروکات کے آٹھویں حصہ کا نواں جس میں حجرہ سکونت وکاشت کی زمین ہتھیار اونٹ خچر اور گھوڑے بھی شامل تھے بالیقین جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے علاوہ تھے تو حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا پر ان کے ہضم کر جانے کا الزام کیسے درست ہو سکتا ہے، کل میراث نہ آپ کے قبضہ میں تھی نہ آپ نے کھائی غرض جھوٹوں پر خدا کی لعنت کے قانون کے مطابق ان مفتریوں کے ہاتھ لعنت ندامت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں آتا اور قانون الہی ایسے جھوٹوں کو خود

1۔ نور الأفهام في علم الكلام، لللواساني، 2/ 62، ط: مؤسسة النشر الإسلامي

2۔ ذكر المجلسي: نحن معاشر الأنبياء لا نورث ما تركناه صدقة. (بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار، 28/ 104، مؤسسة الوفاء بيروت لبنان)

ان کی اپنی زبان سے رسوا کرتا ہے۔

طعن نمبر 9: آپ ﷺ نے حجرہ عائشہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا فتنہ یہاں ہے

آنحضرت ﷺ نے ایک دن مسکن عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف اشارہ فرما کر دوران خطبہ یہ الفاظ فرمائے:

ألا إن الفتنة ههنا حيث يطلع قرن الشيطان(1)

آگاہ رہو فتنہ یہیں ہے تین مرتبہ فرمایا جہاں سے شیطان کا سینگ نکلتا ہے۔

اور اس سے مراد عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا فتنہ ہے جبکہ آپ امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے لڑنے کے لیے مدینہ سے بصرہ گئیں اور ہزاروں مسلمانوں کے قتل کا سبب بنی۔

جواب: کلام صحیح ہے مگر مراد باطل ہے اور یہ دانستہ کلام پیغمبر ﷺ کی صریح تحریف ہے اس لیے کہ آپ ﷺ نے یہ الفاظ بہت سی جگہوں اور مقامات پر فرمائے ہیں اور اشارہ مسکن عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف نہیں مشرق کی طرف فرمایا ہے ہر جگہ مسکن صدیقہ رضی اللہ عنہا کہاں مسجد نبوی میں جہاں حضور ﷺ خطبہ فرماتے تھے یہ اتفاق ہے کہ وہاں سے رخ کرنے سے حجرہ عائشہ رضی اللہ عنہا سامنے پڑتا ہے کیونکہ آپ کا مسکن مشرقی جانب تھا پھر آئندہ کی عبارت تو دیکھو کیونکہ قرن شیطان کے طلوع کی جگہ مسکن عائشہ نہیں سمت مشرق ہے اور وہ روایت جو ان الفاظ سے سمت مشرق کی مراد ظاہر کرتی ہے خود انہی کی کتابوں میں موجود ہے مگر انتہائی بغض و حسد اور شرارت کی بنا پر ادھر سے آنکھیں موند لی ہیں اور غلط مراد و معنی کو پھیلانے میں اخوان الشیاطین کا کردار ادا کرتے جا رہے ہیں۔

حضرت ابن عباس اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایت اس قصہ کے سلسلہ میں بے جا شبہ دور کرنے میں کافی ہے اس کے الفاظ ہیں:

راس الكفر ههنا وأشار نحو المشرق حيث يطلع قرن الشيطان في ربيعة و مضر(2)

کفر کا سرا یہاں ہے اور اشارہ فرمایا سمت کی طرف جہاں قرن شیطان طلوع ہوتا ہے ربیعہ مضر ہیں۔

1۔ المعجم الكبير للطبراني، 13/ 174، رقم: 13874

2۔ ذكر العاملي: رأس الكفر من هاهنا من حيث يطلع قرن الشيطان يعني المشرق (الانتصار،7/ 462، ط: دار السيرة بيروت لبنان)

اس امت مرحومہ میں جو فتنہ بھی اٹھا اسی سمت سے اٹھا سب سے پہلا فتنہ مالک بن اشتر کا خروج تھا وہ اور اس کے ساتھ ہی حضرت عثمان شہید رضی اللہ عنہ کے خلاف کوفہ سے نکلے اور کوفہ مدینہ منورہ سے جانب مشرق ہے، دوسرا فتنہ عبید اللہ بن زیاد کا تھا جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا باعث بنا اس کے بعد مدعی نبوت مختار ثقفی کا فتنہ نمودار ہوا پھر اکثر بدعت اور باطل عقائد انہی اطراف سے رونما ہوتے رہے اسی لیے رافضیوں کا منبع بھی کوفہ ہے اور معتزلہ کی جائے پیدائش بصرہ، واصل بن عطا بصری، کرامتہ کوفہ کے علاقہ کی پیداوار ہیں خوارج نہروان سے نکلے تو دجال اصفہان سے۔

اس شخص کے کفر میں کیا شک ہو سکتا ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ کے سفر بصرہ کو اڑ بنا کر آپ کے مسکن و محل کو مقام فتنہ کہتا یا خیال کرتا ہے کیونکہ وہ تو منبع ایمان سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کا مسکن تھا جن کے اسم مبارک ہی سے فتنہ کفر بھاگتے ہیں اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا تو اپنے اس حجرہ مبارک سے حج کے لیے مکہ مکرمہ روانہ ہوئی تھیں فتنہ اندازی تو ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھی اگر بصرہ کا سفر معاندین کے نزدیک ناگوار سفر ہو بھی تو اس کے لیے تو آپ مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئی تو اب مکہ مکرمہ العیاذ باللہ محل فتنہ ہونا چاہیے حجرہ مبارک کیوں؟

طعن نمبر10: ایک لونڈی کا رشتہ کے لئے بناؤ سنگھار کیا

یہ لوگ روایت کرتے ہیں کہ:

ان عائشة شوفت جارية وقالت لعلنا نصيد بها بعض فتيان قريش [1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک لونڈی کا بناؤ سنگھار کیا اور مقصد یہ بتایا کہ شاید اس طرح ہم کسی قریش جوان کو شکار کر سکیں (کہ وہ اس کی طرف مائل ہو کر اس سے نکاح کرنے پر آمادہ ہو جائے اور میرے حلقہ تابعداری میں آجائے)

1۔ عن عائشة أنها شوفت جارية وطافت بها وقالت: لعلنا نصيب بها بعض شباب قريش. (مصنف ابن أبي شيبة في الأحاديث والآثار، 5/ 281)

جواب: اول تو بچند وجوہ یہ روایت مجروح ہے اور اس سے ثبوت پیش کرنا درست نہیں مثلاً یہ روایت وکیع بن جراح سے مروی ہے جو انہوں نے عمار بن عمران سے انہوں نے غنم قبیلہ کی ایک عورت سے اور اس نے حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت کی ہے اس میں عمار بن عمر مجہول الحال ہے کوئی نہیں جانتا وہ کیسا آدمی تھا اور غنم کی عورت اسم و مسمیٰ دونوں جہت سے مجہول الحال ہے نہ کوئی اس کا نام جانتا ہے نہ اس کا حال چال اس لیے ان دونوں کی بات معتبر اور قابل حجت نہیں پھر اس روایت میں ہے اور جو مرسل و منقطع دونوں کا احتمال رکھتا ہے کوئی جہت اس سے متعین نہیں ہوتی ایسی بے سروپا روایات سے تمسک کر کے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ذات مطہر پر طعن کرنا کسی مومن کی تو شان نہیں ہو سکتی اگر وجہ عداوت شئ دیگر ہو تب بھی یہ خلاف انصاف ہے کہ اپنی عداوت کے اظہار کے لیے دوسرے کے ایمان میں خلل اندازی کرے اور ان کے لیے ایسے حرب استعمال کرے اور پھر یہ طعن کی بات ہے ہی نہیں اپنی متبنیٰ لڑکی یا پروردہ لونڈی وغیرہ کے لیے مناسب بر ڈھونڈنا کون سی ہار کی بات ہے اور اس غرض و مقصد سے لڑکی کا بناؤ سنگھار کرنا کہ اس سے نکاح کی رغبت ہو مسنون مستحب ہے اور ہمیشہ سے رائج اور جاری ہے (کیا طعن کرنے والے اپنی لڑکیوں کو دولہا کے عائزہ کے سامنے بھوتنی بنا کر پیش کرتے ہیں یا کچھ بناؤ سنگار بھی کرتے ہیں اور کیا وہ بہترین داماد کے حصول کے لیے یہ باعث کو واقعی قابل اعتراض طریقہ مانتے ہیں) صحاح میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ منقول ہیں جو آپ نے اپنے متبنیٰ جناب اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی نسبت فرمائے جو سیاہ فام اور کریہ المنظر تھے:

لو كان أسامة جارية لكسوته وحليته حتى أنفقه[1] اگر اسامہ لڑکی ہوتے تو میں ان کا بناؤ سنگھار کراتا ان کو زیور پہناتا تاکہ ان کی طرف لوگ راغب ہوں۔

اور آج بھی شرفاء وغیرہ شرفاء سب میں یہ طریقہ جاری ہے کہ منگنی کے وقت لڑکیوں کا بناؤ سنگھار کرتے اچھا لباس اور بقدر میسر زیورات سے زیبائش بڑھاتے ہیں بلکہ ایسے موقع پر زیور مانگ کر آرائش اور ناموری کرتے ہیں تاکہ عام دنوں میں نظر آنے والی لڑکی میں ایسا نکھار نظر آئے جو باعث ترغیب ہو اور دولہا

1۔ الطبقات الكبرى لابن سعد، 4/ 62، ط: دار صادر بيروت

والیاں متاثر ہو کر اسے پسند کر لیں تو ایسی بات جو دنیا کے تمام طبقات (حتی کے طعن کرنے والوں کے اپنے) ہاں بھی رائج اور معمول بہ ہو اور شرعا بھی سنت و مستحب ہو وہ قابل اعتراض و موجب طعن کس منطق سے ہو گئی۔

مطاعن صحابہ رضی اللہ عنہم علی العموم

طعن نمبر 1: صحابہ رضی اللہ عنہم نے دو مرتبہ گناہ کبیرہ کیا

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دو مرتبہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا اول جنگ احد میں کے سب بھاگ اٹھے دوم جنگ حنین میں کے وہاں بھی ان کے قدم اکھڑ گئے یہ دونوں جہاد کفار کے مقابلہ میں تھے اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی میں کفار کی لڑائی سے بھاگنا گناہ کبیرہ ہے۔

جواب: جنگ احد کے وقت تک فرار سے ممانعت کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے اور پھر یہ لغزش بھی معاف کردی گئی "وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ "[1] (خدا نے جسے معاف کر دیا مگر آپ اسے معاف کرنے پر تیار نہیں ایسی حالت میں تو آپ اپنے ایمان کی خیر منایئے) اور پھر جنگ احد میں منافقین تو لڑائی سے پہلے ہی بھاگ گئے تھے مسلمان دو بدو ہوئے باقاعدہ لڑائی لڑی مگر جب شکست ہوئی اور یہ مشہور ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت پائی تو ایسی حالت میں کہ سردار لشکر نہ رہے اور جمعیت تباہی کی نظر ہوتی ہو تو ایسی حالت میں فرار کی ممانعت نہیں۔

اور جنگ حنین کی پسپائی کو فرار کہنا تو کھلی دھاندلی ہے یہ تو ایک جنگی چال تھی جو پہلی غلط چال اور بے تدبیری کی اصلاح اور لشکر کو نقصان سے بچانے کے لیے کی گئی ہوا یہ کہ میدان جنگ کا بغور جائزہ لینے کا موقع نہ ملنے کے سبب یہ بات اور دشمن کی چال سامنے نہ آسکی کہ دشمن نے تنگ راستہ کے اطراف کی جھاڑیوں میں اپنے تیر انداز متعین کر کے چھپا دیے ہیں مسلمان بے فکر آگے بڑھے تو اس اچانک حملہ اور افتاد سے سراسیمہ ہو گئے اور انتشار میں مبتلا ہو گئے اس وقت بھی پسپا ہونے والے بھی مہاجر و انصار کے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم نہیں تھے بلکہ وہ مسلمان صحابہ تھے جو فتح مکہ یا بعد میں مسلمان ہوئے مگر ان کی پسپائی کو بھی فرار کہہ سکتے ہیں اس لیے صورتحال سمجھ میں آنے کے بعد یہ فورا پلٹے اور پھر مسلمان فتح سے ہمکنار ہوئے (اور پھر جس ذات گرامی و

1۔ سورۃ ال عمران، الآیۃ: 155

محترم ﷺ کی جھوٹی حمایت کا دام بھر کر یہ معترض ان کے جانثاروں کو مطعون کرنے اور انہیں گناہ کبیرہ کا مرتکب قرار دینے کے لیے مستر ب و بے چین ہیں جب انہوں نے ہی اپنے اصحاب و ساتھیوں کو کچھ نہ کہا تو یہ جو نہ تین میں نہ تیرہ میں کیوں راز خواہی میں اپنا ایمان ضائع کر رہے ہیں) اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ثُمَّ أَنْزَلَ اللهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مسلمانوں پر اپنی سکینت نازل فرمائی اور ایسے لشکر اتارے جن کو وہ دیکھ نہ پائے تھے۔

(تم جن کو بزعم خود کبیرہ کا مرتکب قرار دے کر اپنے بغض و کینہ کا نشانہ بنا رہے ہو اللہ کے ہاں ان کے مرتبہ کا کچھ جلوہ نظر آیا کہ نہیں ان کے لیے سکینہ خداوندی کا نزول ہو رہا ہے لشکر خداوندی ان کی مدد کے لیے اتر رہا ہے اور پھر وہ مظفر و منصور لوٹ رہے ہیں مگر اس سب کے باوجود تمہیں وہ اب تک کبیرہ کے مرتکب ہی نظر آ رہے ہیں) ابو القاسم سعید شیعی نے اپنی کتاب شرائع میں بطور نص یہ بیان کیا ہے کہ جب جنگ میں ہلاکت کے یقین ہو جائے تو جنگ سے بھاگنا جائز ہے تو اب یہ کس منہ سے مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں۔

اور پھر یہ شیعہ تو اپنی کتابوں میں درج صحیح روایتوں کے سبب انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی گناہ کبیرہ کا مرتکب مانتے ہیں مثلاً حضرت آدم علیہ السلام حضرت یونس علیہ السلام وغیرہ جن کا معصوم ہونا قطعی ہے اس پر اجماع بھی ہے تو اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو معصوم بھی نہیں ہے کسی کبیرہ کا ارتکاب ہو بھی گیا تو ان کے نزدیک تعاون کا کیا جواز خصوصاً جب وہ گناہ توبہ استغفار اور رحمت الٰہی سے محو بھی کر دیا گیا ہو پھر یہ گناہ ان کی اطاعت اور جہاد کی مشقتوں کے اجر کو ملیا میٹ نہیں کر سکتا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں وارد قرآن و احادیث متواترہ کی بشارت سے چشم پوشی کرنا اور اکا دکا بشری لغزشوں کی ٹوہ میں لگا رہنا کسی صاحب ایمان کی شان تو ہرگز نہیں (معاندین کے جھک مارنے سے اللہ و رسول کے نزدیک تو ان کے مرتبہ میں رتی بھر کمی نہیں آ سکتی البتہ عاقبت انہی کی خراب ہو گی)

ویسے بھی ان شبہات سے اہل سنت کے اعتقاد میں تو کوئی خلل پڑتا نہیں اس لیے معاندین کی یہ ساری

1۔ سورۃ التوبۃ، الآیۃ: 26

تک ورولا حاصل ہے کیونکہ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی عصمت کے قائل نہیں اگر ان سے کوئی گناہ سرزد ہو بھی گیا ہو تو کیا غم (جب کہ غفور الرحیم خدا کی ذات ہے ہاں معاندین کے ہاتھ میں بخشش کا کام ہوتا تو سوچتے) اہل سنت کی راہ اعتدال کی راہ ہے اس لیے وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہیں مثلاً حقوق صحبت، خدمت رسول، ان کی جانبازیاں و جانثاریاں، راہ خدا میں گھر بار، جان و مال، آل و اولاد لٹا بیٹھنا، دین و شریعت کو رائج کرنا اور وہ آیات جو ان کی شان میں نازل ہوئیں اور وہ احادیث جو ان کی رفعت شان اور بلندی درجہ پر حرف آخر ہیں وہ سب ان کے پیش نظر رہتی ہیں لیکن شیعہ کے ان کو عیبوں اور گناہوں کے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

طعن نمبر 2: صحابہ رضی اللہ عنہم خطبہ کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا چھوڑ گئے

کچھ بلکہ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب ڈھول اور اونٹوں کی آواز سنی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا خطبہ دیتے چھوڑ کر کھیل تماشے اور خرید و فروخت کے لیے دوڑ پڑے اور اس دنیا کی متاع قلیل پر نماز جیسی اہم اور بنیادی رکن اسلامی کو اور وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں قربان کر دیا ان کا یہ عمل صاف طور پر بے دیانتی پر دال ہے جس کا ذکر قرآن میں یوں فرمایا گیا" وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا"[1] جب کاروبار یا کھیل کود کی کوئی بات دیکھ پاتے ہیں تو اس کی طرف جھپٹ پڑتے ہیں اور آپ کو اکیلا کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔

جواب: یہ قصہ ہجرت کے ابتدائی ایام کا ہے جبکہ ہنوز احکام و اداب شریعت سے سب حضرات کو پوری واقفیت حاصل نہ تھی احد کے ایام تھے جس کی وجہ سے سب کو پریشانی لاحق تھی تجارتی قافلہ کا شدت سے انتظار تھا خدشہ یہ بھی تھا کہ قافلہ کا سارا اناج یک مشت کسی نے لے لیا یا قافلہ گزر گیا تو زر گراں تر ہو جائے گا انہی حالات کی بنا پر اضطراری طور پر ادھر جھپٹ پڑے مگر کے باہر صحابہ مثلاً ابو بکر صدیق و عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما بدستور مسجد میں بیٹھے رہے پور تربیت و تعدیب سے قبل کا کوئی فعل افعال جاہلیت کے مانند قابل عتاب اور لائق اعتراض نہیں ہوتا قرآن مجید کا انداز گو عتاب اور تادیب کا ہے مگر اس کے باوجود انجام کار سے ڈرایا یا کسی عذاب کا مورد

1۔ سورة الجمعة، الآية: 11

نہیں بتایا گیا اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ خود سرور کائنات ﷺ نے ایسے حضرات پر نہ عتاب فرمایا نہ غصہ ہوئے نہ ڈانٹ ڈپٹ فرمائی تو اب اور کس کی یہ مجال یا حق ہے کہ وہ ان نفوس مقدسہ پر طعن یا اعتراض کریں۔

اور پھر لغزش کا صحابہ یا امتیوں سے سرزد ہونا نابعید از عقل ہے نہ تعجب کے بعد کہ ان میں عصمت کا جوہر ہوتا ہی نہیں معصوم انبیاء ورسل علیہم السلام تک سے بعض ایسے امور صادر ہوئے جو عتاب الٰہی کا باعث تھے ایسے امور کا تقاضائے بشریت کے سبب ظہور ناگزیر ہے پے بہ پے تنبیہات کے سبب ہی تو تہذیب وتادیب حاصل ہوتی ہے۔

طعن نمبر 3: صحاح کی ایک روایت کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم پر طعن

اہلسنت کی صحاح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت موجود ہے:

سيجاء برجال من أمتي فيؤخذ بهم ذات الشمال، فأقول: أصحابي أصحابي، فيقال: إنك لا تدري ما أحدثوا بعدك. فأقول كما قال العبد الصالح: وكنت عليهم شهيدا ما دمت فيهم فلما توفيتني كنت أنت الرقيب عليهم وأنت على كل شيء شهيد. فيقال: إنهم لن يزالوا مرتدين على أعقابهم منذ فارقتهم[1]

حضور ﷺ نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگوں کو دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا تو میں کہوں گا یہ تو میرے امتی ہیں یہ تو میرے امتی ہیں انہیں جہنم میں کیوں لے جارہے ہو اس پر مجھے بتایا جائے گا کہ آپ واقف نہیں اپ کے بعد انہوں نے کیسے کیسے عمل کیے جن کی پاداش میں ان کو لے جایا جارہا ہے تب میں وہ الفاظ دہراؤں گا جو اللہ تعالی کے ایک صالح بندہ عیسی علیہ السلام نے کہے تھے کہ جب تک میں ان میں موجود رہا ان کا نگران رہا اور تو نے مجھے ان کے درمیان اٹھا لیا تو آپ ان کے نگران رہے تو اپ تو ہر شے کے نگران اور جاننے والے ہیں تو کہا جائے گا کہ جب آپ ان سے جدا ہوئے تو یہ تب سے مرتد ہی رہے۔

جواب: حدیث مذکورہ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مرتد سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی موت

1۔ صحيح البخاري، باب كما بدأنا أول خلق نعيده وعدا علينا، 6/ 97، رقم: 4740، ط: دار طوق النجاة

رتداد ہی پر ہوئی اور جو مرتد مرے ہوں ان میں سے کسی کو بھی اہل سنت نہ صحابی کہتے اور مانتے ہیں نہ ان کے فضائل وخوبی کا کوئی معتقد ہے قبیلہ بنی حنیفہ اور بنی تمیم کے اکثر لوگ بصورت وفد حضور ﷺ کی زیارت کو آئے مگر وہ ارتداد کی وبا کا شکار ہو کر غائب وخاسر ہوئے۔[1] اہل سنت کی گفتگو کا موضوع تو وہ صحابہ کرام ﷢ ہیں جو ایمان وعمل صالح کے ساتھ راہی سفر آخرت ہوئے اور اختلاف رائے کے باعث آپس میں لڑے جھگڑے بھی قتل وقتال تک کی نوبت بھی باہم ہوئی اس سب کے باوجود دونوں متحارب جماعتوں نے باہم ایک دوسرے کو نہ کافر کہا نہ بدعتی بلکہ دونوں ایک دوسرے کے ایمان کی گواہی دیتے اور مومن کہتے اور مانتے رہے ایسے باایمان اصحاب رسول ﷺ کے بارے میں ان کی زنبیل میں کوئی روایت ہو تو پیش کریں۔

یہ قصہ تو ان مرتدوں کا ہے جو فریقین کے نزدیک مرتد تھے بحث تو مرتدوں کے ساتھ جنگ وجدال کرنے والے مسلمانوں سے ہے وہ تو بلاشبہ دین کا علم بلند کرنے والے تھے انہوں نے تو جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ قیصر وکسری کی عظمت وقوت کو پاش پاش کیا، لاکھوں لوگوں کو مسلمان کیا، قرآن مجید کی تعلیم دی، صلاۃ قائم کی، شریعت سکھائی، خدا کے دشمنوں سے جہاد میں کافر کو مسلمان بنانے دین وشریعت اور قرآن کی تعلیم دینے میں جو اجر وثواب ہے اسے ہر مسلمان جانتا ہے اس کے ساتھ ایسے حضرات کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالی نے بشارتیں بھی دیں اور اچھے وعدے بھی فرمائے ذیل میں آیات ملاحظہ ہوں:

وَعَدَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا[2]

تم میں سے اہل ایمان اور اچھے عمل کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالی کا یہ وعدہ ہے کہ ان کو

1۔ قال الخطابي: «لم يرتد من الصحابة أحد وإنما ارتد قوم من جفاة الأعراب ممن لا نصرة له في الدين، وذلك لا يوجب قدحا في الصحابة المشهورين». فتح الباري: 11/ 285.

2۔ سورة النور، الآية: 55

خلافت ارضی کا اسی طرح حقدار بنادے گا جس طرح ان سے پہلوؤں کو بنایا تھا اور ان کو ان کے اسی دین میں جو ان کے لیے پسند کیا گیا ہے تمکن عطا فرمائے گا اس کے بعد ان کے خوف کو امن میں بدل دے گا تا کہ یہ میری عبادت کریں اور اس میں کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرائیں۔

چند جگہ ان کے متعلق ارشاد فرمایا:

رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ[1] اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں۔

وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا[2]

ان کے لیے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں ان میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُمْ مِنَ اللهِ فَضْلًا كَبِيرًا[3]

مومنوں کو یہ بشارت دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے بڑے اعزاز و اکرام ہیں۔

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ[4]

پس جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور جن کو محض میری راہ میں تکلیف دی گئی اور جنہوں نے جہاد کیا مرے بھی مارا بھی میں ان کی لغزشوں کو معاف کروں گا اور ان کو ایسے باغوں میں رکھوں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔

یہاں ایک باریک بات جان لینی چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام پر سب و شتم اور طعن اس لئے کفر و حرام ہے، کہ ان میں سب و شتم کی وجہ یعنی گناہ و کفر سرے سے موجود ہی نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس یہ حضرات کرام تو اپنی

1۔ سورۃ المائدۃ، الآیۃ: 119، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: 100، سورۃ المجادلہ، الآیۃ: 22

2۔ سورۃ التوبۃ، الآیۃ: 100

3۔ سورۃ الاحزاب، الآیۃ: 47

4۔ سورۃ آل عمران، الآیۃ: 195

ہے میں تعظیم و توقیر اور مدح و تعریف کے بے شمار اسباب اپنے اندر رکھتے ہیں اب مسلمانوں کی وہ جماعت جو اپنے اندر اعزاز و اکرام، تعظیم و توقیر کے اسباب کی حامل ہو اور نص قرآنی سے ان کے گناہوں اور لغزشوں کی بخشش و معافی بھی ثابت ہو چکی ہو تو ایسی جماعت بالیقین اعزاز اکرام میں انبیاء کا حکم رکھتی ہے، اس لئے ایسی جماعت کی بد گوئی کرنا اس کو ہدف ملامت بنانا اس کی اہانت و تحقیر کرنا بھی حرام ہے فرق صرف اتنا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام میں تو اسباب تحقیر سرے سے تھے ہی نہیں ان میں تھے مگر وہ مٹا دیئے گئے اور مآل کار یہ کہہ سکتے ہیں کہ گویا کہ یہ اسباب ان میں تھے ہی نہیں، اس لئے کہ توبہ کر لینے والے کی طرف گناہ و لغزش کی نسبت حرام ہے!

سوائے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عام امتیوں کا یہ حال نہیں ہے کہ ان کے گناہوں کی معافی کا ہم کو علم وحی اور قرآن سے قطعی معلوم ہو گیا ہو یا ان کی طاعتوں کا قبول ہونا اور ان کے اعمال سے بالخصوص اللہ تعالی کا راضی ہونا بطریق یقین ثابت ہو گیا ہو، گویا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طبقہ انبیاء کرام علیہم السلام اور عام امتیوں کے درمیان بطور برزخ بنتا ہے اسی لئے جمہور علماء امت کا مذہب یہ ہے کہ صحابہ کے علاوہ کوئی شخص کتنا بھی متقی و پرہیز گار ہو صحابہ کرام کے درجہ کو نہیں پہنچتا یہ بڑا قیمتی اور نفیس نکتہ ہے اسے ذہن نشین رکھنا چاہئے پھر ایک جگہ یہ ارشاد فرمایا:

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ ، خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا[1] ان کا رب ان کو بشارت دیتا ہے اپنی رحمت اپنی خوشنودی اور ان باغات کی جو ان کے لئے ہیں جن میں بر قرار رہنے والی نعمتیں ہیں جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔

وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ[2] لیکن اللہ تعالی نے تم کو ایمان کی محبت عطا فرمائی اسے تمہارے دلوں کی رونق و زینت بنایا اور کفر فسق اور گناہ سے تمہارے اندر نفرت اور کراہت پیدا فرمائی۔

اس آیت سے یہ نکتہ معلوم ہوا کہ پاکبازوں کی اس جماعت میں سے کسی سے اگر کسی فسق و عصیان کا

---

1. سورة التوبة، الآية: 21

2. سورة الحجرات، الآية: 7

ارتکاب ہوا بھی ہے تو وہ خطا، سہو، یا مغالطہ اور غلط فہمی کے سبب ہوا ورنہ فسق و نافرمانی کو برا جانتے اور سمجھتے ہوئے اس کا ارتکاب محال و ناممکن ہے، اور عقلاء کے نزدیک یہ بات اپنی جگہ ثابت و طے شدہ ہے کہ اختیاری اعمال و افعال کرنے کے لئے یہ بات ابتدائی ضروری و لازمی شرط ہے کہ وہ اس کو کرنے سے پہلے اچھا بھی سمجھتا ہو اور اس کی طرف شوق و میلان بھی رکھتا ہو اور یہ اوپر کی آیت سے معلوم ہو گیا کہ ان حضرات کے دلوں کی گہرائی میں کفر فسق اور عصیان سے کراہت اور نفرت موجود تھی اس لئے، دانستہ اور شوق و خوشی سے کسی برائی کے ارتکاب کا ان کے متعلق خیال بھی نہیں کیا جا سکتا، ایک اور جگہ ارشاد ہے:

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ[1]

وہی سچے پکے مؤمن ہیں اپنے رب کے نزدیک ان کے لئے مراتب عزت بھی ہیں معافی بھی ہے اور عمدہ رزق بھی۔

اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ ان کے ظاہری افعال و اعمال، نماز، روزہ، حج و جہاد نہ دکھاوے کے تھے نہ ان میں نفاق وغیرہ کا کھوٹ ملا ہوا تھا یہ تو بڑے سچے اور کھرے مومن تھے کہ اپنے رب کے پاس باعزت مراتب بھی رکھتے تھے اور عمدہ میزبانی بھی حاصل تھی اور یہ مراتب و میزبانی کی عزت اس لئے پائی تھی کہ ان کے رب نے ان کی بخشش و مغفرت فرمادی تھی اور ان کا ایمان حقیقی اور یقینی تھا۔

لَٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ[2]

ہاں رسول اور ان کے ایمان والے ساتھیوں نے اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کئے اور بھلائیاں انہیں کے لئے ہیں اور کامیاب و کامران بھی ہی ہیں

ایک جگہ ارشاد ہے:

1۔ سورۃ الانفال، الآیۃ: 4

2۔ سورۃ التوبۃ، الآیۃ: 88

لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ[1]

تم میں سے فتح سے قبل جان ومال سے جہاد کرنے والوں کی کوئی برابری نہیں کر سکتا وہ بڑے بلند مرتبہ لوگ ہیں ان کے مقابل ہیں جنہوں نے فتح کے مال وجان سے جہاد کیا، اور اللہ کا وعدہ ہر ایک سے بھلائی اور بہتری کا ہے اور اللہ تعالی تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے۔

یہ بھی اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ[2]

آخر مہاجرین جو اپنے گھروں سے نکالے گئے ان کے اموال چھینے گئے وہ اللہ تعالی کے فضل و کرم کے طلب گار اور اللہ ورسول کی مدد کرنے والے ہیں یہی لوگ سچے ہیں۔

آخر آیت تک کا مضمون سامنے رکھتے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان نفوس مقدسہ سے نفاق کے احتمال تک کو واضح اور کھلے الفاظ میں باطل کرتی ہے! نیز ارشاد ربانی:

يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ[3]

وہ دن کہ نہیں رسوا کرے گا اللہ تعالی اپنے نبی کو اور ان کے مومن ساتھیوں کو ان کا نور ان کے آگے اور دائیں جانب دوڑتا پھرے گا۔

یہ ارشاد اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ آخرت میں ان کو کوئی عذاب نہ ہو گا نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کی وفات کے بعد بھی ان کا نور زائل نہ ہو گا ورنہ زائل شدہ اور مٹا ہوا نور قیامت کے دن ان کے کیسے کام آسکتا ہے، اور

1۔ سورۃ الحدید، الآیۃ: 10

2۔ سورۃ الحشر، الآیۃ: 8

3۔ سورۃ التحریم، الآیۃ: 8

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ[1]

اپنے پاس سے ان کو نہ ہٹائیے جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور اسی کی ذات کے طالب ہیں۔
بھی ان محترم ومکرم حضرات صحابہؓ کے متعلق نفاق کے احتمال کو بھی باطل کرتا ہے۔

وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ[2]

ہمارے فرمانوں کو ماننے والے اور ان پر ایمان رکھنے والے جب آپ کے پاس آئیں تو بعد سلام ان کو بتائیے کہ تمہارے رب نے ازراہ مرحمت اپنے لئے یہ طے فرمالیا ہے کہ تم میں سے ازراہ نادانی کوئی برائی کر بیٹھے اور اس کے بعد وہ توبہ کر کے اپنی اصلاح کرلے تو اسکی مغفرت ہوگی کیونکہ وہ غفور رحیم ہے۔

ان کے گناہوں کے بخشے جانے کی اس سے واضح اور صاف دلالت کیا ہوگی جب رب غفور نے ان کو دامن رحمت میں لے کر معاف فرمادیا تو اب مواخذہ کا سوال ہی نہیں، ایک اور جگہ ارشاد ہے:

إِنَّ اللهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللهِ[3]

اللہ نے مومنوں سے ان کی جان واموال کے بدلہ جنت کا سودا کرلیا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرکے مریں گے بھی ماریں گے بھی یہ پختہ وعدہ تورات وانجیل اور قرآن میں درج ہے اور اللہ

1۔ سورۃ الانعام، الآیۃ: 52

2۔ سورۃ الانعام، الآیۃ: 54

3۔ سورۃ التوبۃ، الآیۃ: 111

سے اپنے عہد کو پورا کرنے میں کون بڑھ سکتا ہے۔

لہٰذا معلوم ہو گیا کہ ان حضرات کے حق میں بد احمال ہے کہ بہشت اور مغفرت کی خبر دینے کے بعد ان کو عذاب دیں یا دوزخ میں ڈال دیں اس لیے کہ وعدہ میں بداء جائز نہیں ورنہ وعدہ خلافی لازم آئے گی نیز فرمایا:

لَقَدْ رَضِيَ اللهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ[1]

اللہ تعالیٰ ان مومنوں سے خوش اور راضی ہوا جنہوں نے درخت کے نیچے آپ سے بیعت کی ان کے دلی جذبات سے بھی آگاہ ہوا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رضامندی محض ان کے عمل سے نہ تھی بلکہ ان کے دلوں میں ایمان صدق و اخلاق ثابت و بر قرار تھے اور جو ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھے رضائے الٰہی کا وہی اصلی سبب تھے۔

یہاں بعض نادان شیعہ کہہ دیتے ہیں کہ احکام سے رضامندی اس شخص سے رضامندی کو مستلزم نہیں مگر وہ عناد سے اتنے مغلوب ہوتے ہیں کہ آیت کے الفاظ پر توجہ دینے کی بھی توفیق نہیں ہوئی یہاں اللہ تعالیٰ نے "رَضِيَ اللهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ" فرمایا ہے "عن بيعة المومنين" نہیں فرمایا اور "فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ" کو اس کا ضمیمہ و تتمہ بتایا تو ظاہر ہے کہ صبح و اخلاص اور ارادوں کا محل تو دل ہے تو خوشنودی صاحب فعل سے متعلق ہے فعل سے نہیں اور نفع اندوزی منشا فعل سے متعلق ہے سورۃ فعل کے ساتھ نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ اگر کسی کو حفظ قرآن کی نعمت میسر آجائے اور اس کی حدیث و روایات تک رسائی نہ بھی ہو تب بھی اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ صحابہ کرام ﷺ کے متعلق شعبہ میں پڑے یا ان کی بزرگی اور اعزاز و اکرام میں کسی قسم کا شک کرے اس لیے کہ قرآن کا اکثر حصہ انہی نفوس قدسیہ کی تعریف و توصیف سے بھرا ہوا ہے ناظرہ خواں بے چارہ آیت کا ایک لفظ پڑھ اور سن لیتا ہے مگر اس کو اس کے آگے پیچھے کا کچھ پتہ نہیں ہوتا اور اس لیے وہ اس پر غور و تدبر بھی نہیں کر سکتا نہ یہ معلوم کر سکتا ہے کہ اس میں کون کون سی قیود ہیں اور نظم قرآنی میں اس کا ضمیمہ کس کس چیز کو قرار دیا گیا ہے تاکہ غلط راہوں اور جاہلوں کو اس میں تاویل و تحریف یا من مانے معنی پہنانے کی

1۔ سورة التوبة، الآية: ١١١

گنجائش نہ مل سکے اللہ کی قسم اگر میرے والد ماجد مجھے حفظ قرآن کے علاوہ کوئی اور تعلیم نہ بھی دیتے تب بھی ان کا یہ کام عظیم الشان ہوتا کہ عمر اس کا شکریہ نہ ادا کر سکتا یہ ساری نعمت مجھے حفظ قرآن کی بدولت میسر آئی کہ ہر دینی مشکل میں اسی سے کام لے کر حل کر لیتا ہوں والحمدللہ حمدا کثیرا طیبا مبارکا فیہ

طعن نمبر 4: آنحضرت ﷺ نے جب قرطاس طلب کیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے حیلے حوالے کئے

یہ کہ جب حضور ﷺ نے قرطاس و قلم طلب فرمایا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے تعمیل کے بجائے حیلے حوالے سے کام لیا اور آپ سے حجت بازی کی اور جھگڑے۔

جواب: اس کا اصل اور تفصیلی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر اعتراض کے موقع پر دیا جا چکا ہے بات دراصل یہ ہے کہ جن کے دماغوں میں بغض و عناد اور بدگمانی و بدزنی کا غبار بھرا ہو وہ دوستی اور محبت کے لطیف جذبات کو نہ سمجھ پاتے ہیں نہ ان کی قدر کرتے ہیں جناب رسالت مآب ﷺ کی بیماری کے سبب اس وقت جو کیفیت تھی اور آپ جتنے مضطرب و بے چین تھے اس وقت آپ کو ایسے معاملہ کے لیے جو کسی عنوان طے پا چکا ہو اور آئین و شریعت کی اس کے ذریعہ کوئی ضرورت پوری بھی نہ ہو رہی ہو ایسے عالم میں ہر محب مخلص اپنے محبوب کو ناروا اور فضول مشقت سے بچانا چاہتا ہے۔

اس کے علاوہ اس اعتراض کا ایک دوسرا جواب یہ ہے کہ اس وقت کے حاضرین مجلس میں اکثریت حضرات اہل بیت رضی اللہ عنہم کی تھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو کم تعداد میں تھے اب اعتراض کا سارا زور اقلیت پر ڈال دینا جبکہ اکثریت کی شرکت اور مرضی سے وہ فعل انجام پذیر ہوا ہو اور بے ہودگی ہی کہلا سکتی ہے پھر اس واقعہ کے بعد نبی کریم ﷺ پانچ یوم حیات رہے اہل بیت ہمیشہ خدمت میں رہے سامان نوشت و خواند موجود اور دسترس میں رہا کاتب بھی متعین رہے اگر وہ کوئی بہت ہی اہم دینی معاملہ تھا تو ساری سہولتوں کی موجودگی کے باوجود آپ ﷺ نے دوبارہ اس خواہش کا یا اس کی تکمیل کا اظہار یا اعادہ کیوں نہ فرمایا اس وقت تو کوئی ہی لباس اور جھگڑنے والا آپ کے اس پاس نہ تھا کیا کوئی مسلمان نبی محترم ﷺ کے بارے میں ترک واجب کی سوء ظنی کے بعد بھی اپنا ایمان سلامت رکھ سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی جناب سے جن کو خیر امت اور امت وسط کے معزز القاب عنایت ہوئے ہوں جن کا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہو اور جو شہداء علی الناس کا تمغہ رکھتے ہوں ان کے نسبت بدترین امت کا اعتقاد خیال وگمان رکھنا اللہ تعالیٰ کی مرضی ہی کے خلاف نہیں نصوص قرآنیہ کی کھلم کھلم مخالفت بھی ہے۔

طعن نمبر5: صحابہ رضی اللہ عنہم احکامات کی بجاآوری میں سستی سے کام لیتے تھے

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی بجاآوری میں سہل انکاری سے کام لیتے تھے مستعدی اور لپک جھپک نہیں دکھاتے بلکہ کاہلی اور سستی دکھاتے آپ کے مقاصد سے روگردانی کرتے جان چراتے اور بے جا ٹال مٹول سے کام لیتے اس کے دلیل میں وہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ یوم احزاب کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ألا رجل يأتينا بخبر القوم جعله الله معي يوم القيامة؟»، فسكتنا فلم يجبه منا أحد، فقال: «قم يا حذيفة، فأتنا بخبر القوم»، فلم أجد بدا إذ دعاني باسمي أن أقوم، قال: «اذهب فأتني بخبر القوم، ولا تذعرهم علي»، فلما وليت من عنده جعلت كأنما أمشي في حمام حتى أتيتهم---فرجعت وأنا أمشي في مثل الحمام، فلما أتيته فأخبرته بخبر القوم[1]

کیا کوئی شخص ایسا ہے جو مخالف لشکر کی مجھے خبر لادے اس کے اجر میں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے میرے ساتھ رکھیں گے مگر کسی نے جواب نہ دیا اس وقت سخت طوفانی جھکڑ چل رہے تھے اور بہت ٹھنڈ تھی پھر آپ نے ارشاد فرمایا حذیفہ تم اٹھو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب میرا نام لے کر فرمایا تو مجھے اٹھ جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا آپ نے فرمایا جاؤ اور مخالف لشکر کی خبر لاؤ جب میں وہاں سے چلا ہوں تو ایسا معلوم ہوا کہ میں حمام میں چل رہا ہوں حتی کہ میں لشکر کو دیکھ کر واپس ہوا تب بھی کیفیت ایسی ہی تھی جب واپس آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دے چکا تو مجھے ٹھنڈ لگنے لگی۔

1۔ صحيح مسلم ،باب غزوة الأحزاب، 3/ 1414، رقم : 1788، ط: دار إحياء التراث العربي بيروت

جواب: ان لوگوں کا یہ اعتراض اس لیے قابل جواب نہیں کہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد حکم کی شکل میں نہیں تھا بلکہ ایسی بات کی صورت میں تھا جو عمومی طور پر سامنے رکھی جاتی ہے اس کی مثال اللہ تعالی کے درج ذیل ارشادات کی طرح ہے:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا[1] ہم نے اپنی امانت زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے رکھی کہ اسے برداشت کریں مگر وہ اس سے ڈر گئے اور اسے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ نیز فرمایا:

فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ[2]

پس اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں خوش دلی سے آؤ یا دل نخواستہ دونوں نے کہا ہم خوش دلی سے ہی آتے ہیں۔

اور قرائن حالیہ بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ امر شرعی تبلیغ نہ تھا اور امر ہونے کے باوجود یہ کہاں سے لازم آیا کہ وہ وجوب کے لیے تھا بلکہ اس کا جملہ دعایہ "جعله الله معي يوم القيامة" اس کے مندوب و مستحب ہونے پر واضح دلیل ہے کیونکہ واجبات میں ثواب کا وعدہ نہیں فرماتے، اگر فرماتے بھی ہیں دخول جنت یا دوزخ سے نجات پر اکتفا فرماتے ہیں اس خاص ثواب کا وعدہ اس کے مندوب ہونے کی واضح دلیل ہے بطور اصول یہ بات طے شدہ ہے کہ امر وجوب کے لیے بھی ہو تو وہ وجوب کفایہ ہو گا موسم چونکہ بہت شدید سرد تھا اس لیے ہر ایک نے چاہا کہ یہ کام کوئی دوسرا کرے اگر یہ حکم فردا فردا ہر ایک پر واجب ہوتا تو اس کی بجا آوری میں سارے ہی اٹھ کھڑے ہوتے اور جلد از جلد بجا آوری کا مظاہرہ کرتے۔

اگر یہ کوئی بھی بات نہ مانے تو پھر یہ بتائیں کہ کیا یہ جناب علی مرتضی رضی اللہ عنہ پر وارد نہیں ہوتا کیونکہ وہ بھی تو اس وقت اس جماعت میں شامل اور موجود تھے آپ نے اس حکم کی تعمیل کیوں نا فرمائی اور حکم بجالانے میں عجلت

1۔ سورۃ الاحزاب، الآیۃ: 72

2۔ سورۃ فصلت، الآیۃ: 11

کیوں نہ برتی اتنے کچھ کے بعد بھی اگر جناب امیر و دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں یاوہ گوئی کرے اور خیالات بد کو دل میں جگہ دے تو ان کے منہ توڑنے کے لیے کتاب اللہ احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور کتب سیر سے ہزاروں دلیلیں ان کے منہ پر ماری جاسکتی ہیں" يطيعون الله و رسوله "کا تمغہ صداقت وشہادت ان حضرات کے لیے قرآن مجید میں موجود ہے جو مہاجرین وانصار اور مجاہدین رضی اللہ عنہم کو اطاعت وانقیاد کی وجہ سے مرحمت فرمایا گیا بخاری و مسلم اور کتب سیر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جان ساری پروانہ وار فدائیگی اور آپ پر دل و جان قربان کرنے کی کیفیات ساری کی ساری محفوظ و موجود ہیں ان حضرات کے متعلق یہ الفاظ تاریخ نے محفوظ کر رکھیں ہیں:

كانوا يبتدرون الي امره وكادوا يقتتلون على وضوئه، واذا تنخم نخامة إلا وقعت في كف رجل منهم، فدلك بها وجهه[1]

وہ آپ کا حکم بجالانے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے پانی پر لڑپڑنے کے قریب ہو جاتے اگر آپ کی کلی کا پانی کسی کی ہتھیلی پر آپڑتا تو وہ فوراً اسے اپنے منہ پر مل لیتا۔

کسی ذات کے ساتھ یہ شیفتگی و وارفتگی کسی نے پہلے کہاں دیکھی ہو گی اور جس نے اب دیکھ لی وہ حیران رہ گیا صلح حدیبیہ کے موقع پر جناب عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ جو اس وقت مشرکین مکہ میں سے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جان دشمن وہ مکہ والوں کی طرف سے سوال و جواب کے لیے آئے ہوئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت و شیفتگی کی یہ کیفیت دیکھ کر دنگ رہ گیا جب مکہ واپس گیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مداح سرائی اور تعریفوں کے پل باندھ دیئے اور کہا کہ میں نے قیصر و کسری اور شاہان عزم اور رؤسائے مملکت سب کو دیکھا سب کے درباروں میں گیا ہوں مگر کسی کو بھی گو اس کی ساٹھ پشتیں نوکری میں گزر گئی ہوں اتنا مطیع و منقاد نہیں دیکھا۔

ان شیعوں پر تو کلمہ گوئی ایک تہمت ہی ہے ورنہ کوئی کلمہ گو کلمہ پڑھ لینے کے بعد ان نفوس مقدسہ کے متعلق ایسی یاوہ گوئی اور ہرزہ سرائی نہیں کر سکتا اگر احتمال امر میں اس قسم کی سستی موجب طعن ہوتی ہے تو انہیں چاہیے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے بھی ایک دفتر لکھ ڈالیں اور سرفہرست ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام کا اسم

1۔ صحيح البخاری، باب الشروط في الجهاد والمصالحة مع أهل الحرب وكتابة الشرو، 3/ 193، رقم:2731

مبارک لکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے بلاواسطہ ایک درخت کے کھانے سے منع فرمانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتادیا یہ شیطان تمہارا دشمن ہے ایسا نہ ہو تم دونوں کو جنت سے نکلوادے مگر اس کے باوجود آپ نے شیطانی وسوسے کے زیر اثر اس درخت کو کھالیا ایک بات البتہ ہے یہ معترض شیعہ آخر انہی اسلاف کے اخلاق تو ہیں جو جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لشکری تھے اور جو عدول حکمی اور شوخ چشمی میں بدنامی کی حد تک مشہور ہیں ان کی نافرمانی کی گواہی تو خود جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے بر سر ممبر دی، جس کی کیفیت انہی کی اصح الکتب نہج البلاغہ میں مسطور و مرقوم ہے اور جس کا حوالہ اس کتاب میں بھی گزر چکا ہے یہ اپنے ان اصراف پر عائد شدہ متعین کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے پاک باز محب و منقاد حضرات کے کھاتا میں ڈالنا چاہتے ہیں۔

طعن نمبر6: میں تمہیں آگ سے بچاتا ہوں اور تم اس میں گرتے ہو

کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دوستوں سے فرمایا:

أنا آخذ بحجزكم عن النار: هلم عن النار، هلم عن النار، فتغلبوني، تقحمون فيها[1]

میں تمہاری کمر پکڑ کر آگ سے کھینچتا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ آگ سے ادھر آؤ آگ سے ادھر آؤ مگر مجھ سے چھوٹ کر آگ میں گر پڑتے ہو۔

یہ اعتراض پہلے اعتراض سے بھی زیادہ لچر پوچ ہے اس روایت کے سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک نبی اور ایک امت کی مثال ہے وہ کوئی بھی نبی ہو سکتا ہے اور کوئی سی بھی امت اس میں اپنے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کی تخصیص ہو بھی کیسے سکتی ہے جبکہ ہر شخص کی شہوت نفسی و غضبی اسے دوزخ کی طرف کھینچتی ہے اور پیغمبر کی نصیحت اور فرمان اس کو اس سے روکتا ہے لہذا ہر نبی کی مثال اپنی امت کے ساتھ اس شخص کی سی ہے جو محض شفقت و ہمدردی و خیر خواہی کے جذبہ سے ہر شخص کی کمر پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا اور وہ غلبہ غضب و شہوت کے سبب اس سے پیچھا چھڑا کر جلدی آگ میں گھسا جاتا ہے اور اکثر لوگوں میں چونکہ شہوت و غضب کا غلبہ شدید ہوتا ہے اس لیے پیغمبر کی شفقت و جذب کارگر نہیں ہوتی اور آگ میں گر پڑتے ہیں اور پھر یہ تو تمثیل میں ذکر کردہ آگ ہے

1۔ مسند الامام احمد بن حنبل، 13/ 476، رقم: 8118، ط: مؤسسة الرسالة

والی دوزخ کی آگ مراد نہیں ہے اور اس آگ سے مراد گناہ اور شہوات وخواہشات ہیں جو عموماً آتش دوزخ میں جانے کا باعث بنتے تھے یہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دوزخ میں گرنا ہرگز مراد نہیں ورنہ تو یہ حدیث قرآنی آیت کے صریح مخالف ہوگی جس میں فرمایا گیا ہے "وکنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم منها"[1] تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے کہ اس نے تمہیں بچا لیا۔ اس کے علاوہ بھی قرآن مجید میں بہت سی آیات ہیں ان کے لیے جنت تیار کرنے اور عظیم کامیابی اور بہترین اجر کا وعدہ ہے۔

اور پھر اگر انہی الفاظ کے عموم سے دلیل لانے پر اصرار ہی ہے تو پھر یہ سب باہم شامل ہوں گی اور ان سب میں جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی بھی شامل ہوگی (پناہ بخدا) اور اگر خصوصی خطاب سے دلیل لیتے ہیں تو پھر بعض کے فعل سے بعض پر اعتراض کرنا لازم آتا ہے جو بالکل غیر معقول ہے۔

طعن نمبر 7: روم وفارس کے خزانے ملنے کے بعد آپس میں حسد وحرص

صحیح مسلم میں جناب عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے ایک روایت مروی ہے کہ:

أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: «إذا فتحت عليكم خزائن فارس والروم أي قوم أنتم؟ فقال عبد الرحمن بن عوف: كما أمرنا الله تعالى فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كلا بل تتنافسون ثم تتدابرون ثم تتباغضون[2]

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب روم وفارس کے خزانوں پر تمہاری دسترس ہوگی اس وقت تم کیسی قوم ہوگے عبد الرحمن بن عوف نے فرمایا اللہ کے حکم کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہرگز نہیں بلکہ تم باہم حریص ہوگے ایک دوسرے سے حسد کروگے ایک دوسرے سے آنکھیں چراؤگے اور ایک دوسرے سے بغض رکھوگے۔

جواب: اس طعن واعتراض کا یہ ہے کہ یہاں انہوں نے بد دیانتی کا حسب عادت مظاہرہ کیا ہے وہ الفاظ نقل کر

1۔ سورۃ آل عمران، الآیة: 103

2۔ صحيح مسلم، كتاب الزهد والرقائق، 4/ 2274، رقم: 2962، ط: دار إحياء التراث العربي بيروت

دیے جن پر اعتراض کرنا مقصود تھا اور حدیث کا تتمہ جو ان کے مضموم مقصد کی تردید کرتا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اعتراض سے بچاتا اور اصل مراد کو ظاہر کرتا ہے اسے گول کر گئے بالکل اسی ملحد کی طرح جو " لا تقربوا الصلاۃ "کو تو اپنی مطلب براری کے لیے پڑھتا ہے مگر انتم سکاری کو ہضم کرتا ہے چوری تو ہر جگہ اور ہر معاملہ میں قابل نفرین حرکت ہے مگر خاص کر ایسے مقامات پر حدیث کی چوری نہ صرف نیز نازیبا بلکہ چور کی منافقت سمجھی جائے گی حدیث کا آخری حصہ ان الفاظ پر مشتمل ہے:

ثم تنطلقون في مساكين المهاجرين، فتجعلون بعضهم على رقاب بعض[1]

پھر تم مہاجرین کی طرف جاؤ گے اور وہاں ان کے بعض کو دوسرے کی گردن پر سوار کرو گے۔

اس سے دو باتیں معلوم ہوئی کہ بغض و حسد کرنے والا کوئی اور فرقہ ہے اور یہ فرقہ مہاجرین صحابہ کا تو بالکل نہیں خواہ وہ انصار ہوں یا دوسرے مگر انصار کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی کہ مہاجرین کو وہاں ہم ورغلا کر لڑا دیا ہو، اب لے دے کے ایسے لوگوں کا وجود تابعین ہی میں پایا جا سکتا ہے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو موضوع بحث میں دو ہی گروہوں میں منقسم ہیں یعنی مہاجر و انصار ان کا مہاجر ہونا تو از روئے حدیث غلط ٹھہرا اور انصار ہونے کے حالات و واقعات تردید کر رہے ہیں اور حدیث کے الفاظ غیر مبہم طور پر اعمال بد کے وقوع کا زمانہ فارس و روم کے خزانے فتح کرنے کے بعد متعین کرتے ہیں کہ اس وقت تم میں سے بہت سے لوگ خزائن و فتوحات کی کثرت کی بنا پر بغاوت و فساد کی راہ اختیار کریں گے مگر مہاجرین کو کہ خلافت و ریاست ان کا ورثہ ہے چرب زبانی دروغ گوئی اور لگائی بجھائی کر کے باہم لڑا دو گے جب ہم تاریخ کے اوراق میں اس جماعت اور اس کے سرغنوں کا کھوج لگاتے ہیں تو وہاں جناب عبدالرحمن بن ابی بکر،[2] مالک اشتر

1۔ المرجع السابق

2۔ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک تھے یا نہیں؟ اس حوالے سے روایات میں اختلاف ہے، اکثر روایات میں ہے کہ آپ شروع میں شریک ہوئے تھے، لیکن جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے انہیں ان کے والد ابو بکر رضی اللہ عنہ کی یاد دلائی تو وہ پیچھے ہٹ گئے، اور گھر سے باہر نکل گئے۔

محمد بن طلحة، قال: سمعت كنانة، مولى صفية بنت حيي، قال: شهدت مقتل عثمان، وأنا ابن أربع عشرة سنة، فقلت: هل أندى محمد بن أبي بكر بشيء من دمه، فقال: معاذ الله، دخل عليه، فقال عثمان: يا ابن أخي لست

مروان بن حکم اور ان جیسے لوگوں کے نام نمایاں درج ملتے ہیں، لہذا اس اعتراض و طعن کا ہدف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہرگز نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام مبارک میں معاذ اللہ کذب لازم آئے گا۔

ایک اور جواب اس قسم کے اعتراض کا نبوت کی بحث میں گزرا ہے کہ شیعی روایت کے مطابق اللہ تعالی کی طرف سے تنبیہ اور ڈانٹ کے باوجود ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام تمام عمر ائمہ اہل بیت کی طرف سے حسد و بغض گرفتار رہے تو ان معصوم کی پیروی میں غیر معصوم صحابہ بھی قدم زن ہو گیا تو اعتراض کیوں اگر شیعوں کے ہاں پیغمبر معصوم کے عمل کی کوئی توجیح یا جواب ہو سکتا ہے تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بابت اہل سنت کی طرف سے بھی وہی توجیح یا جواب تصور کر لیا جائے۔

طعن نمبر 8: صحابہ رضی اللہ عنہم سیدنا علی و سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ایذاء پر متفق ہو گئے تھے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "من آذى عليا فقد آذاني"[1] جس نے علی رضی اللہ عنہ کو ستایا اس نے گویا مجھے ستایا اور حضرت بی بی فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی نسبت فرمایا" من أغضبها أغضبني "[2] جس نے انہیں غصہ دلایا اس نے گویا مجھے غصہ دلایا حالانکہ سب صحابہ نے علی رضی اللہ عنہ کی عداوت اور بی بی زہرا رضی اللہ عنہا کی ایذاء رسانی پر اتفاق کیا ہے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی ان کو رسوا کیا جبکہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما نے ان کے گھر کو جلانا چاہا اس کی تفصیل شیعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ:

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی قنفذ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلانے کے لیے بھیجا کہ وہ آکر بیعت کر لیں مگر وہ نہیں آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو طیش آیا اور خود ان کے گھر گئے اور ساتھ ہی اپنے

بصاحبي، فخرج ولم يند من دمه بشيء...الخ.(معرفةالأصحاب لابي نعيم الأصبهاني،ترجمة عثمان بن عفان، 1/ 66، الرقم: 257، دار الوطن، ط: الأولى، 1419ھ)

تحفہ کے نسخہ اردو مترجم مولانا خلیل الرحمن نعمانی مظاہری کے اس مقام صفحہ:651 پر عبد الرحمن بن ابی بکر ہے اور فارسی نسخہ مطبوعہ مکتبۃ الحقیقۃ استنبول ترکی کے صفحہ:688 پر محمد بن ابی بکر ہے اور صحیح بھی یہی معلوم ہوتا ہے اس لئے ہم نے اوپر عبد الرحمن بن ابی بکر کی بجائے محمد بن ابی بکر لکھا ہے۔

1۔ مسند الامام احمد بن حنبل، 25 / 321، ط: مؤسسة الرسالة

2۔ صحيح البخاري، باب مناقب قرابة رسول الله صلى الله عليه وسلم، 5/ 21، رقم: 3714

ساتھ لکڑی کے اکٹھے اور آگ بھی لے گئے گھر پہنچے تو دروازہ بند دیکھا تو زور سے آواز دی کہ علی بن ابی طالب دروازہ کھولو مگر جناب علی خاموش رہے اور دروازہ نہ کھولا تو آپ نے دروازہ کو آگ لگادی اور بلا تامل اندر گھس گئے جب سیدہ زہرا نے یہ دیکھا تو بے اختیار حجرہ سے نکل آئیں اور عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے آکر اپنے بابا صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے لے کر رونا شروع کر دیا تب عمر رضی اللہ عنہ انہوں نے اپنی تلوار مع میان کے ان کی کوکھ میں چبھو دی اور علی رضی اللہ عنہ سے کہا ہاں اٹھو اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرلو ورنہ میں تم کو قتل کر دوں گا سارے صحابہ اس وقت موجود تھے مگر کسی نے دم نہ مارا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دختر و داماد رضی اللہ عنہما کو ظالموں کے ہاتھ میں دے دیا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وصیت کو جو آپ نے اہل بیت کے حق میں فرمائی تھی پس پشت ڈال دیا۔"[1]

جواب: اس اعتراض کا یہ ہے کہ یہ سارا قصہ اور بیان شیعوں اور کوفہ کے کذابوں کا من گھڑت اختراع اور دروغ بے فروغ ہے خود جھوٹ گھڑیں بہتان باندھیں اور اس کا جواب اہل سنت سے مانگیں تو یہ بیچارے کیسے عہدہ برا ہو سکیں گے جبار سنت سے ہی جواب لینا ہے تو پہلے اہل سنت کی کتابوں سے اس کی حقیقت معلوم کرو اور پھر جواب مانگو اس لیے کہ اہل سنت کے ہاں روایات میں دروغ گوئی کا چلن نہیں ان کے ہاں تو جو بات صحیح ہے وہ بلا کم وکاست حوالہ قرطاس و قلم ہوتی ہے یا ہر مسلمان کو جان لینا چاہیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی جناب امیر اور سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے درپے آزار نہ ہوا، نہ ان کے ساتھ پرخاش رکھی بلکہ ہمیشہ ان کی شان

1۔ علامہ ابو الفتح محمد بن عبد الکریم بن احمد شہرستانی (م:548ھ) ایک رافضی کذاب ابراہیم بن یسار ابن ہانی النظام کے حالات لکھتے ہوئے اس کی بد عقیدگی کے پول بھی کھولتے ہیں۔ اس کا ایک جھوٹ علامہ شہرستانی نے یوں بیان کیا ہے کہ اس رافضی کذاب نے کہا: إنّ عمر ضرب بطن فاطمة يوم البيعة حتى ألقت الجنين من بطنها ، وكان يصيح : أحرقوا دارها بمن فيها ، وما كان في الدار غير علي وفاطمة والحسن والحسين عليهم السلام . (سیدنا) عمر (رضی اللہ عنہ) نے بیعت والے دن سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پیٹ پر مارا اور ان کے پیٹ کا بچہ گر گیا۔ عمر (رضی اللہ عنہ) پکار کر کہہ رہے تھے کہ اس (سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا) کے گھر کو گھر والوں سمیت جلا دو، گھر میں سوائے سیدنا علی، سیدہ فاطمہ، سیدنا حسن اور سیدنا حسین (علیہم السلام) کے کوئی نہ تھا۔ (الملل والنحل للشهرستاني : ١/ 57 ، الوافي بالوفيات للصفدي (م : ٨٧٦٤) : 5/ 347) رافضی شیعہ اس روایت کو بنیاد بنا کر خلیفہ راشد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر تبرا بازی کرتے ہیں، لیکن اس روایت کی نہ تو ابراہیم بن یسار تک کوئی سند مذکور ہے نہ ابراہیم سے آگے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تک کوئی سند دنیا کی کسی کتاب میں موجود ہے۔ یہ روایت دنیا کا سفید جھوٹ اور شیطان لعین کی کارستانی ہے۔ اس طرح کی جھوٹی بے سند اور بے سروپا روایات سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف پراپیگنڈہ کرنا ناعاقبت اندیشی ہے۔

کے شایان عزت و توقیر کرتے ہر طرح کی مدد میں نصرت کے لیے کمربستہ رہتے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے جب بھی ان کی طرف سے کسی اعانت کی طلب ہوئی یا کسی ضرورت کو محسوس کیا ان کی مدد و اعانت کی گئی چنانچہ عبدالرحمن ابزی کہتا ہے:

شهدنا صفين مع علي في ثمان مائة ممن بايع تحت الشجرة بيعة الرضوان وقتل منهم ثلاثة وستون رجلا منهم عمار بن ياسر وخزيمة بن ثابت ذو الشهادتين وجمع كثير من المهاجرين والانصار وقد ذكرهم وغيره[1]

ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ صفین میں آٹھ سو نفر تھے جنہوں نے بیعت رضوان کی تھی ان میں سے تریسٹھ افراد مقتول ہوئے جن میں عمار بن یاسر اور خزیمہ بن ثابت ذوالشہادتین رضی اللہ عنہما بھی تھے اور مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کی ایک بہت بڑی جماعت تھی جن کا اس نے اور دوسروں نے بھی ذکر کیا۔

یہ بات جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خطبہ مندرجہ نہج البلاغہ میں موجود ہے علاوہ ازیں آپ رضی اللہ عنہ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کو جو خطوط تحریر فرمائے وہ سب موجود ہیں جن میں آپ رضی اللہ عنہ نے مہاجرین و انصار کے ساتھ ہونے کو اپنی خلافت کے حق ہونے کی دلیل قرار دیا ہے ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے دانا اور فہیم سے ایسا عمل ظہور میں آئے اور یہ قنفذ کون ہے؟ جس کے نہ نام کا پتہ نہ ذات کا، یہ کس حیثیت سے آپ کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا تھا۔

آپ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینے والے اور جنگ صفین میں آپ کے دوش بدوش یہی مہاجر و انصار تو تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نظروں سے ابھی ابھی اوجھل ہوئے تھے جناب زہراء رضی اللہ عنہا موجود تھیں جناب شیخین رضی اللہ عنہما کے قوت و

1۔ عن عبد الله بن عبد الرحمن بن أبزى عن أبيه قال: شهدنا مع علي ثمان مائة ممن بايع بيعة الرضوان، قتل منا ثلاثة وستون منهم عمار بن ياسر. (تاريخ خليفة بن خياط العصفري، ص: 148، ط: دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع)

تاریخ خلیفہ بن خیاط اور اسی حوالے سے الاستیعاب میں یہی مذکور ہے کہ خذیمہ بن ثابت ذوالشہادتین صفین میں شریک تھے لیکن الاصابہ میں مذکور ہے کہ ذوالشہادتین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں فوت ہو چکے تھے۔ (ملاحظہ فرمائیں: الاصابہ، 2/239، ط: دار الکتب العلمیہ بیروت)

شوکت انہی دو گروہوں سے تھی بخلاف جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے ان کے پاس تو ایک لاکھ شامی پہلوان پشت پناہی کے لیے موجود تھے وہ اگر انصار و مہاجرین کو نظر انداز کرتے تھے تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے لیکن اس دور میں جب کہ سارے کے سارے مہاجر و انصار زندہ ہوں کوئی فوت نہ ہوا ہو اور نہ ہی قتل ہوا ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جدا ہوئے بھی دو چار ہی دن ہوئے ہوں تو یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ان مہاجر و انصار نے خاندان رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم ہوتے دیکھا اور خاموش رہے ظلم و غضب کے معاملہ میں خاموشی یہ ان نفوس زکیہ پر الزام ہے ان کے اجتماعی خاموشی کا صرف ایک ہی مطلب تھا جو ہو رہا ہے عین منشا نبوت کے مطابق ہو رہا ہے اور کسی پہلو بھی نہ کسی پر جبر ہے نہ ظلم اور نہ کسی کی حق تلفی کی جا رہی ہے نہ کسی کو ستایا جا رہا ہے نہ اسے ذلیل کیا جا رہا ہے افہام و تفہیم کی فضا ہے آراء کا اختلاف اگر ہے بھی تو اسے فہم و فراست سے حل کیا جا رہا ہے لاٹھی یونکا اور وہ ایسے معاملہ میں جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات موجود ہوں اہل حل و عقد انہیں تسلیم کر کے عمل پیرا ہو چکے ہوں یہ صرف دشمنان اسلام کو پروپیگنڈا ہے اور کچھ نہیں پھر جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں دیکھ لیں کہ وہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ اور نہیں ہوئے بلکہ آپ ہی نے ان کی سرکشی کی وجہ سے ان پر حملہ کیا تھا مگر اس کے باوجود مہاجر و انصار رضی اللہ عنہم معتد آپ کے زیر علم شانہ بشانہ تھی اگر سارے ہی مہاجر و انصار ان کے خلاف اور ان کو دشمنوں کے حوالہ کرنے والے تھے تو یہ تعداد کہاں سے آگئی غرض یہ سب کچھ کسی بھی عقل رکھنے والے کی سمجھ میں نہیں آتا ہاں جس کی عقل شیطان یا اخوان الشیطان نے مار رکھی ہو وہ البتہ صحرائے ذلالت و گمراہی میں بھٹکنے والا ہی ایسی باتیں گھڑ یا باور کرتا ہے اب پہلے آپ یہ ملاحظہ فرمائیے کہ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما دونوں حضرت کے علی رضی اللہ عنہ سے متعلق کیا خیالات اور برتاؤ تھا۔

شیخین رضی اللہ عنہما کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے برتاؤ

جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہمیشہ آپ کے اوصاف و فضائل میں رطب اللسان رہتے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ کی عزت و توقیر کرنے کے لیے تاکید فرماتے رہتے چنانچہ دار قطنی نے شعبی سے روایت کی ہے کہ:

ایک مرتبہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تشریف لے آئے تو آپ کو دیکھ کر جناب صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا جسے ایسے آدمی کے دیکھنے کی خواہش و

خوشی ہو جو لوگوں میں باعتبار مرتبہ بلند ہو آنحضرت ﷺ سے باعتبار قرآن سب سے قریب ہو اور آپ کی پیروی و متابعت میں سب سے افضل و برتر ہو تو اسے چاہیے کہ وہ آنے والے صاحب کو دیکھ لے۔[1]

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی آپ کی توقیر و تعظیم کرتے آپ سے صلاح و مشورہ طلب کرنے میں مبالغہ فرماتے تھے دار قطنی نے سعید بن مسیب کی روایت میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی الفاظ روایت کیے ہیں" وأعلموا انه لا يتم لأحد شرف إلا بولاية علي بن أبي طالب "[2] لوگو خوب سمجھ لو کہ شرافت کی تکمیل علی کی دوستی ہی سے ہو سکتی ہے۔

اور جب موؤدہ کے متعلق سوال اٹھا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باہم مختلف رائے تھے اس میں یہ سوال پیش آیا کہ مہینہ دو مہینہ کا ساقت کردہ حمل بھی موؤدہ کہلائے گا یا نہیں تو محتاط صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رائے تھی کہ وہ بھی موؤدہ میں شامل ہے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا واللہ جب تک اس پر سات مرتبہ نہ گزرلیں وہ موؤدہ نہیں ہوتی یہ حضرت جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا" صدقت أطال الله بقاءك يا ابا القاسم "ابو القاسم اللہ آپ کی زندگی دراز فرمائے آپ نے سچ فرمایا، حریری نے درۃ الخواص فی اغلاط الخواص میں لکھا ہے کہ یہ دعائیہ جملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے پہل ادا فرمایا۔[3]

1۔ عن الشعبي قال رأى أبو بكر عليا فقال من سره أن ينظر إلى أعظم الناس منزلة من رسول الله (صلى الله عليه وسلم) وأقربه قرابة وأفضله دالة وأعظمه غناء عن نبيه فلينظر إلى هذا.(تاريخ دمشق لابن عساكر، 42/ 73، ط: دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع)

2۔ بشارة المصطفى لشيعة المرتضى ، ص: 382، ط: مؤسسة النشر الاسلامي قم

3۔ [عن عبيد بن رفاعة] عن أبيه قال جلس [إلى عمر] علي والزبير وسعد في نفر من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم فتذاكروا العزل فقالوا لا بأس به فقال رجل إنه يزعمون أنها الموؤودة الصغرى فقال علي رضي الله عنه لا تكون مؤؤودة حتى تمر عليها التارات السبع تكون سلالة ثم تكون نطفة ثم تكون علقة ثم تكون مضغة ثم تكون عظما ثم تكون

عظیم باپ کے صحیح خلف الرشید حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما برگزیدہ اصحاب کرام میں شمار ہوتے ہیں وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ جہاد و قتال میں عدم شرکت پر ہمیشہ ملول و متاثر رہے طبرانی نے اوسط المعاجم میں سے روایت بیان کی ہے کہ جب حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو مکہ میں یہ معلوم ہوا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جانب عراق روانہ ہوگئے ہیں تو یہ مکہ سے دوڑ پڑے اور تین دن رات کے فاصلہ کے مسافت پر آپ کو جالیا آپ سے کہا:

أين تريد؟ قال: العراق قال: وإذا معه طوامير كتب فقال: هذه بيعتهم فقال: لا تأتهم فأبى أفقال: إني محدثك حديثا: إن جبريل عليه السلام أتى النبي صلى الله عليه وسلم فخيره بين الدنيا والآخرة فاختار الآخرة ولم يرد الدنيا وإنكم بضعة من رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يليها أحد منكم أبدا وما صرفها الله عز وجل عنكم؛ إلا للذي هو خير لكم قال: فأبى أن يرجع فاعتنقه ابن عمر وبكى وقال: أستودعك الله من قتيل[1]

آپ کا ارادہ کہاں جانے کا ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ عراق جارہا ہوں اور آپ کے ساتھ مکاتیب و عہد ناموں کے بڑے دفتر اور طومار تھا جس کے متعلق فرمایا کہ یہ وہاں کے لوگوں کے خطوط ہیں اور یہ بیعت نامے ہیں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے ان خطوط اور بیعت ناموں پر نہ جایئے میں جو کہتا ہوں بغور سنیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبرائیل امین آئے اور دنیا و آخرت میں سے ایک کے اختیار کرنے کا حق دیا کہ ان میں سے جو چاہیں پسند فرما لیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت کو اختیار فرمایا اور آپ بھی ان کے جسد مبارک کا ایک جز ہیں آپ میں سے کوئی بھی متولی خلافت نہ ہوگا پھر بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے واپسی سے انکار فرمایا تو

لحما ثم تكون خلقا آخر فقال له عمر صدقت أطال الله بقاءك وهذه أيضا رواية زيد بن أبي الورقاء عن بن لهيعة وقيل إن أول من قال في الإسلام أطال الله بقاءك عمر لعلي رضي الله عنهما (الاستذكار لابن عبدالبر، 6/ 227)

1 ۔ الشريعة للآجري، باب إخبار النبي ﷺ بقتل الحسين، 5/ 2176، رقم: 1668، ط: دار الوطن الرياض

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان سے معانقہ کیا اور با آواز بلند رو رو کر کہے جا رہے تھے کہ اے مقتول میں تمہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

ر نے بھی عمدہ و صحیح سند کے ساتھ اسی قسم کی روایت بیان کی ہے۔

جنگ جمل کی حقیقت

اب ہم ان لڑائیوں کے معاملہ کو لیتے ہیں جو حضرت طلحہ جناب زبیر اور ام المومنین رضی اللہ عنہم اور جناب امیر ضی اللہ عنہ کے مابین واقعہ ہوا اس سلسلہ میں یہ بات تو بلا خوف و تردید بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ ان لڑائیوں کی جناب امیر رضی اللہ عنہ سے بغض و عناد ہرگز نہ تھا نہ آپ کو ایذا پہنچانا مطمح نظر تھا بلکہ ان کے کچھ دوسرے ہی سیاسی م کے اسباب و عوامل تھے جن کو قابل اعتماد مؤرخین نے شرح و بسط اور خاصی تفصیل سے مدون و مرتب کیا ہے اور وہ سارے کے سارے اسباب و عوامل وقوع میں بھی آئے۔

اجمالاً ان کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو کوفہ و مصر کے اوباشوں اور شورش ندید معاشوں نے شہید کر دیا تو اس وقت فضا و حالات کو دیکھتے ہوئے جناب امیر رضی اللہ عنہ نے ان سے الجھنا یا دار بر کرنا مصلحتاً مناسب خیال نہیں فرمایا اور خاموشی اختیار فرمائی مگر ان بدبختوں نے اپنے اس فعل قبیح و شنیع کو ق ستائش سمجھا اور اس پر فخر کرنا اور حضرت شہید رضی اللہ عنہ کو برائی سے یاد کرنے کی مضموم حرکت بھی شروع کر ں اور اعلان کہنے لگے کہ ہم نے جو کیا یہی حق ہے دوسری طرف چند برگزیدہ صحابہ کی ایک جماعت جس میں اب طلحہ و زبیر، نعمان بن بشیر اور کعب بن عجرہ وغیرہ رضی اللہ عنہم قتل عثمان رضی اللہ عنہ سے بہت دلگیر اور متاثر و ملول تھے کہتے تھے کہ یہ بدترین سانحہ ہے جو امت میں رونما ہوا اگر ہمیں ابتدا میں صحیح طور پر معلوم ہو گیا ہوتا کہ ایسا گا تو ہم اول قدم پر ہی اس کا سد باب کر دیتے افسوس وہ مظلوم مارے گئے وہ یقیناً حق پر تھے ان کے قاتلین ہی ار و اور باطل پر تھے قاتلوں اور شورش پسندوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ بعض حضرات ہمارے خلاف یہ رائے کھتے ہیں تو انہوں نے طے کیا کہ ان کو بھی جام شہادت پلا کر حضرت عثمان شہید رضی اللہ عنہ کی راہ پر روانہ کرنے بعض ض اور ہمدرد لوگوں کے ذریعہ اس پخت و پز کی اطلاع ان حضرات کو ملی اور یہ حضرات مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے، ں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بسلسلہ حج پہلے سے قیام فرما تھیں ان حضرات نے سارے حالات و

کوائف سے آپ کو آگاہ کر کے یہ بھی کہا کہ اب ہم آپ کی پناہ میں ہیں کہ پریشانی میں ماں کی گود بچہ کے لیے باعث سکون ہوتی ہے آپ سارے مسلمانوں کی ماں ہیں مسلمانوں پر جو افتاد آپڑی ہے اور عربوں کی جو آفت ہمارے سروں پر مسلط ہو گئی ہے اس کو اب صرف آپ ہی ٹال سکتی ہیں کیونکہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے تو مصلحت وقت کے پیش نظر ان بدبختوں کے سامنے خاموشی اختیار فرمائی ہے اور سرپسندوں نے اس خاموشی کو کمزوری سمجھ لیا ہے اور اب وہ ظلم و تعدی پر زیادہ جری اور بے باک ہوتے جا رہے ہیں، جب تک حضرت عثمان شہید کا قصاص ان سے نہ لیا جائے گا اور ان کی بدکرداری کی قرار واقعی سزا نہ دی جا سکے گی معاملات صحیح نہ ہوں گے ان کا ظلم و تعدی بڑھتی رہے گی کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہ ہو گا تو من مانی کریں گے دیار میں انتشار و افتراق پھیل جائے گا اور سارے مسلمان امن و اطمینان سے محروم ہو جائیں گے۔

اس وقت جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے مشورہ دیا کہ جب تک امیر المومنین رضی اللہ عنہ ان کے گھیرے میں ہیں اور وہ لوگ مدینہ میں ہیں تم مدینہ نہ جاؤ جہاں اطمینان و سکون نظر آئے وہاں قیام کرو اس دوران تدبیروں سے حیل حوالوں سے یہ کوشش جاری رکھو کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ ان کے نرغہ سے نکل آئیں جب ان سے ان بدبختوں کا اثر ختم ہو جائے گا تو اس وقت تمہاری رفاقت ان کے لیے مفید بھی ہو گی اور مؤثر بھی اس وقت جب وہ تمہارے ساتھ ہوں گے اور تمہاری رفاقت قبول کریں گے تب اس پر غور کرنا اور سوچنا کہ خلیفہ مظلوم کا قصاص کس طرح لیا اور قاتلوں کو سرزنش تنبیہ اور گوشمالی کس طرح ہو کہ دوسروں کو اس سے عبرت حاصل ہو مگر یہ کام بہت بڑا ہے اسے بچوں کا کھیل نہ سمجھنا تمام موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس رائے کو پسند کیا اور چونکہ اس وقت مسلمانوں کی فوجیں عراق و بصرہ میں تھی اس لیے انہی اطراف کو قیام کرنے کے لیے مناسب خیال کیا اور ام المومنین حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا پر زور ڈالا کہ جب تک فتنہ فروغ نہ ہو امن و امان قائم نہ ہو امور خلافت سعی طور پر انجام نہ پانے لگے اور ہماری ملاقات امیر المومنین سے نہ ہو جائے آپ ہمارے ساتھ ہی قیام فرمائیے، آپ ہمارے لیے بہت بڑا سہارا ہیں آپ امت کی ماں ہیں، آپ کا اعزاز و اکرام بھی تمام امہات سے بڑھا ہوا ہے آپ کے ہوتے ہوئے ہم پر ہاتھ اٹھانے کی کسی بدبخت کو جرأت نہ ہو گی لہذا بہت سی مصالح ملکی و ملی کی خاطر اور اس توقع پر کہ جو خلیج مسلمانوں میں پیدا کر دی گئی ہے اس کو پاٹنے اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی میں آپ کی مساعی

ممکن ہے بار اور ہو جائیں ام المومنین رضی اللہ عنہا نے ان کے ساتھ رہنے کا فیصلہ فرمالیا ان میں سے آپ رضی اللہ عنہا کے اقارب بھی تو تھے ایک سگے بھانجے دوسرے بہنوئی اور بھی دیگر اصحاب چنانچہ آپ بصرہ کی طرف روانہ ہوئیں۔

مگر قاتلین اور شورش پسندوں کی یہ حرکت کسی فوری جذبہ یا ابال کا نتیجہ نہ تھی نہ ہی ان کا یہ سبب تھا کہ حضرت عثمان شہید رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد و عادل نہ تھے بلکہ یہ اسلام کے خلاف کفر کی اولین سازش تھی جس کی پشت پر پوری شیطنت اور ابلیسیت کی طاقت مرکوز تھی مدتوں منصوبہ بندی کی گئی رجال کار تیار کیے گئے اور اس کی خشت اول عبد اللہ بن صباح یہودی تھا برسوں سے خفیہ و اعلانیہ تحریک چلائی جا رہی تھی اطراف و اکناف سے شورش پسندوں اور فسادیوں کو ورغلایا اور ابھارا گیا تھا، پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ برسوں کی محنت اور تیاری پر وہ کسی بے تدبیری سے پانی پھیر دیتے لہذا قتل عثمان کے بعد بیعت حاکمہ پر انہوں نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی اول پروگرام بیعت حضرت علی رضی اللہ عنہ جب اطمینان سے پورا کر لیا تب بھی ان کے گرد سے اپنا گھر نہیں ہٹایا بلکہ گرفت اور گھیراؤ اور سخت مضبوط کر دیا اور حالات کو اس نہج پر لے آئے کہ سازشی گروہ معتبر مانا جانے لگا، وہ جو کچھ کہتے وہی صحیح تسلیم ہوتا وہ جو سازش بھی چاہتے کامیاب ہو جاتی تھی چنانچہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کے پیش نظر اصلاح بین المسلمین کا پروگرام تھا وہ اگر کامیاب ہو جاتا تو نہ صرف قاتلان عثمان کیفر کردار کو پہنچا دیے جاتے بلکہ منافقت بھی اپنی موت آپ مر جاتی مگر مشیت ازدی میں کچھ اور ہی طے تھا اس لیے ام المومنین کے سفر خیر کو بھی دشمن نے اعلی مطلب براری بنالیا اور جناب امیر تک یہ قصہ بہت سی رنگ امیزیوں کے ساتھ دوسرے انداز میں پیش کیا اور اپ پر زور دیا کہ آپ کو لامحالہ ان کا تعاقب کرنا چاہیے حضرات حسنین عبد اللہ بن جعفر اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے ہر چند عیس سے روکا اور مخالفت کی مگر آپ پر اثر فسادیوں کا ہی غالب رہا ان حضرات کی بات آپ نے نہیں مانی بالآخر آپ تعاقب میں روانہ ہو گئے۔

جب بصرہ پہنچے تو آپ نے قعقاع کو ام المومنین اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کے پاس بھیجا کہ معلوم کریں ان حضرات کا مدعا و مقصد کیا ہے چنانچہ قعقاع آپ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا ام المومنین آپ کے سفر کی کیا غرض ہے آپ نے فرمایا مسلمانوں میں باہم مصالحت پھر طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کو بلوایا وہ آئے تو قعقاع نے پوچھا کہ بتائیے کہ صلح و اصلاح کس طرح ترکیب سے ہو گی انہوں نے قاتلین عثمان کے حوالگی کے لیے کہا تو

قعقاع کہنے لگا یہ موجودہ حالات میں ناممکن ہے فتنہ فروغ ہوکر مسلمان سب متفق ہوکر مطالبہ کریں تب ہی ایسا ہوسکتا ہے لہذا تقاضہ وقت یہ ہے کہ فی الحال اس معاملہ میں نرمی اختیار کرلو ان دونوں حضرات نے تسلیم کرلیا کہ تمہاری رائے صائب ہے قعقاع جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف لوٹے اور واقعات کی اطلاع دی، حالات روبراہ ہوتے دیکھ کر سب ہی کو خوشی تھی اور یہ یقین ہوتا جارہا تھا کہ صلح کی رکاوٹ اب دور ہوگئی ہے عنقریب صلح ہو جائے گی لشکر وہاں تین دن مقیم رہا تیسرے دن کی شام کو باہمی نامہ و بیان کے ذریعہ یہ طے پاگیا کہ اگلے دن جناب طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما تنہائی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات کریں گے اور اس مجلس میں قاتلین عثمان میں سے کوئی نہ ہوگا یہ خبر ایسی تھی کہ منافقوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ان کو نظر آنے لگا کہ ساری محنت مٹی میں مل کر اکارت ہی نہیں جائے گی جان کے لالے بھی پڑ جائیں گے اور ایک ایک کو چن چن کر قصاص میں قتل کر دیا جائے گا حیران و پریشان اپنے مربی اور استاد عبداللہ بن سبا کے پاس گئے حالات بتاکر چارہ کار پوچھا اس نے کہا بس سورۃ ایک ہی ہے رات کو لشکر ام مومنین پر شب خون مارو اور چیخ چیخ کر کہو مسلمانوں نے دھوکہ دے کر ہم پر حملہ کر دیا یہی بات امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے بھی دل نشین کرو بالآخر انہوں نے یہی کیا لشکر ام المومنین پر ٹوٹ پڑے اور الزام یہ لگایا کہ طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما نے غدر کیا امیر المومنین رضی اللہ عنہ خبر سن کر تعجب میں رہ گئے مگر اب وقت گزر گیا تھا جنگ کی آگ پورے زور سے بھڑک چکی تھی سر قلم ہو رہے تھے منافقوں کی چال بازی مومنوں کی فراست پر بازی لے گئی تھی ناچار امیر رضی اللہ عنہ بھی شریک جنگ ہوگئے اور پھر ہوا جو ہونا تھا۔[1]

قرطبی کے علاوہ دیگر اہل سنت کے مرخین کی اکثریت نے اس واقعہ کو اسی طرح بیان کیا ہے اور جناب حسن جناب عبداللہ بن جعفر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی اسی قسم کی روایت منقول ہے اب شیعوں کے اسلاف قاتلان عثمان جو ان کے پیشوا بھی ہیں ادھر ادھر کی زٹلیات بیان کرنے لگیں تو ہم انہیں گوز شتر کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتے۔

1۔ تاریخ الطبری: 3/ 61؛ المنتظم: 5/ 94.

جنگ صفین کے محرکات

اول اول اہل شام کا مطالبہ بھی یہی تھا کہ قاتلان عثمان سے قصاص لیا جائے اور انہیں پوری سزا ملنی چاہیے مگر جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس وقت بھی یعنی جنگ جمل کے بعد کے اب میدان صاف تھا مخالف اور جھگڑنے والے ختم ہو گئے تھے آپ کی طرف سے غدر واجبی کیا گیا تو وہ بدگمان ہو گئے اور خلافت سے منکر ہو کر آپ کی برائیاں کر کے کہنے لگے کہ دراصل آپ خلافت کے اہل ہی نہیں ہیں اور پھر وہ مد مقابل بن کر اٹھ کھڑے ہوئے جناب امیر رضی اللہ عنہ کا ایک فرمان بحوالہ نہج البلاغہ پہلے بیان ہو چکا ہے جس میں آپ نے فرمایا "ہم ایسے ہو گئے کہ اپنے مسلمان بھائیوں سے لڑتے ہیں اس لیے کہ اس میں کجروی گمراہی شبہ اور تاویل نے جگہ لے لی ہے" اور قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی نہج البلاغہ میں یہ الفاظ موجود ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

قال له قوم من الصحابة: لو عاقبت قوما ممن أجلب على عثمان؟: يا إخوتاه! إني لست أجهل ما تعلمون، ولكن كيف لي بقوة والقوم المجلبون على حد شوكتهم، يملكوننا ولا نملكهم؟! وهاهم هؤلاء قد ثارت معهم عبدانكم، والتفت إليهم أعرابكم، وهم خلالكم يسومونكم ما شاؤوا.[1]

آپ کے بعض رفقانے کہا کاش ان لوگوں کو سزا دیتے جنہوں نے حضرت عثمان پر بلوہ کیا فرمایا بھائیوں میں اس چیز سے ناواقف نہیں جو تم کہہ رہے ہو لیکن ایسا ہو کس طرح سکتا ہے اس لیے کہ صاحب قوت وشوکت ان کے پاس ہے وہ ہم پر حاکم ہیں ہم ان پر نہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ مل کر تمہارے غلاموں نے چڑھائی کی اور تمہارے صحرائیوں نے اکٹھے ہو کر ان کا ساتھ دیا اور یہ تم ہی میں سے ہیں جو دل کھول کر تمہاری ہی برائیاں کرتے پھرتے ہیں۔

مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہو گیا کہ صحابہ کرام حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جس بات کا تقاضا کر رہے تھے آپ اس سے تغافل محض اس لیے فرما رہے تھے کہ آپ مجبور محض ہو کر رہ گئے تھے اور ضرورت کسی کی

1۔ موسوعة الإمام علي بن أبي طالب في الكتاب والسنة والتاريخ، لمحمد الريشهري، 4/ 116، ط: دار الحديث قم

متقاضی تھی اور جناب امیر اس میں معذور تھے نہج البلاغہ کے مندرجات تو شیعہ حضرات کے مرغوبات اور پسندیدہ ہیں ان میں تو اہل سنت کو کوئی عمل دخل نہیں اگر ہم اپنی روایات ذکر کریں تو پوری حقیقت کھل کر سامنے آجائے اور بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے حالانکہ شیعہ ایسی روایات ذکر نہیں کرتے بڑے خفیہ طریقہ پر راز رکھتے ہیں کہ مذہب کا سارا اتار و پود ہی نہ بکھر جائے لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کھلی دلیل ہے کہ خواہ مخواہی کہیں نہ کہیں دو چار عبارات ان سے انہی کی معتبر کتابوں میں ایسی درج کرادی ہیں جو اہل سنت کے بہت ہی کام آتی ہیں اور ان کے خود ساختہ مذہب کی خود ہی پول کھول دیتی ہیں۔

قنفذ کا قصہ سیدہ زہراء رضی اللہ عنہا کے گھر کا دروازہ جلانا یا ان کی کوکھ میں تلوار کا ٹھوکا یہ سب ان کے کوفہ کے اخوان الشیطان مفتریوں اور کذابوں کی من گھڑت ہے جو حسن اتفاق سے ان شیعوں کے پیشوا اور مقتدا بھی ہیں اہل سنت کی کتاب میں بطریق صحیح تو کیا بطریق ضعیف بھی اس کا ذکر نہیں شیعی رواراویوں کا تفصیلی احوال پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ان بدبختوں نے تو اپنے ائمہ کو نہیں بخشا طرح طرح کی تہمتیں ان پر جڑیں نوع بنوع افتراعات ان سے منسوب کیے اور یہ کچھ تو انہوں نے دعوی محبت و اخلاص کے علی الرغم کیا اب آپ خود سوچ لیں جن سے ان کو عداوت ہے جو ان کا دین و ایمان بھی ہے ان کے متعلق تو یہ جھوٹ کے مینار کھڑے کرنے سے بھی نہ ہچکچائیں گے اور انہوں نے ایسا ہی کیا بھی ہے بالاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ان کی کتابوں میں کذب و افترا اور بہتان کے سوا کچھ نہیں جب صورتحال یہ ہو تو اہل سنت ان جھوٹوں کی ان جھوٹی روایات پر کیوں کان دھریں گے جو قرآن مجید اور عترت کی اکثر مخالف ہیں کیونکہ اہل سنت کے دین و ایمان کا رشتہ تو قرآن مجید اور اقوال عترت سے وابستہ ہیں اور یہ دو عادل گواہ ان کے بہتان اور افتراء کی جڑ کاٹنے کے لیے کافی وافی ہیں، ان اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق قرآن کی شہادت درکار ہو تو وہ بھرا پڑا ہے جگہ بجگہ ہم ان کے حوالے بیان کرتے چلے آرہے ہیں یہ آیت " أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ "[1] کس کے بارے میں ہے " أَشِدَّاءُ

1۔ سورۃ المائدۃ، الآیۃ: 54

عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ"[1] کن لوگوں کی شان میں آیا ہے "اَلَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ"[2] کس جماعت کے حق میں نازل ہوئی کیا آیت میں مذکورہ امید کا پسندیدہ مشغلہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر یہی تھا کہ خانہ زہرا رضی اللہ عنہا کو جلائیں اور ان کی کوکھ میں تلوار چبھائیں اسی کے ساتھ اس آیت پر بھی نظر رہے "لٰكِنَّ اللهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ"[3] یہ کس کو خطاب کر رہی ہے فعل بد فسوق ہے یا نہیں مگر یہ آیت کو اس پاک باز جماعت سے فعل بد کی پسندیدگی کی تردید کر رہی ہے وہ فعل بد کو پسند ہی نہیں کرتے اس کے ارتکاب کا ان سے کیا سوال؟ اور اگر اس گروہ اتقیاء واصفیاء کے متعلق حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت ہی سنا چاہتے ہو تو نہج البلاغہ ہی اٹھا کر دیکھ لو کہ انہوں نے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب گرامی قدر رضی اللہ عنہم کے متعلق کیا ارشاد فرمایا ہے ان اصحاب کرام کا اپنے دوستوں کے سامنے تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

لقد رأيت أصحاب محمد صلى الله عليه وآله فما أرى أحدا يشبههم،لقد كانوا يصبحون شعثا غبرا وقد باتوا سجدا وقياما يراوحون بين جباههم وخدودهم ويقفون على مثل الجمر من ذكر معادهم. كأن بين أعينهم ركب المعزى من طول سجودهم. إذا ذكر الله هملت أعينهم حتى تبل جيوبهم. ومادوا كما يميد الشجر يوم الريح العاصف خوفا من العقاب ورجاء الثواب[4]

مجھے تم میں سے کوئی بھی اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مانند دکھائی نہیں دیتا وہ دن محنت مشقت کے کاموں میں گزارتے تو رات نماز کے سجود و قیام میں نہ وہ اپنی پیشانیوں کو آرام دیتے نہ قدموں

1۔ سورة الفتح، الآية: 29

2۔ سورة الحج، الآية: 41

3۔ سورة الحجرات، الآية: 7

4۔ نهج البلاغة، 1/ 189، 190، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

کو گویا آخرت کے ڈر نے انہیں آتش زیر پا کر رکھا ہو ان کی پیشانیوں پر طویل سجدوں کے نشان پڑ گئے تھے اللہ کے ذکر پر آنکھوں سے اس قدر آنسو ابل پڑتے کے چہرہ تر ہو جاتا اور وہ اللہ کے عذاب کے خوف اور ثواب کی امید میں طوفان میں لرزیدہ درختوں کی مانند کانپتے رہتے۔

اور یہ بھی فرمایا:

لقد كنا مع رسول الله صلى الله عليه وآله نقتل آباءنا وأبناءنا وإخواننا وأعمامنا. ما يزيدنا ذلك إلا إيمانا وتسليما ومضيا على اللقم وصبرا على مضض الألم وجدا في جهاد العدو. ولقد كان الرجل منا والآخر من عدونا يتصاولان تصاول الفحلين. يتخالسان أنفسهما أيهما يسقي صاحبه كأس المنون. فمرة لنا من عدونا. ومرة لعدونا منا. فلما رأى الله صدقنا أنزل بعدونا الكبت وأنزل علينا النصر حتى استقر الاسلام ملقيا جرانه. ومتبوئا أوطانه. ولعمري لو كنا نأتي ما أتيتم ما قام للدين عمود. ولا أخضر للإيمان عود.[1]

ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہی میں قتال کرتے اور مقتول بیٹے باپ بھائی ماموں چچا ہوتے اور ایسا ایمان کے تقاضے اطاعت کے جذبہ راہ راست پر چلنے کی خاطر صدمہ کی تکلیف پر صبر کرتے ہوئے دشمن کے خلاف جہاد میں کوشش کرتے ہوئے کرتے ایک ہم میں سے دوسرا دشمنوں میں سے دونوں باہم ایک دوسرے پر شیر کی طرح حملہ اور ہوتے اور ایک دوسرے کی جان لینے کی کوشش کرتے کے دونوں میں سے کون اپنے مدمقابل کو موت کا جام پلاتا ہے کبھی ہم بازی لے جاتے کبھی ہمارا دشمن جیت جاتا جب اللہ تعالیٰ نے ہماری صداقت پر رکھ لی تو دشمن پر ذلت تھوپی اور ہمیں فتح عطا فرمائی حتی کہ اسلام کا سکہ جم گیا اور اسے استقرار نصیب ہوا اس کے پڑوسی مطمئن اس کے دیار

---

1 ۔ نهج البلاغة، 1/ 104، 105، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

دامنگیر جائے امن و قرار ٹھہرے اور میری جان کی قسم کہ ہم بھی اگر وہی کرتے جو تم کر رہے ہو تو نہ دین کو قیام و قرار نصیب ہوتا نہ ہی شجر اسلام سرسبز و بار آور ہوتا۔

اور پھر ان جملہ شہادتوں سے قطع نظر کی صورت میں بھی ایک آیت قرآنی ہمیں ایسی موجود ملتی ہے جو اس قصہ کو جھٹلانے کے لیے کافی ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولَئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ[1]

جو قوم اللہ و رسول اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے آپ اس کو ایسا نہ پائیں گے کہ وہ اللہ و رسول سے ضد و قد رکھنے والے سے دوستی رکھیں خواہ وہ ان کے باپ ہوں ان کے بیٹے ہوں ان کے بھائی یا ان کے کنبہ والے وہ لوگ وہی ہیں جن کے قلوب پر ایمان کندہ کر دیا گیا ہے اور اپنی روح سے ان کو تقویت پہنچائی۔

اس آیت سے بالکل صاف اور صریح طور پر یہ بات معلوم ہو گئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایسے شخص کی طرف راغب ہونا یا دوستی کا ہاتھ بڑھانا جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالف ہو یا اس کی حمایت کرنا یا اس کی دوستی کو حکم الٰہی کے نفاذ میں رکاوٹ بنانا محال بنا ممکن ہے لہٰذا ایسے بلند او صاف رکھنے والے حضرات سے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ایسے واقعہ پر سکوت اختیار کریں چہ جائے کہ ان میں سے کوئی ایسے نازیبہ عمل کا ارتکاب کرے حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد دین کا علم بلند رکھنے میں انہوں نے اپنی جانیں اور اموال نثار کر دی ہوں اور ساری زندگی سنت رسول کی زندہ کرنے میں گزار دی ہو "سبحانک هذا بهتان عظيم"

جب اہل سنت کے سامنے خدا اور سول جناب امیر و حسنین رضی اللہ عنہم کی وقیع شہادت موجود ہو تو ان سے یہ توقع کیوں رکھی جاتی ہے کہ وہ ان اخوان الشیطان کی بکواس اور ابن مطہر حلی اور ابن شہر آشوب مازندرانی کی

1۔ سورة المجادلة ، الآية: 22

افترا، پردازی وزاز خوائی پر کان دھریں گے، ان کی نظر میں تو یہ صدائیں کوے کی کائیں کائیں اور صوت تمار سے زیادہ وزن نہیں رکھتی۔

طعن نمبر 9: قیامت قائم نہ ہو گی جب تک میری امت اگلی قوموں کی اتباع نہ کرے گی

بخاری و مسلم میں بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: " لا تقوم الساعة حتى تأخذ أمتي أخذ الأمم قبلها شبرا بشبر، وذراعا بذراع "، فقال رجل: يا رسول الله، كما فعلت فارس والروم، قال: " وما الناس إلا أولئك [1]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک میری امت وہ کچھ نہ کرے جو پہلے کی امتیں کر چکی ہیں ایک ایک بالشت اور ایک ایک ہاتھ کی مقدار حاضرین نے پوچھا یارسول اللہ کیا وہ فارس وروم کے لوگ ہیں تو آپ نے فرمایا ان کے علاوہ اور کون ہو سکتے ہیں۔

اس اعتراض وطعن میں ان ناہنجاروں نے دنیا کو اپنی عقلوں پر ماتم کرنے کی دعوت دینے کا مضحکہ خیز اقدام کیا ہے کہ ساری امت کو اول تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں محصور قرار دیا اور پھر اس حدیث کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف استعمال کیا حالانکہ اس حدیث میں لفظ امت مذکور ہیں صحابہ کا لفظ نہیں ہے حضور ﷺ کی امت زیادہ تر کفار فارس مرحوم کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے کیا عقائد میں کیا اعمال میں کیا اخلاق میں کیا رسم و رواج میں، مثلا رومی تثلیث کے قائل ہیں کہتے ہیں اللہ تین میں سے ایک ہے، غالی رافضی بھی پانچ خدا مانتے ہیں، باب اول میں اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے پھر رومی کہتے ہیں کہ حشر روحانی ہو گا نہ کہ جسمانی اسماعیلیوں اور دوسرے رافضیوں کا بھی یہی مذہب ہے، رومی پیشاب پاخانہ کی نجاست سے نہیں بچتے نہ کوئی اہتمام ان کے ہاں اس کے لیے پایا جاتا ہے امامیہ کے ہاں بھی انسانی بول و براز نجس نہیں ہے، اس میں اگر یہ لتھڑ بھی جائیں تب بھی ایسی حالت میں نماز جائز قرار دیتے ہیں، اس کا بیان باب فقہ میں گزر چکا ہے رومی خدا اور رسول پر افترا

1۔ مسند الامام احمد بن حنبل، 14/ 153، رقم: 8432، ط: مؤسسة الرسالة

کرتے اور جھوٹے الزامات لگاتے ہیں امامیہ بھی افتراء و کذب میں اپنے ان استادوں کو پیچھے چھوڑ کر خود استاد کا منصب سنبھالے ہوئے ہیں، فارس والے خالق خیر و شر کو علیحدہ علیحدہ ثابت کرتے ہیں تو امامیہ بلکہ سارے رافضی خدا کو خالق خیر اور بندہ و شیطان کو خالق شر جانتے ہیں، فارسی تقدیر کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آدمی کا ارادہ تو وقوع میں آجاتا ہے مگر اللہ کا ارادہ واقع نہیں ہوتا امامیہ بشمول جملہ رافضی بھی یہی مذہب اپنائے ہوئے ہیں، فارسی نوروز کی بہت تعظیم کرتے اسے بمثل عید شمار کرتے ہیں قمر کو عقرب میں اور بھورے کی رسم اور محاق (چاند کا سورج کے مقابلے میں آجانے) کو منحوس مانتے ہیں بالکل اسی طرح امامیہ بھی نوروز کی تعظیم کرتے ہیں اور ان امور کو منحوس سمجھتے ہیں، متعہ، شرمگاہوں کا حلال ہونا جس پر ہندوستان کے راجہ عمل پیرا رہتے ہیں امامیہ کے نزدیک بھی جائز ہے محرمات سے نکاح اور اغلام مجوسی فارسیوں کا دین ہے رافضیوں میں باطنی فرقہ کا بھی یہی مذہب ہے ماتم نوحہ گری چوک گریبانی اور سیاہ لباس کرنا مصیبت و آفت کے وقت فارسی مجوسیوں میں رائج ہے امامیہ بھی اپنے وطیرہ میں ان کے قدم بقدم ہیں۔

یہ تو مشت نمونہ از خروارہ ہے ب نظر تحقیق و تفتیش دیکھا جائے تو یہ قوم شیعہ کفر و شرک کی بہت سی گندگیوں میں انہی کے ہم عنان اور شبر الشبر ذراعا بذراعا میں کہ زندہ مثال نظر آئے گی، اب عام ناظرین کے ساتھ دل چاہے تو شیعہ قوم بغور کرلے کہ اس حدیث مبارک کو عملا صحیح ثابت کرنے میں اور اس کا مصداق بننے میں آگے آگے کون ہے۔

طعن نمبر10: قوم کے ڈر سے نبی کریم ﷺ نے کچھ کام چھوڑ دیئے

یہ ہے کہ بخاری شریف میں بحوالہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لولا أن قومك حديث عهد بجاهلية، لأمرت بالبيت فهدم فأدخلت فيه ما أخرج منه، وألزقته بالأرض، وجعلت له بابين بابا شرقيا وبابا غربيا، فإنهم عجزوا عن بنائه، فبلغت به أساس إبراهيم عليه السلام[1]

1۔ مسند الامام احمد بن حنبل، 43/ 153، رقم: 26029، ط: مؤسسة الرسالة

اگر تمہاری قوم کا عہد کفر ابھی قریب نہ گزرا ہوتا تو مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ وہ اسے گوارا پسند نہ کریں گے تو میں خانہ کعبہ کو ڈھانے کا حکم دیتا اور اس میں سے نکلا ہوا حصہ اس میں شامل کرتا اس کی کرسی زمین سے ملا دیتا اس میں شرقا غربا دو دروازے قائم کرتا اور اس کو ابراہیمی بنیاد پر از سر نو تعمیر کرتا۔

تو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی قوم قریش ہی تو تھی تو معلوم ہوا ان کے دل اور باطن صاف نہ تھے اور ان کے باطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خائف تھے اور ان کے ڈر سے بعض شرعی امور میں آپ کو تقیہ فرماتے تھے۔

جواب: اس اعتراض کا یہ ہے کہ قوم سے سارے ہی قریش مراد ہوں تو اس میں اوروں کے ساتھ جناب امیر رضی اللہ عنہ بھی داخل ہوں گے بلکہ پورا ہاشمی قبیلہ بھی کیونکہ وہ بھی قریش میں سے ہیں اور اگر چند افراد مراد ہوں تو اس سے بات نہیں بنتی کیونکہ مؤلفۃ القلوب اور فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہونے والے افراد سے خوف کا اظہار ہے جو نہ ابھی آداب شریعت سے مؤدب ہوئے تھے اور نہ ہی قوت ایمانی ابھی مستحکم ہوئی تھی اپنے خاص اصحاب اور رفقاء قدیم سے آپ کو کوئی خوف نہ تھا۔

اب رہی تقیہ کی بات تو وہ تبلیغی امور احکام شرعی اور واجبات میں ثابت کرنا چاہیے دنیاوی مصالح اور امارات کی شکست وریخت میں بات بنتی نہیں اگرچہ وہ عمارت کعبہ شریف ہی کیوں نہ ہو کیونکہ یہ عمل بالاتفاق نہ مامور باللہ ہے نا واجب، اور پھر حدیث میں لفظ خوف ہے اور خوف سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز واقع بھی ہو جائے لہذا اس حدیث کے ساتھ تمام اصحاب پر طعن کرنا اور خصوصا ان پر جو یہاں زیر بحث مسئلہ میں سخت بد دیانتی کے ساتھ تعصب و عناد کا گھناؤنا مظاہرہ بھی ہے۔

باب یازدہم

خصوصیات مذہب شیعہ

اہلسنت رحمہم اللہ نے بڑی کدو کاوش اور تلاش و جستجو اور تفتیش و تحقیق سے اس فرقے کے پانچ ایسے خواص معلوم کیے جو کسی دوسرے اسلامی فرقے میں نہیں ملتے ملتے ہیں تو شاذ و نادر اور وہ بھی شیعوں کے میل ملاپ کا اثر ہوتا ہے وہ خواص خمسہ یہ ہیں:

1۔اوہام 2۔عادات 3۔غلوات 4۔تعصبات اور 5۔ہفوات

اول تو آپ ان خواص خمسہ کے معنی ذہن نشین کر لیں اس کے بعد بطور نمونہ ہر ایک سے کچھ ذکر کیا جائے گا ان شاء اللہ۔

الف: عادات، وہ ہیں جو ان کے عوام و خواست میں بلا ان کے علماء کی تصریح و تذکیر شہرت رکھتی ہیں ان عادات کا ذکر نہ ان کی کتابوں میں ہے نہ ان کے علماء نے تصریح کر کے کوئی مذہبی ثبوت پیش کیا ہے مثلاً اولیاء اللہ کے خوارق کا انکار، ماتم، نوحہ، شیون، تصویر سازی، تربت نوازی بموقع ایام عاشورہ ان باتوں کے متعلق عبادت کا گمان رکھنا اور یہ عقیدہ قائم کرنا کہ اس سے تمام سال کے گناہ مٹ جاتے ہیں اور بابا شجاع الدین کی عید کے دن آٹے کا پتلہ بشکل فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بنانا اس کے پیٹ میں شہد ڈالنا اور اس کو قتل کر ڈالنا اور اس شہد کو پی جانا دوشنبہ کے دن کو منحوس سمجھنا چار کے عدد سے الرجک ہونا بارہ کے عدد کو مبارک جاننا اور اسی طرح کی کی عادتیں۔

اس فرقہ کی عادات اس لیے قابل گرفت نہیں کہ ہر فرقہ نے اپنے لیے کچھ عادات کچھ رسوم کچھ بدعات گھڑ رکھی ہیں، لیکن چونکہ اس فرقہ کے علماء و خواص ان امور سے انکار کرتے اور انہیں خلاف کتاب اللہ جانتے ہیں تو ان سے اعتراض ساقط ہو گیا اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنی اس کتاب میں ان کی ان عادات کو نظر انداز کیا ہے اسے موضوع بحث نہیں بنایا، البتہ ان کی بعض عادات جو علمی انداز میں پیش کی جاتی ہیں اگرچہ بحوالہ کتب اور بلحاظ قرداد علماء ان کا ثبوت نہیں ہم نے باب فقہ میں ان کا ذکر کیا ہے مثلاً جمعہ اور جماعت کا ترک، وضو میں پاؤں کا مسح کرنا، موزوں پر مسح ترک کرنے کو سنت بتانا، تراویح کو ترک کرنا، دبر میں وطی کرنا اور متعہ کو افضل عبادات جاننا۔

ب: ہفوہ، یہ ہے کہ اپنے مذہب کی حفاظت کی خاطر یا مخالف مذہب کو شکست دینے کی غرض سے حس، عقل صریح اور تواتر کے خلاف کسی امر کا ارتکاب کیا جائے۔

ج: غلو، یہ ہے کہ جو بات اپنے نزدیک ثابت نہ ہو وہ اپنے محبوب افراد کے ساتھ انتہائی محبت وعقیدت کے پیش نظر ان کے لیے ثابت کرتے ہیں یا جو چیز خود کے نزدیک ثابت ہے ان کے بارے میں اس سے انکار کر دیتے ہیں۔

د: تعصب، یہ ہے کہ جن افراد سے ان کو انتہائی بغض ہے ان کے بارے میں منفی شے کو ثابت اور ثابت کو منفی بتاتے اور ثابت کرتے ہیں گویا غلو اور تعصب دونوں ایک ہی تھیلی کے دو چٹے بٹے ہیں کیونکہ ہر دو میں اپنے مسلمات کی نفی اور اپنے منکرات کی تسلیم کرتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ جب یہ عمل اپنی محبوب شخصیات کے لیے ہو تو وہ غلو ہوتا ہے اور مبغوض شخصیت کے لیے ہو تو اسے تعصب کہتے ہیں اور یہ دونوں عادتیں نص قرآنی کے مطابق حرام ہے:

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللهِ إِلَّا الْحَقَّ [1]

اے اہل کتاب اپنے دین میں غلومت کرو اور اللہ تعالی کی نسبت حق بات ہی منہ سے نکالو۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللهِ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ [2]

اے اہل کتاب گواہی دے دینے کے بعد تم اللہ تعالی کی آیات کے ساتھ کفر کیوں کرتے ہو۔

اسی باعث اس کتاب میں غلو و تعصب کو ایک ہی فصل کے تحت بیان کیا ہے اور شہرت کی بنا پر غلو کو بھی تعصب کے عنوان سے بیان کیا ہے اور اوہام چونکہ گمراہی کی جڑ اور بنیاد ہوتے ہیں اس لیے ان کو مستقل فصل میں سب سے پہلے بیان کیا گیا ہے اس طرح یہ باب تین فصلوں پر مرتب کیا گیا ہے، فصل اول اوہام، فصل دوم تعصبات، فصل صوم ہفوات۔

1۔ سورۃ النساء، الایۃ: 171

2۔ سورۃ ال عمران، الایۃ: 70

فصل اول شیعی اوہام

واضح رہے کہ عقل کے تفکر میں زیادہ تر غلطی غلبہ وہم سے ہوتی ہے اسی لیے ہر اس فرقہ کا جس پر اوہام غالب ہوں عقلی اعتبار اٹھ جاتا ہے، مثلاً بچے اور عورتیں اسی لیے بچوں کے نزدیک لکڑی کا ہر گھوڑا دوڑنے والا ہوتا ہے اور ہر قالین کا شیر پھاڑنے والا ہوتا ہے اور عورتوں کے نزدیک ہر بیماری کا سبب اوپری پرائی یا سایہ آسیب یا شیخ سدو کا دخل واثر ہوتا ہے ان کے نزدیک شادی وغمی کی مقررہ رسمیں چھوڑنا ایسا ہی ہے جیسا کوئی شرعی حکم چھوڑنا اور وہ اسے باعتبار عقل محال سمجھتی ہیں اور اچھے برے شگون لینا، فال نکالنا ان کے نزدیک وحی منزل میں اللہ کا حکم رکھتی ہے لہٰذا جب شیعی مذہب کو دلائل میں وہم کا غلبہ ہوا تو ان کی عقل پر سے اعتماد اٹھ گیا اسی لیے سلف نے فیصلہ دیا کہ شیعہ اس امت کی عورتیں ہیں، اب ان کے اوہام کی تفصیل سننے سے پہلے یہ اور جان لیجیے کہ وہم کا عقل پر غلبہ مطالب حقہ وصحیحہ کی دریافت میں چند انواع وطرق سے ہوتا ہے۔

پہلی نوع: یہ کہ عقل حکم جزئی (خصوصی) کا کلی (عام) جانتی ہے مثلاً یہ کہ ہر مخالف دشمن ہے اب یہاں غلطی کا منشا یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ اس کے عکس کو کلی مان لے جو حقیقت میں ہے بھی یہ وہم میں پڑھ کر اس کو کلی تسلیم کر لیتے ہیں اہل بیت اور اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں شیعوں کو یہی غلطی لاحق ہوئی بلکہ اہل سنت اور اہل بیت کے حق میں بھی کہ صحابہ اور اہل سنت کے بیشتر فقہی مسائل کو امامت سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے اہل بیت سے مخالف پایا تو یہ حکم لگا بیٹھے کہ ان کو اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم سے عداوت ہے حالانکہ باعتبار عقل مخالفت کو عداوت کہنا ہرگز صحیح نہیں کیونکہ اگر ایک ہی مقصد کے طالب حصول مقصد کے لیے جدا راستوں پر گامزن ہوں تو انہیں باہم دشمن نہیں کہتے چنانچہ فقیہ وامام اعظم اہل سنت ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد قاضی ابو یوسف وامام محمد بن حسن شیبانی رحمہما اللہ نے بہت سے مسائل میں اپنے استاد سے اختلاف کیا ہے اب کون عقلمند ان کو اپنے استاد کا دشمن کہے یا مانے گا!

اسی قاعدہ سے بہت سی شاخیں پھوٹتی ہیں مثلاً اگر باہم دو شخص کسی معاملہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں یا ایک دوسرے کے کسی مشورہ واجتہاد میں کوئی غلطی پکڑتا ہے تو وہ اس کا دشمن ہے اس لیے جناب امیر کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بعض باتوں کو ناپسند کرنا یا ان کے بعد اجتہادی مسائل میں ان کو خطاکار ٹھہرانا

شیعوں کے نزدیک دشمنی کی کھلی اور صاف دلیل ہے اسی طرح جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قصاص عثمان میں تاخیر کو بنظر انکار دیکھنے کو یہ لوگ دشمنی پر معمول کرتے ہیں تو جب اصل ہی غلط ہے اس سے جو شاخیں نکلیں گی وہ سب ہی غلط ہوں گی حالانکہ کتب شیعہ میں اسی اصل کے خلاف ثابت ہے ابو مخنف جناب حسین رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ آپ حضرت امیر معاویہ کے ساتھ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح کو ناپسند فرماتے تھے اور جس کو جناب حسن رضی اللہ عنہ کی غلطی اور خطا قرار دیتے تھے،[1] لہذا اگر ان کی تسلیم کردہ اصل کے مطابق کسی بات کا ناپسند کرنا یا اس کو خطا ٹھہرانا عداوت پر مبنی ہو تو لازم آتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جناب حسن رضی اللہ عنہ کے دشمن ہوں ایسا اعتقاد وقوف اور صریح کی طرف لے جاتا ہے۔

دوسری نوع: حصر کے صیغہ کو اکبر میں اپنی طرف سے بڑھا لیتے ہیں کہ نتیجہ غلط نکلے اور شیعوں کے اکثر دلائل اسی نوع کے ہیں جس کا نمونہ باب امامت میں گزر چکا مثلاً جناب امیر رضی اللہ عنہ عالم تھے شجاع تھے اور متقی تھے اور جو ان اوصاف کا حامل ہو امام وہی ہے دوسرا نہیں حالانکہ صغری میں حصر بالکل نہیں اور یہ غلطی اس لیے ہے کہ ہر دو مقدمات میں حد اوسط پوری پوری مکرر نہیں آرہی حالانکہ نتیجہ نکالنے کے لیے حد اوسط کا مکرر آنا شرط ہے لیکن وہم جو معنی کی قیودات کی گہرائی تک پہنچنے سے قاصر و عاجز ہوتا ہے وہ اس سے غافل رہ کر سمجھ بیٹھتا ہے کہ شاید اس میں حد اوسط مقرر آگئی ہے، چنانچہ یہ دلیل بھی اسی نوع اور قبیل کی ہے کہ جناب امیر واجب الاطاعت ہیں اور جو واجب الاطاعت ہو وہی امام ہے وغیرہ وغیرہ۔

تیسری نوع: یہ کہ مطلوب کچھ اور ہوتا ہے اور نتیجہ کچھ اور نکل آتا ہے لیکن چونکہ ان دونوں میں قرب اور نزدیکی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ وہم سمجھ بیٹھتا ہے کہ مطلوب حاصل ہو گیا اسی وجہ سے شیعوں کے اکثر دلائل نامکمل و ناتمام ہوتے ہیں اس کتاب کے مباحث امامت میں اس کی بعض گزر چکے ہیں مثلاً یہ کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ مدینۃ العلم کے دروازہ ہے اور جو مدینۃ العلم کا دروازہ ہو امام ہے وہم نے سمجھا کہ امام چونکہ رئیس امت ہے اور

---

1 ۔ وقال أبو مخنف: كان [مولانا] الحسين بن علي تعلوه الكراهة لما كان عليه من أمر أخيه الحسن (عليه السلام) من صلح معاوية ويقول: لو جز أنفي بموسى كان أحب إلي مما فعله أخي.(الفصول المهمة في معرفة الأئمة، 2/ 775، 776، ط: دار الحديث للطباعة والنشر قم)

دروازہ بھی گھر کی ریاست کسی نہ کسی وجہ سے رکھتا ہے پس جناب امیر رضی اللہ عنہ جب دروازہ ہوئے تو امام بھی ہوئے حالانکہ مدینۃ العلم کا دروازہ ہونا کچھ اور ہے اور امام ہونا کچھ اور ان میں آپس میں نہ اتحاد ہے نہ تلازم۔

چوتھی نوع: یہ مصادرت بر مطلوب کی شکل میں ہوتا ہے کہ وہم لفظ یا مفہوم کے تغیر کی وجہ سے خیال کرتا ہے کہ دلیل کا مقدمہ کچھ اور ہے اور مطلوب کچھ اور میں نے ایک کو دوسرے سے ثابت کر دیا حالانکہ عقل دونوں کو ایک جانتی یا ایک ذات سمجھتی ہے لہذا اس کو ثابت کرنا یا "اثبات الشیء لنفسہ" کا مصداق ہے مثلا شیعہ کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ اولی بالتصرف ہیں اور جو اولی بالتصرف ہو وہ امام ہے حالانکہ امام کے اصل معنی ہی "اولی بتصرف عام" کے ہیں لہذا اکبر و اوسط ایک ہی چیز ہوئے اور صغریٰ اور مطلوب بلحاظ معنی ایک قضیہ اگرچہ لفظ میں تغایر ہو۔

اور مصادرت کی ایک قسم یہ ہے کہ دلیل کے مقدمات مطلوب سے زیادہ واضح نہ ہوں بلکہ مقابل نزدیک پوشیدہ اور قابل منع ہو مثلا جناب امیر رضی اللہ عنہ معصوم ہیں اور امام معصوم ہوتا ہے اہل سنت کے نزدیک جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت تو بہر حال کسی نہ کسی وقت ثابت ہے لیکن معصومیت وہ صرف انبیاء کرام علیہم السلام کا خاصہ مانتے ہیں اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کو کسی وقت بھی معصوم نہیں جانتے ہاں محفوظ سمجھتے ہیں آپ کے امامت کو ثابت کرنے والی دلیلیں بڑی واضح اور مضبوط ہیں مگر آپ کی عصمت ثابت کرنے والے دلائل خدشہ اور قباحت سے خالی نہیں۔

پانچویں نوع: لفظی اشتراک کی غلطی ہے یعنی دو چیزوں پر ایک لفظ کا اطلاق کرتے ہیں اور اس چیز کا حکم دوسری چیز کے لیے ثابت کرتے ہیں مثلا نبی نزول شریعت اور وحی میں امام ہے اور نبی کا خلیفہ بھی حکم و احکام صلح و جنگ میں امام ہے لہذا جب نبی معصوم ہو گا تو خلیفہ بھی معصوم ہو گا حالانکہ امام کا اطلاق نبی پر کسی اور معنی کے لحاظ سے ہے اور خلیفہ پر دوسرے معنی سے۔

نحوی توجیہات میں اس قسم کی غلطی واقع ہوتی ہے مثلا کہتے ہیں "وھم راکعون، ویؤتون الزکاۃ" سے حال واقع ہوا ہے تو چاہیے کہ ایتاء الزکوۃ سے مقارن ہو حالانکہ وہ یقیمون الصلاۃ سے حال ہے تاکہ صلوۃ یہود سے احتراز ہو جائے غلط مجاز بھی اسی قبیل سے ہے یعنی بطور مجاز ایک چیز پر ایک لفظ کا اطلاق کرتے ہیں پھر حقیقی معنی کے لازم کو اس چیز کے لیے ثابت کرتے مثلا بعض روافض کہتے ہیں کہ اللہ نور ہے اور ہر نور محسوس ہے تو اللہ

بھی محسوس ہے چنانچہ ہشام بن حکم اور ان کے دوسرے پیشواؤں کا یہی مذہب ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات پہ نور کا اطلاق بربنائے مجاز ہے اور محسوسیت حقیقی معنی کا لازم ہے مجازی معنی کا نہیں یا مثلاً کہتے ہیں کہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے نفس نبی فرمایا ہے اور نفس نبی معصوم ہوتا ہے واجب الاطاعت ہوتا ہے اور اولیٰ بتصرف اور تمام مخلوق وانبیاء سے افضل تو یہ تمام امور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لیے ثابت کرتے ہیں حالانکہ آپ کو نفس نبی مجازاً فرمایا گیا اور مجاز پر حقیقت کا حکم مرتب نہیں ہوتا ورنہ بہادر کو شیر کہنا اس سے انسانیت سلب کرنا ہوگا۔

چھٹی نوع: ایہام العکس کی ہے یعنی ایک سچا مقدمہ عقل کے ہاتھ لگتا ہے اور وہاں ہم اس کے عکس کو بھی کلی صادق سمجھ بیٹھتا ہے اور اس سے دلیلوں میں کام نکالتا ہے مثلاً یہ کہ ہر انسان معصوم قابل امامت ہے یہ ایک سچا مقدمہ ہے مگر وہاں ہم نے اس کا عکس تراش لیا کہ ہر قابل امامت معصوم ہے حالانکہ منطقیوں کے نزدیک یہ بات طے اور ثابت ہے کہ موجبہ کلیہ کا عکس موجبہ کلیہ نہیں آتا۔

ساتویں نوع: اغفال اللزوم کی ہے یعنی حکم ملزوم لازم اعم کو دیتے ہیں اور یوں غلطی میں پڑ جاتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ نبی کے لیے عصمت اس لیے ضروری ہے کہ وہ امامت کریاست کا مالک ہوتا ہے تو جو بھی رئیس امت ہوگا وہ معصوم ہوگا حالانکہ نبی کے عصمت معجزہ کی تصدیق کے سبب سے ہے ریاست کے باعث نہیں اور یہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سورہ برات کی تبلیغ سے معزول کرنا اسی سبب سے تھا کہ آپ نیابت پیغمبر کے قابل نہ تھے تو پھر آپ کسی نیابت کے قابل نہ رہے ان کا ایسا کہنا بھی اسی قبیل سے ہے اس لیے کہ آپ کا یہ عزل عرب عادت کے مطابق تھا جو ان کے ہاں نقض عہد کے وقت جاری تھی اور اسی زمرہ میں ہے ان کا یہ کہنا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ چونکہ اہل بیت میں سے نہیں تھے کہ ان کو حق کے خلافت پہنچتا اس لیے وہ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا مقابلہ کرنے کے معاملہ میں خطاکار تھے گویا کہتے یہ ہیں کہ اہل بیت کے مقابلوں میں ہر صحابی کو دعویٰ خلافت کا حق نہیں اور بھی اسی طرح کے اقوال ہیں جو اغفال اللزوم کے زمرے میں آتے ہیں۔

آٹھویں نوع: یہ دو متنافی اشیاء کا دو وقت میں بھی ہونا محال قرار دیتے ہیں اور ان کی یہ غلطی زمانے سے غفلت پر مبنی ہے مثلاً کہتے ہیں کہ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کسی نہ کسی زمانہ میں کافر تھے اور کافر قابل امامت نہیں حالانکہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ دو متنافی چیزوں کا ایک وقت میں جمع ہونا تو محال ہے مگر ایک ذات میں دو وقتوں میں جمع

محال نہیں مثلاً سونا، جاگنا، گرمی، سردی وغیرہ وغیرہ۔

نویں نوع: قوۃ کو فعل کی جگہ استعمال کر لینا مثلاً یہ کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی امام تھے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "أنت مني بمنزلة هارون من موسى "[1] جو نسبت ہارون کی موسیٰ سے تھی وہی نسبت تم کو مجھ سے ہے۔ اس لیے اگر آپ رضی اللہ عنہ بلا فصل امام نہ ہوں تو آپ کا عزل لازم آتا ہے اور امام کا معزول ہونا جائز نہیں حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور امام بالقوۃ تھے امام بالفعل نہ تھے اور امام بالقوۃ کو جب ان سے قابل ترجیح افراد کی موجودگی کے سبب مقرر ہی نہیں کیا گیا تو عزل کا کیا سوال!

دسویں نوع: جز کو کل کی جگہ لے لینا مثلاً کہتے ہیں کہ اولاد پیغمبر جزوِ پیغمبر ہیں اور پیغمبر معصوم ہیں لہٰذا اولاد بھی معصوم ہے حالانکہ معصوم پیغمبر کی مکمل شخصیت ہے اس کا کوئی جزو نہیں اور اسی میں غلط مجاز کی شکل بھی موجود ہے اس لیے کہ اولاد جز حقیقی نہیں ہوتی۔

گیارھویں نوع: یہ کہ عرض کو ذات کی جگہ لے لینا اور تابع کو متبوع کا حکم دینا مثلاً کہتے ہیں کہ امام نائب پیغمبر ہوتا ہے تبلیغ کے معاملہ میں تو وہ احکام کا اسی طرح مبلغ ہوگا جس طرح نبی اور پیغمبر اور پیغمبر معصوم ہے تو چاہیے کہ امام بھی معصوم ہو حالانکہ یہ نہیں دیکھتے کہ پیغمبر مبلغ بالذات ہے اور امام مبلغ بالتبع ہے اور عصمت مبلغ بھی ذات کا خاصہ ہے اور اسی قبیل سے وہ بات ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اس امت کا امام نائب پیغمبر ہے جو تمام پیغمبروں سے بہتر ہیں لہٰذا امام کو بھی تمام پیغمبروں سے بہتر ہونا چاہیے حالانکہ نائب شخص کو تمام صفات میں اس شخص کا حکم نہیں ملتا (جب وہ نائب پیغمبر ہونے کے باوجود پیغمبر کے مرتبہ پر نہیں تو تمام پیغمبروں سے افضل ہونا تو بعد کی بات ہے)

بارھویں نوع: یہ ہے کہ ایک لازم مشترک میں شریک دو چیزوں کے اتحاد کا حکم لگانا مثلاً مشیر مکرہ (منع کرنے والا) کیونکہ جس معاملہ میں مشورہ ہوا یا جس میں مجبور کیا گیا دونوں کی رضامندی کو دخل ہے مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب قصہ کرطاس میں مشیر ہوئے تو مکرہ بھی ہوئے اور جو نبی کو کسی چیز پر مجبور کرے وہ گناہگار ہے

1۔ صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب من فضائل علي بن أبي طالب، 4/ 1870، رقم: 2404۔

حالانکہ مشورہ دینے اور مجبور کرنے میں عقل کے نزدیک فرق ظاہر ہے اگرچہ وہم اس کا یقین نہ کرے اسی لیے بچے عورتیں اور نادان مشیر کو بھی مکرہ کی طرح ملامت کرتے ہیں۔

تیرھویں نوع: یہ کہ عدم ملکہ کو ایجاب وسلب کی جگہ جاننا مثلاً یہ کہتے ہیں کہ جب خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم معصوم نہ تھے تو فاسق ہوئے حالانکہ عصمت نہ ہونے سے فسق لازم نہیں آتا کیونکہ ان کے درمیان محفوظ کا ایک واسطہ ہے۔

چودھویں نوع: یہ کہ مجموعی کل کو افرادی کل کا حکم دینا مثلاً کہتے ہیں کہ ہر صحابی معصوم نہ تھا تو گویا کل صحابہ بھی معصوم نہ ہوئے اس لیے ان کا اجماع خطا کا احتمال رکھے گا حالانکہ مجموعی کل اور افرادی کل کے احکام ثبوت فرق ہے مثلاً ہر انسان اس گھر میں سما سکتا ہے اور یہ روٹی اس کا پیٹ بھر سکتی ہے مگر سب انسان نہ اس گھر میں سما سکتے ہیں اور نہ یہ روٹی سب کا پیٹ بھر سکتی ہے۔

پندرھویں نوع: یہ کہ نئی نئی مثالوں کو ایک خاص چیز جاننا اور اس قسم کا وہم کمزور عقل والوں پر غلبہ کرتا ہے یہاں تک کہ دریا کے پانی چراغ کے شعلے اور فوارہ کے پانی کو اکثر اشخاص ایک پانی اور ایک شعلہ خیال کرتے ہیں اور اکثر شیعہ اپنے عادت میں اس کا خیال میں منہمک ہیں مثلاً عاشورہ کا دن جو ہر سال آتا ہے اس کو جناب حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دن خیال کرتے ہیں اور نوحہ وماتم، نالہ وشیون، گریہ وزاری، سینہ کوبی وبے قراری بالکل ان عورتوں کی طرح شروع کر دیتے ہیں جو ہر سال اپنے مردوں پر کرتی ہیں حالانکہ عقل جانتی اور مانتی ہے کہ زمانہ سیال اور غیر قار ہے اس کے اجزاء کو ہرگز قرار نہیں اور جو معدوم ہو گیا اس کا لوٹنا محال ہے، جناب حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اس دن ہوئی تھی جس کو بارہ سو سال کا عرصہ ہوتا ہے اس دن کو آج کے اس دن سے کیا اتحاد اور کون سی مناسبت ہے۔

عید الفطر اور عید الاضحی کو اس پر اس لیے قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں سرور وشادمانی کے اسباب ہر سال تازہ اور نئے ہوتے ہیں یعنی رمضان کے روزوں کی ادائیگی اور خانہ کعبہ کے حج کی ادائیگی جو نئی نعمت کا شکریہ ہیں جو سال بسال نیا سرور اور نئی فرحت پیدا کرتے ہیں اسی لیے شرعی عیدیں اس وہم فاسد پر مقرر نہیں ہوئی ہیں بلکہ اکثر اوقات نے بھی نوروز ومہرجان اور اس قسم کے دنوں کو عید منایا ہے کہ یہ ہر سال آسمانی تغیرات کے سبب نئی نئی فرحت لاتے ہیں اور نئے نئے احکام کا سبب بنتے ہیں بابا شجاع الدین کی عید عید غدیر سب اسی خیال فاسد پر مبنی ہیں۔

یہیں سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ آیت "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ"[1] کا دن یا نزول وحی کا پہلا دن اور شب معراج کو شرعا عید کیوں قرار نہیں دیا عید الفطر عید النحر کو قرار دیا اسی طرح کسی نبی کے یوم تولد یا وفات کے دن کو عید قرار نہیں دیا اور صوم یوم عاشورہ کو کیوں منسوخ فرمایا جس کو آنحضرت ﷺ نے سال اول میں یہود کی موافقت میں ادا فرمایا ان سب میں یہی راز کار فرما ہے کہ وہم کو اس میں مداخلت کا موقعہ نہ ملے۔

سولھویں نوع: ایک چیز کی صورت کو وہی چیز قرار دینا اور اس قسم کے اوہام نے اکثر بت پرستوں کے راہزنی کی اور ان کو گمراہی میں مبتلا کیا کم سن اور نادان بچے بھی اس وہم میں پڑھ کر بہت خوش ہوتے ہیں کہ مٹی کے کھلونے ہتھیار گھوڑے بنا کر انہیں اصلی گھوڑے اور ہتھیار سمجھتے ہیں، کم سن بچیاں رنگ برنگ کپڑے پہنا کر ان کی شادی کرتی اور بہت خوش ہوتی ہیں، اس قسم کے وہم کا شیعوں پر تو بہت ہی غلبہ ہے حضرات حسنین جناب امیر جناب سیدہ رضی اللہ عنہم کی مصنوعی قبور بناتے ہیں اور حقیقی قبروں کی طرح انہیں مان کر ان کی انتہائی تعظیم کرتے ہیں، سجدے کرتے ہیں، فاتحہ و سلام پہنچاتے ہیں، مور چھل، مگس ران اٹھائے مجاوروں کی طرح ان کے پاس کھڑے رہتے ہیں اور خوب داد کفر دیتے ہیں، عقل کے نزدیک بچوں کی حرکت اور ان پیران نابالغ کی حرکات میں کوئی تفاوت اور فرق نہیں۔

سترھویں نوع: کسی شخص کو کسی دوسرے شخص کے نام سے موسوم کرکے تعظیم یا اہانت سب و شتم مار پیٹ کا سلوک کرتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم یہ سلوک اصل شخص سے کر رہے ہیں ان کا یہ وہم پہلے وہم سے بھی زیادہ کمزور ہے اپ نے بچوں کو یہ کھیل کھیلتے دیکھا یا سنا ہو گا کہ وہ اپنے میں سے کسی کو بادشاہ کسی کو وزیر کسی کو چور کسی کو کوتوال بنا کر باہم اسی طرح کا سلوک کرتے ہیں شیعہ بھی محرم میں یہ ناٹک رچاتے ہیں کسی کا نام یزید کسی کا شمر اور بعض خواتین کو خواتین اہل بیت کا نام دے کر ان سے وہی سلوک اور معاملہ کرتے ہیں جو ان کے نزدیک ہونا چاہیے تھا ان کے اس وہم کو اللہ کی کتاب کی ایک آیت باطل کرنے کے لیے کافی ہے:

1۔ سورة المائدة، الآية: 3

إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ[1]

یہ کچھ نہیں صرف ایسے نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں بغیر اللہ کی منظوری کے

ان کی اسی وہم کی پیداوار ان کی یہ حرکت ہے کہ جب کسی کا نام عبد اللہ یا عبد الرحمن دیکھتے ہیں تو اس کی تحقیر و اہانت کرتے ہیں حالانکہ صحیح حدیث میں یہ خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالی کو ناموں میں سے سب سے زیادہ محبوب عبد اللہ، عبد الرحمن نام ہیں،[2] بالکل معمولی اور سامنے کی بات ہے کہ کسی چیز کا نام اس چیز کے خواص و اثرات میں نہیں رکھتا مثلاً آگ کا نام گرم نہیں پانی کا نام ٹھنڈا نہیں شکر کا نام مٹھاس نہیں اور ایلوے کے نام میں کڑواہٹ نہیں پائی جاتی۔

اٹھارویں نوع: یہ کہ ظرف کو تناقض کی شرط نہیں جانتے اس وہم نے بھی عوام میں بہت گمراہی پھیلائی ہے اور انہیں راہ راست سے بھٹکایا ہے دو نقیضوں کے دو مختلف ظرفوں میں جمع ہو جانے کو یہ محال ہی جانتے ہیں چنانچہ مسئلہ اجتہاد میں شیعہ اسی وہاں میں گرفتار ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر امام خدا کی جانب سے مقرر نہ ہو اور ایسے احکام جن پر نص شرعی نہ ہو اگر وہ مجتہدین کی رائے سے وابستہ ہوں تو اجتماع نقیضین لازم آئے گا کیونکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اگر ایک چیز کو حلال قرار دیا ہے تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کو حرام قرار دے رہے ہیں حالانکہ صاف بات ہے کہ جب مجتہد کا ظن مختلف ہوا تو اجتماع نقیضین کہاں ہوا دونوں کا ظن ایک ہوتا اور احکام مختلف تو کہا جا سکتا تھا ہر شخص جانتا ہے کہ محمود کے گمان میں حامد کھڑا ہوا ہے مگر احمد کے گمان میں کھڑا ہوا نہیں ہے تو اس میں نقیض کہاں اور یہ باہم متناقض کیسے ہوئے یہاں بھی غیر منصوصات میں اللہ تعالی کی طرف سے کوئی حکم متعین نہیں بلکہ ہر شخص کے لیے وہی حکم متعین ہے جو اس کے یا اس کے پیشواؤں کے اجتہاد کے مطابق ہو اور اختلاف امتی رحمۃ کے یہی معنی ہیں۔

1۔ سورة النجم، الآية: 23

2۔ عن مجاهد، قال: أحب الأسماء إلى الله عز وجل: عبد الله، وعبد الرحمن (الأدب لابن أبي شيبة، باب ما يستحب من الأسماء، 1/ 273، رقم: 253، ط: دار البشائر الإسلامية لبنان)

انیسویں نوع: یہ کہ ایک چیز کو دوسری کے ساتھ تشبیہ دینے میں مشبہ اور مشبہ بہ میں پوری پوری مساوات کا سلب جاننا یہ وہم کم سن بچوں کو لاحق ہوتا ہے تمیز دار شعور رکھنے والے لڑکوں کو نہیں شیعوں کو یہ وہم بہت ہوتا رہتا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کو زہد، تقوی، علم اور حلم میں جب اولوالعزم انبیاء علیہم السلام سے تشبیہ دی ہے تو امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو ان انبیاء اولوالعزم کے برابر ہونا چاہیے اور جو اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کے برابر ہوگا وہ دوسرے انبیاء علیہم السلام سے افضل ہوگا اب ایسی لچربات کا کوئی کیا جواب دے۔

بیسویں نوع: کہ عادیات کو اولیات کے بجائے لاتے ہیں یہ وہم اکثر گمراہ فرقوں کو لگا ہے اور بڑے بڑے اہل علم اس بھنور میں غوطے کھاتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ ہر شخص کی ریاست اس کی اولاد اور اس کے خاندان میں چلتی ہے اور دلیل یہ کہ قیصر وکسری کے ہاں یہی ہوتا تھا، اور زمینداروں یا راجپوتوں میں اسی کے مطابق عمل ہوتا ہے داماد کے ہوتے ہوئے خسر کو ریاست کا حق نہیں پہنچتا۔

اس وہم کے مقابلہ میں اسی جنس کا ایک دوسرا وہم بھی ہے یعنی کہ انسان کے مرنے کے بعد ریاست کے اختیارات اس کی بیوی کے سپرد ہیں اور اگر اس کی کئی بیویاں ہوں تو جو بیوی اسکی خاص ہو اور جو کنوارپنے کی حالت میں اسکی بیوی بنی ہو امامت کا معاملہ اسکے ہاتھ میں ہے نہ اس معاملہ میں لڑکی کو کوئی دخل ہے نہ داماد کو۔ بہر حال عقل کے نزدیک دونوں وہم فاسد اور غلط ہیں شرع میں عہدہ اور ریاست ورثہ میں شمار نہیں قابلیت، صلاحیت لیاقت یا صاحب ریاست کے اشارہ پر ترجیح کا دارومدار ہے۔

اکیسویں نوع: غائب کو نظر آنے والی چیز پر قیاس کرنا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ اور پیغمبر علیہ السلام کو مخلوق اور امت پر قیاس کرنا اس سخت بیماری نے بھی بہت سوں کے عقائد خراب کئے ہیں چنانچہ شیعوں کے الہیات ومعاد کے اکثر مسائل اسی اصل پر موقوف ہیں، خصوصاً وجوب اصلح ولطف اور وجوب عدل اور مطیع کو ثواب دینا اور عاصی کو عذاب وغیرہ، اس وہم سے جو خرابی پیدا ہوتی ہے گذشتہ ابواب میں ان کا بیان گذر چکا ہے۔

بائیسویں نوع: ترک اضافات یعنی یہ کہ ایک چیز کو چند چیزوں سے دو تین نسبتیں حاصل ہوں ایک نسبت کوئی حکم چاہتی ہو دوسری کچھ اور اب ان میں سے ایک کا لحاظ کریں اور باقی کو نظر انداز کر دیں امامیہ کو یہ وہم اکثر مسائل میں لاحق ہوا ہے مثلاً کہتے ہیں کہ امامت چونکہ نبی کی نیابت ہے اس لیے وہ نبی کی اجازت پر موقوف ہوگی لہذا امام کی

امامت پر نص ہوناواجب ہوا، حالانکہ امامت ریاست امت ہے اور انہیں کے اختیار پر موقوف ہے تواس لحاظ سے امام کا منصوص علیہ ہوناضروری نہیں، یا مثلاً کہتے ہیں کہ امیر سے محبت کرناواجب ہے جب کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے آپ سے پرخاش رکھی لہذا وہ واجب البغض ہوئیں حالانکہ اس کا یہ پہلو بھی تو ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام واجب المحبت ہیں اور ام المؤمنین آپ کی محبوب زوجہ لہذا وہ واجب المحبت ہوئیں، اس قسم کا وہم ان کے تمام معتقدات میں گھسا ہوا ہے اور حفظت شیئا و غابت عنک اشیاء (ایک چیز یاد رہ گئی اور باقی ساری چیزیں تیری نظر سے غائب ہو گئیں) کی پرانی مثل ان پر صادق آتی ہے کہ وہم کے سوا ان کو سب کچھ بھول گیا۔

تیئیسویں نوع: یہ کہ جو کچھ دلی آرزو ہو مثلاً کمال انتظام حسن سیاست ملک، اور لوازم ریاست ان چیزوں کے متعلق واقعی یہ گمان کرنا یا اعتقاد رکھنا کہ گویا تحقیق شدہ ہے مثلاً کہتے ہیں کہ ہر شرعی حکم اور دنیوی مصلحت کیلئے امام معصوم واجب الطاعت ہے اس لیے کہ اس پر غیب سے القاء ہوتا ہے وہ اپنی تدبیر و حکم میں ہرگز غلطی نہیں کرتا یہ عجیب لطیفہ ہے کہ ایک چیز گویا واقع تو ہوئی مگر ہماری نظر سے غائب ہے نہ ہم اس کو دیکھتے ہیں نہ اس کی خبر سنتے ہیں پھر بھی یقین سے جانتے ہیں کہ ایسا ہے، یہ وہم تو ہے ہی غفلت اس پر مزید ہے کہ جب ہم اس کو نہ دیکھ رہے ہیں نہ اسکی خبر سن رہے ہیں ایسی بات یا چیز کا تو وجود و عدم برابر ہوا، تو اسکے وقوع میں کونسا لطف اور کیا حاصل!

چوبیسویں نوع: یہ ہے کہ ہمیں اپنی معلومات میں جس کی دلیل نہ ملے وہ باطل ہے سابقہ بے وقوفوں میں سے اکثر نے اسی کو دلیل بنا کر اندھیرے میں رنگوں کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اندھیرے میں کوئی رنگ نہیں اس لیے کہ ہم نہیں دیکھ پاتے اور جو ہم دیکھ نہ سکیں اس کا وجود نہیں مگر اتنا نہیں سمجھتے کہ اس کا جواز ہے کہ رنگ موجود مگر ہم اس کو سمجھ نہ سکتے ہوں، اکثر شیعہ اس وہم کا شکار ہیں اور اسی بنا پر ازواج مطہرات اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے فضائل کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری کتابوں میں مذکور نہیں، ارباب سیر و تواریخ کے ذکر کردہ امور واقعیہ کا انکار کرتے ہیں ان کے باطل و غلط ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں، اس بارے میں اگر ان کے سامنے آیات یا متفق علیہ احادیث پیش کی جائیں تو کہتے ہیں کہ ہم نہیں سمجھتے کہ اس عبارت سے یہ مدعا ثابت ہوتا ہو

یہ تو دراصل " وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَعَنَهُمُ اللهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَا يُؤْمِنُونَ "[1] کا مصداق ہیں۔

پچیسویں نوع: یہ کہ زمانہ میں تقدم، کتابوں کی تصنیف، رسائل کی تدوین، دنیا میں شہرت، شاگردوں اور ساتھیوں کی کثرت، یہ سب حق پر ہونے کی دلیلیں ہیں، لہذا ہمارے علماء کے پیشوا چونکہ یہ تمام صفات بدرجہ اکمل رکھتے تھے اس لیے بلاشبہ ان کے تمام معتقدات واقعہ کے مطابق ہی ہوں گے، اس وہم کی اصلیت یہ ہے کہ دنیاوی مناصب میں مال و جاہ کا حصول شہرت، پیروؤں و خدام کی کثرت و بہتات بزرگی، ثروت و شان و شوکت کی دلیل ہوتی ہے، اور یہ لوگ دنیاوی طور پر آگے بڑھے ہوئے افراد کے تقدم کو اور اک حق کے تقدم کے برابر جانتے اور علمی اور دینی دنیا میں بھی ان کو سبقت و پیش دستی کا مستحق سمجھ بیٹھتے ہیں ایسے خیال و وہم کی غلطی ڈھکی چھپی نہیں بالکل آشکارا ہے۔

ایسی باتیں اور معالطے حکماء ہند و یونان میں ان لوگوں سے زیادہ پیش آتے رہے ہیں حالانکہ ان کے اکثر معتقدات خصوصاً الہیات، نبوت اور معاد میں ان کی بے وقوفی کی شہادت دے رہے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ اس بے وقوف فرقہ کے مغالطے اور اوہام اگر ہم پورے پورے بیان کرنے بیٹھ جائیں تو دفتر کے دفتر بھی انکے لیے کافی نہ ہونگے، مجبوراً اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے اتنے سے بھی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کتنے پانی میں ہیں۔

فصل دوم شیعی تعصبات

واضح رہے کہ تعصب اسے کہتے ہیں کہ ایک چیز اپنے نزدیک دلیل قطعی سے ثابت ہے مگر مخالف کے مقابلہ میں اس کا انکار کر دیا جائے اور جو چیز اپنے نزدیک قابل انکار ہے اسی چیز سے فریق مخالف پر الزام رکھنا گویا مخالف بھی نفی و اثبات میں خود کے موافق ہو ورنہ اگر وہ موافق نہ ہو گا تو وہ دلیل الزامی ہو گی تعصب نہ ہو گا اور چونکہ در حقیقت غلو بھی یہی ہے کہ منفی کا اثبات کیا جائے اور مثبت کی نفی کی جائے، محض شدت محبت کے سبب تو اسے بھی تعصب میں شمار کیا گیا ہے، اس فصل میں اس کا بھی ذکر ہو گا مگر عنوان کلام ہر دو میں تعصب ہی رہے گا۔

1۔ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: 88

تعصب نمبر 1: کتاب اللہ، سنت رسول اللہ سے آفتاب سے زیادہ روشن دلائل جو اہل بیت اور خود رسول اللہ ﷺ سے بطریق تواتر اہل سنت کے ہاں مروی ہیں ان کے سامنے پیش کی جاتی ہیں تو ان سے صاف انکار کر دیتے ہیں اور وہ واہی تباہی روایات جو ان کے مجروح و مطعون اور غیر معتبر راویوں سے طریق قوم کے موافق امامیہ سے منقول ہیں ان کو قبول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امام جس کی روایت کرے وہ موجب علم و عمل ہے اگرچہ اسکی اسناد میں مجہول، ضعیف، جھوٹے اور وضاع راوی ہی کیوں نہ ہوں اور اہل سنت کی مرویات چاہے ثقہ راویوں سے ہوں واجب الرد اور انکار کے قابل ہیں، حالانکہ باب اخبار میں ان کے تمام علماء یہی کہتے ہیں کہ موثق روایت ضعیف سے مقدم ہے، بہتر اور معتبر ہے، اور ثقات اہل سنت کی روایات بلاشبہ ان کے نزدیک موثق ہیں۔

تعصب کی ایک بات یہ بھی ہے کہ ان خفی الدلالت آیات کو نص صریح جانتے ہیں جو قواعد و اصول عربیت کے موافق ان کے مدعا پر ہرگز دلالت نہیں کرتیں اور نصوص صریحہ کو متشابہات سمجھتے ہیں جو اہل سنت کے مذہب پر صحیح دلالت کرتی ہیں، حالانکہ اس سلسلہ میں ان کے علماء کا اس طور بارہا امتحان بھی ہوا کہ بعض کافر و ذمی لوگوں کو جو نہ کسی مذہب سے سروکار رکھتے تھے اور اہل مذاہب سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، لغت عربی کی تعلیم یا ترجمہ تحت اللفظ سیکھنے پر جب ان کو وہ آیات سنا کر پوچھا گیا کہ تم ان سے کیا سمجھے تو انہوں نے بلا توقف اہل سنت کے مدعا پر گواہی دی شیعہ مدعا اس آیت سے نہ ان کے سمجھ میں آیا اور نہ اس پر انہیں یقین آیا۔

تعصب نمبر 2: حضور خاتم المرسلین ﷺ اور جناب علی رضی اللہ عنہ کو برابر جانتے ہیں حالانکہ پیغمبر ﷺ کی تمام مخلوقات پر افضلیت خود ان کے نزدیک بھی بتواتر منقول ہے۔ (1)

تعصب نمبر 3: علی کی محبت جس کے دل میں ہوگی خواہ وہ کافر و مشرک ہو یہودی و نصرانی ہو وہ جنت میں داخل ہوگا، اور جو دل میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی دوستی رکھے خواہ عابد و متقی ہو اور اہل بیت سے بھی محبت رکھتا ہو پھر بھی وہ دوزخی ہے، چنانچہ رضی الدین لغوی شیعی (2) نے اپنے چند شعروں میں زینا بن اسحاق نصرانی کے بہشتی ہونے

1۔ فكان تأويل قوله أبنائنا الحسن والحسين ونسائنا فاطمة وأنفسنا علي بن أبي طالب.(الميزان في تفسير القران، للطباطبائي، 3/ 230، ط: الحوزة العلمية في قم المقدسة)

2۔ فقيه متكلم على مذهب الامامية من شيوخ ابن العلقمي، مات سنة 610هـ أعيان الشيعة: 10/ 262

کا حکم لگایا ہے حالانکہ اس نے جناب ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو برا نہیں کہا ہے، ابیات:

عدي وتيم لا أحاول ذكرهم　　بسوء ولكني محب لهاشم

وما تعتريني في علي ورهطه　　إذا ذكروا في الله لومة لائم

يقولون ما بال النصارى تحبهم　　وأهل النهى من أعرب وأعاجم

فقلت لهم إني لأحسب حبهم　　سرى في قلوب الخلق حتى البهائم[1]

ترجمہ: میں عدی و تیم (ابو بکر و عمر کے قبیلے) کا ذکر برائی سے کرنے کا کوئی ارادہ نہیں کرتا لیکن میں بنی ہاشم سے محبت رکھتا ہوں اور جب دین خدا میں علی اور اس کے گھرانے کا ذکر کیا جائے تو مجھے ملامت گھر کی ملامت نہیں چھوتی، کہتے ہیں کہ اس کا کیا سبب ہے عرب و عجم اور نصاری کے عقلمند ان سے محبت کرتے ہیں تو میں ان سے کہتا ہوں کہ ان کی محبت انسانوں کے دلوں میں کیا بہائم کے دلوں تک میں اثر کر گئی ہے۔

اور ابن فضلوں یہودی کو تو ان کے علماء ان دو تین بیتوں کی وجہ سے بھلائی سے یاد کرتے ہیں:

رب هب لي من الجنة سوالي　　واعف عني بحق ال الرسول

واسقني شربة بكف علي　　سيد الأولياء زوج بتول[2]

ترجمہ: میرے پروردگار میرا جنت کا سوال پورا فرما اور آل رسول کے طفیل میرے گناہ بخش دے اور علی کے ہاتھ سے مجھے پانی پلا جو ولیوں کے سردار اور شوہر بتول ہیں۔

حالانکہ حضرت علی اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کی محبت ان کی مدح گوئی، منقبت خوانی بالاجماع موجب اجر و ثواب اور ایک طرح کی عبادت ہے مگر تمام قابل اجر و ثواب اعمال میں قبولیت کیلئے ایمان شرط اول ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ وَإِنَّا لَهُ كَاتِبُونَ[3]

1۔ ملحقات الإحقاق للمرعشي، 22/ 99، ط: طبع: حافظ قم

2۔ إحقاق الحق للتستري، ص: 212

3۔

اور جو اچھے کام کرتا ہے بشرطیکہ وہ مومن بھی ہو تو اس کی سعی و کوشش ضائع نہیں ہوتی ہم اس کو لکھ رکھتے ہیں۔

جب محبوب خدا پیغمبر اعظم ﷺ کی محبت بھی آپ کے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر کافروں پر اثر انداز نہ ہوئی تو جناب امیر و اہل بیت رضی اللہ عنہم جو بلا شبہ آنحضرت ﷺ کے پیرو اور تابعدار ہیں تو ان کی محبت کافر کے حق میں کیسے کارگر ہو سکتی ہے اور پھر کافروں کی دوزخ سے رہائی اور بہشت میں ان کا دخول خود ان شیعوں کے نزدیک باطل و محال ہے خواہ وہ کتنے بھی اعمال خیر کیوں نہ کر لیں، اور اہل ایمان خواہ کس قدر بھی گناہ نہ رکھتے ہوں ان کے نزدیک بہشت میں ضرور داخل ہوں گے صحابہ سے محبت زیادہ سے زیادہ معصیت اور گناہ کبیرہ ہی ہوگی تو اہل سنت ان کی دوستی کی وجہ سے بہشت سے کیوں محروم رہیں گے حالانکہ وہ اہل بیت کرام سے بھی بلاشبہ محبت رکھتے ہیں، اور جب اہل بیت کی محبت کافر کو دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا سکتی ہے تو اہل سنت جو صرف صحابہ سے دوستی رکھنے کے مرتکب ہیں دوزخ سے خلاصی پا کر جنت میں کیوں داخل نہ ہوں۔

تعصب نمبر 4: یہ ہے کہ کہتے ہیں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے محبت رکھتے ہوئے کوئی معصیت ضرر نہیں پہنچاتی [1] حالانکہ یہ بات نصوص قرآنی کے خلاف ہے مثلاً:

"مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ"[2] (جو برا کام کرے گا اس کا بدلہ پائے گا)

"مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ"[3] (جو ذرہ برابر برائی کرے گا وہ اس کے آگے آئے گی)

کے علاوہ ازیں اس کے خلاف خود ائمہ کرام رحمہم اللہ سے صحیح روایات مروی ہیں جو کتاب میں بیان ہو چکی ہیں۔

تعصب نمبر 5: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے انتہائی بغض و عداوت کی وجہ سے پوری امت محمدیہ ﷺ کا نام ان

1۔ حب علي الصراط المستقيم، والنجاة من العذاب الأليم. (مشارق أنوار اليقين في أسرار أمير المؤمنين، ص: 200، ط: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات بيروت لبنان)

2۔ سورة الانبياء، الاية : 94

3۔ سورة الزلزلة، الاية : 8

بدبختوں نے ملعونہ رکھ دیا،[1] اور اللہ تعالیٰ کے فرمان "كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ"[2] کو بھی پس پشت پھینک دیا ہے اور اپنے امام جناب حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ کی اس روایت کو جو ابن بابویہ نے بسند صحیح اپنی تفسیر میں روایت کی ہے فراموش کر دیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

أما علمت يا موسى أن فضل أمة محمد علي سائر الأمم كفضلي على خلقي[3]

کیا تم جانتے نہیں کہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت تمام امم کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسی میری فضیلت میری تمام مخلوق پر۔

اسی طرح آیت "وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ"[4] میں بھی انہوں نے نظر انداز کر دی ہے۔

تعصب نمبر 6: موجودہ قرآن مجید سے بریت ظاہر کرتے ہیں حالانکہ یہ بلاشبہ ان کے ائمہ حضرات رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک منقول بالتواتر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوران نماز وخارج نماز بہ نیت عبادت اس کی ہی تلاوت فرماتے تھے، اور جناب حسن عسکری اور دیگر ائمہ رحمۃ اللہ علیہم نے اسی قرآن کی تفسیر لکھی اور اسی کی آیات والفاظ سے اپنے کلام میں دلائل واستشہادات پیش کئے مگر یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن منزل نہیں بلکہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تحریف کردہ ہے کیونکہ انہوں نے ہی اسے جمع کیا[5] اور انہوں نے ہی اسے رواج دیا، کوئی حد ہے اس بغض وعناد کی؟

1۔ أخرج الكليني وغيره عن سدير الصيرفي قال سمعت أبا عبد الله يقول: «ما تنكر هذه الأمة الملعونة أن يفعل الله عز وجل بحجته في وقت من الأوقات كما فعل بيوسف ... ». الكافي: 7/ 1؛ ابن بابويه، علل الشرائع: 1/ 244.

2۔ سورة ال عمران، الاية : 110

3۔ ذكر المجلسي: يا موسى أما علمت أن فضل أمة محمد على جميع الأمم كفضلي على جميع خلقي- (بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار، 89/ 225، ط: مؤسسة الوفاء بيروت لبنان)

4۔ سورة البقرة، الاية : 143

5۔ شیعہ مذہب کے ایک بہت بڑے عالم حسن بن محمد تقی النوری الطبرسی نے 1292ھ میں ایک کتاب "فصل الخطاب في إثبات تحريف كتاب رب الأرباب" نامی لکھی ہے جو تقریباً 400 صفحات پر مشتمل ہے اس میں سینکڑوں دلائل اس بات پر قائم کئے ہیں کہ قرآن کریم میں ہر

تعصب نمبر 7: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر لعنت کرنے کو ذکر الٰہی اور تلاوت قرآن سے بڑھ کر جانتے ہیں حالانکہ کسی بھی ملت و شریعت میں بروں کی برائی کار ثواب نہیں مانی گئی چہ جائیکہ وہ ذکر الٰہی سے زیادہ ثواب کا درجہ رکھے جو باجماع جمل ملل و نحل افضل ترین شغل اور احسن ترین عمل ہے[1] (یہ بات بغض و عناد سے اٹی کھوپڑی میں جڑ پکڑ سکتی ہے اور وہی ایسا لغو و بے ہودہ عقیدہ رکھ سکتے ہیں)

تعصب نمبر 8: بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن پر لعنت بھیجنے کو بڑی عبادت شمار کرتے اور پنجوقتہ نمازوں کی طرح اس کو ہمیشہ ادا کرنا فرض خیال کرتے ہیں،[2] ابو جہل فرعون و نمرود کو جو بلاشبہ خدا اور اس کے رسولوں کے دشمن ہیں کبھی کچھ نہیں کہتے نہ ان کی کتابوں میں اس کے متعلق کچھ لکھا ہے ان کی کتابوں میں تو یہ لکھا ہے کہ جناب شیخین رضی اللہ عنہما پر ہر صبح لعنت بھیجنا ستر نیکیوں کے برابر ہے مگر ابو جہل فرعون و نمرود پر لعنت رتی بھر بھی حسنہ نہیں۔

تعصب نمبر 9: بنات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام کلثوم اور بی بی رقیہ رضی اللہ عنہما کا عقد چونکہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا اس لیے ان ہر دو محترمات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے خارج کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں نہیں تھیں،[3] بلکہ بعض تو ان کو حضرت خدیجہ الکبری رضی اللہ عنہا کی بیٹیاں بھی نہیں مانتے کہ کہیں ماں کی

قسم کی تحریف ہوئی ہے، بعض شیعہ علماء نے تقیۃً تحریف کا انکار کیا ہے لیکن اصح قول کے مطابق شیعہ قرآن میں تحریف کو ثابت مانتے ہیں: ان الاصحاب قد اطبقوا علی صحۃ الاخبار المستفیضۃ بل المتواترۃ الدالۃ بصریحہا علی وقوع التحریف فی القرآن کلاما و مادۃ و اعرابا و التصدیق بہا۔(فصل الخطاب، ص31، الانوار النعمانیۃ، ج2، ص357)

1 ۔ ألف علي بن عبد العال الكركي من مشاهير علمائهم مات سنة 940هـ كتابا في لعن الشيخين خاصة والصحابة عامة سماه (نفحات اللاهوت في لعن الجبت والطاغوت)

2 ۔ وبسند معتبر منقول است کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام از جائے نماز خود بر نمی خاستند تا چہار ملعون و چہار ملعونہ را لعنت نمی کردند پس باید بعد از ہر نماز بگوید "اللهم العن ابابكر و عمر وعثمان ومعاوية وعائشه و حفصه و هندا و ام الحكم "(عین الحیات، ص:599، ط: انتشارات کتاب فروشی اسلامیہ تہران ایران)

3 ۔ ذكر الإمامية أن رقية وزينب لم تكونا بنات النبي صلى الله عليه وسلم وإنما هما بنات لأخت خديجة، وأنه صلى الله عليه وسلم تزوج خديجة وهي عذراء، ذكره ابن شهر آشوب المازندراني، وعزاه إلى الطوسي والمرتضى، فقال:

طرف سے ہی بی بی زہرا رضی اللہ عنہا سے اشتراک نہ ہو حالانکہ یہ آیت "يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ"[1]
اے نبی اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہو، کے سراسر خلاف ہے ایک بیٹی کے لئے بنات صیغہ جمع کی کیا تک تھی۔

نہج البلاغہ میں ذکر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تغیر سیرت پر ناراض ہوتے ہوئے یہ الفاظ فرمائے کہ دامادی کے سبب آپ اس رتبہ تک پہنچے کہ شیخین رضی اللہ عنہما بھی نہ پہنچے تھے،[2] (یہ کن کی دامادی کی طرف اشارہ) اور دیکھیے ابو جعفر طوسی اپنی کتاب تہذیب میں جناب جعفر صادق رحمہ اللہ سے یوں روایت کرتا ہے کہ وہ اپنی دعا میں یہ فرمایا کرتے تھے:

اللهم صل على رقية بنت نبيك، اللهم صل على أم كلثوم بنت نبيك[3]

اے اللہ اپنے نبی کی بیٹی رقیہ پر رحمت فرما اے اللہ اپنے نبی کی بیٹی ام کلثوم پر رحمت فرما۔

کلینی کی روایت بھی ملاحظہ کیجئے:

تزوج خديجة وهو ابن بضع وعشرين سنة فولد منها قبل مبعثه صلى الله عليه وسلم القاسم ورقية وزينب وأم كلثوم، وبعد المبعث الطيب والطاهر وفاطمة[4]

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی فرمائی تو آپ کی عمر پچیس سال تھی تو آپ کی بعثت سے قبل، قاسم، رقیہ، زینب اور ام کلثوم رضی اللہ عنہم پیدا ہوئیں اور بعثت کے بعد طیب او طاہر، اور فاطمہ رضی اللہ عنہم تولد ہوئے۔

«إن النبي صلى الله عليه وسلم تزوج بها [خديجة] وكانت عذراء، وإن رقية وزينب كانتا ابنتي هالة بنت أخت خديجة». مناقب آل أبي طالب: 1/ 159.

1۔ سورة الاحزاب، الاية: 59

2۔ قد بلغت من صهره ما لم ينالا۔ (نهج البلاغة، 2/ 68، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان)

3۔ تهذيب الأحكام: 3/ 120؛ المفيد، المقنعة: ص 239؛ الفتال، روضة الواعظين: 2/ 324.

4۔ الأصول من الكافي: 1/ 439، ط: دار الكتب الاسلامية

اور دوسری روایت میں اس نے بیان کیا ہے کہ بعثت کے بعد صرف فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی پیدا ہوئیں اور طیب و طاہر رضی اللہ عنہما بعثت سے پہلے پیدا ہوئے ملا طاہر قزوینی نے شرح میں قصہ کی تفصیل لکھی ہے۔

تعصب نمبر 10: یہ کہتے ہیں کہ جناب ابو بکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم منافقوں میں سے تھے حالانکہ یہ بات ان کے نزدیک ثابت ہے کہ آیت " مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلٰى مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ "[1] کے ذریعہ مومن و منافق باہم ممیز ہو چکے تھے آخر حیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امام نماز مقرر فرمایا حالانکہ منافق کو بالاجماع امام نماز بنانا جائز نہیں اور پھر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہمیشہ حضرت ابو بکر حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی اقتداء میں نماز ادا فرماتے رہے ان کے علاوہ جناب ابوذر، سلمان فارسی، مقداد اور جناب عمار رضی اللہ عنہم بھی ان تینوں حضرات کے پیچھے نماز پڑھتے رہے اور کبھی ان کی اقتداء سے علیحدہ نہیں ہوئے۔[2]

تعصب نمبر 11: کہ تیمی اور عدوی جناب ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دو بت تھے جن کو وہ چھپائے رکھتے اور انہیں کی عبادت کرتے تھے، حالانکہ یہ بات انہی لوگوں کے نزدیک ثابت ہے کہ جناب محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنا متبنیٰ بنایا تھا اور اپنی صاحبزادی کا نکاح کرنا چاہتے تھے اگر ان کی بکواس صحیح مان لی جائے تو پہلی بات تو یہ کہ جناب اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا جو مومنہ تھیں جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ سے انکا نکاح کیسے صحیح ہوا اور جناب محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی ولادت کیسی ہوئی اور غلط ولادت والے کو جناب امیر رضی اللہ عنہ نے اپنا متبنیٰ کیسے بنالیا اور اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دینے کا کیوں ارادہ کیا ایک معصوم کا بت پرستوں سے اس قسم کے معاملات کرنا کس شرح و منطق کی رو سے صحیح قرار پائے گا۔

تعصب نمبر 12: یہ کہتے ہیں کہ قرآن کی وہ آیات جو حضرات مہاجرین و انصار خصوصاً حضرت ابو بکر و عمر عثمان و طلحہ، زبیر اور جناب صدیقہ رضی اللہ عنہم کی شان میں نازل ہوئیں سب متشابہات ہیں جن کے معنی کا پتہ نہیں ابن

1۔ سورة ال عمران، الاية : 179

2۔ ثم قام وتهيأ للصلاة وحضر المسجد ووقف خلف أبي بكر (تفسير القمي لأبي الحسن القمي، 2/ 159، ط: مطبعة النجف)

شہر آشوب السروی مازندرانی نے جو ان کے عالموں میں سے ہے یہ بات لکھی ہے، اور دوسرے بھی اس کے دیکھا دیکھی یہی بیان کرنے لگے گئے ہیں۔[1]

تعصب نمبر 13: اہل سنت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے میں حد سے بھی بڑھ جاتے ہیں اور آپ کی ذات گرامی سے عناد رکھتے ہیں افراط سے کام لیتے ہیں اسی وجہ سے ان حضرات کو نواصب کے لقب سے یاد کرتے ہیں اس افتراء و بہتان کا سہرا ابن شہر آشوب نے اپنے سر باندھا ہے حالانکہ یہی لوگ خود اپنی کتابوں میں اہل سنت کی کتابوں خصوصاً بیہقی، ابوالشیخ اور دیلمی سے نقل کرتے ہیں:

لا يؤمن أحدكم حتى أكون أحب إليه من نفسه ويكون عترتي أحب إليه من نفسه[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک میں کسی کو اپنی جان سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں وہ مومن نہیں ہوتا اور میری عترت بھی اس کو اپنی جان سے زیادہ پیاری نہ ہو جائے۔

عن ابن عباس رضي الله عنهما قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم أحبوا الله لما يغذوكم به وأحبوني لحب الله وأحبوا أهل بيتي بحبي[3]

ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ سے محبت کرو کہ وہ تم پر انعام فرماتا ہے اور اللہ سے دوستی کے سبب مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کی وجہ سے میرے اہل بیت سے محبت کرو۔

1۔ بل خصوا آيات مدح الصحابة بعلي رضي الله عنه، وعموا عن سياقها. فمثلا أورد قيس بن سليم في كتابه عن علي رضي الله عنه أنه قال في تفسير قوله تعالى {والسابقون الأولون من المهاجرين والأنصار والذين اتبعوهم بإحسان رضي الله عنهم ورضوا عنه} سئل عنها رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: «أنزلها الله تعالى ذكره في الأنبياء وأوصيائهم، فأنا أفضل أنبياء الله ورسله وعلي بن أبي طالب أفضل الأوصياء». كتاب قيس بن سليم: ص 643؛ ابن طاوس، التحصين: ص 632؛ المجلسي، بحار الأنوار: 31/ 410. والآية بلفظ الجمع تمدح المهاجرين والأنصار، ولم يدع أحد أن عليا كان من الأنصار.

2۔ ذكر المتقي الهندي: لا يؤمن أحدكم حتى أكون أحب إليه من نفسه وأهلي أحب إليه من أهله وعترتي أحب إليه من عترته وذريتي أحب إليه من ذريته۔ (كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال، 1/ 41، ط: مؤسسة الرسالة)

3۔ سنن الترمذي، باب مناقب أهل بيت النبي صلى الله عليه وسلم، 6/ 134، رقم: 3789

ان روایات کے علاوہ شیعہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اہل سنت جناب امیر اور آپ کی ذریت رضی اللہ عنہم سے محبت فرائض ایمان میں سے شمار کرتے ہیں چنانچہ شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عربی اشعار میں فرمایا ہے:

فلا تعدل بأهل البيت خلقا　　فأهل البيت هم أهل السيادة

فبغضهم من الإنسان خسر　　حقيقي وحبهم عبادة[1]

اہل بیت کو عام مخلوق کی طرح کا نہ سمجھو وہ نیک بخت لوگوں کی جماعت ہے ان سے عداوت وبغض انسان کے لیے حقیقی خسارہ ہے اور ان سے محبت عبادت کا سا درجہ رکھتی ہے۔

ان اشعار کو شیخ بہاء الدین آملی نے اپنے کشکول میں ذکر کر کے شیخ موصوف سے یہ بھی نقل کیا کہ آپ فرماتے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تو ایمان لے آیا مگر آپ کے اہل بیت پر ایمان نہیں لایا تو وہ مومن نہیں، اور ان شیعوں کو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جب اہل بیت کا حال بھی معلوم ہے اور اس سلسلے میں جناب اعمش رحمۃ اللہ علیہ سے امام صاحب کی پرخاش بھی پوشیدہ بات نہیں، ہوتا یہ تھا کہ جناب اعمش حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ کو جو ابو جہل کی بیٹی کے لئے پیغام نکاح دینا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر اظہار ناراضگی فرمانے کو بیان کیا کرتے تھے، مگر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان سے کہتے تھے کہ گو واقعہ صحیح ہے مگر تم جس انداز بیگانہ اور بے ادبانہ میں اس کو بیان کرتے ہو یہ درست نہیں، اور جب کوئی دینی مسئلہ اس پر موقوف بھی نہیں تو کیوں بیان کرتے ہو، چنانچہ شریک بن عبد اللہ بن شبرمہ ابن ابی لیلی رحمہم اللہ جو امام صاحب کی رائے سے متفق تھے سب مل کر اعمش کے گھر گئے اور ان سے اس واقعہ کے بیان کرنے پر ملامت کی جناب اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ جہاں تک حب علی رضی اللہ عنہ کا سوال ہے تو میں اس میں تم سے بھی دو قدم آگے ہوں مگر حدیث کو جس طرح سنا ہے اسی طرح روایت کیا ہے، میرا یہی منصبی فریضہ ہے پھر ان حضرات کے سامنے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے مناقب میں بہت سی روایات بیان کیں کہ سب خوش ہوئے اور خوش خوش واپس آگئے، اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو جناب محمد باقر، جناب جعفر صادق رحمہم اللہ سے علم وطریقت کے استفادہ کی جو شاگردانہ نسبت حاصل ہے یا جناب زید بن علی

1۔ الفتوحات المكية، لابن العربی، 4/ 139، ط: دار صادر بيروت

بن حسین رضی اللہ عنہما سے جو رابطہ و تعلق ہے وہ نہ محتاج بیان ہے نہ محتاج ثبوت۔

جناب امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی جناب ثابت رحمۃ اللہ علیہ نے بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی زیارت کی جناب امیر نے اس کے حق میں برکت اولاد کی دعا فرمائی چنانچہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ آپ کی دعا کی قبولیت کی علامت ہیں،[1] جناب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی محبت اس خاندان سے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، اس سلسلہ میں ان کے اشعار شیعہ کتب میں مذکور و مسطور ہیں ہم ان کی توجہ ان کی اپنی کتابوں میں مندرج اشعار کی طرف دلاتے ہیں کہ انہیں دیکھیں اور اپنے الزام کی مضحکہ خیزی پر ہو سکے تو ندامت سے سر جھکا لیں، اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تو جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ کے دوستوں میں سے تھے پوری زندگی ان کے ہم مجلس رہے آپ سے علم حاصل کیا اور آپ کے شاگرد رشید شمار ہوئے ہیں اور جب جناب علی رضا رحمۃ اللہ علیہ نیشاپور پہنچے تو ایک خچر پر سوار تھے شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ جو اہل سنت کے بڑے صوفیاء میں سے ہیں آپ کے آگے آگے جلوداری کرتے چلتے تھے اور صوفیہ کی ایک دوسری جماعت اپنی چادروں سے آپ پر سایہ کئے ہوئے ہوتی۔

حافظ ابوزرعہ رازی اور محمد بن اسلم طوسی رحمۃ اللہ علیہما اپنے تمام طلباء اور حدیث کے کاتبان کے ساتھ اپنے مدرسوں اور اپنے مقامات سے باہر آپ کی زیارت کیلیے نکل آئے اور شہر میں ایک ہل چل مچ گئی لوگ باگ آپ کی زیارت کو اُمڈ آئے محدثین اہل سنت نے عرض کیا کہ اس موقع پر آپ اگر ایک دو حدیثیں اپنی آبائی سند یعنی سلسلۃ الذہب سے مجمع کے سامنے بیان فرما دیں تو ہم سب احسان مند ہوں گے چنانچہ آپ نے اب وجد کے حوالہ سے یہ روایت بیان فرمائی:

لا إله إلا الله حصني فمن قالها دخل حصني ومن دخل حصني أمن من عذابي[2]

کلمہ لا الہ الا اللہ میرا قلعہ ہے جس نے یہ کلمہ پڑھ لیا وہ میرے قلعہ میں داخل ہو گیا اور جو

1۔ ذهب ثابت إلى علي بن أبي طالب، رضي الله عنه، وهو صغير، فدعا له بالبركة فيه وفي ذريته، ونحن نرجو أن يكون الله تعالى قد استجاب ذلك لعلي فينا۔ (وفيات الأعيان وأنباء أبناء الزمان، 5/ 405، ط: دار صادر بيروت)

2۔ فيض القدير شرح الجامع الصغير من أحاديث البشير النذير، 4/ 641، ط: دار الكتب العلمية بيروت لبنان

میرے قلعہ میں داخل ہو گیاوہ عذاب سے مامون ہو گیا۔

اس وقت اہل سنت علماء محدثین اور طلبا جو دوات بردار تھے ان کی تعداد لگ بھگ بیس ہزار تھی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جب اس روایت کو ذکر کرتے تو فرماتے اگر یہ پاگل پر پڑھی جائے تو اسے ہوش آ جائے اور بیمار پر پڑھی جائے وہ صحت یاب ہو جائے، ابن اثیر نے کامل میں اسی طرح ذکر کیا ہے امامیہ میں سے صاحب الفصول نے بھی تاریخ الائمہ میں ایسا ہی ذکر کیا ہے حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت مشہور ہے:

كان عنده رجل من قريش فاتاه علي بن حسين فقال له الرجل القرشي يا ابا عبد الله من هذا قال سعيد هذا الذي لا يسع مسلما ان يجهله هو علي بن حسين بن علي بن ابي طالب رضي الله تعالى عنهم اجمعين(1)

کہ ان کے پاس ایک قریشی بیٹھے ہوئے تھے کہ جناب علی بن حسین رضی اللہ عنہما تشریف لائے قریشی نے پوچھا ابو عبد اللہ کون صاحب ہیں سعید نے کہا یہ وہ ہیں جن سے ناواقف رہنا کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں یہ علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم ہیں۔

پھر تصوف کے اکثر سلسلے انہی حضرات تک منتہی ہوتے ہیں تو گویا یہ اہل سنت کے سب فرقوں کے پیر و مرشد ہیں اور اہل سنت کے نزدیک پیر و مرشد کی جو عزت و احترام اور عظمت ہے وہ سب پر واضح اور روشن ہے یہ حضرات تو اپنے مرشد سے بغض و عناد رکھنے یا ان کی اہانت کرنے کو سلسلہ طریقت سے نکل جانے کے مترادف سمجھتے ہیں۔

اب لائق غور اور قابل توجہ یہ بات ہے کہ اہل سنت کا دارومدار شریعت اور طریقت پر ہی تو ہے اور انہی دو باتوں کو وہ سرداری اور بزرگی کا ذریعہ جانتے ہیں شریعت کے ستون اور بڑے یہی چار ائمہ عظام رحمہم اللہ علیہم ہیں اور طریقت کے بڑے صوفیاء کے خاندان کے افراد ہیں اور ہر دو فرقوں اہل شریعت و اہل طریقت کا رجوع اہل بیت ہی کی طرف ہے اور یہ انہی بزرگوں کے خوان فیض کے ریزہ چیں ہیں، لہذا اہل بیت سے بغض رکھنے کی نسبت

---

1 ۔ أعيان الشيعة، 1 / 631، ط: دار التعارف للمطبوعات بيروت

اہلسنت کی طرف کرنا ایسا ہی ہے جیسے ایک محسوس چیز کا انکار کرنا یا اجتماع ضدین کا دعویٰ کرنا کوئی بھی عقلمند اس کو گوارا نہیں کرتا۔

اور اہلسنت کو نواصب کہنا نور کو اندھیرا یا آفتاب کو تاریک کہنے کے مترادف ہے تاریخ کی اس گواہی کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا کہ اہل سنت ہمیشہ نواصب سے برسر مقابلہ رہے ہیں وہ ان کی ہفوات اور بکواس کی ہمیشہ تردید کر کے منہ توڑ جواب دیتے رہے ہیں ان کے شاعروں نے ان کے مقابلہ میں زبان سے سیف سنان کا کام لیا ہے کثیر عزہ مشہور شاعر کے دو شعر دیکھئے:

لعن الله من يسب حسينا | او اخاه من سوقة و امام

ورمي الله من يسب عليا | بصدام و اوفق و جذام

حسین کو گالی دینے والے پر اللہ کی لعنت ہو یا ان کے بھائی کو جو ان کے ماتحت و امام ہیں گالی دینے والے پر بھی اور علی رضی اللہ عنہ کو گالی دینے والے کو اللہ تعالیٰ صدمے، لغزش اور جزام کی مار مارے۔

حقیقت اور واقعہ یہ ہے کہ شیعہ اہل بیت سے اہل سنت کی محبت کو نہ سمجھ سکتے ہیں نہ اس کا تصور کر سکتے ہیں (کیونکہ ان کی پیدائش بغض و عناد اور نفاق کے خمیر سے ہوئی محبت کی نا ان کو ہوا لگی نہ وہ اس سے واقف و آگاہ ہیں اور یہ ان کے خمیر کا ہی قصور ہے کہ وہ اپنے مقتداؤں اور رہنماؤں کو بھی دانستہ یا نادانستہ اپنے بغض و عناد کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں) اگر انہیں اہل سنت کی محبت کی شدت کا اندازہ کرنا ہو تو پھر ناصبی مذہب اختیار کر کے سامنے آئیں اور دیکھیں کہ اہل سنت ان سے کیا سلوک کرتے ہیں۔

تعصب نمبر 14: یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتل کو فسق نہیں کہتے اور ان کے قاتل ابن ملجم سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی اور اس کی تعدیل و توثیق بھی کی ہے،[1] ان کا یہ جھوٹ انتہا درجہ کا افترا

1۔ صحیح بخاری میں ابن ملجم کی کوئی روایت موجود نہیں ہے البتہ ایک اور راوی عمران بن حطان کی روایت موجود ہے جس کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ اس نے ابن ملجم پر ایک مرثیہ لکھا ہے اور وہ خارجی تھا تو علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں ابو زکریا موصلی کے حوالے سے لکھا ہے کہ عمران بن حطان آخری عمر میں خارجیت سے توبہ کر چکے تھے "وقصته في ذلك مشهورة مبسوطة في الكامل للمبرد وفي غيره على أن أبا زكريا الموصلي حكى في تاريخ الموصل عن غيره أن عمران هذا رجع في آخر عمره عن رأي الخوارج فإن صح ذلك كان

اور بہتان ہے اور ان کی بے شرمی اور بے حیائی کا منہ بولتا ثبوت ہے اس لیے کہ کتاب صحیح بخاری کوئی نادر الوجود کتاب تو ہے نہیں شہروں کو چھوڑیے چھوٹے چھوٹے قصبات میں اس کے نسخے موجود ہوں گے اس کے راوی گنیں چنے اور موثق و مضبوط اہل سنت قتل مومن کو شرک باللہ کے بعد سب سے بڑا گناہ کہتے ہیں ان کی کتب عقائد میں بھی یہ لکھا ہے اس نفس مقدس کے قتل کو تو وہ حدیث نبوی کے موجب کفر جانتے ہیں اہل سنت کی تمام کتابوں میں حدیث "اشقی الاخرین"[1] کا مورد یہی ملعون بیان کیا گیا ہے یہ بات تو کوئی سنی محدث اس سے روایت بیان کرے گا خارجیہ سے ہے اور پھر بخاری جیسا امام! طبرانی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أشقى الناس ثلاثة: عاقر ناقة ثمود، وابن آدم الذي قتل أخاه وقاتل علي بن ابي طالب[2]

سارے انسانوں میں بدبخت ترین تین افراد ہیں ثمود کی اونٹنی کی کوچیں کاٹنے والا آدم علیہ السلام کا وہ بیٹا جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا اور علی ابن ابی طالب کا قاتل۔

ابن شہر آشوب نے بھی اس افترا کو اپنی مثالب میں امام بخاری پر بہتان باندھتے ہوئے بیان کیا ہے اور اسی سے

عذرا جيدا وإلا فلا يضر التخريج عمن هذا سبيله في المتابعات والله أعلم "(فتح البارى فى شرح صحيح البخارى، المقدمة ، الفصل التاسع في سياق أسماء من طعن فيه، 1/ 433، ط: دار المعرفة بيروت) عمران بن حطان سے متعلق اس تفصیل سے نہ صرف یہ کہ امام بخاری سے اعتراض رفع ہو جاتا ہے، بلکہ یہ بات روز روشن کی طرح نمایاں ہو جاتی ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ سرسری قواعد کی پیروی کرنے کی بجائے انتہائی دقت اور تتبع کے ساتھ روایات صحیح بخاری میں درج کیا کرتے تھے۔

1 ـ عن الضحاك بن مزاحم قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «يا علي، تدري من شر الأولين؟» وقال وكيع مرة عن الضحاك، عن علي قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: «يا علي، تدري من أشقى الأولين؟» قلت: الله ورسوله أعلم، قال: «عاقر الناقة» ، قال: " تدري من شر، وقال مرة: من أشقى الآخرين؟ " قلت: الله ورسوله أعلم، قال: «قاتلك» .(فضائل الصحابة ،للامام احمد بن حنبل،فضائل على، 2/ 566، رقم : 953، ط: مؤسسة الرسالة)

2 ـ روي الطبراني : عن عبد الله بن عمرو، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: «أشقى الناس ثلاثة: عاقر ناقة ثمود، وابن آدم الذي قتل أخاه؛ ما سفك على الأرض من دم إلا لحقه منه؛ لأنه أول من سن القتل»(الْمُعْجَمُ الكَبِير للطبراني،13/ 518، رقم: 14399)

اندازہ ہوتا ہے کہ شیعوں نے اہل سنت پر افترا پردازی اور بہتان تراشی میں بے حیائی کی تمام حدود پار کرلی ہیں۔

تعصب نمبر 15: ان کو اہل سنت سے جو بغض وعناد ہے اور جس کی بنا پر ان کی نسبت سنت پیغمبر ہے تو یہ شیعہ اس بغض وعناد میں اتنے اندھے ہوگئے ہیں کہ ان کے علماء سنت پیغمبر پر لعنت کر کے اپنا ایمان کفر کے سول پر دے چکے ہیں وہ کہتے ہیں ہم کو کفر قبول ہے مگر سنت پیغمبر کو اچھا کہنا منظور نہیں یہ تو وہی مثال ہوئی غصہ تو سوکن پر آیا مگر قتل شوہر کو کر دیا اور یہ بات کوئی مفروضہ نہیں صاحب ابن عباد جو سلاطین دیالہ کا وزیر تھا اس فرقہ کے داعیوں میں اس کی نظیر ناپید ہے وہ اپنے اشعار میں کہتا ہے:

حب علي بن أبي طالب — هو الذي يهدي إلى الجنة

إن كان تفضيلي له بدعة — فلعنة الله على السنة[1]

علی بن ابی طالب کی محبت ہی جنت میں لے جاتی ہے میرا ان کو افضل ٹھہرانا اگر بدعت ہے تو پھر سنت پر اللہ کی لعنت ہو۔(نعوذ باللہ من ذلک الھفوات)

تعصب نمبر 16: اہل سنت کے بعض روایات پر زبان دراز کرتے اور انہیں سخت سست کہتے ہیں مثلا سہو پیغمبر والی حدیث یا لیلۃ التعریس میں آپ کی نماز قضا ہو جانے والی روایت چنانچہ ابن مطہر حلی نے اندور روایات کے نقل کرنے پر بہت واحد تباہی بکی ہے مگر ان اندھوں کو یہ نظر نہیں آیا کہ خود ان کی کتابوں میں ان روایات کو نہ صرف نقل ہی کیا گیا بلکہ ان کی تصحیح بھی بیان کی گئی ہے ان میں سے حدیث ذوالیدین تو یہ ہے:

ان رسول اللہ ﷺ الظهر او العصر ركعتين فقال ذو اليدين اقصرت الصلاه ام نسيت يا رسول الله وقال رسول الله ﷺ لمن خلفه اصدق ذو اليدين قالوا نعم صليت ركعتين فبنا على صلاته واتم اربعا وسجد للسهو سجدتين ثم تشهد وسلم[2]

رسول اللہ ﷺ نے ظہر عصر کی نماز ادا فرمائی اور دو رکعت پر سلام پھیر دیا تو جناب ذوالیدین رضی اللہ عنہ

1۔ مناقب آل أبي طالب، لابن شهر اشوب، 2/ 291، ط: المطبعة الحيدرية النجف

2۔ تفسير نور الثقلين، 4/ 257، ط: مؤسسة اسماعيليان للطباعة والنشر والتوزيع قم إيران

نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ نماز میں قصر ہو گیا یا آپ سے سہو ہوا تو آپ ﷺ نے دیگر مقتدیوں سے دریافت فرمایا کہ ذوالیدین صحیح کہہ رہے ہیں سب نے عرض کی بے شک تب آپ نے اسی نماز پر بنیاد رکھتے ہوئے دو رکعت اور پڑھیں اور سہو کے دو سجدے کیے اور تشہد پڑھ کر سلام پھیرا۔

اور حدیث لیلۃ التعریس وہ یہ ہے کہ:

عرس في منصرفه من خيبر فنزل قبل طلوع الصبح فرقد فغلبت عيناه فلم يستيقظ حتى وقع عليه حر الشمس ثم استيقظ وتوضا وصلى قضاء الصبح وقال هذا وادي الشيطان[1]

خیبر سے واپسی پر ایک جگہ طلوع فجر سے کچھ دیر پہلے شب باشی کے لیے آپ نے قیام فرمایا نیند کا غلبہ تھا کہ آپ سو گئے اور جب دھوپ کی گرمی محسوس ہوئی تو آپ کی آنکھ کھل گئی تب آپ نے وضو فرما کر صبح کی نماز قضا پڑھی اور فرمایا یہ شیطان کی وادی ہے۔

ان روایات کی نسبت ابن مطہر حلی کہتا ہے کہ پہلی روایت عبادات میں پیغمبر کے نسیان کو ظاہر کرتی ہے اور دوسری شیطان کے تسلط کو اور ہر دو نبوت میں سخن پیدا کرتی ہیں لہذا اہل سنت کا افتراء ہے مگر خود اس مفتری کے دین پٹم ہو گئے اور اسے یہ نظر نہیں آیا کہ پہلی حدیث ابو جعفر طوسی نے تہذیب میں حسین بن سعید سے بطریق صحیح روایت کی ہے اور اس نے ابو عبد اللہ ؒ سے اور کلینی نے بھی بحوالہ ابی عبد اللہ سماعہ سے روایت کی ہے اور دوسری اسناد سے بھی بحوالہ ابی عبد اللہ سعید اعرج سے روایت کی ہے اور اس کے آخر میں کہا ہے کہ:

إن الله هو الذي أنساه رحمة للأمة ألا ترى لو أن رجلا صنع هذا لعير، وقيل ما تقبل صلاتك، فمن دخل عليه اليوم ذلك قال: قد سن رسول الله

---

1 ۔ الفروع الكافي ، 3/ 357، ناشر: تهران بازار سلطاني دار الكتب الاسلامية و تهذيب الأحكام في شرح المقنعة للطوسي، 2/ 345، ناشر: تهران بازار سلطاني دار الكتب الاسلامية۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وصارت أسوۃ[1]

امت پر مہربانی کی نظر سے اللہ تعالی نے آپ سے صاحب کرایا تم خیال نہیں کرتے کہ اگر کسی سے ایسی حرکت ہوتی تو اسے ملامت کی جاتی اور کہا جاتا کہ تمہاری نماز نہیں ہوئی مگر اب اج اگر کسی سے ایسی حرکت سرزد ہو جائے تو کہا جائے گا کہ ایسا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش آ چکا ہے اور وہ ہمارے لیے نظیر واسوہ ہے۔

اور دوسری روایت کو طوسی نے تہذیب میں حسین بن سعید سے بحوالہ ابی عبد اللہ علیہ السلام روایت کیا ہے کلینی نے کافی میں حمزہ بن طیار سے بحوالہ ابی عبد اللہ علیہ السلام روایت کیا اور آخر میں یہ اضافہ کیا کہ:

أنا أنيمك وأنا أوقظك فإذا قمت فصل ليعلموا إذا أصابهم ذلك كيف يصنعون، ليس كما يقولون: إذا نام عنها هلك[2]

اللہ تعالی نے فرمایا میں نے ہی تجھے سلایا میں نے ہی تجھے جگایا جب جاگ جاؤ تو نماز پڑھ لو تاکہ امت کو معلوم ہو جائے کہ ان کو جب ایسا واقعہ پیش اۓ تو وہ کیا کریں ایسا نہیں جیسا کہ کہتے ہیں کہ جو سویا اس کی نماز گئی۔

ان روایات سے جو اعتراض انہوں نے کیا ہے دونوں باتیں نبوت میں خلل انداز ہیں تو ان کی یہ بات بالکل غلط ہے اس لیے بھول چوک نسیان ونوم کی طرح بشری احکام میں سے ہیں ہاں امور تبلیغی ہوتے تو بعد کچھ درست ہو سکتی تھی اس لیے کہ ان امور میں رسولوں سے کوتاہی جائز نہیں مثلا نہی کے بجائے امر یا اس کے برعکس ایسی بھول چوک کسی پیغمبر سے نہیں ہوئی متفرق انبیاء ورسل علیہم السلام کے متعلق اللہ تعالی کے ارشادات دیکھیے موسی علیہ السلام " لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ "[3] بھول چوک میں میری گرفت نہ کیجئے، آدم علیہ السلام

1۔بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار، 85/ 218، ط: دار إحياء التراث العربي بيروت لبنان

2۔الأصول من الكافي، 1/ 165، ط: دار الكتب الاسلامية

3۔سورة الكهف، الاية: 73

"فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا"(1) وہ بھول گئے ہم نے ان کا ارادہ پختہ نہ فرمایا، حضور ﷺ "وَاذْكُرْ رَبَّكَ إِذَا نَسِيتَ"(2) جب کچھ بھول جاؤ تو اپنے رب کو یاد کرو، اور اس وادی میں آپ پر شیطان کا تسلط ہرگز نہیں ہوا بلکہ یہ اثر حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر ہوا تھا کہ حضور ﷺ نے ان کو جاگنے اور محافظت کا فرض سونپ کر اطمینان سے آرام فرمایا تھا شیطان نے بصورت نیند حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر غلبہ پالیا اور اس بہانہ حضور ﷺ اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی نماز قضا ہو گئی اگر کسی شخص کے گماشتہ یا وکیل پر کوئی ظالم وفات سے تسلط پالے تو اسے ہرگز اس شخص پر تسلط پالینا نہیں کہتے وہ نقصان کا اثر اس شخص تک بھی پہنچے۔

تعصب نمبر 17: یہ کہتے ہیں کہ نماز میں اگر کوئی شخص "تعالی جدک"(3) کہے تو اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے حالانکہ "تَعَالَى جَدُّ رَبِّنَا"(4) قرآن میں آیا ہے اور اس آیت و سورت کا نماز میں پڑھنا ان کے نزدیک بھی جائز ہے ممنوع نہیں دوران بحث ان کا جواب یہ تھا کہ یہ الفاظ اللہ تعالی نے جنوں کے قول کے طور پر نقل کیے ہیں حالانکہ اللہ تعالی نے قرآن مجید میں کئی جگہ کفار کے اقوال نقل کیے ہیں مثلاً "وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللهِ"(5) یہود نے کہا عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ نے کہا عیسی مسیح اللہ کے بیٹے ہیں اور جہاں کہیں کافروں کا قول نقل فرمایا وہاں اس کے عقب میں اس کی تکذیب بھی ساتھ ہی لگادی ہے، قرآن کے تفصیلی مطالعات سے اس کا پتہ چلتا ہے مگر اس جگہ اس قول کی تکذیب بالکل مذکور نہیں اگر اس آیت کے حوالہ سے بھی ان کے تعصب کی آگ نہ بجھے تو جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے اس

1۔ سورۃ طه، الآية: 115

2۔ سورۃ الكهف، الآية: 24

3۔ وقال الصادق عليه السلام "أفسد ابن مسعود على الناس صلاتهم بشيئين بقوله تبارك اسمك وتعالى جدك (من لا يحضره الفقيه، 1/401، ط: الحوزة العلمية في قم المقدسة)

4۔ سورۃ الجن، الآية: 3

5۔ سورۃ التوبة، الآية: 30

قول کے بارے میں یہ کیا کہیں گے جو نہج البلاغہ نے آپ کے ایک خطبہ کے ذیل میں نقل کیے ہیں "الحمد الله الفاشي حمده، والغالب جنده، والمتعالي جده "[1] ساری تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس کی حمد عام ہے جس کے لشکر غالب ہیں جس کی شوکت بالاتر ہے۔

تعصب نمبر 18: ان کا کہنا ہے کہ اہل سنت یہود و نصاری سے بدتر ہیں یہ بات ابن المعلم نے بیان کی ہے اس اچھوتی بات کی واقعی داد نہیں دی جاسکتی کہ خدا رسول فرشتوں کو قرآن دیگر کتب الہیہ اور روز آخرت پر ایمان لانے والے رسول و خاندان رسول کے ساتھ ان کی جانب وہاں محبت ووابستگی یہ ساری باتیں تو ان کے نزدیک رائے گاالبتہ یہود و نصاری کا کفر پیغمبر کے ساتھ ان کی عداوت اور ان کا انکار فرشتوں خصوصا حضرت جرائیل علیہ السلام کے ساتھ ان کی عداوت یہ سب کچھ اس فرقہ کو پسند اور گوارا ہے سچ ہے گندگی کا کیڑا گندگی ہی میں خوش ہے۔

اور پھر اس قول سے تو انہوں نے اپنے پیشواؤں اور مقتداؤں کی پیروی کا حق ہی ادا کر دیا انہوں نے بھی تو جناب امیر رضی اللہ عنہ کی عہد میں کافروں اور بت پرستوں کو اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر کہا تھا شیعوں کو بھی حق وفاداری کا پاس کرتے ہوئے ان کی انگلی ہوئی گندگی کو نگلنا ہی چاہیے تھا (قرآن کریم نے ان باطل پرستوں کے لیے ایک ائینہ مہیا کیا ہے انہیں وہ دیکھ لینا چاہیے تاکہ انہیں اپنی اصلی شکل میں کوئی شبہ نہ رہے)

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَؤُلَاءِ أَهْدَى مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا[2]

تم نے نہیں دیکھا ان کو جو صاحب کتاب تھے کہ وہی اب بتوں اور شیطان پر ایمان لے اۓ ہیں اب وہ کہتے ہیں کہ یہ کافر مومنوں کے مقابلے میں زیادہ راہ راست پر ہیں

(شیعہ کو بھی کتاب یعنی قرآن سے حصہ ملا تھا مگر جب یہ کتاب سے فرنٹ ہو کر جبت وطاغوت ابن سبا وغیرہ پر ایمان لے آئے تو انہیں اپنے پیشرو اور مقتداؤں کی اتباع میں لازما انہی کے قول کو دہرانا اور یہود و نصاری کو

1۔ نہج البلاغة، 2/ 133، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

2۔ سورة النساء، الاية:51

مسلمانوں سے اچھا بتانا ہی چاہیے تھا)

تعصب نمبر 19: یہ کہتے ہیں غالی کیسانی، اسماعیلی اور رافضیوں کے دوسرے فرقے جو ائمہ کی امامت کے منکر ہو کر امامت ہی کے مقرب کہلائے اور ائمہ کی شان میں انہوں نے دیدہ درانی بھی کی ہے یہ سب کے سب محبت علی کے باعث جنت میں جائیں گے اور اہل سنت ہمیشہ ہمیں دوزخ میں رہیں گے اور ان کی تمام ائمہ کی دوستی بھی کام نہ ائے گی اور شریعت وطریقت میں ان کو اپنا امام تسلیم کرنا فائدہ دے گا اگرچہ انہوں نے ان حضرات میں سے کسی کی تحقیر بھی نہیں کی بلکہ سب کی تعظیم ہی کرتے رہے مگر جائیں گے دوزخ ہی میں اب یہ بات اللہ ہی جانے کے اہل سنت کی حب علی کیوں بے اثر ہے اور کیسانیوں اور اسماعیلیوں کی ائمہ کی تکذیب کیوں بے اثر نہیں۔

تعصب نمبر 20: یہ ہے کہ ایسی احادیث جو شیعوں کے نزدیک ان کے اپنے طریقے کے مطابق صحیح الثبوت ہیں اگر سوئے اتفاق سے ان روایات کا مضمون اہل سنت کے مذہب سے موافقت کر جائے تو وہ روایات ان کے نزدیک ناقابل عمل ناقابل قبول بلکہ نظر انداز کر دیے جانے کے قابل ہیں اس لیے اس صورت میں اہل سنت کے موافقت کا کفر لازم اتا ہے مثلا منی ومذی کہ نجس ہونے کی روایات یا ان کے نکلنے سے وضو ٹوٹ جانے کی روایات اور سجدہ صاحب کی روایات کے ابو جعفر طوسی وغیرہ نے اس کی تصحیح کی ہے اور بڑے تالاب میں غسل کی روایات جن کا ذکر ابن المعلم نے کیا ہے اور ڈھیلے کے بعد پانی سے استنجا خود ان کے اقرار سے سنت پیغمبر ہے جس کی تصریح صاحب نے کی ہے۔

ان کے شیخ الطائفہ نے ایک قاعدہ اور اصول مقرر کیا ہے کہ کلینی کی بعض روایات یا اس کے شیخ محمد بن نعمان کی روایات یا شیخ الشیخ محمد بن بابوہ قمی کی روایات یا خود شیخ الطائفہ نے جن روایات کی تصحیح کی ہے جب ایسی روایات پر عام لوگ عمل کرنے لگے تو ان کو متروک العمل سمجھ لینا چاہیے معلوم نہیں یہ اپنے برے ہمزاد اہل سنت سے کہاں کہاں بھاگیں گے اور ان سے بچنے کے لیے کہاں کہاں ہاتھ پاؤں ماریں گے اجزائے کلمہ اور الفاظ قران کے اشتراک سے کیسا پیچھا چھڑائیں گے اور علی حسن حسین فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہم کے نئے نام رکھ کر کب اہل سنت کی موافقت سے جان چھڑائیں گے۔

ایک دوسرا اصول اور قاعدہ با اتفاق ان کے ہاں یہ بھی مقرر ہے کہ جب کسی مسئلہ میں دو روایات ہوں تو

ان میں سے جو روایت اہل سنت کے موافق ہو اس کے الٹ پر عمل کرنا چاہیے کیونکہ رشد وہدایت اسی میں ہے۔[1]

تعصب نمبر 21: ان کی بہت سی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ اہل سنت یہود و نصاریٰ سے بہت گندے ہیں ان کے بدن سے کوئی چیز چھو جائے تو اسے دھونا چاہیے انسانوں کو نجس اور گندا کہنے والوں کا اپنا یہ حال ہے کہ انسانی پاخانہ بھی ان کے ہاں نجس نہیں ان سے بدن لتھڑا ہوا ہو تب بھی ان کی نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا ٹھیک ہے یہاں اہل سنت کے ہاتھ نہ لگائے مگر ان کے پاخانہ سے مستفیض ہوتے رہیں کہ وہ تو ان کے نزدیک نجس نہیں پاک ہیں۔

تعصب نمبر 22: ہر کام مثلاً کھانا پینا پہننا سوار ہونا اٹھنا بیٹھنا وغیرہ بجائے بسم اللہ کے ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما پر لعنت سے شروع کرنا چاہیے وہ اس مبارک اور بابرکت خیال کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان دونوں حضرات کے نام کاغذ پر لکھ کر اسے بطور فلیتہ جلائیں اور بخار کے مریض کو اس کی دھونی دے تو وہ بخار سے شفا پا جائے گا۔[2]

ایک بات یہ کہتے ہیں کہ جب کسی کھانے پر ستر مرتبہ ان دو اسمائے مبارک پر لعن کر کے دم کر دیں تو اس کھانے میں بہت برکت ہو جاتی ہے (بات دراصل یہ ہے کہ جو خود لعنتی ہو اس کی لعنت تو بے اثر ہوتی ہے یہ ان محترم ومقدس بزرگوں کے اسماء مبارکہ کی تاثیر ہے کہ مریض شفایاب ہوتے اور کھانوں میں برکت ہوتی اور یہ اتنا بڑا فضل و اعزاز ہے کہ لعنتی لوگ خود غیر محسوس طور پر اس کے اقرار پر مجبور ہوئے انہیں یقین کرنا چاہیے کہ جب وہ ان اسماء مبارکہ کے ساتھ لعنت جذبہ کرتے ہیں تو لعنت تو لعنتی کو دیکھ کر اسی سے چمٹ جاتی ہے اور اسماء مبارکہ پاک وصاف رہ جاتے ہیں اور اپنا صحیح اثر دکھاتے ہیں، از مترجم نعمانی)

1۔ عدم جواز العمل بما يوافق العامة وطريقتهم ولو من أحاديث الأئمة ع مع المعارض وأن ما لا نص فيه إذا احتاج الإنسان إلى حكمه وجب أن يسأل عنه علماء العامة ويأخذ بخلاف قولهم- (الفصول المهمة في أصول الأئمة، 1/ 575، ط: مؤسسة معارف إسلامي إمام رضا)

2۔ قال الكركي: «في نبذة يسيرة مما ورد من طرق أصحابنا الإمامية - رضي الله عنهم - مما هو صريح في لعن هؤلاء، وإثبات كفرهم في شدة الظهور والوضوح كما يصرح وهو كثير جدا والغرض ههنا التعرض إليه لنستدل باليسير على الكثير» .. نفحات اللاهوت.

کافی کو لینی میں یہ مرقوم ہے کہ خدا کے نزدیک عورتوں میں بدترین نام حمیرہ ہے اور یہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا لقب ہے حضور اکرم ﷺ اسی لقب سے مخاطب فرماتے تھے مگر یہ لوگ ابولہب کی بیوی کو برا نہیں جانتے جس کی برائی اللہ تعالی نے قرآن میں نازل فرمائی (شاید اسی لیے کہ آج کل ابولہب کے مشن کے وارث یہی ہوں)

ان کے ہاں یہ روایت موجود ہے کہ جناب علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے اپنے لڑکوں کے نام ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم رکھے تھے،[1] اور یہ بھی بالیقین معلوم ہے کہ باپ پر بیٹوں کا یہ حق ہے کہ وہ ان کے نیک واچھے نام رکھے پس جب ابو بکر و عمر عثمان رضی اللہ عنہم میں کوئی برائی نہیں تو صد صدیقہ کا لقب کب برا ہو سکتا ہے، اگر معاملہ جناب امیر رضی اللہ عنہ سے عداوت کا ہے تو جناب صدیقہ ان تینوں حضرات سے بڑھ کر تو مخالف نہیں تھی اور پھر لقب کا رتبہ اختصاص میں نام سے کم تر ہے کیونکہ تعین و تشخیص کے لیے وضع اصلی میں علم کا ہی اعتبار ہے لقب دراصل صفات سے ہوتا ہے اور غلبہ استعمال سے اختصاص پیدا کر لیتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز بالذات مخصوص ہو وہ مخصوص بالعرض سے زیادہ قوت والی ہوتی ہے (یہاں بطور لطیفہ دو باتیں ذہن نشین ہو جائیں تو کیا مضائقہ اول تو یہ شیعہ چونکہ اپنے لڑکوں کے نام عموما ابو بکر و عمر و عثمان نہیں رکھتے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ نام رکھے تو شیعہ ان کے پیرو نہیں رہے دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کے نزدیک بھی یہ نام اچھے شمار ہوتے ہیں تب ہی اس نے برے لوگوں سے یہ توفیق ہی سلب کر لی کہ وہ ان اچھے اور بابرکت ناموں کا کبھی فیض ہی حاصل نہ کر سکیں اور انہیں کبھی یہ توفیق نہ ہو کہ اپنے لڑکوں کے ایسے بابرکت نام رکھ سکیں، اعظم مترجم نعمانی)

تعصب نمبر 23: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر طعن کی طرح جناب حفصہ رضی اللہ عنہا پر طعن کو بھی عبادات بلکہ فرائض پنج وقتہ میں شمار کرتے ہیں بعد ادائیگی پنجگانہ دیگر ورد وظائف کے مقابلہ میں اس کے ورد کو بہترین وظیفہ قرار دیتے ہیں حالانکہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے کوئی ایسا امر صادر نہیں ہوا جو ان کی بدگوئی کا سبب اور اس کا یہ خود

---

1 ـ قتل عبد الله بن علي بن أبي طالب، وهو ابن خمس وعشرين سنة ولا عقب له. (مقاتل الطالبيين، ج 1، ص 22) وكان عمر بن الخطاب سمّي عمر بن عليّ باسمه. (أنساب الأشراف، ج 1، ص 297) إنّما سمّيته باسم أخي عثمان بن مظعون. (مقاتل الطالبيين، ج 1، ص 23)

بھی اقرار کرتے ہیں کہ وہ کوئی گناہ نہیں رکھتی بجز اس کے کہ وہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں حالانکہ " وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى "[1] اس کے صریح خلاف ہے اگر بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کے لیے یہی سبب مجھے بطعان ہے تو تعجب ہے جناب محمد بن ابی بکر کو اس طرح کی نسبت رکھتے ہوئے ان لوگوں نے کیوں معاف کیے رکھا اور ان پر لعن وطعان کیوں نہیں کرتے اگر یہ کہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی رفاقت وصحبت ان کے حق میں مانع طعن ہے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ورفاقت اور تعلق زوجیت حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے حق میں کیوں مانع نہیں ہوا، جناب امیر رضی اللہ عنہ تو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق قرب وصحبت کے سبب ہی معزز ومحترم تھے اس لیے اس سلسلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق زیادہ قابل لحاظ ہونا چاہیے تھا۔

تعصب نمبر 24: اس فرقہ کے ایک نابکار شیخ مقداد نامی نے الزام لگایا ہے کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے جناب معاویہ رضی اللہ عنہ کی والدہ سے فعل شنیع کیا تھا حالانکہ شریف مرتضیٰ نے تنزیہ الانبیاء والائمہ نامی کتاب میں اور دوسرے علماء امامیہ نے قطعی طور سے حکم لگایا ہے کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے خلفاء رضی اللہ عنہم ظاہری شریعت کی پاسداری اور زہد دین وتقوی کے امور کو شائع کرنے اور رواج دینے کا بہت اہتمام کرتے[2] اور خاص خیال رکھتے تھے تاکہ اس میں کوتاہی کے سبب منصب امامت کے لیاقت مجروح نہ ہو اور لوگوں کی نظروں سے نہ گر جائیں خصوصا عمر رضی اللہ عنہ کو اس معاملہ میں بڑی کدوکاش رہتی اور بہت احتیاط وپرہیز مد نظر رہتا۔

تعصب نمبر 25: یہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ بلکہ تمام امہات المومنین رضی اللہ عنہن کی طلاق کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا تھا کہ جب چاہیں طلاق دے دیں حالانکہ اللہ تعالی نے خود حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ازواج مطہرات کے طلاق کا مختار نہ بنایا تھا آپ اس معاملہ کو دوسرے کے سپرد کیسے فرماسکتے تھے ارشاد باری ہے:

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ

1۔ سورة الانعام، الاية: 164

2۔ وكان عمر أتقى لله وأعرف لحقوق الله (شرح نهج البلاغة لابن أبي الحديد، 16 / 235، ط: دار إحياء الكتب العربية)

حُسۡنُهُنَّ[1] آپ کے لیے ان عورتوں کے بعد نہ تو کوئی اور حلال ہے اور نہ ان کا تبادلہ دوسری زوجات سے گو آپ کو ان کا حسن بھلا کیوں نہ لگتا ہو۔

اس آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ اب حضور ﷺ کو پابند فرما دیا گیا کہ نہ مزید کوئی نکاح فرمائیں گے اور نہ ہی موجودہ ازواج میں سے کسی کو الگ کر کے ان کے بدلے دوسری بیوی لائیں گے، ازواج مطہرات کو یہ فضیلت و عزت اس لیے نصیب ہوئی کہ انہوں نے اپنے حق اختیار کو استعمال کرتے ہوئے دنیا کو خیر باد کہہ کر آخرت کو قبول کر لیا تھا اور حضور ﷺ کی محبت و رفاقت کو دنیاوی عیش ساز و سامان اور کامرانی کے مقابلے میں پسند کیا تھا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بھی یہ چاہا کہ ان کو دنیا و آخرت میں پیغمبر کی رفاقت سے جدا نہ کرے اور پیغمبر طلاق کی تلخی سے انہیں ناآشنا رکھے چنانچہ آیت تخیر کے ذیل میں خود شیعی تفاسیر میں ان کی ثابت قدمی مذکور و مستور ہے اور یہ بات بالاجماع ثابت ہے کہ اس ایثار و اختیار میں تمام ازواج مطہرات سے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کو سبقت نصیب تھی اس لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ خود حضور ﷺ ان کو طلاق دیتے یا کسی اور کو اس کا اختیار دیتے اور اگر آپ اختیار کسی کو سپرد فرماتے تو بھی شیعوں کو اس سے کیا فائدہ کیونکہ آپ ﷺ کے حین حیات تو وہ طلاق عمل میں نہ آئی اور وصال کے بعد وہ توکیل و تفویض کالعدم ہو گئی اس لیے کہ سارے فرقوں کے اجماع کے مطابق موکل کی وفات کے بعد وکالت باطل ہو جاتی ہے اور جب جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا جناب امیر رضی اللہ عنہ سے برسر پرخاش تھی اس وقت آپ طلاق کے مالک نہ تھے اور پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ وفات کے بعد طلاق دینے کے کوئی معنی ہی نہیں۔

اس فرقہ کی بنیاد اور شرط وجود ہی کذب و افترائات و تعصبات پر ہے اس لیے نہ ان کے تعصبات کی کوئی حد ہے نہ وہ کبھی رک سکتے ہیں ہر دور اور ہر زمانہ میں مناسب احوال ان میں تبدیلی و اضافہ ہوتا ہی رہے گا ہم کہاں تک ان کا تعاقب کر کے کھوج لگائیں گے اس لیے جو کچھ ذکر کیا جا چکا اسی پر اتفاق کرتے ہیں ہم نے تینوں فصلوں میں بطور نمونہ ہی پیش کیا ہے پورے تعصبات کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔

1۔ سورۃ الاحزاب، الآیۃ:52

فصل سوم شیعی ہفوات

ہفوہ نمبر 1: تقیہ کی حقیقت

یہ کہتے ہیں کہ انبیاء وائمہ کا کام دین ومذہب کا چھپانا ہے،[1] انہوں نے پوری زندگی تقیہ میں بسر کی ہے کسی کو بھی مذہب ودین واضح طور پر نہیں بتایا،[2] یہ ہفوہ چھوڑتے وقت وہ یہ بھول گئے کہ ایسا ہے تو پھر انبیاء کی بعثت اور ائمہ کے تقرر سے حاصل کیا ہوا یعنی کچھ بھی نہیں، دنیا ان کی آمد سے پہلے بھی اندھیرے میں تھی آمد کے بعد بھی اندھیرے میں رہی۔

دراصل اس باطل خیال کی بنیاد اس تخیل پر ہے کہ ہر صاحب عزم، ہر طالع آزما، جو ایک سلطنت کا علم بلند اور دوسری کا سرنگوں کرنا چاہتا ہے وہ اپنے ارادوں کو راز رکھتا، اور اپنی تدبیروں کا کسی کو پتہ نہیں لگنے دیتا اور کج فطرت لوگ ایسے ہی لوگوں پر انبیاء وائمہ کو قیاس کر کے مذکورہ غلط وباطل تصور وعقیدہ گھڑنے کے مرتکب ہوئے ذرا سا بھی غور کر لیں تو پتہ چل جائے گا کہ نبی کو مبعوث اور امام کو مقرر کر کے ان کو اخفاء راز کا مکلف بنانا ایسا ہی ہے کہ کسی کو قاضی شہر مقرر کر کے پابند کر دیا جائے کہ نہ کسی سے بات کرے، نہ کسی کی فریاد سنے، نہ کوئی فیصلہ دے تو ایسے تقرر کو ایک نادان بچہ بھی کھیل سمجھے گا اور مذاق اڑائے گا، اور بظاہر یہ فعل بے توفی سمجھا جاتا اور ایسا کرنا بعثت نبی اور تقرر امام کے سراسر خلاف ہے، اگر انبیاء اور ائمہ حکم خدا کے بجائے اپنی مرضی سے یہ تقیہ کرتے ہیں تو وہ عاصی اور گنہگار اور تارک واجب قرار پائیں گے اور پھر عصمت کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہے گی۔

خلاصہ کلام یہ کہ جھوٹ بولنا، نفاق اختیار کرنا انبیاء وائمہ کی شان کے خلاف ہے اور ان بزرگ ومحرم ومقدس ہستیوں کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنی پوری زندگی میں ان بری خصلتوں کو اپنا شعار

1۔ قال المفيد «والتقية واجبة لا يجوز رفعها إلى أن يخرج القائم – عليه السلام –، فمن تركها قبل خروجه فقد خرج عن دين الله تعالى وعن دين الإمامية، وخالف الله ورسوله والأئمة عليهم السلام». الاعتقادات: ص 81 (الهامش).

2۔ قال ابن القيم: «التقية أن يقول العبد خلاف ما يعتقده لاتقاء مكروه يقع به لو لم يتكلم بالتقية». أحكام أهل الذمة: ص 1038. وينظر تعريف ابن حجر في الفتح: 12/ 314؛ والسرخسي في المبسوط: 24/ 45.

بنائے رکھیں اور لوگوں کو ہدایت و رہنمائی کے بجائے دھوکہ دیں اور گمراہ کریں، اگر منکرین و مخالفین اور معاندین کی طرف سے ان کو کوئی اندیشہ یا خطرہ بھی ہوتا ہے تو بھی کلمہ حق کہنے سے باز نہیں رہتے، انہی حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان میں اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللهَ وَكَفَى بِاللهِ حَسِيبًا[1] اللہ کے پیغامات کی تبلیغ کرتے ہیں اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے ان کی نگرانی کو اللہ ہی کافی ہے۔

اگر ان ہفواتیوں کے کہنے کے مطابق انبیاء تقیہ کیے ہوئے ہوتے تو کفار کی طرف سے اذیت کیوں برداشت کرتے، مار پیٹ، گالم گلوچ، بے عزتی، بے حرمتی، جلاوطنی ان کے ہاتھوں کی بھگتے، جبکہ عام مسلمانوں کے لیے فرمایا گیا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جنت میں بغیر اپنے سے پہلوں کی طرح تکلیفوں اور اذیتوں کو برداشت کیے داخل ہو جاؤ گے، وہ تکالیف اتنی سخت تھیں کہ نبی اور ان کے ساتھی یہ کہنے لگے تھے کہ اللہ کی نصرت و مدد آخر کب آئے گی تو انبیاء وائمہ کے بارے میں کیا خیال کرنا چاہیے۔

اور اس ہفوہ کی تان اس پر ٹوٹی ہے کہ آیت "إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ"[2] میں اتقاکم سے مراد وہ ہے جو تقیہ میں سب سے بڑھا ہوا ہو،[3] ان کے مفسرین نے ان الفاظ کی یہی تفسیر کی ہے (گویا انہوں نے دوسروں کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنے ہاں کے اتقیاء کو منافق اعظم کہے جانے کا برا نہیں مانیں گے کیونکہ شیعوں سے قطع نظر سے پوری دنیا کے نزدیک تقیہ و نفاق ہم معنی ہیں، از مترجم نعمانی) اور اسی تفسیر کے موجب لازم آتا ہے ہم کہ حضرت یحیی و حضرت زکریا علیہم السلام اور جناب حسین رضی اللہ عنہ جنہوں نے بالاجماع تقیہ نہیں کیا

1۔ سورة الاحزاب، الآية:39

2۔ سورة الحجرات، الآية:13

3۔ وعنه عليه السلام، انه سئل عن قول الله عز وجل:(ان أكرمكم عند الله أتقاكم) قال: " أعملكم بالتقية "(مستدرك الوسائل ومستنبط المسائل، 12/ 254، ط: مؤسسة آل البيت عليهم السلام لإحياء التراث)

خدا کے نزدیک کرامت وبزرگی نہ رکھتے ہوں، اور آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں جتنے بھی منافق تھے وہ بزرگی وکرامت کے اعلی مراتب پر فائز ہوں۔ سُبحانَكَ هَذا بهتان عَظِيمٌ

(ناظرین یہ یاد کرلیں کہ خدا کے ہاں جناب حسین رضی اللہ عنہ جو کرامت وبزرگی بھی رکھتے ہوں مگر شیعوں کے نزدیک تقیہ نہ کرنے کی وجہ سے کوئی عزت وحرمت نہ رہ گئی تھی اور کوفہ کے شیعوں نے اس کا عملی ثبوت دیا خطوط کی ترسیل سے لے کر کارگاہ شہادت کی تاریخ کا مطالعہ کر جائے کہ ہر جگہ شیعہ آپ کو گھیر گھار کر، کشاں کشاں، اور دھکیلتے ہو مقتل تک لے جاتے نظر آئیں گے جہاں پہنچا کر وہ خود منہ پھیر کر دشمنوں سے سازش کے دام کھرے کرنے پہنچ گئے، آج یہ جتنے چاہیں مرثیے جوڑلیں روز قیامت بہت قریب ہے ان شاء اللہ خون حسین کے ایک ایک قطرہ کا ان کو حساب دینا ہی ہوگا کیونکہ قاتلان حسین میں سرفہرست یہی ہیں۔ن)

اور تقیہ کے وجوب اور اس کی خوبیوں کے سلسلہ میں جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے یہ جو کچھ روایت کرتے ہیں وہ سب جھوٹ من گھڑت اور افتراء ہے جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ اس قسم کی ہفوات کو جائز ہی نہیں سمجھیں گے چہ جائیکہ وہ اسے واجب قرار دیں اور اپنے جد امجد جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی مخالفت فرمائیں گے، نہج البلاغہ ان کی اصح الکتب ہے اور متواتر بھی اس میں جناب امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی نص صریح بایں الفاظ موجود ہے:

علامة الإيمان إيثارك الصدق حيث يضرك على الكذب[1]

جب جھوٹ کے مقابلہ پر سچ بولنا نقصان کا سبب ہو اس وقت سچ بولنا ایمان کی علامت ہے۔

یہ نص بتاتی ہے کہ تقیہ کرنے والا ایمان ہی نہیں رکھتا۔

أُولَئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا[2]

وہ اپنے صبر کی وجہ سے دوہرا اجر دئے جائیں گے۔

کی تفسیر بھی یہ تقیہ ہی سے کرتے ہیں کہتے ہیں حسنہ تقیہ ہے اور اس کا اظہار سیئہ ہے حالانکہ اس سے

1۔ تفسير الآلوسي، ج 3 الصفحة 123

2۔ سورة القصص، الاية:54

پہلے کی آیت صاف طور پر اظہار پر دلالت کرتی ہے" وَإِذَا يُتْلَى عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ "[1] پھر تقیہ میں صبر کی ضرورت بھی تو نہیں یہ تو بلا مشقت حسب دلخواہ مال اٹھانا اور عیش کرنا ہے، کیونکہ تقیہ میں تو ہمہ دم بہر حال سراسر موافقت واتحاد اور تسلیم ورضا ہے، نہ مخالفت نہ عناد پھر بھی صبر کی گھاٹی کہاں اور کیسے پیش آسکتی ہے۔

کذب افتراء ان کی گھٹی کا جزنہ ہوتا تو شاید ان کو توفیق مل جاتی کہ اپنے ہی فرقہ کی کتابوں میں مندرج تقیہ کو باطل کرنے والی منہ بولتی روایات ہی کا مطالعہ کر لیتے جو کسی اور سے نہیں اہل بیت کرام علیہم السلام سے مروی ہیں ان میں ایک وہ روایت ہے جو جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور رضی نے نہج البلاغہ میں ان الفاظ سے نقل کیا ہے، امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

> اللہ کی قسم میں ان کے مقابلہ میں تن تنہا آؤں اور وہ اتنی کثیر تعداد میں ہوں کہ زمین ان سے پٹی پڑی ہو تو بھی ان کی پرواہ نہ کروں نہ ان سے دہشت کھاؤں میں ان کی گمراہی سے بھی باخبر ہوں اور اپنی ہدایت سے بھی مجھے اپنی طرف سے نیز اپنے رب کی طرف سے ہدایت کا یقین ہے میں اللہ تعالیٰ سے اچھے اجر اور ملاقات کا امیدوار ہوں اور منتظر بھی۔[2]

پس جو شخص تن تنہا ہوتے ہوئے دشمن کے اتنے بڑے لشکر سے جس نے زمین کا چپہ چپہ بھر رکھا ہو نہ ڈرے نہ ان سے دہشت زدہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا منتظر اور امیدوار عنایات و کرامات ہو ایسے شخص کی زندگی و موت کے معاملات میں تقیہ کی گنجائش اور اس کا امکان کہاں پایا جاسکتا ہے پھر تقیہ بغیر خوف کے نہیں ہوتا اور خوف دو طرح کا ہوتا ہے، اول جان کا خوف اور ائمہ کرام کو یہ خوف بالکل نہیں ہوتا اس کی دو وجوہ ہیں

1۔ سورۃ القصص، الآیۃ:53

2۔ واني والله لو لقيتهم واحدا وهم طلاع الارض كلها ما باليت ولا استوحشت، واني من ضلالهم الذي هم فيه والهدى الذي انا عليه لعلى بصيرة من نفسي ويقين من ربي، واني الى لقاء الله لمشتاق، ولحسن ثوابه لمنتظر راج.(شرح نهج البلاغة از ابن ابی الحدید، 17/ 153، ط: دار الكتب العلميه بيروت)

پہلی تو یہ کہ ان کی موت ان کے اختیار میں ہوتی ہے، کلینی نے کافی میں یہ مسئلہ ثابت کیا ہے اور سارے ہی امامیہ کا اس پر اجماع ہے، دوسری وجہ یہ کہ ائمہ کو ماکان ومایکون کا علم ہوتا ہے گویا وہ اپنی موت اس کی کیفیت و وقت سے باخبر ہوتے ہیں اور اس کا تفصیلی علم رکھتے ہیں، لہذا وقت سے پہلے جان کا خوف ان کو کیوں ہونے لگا، دوسرا خوف بدنی یا روحانی ایذاء کی مشقت کا ہوتا ہے اور ان تکالیف کو برداشت کرنا اور گوارا کرنا ہمیشہ نیکوکاروں کا وطیرہ اور طرہ امتیاز رہا ہے انہوں نے اوامر الٰہی کے امتثال میں تکلیفوں کو گوارا کیا ہے، جابر اور قاہر بادشاہان وقت اور فراعین زمانہ سے مقابلہ کیا ہے اگر اس معاملہ میں بزدلی دکھائیں اور عبادت و مجاہدہ میں مشقت کا تحمل گوارا نہ کریں تو وہ نیکوں ہی کے شمار میں نہیں آسکتے چہ جائیکہ وہ نیکوں کے امام شمار ہوں لہذا ان کے لئے کسی طرح بھی تقیہ ثابت وجائز نہ ہوا۔

پھر اگر بقول شیعہ تقیہ جائز یا واجب ہوتا تو شیعوں کے گمان کے مطابق جناب امیر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت میں چھ ماہ کا توقف کیوں کرتے اتنے عرصہ بیعت سے رکے رہنا تو صراحتاً ملال وناخوشی کا اظہار ہے (جو تقیہ کی نفی ہے) سب کے ساتھ بیعت ہی کر لیتے۔

تیسری روایت جو تقیہ کو باطل ٹھہراتی ہے عباسی نے زرارہ بن امین سے اس نے ابی بکر بن حزم سے روایت کی ہے:

> قال: توضأ رجل، فمسح على خفيه، فدخل المسجد فصلى، فجاء علي فوطأ على رقبته، فقال: ويلك! تصلي على غير وضوء؟فقال [الرجل]: أمرني عمر بن الخطاب. قال [الراوي]: فأخذه بيده، فانتهى به إليه فقال [علي]: انظر ما يروي هذا عليك؟ ورفع صوته. فقال [عمر]: نعم، أنا أمرته[1]

کہا کہ ایک شخص نے وضو کیا موزوں پر مسح کیا اور مسجد میں آکر نماز ادا کی اتنے میں جناب علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو اس کی گدی دبوچ کر فرمایا ارے تیرا ناس ہو بغیر وضو کے نماز پڑھتا ہے

1۔التشريع وملابسات الأحكام عند المسلمين،لعلي الشهرستاني، 1/ 35، ط: بيروت

اس نے کہا مجھے تو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا آپ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لا کر کہا دیکھیے یہ آپ کے بارے میں کیا کہتا ہے اور انداز تخاطب گرجنے برسنے جیسا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں میں نے اسے یہی کہا تھا۔

اب یہاں تقیہ کہاں رہا جب غلط کار کو گدی سے دبوچ لیا اور خلیفہ وقت پر گرج، برس لیے تو تقیہ رخصت ہو گیا، چوتھی روایت شیعوں کے مقتدا اور نہج البلاغہ کے شارح راوندی کی ہے جسے اس نے اپنی کتاب جرائح الخرائج میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

أن عليا عليه السلام بلغه عن عمر ذكر شيعته، فاستقبله في بعض طرقات بساتين المدينة وفي يد علي عليه السلام قوس عربية، فقال: يا عمر بلغني عنك ذكرك لشيعتي، فقال: أربع على ظلعك، فقال: إنك لهيهنا؟ ثم رمى بالقوس إلى [على] الأرض فإذا هي ثعبان كالبعير فاغر فاه، وقد أقبل نحو عمر ليبتلعه، فصاح عمر: الله الله يا أبا الحسن لا عدت بعدها في شئ، وجعل يتضرع إليه، فضرب علي يده إلى الثعبان فعادت القوس كما كانت، فمر عمر إلى بيته مرعوبا، قال سلمان: فلما كان في الليل دعاني علي عليه السلام، فقال: صر إلى عمر فإنه حمل إليه مال من ناحية المشرق ولم يعلم به أحد، وقد عزم أن يحتبسه، فقل له: يقول لك علي: أخرج إليك مال من ناحية المشرق ففرقه على من جعل لهم ولا تحبسه فأفضحك، قال سلمان: فأديت إليه الرسالة، فقال: حيرني أمر صاحبك من أين علم به؟ فقلت: وهل يخفى عليه مثل هذا، فقال لسلمان: اقبل مني ما أقول لك: ما علي إلا ساحر! وإني لمشفق عليك منه، والصواب أن تفارقه وتصير في جملتنا، قلت: بئس ما قلت، لكن عليا ورث من أسرار النبوة ما قد رأيت

منه وما هو أكبر منه، قال: ارجع إليه فقل له: السمع والطاعة لأمرك، فرجعت إلى علي عليه السلام فقال: أحدثك بما جرى بينكما؟ فقلت: أنت أعلم به مني، فتكلم بكل ما جرى [به] بيننا، ثم قال: إن رعب الثعبان في قلبه إلى أن يموت.(1)

حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کو خبر ملی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے شیعوں کے بارے میں کچھ کہتے ہیں مدینہ کے باغات کے راستہ میں آپ دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا اس وقت حضرت علی کے ہاتھ میں کمان تھی آپ نے کہا اے عمر رضی اللہ عنہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم میرے شیعوں کے متعلق کچھ کہتے رہتے ہو جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا اے علی (رضی اللہ عنہ) اپنے منی کے سر پر رحم کھاؤ اس پر علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اچھا تم اس درجہ تک پہنچ چکے ہو اور اپنی کمان زمین پر ڈال دی جو فوراً اژدھا بن کر منہ کھولے ہوئے عمر کو نگلنے کے لئے ان کی طرف لپکی اس پر عمر چلائے خدا کے لیے اے ابو الحسن اب میں تمہارے کسی معاملہ میں دخل نہ دوں گا اور ان کے آگے گڑگڑانے لگے پس علی نے اژدھے پر ہاتھ ڈالا تو وہ کمان بن گئی اس کے بعد جناب عمر رضی اللہ عنہ اپنے گھر لوٹ آئے سلمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رات ہوئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجھے طلب کیا اور فرمایا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ مشرق سے ان کے پاس مال آیا ہے جسے وہ ہضم کرنا چاہتے ہیں لہٰذا ان سے کہو کہ علی کہتے ہیں جو مال مشرق سے آیا ہے نکالو اور حق داروں میں اسے بانٹ دو اسے دبانے کا خیال نہ کرو ورنہ میں تمہیں ذلیل کروں گا سلمان کہتے ہیں میں ان کے پاس گیا اور جا کر یہ پیغام پہنچایا وہ کہنے لگے تم یہ تو بتاؤ کہ تمہارے دوست کو اس مال کی خبر کیسے لگی میں نے کہا ان سے ایسی بات کہاں چھپ سکتی ہے تو کہنے لگے سلمان! میری بات مان لو علی تو ایک جادوگر ہیں میرا تمہارے بارے میں یقین ہے اور مناسب بھی یہی ہے کہ تم ان سے جدا ہو کر ہم میں آملو، میں نے کہا جیسا

1۔ بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار، 31/ 614، ط: دار الرضا بيروت لبنان

آپ خیال کرتے ہیں معاملہ ایسا نہیں ہے ان کے بارے میں آپ نے جو ملاحظہ کیا وہ وہ اسرار نبویہ ہیں جو انہیں ورثہ میں ملے ہیں اور ان کے پاس تو اس سے بھی زائد ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اچھا ان کی طرف واپس جاؤ اور ان سے کہو کہ میں نے آپ کے حکم سنا اور مانا لہذا میں جناب علی رضی اللہ عنہ کے پاس واپس آیا تو آپ نے پوچھا کہو جو باتیں عمر رضی اللہ عنہ سے ہوئیں سناؤ میں نے کہا آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں پھر آپ نے وہ تمام باتیں دہرا دیں جو ہمارے درمیان ہوئی تھیں اور آپ نے یہ بھی کہا کہ اژدھے کا خوف مرتے دم تک ان کے دل میں رہے گا۔

اس روایت میں تقیہ کی گردن ماری گئی ہے اور خوب دل کھول کر اس کی بیخ کنی کی گئی ہے لہذا اس سے معلوم ہوا کہ شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت کے عہد میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے جن امور پر سکوت عمل میں آیا مثلاً قصہ فدک، اور جناب ام کلثوم کا نکاح وغیرہ وہ محض اس بنا پر تھا کہ آپ کے نزدیک وہ درست تھے اور آپ انہیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے ورنہ انکار وتنقید کی پوری طاقت رکھتے تھے اگر انکار کی طاقت رکھتے ہوئے شرع کی منع کردہ باتوں پر سکوت فرماتے اور سستی برتتے تو فاسق نہ ہو جاتے بلکہ دختر سیدۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بارے میں اگر اس تمام اقتدار کے باوجود ستی یا رواداری سے کام لیتے تو کون سی ایسی برائی تھی جو لازم نہ آتی اور کچھ نہ سہی اس کی وجہ سے منصب امامت کی لیاقت سے تو میلوں دور جا پڑتے۔

چنانچہ ایک دو مرتبہ کوئی ممنوع و ناگوار چیز سامنے آئی، یا علم غیب سے معلوم کیا تو اتنے شدید غصہ سے کام لیا، ظالموں کے سخت ترین انسان عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) سے جن کو کسی کا لحاظ نہ تھا اس قدر خائف ہو گئے، لہذا معلوم ہوا کہ متعہ کی حرمت، سنت تراویح کا اجراء اور رواج پانا خمس وغنائم کی تقسیم، عمال کا تقرر، اور دوسرے مہمات خلافت ان سب کو آپ پسند فرماتے تھے ورنہ تو چشم ابرو کے ایک اثر کے ایک اشارے سے سارا کارخانہ خلافت درہم برہم کر سکتے تھے کسی لاؤ لشکر، اعوان وانصار کی بھی مطلق ضرورت وحاجت نہ تھی وہ ایک بے تیر کی ایک کمان ہی کافی تھی۔

عہد فاروقی میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کے سکوت اور دین وخلافت کے ظاہری امور میں موافقت کی جو وجوہ کتب امامیہ میں لکھی گئی ہیں کہ آپ بے بس، لاچار، ذلیل وبے قدرت تھے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے تھے، ایسی وجوہ ہیں کہ اول تو آپ کے یہ باتیں شایان شان نہیں دوسرے امامیوں کی یہ واہی تباہی بکواس کے سوا کچھ

نہیں، جناب امیر رضی اللہ عنہ عہد شیخین میں بڑے معزز اور بڑے لائق احترام رہے دونوں حضرات کے مشیر و خیر خواہ رہے اور ملت حنیفیہ پر قائم رہے، ان کے دوستوں، ساتھیوں اور خلفاء نے ان کو کبھی بے قدرت، بے بس، لاچار، اور بے وقار نہیں سمجھا، ہمیشہ ان کے شایان شان برتاؤ کیا، یہ تو شیعہ ہی ہیں جنہوں روز اول سے آپ کو اپنا آلہ کار سمجھا اور ان کی حقیقی محبت وعزت نہیں کی ان سے تقیہ جیسی ذلیل حرکت منسوب کر کے ان کا سارا وقار، دبدبہ اور عزت خاک میں ملا دی۔

ان سے تقیہ منسوب و ثابت کرنے سے در اصل اہل بیت کے لئے ایسی باتیں لازم آتی ہیں جو ان کی غیرت عزت آبرو سب میں خلل انداز ہوتی ہیں مثلاً اپنی بیٹی کافر کے نکاح میں دینا یا اپنی تمام بہنوں بیٹیوں کو کفر کے حوالہ کرنا خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ ان حضرات کو وہ قدرت و قوت حاصل تھی کہ اس کا دفاع کر سکتے، اور ایک معجزہ دکھا کر ایسے حضرات کو چشم زدن میں ذلیل کر سکتے تھے۔

اہلسنت اور کتب شیعہ میں باتفاق تواتر سے یہ بات ثابت ہے کہ جناب امیر واہل بیت رضی اللہ عنہم نے خلفاء ثلاثہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فروع فقہیہ کے بہت سے مسائل میں اختلاف کئے ان سے بحث و مناظرہ کیا لیکن اس مخالفت یا مناظرہ کی بنا پر کسی ایک نے بھی صراحتاً تو کیا اشارہ و کنایہ میں بھی ان کو مطعون نہیں کیا ایذاء دہی تو بہت دور کی بات تھی اس سے بھی تقیہ باطل ہوا کیونکہ بعض مسائل میں واقعہ کا اظہار ہونے کے باوجود کوئی ضرر نہیں پہنچا تو ثابت ہو گیا کہ اظہار کی قوت موجود تھی اور نقصان کا خوف معدوم۔

اور اگر تقیہ مان لیا جائے تو یا خدا کے حکم ہو گا یا بغیر حکم خدا ہو گا پہلی شق میں ثات ہوتا ہے کہ خدا حکیم نہیں کیونکہ ایک کام کا حکم دینا اور پھر اس کے خلاف کا امر صادر کرنا تو حکمت و دانائی کی جگہ سفاہت و حماقت لگتا ہے اور اگر شق ثانی ہو یعنی محض لوگوں کی ایذاء رسانی کے ڈر سے تقیہ ہو تو ائمہ اہل بیت جیسے داعیان حق پر بزدلی سستی اور بے صبری تھوپنے کے سوا کچھ نہیں اور یہ باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ ایسے شخص میں امامت کی لیاقت نہیں، سارا قرآن جہاد کی مشقتوں پر تحمل اور مصائب پر صبر کی تلقین سے بھرا ہوا ہے صابرین کی مدح سرائی بھی جابجا ملتی ہے اور ان امور سے بھاگنا یا جان چرانا صالحین اور صابرین کا طریقہ بھی نہیں رہا۔

ایک اور بات کہ اگر تقیہ واجب ہی ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے یہ نہ فرماتے اگر

مجھے اس عہد کا پاس نہ ہوتا جو مجھ سے میرے حبیب ﷺ نے لیا تھا تب تم دیکھتے کہ مددکاروں کی تعداد کے لحاظ سے کمزور کون ہے اس کا حوالہ کتب امامیہ کے حوالہ سے پہلے بھی مذکور ہو چکا ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ عام امامیوں کا یہ خیال کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ پر اپنی خلافت سے قبل تقیہ واجب تھا اور خلافت کے بعد حرام ہو گیا لہذا آپ سے جو روایات خلافت و ولایت کے بعد منقول ہیں ان میں تقیہ ہر گز نہیں ماننا چاہئے ورنہ لازم آئے گا کہ ایک معصوم حرام کا مرتکب ہوا لیکن ان میں سید مرتضیٰ امامی اس بات کا قائل ہے کہ آپ پر خلافت اور ولایت کے بعد بھی تقیہ واجب تھا، مگر ظاہر ہے کہ اس کا یہ قول غلط اور باطل ہے، اس لیے کہ اگر بعد خلافت بھی تقیہ واجب ہوتا تو آپ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو معزول نہ فرماتے اس لیے کہ آپ ان سے خوفزدہ تھے جس کا اظہار بھی ان الفاظ میں فرمایا تھا "اني اخاف كيده وان كيده لعظيم" میں ان کی تدبیر سے خائف رہتا ہوں ان کی چال بڑی گہری ہوتی ہے و جناب ابن عباس اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم نے بھی یہی مشورہ دیا" وله شهرا واعزله دهرا "[1] ایک ماہ کیلیے ان کو حاکم بناؤ، اور پھر ہمیشہ کیلیے معزول کر دو مگر آپ نے اسکا جواب دیا" وما كنت متخذ المضلين عضدا "[2] میں فساد پیشہ سے مدد و قوت لینے والا نہیں ہوں، چنانچہ یہی معزولی فساد عظیم کا باعث بنی، زمین سے فتنے امل پڑے اور نوبت قتل و قتال تک پہنچ کر رہی۔

سید مرتضیٰ کہتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی ولایت و خلافت تو ایک دکھاوا تھی یوں ہی برائے نام حقیقت سے خالی، کیونکہ جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ آپ سے پرخاش رکھتے تھے جو آپ کی وفات تک جاری رہی اور آپ کے متبعین اور فوج میں ایسے لوگ تھے جو اصحاب رسول ﷺ کی اولاد تھے اور در پردہ وہ آپ کے دشمن تھے اور شیخین رضی اللہ عنہما کے انصاف اور فضائل کے معتقد اور ان کے معاونین اور حامیوں کے مداح ایسی صورت میں اگر جناب امیر رضی اللہ عنہ خاطر خواہ انداز پر اپنے عقیدہ کا اظہار فرماتے یا اس پر عمل پیرا ہوتے تو گمان غالب تھا کہ یہ متبعین ساتھ چھوڑ جاتے اور امر خلافت اور کٹھن ہو جاتا اس وجہ سے ولایت کی حالت میں آپ پر تقیہ واجب تھا، سمجھ میں نہیں آتا کہ

1۔ موسوعة الإمام علي بن أبي طالب،لمحمد الريشهري،5/ 339، ط: دار الحديث قم

2۔ موسوعة الإمام علي بن أبي طالب،لمحمد الريشهري،4/ 117، ط: دار الحديث قم

شیعیت کے دعویٰ کے ساتھ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی ولایت کو بھی نمائشی اور بے معنی قرار دیتے ہیں۔

اہلسنت کے نزدیک یہ ولایت سراسر با معنی تھی اور ولایت کی حقیقت اس پر منحصر تھی در حقیقت ولایت کے معنی ملک میں تصرف کرنے، احکام جاری کرنے، رعایا سے محصولات و خراج لینے اور مفسدوں کی تنبیہ و تادیب پر قدرت رکھنے کے ہیں اور اس وقت کے اکثر اسلامی شہروں پر جناب امیر رضی اللہ عنہ ایسے تصرف و ولایت کی قدرت بدرجہ کمال رکھتے تھے خصوصاً حجاز، حرمین، یمن، عمان، بحرین، آذربائجان عراق، فارس، وخراسان میں بغیر کسی جھگڑے مقابلہ یا رکاوٹ کے احکام جاری و نافذ تھے، اور وہاں کے باشندے دل و جان سے آپ کے مطیع و فرماں بردار تھے، اگر مخالف تھا تو شام کا علاقہ تھا، اگر ملک کے کسی ایک حصہ میں گڑبڑ ہو جائے تو یہ معنی ولایت کے منافی نہیں اس سے خلافت و امامت نمائشی و برائے نام نہیں کہلا سکتی ذرا صدر اول عبد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر تو نظر ڈالئے کہ آپ خلیفہ مقرر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر تصرف سوائے جزیرۃ العرب کوئی علاقہ نہ تھا اور اس میں بھی سب دشمن اور مفسد بڑے زور آور تھے مثلاً مسیلمہ کذاب، خلیفہ بنی تمیم کی مدعیہ نبوت سجاح، اور بنو تمیم وہ قبیلہ تھا کہ سارے عرب میں لڑاکا مشہور تھے اس کے مرد مردان کارزار سمجھے جاتے تھے۔

دوسری طرف مانعین زکوۃ کی شورش تھی تو شام میں بنو غسان حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے برسر پرخاش تھا اور پھر اردگرد کے تمام عرب قبائل فتنہ ارتداد میں گرفتار غرض کیفیت یہ تھی کہ سوائے اہالیان مکہ و مدینہ کے آپ کا کوئی حامی و ناصر نہیں آتا تھا مگر اس سب کے باوجود آپ کی استقامت و ثبات کا یہ عالم تھا کہ آپ نے کسی شرعی معاملہ میں معمولی سی مداہنت اور کمزوری یا رواداری کو بار پانے نہیں دیا اور ایسے عالم میں بھی اعلان فرمایا تحریر فرمایا:

لو منعوني عقالا كانوا يؤدونه إلى رسول الله ﷺ لقاتلتهم[1] اگر جانور کی رسی بھی جو یہ زکوۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے مجھے نہ دیں گے تو میں ان سے قتال کروں گا۔

اور جناب امیر رضی اللہ عنہ تو سب سے زیادہ بہادر تھے ملک کے ایک علاقہ کے بسنے والوں سے ڈر کر دین محمدی کو

1۔ المبسوط لشمس الدين السرخسي، 2/ 159، ط: دار المعرفة بيروت لبنان

مٹنے اور دولت سرمدی کے زوال کو کیسے روا رکھتے، یہ بات صرف شیعہ کی سمجھ میں آئے تو آئے کسی مسلمان کے تو تصور میں بھی نہیں آسکتی، وہ تو ایسے خیال پر سُبحانَكَ هٰذَا بُهتانٌ عَظِيمٌ پڑھتے ہیں ایک طرف تم اس کو وصی بحق کہتے ہو اور دوسری طرف ان پر الزام لگاتے ہو کہ گویا جناب امیر رضی اللہ عنہ نے دین محمدی میں غلطی کو جائز رکھا اور گوارا کیا، کیا تمہاری عقلوں کو زنگ لگ گیا یا آنکھیں بصارت کھو بیٹھیں، کہ نہ دیکھتے ہو کہ کیا کہہ رہے ہو نہ یہ سوچتے ہو کہ اس کے متعلق کہہ رہے ہو اور یہ بات جو انہوں نے کہی کہ آپ کے متبعین اور افواج میں دشمنوں کی اولاد کی اکثریت تھی اور وہی ان کے پیرو تھے تو ان میں اکثریت والی بات تو بالکل غلط ہے اس لیے کہ اکثریت تو کوفیوں مصریوں اور قاتلین عثمان کی تھی جن کی ساری تگ و دو صحابہ کرام کے مطاعن کی تلاش میں صرف ہو رہی تھی وہ تو ان حضرات کرام کی بزرگی اور اعزاز کے انہدام کے خواہاں تھے یا عراق و عجم خراسان اور احواز کے ایسے لوگ تھے جو لوگ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے عہد کے زخم خوردہ تھے اور ان کی فوجوں سے دو بدو شکست کا زخم کھا کر دلوں میں کینہ چھپائے ہوئے تھے، یا پھر وہ اکھڑ اور ان گھڑ عرب جو فتنہ انگیزی جنگ جوئی طعن و بدگوئی کو اپنی فطرت میں لے کر اس دنیا میں آئے اور جن کا محبوب مشغلہ احکام و حکام میں رد و بدل اور اکھاڑ پچھاڑ اور پھر ایسے مزاج کے لوگوں کے سامنے مسائل بھی عین ان کی خواہش و آرزو اور تمناؤں کے بر لانے والے ہوں جیسے متع کہ عیاش تباہ اور شہوت پرست لوگوں کی کشش کا باعث یا مسح رجلین کا مسئلہ کہ آدھے وضو سے چھٹی یا تراویح کی معافی کہ بے ایمان اور روزہ دار کے لیے افطار کے بعد ایسا ہے جیسے موت کے بعد عذاب قبر، اکثر عجمی و عربوں پر تراویح بہت شاق و دشوار تھی چنانچہ ایک مشہور شاعر طرطوسی نے اس سلسلہ میں جو کہا اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"روزہ کا دن بدبختی کا دن ہے اور تراویح کی رات مصیبت کی رات ہے بیمار بن جاؤ کہ پاک چیزیں تمہارے لیے حلال ہو جائیں اور بعض وقت بیمار بننا بھی عین شفا ہے اور اگر روزہ رکھنا ہی پڑ جائے تو اکثر بعد عشاء کا روزہ رکھ"(1)

1۔يوم الصيام يوم نكد وليلة التراويح ليلة الوصب فتمارضوا تحل لكم الطيبات إن التمارض عين الشفاء في الأدب وإن صمت فلا تصم إلا العشاء فإن هذا من فعل أرباب الحجا والأرب(يتيمة الدهر في محاسن أهل العصر، للثعالبي، 1/ 468، ط: دار الكتب العلميه، بيروت)

تو ان مسائل نے جن لوگوں کے دلوں کو کھینچا وہ بھی آپ کے ساتھ ہی ہوں اور فوجیوں میں شامل تھے تو معلوم ہو گیا کہ اکثریت کن لوگوں کی تھی اور صحابہ کی جو اولادیں آپ کے ساتھ تھیں وہ انصار تھے جو ہمیشہ سے محب علی اور شیعان علی شمار ہوتے تھے وہ شیخین رضی اللہ عنہما کا عدل اور ان کی فضیلت سے آگاہ تھے اور اپنے والدین سے وضع و عین پیغبری سے بھی واقف ہو گئے تھے تو گویا بقول شیعہ شیخین کی طرف سے سنت پیغبری میں جو تحریف یا تغیر ہوا تھا اسے خوب جانتے تھے اور کل جدید لذیذ کہ مصداق نادر مسائل پرانے وسائل کے مقابلہ میں ان کو پسند اور جمعیت خاطر کا سبب بھی ہوں گے اس طرح یہ سارے مٹھی میں تھے پھر خوف کی سے تھا محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ یا ان جیسے دو ایک ہوں گے تو وہ مصر میں جب مارے گئے تو ان کا خوف بھی زائل ہو گیا اب رہے امیر معاویہ اور جناب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما ان سے اگر خوف تھا تو وہ بغاوت اور محاذ آرائی کا تھا اس لیے مخالفت میں انہوں نے کون سی کمی کی تھی کہ اگر آپ اظہار حق فرماتے اور اصل امور شرع مروج فرماتے تو وہ اپنی مخالفت میں کیا اضافہ کرتے۔

اس کے ساتھ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل بھی سامنے رہے کہ ابتدائے بعثت سے لے کر حیات مبارکہ کے اخری لمحہ تک آپ کے اکثر متبعین و پیرو یا تو آپ کے جانے دشمنوں کی اولاد تھے یا آپ کے بھائی بند مثلاً عکرمہ بن ابو جہل، حارث بن ہشام، صفوان بن امیہ بن خلف، زبیر بن مطعم اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہم جو امیر الامراء اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شمشیر برہنہ تھے یہ سب کے سب ان کافروں کے فرزند تھے جو آپ کے سخت ترین جانی دشمن تھے اس کے باوجود آپ نے کبھی بھی امور شرعیہ میں کسی رو رعایت یا نرمی و سستی سے کام نہیں لیا یہی حال سابقہ انبیاء اور رسول علیہم السلام اور ان کے ورثا کا رہا ہے کہ ہمیشہ دشمنوں اور مخالفوں سے پالا پڑتا رہا اگر ان کے اسلاف کی دشمنی وعداوت تبلیغ احکام و امور شرع میں ملحوظ رکھی جایا کرتی تو شرع کیسے ظہور میں آتی اور دین حق دین باطل سے کس طرح ممتاز ہوتا۔

پھر جناب امیر رضی اللہ عنہ کے پیروں نے آپ کی بات مان لینے آپ کی تعظیم و توقیر کرنے اور آپ کی رفاقت میں جان لڑا دینے میں کوئی کمی اٹھا نہ رکھی چنانچہ جنگ جمل و صفین اور نہروان کے واقعات موجود ہیں اور جو شخص کسی پر جان نچھاور کرنے کے آخری اقدام پر تلا ہوا ہو وہ ان کے شرعی فرمان سے کیوں منہ موڑنے لگا، اور اتنا تو بہر حال تمام متبعین اور پیروں کے بارے میں متفق علیہ ہے کہ وہ سب کے سب آپ کا شمار خلفائے

راشدین میں کرتے اور اپنے زمانہ و وقت میں ساری مخلوق اس سے بہتر سمجھتے تھے اہل سنت کا بھی یہی عقیدہ و مذہب ہے اور ان کے نزدیک یہ بھی طے شدہ ہے کہ خلفائے راشدین کی سنت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا حکم رکھتی ہے تو جن لوگوں کے ایسے خیالات اور عقائد ہوں ان سے ڈرنا اور تقیہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

پانچویں روایت جو کلینی کی ہے یہ ہے:

روي الكليني عن معاذ بن كثير عن أبي عبد الله عليه السلام قال: إن الله عز وجل أنزل على نبيه صلى الله عليه وآله كتابا قبل وفاته، فقال: يا محمد هذه وصيتك إلى النجبة من أهلك، قال: وما النجبة يا جبرئيل؟ فقال :علي بن أبي طالب وولده عليهم السلام، وكان على الكتاب خواتيم من ذهب فدفعه النبي صلى الله عليه وآله إلى أمير المؤمنين عليه السلام وأمره أن يفك خاتما منه ويعمل بما فيه، ففك أمير المؤمنين عليه السلام خاتما وعمل بما فيه، ثم دفعه إلى ابنه الحسن عليه السلام ففك خاتما وعمل بما فيه، ثم دفعه إلى الحسين عليهما السلام، ففك خاتما فوجد فيه أن اخرج بقوم إلى الشهادة، فلا شهادة لهم إلا معك واشر نفسك لله عز وجل، ففعل ثم دفعه إلى علي بن الحسين عليهما السلام ففك خاتما فوجد فيه أن أطرق واصمت والزم منزلك واعبد ربك حتى يأتيك اليقين، ففعل، ثم دفعه إلى ابنه محمد بن علي عليهما السلام، ففك خاتما فوجد فيه حدث الناس وافتهم ولا تخافن إلا الله عز وجل، فإنه لا سبيل لاحد عليك [ففعل]، ثم دفعه إلى ابنه جعفر ففك خاتما فوجد فيه حدث الناس وافتهم وانشر علوم أهل بيتك وصدق آبائك الصالحين ولا تخافن إلا الله عز وجل وأنت في حرز وأمان، ففعل، ثم دفعه إلى ابنه موسى

عليه السلام وكذلك يدفعه موسى إلى الذي بعده ثم كذلك إلى قيام المهدي[1]
ورواه من طريق اخر عن معاذ بن كثير ايضا ان ابي عبد الله وفيه في الخاتم
الخامس وقل الحق في الامن والخوف ولا تخشى الا الله[2]

کلینی نے بحوالہ معاذ ابن کثیر جناب ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے اپنے نبی پر ایک کتاب نازل فرمائی اور فرمایا کہ یہ تمہاری طرف سے نوجواں کے لیے وصیت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل علیہ السلام سے دریافت فرمایاوہ نوجوابہ کون ہے انہوں نے کہا کہ علی بن ابی طالب اور ان کی اولاد رضی اللہ عنہم اور کتاب پر سونے کی مہریں تھیں پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کتاب علی رضی اللہ عنہ کو دی اور فرمایا کہ ان مہروں میں سے ایک کو توڑیں اور اس میں جو کچھ درج ہے اس پر عمل کریں پھر حسن رضی اللہ عنہ کو دی اپ نے مہر توڑی اور جو کچھ اس میں پایا عمل کیا پھر حسین رضی اللہ عنہ کو دی اور انہوں نے مہر توڑی تو اس میں یہ لکھا پایا کہ ایک قوم کے ہمراہی میں شہادت کے لیے نکلو کیونکہ تمہارے بغیر ان کی شہادت معتبر نہیں اور راہ خدا میں اپنی جان کے بازی لگاؤ تو انہوں نے ایسا ہی کیا پھر علی بن الحسین رحمۃ اللہ علیہ کو دی انہوں نے بھی ایک مہر توڑی تو اس میں یہ لکھا پایا کہ سر تسلیم خم کرو خاموش رہو گھر میں بیٹھے رہو اور مرتے دم تک اپنے رب کی عبادت کرتے رہو انہوں نے ایسا ہی کیا پھر ان کے بیٹے محمد بن علی بن الحسین رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کی انہوں نے ایک مہر توڑی تو اس میں یہ پایا لوگوں سے حدیث بیان کرو ان کو فتوی دو اور اہل بیت کے علم کو پھیلاؤ اور اپنے نیک بخت باپ دادا کی تصدیق کرو اور سوائے خدا کے کسی سے نہ ڈرو کیونکہ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا پھر جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے کی آپ نے ایک مہر توڑی تو اس میں یہ لکھا ہوا پایا کہ لوگوں سے حدیث بیان کرو ان کو فتوی دو اور سوائے خدا کے

1۔ الأصول من الكافي، 1/ 280، 281، ط: دار الكتب الاسلامية

2۔ شرح أصول الكافي للمازندراني، 6/ 96، ط: دار احياء التراث العربي بيروت لبنان

کسی سے نہ ڈرو اہل بیت کا علم پھیلاؤ اور اپنے نیک بخت باپ دادا کی تصدیق کرو تم یقیناً امن و حفاظت میں ہو تو انہوں نے ایسا ہی کیا پھر ان کے بیٹے موسی علیہ السلام کے حوالے کی اور اسی طرح ظہور مہدی تک ہوتا چلا جائے گا اور ایک دوسرے سلسلہ سند سے بھی معاذ بن کثیر سے روایت کی ہے اور اس نے ابی عبد اللہ علیہ السلام سے اس میں پانچویں مہر میں یوں ہے امن و خوف میں حق بات کہہ اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈر۔

یہ روایت بڑے اچھے فوائد پر مشتمل ہے:

الف: ائمہ حضرات جو کچھ کرتے تھے خدا کے حکم کے مطابق کرتے ان کو جن باتوں کا حکم دیا گیا انہوں نے وہ انجام دی لیکن زمین پر اقتدار حاصل کرنے اور امور مملکت میں دخل اندازی کرنے کا ان میں سے کسی بزرگ کو بھی حکم نہیں ملا ورنہ وہ اس کے لیے تگ و دو کرتے اور ضرور کامیاب ہوتے۔

ب: جناب امیر رضی اللہ عنہ عہد خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم میں خاموش رہنے کوئی گڑبڑ نہ کرنے اور خلفاء ثلاثہ کی اطاعت و فرمانبرداری سے پیش آنے پر مامور تھے اور انہوں نے اس حکم الٰہی کی پوری پوری پابندی فرمائی فہو المراد یہی ہمارا مقصد ہے۔

ج: بعض ائمہ مثلاً جناب باقر و صادق علیہما السلام کو کسی کے ساتھ تقیہ کرنا ممنوع قرار دیا گیا لہٰذا ان کے وہ تمام اقوال و افعال و روایات جو اہل سنت کے نزدیک ان سے بطریق تواتر شہرت مروی ہے سب کے سب سچائی اور ظاہر پر مبنی ہے امام اعظم ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ علمائے اہل سنت نے آپ سے جو کچھ سیکھا وہ سب فرمودہ خدا تھا مگر شیعوں نے جو وطیرہ اختیار کر رکھا ہے وہ ان اقوال میں جو اہل سنت کی موافقت میں ہیں اور ان کی کتابوں میں مذکور ہیں رد و بدل کر کے ان کو تقیہ پر محمول کرتے ہیں تو یہ تحریف و تنسیخ تو ہے ہی مگر اسی کے ساتھ وصیت کے بھی صاف طور پر خلاف ہے۔

چھٹی روایت سلیم بن قیس ہلالی نے اپنی کتاب احتجاجات میں اشعث بن قیس سے ایک طویل روایت کے ذیل میں بیان کیا ہے:

ان أمير المؤمنين عليه السلام لما قبض رسول الله صلى الله عليه وآله مال الناس إلى أبي بكر فبايعوه حملت فاطمة وأخذت بيد ابني الحسن والحسين،

فلم أدع أحدا من أهل بدر وأهل السابقة من المهاجرين والأنصار إلا ناشدتهم الله في حقي ودعوتهم إلى نصرتي. فلم يستجب لي من جميع الناس إلا أربعة رهط: سلمان وأبو ذر والمقداد والزبير[1]

امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور لوگوں کا جھکاؤ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرف ہوا اور آپ سے بیعت لی گئی تو میں نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اونٹ پر سوار کیا اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما کا ہاتھ پکڑا اور اہل بدر مہاجرین و انصار کے سابقین میں سے کسی کو نہ چھوڑا جس کو میں نے اپنے حق کے لیے قسم نہ دی ہو اور اپنی مدد کے لیے نہ بلایا ہو مگر ان حضرات میں سے چار کے سوا میری بات کسی نے بھی نہ مانی یعنی زبیر، سلمان ابوذر اور مقداد رضی اللہ عنہم۔

یہ روایت بھی صاف غمازی کر رہی ہے کہ امام بر حق پر تقیہ واجب نہ تھا اگر واجب ہوتا تو خاتون جنت اور شباب اہل جنت کے سرداروں کو لے کر یوں در بدر نہ پھرتے اس میں فائدہ کی کوئی بات نہ تھی بلکہ جو لوگ بیعت کر چکے تھے ان کے سامنے ایسی بات کہ اظہار میں تو سراسر مضرت تھی۔

ساتویں روایت بھی سلیم بن قیس سے ایک دوسری کتاب میں جو شیعوں کے ہاں ابان بن عیاش کے نام سے مشہور ہے اس نے سلیم سے اس کی یوں روایت کی ہے:

ان ابا بكر بعث الى علي قنفذا حين بايعه الناس ولم يبايعه علي وقال له انطلق الى علي فقل له اجب خليفة رسول الله صلى الله عليه وسلم فانطلق فبلغه فقال له ما اسرع ما كذبتم على رسول الله صلى الله عليه وسلم وارتددتم والله ما استخلف رسول الله صلى الله عليه وسلم غيري[2]

1۔ كتاب سليم بن قيس الهلالي، ص: 216

2۔ كتاب سليم بن قيس الهلالي، ص: 385

جب لوگوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی اور علی رضی اللہ عنہ نے ان سے بیعت نہ کی تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قنفذ کو ان کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کو تسلیم کر لو پس اس نے جا کر یہ بات پہنچا دی تب علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کس قدر جلد جھوٹ منسوب کر دیا اور ان سے پھر گئے خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سوا کسی کو خلیفہ نہیں بنایا۔

یہ روایت بھی تقیہ کے بطلان کا علی الاعلان اظہار کر رہی ہے۔

آٹھویں روایت کتاب سلیم میں اسی ابان سے مروی ہے:

أنه لما يجب على غضب عمر وأضرم النار بباب علي وأحرقه ودخل فاستقبلته فاطمة وصاحت يا أبتاه ويا رسول الله فرفع عمر السيف وهو في غمده فوجأ به جنبها المبارك ورفع السوط فضرب به ضرعها فصاحت يا أبتاه فأخذ علي بتلابيب عمر وهزه ووجأ أنفه ورقبته[1]

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت نہیں مانی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت خفا ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دروازہ کو آگ لگا دی اور جلا کر اس کو ڈھا دیا فاطمہ رضی اللہ عنہا بابائی دہائی دیتی ہوئی آئیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے میان سمیت اپنی تلوار سے ان کی کوکھ میں کچوکا دیا اور کوڑا ان کے پیرہن فرمار اوہ پھر ہائے بابا چلائیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی گردن دبوچی اور اسے جھٹکا دیا ناک و گدی کو بھی رگڑا۔

نویں روایت اسی کتاب میں یہ بھی درج ہے:

أن عمر قال لعلي: بايع أبا بكر رضي الله تعالى عنه قال: إن لم أفعل ذلك؟ قال: إذا والله تعالى لأضربن عنقك قال :كذبت والله يا ابن صهاك لا تقدر

1 ـ كتاب سليم بن قيس الهلالي، ص: 149

على ذلك أنت ألأم وأضعف من ذلك[1]

عمر رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ سے کہا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لو آپ نے کہا اگر نہ کروں تو پھر کیا ہو گا انہوں نے فرمایا تب بخدا تم قتل کر دیئے جاؤ گے علی نے کہا اے ابن صحاک بخدا تم نے جھوٹ کہا تم اس پر قادر نہیں ہو سکتے تم تو اس سے زیادہ لئیم اور کمزور ہو۔

اس روایت نے تو تقیہ کا ناس ہی مار دیا اور جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دیا کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے گالی بھی دی تکذیب بھی کی اور اس پر قسم کھا کر اسے پختہ اور موکد بھی کیا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ضعف الخلق کہا حالانکہ شیعوں کی اصح الکتب نہج البلاغہ میں منقول ور مروی ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے جب یہ سنا کہ ان کے لشکری اہل شام کی بدگوئی کرتے اور گالیاں دیتے ہیں تو آپ نے ان کو اس سے روکا اور فرمایا کہ مجھے تمہارا گلیر ہونا پسند نہیں اب پتہ نہیں یہاں آپ نے اپنی زبان کو گالی سے آلودہ کرنا کیوں پسند ہے فرمایا(دراصل نہ یہ زبان اپ کی ہے نہ اپ کا اخلاق ہے یہ تو کسی بد فطرت کی کرشمہ سازی ہے کہ وہ اپنی زبان ان کے دہن مبارک میں ٹھونسنے کی ناپاک جسارت کر رہا ہے۔ن)

دسویں روایت محمد بن سنان کی روایت ہے:

أن أمير المؤمنين قال لعمر: يا مغرور إني أراك في الدنيا قتيلا بجراحة من عند أم معمر تحكم عليه جورا فيقتلك ويدخل بذلك الجنان على رغم منك.[2]

امیر المومنین نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے کہا اے مغرور میں تجھ کو دنیا میں مقتول دیکھ رہا ہوں کہ عبد ابن معمر اس فیصلہ کی وجہ سے جو تم اس کے حق میں ظلما صادر کرو گے اور وہ تمہیں قتل کر دے گا اور تمہارے نہ چاہنے کے باوجود جنت میں جائے گا۔

پڑھتا جا شرماتا جا اس گرج چمک میں کہیں تقیہ کا وجود نظر آتا ہے کوسوں منزلوں اس کا تو پتہ نہیں۔

1۔ كتاب سليم بن قيس الهلالي، ص: 390

2۔ مجمع النورين وملتقى البحرين، لابي الحسن المرندي، ص: 316

گیارہویں روایت بھی محمد بن سنان راوی ہے:

أنه قال لعمر مرة: إن لك ولصاحبك الذي قمت مقامه هتكا وصلبا تخرجان من جوار رسول الله صلى الله عليه وسلم فتصلبان على شجرة يابسة فتورق فيفتتن بذلك من والاكما ثم يؤتى بالنار التي أضرمت لإبراهيم ويأتي جرجيس ودانيال وكل نبي وصديق فتصلبان فيها فتحرقان وتصيران رمادا ثم تأتي ريح فتنسفكما في اليم نسفا[1]

امیر المومنین نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تمہارے لیے نیز جس کی جگہ تم نے سنبھالی ہے یقیناً بے آبروئی اور سولی پر چڑھنا ہے تم دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوس سے نکال دیئے جاؤ گے اور سولی دے دیے جاؤ گے ایک سوکھے درخت پر جو پتے لے آئے گا اس سے تمہارے ہمدرد فتنہ میں پڑ جائیں گے اس کے بعد وہ آگ لائی جائے گی جو ابراہیم علیہ السلام کے لیے بھڑکائی گئی تھی اور جرجیس اور دانیال اور ہر نبی اور صدیق لائیں گے پس تم دونوں اس میں ڈالے جاؤ گے اور جلائے جاؤ گے اور راکھ ہو جاؤ گے پھر ہوا آئے گی اور تم کو سمندر میں ڈال کر نیست و نابود کر دے گی۔

یہاں بھی دامن تقیہ تار تار ہے اور اصول تقیہ اشکبار (مندرجہ بالا روایت کے متعلق بلاریب و شک ہر مسلمان جانتا ہے کہ جناب امیر یہ الفاظ و بیان تو کجا ان کو پتہ تک نہیں ہو گا کہ سبائیوں نے ان کی طرف کیا کیا جھوٹ منسوب کر کے پھیلا دیے ہیں البتہ اس روایت سے رافضیوں کی ان وارداتوں کی ضرور تصدیق ہو گئی جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں جن میں ان بدبختوں نے کئی مرتبہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے اجساد مبارکہ کو پہلو رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نکال کر اسی سبائی بکواس کو عملی جامہ پہنانے کی ناکام کوشش کی اور اسی کوشش میں ایک مرتبہ چالیس رافضی مسجد نبوی میں غرق زمین ہو کر کندہ جہنم بنے جس کا نشان ہنوز موجود ہے، از مترجم نعمانی)

1۔ مدينة معاجز الأئمة الاثني عشر، 2/ 94، ط: مؤسسة المعارف الاسلامية

گو تقیہ کے بطلان کی روایات کتب شیعہ میں بے شمار موجود ہیں مگر یہاں صرف بارہ روایات پر اکتفا کیا گیا کسی بھی عقلمند کو ان روایات کے مطالعہ کے بعد یہ شک نہیں رہے گا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جو اپنے دشمنوں میں جری، ہیبت، سرکشی اور دبدبہ میں مشہور اور ضرب المثل تھے وہ جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے سامنے ہر معاملہ میں بودے پست ہمت اور حقیر و ذلیل تھے تو پھر دوسرے حضرات جو آپ سے کمزور ضعیف و بزدل تھے ان کا معلوم نہیں بدحواسی میں کیا حال ہوتا ہو گا ان کے تو ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہوں گے لہذا معلوم ہو گیا کہ جناب امیر کا امور مملکت میں دخل نہ دینا اور ان کو انہی چند ضعیف و کمزور و حقیر لوگوں کی صوابدید پر دیدہ مدانستہ چھوڑے رکھنا بے بسی اور تقیہ پر مبنی نہیں تھا اگرچہ یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ ایسا کرنا مخلوق کے دین و ایمان کے فساد کا سراسر سبب بنا اور شریعت کی تحریف اور کتاب اللہ کی تبدیلی جیسے نتائج اس پر مرتب ہوئے اب اس کا جواب شیعہ ہی نے کہ اس قدر طاقت و قوت اور دبدبہ رکھتے ہوئے جناب امیر نے فساد عقیدہ تحریف شریعت اور تبدیلی کتاب اللہ کیسے اور کیوں گوارا فرمائی جبکہ مذکورہ بالا روایات نے تقیہ کے اصول کو تو جھٹلا دیا۔

ائمہ سے تقیہ کا وقوع اور سراسر جبن بزدلی بے عزتی اور نہ حفاظتی ہے خاص کر ایسی صورت میں کہ موت بھی ان کے ہاتھ میں ہو گزشتہ و آئندہ حالات کی ان کو خبر بھی ہو اور پھر تقیہ بھی اس حد تک کے فاسق و فاجر ان کی لڑکیاں اور فرجیں چھین لیں وہ انتقام کی قدرت بھی رکھتے ہوں بلکہ اول قدم پر ہی دفاع اور روک دینے کی صلاحیت بھی حاصل ہو کے پھر کسی تعب و مشقت کی بھی ضرورت نہ رہے صرف ایک کمان ڈال دینے اور زبان ہلا دینے سے کام تمام ہو جائے بہر حال ایسا ذلیل اور قابل نفرت خیال و تصور محترم حضرات کی شان میں کسی مسلمان کے دل و دماغ میں تو ہرگز نہیں اس سکتا اس لیے کہ یہ صریح کفر ہے یہ ساری قباحتیں اور نحوستیں تو اس منحوس تقیہ کے اصول کی پیداوار ہیں اور اس کے واجب ہونے سے کیا بلکہ صرف واقعہ ہونے سے وہ ساری اغراض فوت ہو جاتی ہیں جو نصب امام سے مقصود ہوتی ہیں نہ ہی امامت ظاہر ہو پاتی ہے نہ ہی شریعت کی حفاظت اور نہ ہی حق باطل سے تمیز پاتا ہے اور اگر کوئی ابتداء دعوی امامت و خلافت کرے اور جب دیکھے کہ لوگ اس کی امامت کے منکر ہیں تو اس سے سختی و درشتی سے پیش آتے ہیں تو وہ تقیہ اختیار کر کے بیٹھ جاتے اور ہر معاملہ میں اس کا شریک عمل رہے تو عوام و خواص یہی سمجھیں گے کہ اس نے اپنے دعوی سے رجوع کر لیا ہے اور یہ بھی یقین کر لیں گے کہ آدمی

چھڑ والا اور بڑبولا تھا کہ اتنے بڑے منصب کا دعوی تو کر بیٹھا مگر کچھ چلتی نہ دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا۔

در حقیقت یہ خیال حد درجہ نازیبا و ناشائستہ ہے اور کوئی بھی مسلمان اس کو پسند نہیں کر سکتا مگر اس کو کیا کہا جائے کہ شیعہ روایات جو ان کے ہاں جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی بابت ملتی ہیں اسی حالت کو ثابت کرتی ہیں بفرض محال ہم یہ مان بھی لیں کہ تقیہ میں کوئی خرابی نہیں مگر لڑکیوں اور بہنوں کے چھین لیے جانے پر دب جانا اور دم بخود رہ جانا مسلمان کی دل شکنی اور نفرت قلبی کے لیے تو یہی کافی ہے اور ان کی یہ اشک شوئی بھی بیکار اور افتراء ہے کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ دختر جناب امیر رضی اللہ عنہ پر حاوی نہ ہو سکے کہ ایک جن بیچ میں حائل ہو گیا۔

یہ ایک دیدہ دلیرانہ چوری ہے جو حضرت سارہ علیہا السلام کے قصہ سے اڑائی گئی ہے سب کو معلوم ہے کہ ایک ظالم نے ان عفت مآب کو غصب کر لیا تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام سر بسجدہ مصروف التجا تھے وہ بدبخت جب بھی بدنیتی کرتا بے ہوش ہو کر گر پڑتا، مگر یہاں تو قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے باقاعدہ نکاح میں آگئی پھر آپ کے بطن سے زید بن عمر رضی اللہ عنہ نہ صرف پیدا ہوا بلکہ زندگی کی بیس بہاریں بھی دیکھیں اور عین عالم شباب میں بنی عدی کی باہم خانہ جنگی میں صلح وصفائی کے لیے جاتے ہوئے رات کی اندھیری میں کسی نامعلوم فرد کے ہاتھوں مغالطہ میں شہید ہو گئے اور اتفاق یہ کہ آپ کی والدہ سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا بھی اسی روز بیماری کے سبب فوت ہوئیں دونوں جنازے ساتھ لائے گئے،[1] جناب حسین و عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے نماز جنازہ پڑھی اور دفن کیا اور کچھ نہ بھی ہو تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی زندگی کے آخری لمحہ تک ان پاکباز محترمہ رضی اللہ عنہا کا آپ کے گھر میں رہنا بلاشبہ ثابت ہے۔

اول تو جگر پارہ رسول کا ایک فاجر و کافر کے ہاتھوں چھن جانا ہی متصور نہیں اور اگر ہو بھی گیا تھا تو یہاں خلاصی زیادہ متوقع تھی اور نکاح کے بارے میں عذر پیش کرنے کی خاطر یہ بے حیا قوم جناب صادق رحمہ اللہ علیہ سے جو روایت نقل کرتی ہے کہ:

1۔ عن عبد الرحمن بن زيد بن أسلم، عن أبيه، عن جدّه: تزوّج عمر أم كلثوم على مهر أربعين ألفا. وقال الزبير: ولدت لعمر ابنيه: زيدا، ورقية، وماتت أم كلثوم وولدها في يوم واحد، أصيب زيد في حرب كانت بين بني عديّ (الإصابة في تمييز الصحابة، 8/ 465، ط، دار الكتب العلمية بيروت)

"اول فرج غصب منا"(1)

اس کو سن کر تو مسلمانوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مگر لعنت ہے ان بد باطن بدبختوں پر کے محض عداوت عمر میں اتنے اندھے ہوگئے کہ اس قسم کی کفریات پاکباز ائمہ اطہار پر بکنے میں بھی انہیں ذرا شرم و عار نہیں حالانکہ ان کے شرمناک جھوٹ کی تکذیب کے لیے خود کتب امامیہ میں صحیح روایات موجود ہیں جو عداوت عمر کی بنا پر طاق نسیان بنا رکھی ہیں ادھر آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے یہ ادھرے اندھے ہیں تو دنیا تو اندھی نہیں ملاحظہ فرمایئے:

سئل الامام محمد بن علي الباقر عن تزويجها فقال لولا انه راه اهلا لها ما كان يزوجها اياه وكانت اشرف نساء العالم جدها رسول الله ﷺ واخواها الحسن والحسين سيدا شباب اهل الجنه وابوها علي ذو الشرف والمنقبة في الاسلام وامها فاطمة بنت محمد ﷺ وجدتها خديجة بنت خويلد.(2)

جناب محمد بن علی الباقر رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے نکاح کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جناب ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے لائق نہ پاتے تو ان سے نکاح ہی کیوں کرتے وہ تمام مستورات عالم میں شریف ترین تھیں رسول اللہ ﷺ ان کے نانا جوانان جنت کے سردار حضرت حسنین رضی اللہ عنہما ان کے ماں جائے بھائی شرف و منقبت کے مالک حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے والد اور سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا رسول اللہ رضی اللہ عنہ کے جگر گوشہ ان کی والدہ ہیں ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا ان کی نانی۔

1۔ عن زرارة، عن أبي عبد الله (عليه السلام) في تزويج أم كلثوم فقال: إن ذلك فرج غصبناه.(الفروع من الكافي، 5/ 346، ط: دار الكتب الاسلامية)

2۔ اخبرنا عبدالله اخبرنا محمد حدثني موسى قال حدثنا ابى عن ابيه عن جده جعفر بن محمد عن ابيه عن جده ان عليا نقل ابنته ام كلثوم فى عدتها حيث مات زوجها عمر بن الخطاب لانها كانت فى دارالامارة۔(قرب الاسناد لابى العباس عبدالله بن جعفر حميرى، ص 109، ط، تهران جديد)

ان کو یہ بات تو سامنے رکھنی چاہیے تھی کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک شیعہ کی برائی کرنے پر اتنی شدت سے باز پرس کی اور کمان کا اژدہا بنا کر ان کو حراساں اور بے عزت کیا تو کیا وہ اپنی بیٹی کے چھن جانے پر اور عزت وناموس کا سوال در پیش ہونے پر ایسے ہی ٹھنڈے مزاج کا ثبوت دیتے اور ان کی رگ غیرت واہمیت میں کوئی جنبش نہ ہوتی اور وہ خاموشی سے بغیر تعرض کیے اسے گوارا کر لیتے ایسی پاک ومطہر گرام قدر لائق احترام ہستیوں کے متعلق وقوع زنا کا وہم بھی اپنے دل میں لانا گو مجبوری سے ہو مسلمانوں کے کھلا کفر ہے مگر کھلے کفر کے مرتکب یہ ناپاک اور بدفطرت گروہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن ہستیوں کی پاکی وپاک بازی قرآن مجید میں نازل فرمائی ہے ان کے پاک دامن کو محض عداوت وبغض وعناد عمر رضی اللہ عنہ کے سبب اس فعل کے داغ سے داغدار کرے اور جناب امیر اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کو بے غیرتی اور بے ناموسی کے اتہام سے متہم کرے۔

مگر یہ اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ ساری کالک ان ملعون ہی کے چہروں کا تا قیام قیامت جزر ہے گی اس لیے کہ انہوں نے اپنے سوائے منصوبوں کی خاطر سارے ہی قابل احترام مشرف بزرگوں کو مجروح کرنے کی ناپاک منصوبہ بندی کی جسارت کی ہے جن کی پاک دامنی کا خدا گواہ ہے ان کے دامن پر تو یہ منافق وکافر کیا دھبہ کاری کریں گے البتہ خود ہی قرۃ خاسئین بند کر رہیں گے انہوں نے عداوت وبغض میں جس کفر وزندیقیت کا مظاہرہ کیا اس کے نظیر کسی فرقہ میں پائی گئی نہ پائی جائے گی شیطان بزبان قرآن آدم کا کھلا دشمن ہے اور انتہا درجہ کی اداوت اور بغض رکھتا ہے مگر اس سے بھی خدا تعالیٰ پر کوئی تہمت یا جھوٹ نہیں جوڑا اور اسے مجبوری وبے بسی جیسے نقائص سے متہم نہیں کیا۔

فائدہ عظیمہ

جب تقیہ کی بات بحث میں اہی گئی تو فرق اسلامیہ میں اس کے سلسلہ میں جو افراط وتفریط پائی جاتی ہے اسے بھی مختصرا بیان کر دینا مناسب معلوم ہوا اگر تقیہ میں شیعوں کے ہاں حد درجہ افراد ہے تو اس کے مقابلے میں خوارج کے ہاں بے انتہا تفریط شیعوں کا افراط ان کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ معمولی اور بہت ہی معمولی خوف یا لالچ کے باعث اظہار واقرار کفر کو بھی جائز سمجھتے ہیں بلکہ واجب گردانتے ہیں اور خوارج کی تفریط یہ ہے کہ وہ دین کے مقابلے میں جان ور ناموس کا بھی لحاظ نہیں کرتے بلکہ وہ تو اپنے انتہا پسند مزاج کے باعث اس باب میں عجیب عجیب زیادتیوں سے کام لیتے ہیں اس میں سے ایک یہ کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور کوئی چور

یا غاصب اگر اس کا بہت سامان و دولت لے جانا چاہے تب بھی اس کو نیت توڑنا حرام ہے چنانچہ وہ حضرات بریدہ اسلمی صحابی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کرتے ہیں کہ وہ نماز میں اپنے گھوڑے پر نظر رکھتے تھے کہ بدک کر بھاگ نہ جائے اس لیے مناسب ہوا کہ مذہب اہل سنت جو درمیانی درجہ ہے کو تحریر میں لے آئیں اہل سنت کی اکثر کتب میں اس کی وضاحت نہیں کی گئی پہلی بات تو یہ کہ تقیہ ایک مشہور فعل ہے چنانچہ آیات ذیل اس کی دلیل ہیں:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً[1]

مومنوں کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ مومنوں کو نظر انداز کر کے کافروں کو دوست بنائیں اور جو ایسا کرے وہ اللہ کے نزدیک کسی شمار میں نہیں ہاں اگر ان سے کوئی آڑ لینی ہو تو اور بات ہے۔

إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ[2]

مگر وہ جو مجبور کر دیا جائے دراں حالیکہ اس کا دل ایمان پر جمع ہوا ہو۔

ان کے علاوہ بھی اور بہت سی آیات ہیں تقیہ کی تعریف یہ ہے کہ جان مال اور آبرو کو دشمن کے شر اور اس کی دست وبرد سے بچائیں دشمن دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جن سے دینی و ملی اختلاف کے سبب دشمنی ہو جیسے کافر مشرک مرتد وغیرہ دوسرا وہ جس سے کسی دنیاوی اغراض و اسباب کے سبب دشمنی ہو جیسے مال و جائیداد اسباب وغیرہ جب دشمنی دو طرح کی ہوئی تو لامحالہ تقیہ کی بھی دو قسم ہوں گی، پہلی قسم جس میں ازروئے شرع تقیہ کی صورت یہ ہو گی کہ جب مسلمان کسی ایسی جگہ گھر جائے جہاں کافروں کی وجہ سے دین و مذہب کو ظاہر نہ کر سکے تو اس پر ہجرت واجب ہو جاتی ہے اور وہ اس جگہ کو چھوڑ کر ایسی جگہ چلا جائے جہاں اسے اپنے دین مذہب کے اظہار کی آزادی اور پوری قوت میسر ہو اس کے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اپنی کمزوری کے لیے کوئی جواز تلاش کر کے اپنے مذہب و طریقہ اسلام کو چھپائے اس پر قرآنی قطعی نصوص وارد ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

1۔ سورة ال عمران ، الاية : 28

2۔ سورة النحل ، الاية : 106

يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ أَرْضِي وَاسِعَةٌ فَإِيَّايَ فَاعْبُدُونِ[1]

میرے بندو میری زمین بڑی وسیع ہے پوجا صرف میری ہی کرو، یا ارشاد ہوا:

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا[2]

جن لوگوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہوا ہوتا ہے فرشتے جب ان کی روح قبض کرتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ تم کہاں پھنسے ہوئے تھے وہ کہیں گے کہ ہم زمین کے کمزور افراد تھے فرشتے ان سے کہیں گے کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی تو وہاں ہجرت کیوں نہ کر گئے ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے جو بہت برا ٹھکانہ ہے ہاں ترک ہجرت میں کوئی واقعی عذر ہو تو وہ قابل لحاظ ہو گا مثلاً عورتیں، بچے، اندھے، لنگڑے لولے، اپاہج، زیر حراست یا قیدی یا انہی کی مانند۔

مخالفین اگر خود اس کو یا اس کے ماں باپ بیوی بچوں کو قتل کرنے پر آمادہ ہوں اور گمان غالب یہ ہو کہ وہ اپنا ارادہ قتل پورا کر کے رہیں گے خواہی قتل دانہ پانی بند کرنے یا جلاوطن کرنے یا کسی اور صورت سے ہو ایسی صورت میں بقدر ضرورت ان سے زبانی معافقت کی اجازت ہے مگر ایسی حالت میں بچ نکلنے کی کوشش خور بیلہ جوئی واجب ہے اور اگر یہ خیال ہو کہ کچھ مالی یا بدنی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے جو قابل برداشت ہو مثلاً قید و بند یا غیر مہلک مار پیٹ ایسی صورت میں مخالف کے ساتھ موافقت جائز نہیں جواز کی صورت میں بھی موافقت رخصت ہے ورنہ اس وقت بھی عظیمت یہی ہے کہ دھڑلے سے اپنے مذہب کا اظہار کرے چاہے جان جاتی ہی رہے (در حقیقت یہ شیعوں کے تقیہ سے بالکل ہی جدا ایک دوسری ہی کیفیت ہے اس کو رخصت سے تعبیر کیا گیا ہے گو سورۃ تقیہ ہی معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت کے لحاظ سے آسمان و زمین کا فرق ہے عزم ترجم نعمانی)

1۔ سورۃ العنکبوت، الآیۃ: 56

2۔ سورۃ النساء، الآیۃ: 97

اب ذرا شیعوں کی سہل انگاری اور زیادتی دیکھیے کہ معمولی سے مال وزر کی خاطر بلکہ مجلس میں کسی اعزاز و اکرام کی امید میں بلکہ صرف زبانی طور پر خود کو قبلہ وصاحب کہلوانے اپنا دین وایمان تج کر مخالف کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں اور ہجرت کو ہرگز واجب نہیں جانتے اور تمام قرآنی آیات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن میں ترک ہجرت پر کھلم کھلا عتاب فرمایا گیا ہے اور یہ کوئی پہلی مثال نہیں بلکہ ان کا معاملہ تمام قرآن کے ساتھ ایسا ہی ہے ان کی معتبر کتب میں یہ مذکور ومسطور ہے:

من صلى وراء سني تقية فكأنما صلى وراء نبي[1]

جس نے سنی کے پیچھے نماز پڑھی اس نے گویا نبی کے پیچھے نماز پڑھی۔

مگر تھوڑے سے نان و آش کی خاطر دیکھ لیجیے اپنی نماز کس طرح خراب کرتے اور اس نماز کے مقابلے میں دوسری نمازوں کے زیادہ ثواب کے امیدوار بنے رہتے ہیں ایسی ہی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فرقہ مذہبی اعتقادات میں کتنا بودا اور لاپرواہ اور حیلہ ساز واقع ہوا غیرت اور شدت کی تو اس میں بو باس تک نہیں ان کا سارا اوڑھنا بچھونا وہ تعصب اور اندھا پن ہے جو یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر بدگوئی کرنے اور طعن و تشنیع میں صرف کرتے ہیں دینی مشقت برداشت کرنا ہرگز گوارا نہیں کرتے دنیا کا حقیر ساز وسامان یہاں کی راحت ولذت ان کے نزدیک دین و آخرت کے بڑے منافع اور دیرپا نعمتوں سے بھی زیادہ عزیز تر اور اہم تر ہیں یہ واضح اور صحیح طور پر اس آیت کے مصداق ہیں:

أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ[2] یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت کے داموں خرید اہے وہاں نہ ان کے عذاب میں تخفیف کی جائے گی نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی۔

1۔ روى الكليني وغيره عن الحلبي عن أبي عبد الله قال: «من صلى معهم في الصف الأول كان كمن صلى خلف رسول الله ﷺ في الصف الأول». الكافي: 3/ 380؛ ابن بابويه، الأمالي: ص 336؛ العاملي، وسائل الشيعة: 8/ 299.

2۔ سورة البقرة، الاية : 86

دنیا بھر کے عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ محبت و بغض تصدیق و تکذیب اور اخلاص و نفاق کے دعوے کے جھوٹ سچ جاننے اور پرکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ تجربہ اور بلاو مصائب کے وقت منافع کے طلف ہو جانے لذتوں کے ترک کرنے اور رنج و مشقت کے برداشت کرنے کے باوجود اپنے دعویٰ پر مصر اور ثابت قدم ہے تو ٹھیک ہے ورنہ یوں تو ہر شخص مصلحت وقت کے موافق اپنے متعلق کوئی نہ کوئی دعویٰ رکھتا ہی ہے اگر ان عام اور معمولی تکالیف سے بچنے کے لیے تقیہ لازم ہو جائے تو سچ جھوٹ میں تمیز کیسے ہو سکے گی اگرچہ علم الٰہی میں دلوں کی پوشیدہ اور سینہ کی چھپی ہوئی باتیں روشن ہیں اور اس کو امتحان کی حاجت بھی نہیں لیکن دینی تکلیف کا مدار اور امر و نواہی پر عمل کا پتہ تو امتحان نما معاملات پر ہے چنانچہ اس معاملہ کو صفائی سے ظاہر فرمایا:

لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا[1] تاکہ تمہیں پرکھے کہ بلحاظ اعمال کون اچھا ہے، یا فرمایا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنكُمْ وَالصَّابِرِينَ[2]

ہم تم کو یقیناً آزمائیں گے تاکہ معلوم ہو جائے کہ تم میں سے مجاہدین اور صابرین کون ہیں، اور فرمایا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ[3]

البتہ ہم آزمائیں گے تم کو خوف و دہشت اور بھوک سے اور مالوں جانوں اور پیداوار میں کمی ڈال کر۔

اب رہی دوسری قسم تو اس صورت میں ہجرت واجب ہونے اور نہ ہونے میں علماء کی آراء مختلف ہیں ایک گروہ اسے واجب کہتا ہے اور اس آیت کو بطور دلیل پیش کرتا ہے:

وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ[4] اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اور دوسری دلیل مال کے ضائع کرنے کی ممانعت سے لی ہے دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ہجرت واجب نہیں

1۔ سورۃ الملک، الآیۃ : 2

2۔ سورۃ محمد، الآیۃ : 31

3۔ سورۃ البقرۃ، الآیۃ : 155

4۔ سورۃ البقرۃ، الآیۃ : 195

کہ وہاں سے ہجرت دنیاوی مصالح میں سے ایک مصلحت اور ملت کے اتحاد کے سبب ہجرت نہ کرنے سے اس کمزور وضعیف شخص کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا کیوں کہ اس کا غالب دشمن بحیثیت مسلمان اس سے کوئی سروکار نہیں رکھے گا دونوں گروہوں کے مابین فیصلہ کن بات یہ ہے کہ اپنی جان یا عزیز واقارب کی ہلاکت کا یا شدید بے عزتی کا خطرہ ہے تو یہاں سے بھی ہجرت واجب ہے لیکن یہ ہجرت عبادت اور لائق ثواب نہیں کہ اس پر اسے ثواب بھی ملے اس کا وجوب محض اس شخص کی دنیاوی مصلحت کی بنا پر ہے۔

تحقیق کی بات یہ ہے کہ ہر واجب عبادت نہیں ہوتا بہت سے واجبات ہیں کہ ان پر کوئی ثواب نہیں مثلا سخت بھوک کے وقت کھانا مرض میں یقینی اور ظنی نقصانات سے بچنا صحت کی حالت میں سمیات سے پرہیز کرنا وغیرہ وغیرہ یہ ہجرت بھی اسی قسم کی ہے یہ ہجرت الی اللہ ورسولہ نہیں ہے کہ ثواب آخرت کا سبب بنے تقیہ سے متعلق اس مفید بحث کے بعد اب ہم اصل معاملہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اہل سنت کہتے ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک میں ہرگز تقیہ نہیں کیا پسندیدہ دین کے اظہار پر اپ کو قدرت تھی دین ودنیا کے کسی معاملہ میں آپ کسی سے خائف نہیں تھے امر دین میں خائف نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے ہجرت نہیں فرمائی اگر آپ خائف ہوتے تو آپ پر موجب آیت قرآنی "إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ....الخ"[1] کے اور دنیاوی امور میں خائف نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مال وجان کے بارے میں اپ سے نہ کوئی لڑا جھگڑا نہ الجھا اور نہ سخت کلامی سے پیش آیا اس کے برعکس ہر کہہ ومہہ آپ کی نہایت تعظیم وتوقیر کرتے اور محبت سے پیش آتے تھے اور آپ کا برتاؤ بھی سب کے ساتھ علی قدر مراتب تھا چنانچہ تاریخ اس پر گواہ ہے۔

رہا شیعوں کا مذہب تو وہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ان کے محققین تو آپ کی خود اپنے خلافت میں بھی تقیہ کو واجب بتاتے ہیں چہ جائیکہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں یہاں قاضی نور اللہ شوستری نے بڑی پوچ اور گوزشتر قسم کی بات کہی ہے وہ کہتا ہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ سے لڑائی کرنا ہونا یعنی عہد خلفاء ثلاثہ میں ایسا ہے جیسا کہ

1۔ سورۃ النساء، الایۃ: 79

ہمارے پیغمبر ﷺ کا قبل ہجرت مقاتلہ نہ کرنا یا اکثر انبیاء کا مقاتلہ نہ کرنا، یہاں قاضی صاحب کو ہجرت کے لفظ سے دھوکہ لگا ہے اگر جناب امیر رضی اللہ عنہ کا حال نبی کریم ﷺ کے قبل ہجرت حال کی طرح ہے تو پھر ان کا حال حضور ﷺ کے ہجرت کے وقت یا ہجرت کے بعد کے حال کے مطابق کیوں نہ ہو حالانکہ جناب امیر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا ارادہ ہی نہیں فرمایا یہ بات بالاجماع ثابت ہے اس سے انکار و فرار ممکن ہی نہیں۔

خدا اور رسول کے متعلق ہلکی بات یا بغیر سوچے سمجھے کوئی کلمہ منہ سے نہیں نکالنا چاہیے اور پھر قبل ہجرت ہمارے پیغمبر ﷺ کا کیا یہ حال تھا کہ وہ ابو جہل اور امیہ بن خلف کے ساتھ مل کر نعوذ باللہ لات و منات کو پوجتے تھے یا دوسرے رسولوں میں جاہلیت اور ذبح علی غیر اللہ میں ان کے ساتھ شریک عمل تھے یا ان کی مدح و ثنا اپنا ورد بنایا ہوا تھا یا ان کے ساتھ ہم پیالہ و ہم نوالہ رہتے تھے یا احکام میں ان کی پیروی کرتے یا یہ کہ ہر وقت وہ ہمیشہ باہم مقابلہ گفت و شنید اور مار پیٹ رہتی تھی!

آپ تو ان کی عادات اور رسوم کی برائی اور ہجو برملا کرتے لوگوں کو بر سر میدان دین حق کی طرف بلاتے اور سختیاں برداشت کرتے حتی کہ بعد ہجرت کے انصار و مددگار پیدا ہوئے تو زبانی دعوت سے گریز کر نوبت تلوار و تفنگ تک پہنچی تو گویا وہاں تو مراتب اظہار میں ترقی تھی تقیہ اور پوشیدگی کا وہاں کیا سوال یہی حال انبیاء سابقین علیہم السلام کا تھا ہاں جب اور جن انبیاء کرام پر جہاد بھی سیف واجب نہ تھا بلکہ اس کا تعلق عمرہ و ملوک سے تھا اور جو انبیاء کے زیر فرمان تھے اس لیے وہ خود جنگ و جدال اور جمع لشکر میں مشغول نہ ہوتے تھے اور جب ہمارے پیغمبر ﷺ مامور بجہاد ہوئے تو یہ ضروری قرار پایا کہ آپ کے خلفاء ہی نہیں آپ کی ساری امت بھی مامور بجہاد ہو اب اگر کوئی شخص انبیاء سابقین کی سنت جہاد کو ترک کرے اور اس ترک کو لازم قرار دے لے تو بلاشبہ کافر ہو جائے اور کبھی ایسا نہ ہوا نہ ہو گا کہ بغاوت اور کفر کے ظہور کے بعد ہمارے پیغمبر ﷺ کے نائب یا خلیفہ سے وجوب جہاد ساقط ہو جائے۔

لہذا جناب امیر رضی اللہ عنہ کے حال کو انبیاء سابقین کے حال پر قیاس کرنا ایسا ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لیے نماز میں بیت المقدس کی طرف منہ کرنا فرض تھا نہ کہ کعبہ مکرمہ کی طرف اور آیت استقبال قبلہ سے پیشتر آپ کا حال بھی وہی تھا جو انبیاء سابقین اور خود ہمارے رسول مقبول ﷺ کا یہی حال تمام احکام شرعیہ میں تھا ایسی مجنون کی فہرست سے خارج کر دینا چاہیے آیت جہاد کے نزول سے پہلے اگر حضور ﷺ کو اس کے

نزول کا انتظار تھا تو آپ ترک قتال فرمائے ہوئے تھے تو جناب امیر رضی اللہ عنہ کو کس بات کا انتظار تھا قرآن میں تو امت محمدیہ پر جہاد و قتال واجب ہو چکا تھا پھر اولو الامر جو پیغمبر علیہ السلام کے نائب ہیں اور جن کے تقرر سے غرض محض یہ ہے کہ جہاد کریں دین کا اعلان کریں اور ظالم سے مظلوم کا حق دلائیں کس بات کا انتظار کرتے رہے اور کیوں جہاد نہیں کیا یہ ہے مبلغ علم ان کے علماء کا اور حال ان کے محققین کی بے سروپا بکواس کا عوام کا تو کہنا ہی کیا۔

اب تقیہ کے متعلق اہل سنت کے خیالات بھی گوش گزار کر لیجئے، اہل تاریخ کا اس پر اجماع ہے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام پہنچا کے آپ اگر یزید کی بیعت کر لو اور اسے امام بر حق تسلیم کر لو تو ہم تم سے کوئی تعرض نہ کریں گے جہاں رہنا منظور ہو بخوشی رہو بار بار یہ پیشکش ہوئی مگر جب آپ نے یزید کو اپنے رویہ پر ڈٹا پایا اور اسے قابل امامت نہ سمجھا تو آپ نے کھلم کھلا اس کی بیعت سے انکار کر دیا اور ہر گز کوئی تکیہ نہ فرمایا اور پھر پیش آیا جو پیش آنا تھا، لہذا اگر تقیہ واجب ہوتا تو اس کے اس سے زیادہ ساز گار حالات اور کیا ہو سکتے تھے کہ دشمنوں کا خوف بے انتہا تھا ستر نفر مار ڈالے جانے کے لیے تیس ہزار لشکریوں میں محصور ہو چکے تھے قتل و بے عزتی اور بے آبروئی یقینی ہو چکی تھی ایسے عالم میں آپ کے ثبات نے یہ بتا دیا کہ وجوب تو بڑی بات ہے آپ رضی اللہ عنہ تقیہ کے جواز کے بھی قائل نہ تھے۔

ایک دوسری بات تاریخ گواہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جناب امیر رضی اللہ عنہ کی دو حالتیں تھیں اول یہ کہ عہد شیخین اور زمانہ ذی النورین رضی اللہ عنہ میں آپ نے بیعت خلافت کی کسی سے کوئی تعارض نہ فرمایا نماز روزہ حج مشورہ تدابیر امور مہمہ میں ان کے ساتھ شریک و دخیل رہے اور خلا ملا برابر رہا، دوسری حالت یہ کہ جناب ذی النورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد لوگوں سے بیعت جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے کئی بار مقابلہ کیا اگرچہ آپ کے ساتھ ہی کام تھے چنانچہ قاضی نور اللہ نے مجالس المومنین میں لکھا ہے کہ قریش میں سے صرف پانچ نفر آپ کے ساتھ تھے جبکہ تیرہ قبیلے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے [1] اس لیے آپ کو فتح نصیب نہ ہوئی اور آپ

1۔عن عبد الله بن سنان، قال: سمعت أبا عبد الله عليه السلام يقول: كان مع أمير المؤمنين عليه السلام من قريش خمسة نفر، وكانت ثلاثة عشر قبيلة مع معاوية.(اختيار معرفة الرجال المعروف برجال الكشي، 1/ 281، ط: مؤسسة آل البيت عليهم السلام قم)

دفع شر نہ فرما سکے تو لا محالہ کسی صورت میں بھی خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم سے آپ کی موافقت تقیہ و مجبوری کی بنا پر نہ تھی ورنہ یہاں بھی تقیہ فرماتے ہیں۔

ایک اور بات یہ کہ شیعوں کی ایک معتبر کتاب بحر المناقب میں مناقب اخطب سے نقل کرتے ہیں کہ اس نے محمد بن خالد سے روایت کی:

> خطبهم عمر بن الخطاب فقال: لو صرفناكم عما تعرفون إلى ما تنكرون ما كنتم صانعين؟ قال فسكتوا فقال ذلك ثلاثا"، فقام علي عليه السلام فقال: يا أمير المؤمنين اذن كنا نستتيبك، فان تبت قبلناك قال: فإن [لم أتب]. قال: اذن نضرب الذي فيه عيناك فقال: الحمد لله الذي جعل في هذه الأمة من إذا اعوججنا أقام أودنا.[1]

جناب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان کو خطبہ دیا اور فرمایا کہ اگر میں تم کو جانی پہچانی راہ سے اجنبی راہ کی طرف پھیر دوں تو تم کیا کرو گے راوی کے مطابق سب چپ رہے آپ نے تین مرتبہ اسے دہرایا تو جناب علی رضی اللہ عنہ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا اس وقت ہم تم سے توبہ کا مطالبہ کریں گے اگر توبہ کر لو گے تو ہمارے لیے قابل قبول رہو گے عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر میں ایسا نہ کروں کہا اس وقت ہم تمہارا سر قلم کر دیں گے جس میں تمہاری آنکھیں ہیں جناب عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ اس امت میں وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ٹیڑھے راستے پر چل نکلے تو وہ ہم کو سیدھا کر دیں۔

اس روایت سے صاف معلوم ہو گیا کہ جناب مرتضیٰ علی رضی اللہ عنہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کس قدر پختگی سے قائم تھے اور ممنوعات شرعیہ میں سستی نہ کرنے اور ان سے انکار کرنے کی قدرت رکھنے میں آپ کو مرتبہ کس قدر بلند و رفیع تھا اور جب یہ حال ہو اور معاملہ کی نوعیت ایسی ہو تو تقیہ کی وہاں کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

پھر قاضی نور اللہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ آپ بھی ان میں سے ہیں جو

1۔المناقب تأليف الموفق بن أحمد بن محمد المكي الخوارزمي، ص: 98، 99،ط: مؤسسة النشر الاسلامي

اعراف میں ہوں گے رسول اللہ ﷺ آپ کو بہت عزیز اور دوست رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ عباس میرے والد کی جگہ ہیں غرض آپ کے فضائل اتنی تفصیل سے بیان کیے کہ اس مختصر میں اس کی سمائی بھی مشکل ہے اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے پر آپ نے جناب ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا حضرت علی رضی رضی اللہ عنہ سے رشتہ مانگا آپ نے پہلی بار انکار کیا دوسری بار سکوت فرمایا اس کے بعد خود جناب عباس رضی اللہ عنہ نے متولی نکاح بن کر حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے باندھ دیا، [1] حضرت علی رضی اللہ عنہ بوجہ تقیہ اس سے نہ روک سکے اور اسی لیے سکوت فرمایا ہر عقلمند بلا تامل کہ یہ جان لے گا کہ اتنے فضائل رکھنے والی ہستی کے متعلق یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کے ظالم کے ظلم میں آپ نے اعانت کی ہو۔

ہفوہ نمبر 2: شیخین رضی اللہ عنہما منافق تھے

یہ کہ شیخین رضی اللہ عنہما اہل نفاق میں سے تھے، [2] حالانکہ ان کی قوت ایمانی بطریق تواتر ثابت ہے حضور اکرم ﷺ نے ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ایمان کو اپنے ساتھ شمار فرمایا ہے کلینی سے باب امامت میں درجات ایمان سے متعلق جو حدیث روایت کی گئی ہے اس میں تشریح ہے کہ مہاجرین اولین کے ایمان کو تمام امتیوں کے ایمان پر بدرجہا ترجیح ہے پھر جناب کی جو نص نہج البلاغہ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی شان میں مذکور ہے وہ بھی آپ کے کمال ایمان پر شاہد و دال ہے اور جناب محمد باقر اور دوسرے ائمہ علیہم السلام کا آپ کو صدیق کے لقب سے ملقب کرنا اس ہفوہ کی ریڑھ ہی مار دیتا ہے۔

ہفوہ نمبر 3: شیخین رضی اللہ عنہما اصحاب العقبہ میں سے تھے

یہ کہ شیخین اصحاب العقبہ میں سے تھے یعنی وہ بارہ منافق جنہوں نے غزوہ تبوک سے واپسی پر اثناء راہ آپ ﷺ کو تنہا پا کر قتل کرنا چاہا تھا عمار بن یاسر اور حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہما اس سازش سے آگاہ ہو گئے اور بروقت مداخلت

1۔ رسائل الشریف المرتضی، 3/ 149، ط: دار القرآن الکریم قم

2۔ پس میگویند آن مومنان کہ مشرف گردید اندبر کافران و منافقان کہ ای ابو بکر وای عمر وای عثمان تا آنکہ ہمہ راباجمہای ایشان ندا میکنند۔ (حق الیقین، ملا باقر مجلسی، باب ششم دربیان جہنم و عقوبات آن، ص:528، ط: سازمان انتشارات جاویدان)

کر کے ان کی سازش ناکام بنادی۔[1]

یہ بوجوہ تواتر اور بداہت کے صاف خلاف ہے اس لیے کہ ان دونوں حضرات کی صاحبزادیاں حضور ﷺ کی زوجیت میں تھیں ان کو اس قسم کے کام کے وہاں زیادہ مواقع حاصل تھے پھر ان حضرات کا خانہ نبوت میں آنا جانا آپ سے خلوت وجلوت میں ملاقات ویکجائی اتنی مشہور ومعروف ہے کہ ضرب المثل ہوگئی ہے اس قسم کے رازدانوں اور جلوت وخلوت کے ساتھیوں کو فرصت وطن ہائی کے وقت کی تلاش کی بھلا کیا ضرورت رفیق غار اور صاحب عریش کو اس کام کی تکمیل کے لیے ان سے اچھے مواقع کب مل سکتے تھے خلاصہ کلام یہ کہ جس کی نظر کتب سیر پر ہو اور آنحضور ﷺ کے ساتھ شیخین کی صحبت یا ان حضرات سے نبی کریم ﷺ کے الفت ومعانست شفقت وحمایت معلوم ہو وہ ان حضرات کی نسبت اس قسم کے احتمال کو ہر گز جائز نہیں رکھے گا ،ان حضرات کے متعلق ایسا احتمال کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کوئی آدمی جناب امیر رضی اللہ عنہ کے متعلق ایسا احتمال رکھے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں پھر ان شیعوں ہی کی تفاسیر سے یہ ثابت ہے کہ یہ آیت اصحاب العقبہ ہی کی شان میں نازل ہوئی:

يَحْلِفُونَ بِاللهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا[2] اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے نہیں کہا حالانکہ انہوں نے کفر کا کلمہ کہا اور اسلام لا کر پھر کافر ہوئے اور جو چاہا تھا وہ نہیں پایا۔

اس آیت سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوئی کہ اصحاب عقبہ کا حال دو صورتوں سے خالی نہیں یا توبہ کریں اور عذاب نفاق سے نجات پالیں یا گناہ پر اصرار کریں تو اس صورت میں دنیا و آخرت میں آزار کے سزاوار

1۔ أصلحك الله عن الاثني عشر أصحاب العقبة المتلثمين الذين أرادوا أن ينفروا برسول الله صلى الله عليه وآله الناقة، ومتى كان ذلك؟ قال :بغدير خم مقبل رسول الله صلى الله عليه وآله من حجة الوداع.(كتاب سليم بن قيس الهلالي، ص: 272)

2۔سورة التوبة ، الاية :74

ٹھہرے اور ان کا کوئی معین و مددگار نہ ہو اور شیعہ اس پر متفق ہیں کہ جناب ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے اس نفاق سے توبہ نہیں کی تو آیت کی رو سے ان کو دنیا میں عذاب علیم پہنچنا چاہیے اور ان کا کوئی حامی و ناصر بھی میسر نہ ہونا چاہیے مگر ان کی پوری زندگی آئینہ کی مانند سامنے ہے انہیں کوئی عذاب نہیں پہنچا رہا حمایت و نصرت کا معاملہ تو ان حضرات کو جو حمایت پر نصرت میسر رہی اس سے کوئی شیعوں کی طرح اندھا ہی انکار کر سکتا ہے اور تاریخ کو جھٹلا سکتا ہے اب ایک طرف کتاب اللہ ہے دوسری طرف شیعہ!

پوری امت اس پر متفق ہے کہ کتاب اللہ میں جھوٹ کو مطلق دخل نہیں اس کے اندر تو جھوٹ کیا ہوتا کوئی باہر سے بھی اس میں جھوٹ داخل نہیں کر سکتا دوسری امت مسلمہ اس پر بھی متفق ہے کہ شیعہ جھوٹ بولنے جھوٹ گھڑنے اور جھوٹ منسوب کرنے میں عالمگیر شہرت کے مالک ہیں لہذا معلوم ہوا کہ یہاں بھی شیعوں نے جھوٹ بولا حضرات شیخین رضی اللہ عنہما اصحاب عقبہ میں سے نہیں ہیں۔

ہفوہ نمبر 4: امام کا وجود محض لطف ہوتا ہے

یہ کہ امام کے محض وجود کو لطف قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالی نے امام مقرر فرما کر لطف کا حق ادا فرما دیا،[1] اب اس کو ظاہر کر کے تسلط اور غلبہ دینا یہ لطف کے لیے بالکل ضروری نہیں یہ اتنی کچی بات ہے کہ اس پر ہوش مند تو کیا مکتب کے بچے بھی یقین کرنے کو تیار نہ ہوں گے ذرا کسی مدرسہ کے لڑکوں کو کہیے کہ تمہارے لیے ایک ایسے استاد کا انتظام کیا گیا ہے جس کو نہ تم دیکھ سکتے ہو نہ اس کی آواز سن سکتے ہو اور نہ ہی وہ تم کو دیکھ سکتا ہے نہ ہی تمہاری آواز سن سکتا ہے پھر جو رد عمل ہو گا آپ کو پتہ ہی چل جائے گا۔

ہفوہ نمبر 5: سیدنا علی کو اوصاف خدائی سے متصف کرتے ہیں

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اوصاف خدائی سے متصف کرتے اور کہتے ہیں کہ آپ اعراض این و متی سے پاک ہیں یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کو بشر نہیں کہنا چاہیے یہ امور وضاحت عقلی کے صاف و صریح خلاف اور اس کو

1۔الإمام لطف فيجب نصبه على الله تعالى تحصيلا للغرض.(كشف المراد في شرح تجريد الاعتقاد، للطوسي، المقصد الخامس في الإمامة، ص:388، ط: انتشارات شكوری)

بھی گویا علی رضی اللہ عنہ کو روز جزا کا مالک قرار دیتے ہیں[1] یہ پہلے بھی باب مکائد میں بیان ہو چکا ہے عنقریب پھر بیان ہو گا۔

5۔ وكان الكافر على ربه ظهيرا یعنی کافر اپنے پروردگار پر دلیر ہے کی تفسیر "اي في اخذ الخلافة" یعنی خلافت لینے میں کرتے ہیں حالانکہ یہاں کافر سے مراد بت پرست ہیں اس سے پہلے کہ عبارت اس کی دلیل ہے فرمایا" ويعبدون من دون الله ما لا ينفعوهم ولا يضرهم "اور اللہ کے سوا ایسی ہستیوں کی پوجا کرتے ہیں جو نہ ان کو فائدہ پہنچا سکتی ہیں نہ نقصان۔

6۔ یہ بھی کہتے ہیں "لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ"[2] سے مراد "شركة في الخلافه مع علي غيره" یعنی تم خلافت میں علی کے غیر کو شریک کرتے ہو، اس لیے تمہارے اعمال جت وضائع ہو جائیں گے لیکن ان کو اتنا معلوم نہیں کہ اس آیت کا کچھ اول بھی ہے "ولقد اوحي اليك والى الذين من قبلك" آپ کی طرف اور جو آپ سے قبل گزرے وحی بھیجی گئی کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے اعمال ضائع و بیکار جائیں گے، اس میں خلافت علیم غیر کی شرکت کہاں گھس آئی کہ اس سے نہیں ہو اور اگر نہیں تھی ہی تو پھر دوسروں کو خلیفہ کیوں کیا اور اگر صرف ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا حال تمام انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی پہنچا تھا تو اس منادی کی کیا ضرورت تھی پھر آیت کا سیاق "بل الله فاعبد وكم من الشاكرين" ہے اور سباق "قل افغير الله تامروني ايها الجاهلون" اور یہ سیاق وسباق کی دونوں ایات صاف بتا رہی ہیں کہ شرک سے مراد غیر اللہ کی عبادت ہے اور یہ قاعدہ اصول شیعوں کے ہاں بھی طے کردہ و تسلیم شدہ ہے کہ شارع کے کلام میں جب کوئی لفظ آئے تو شرعی معنی پر محمول ہو گا لغوی معنی پر نہیں ہو گا خصوصا جبکہ لغوی معنی ضمیر کا بھی محتاج ہو جس کا کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔

7۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ آیت " وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا بِآيَاتِنَا أَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا

1۔ روي أن درجة أمير المؤمنين (عليه السلام) في الجنة دون النبي (صلى الله عليه وآله وسلم) بدرجة----- والأنبياء والرسل دونهم على الدرجات۔ (المحتضر للحلي، ص: 47، ط: انتشارات المكتبة الحيدرية)

2۔ سورة الزمر، الآية: 65

الْغَالِبُونَ "(1) میں سلطان سے مراد جناب علی رضی اللہ عنہ کی صورت ہے یعنی جب فرعون حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو کوئی اذیت پہنچانا چاہتا فوراً اسے علی رضی اللہ عنہ کی صورت دکھادی جاتی وہ سہم کر رہ جاتا حالانکہ قرآن مجید میں غلبہ کو آیات سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور آیات جمع کا صیغہ ہے کم از کم دو آیات تو ہونی چاہیے اور صورت علی تو ایک ہی آیت ہوگی اگر ہوئی بھی تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایات کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جہاں کہیں ان کا قصہ بیان فرمایا ہے وہی معجزات پر اکتفا فرمایا ہے عصا اور ید بیضاء جیسا سورہ طہٰ میں مذکور ہے تو آسان نشانی کا ذکر اور اہم و بڑی نشانی کو نشانیوں کے شمار میں نظر انداز کر دینا شان بلاغت کے خلاف ہے، اور پھر یہ کیا بات ہوئی کہ فرعون تو صرف آپ کی تصویر سے سہم اور ڈر جاتا تھا مگر جناب ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما پر آپ کے جیتے جاگتے جس میں حقیقی نے اتنا بھی اثر نہ کیا کہ اس کے دیکھنے سے ان کے مزاج میں کچھ نرمی ہی آجاتی۔

8۔ یہ کہتے ہیں کہ "یا ایتھا النفس المطمئنة" میں رب سے مراد علی ہیں۔

9۔ یہ قائل ہیں کہ "لَا يُسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ" میں انس و جن سے علی کے شیعہ مراد ہیں کیونکہ ان سے کسی گناہ کے بارے میں سوال نہیں ہوگا علی کی ولایت ان کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دے گی اور جب گناہ رہے ہی نہیں تو سوال کس بات کا ہوگا ابن بابویہ، ابن طاؤس اور دوسروں نے اس کو بیان کیا ہے مگر یہ عالم و فاضل ایک تو یہ بات نہیں سمجھ پائے کہ سیاق نفی میں انس و جان نکرہ ہے اور وہ عام الفاظ میں سے ہیں ان سے شیعان علی کی تخصیص کے کوئی بنیاد اور وجہ نہیں دوسرے یہ کہ کیا شیعہ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ اپنی محرمات سے زنا اور اپنے لخت جگر یا شریک دودھ سے اغلام بازی کر کے نیز ساری زندگی شراب نوشی خنزیر خوری اور سود کاری جھوٹ بغیبت میں گزارنے کے باوجود فرش سے نہ صرف محفوظ رہیں گے بلکہ اعمال بد ان کے لیے نماز روزہ و دیگر عبادات و اعمال صالحہ کی طرح موجب اجر و ثواب بھی ہوں گے اگر وہ ایسا ہی خیال کرتے ہیں تو یہ تو اباحیوں اور زندیقیوں کا مذہب ہوا بلکہ ان سے بھی دو قدم اگے کیونکہ وہ لوگ ان امور کو مباح خیال کر کے

1۔ سورة القصص، الآية: 35

ان کے ارتکاب پر عذاب کا خوف نہیں رکھتے اور یہ شیعہ تو عذاب کے خوف سے ہی مامون نہیں بلکہ ان خباثتوں اور نجاستوں اور بداعمالیوں پر اجر و ثواب کی امید رکھتے اور ان بدکاریوں کو عبادت جانتے ہیں۔

10۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں صبر کا حکم اور صابرین کی تعریف بیان ہوئی ہے ان سب سے مراد شیعہ اور ان کا وہ صبر مراد ہے جو یہ جناب مہدی کے آنے تک مخالفین کے ہاتھوں تکلیفیں اور مصائب اٹھائیں گے۔

ان مذکورہ تفاسیر سے اگر کوئی شیعہ انکار کرے تو اسے یہ تفسیریں شیعوں کی اصول کتب کلینی میں موجود ملیں گی، وہاں وہ دیکھ سکتا ہے اس کے علاوہ ان کو تفسیر علی بن ابراہیم اور تفسیر ابن بابویہ جن کو یہ جناب حسن عسکری رحمہ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرتا ہے نیز شریف مرتضیٰ کی کتاب تنزیہ الانبیاء والائمہ کے مطالعہ کی اگر توفیق مل جائے تو وہاں یہ سارے حوالے ان کو موجود ملیں گے۔[1]

ہفوہ نمبر 8: روز جزا کے مالک وہ حاکم جناب علی رضی اللہ عنہ ہوں گے

یہ کہ روز جزا کے مالک وہ حاکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب علی ہوں گے اس خیال خام کی تردید قرآن مجید میں جابجا ملتی ہے "مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ،[2] لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ"[3] وغیرہ وغیرہ اس کی مثالیں ہیں اگر یہ حضرات حاکم ہوں تو شفاعت بے معنی ہو جائے گی امت کو پھر خوف و خطر کیوں ہو گا اور یہ حضرات خود ان کو کیوں ڈرائیں گے ایک بات لائق توجہ یہ بھی ہے کہ ان شیعوں کے نزدیک حساب کتاب وزن اعمال سوال وغیرہ جو روز قیامت کی ہولناکیاں ہے شیعوں کو تو ان سے سابقہ پیش ہی نہیں آئے گا یہ سب تو غیر شیعوں کے لیے مخصوص ہیں وہ تو برملا کہتے ہیں کہ علی کو دوست رکھنے والا خواہ یہودی ہو خواہ نصرانی یا ہندو مشرک دوزخ میں نہیں جائے گا۔

1۔ شیعہ عالم دین "میرزا حسین النوری الطبرسی" نے "فصل الخطاب فی تحریف کتاب رب الأرباب" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں تحریف کی تمام اقسام کو مختلف ابواب اور فصول میں تفصیلاً بیان کیا ہے مذکورہ جزئیات اور مزید تفصیل کے لئے اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔

2۔ سورة الفاتحة ،الآية: 3

3۔ سورة غافر ،الآية: 16

علل الشرائع ابن بابویہ کی ایک کتاب ہے اس نے اس میں یہی بات لکھی ہے اس نے اس روایت کو بحوالہ مفضل بن عمر جناب ابی عبد اللہ سے منسوب کیا ہے معانی الاخبار میں بھی یہ روایت موجود ہے اور شیعہ اعتقاداً اس مسئلہ کو متواتر سمجھتے ہیں اس صورت میں حب علی کے مقابلہ میں نہ خدا اور رسول پر ایمان کی کوئی حیثیت ہے نہ تمام عقائد اور تکلیفات کی ضرورت اور تمام حدود اور ساری تعزیرات ساقط اور ختم ہو جاتے اور امور شریعت میں کوئی شرعی امر ضروری نہیں رہتا۔(1)

یہ ہفوہ بے شمار فسادات کی بنیاد اور اصل ہے ایسے ہفوات پر اعتقاد رکھنے کے بعد تو اثناء عشریوں کو چاہیے کہ اپنے مذہب کو حمیریہ معمریہ کہا کریں کہ اعتقادات کی ہم رنگی کا یہی تقاضہ ہے۔

ہفوہ نمبر 9: جناب عمر رضی اللہ عنہ نے جناب علی رضی اللہ عنہ کو حیلوں بہانوں سے قتل کرنا چاہا

کہتے ہیں کہ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حیلوں بہانوں سے کام لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا چاہا چنانچہ علی بن مظاہر واسطی نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت بھی بیان کر ڈالی ہے حالانکہ جناب فاروق اعظم کا حضرت علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ خصوصی لگاؤ، دلی محبت، عزت واحترام اور توقیر، سسرال ہو جانے پر فخر، عطایا کہ رجسٹر میں آپ کی اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی فضیلت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کے فضائل کی روایات خود ان شیعوں کے ہاں بتواتر ثابت ہیں اور نہج البلاغہ کے شارحین جو اکثر شیعہ ہیں ان سب کو اپنی شرحوں میں لکھا ہے، اور شریف مرتضیٰ شیعی کی کتاب تنزیہ الانبیاء والائمہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تعریف ان الفاظ میں موجود ہے:

ان عمر كان مظهرا للاسلام والمتمسك بشرائعه كلها (2)

1۔ حب علي حسنة لا تضر معها سيئة(علل الشرائع ، باب العلة التي من أجلها سمي أمير المؤمنين عليا عليه السلام ، 1/ 13 ، ط: دار المرتضى بيروت و معاني الاخبار، باب معنى قول النبي ﷺ حب علي حسنة لا تضر معها سيئة، ص: 185، ط: دار المعرفة بيروت)

2۔ ذكر الشريف في الشافي: لأنه كان على ظاهر الاسلام، والتمسك بشرائعه، وإظهار الاسلام يرجع إلى الشرع فيه۔ (الشافي في الإمامة ،3/ 273، ط: مؤسسة إسماعيليان قم)

بے شک عمر اسلام کو ظاہر کرنے والے اور تمام احکام اسلام پر عمل کرنے والے تھے۔

ایسے اوصاف سے متعلق شخص کے متعلق کوئی فاتر العقل ہی یہ خیال کر سکتا ہے کہ وہ اپنے دوست مشیر دست وبازو محب اور خسر کو جو باپ کے درجے کا ہوتا ہے قتل کرنے کی تدبیر کرے گا۔

ہفوہ نمبر10: بعض صحابہ رضی اللہ عنہم پر لعنت سے ستر نیکیاں

کہتے ہیں کہ جو شخص فلاں فلاں پر ستر بار لعنت کرے تو اس کو ستر نیکیوں کا ثواب ملے گا ستر گناہ محو کر دیئے جائیں گے اور جنت کے ستر درجے اسے الاٹ کر دیئے جائیں گے چنانچہ ابو جعفر طوسی نے بحوالہ جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ مختلف روایات کے ضمن میں اس کا ذکر کیا ہے، یہ ایسا سفید جھوٹ ہے کہ سارے مذاہب وشرائع اپنے اپنے انداز میں اس کی تردید رکھتے ہیں اس لیے کہ بروں کو بھی برا کہنا کسی شریعت میں ثواب کا موجب نہیں بروں اور بدوں کا سردار شیطان ہے مگر اس کو برا کہنا بھی نیکی میں شمار نہیں ہوتا آپ صبح سے شام تک اس پر لعنت کریں گے تو بھی آپ کے نامہ اعمال میں ذرہ بھر نیکی نہیں لکھی جائے گی (اس سلسلہ میں عام مسلمانوں کے لیے عموماً اور شیعوں کے لیے خصوصاً جناب اکبر الہ آبادی مرحوم کا ایک شعر پیش کرتا ہوں شاید کسی کی آنکھ کھل جائے:

نئی ترکیب شیطان نکالی ہے یہ اغوا کی　　خدا کی حمد کیجئے ترک بس مجھ کو برا کہئے

شیعہ علماء کا ہفوہ بالا بھی شیعی عوام کے لیے شیطانی اغوا سے کم نہیں ان محترم ہستیوں پر لعنت سے ان کا تو کچھ بگڑتا نہیں البتہ شیعوں کی اپنی عاقبت یقیناً خراب ہوگی، از مترجم نعمانی)

بطریق صحیح جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ نے اپنے رفقاء کو جب اہل شام کو گالیاں بکتے سنا تو فرمایا کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ تم گالیاں بکنے والے بنو،[1] نیز حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر لعنت کو خدا کی حمد وثنا اور ذکر سے افضل کہتے ہیں چنانچہ احول کے ذریعہ متعدد طرق سے جناب صادق کی روایات ملتی ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کو اکبر فرمایا ہے "وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ"[2] مگر یہ احول وہ ہے جس نے بار بار جناب

1۔ إني أكره لكم أن تكونوا سبابين (شرح نهج البلاغة از ابن ابی الحديد، 11/ 21، ط: دار احياء الكتب العربية)

2۔ سورة العنكبوت، الاية: 45

صادق رحمہ اللہ پر جھوٹ باندھا ہے اور آپ نے اسے افترا پرداز اور جھوٹا کہا ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ شیعہ مذہب کی بنیاد ہی جھوٹ دجل اور فریب پر رکھی گئی اور وہ ہی آج تک اس کو سہارا دیئے ہوئے ہیں۔

ہفوہ نمبر 11: قتل عمر رضی اللہ عنہ سے تین دن تک نامہ اعمال نہیں لکھے گئے

یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالی نے کراما کاتبین کو یہ حکم دیا ہے کہ قتل عمر سے تین دن تک لوگوں کے نامہ اعمال نہ لکھے جائیں نہ کسی کا گناہ درج کیا جائے یہ روایت علی بن مظاہر واسطی نے احمد بن اسحاق قمی سے اس نے جناب حسن عسکری سے انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس میں حکایت اب بیان ہو رہی ہے یہ روایت افترا اور جھوٹ پر مبنی ہے،[1] اور یہ نہ صرف اس اصول شریعت کے خلاف ہے بلکہ متواتر روایات کو بھی جھٹلانے والی ہے اس روایت کو ماننے والا ذرا غور کر کے بتائے کہ ایک شخص قتل عمر کے یوم بالغ ہوا اور تین دن تک قابل تصور اور ناقابل تصور سارے ہی کبیرہ گناہ کا دھڑلے سے ارتکاب کرتا رہا جس میں محرمات کے ساتھ زنا، اغلام، شراب نوشی، قتل، بت پرستی، چوری اور جناب علی رضی اللہ عنہ کا سب وشتم سب ہی کو شامل ہے اور وہ تین دن کے میعادی وقفہ میں انتقال کر گیا اب وہ بغیر حساب جنت میں چلا جائے تو کیا روایت بالا کے مطابق درست ہوگا اگر کسی میں رمق بھر عقل اور صحیح دینداری ہوگی وہ اس روایت کے باطل ہونے پر کوئی شک نہیں کرے گا۔

ہفوہ نمبر 12: تیمی اور عدوی نام کے دو بت تھے

کہتے ہیں کہ تیمی اور عدوی نام کے دو بت تھے اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما خدا کو چھوڑ کر ان کی پوجا کیا کرتے تھے[2] ابان بن عیاش اور دوسروں نے سلیم بن قیس ہلالی سے یہ روایت کی ہے اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر یہ تہمت لگائی گئی ہے جناب فصل تعصبات میں اس ہفوہ کی برائی بیان کی گئی ہے۔

1۔ وأمرت الكرام الكاتبين أن يرفعوا القلم عن الخلق كلهم ثلاثة أيام من ذلك اليوم ولا أكتب عليهم شيئا من خطاياهم كرامة لك ولوصيك ... ». بحار الأنوار: 31/ 125.

2۔ ان تيميا وعدويا كانا صنمان يعبدان من دون الله، وان ابابكر وعمر كانا يسران بعبادتهما في بيوتهما بعد اسلامهما، وكان لهما صنمان من خشب يعبدانهما سرا.(كتاب سليم بن قيس هلالي ،ص:253، ط: انصاريان پبليكيشنز، قم)

ہفوہ نمبر13: حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطاب کے صلبی بیٹے نہ تھے

کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خطاب کے سلبی فرزند نہ تھے بلکہ ولد و زنا تھے حالانکہ اوروں کو چھوڑیے خود امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے نیز دیگر ائمہ نے سینکڑوں مرتبہ ان کو ابن الخطاب کہہ کر مخاطب کیا امہات المومنین میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہیں دوسری طرف امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا آپ کی زوجہ محترمہ ہیں گویا آپ نبی محترم کے خسر ہیں تو علی مکرم کے داماد اور حب علی کے بدبخت دعویدار اس سے بالکل نہ شرمائے کہ علی پر یہ الزام لگائیں کہ انہوں نے ولد الزنا کو داماد بنالیا۔

سارے امامیہ کا حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے نسب کے انکار پر اتفاق ہے ان کے علمائے انصاب کی کتابوں میں اس کو لکھا بھی ہے اس میں حمید الدین نخعی صاحب بحر الانساب بھی ہے اور حسن بن سلمان العذری اپنی ملتقطات میں اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔

ہفوہ نمبر14: شیخین کی ہر سال منیٰ میں رمی کی جاتی ہے

کہتے ہیں کہ ہر سال موسم حج میں فرشتے جناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو اپنی قبور سے زندہ کر کے منیٰ میں لاتے ہیں اور رمی جمار کی جگہ ان کو سولی پر چڑھاتے ہیں ابو الخضر نے اپنے باپ دادا کے حوالے سے جناب محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت بیان کی ہے، یہ ہفوہ بھی شیعی کذب و افترا کا شاہکار ہے اور ائمہ کو بدنام کرنے کی ناپاک سعی یا پھر پاگلوں کی بڑ ہے اس لیے کہ دار الجزاء تو آخرت ہے دنیا تو نہیں یہ افواہ خلاف نقل ہونے کے علاوہ عقل وحیث کے بھی خلاف ہے یہ لاکھوں حاجی ہر سال حج کے لیے منیٰ میں تین چار دن قیام کرتے ہیں ان کو کہیں نہ سولی گھڑی دکھائی دیتی ہے نہ کہیں کوئی لٹکا ہوا نظر آتا ہے آخر یہ شیعہ ذہنی سولی جس کو دیتے ہیں۔

اگر یہ کہیں کہ حجاج کو دکھانا منظور نہیں تو ہم کہیں گے کہ آخر عذاب قبر میں کون سی کمی تھی کہ فرشتے ان کو قبروں سے نکالتے اور بازار منا میں لاتے ہیں اگر حاجیوں کو عبرت دلانا اور خود ان کو اپنی تذلیل پر رسوائی سے آگاہ کرنے کا مقصد تھا اور وہ کسی نے دیکھا نہیں تو ساری تگ و دو لاحاصل عبث اور لغو ثابت ہوئی اور اللہ تعالیٰ عبث سے پاک ہے یہ بات شیعہ عقائد میں بھی تسلیم شدہ ہے۔

ہفوہ نمبر 15: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اعتماد نہیں تھا

کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سفر ہجرت میں اس لیے ساتھ لیا تھا کہ کہیں قریش مکہ کو سمت سفر سے مطلع نہ کریں کہ آپ کس طرح تشریف لے گئے۔[1] اس ہفوہ پر یہ شیعہ خود بغلیں بجانا چاہیں تو انہیں کون روک سکتا ہے ورنہ یہ اتنا ظاہر البطلان ہے کہ تردید کی متعلق حاجت نہیں اگر بات وہ ہوتی جو یہ کہتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ضرورت تھی کہ موسم گرما کی دوپہر ان کے گھر تشریف لے جاکر ارادہ ہجرت سے مطلع فرماتے اور مشورہ طلب فرماتے کہ کب وقت کس طرح نکلنا چاہیے زاد راہ اور سواری ان سے کیوں لیتے سفر کا کھانا اور ناشتہ ان کے گھر ان کی صاحبزادی سے تیار کرایا پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی کے چیلے عامر بن فہیرہ کو رہنما کی حیثیت دی سواری کے اونٹ اس کے حوالے کیے انہیں ابو بکر کے بڑے بیٹے عبد اللہ کو حالات کے تجسس اور خبر گیری کے لیے اور قریش کی تجویزوں و خبروں سے آگاہی کے لیے ہر کارا مقرر کیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے کیوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کی فکر مندی اور غم کو اور آنحضرت رضی اللہ عنہ کا ان کو معیت کا گہرا راز افشا کرتے ہوئے تسلی و دلاسا دینے کو حکایتاً بیان فرمایا "إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا"[2] اس ہفوہ سے شیعوں کی اس اندرونی کھولن کا اور بھڑکتی ہوئی آتش عداوت کا پتہ چلتا ہے جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اس عزت و فضیلت کے سبب ہے جو اپ کو اس سفر صحبت فرحا پہ میسر آئی جس کا ذکر رہتی دنیا تک قرآن مجید میں محفوظ ہو گیا وہ چاہتے ہیں ہفوے اڑا اڑا کر جھوٹ اور افتراء بازی کر کر کے اس فضیلت میں کیڑے نکالیں مگر بے سروپا محض خیالی تو کیسے تمام واقعہ اس کے پس منظر پیش منظر مالہ وماعلیہ کو یہ کیسے جھٹلا سکتے

1۔ روى القمي ونقله عنه معظم مفسريهم عن أبي عبد الله: «قال لما كان رسول الله صلى الله عليه وسلم في الغار قال لفلان [لأبي بكر]: كأني أنظر إلى سفينة جعفر في أصحابه يقوم في البحر وأنظر إلى الأنصار محتسبين في أفنيتهم، فقال فلان [أبو بكر]: وتراهم يا رسول الله؟ قال نعم، قال: فأرينهم فمسح على عينيه فرآهم فقال في نفسه: الآن صدقت أنك ساحر، فقال له رسول الله: أنت الصديق». تفسير القمي: ١/ 290

2۔ سورة التوبة: الاية: 40

ہیں اس کے تو ہر ہر رخ اور ہر ہر پہلو سے ان کے بکواس کی تردید اور ان کی ذلت میں اضافہ ہو گا "لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ"[1] ایسے ہی موقع کے لیے فرمایا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ملا عبد اللہ مشہدی مصنف اظہار الحق نے اس قصہ اور آیت کا بڑی کاوش اور باریک بینی سے جائزہ لے کر مجبوراً یہ منصفانہ رائے ظاہر کر دی ہے کہ واقعہ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ احتمال حقیقت سے بہت دور ہے اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ آپ خلیفہ اول کو اپنی رفاقت وہمراہی کے لیے چن لیں جن کو سسر ہونے کی نسبت بھی حاصل تھی اور لوگوں سے ایمان واسلام میں سبقت لے جانے کی برتری بھی آپ کو نصیب تھی اور اکثر اوقات رسالت مآب ﷺ کی صحبت میں موجود رہتے اور آنحضرت ﷺ کو ان کی صحبت سے دل بستگی محسوس ہوئی ہو، قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں اس بحث کے رکاکت کی تصریح کی ہے والحمد للہ مفسر نیشاپوری نے کہا ہے:

ثم إننا لا ننسى أن اضطجاع علي على فراشه صلى الله عليه وسلم طاعة وفضيلة، إلا أن صحبة أبي بكر أعظم، لأن الحاضر أعلى من الغائب، ولأن عليا ما تحمل المحنة إلا ليلة واحدة وأبو بكر مكث في الغار أياما، وإنما اختار عليا للنوم في فراشه لأنه كان صغيرا لم تظهر منه دعوة بالدليل والحجة وجهاد بالسيف والسنان، بخلاف أبي بكر فإنه دعا في جماعة إلى الدين، وقد ذب عن الرسول صلى الله عليه وسلم بالنفس والمال، وكان غضب الكفار على أبي بكر أشد من غضبهم على علي، ولهذا لم يقصدوا عليا بضرب وألم لما عرفوا أنه مضطجع.[2]

پھر ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ علی رضی اللہ عنہ کا آپ کے بستر پر سونا فضیلت واطاعت ہے مگر

1۔ سورۃ الانفال: الآیۃ: 8

2۔ الميزان في تفسير القرآن، 9/ 291، ط: الحوزة العلمية قم المقدسة

صحبت ابو بکر اس سے بڑھ کر ہے کیونکہ حاضر و مقابلہ غائب بلند مرتبہ ہوتا ہے اور اس لیے کہ علی نے صرف ایک رات تکلیف برداشت کی مگر ابو بکر رضی اللہ عنہ غار میں کئی دن ٹھہرے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علی کو اپنے بستر پر سونے کے لیے اس لیے انتخاب فرمایا تھا کہ آپ ابھی بچے تھے آپ نے نہ ابھی دلیل و حجت سے دعوت دینی شروع کی تھی نہ تلوار اور بھالے سے بخلاف ابو بکر کے کہ انہوں نے ایک جماعت کو دین کی طرف بلایا تھا اور جان و مال کی بازی لگا کر رسول کو بچایا تھا کفار کا غیض و غضب علی کی نسبت ابو بکر پر زیادہ تھا اسی لیے جب انہوں نے دیکھا کہ سونے والے وہ ہیں تو انہوں نے علی کو مارنے یا تکلیف پہنچانے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔

ہفوہ نمبر 16: فلاں عورت کی کھال اصحاب کہف کے کتے سے تبدیل ہو گی

یہ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن فلاں عورت کے بدن کی کھال اصحاب کہف کے کتے کی کھال سے بدل جائے گی دراصل باتوں اور روایتوں میں حسب مرضی کانٹ چھانٹ اور قطع بیونت اس فرقہ کی پرانی عادت اور شرارت ہے یہ الفاظ دراصل بلعم باعورہ کی نسبت آئے ہیں اور وہ ان کے نزدیک سزا کا سزاوار نہ قرار پایا تو روایت میں اصلاح کے طور پر تحریف و تصرف کر کے اس قسم کی روایت کی یہ ان کا پرانا پیشہ اور عادت ہے کہ یہ ان کافروں کا بھی پاس کرتے اور ان کو برائی سے یاد نہیں کرتے جن کے کفر پر اللہ اور رسول کے کلام میں صراحت وارد ہوئی ہے اور جنہوں نے اللہ و رسول سے انتہائی دشمنی اور عداوت برتی اور جن کی بدبختی اور بد انجامی پر قرآن مجید گویا ہے اور نہ ان کی بدحالی کو یہ کوئی اہمیت دیتے ہیں بلکہ ان کے بارے میں جو سزائیں وارد ہیں ان کو ان کے مرتبہ سے زیادہ جان کر خلفاء رسول اور ازواج رسول کے حق میں یہ روایت کرتے اور جذبہ کرنے کی ناپاک جسارت کرتے ہیں اور یوں قرآن و حدیث کی تحریف اور ان میں تصرف کر کے اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں اور ان کا حال اس بے وقوف کا سا ہے جس نے بعض قرآنی آیات کی اصلاح کی تھی کہ جب اس نے پڑھا "وعصی آدم ربہ" یا "وخر موسی" تو یوں اصلاح کی "وعصی موسی ربہ، وخر عیسی" اور کہنے لگا کہ عصا موسی علیہ السلام کا تھا نہ کہ آدم علیہ السلام اور خر گدھا تو عیسی علیہ السلام کا تھا نہ کہ موسی علیہ السلام کا اس ہفوہ کی تردید کے لیے قرآن کی ہی آیت کافی ہے:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا[1]

اے اہل بیت اللہ تعالی نے چاہا کہ تم سے نجاست اور گندگی دور فرما کر تم کو طاہر و مطہر کر دے۔

اور کتے کی کھال گو وہ اصحاب کہف ہی کا ہو نجس ہے یا یہ آیت "الطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ أُولَئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ"[2] یا یہ آیت" لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ"[3] جب ازواج کی تبدیلی دوسری ازواج سے بھی جائز نہ رہی تو ازواج کی تبدیلی ناپاک اور نجس کتے سے کیسے جائز ہوگی، اس ہفوہ میں ایک یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انہوں نے آیت ذیل کے مضمون کو خود اپنے اوپر کس طرح چسپاں کر لیا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُهِينًا[4] جو لوگ اللہ و رسول کو اذیت دیتے ہیں ان کے لیے دنیا و آخرت میں لعنت ہے اور ان کے لیے بڑا دردناک عذاب تیار ہے۔

اور یہ اس لعنت ہی کا اثر ہے کہ وہ یہ وعید دیکھ کر پڑھ اور سن کر بھی اسی پر ڈٹے ہوئے ہیں اور اپنے حرکات شنیعہ سے باز نہیں آئے اپنا ایمان برباد کرتے اور اللہ و رسول کو اذیت دینے والے اعمال و عقائد سے چمٹے ہوئے ہیں۔

ہفوہ نمبر 17: معصوم کے بدن سے لگنے والی مٹی کعبہ سے بھی بہتر ہے

یہ کہتے ہیں کہ زمین کا وہ حصہ جو کسی معصوم کے بدن سے چھو جائے کعبہ مکرمہ سے ہزار درجہ بہتر ہے یہ بات ان کے شیخ مقتول نے دروس میں بیان کی اور دوسروں نے اس پر نص کی ہے۔

1۔ سورۃ الاحزاب: الآیۃ: 33

2۔ سورۃ النور: الآیۃ: 26

3۔ سورۃ الاحزاب: الآیۃ: 52

4۔ سورۃ الاحزاب: الآیۃ: 52

اس ہفوہ کا باطل و غلط ہونا بالکل ظاہر ہے کیونکہ اس کو مان لینے سے لازم آئے گا کہ یہود و نصاری کے کنیسے، رہبان کے معبد، دیر، مجوس کے آتش خانے اور بتوں کے استحقاق جہاں کسی معصوم کا گزر ہوا ہو خصوصا کوفہ و صفین کے درمیان کی منزلیں کعبہ مکرمہ سے بہتر ہوں بلکہ خلفائے عباسیہ کے وہ گھر جہاں ائمہ معصوم نظر بند رہے کعبہ سے ہزار درجہ افضل ہوں اور جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا وہ گھر جہاں یزید پیدا ہوا اور جس میں ایک مرتبہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ عیادت کے لیے تشریف لے گئے کعبہ مکرمہ سے ہزار درجہ بہتر ہو تو ہے ان ہفوہ بازوں پر کہ وہ نہیں سوچتے کہ ان کی زبان و قلم سے کیا نکل رہا ہے۔

ہفوہ نمبر 18: حقیقی بادشاہ امام معصوم مہدی منتظر ہیں

ایک طرف تو یہ خود اقراری ہیں کہ صاحب امر حقیقی بادشاہ امام معصوم مہدی منتظر ہیں ان کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں کہ سزائے مقرر کرے یا سزائیں نافذ کرے لوگوں کو جھگڑے نمٹے چکائے جمعہ و جماعت قائم کرے جہاد کا حکم دے اور جو ان کی اجازت کے بغیر ان امور میں دخل دے وہ فاسق ہے اور نافرمان پھر دوسری طرف خود ہی کہتے ہیں کہ امام معصوم کی غیر موجودگی میں امور شرع اس مجتہد کی ذمہ داری ہے جو اپنے اندر نیابت تک کی شرائط رکھتا ہو یعنی جو اجتہاد کے درجہ تک پہنچا ہوا ہو اور اس کے زمانہ میں اس سے بڑا کوئی عالم نہ ہو تو وہ جہاد کے علاوہ ہر بات میں امام کا نائب ہے یہ مسئلہ امامیہ کا متفقہ اور اجماعی ہے۔

اس میں پہلی بات تو یہ کہ اہل سنت پر جو یہ طعن کرتے تھے وہ کہاں گیا کہ یہ لوگ بغیر نص کے اپنے اجماع سے رسول کا خلیفہ مقرر کرتے ہیں اور یوں دین پیغمبر میں تصرف کرتے اور دخل دیتے ہیں اب یہ کہ اس نص اور دلیل سے اپنے امام کا نائب مقرر کرتے ہیں دوسری بات قابل قباحت و خلش یہ کہ ان کے پاس وہ کون سا پیمانہ اور درایا ہے جس سے یہ معلوم کریں گے کہ شرق و غرب پوری دنیا میں موجود علمائے وقت میں کون سب سے بڑا عالم ہے عملی طور پر یہ کام جتنا مشکل و محال ہے سب پر ظاہر ہے اسی کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ ان کے وہ بعض علماء جن کے اجماع پر یہ اعتماد رکھتے ہیں اور جن کو انہوں نے اپنے ہاں امام کا درجہ دے رکھا ہے اور ان کے امر و نہی سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہیں مثلا ابن بابویہ، ابن المعلم، سید مرتضی، ابن مطہر حلی، شیخ مقتول وغیرہ وغیرہ ان کا اپنے زمانے میں سب سے زیادہ عالم ہونا کسی بھی جہت سے ثابت نہیں۔

جھٹلانے والے ہیں کسی شیعی شاعر کا ایک شعر ہے:

يجل عن الأعراض والأين والمتى ويكبر عن تشبيهه بالعناصر[1]

وہ اعراض اور این و متی سے برتر ہیں اور وہ اس سے بھی بالاتر ہیں کہ ان کو عناصر سے تشبیہ دی جائے۔

ایک دوسرا شاعر دوسرے خیال کو یوں نظم کرتا ہے:

أهل النهي عجزوا عن وصف حيدرة والعارفون بمعنى حبه تاهوا

إن أدعه بشرا، فالعقل يمنعني وأختشي الله في قولي هو الله[2]

اہل عقل حیدر کی تعریف سے عاجز رہ گئے اور عاشق ان کی محبت میں حیران ہیں اگر ان کو بشر کہوں تو مجھے عقل روکتی ہے اگر ان کو اللہ کہوں تو اللہ سے ڈرتا ہوں۔

یہ خیال و عقیدہ غالی شیعوں کے عقائد سے قریب اور کفر و زندیقیت کے سوا کچھ نہیں۔

ہفوہ نمبر 6: تمام انبیاء کو سیدنا علی کی ولایت کی پاسداری کے لیے بھیجا گیا

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کو جناب علی رضی اللہ عنہ کی ولایت کی پاسداری کے لیے بھیجا تھا وہ درپردہ تمام انبیاء کے ساتھ تھے[3] اور ظاہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور جو اس بات کا انکار کرے ان کے مذہب میں اسے کافر کہا جاتا ہے یہ بات ابن طاؤس نے اپنی کتابوں میں ذکر کی ہے۔

ابن المعلم نے جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی روایت کی ہے کہ "لو لا علي لم يخلق الانبياء"[4]

---

1 ـ شرح القصائد العلويات السبع شعر ،لابن أبي الحديد المعتزلي، ص: 128

2 ـ شجرة طوبى، لمحمد مهدي الحائري، 1/ 153، ط: المكتبة الحيدرية ومطبعتها في النجف

3 ـ قالوا: بعثنا على شهادة أن لا إله إلا الله والاقرار بنبوتك وعلى الولاية لعلي بن أبي طالب عليه السلام ـ(بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار، 35/ 155، ط: دار إحياء التراث العربي بيروت لبنان)

4 ـ ولولانا لم يخلق الله الجنة ولا النار ولا الأنبياء ولا الملائكة.(مستدرك سفينة البحار، للعلامةعلي النمازي الشاهرودي، 3/ 167، ط: مؤسسة النشر الاسلامي قم)

علی اگر نہ ہوتے تو انبیاء پیدا نہ کیے جاتے یہ بھی ان کا کہنا ہے کہ قیامت کے دن علی رضی اللہ عنہ کا درجہ سارے انبیاء اور رسولوں سے بلند ہو گا تمام انبیاء اور رسول محبت علی اور آپ کی شیعت بطور دین مانتے ہوئے تھے اور اس کی آرزو رکھتے تھے کہ ان کا حشر بحیثیت شیعہ علی ہو حتی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اس کے آرزومند تھے یہ بات ابن طاؤس نے ذکر کی ہے یہ بھی کہتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ کا حق خدا تعالی پر ثابت ہے یہ تمام ہفوات اور بکواس ساری آسمانی شرائع اور نصوص قرآنیہ کی تکذیب کرنے والے اور کفر و زندیقیت کی اصل و بنیاد ہیں۔

ہفوہ نمبر 7: قرآن کریم کی تحریف کرتے ہیں

یہ کہ قرآن مجید کی تحریف کرتے ہیں اور سیاق و سباق کے خلاف اس کو خلاف مراد معنی پر محمول کرتے ہیں حتی کہ جاہل نما عاقل اس کو نشانہ مذاق بناتا ہے اس فرقہ کی تمام تفاسیر اسی قماش کی ہیں بطور نمونہ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

1۔ صراط مستقیم کے متعلق کہتے ہیں اس سے حب علی مراد ہے۔[1]

2۔ الذین انعمت علیھم سے مراد علی و اولاد علی رضی اللہ عنہم ہیں۔[2] یہ دونوں تفسیریں نہ صرف یہ کہ نظم قرآن سے کوئی ربط نہیں رکھتی باہم بھی ایک دوسرے کی تکذیب کرتی ہیں۔

3۔ ومن الناس من یقول امنا باللہ سے مراد عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم کے نو آدمی ہیں۔[3]

4۔ جہاں کہیں لفظ ربک آیا ہے وہاں علی مراد ہے حتی کہ آیت "انھم ملاقوا ربھم وانھم الیہ راجعون" میں

1۔ وقال الله لنبيه (وانك لتهدي إلى صراط مستقيم) يعني انك لتأمر بولاية علي وتدعو إليها وعلي هو الصراط المستقيم - (تفسير القمي لأبي الحسن علي بن إبراهيم القمي، 2/ 280، ط: مكتبة آية الله الحكيم)

2۔ وفي المعاني عن النبي (صلى الله عليه وآله) الذين أنعمت عليهم شيعة علي يعني أنعمت عليهم بولاية علي بن أبي طالب لم تغضب عليهم ولم يضلوا.(تفسير الصافي، لفيض الكاشاني ، 1/ 87، ط: مكتبه الصدر طهران)

3۔ (ومن الناس من يقول آمنا بالله) فإنها نزلت في قوم منافقين أظهروا لرسول الله الاسلام وكانوا إذا رأوا الكفار قالوا " انا معكم" (تفسير القمي لأبي الحسن علي بن إبراهيم القمي،1/ 36، ط: مكتبة آية الله الحكيم)

اب دیکھنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب نیابت امام کی شرط عالم ہونا ٹھہری اور اس کا معلوم ہونا محال و مشکل ہے تو لا محالہ دو صورتیں ہوں گی یا تو احکام شرعیہ بغیر عمل معطل پڑے رہیں گے یا امام معصوم کے فرمان کے خلاف عمل ہو گا اور یہ ایسا ضبط اور آفت ہے جس سے ان کا نکلنا محال ہے۔

ہفوہ نمبر19: مخصوص وقت کے علاوہ جہاد فساد ہے

یہ کہ وقت محدود کے علاوہ دیگر اوقات میں جہاد کو فاسد اور معصیت خیال کرتے ہیں حالانکہ قران مجید اور احادیث رسول بطریق تواتر جہاد کی ہمہ وقت فضیلت پر صاف طور پر گواہ ہیں معمولی عقل والا بھی یہ کہے گا کہ وجوب جہاد کا سبب جب دشمنوں کا دفعیہ اور اسلام کا بول بالا قرار پایا تو جب تک دشمن موجود اور اعلاء کلمۃ اللہ کی ضرورت ہے جہاد جاری رہے گا ان ہر دو اسباب کے ہوتے ہوئے جہاد نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا پکے ہوئے پھوڑے سے مواد نہ نکالنا اور اعضاء رئیسہ کے کمزور ہونے کے باوجود قوت کی دوا استعمال نہ کرنا۔

ہفوہ نمبر20: یہ قرآن منزل من اللہ نہیں ہے

یہ لوگ قرآن کو منزل نہیں مانتے بلکہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا تحریف کردہ خیال کرتے ہیں یہ اپنے عقیدہ پر ہی جمے رہتے تو کسی بات پر تو ثبات و استقامت کی ان کے ہاں مثال مل جاتی اس عقیدہ کے باوجود یہ خود ہی اپنے ائمہ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ وہ اسی قرآن کو نمازوں میں پڑھا کرتے تھے اور بنیت ثواب اسی قرآن کی تلاوت فرماتے تھے اس کی آیات کو احکام شرعیہ کے لیے دلیل ٹھہراتے تھے۔

غضب بالائے غضب یہ کہ ان کے پاس بھی قرآن منزل موجود نہیں اور سارے امامیہ اسی تحریف شدہ کلام اللہ کی تلاوت کرتے اور اپنے مردوں کو اسی کا ایصال ثواب کرتے ہیں اگر وہ عقیدہ ہے تو یہ خلاف عقیدہ لغو حرکت کیوں!

ہفوہ نمبر21: دابۃ الارض سے مراد حضرت علی ہے

یہ کہتے ہیں کہ دابۃ الارض سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں اللہ انہیں جہنم رسید کرے کتنے بے ادب ہیں آیت " وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا

لَا يُوقِنُونَ"[1] کی تفسیر کولینی نے یہی بیان کی ہے اور افترا و تہمت کے لیے جناب جعفر صادق علیہ السلام کا کندھا تلاش کیا ہے اور ان کے حوالہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ کہلوایا" أنا الدابة التي تكلم الناس "[2] میں ہی وہ زمینی چوپایا ہوں جو لوگوں سے باتیں کرتا ہے، حالانکہ قرآن مجید میں صاف طور پر مذکور ہے کہ دابۃ الارض کے خروج کا وقت قرب قیامت کا زمانہ ہے اور لوگوں پر ہلاکت و مصائب ٹوٹ پڑنے کا وقت ہے اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کا زمانہ اس سے سینکڑوں سال مقدم ہے اور آپ کی واپسی کا زمانہ بمطابق عقیدہ امامیہ امام مہدی کا وقت ہے اور ابھی تو قیامت میں عرصہ دراز کا بعد ہے۔

ہفوہ نمبر 22: شرم گاہوں کو حلال جاننا

اپنی لونڈیوں کنیزوں اور بیویوں کی شرمگاہوں کو مہمانوں دوستوں کو بحق کے دوستی و میزبانی بطور عاریت سپرد کرنا بہترین عبادت خیال کرتے اور اونچے درجے کی اطاعت جانتے ہیں[3] اور اس پر اجر جزیل کی روایت بھی بیان کرتے ہیں رقعہ مزورہ کے مصنف نے حضرت صاحب الزمان سے رقعہ نقل کیا ہے جس کے پڑھنے سے ہر شریف مسلمان کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور سر ندامت سے جھک جاتے ہیں مگر اس طائفہ ملعونہ کی بے حیائی اور ڈھٹائی ملاحظہ ہو کے اس قدر گندے اور شرافت و پاک بازی سے عار خیالات ایسے نفوس قدسیہ عالی مرتبت حضرات کی طرف منسوب کرتے اور ذرا نہیں شرماتے۔[4]

1۔ سورۃ النمل: الآیۃ: 82

2۔ الكافي: 1/ 197؛ تفسير القمي: 2/ 130؛ الصفار، بصائر الدرجات: ص 199.

3۔عن محمد بن مسلم عن أبي جعفر عليه السلام قال: قلت له: الرجل يكون له المملوكة فيحلها لأخيه؟ قال: نعم لا بأس به، له ما أحل له منها. وفي رواية أخرى :خدمتها لنا وفرجها لكم حلال.(تهذيب الاحكام، باب الزيادات في فقه النكاح ، 7/ 241، ط: دار الكتب الاسلاميه، تهران)

4۔عن أبي العباس البقباق قال سأل رجل أبا عبد الله عليه السلام ونحن عنده عن عارية الفرج فقال حرام ثم مكث قليلا ثم قال لكن لا بأس بأن يحل الرجل الجارية لأخيه.(جامع أحاديث الشيعة، 21/ 155، ط: المطبعة المهر قم)

مفوہ نمبر 23: متعہ بہترین اور افضل عبادت ہے

یہ عورتوں کے متعہ کو بہترین عبادت اور افضل اطاعت خیال کرتے ہیں تفسیر فتح اللہ میں آیت "فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً"[1] کے ذیل میں بحوالہ ابن باب وح جناب جعفر صادق علیہ السلام سے یہ روایت مذکور ہے کہ کوئی خالصتاً وجہ اللہ کسی عورت سے متعہ کرے تو اس سے جو بات یا اس کے ساتھ جو حرکت بھی کرے اس پر اللہ تعالیٰ اسے ایک نیکی عطا فرمائیں گے اور اگر اس سے ہمبستری کریں تو حق عزاسمہ اس کے تمام گناہ معاف فرمادے گا اور جب غسل کرے گا تو ہر ہر بال کے عوض جس پر پانی بہے اس کی مغفرت کرے اور رحمت برسائے گا،[2] لہٰذا اس روایت کے بھی انسان کے لیے عمر بھر میں ایک مرتبہ متعہ کرنا گناہوں کی معافی کے لیے کافی ہے، تفسیر مذکور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک روایت بھی بیان کی گئی ہے کہ جو دنیا سے بغیر متعہ کیے چلا گیا ہو تو قیامت میں بگڑی صورت اور کریہہ المنظر بنا ہوا اٹھے گا اس شخص کی طرح جس کی ناک کاٹ دی گئی ہو۔[3]

معاذ اللہ ثم معاذ اللہ کیا اس روایت کی رو سے انبیاء کرام علیہم السلام پر اور ائمہ رحمہم اللہ جنہوں نے بالاجماع مت نہیں کیا زد نہیں پڑتی اور کیا وہ اس ذلت میں گرفتار قرار نہیں پاتے اسی تفسیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب یہ روایت بھی ہے کہ آپ نے فرمایا جو ایک بار متعہ کرے اس کا درجہ حسین کے برابر ہو گا جو دو مرتبہ متعہ کرے اس کا درجہ حسن کے درجہ کے برابر ہو گا اور جو تین مرتبہ متعہ کرے اس کا درجہ علی جیسا ہو اور جو چار مرتبہ متعہ

1۔ سورۃ النساء: الآیۃ: 24

2۔ عن صالح بن عقبة، عن أبيه، عن أبي جعفر (عليه السلام) قال: قلت: للمتمتع ثواب؟ قال: إن كان يريد بذلك وجه الله تعالى وخلافا على من أنكرها لم يكلمها كلمة إلا كتب الله له بها حسنة، ولم يمد يده إليها إلا كتب الله له حسنة، فإذا دنا منها غفر الله له بذلك ذنبا، فإذا اغتسل غفر الله له بقدر ما مر من الماء على شعره، قلت: بعدد الشعر؟ قال: بعدد الشعر. (وسائل الشيعة إلى تحصيل مسائل الشريعة، 21/ 13، ط: مؤسسة آل البيت عليه السلام لإحياء التراث)

3۔ عن هشام بن سالم، عن أبي عبد الله (عليه السلام) قال: يستحب للرجل أن يتزوج المتعة وما أحب للرجل منكم أن يخرج من الدنيا حتى يتزوج المتعة ولو مرة. (المرجع السابق، 21/ 14)

کرے اس کا درجہ محمد ﷺ جیسا ہو۔(1) یہ حدیث تو ان ایمان فروشوں کے لئے [illegible] [illegible] اور متعہ پر [illegible] [illegible] [illegible]

اسی قسم میں جناب ملا [illegible] [illegible] ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ [illegible] رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں [illegible] [illegible] فرمایا اس کے بعد فرمایا جو مرد [illegible] اللہ تعالیٰ کی طرف سے [illegible] ایک متعہ کرنے [illegible] جو مومن عورت سے متعہ کرتا ہے متعہ سے پہلے [illegible] اللہ تعالیٰ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] حاصل ہوتا ہے [illegible] [illegible] میں [illegible] کی مخالفت [illegible] [illegible] مخالفت [illegible] سے [illegible] کی مخالفت [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] خدا کی رحمت [illegible] کی مخالفت [illegible] [illegible] کی نعمت کا انکار کیا اور خدا کی مخالفت کی اور جو خدا کی مخالفت کرے وہ معذب ہوگا۔

جو ایماندار دنیا میں ایک بار متعہ کرے گا [illegible] جب عورت اپنے مرد متعہ کے پاس بیٹھتی ہے تو فرشتہ ان پر اترتا ہے اور جب تک اپنی نشست بدلتے انکی ان کی حفاظت کرتے ہیں [illegible] جو بات کرتے ہیں وہ ذکر و تسبیح کا حکم رکھتی ہے اور جب ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتے ہیں تو ان کے گناہ انگلیوں کے پوروں سے جھڑ جاتے ہیں اور جب بوس و کنار کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہر بوسے کے عوض ایک حج و عمرہ کا ثواب لکھتا ہے اور [illegible] [illegible] اور جب اٹھ کر غسل میں مشغول ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے کہتا ہے کہ میرے ان دونوں بندوں کو دیکھو کہ اٹھ کر غسل کرنے لگے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ میں ان کا

1۔ من تمتع مرة كانت درجته كدرجة الحسين، ومن تمتع مرتين فدرجته كدرجة الحسن، ومن تمتع ثلاث مرات كانت درجته كدرجة علي بن أبي طالب، ومن تمتع أربع مرات فدرجته كدرجتي (تفسير منهج الصادقين، ص 356، لمصنفه محمد الملا الكاشاني)

پروردگار ہوں تم گواہ رہو کہ میں نے ان کے گناہ معاف کیے ان کے بدن کے جس بال پر پانی گرتا ہے حق تعالی ہر بال کے عوض ایک نیکی لکھتا اور ایک گناہ معاف کرتا ہے اور دس درجے بلند کرتا ہے اس پر حضرت علی علیہ السلام اٹھے اور عرض کیا یارسول اللہ اس بارے میں جو صرف کوشش کرے اس کا کیا درجہ ہے فرمایا وہی جو مرد متمتع عورت متمتعہ کا ہے اس کے بعد فرمایا اے علی جب یہ دونوں غسل سے فارغ ہوتے ہیں تو جو قطرہ ان کے بدن سے گرتا ہے اس سے اللہ تعالی ایک فرشتہ پیدا کرتا ہے جو اللہ تعالی کی تسبیح و تقدیس میں مشغول ہو جاتا ہے اور قیامت تک اس کا ثواب غسل کرنے والے کے نامہ اعمال میں لکھا جاتا ہے اے علی جو اسے سنت کو حقیر جانے اور اسے زندہ نہ کرے وہ میرے شیعہ میں سے نہیں ہے میں اس سے بیزار ہوں گا۔[1]

اب ان روایات پر غور کر لیجئے کہ اہتمام شرائع و ادیان سے کس قدر مخالف ہیں نکاح جو بالاتفاق انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اس کو کسی نے گناہ معاف ہونے اور درجات بڑھنے کا ثواب نہیں بتایا پس حرکت فاحشہ کی کیا ہے حیثیت کسی بھی دین و آئین میں شہوت رانی اور نفس کی خواہش پوری کرنے کو اس قدر ثواب تو کیا بلکہ اس کے عشر عشیر کا سبب بھی نہیں ٹھہرایا ایسی حرام کاری کو وہی دین و آئین اپنے دامن میں جگہ دے سکتا ہے جس میں خدا کے دشمنوں کے ساتھ جہاد اور رمضان کی راتوں میں شب بیداری جس کی قرآن میں تعریف آ چکی ہو سب سے بڑی معصیت اور گناہ کبیرہ ہو مگر بصورت متعہ حرام کاری میں شب بیداری وہ عبادت ہو کے ایک بار کرنے سے درجہ امامت اور چار بار کرنے سے درجہ نبوت پر فائز کر دے کتنے افسوس کی بات ہے کہ قرآن مجید جو محض ثواب کے اسباب بتانے اور لوگوں کو جنت میں پہنچنے کا راستہ بتانے کے لیے نازل ہوا وہ تو اس سب سے بڑی عبادت کی بو باس اور محاسن سے یکسر خالی ہے اس میں اس سہل اور آسان راستہ کی ہوا تک نہیں لگنے دی اور انبیاء و ائمہ کے درجات تک پہنچنے کا راستہ نامعلوم ہی رہا۔

اگرچہ ضعیف من گھڑت اور واہی تباہی روایات ابن بابویہ کی تھیلی یا میر فتح اللہ کے پٹارے میں ثوب

1۔ عن محمد بن علي الهمداني، عن رجل سماه عن أبي عبد الله (عليه السلام) قال: ما من رجل تمتع ثم اغتسل إلا خلق الله من كل قطرة تقطر منه سبعين ملكا يستغفرون له إلى يوم القيامة ويلعنون متجنبها إلى أن تقوم الساعة.

(وسائل الشيعة إلى تحصيل مسائل الشريعة، 21/ 16، ط: مؤسسة آل البيت عليه السلام لإحياء التراث)

ناپاک کی طرح چھپی پڑی ہوں اور کسی نے ان پر یقین نہ کیا تو پھر اس میں لطف واحسان الٰہی کیا رہا ایسے عمدہ و دلچسپ مضمون کو تو ایک بار نہیں بار بار قرآن مجید میں لانا چاہیے تھا اور نماز روزہ حج زکوۃ وجہاد جیسی اہمیت کے ساتھ بیان کرنا چاہیے تھا تاکہ خاص اس سے واقف ہوتے مکتب کا ہر بچہ اس کو پڑھتا اور تواتر و شہرت کی حد تک وہ پہنچتا بہرحال ان کے نزدیک جب متعہ ہے ایک بڑی عبادت ٹھہرا تو انہوں نے اس میں وسعت بھی دی تاکہ کوئی آدمی کسی بھی وقت کسی بھی جگہ اس کے ثواب سے محروم نہ رہے وہ وسعت کیا ہے ملاحظہ فرمایئے:

علی بن احمد، ہیئتی فرقہ امامیہ کا چوٹی کا عالم کربلائے معلی کی جامع مسجد کا امام اور خطیب بھی تھا اس کا شمار ان کے واجب الاطاعت مجتہدین میں ہوتا تھا اس نے اور ان کے دوسرے عالم ہونے کہا ہے امامیہ کے نزدیک بالاتفاق متعہ دوریہ جائز ہے اور وہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی رات ایک عورت چند مردوں سے گھڑی دو گھڑی کے لیے متعہ کر سکتی ہے اور باری باری سب کو نمٹا سکتی ہے۔[1] اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ہم امامیوں کے نزدیک زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ خاوند والی عورت سے بھی متعہ جائز ہے وجبکہ ان کے خاوند سنی المذہب ہوں اس لیے کہ ہمارے نزدیک اہل سنت کا نکاح صحیح نہیں یوں ان کی عورتیں نکاح کے باوجود بغیر خاوند والی ہیں اور ایسی عورتوں سے متعہ بالاجماع جائز ہے بلکہ یہ تو کہتے ہیں کہ ہندو اور مجوسی عورت سے بھی متعہ جائز ہے بشرطیکہ وہ زبان سے لا الہ الا اللہ کہہ دے چاہے اس کے دل میں ان الفاظ کے کوئی معنی و مفہوم نہ ہوں۔

خاتمہ باب خلاصہ حساب

واضح رہے کہ خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک امت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی مذہب پر برقرار و متحد و متفق تھی بانیان قتل اور قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک بڑے دور رس سازشی منصوبہ کی داغ بیل ڈالی اور حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اس کی مرضی کے خلاف ایک نئے شیعی مذہب کو وجود میں لے آیا گیا جو ہر لحاظ سے مسلمانوں سے الگ ایک مستقل مذہب ہے اس لیے کلمہ سے لے کر قبر کے گڑھے میں دفن

1۔ وهناك نوع آخر أخبث من هذا يسمى عندهم بالمتعة الدورية وهي أن يحوز جماعة امرأة فيتمتع بها. (الغدير، 3/ 306، ط: دار الكتاب العربي بيروت لبنان)

ہونے تک کوئی شرعی مسئلہ ایسا نہیں جو اہل سنت سے موافق ہو اگر نادانستگی میں اس کی موافقت کسی وقت ظاہر بھی ہو جائے تب بھی دانستہ اور جان بوجھ کر یہ ہمیشہ مذہب اہل سنت کے مخالف ہی رہے ہیں جب صورت حال یہ ہو تو ہر دو جماعت میں سے ہر ایک کی حقانیت کو پرکھنے کے لیے کوئی معیار ہونا چاہیے اور وہ معیار کتاب اللہ اور اقوال عطرت رسول ہیں اب ہمیں چاہیے کہ یہ دیکھیں کہ یہ معیار کے مطابق کون سا مذہب کافروں کے مذہب کے مشابہ ہے اور کون سا مذہب کافروں کے مذہب کے منافی اور بالکل اس کا الٹ ہے کیونکہ کافروں کے متعلق دونوں جماعتوں کا یہ اجماعی اور متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ لعنت و گمراہی میں گرفتار ہیں اس پرکھ کی ضرورت اس لیے بھی اہم ہے کہ دونوں جماعتوں کے اختلاف کے وقت ایک دوسرے کی روایات کو قبول نہیں کیا جاتا لہٰذا کتاب اللہ اور اقوال عترت رسول جس مذہب کی حقیقت کی گواہی دیں گی ہمارے نزدیک وہی مذہب حق ہوگا اور اس کے مقابل مذہب کو ہم باطل سمجھیں گے اور جو آئین کفر و شرک کو اور ان کے مذہب سے ملتا جلتا اور مشابہ ہوگا اس کو ہم مذہب باطل سمجھیں گے اور اس کے مقابل کو مذہب حق۔

لہٰذا ہم اول قرآن مجید کو سامنے لاتے ہیں کہ اس میں بہت سی آیات ہیں جو مذہب اہل سنت کی حقیت ثابت کرتی ہیں مگر ہم تبرکاً ان کے بارہ ائمہ کے عدد کے موافق بارہ آیات قرآنیہ بیان کرتے ہیں:

مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ[1]

محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھ والے اصحاب جو ہیں وہ کافروں پر سخت گیر مگر باہم بہت نرم دل ہیں تم انہیں رکوع و سجود میں اللہ تعالیٰ کا فضل و رضا طلب کرتے ہوئے پاؤ گے ان کی پیشانیوں پر سجدوں کے نشان ثبت ہیں۔

اس آیت کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ محمد ﷺ کے اصحاب کا دین دراصل دین حق ہے اس لیے کہ ممدوح کا موافق بھی ممدوح ہوتا ہے۔

1۔ سورۃ الفتح : الآیۃ: 36

وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ[1]

اور ان کے بعد آنے والے کہتے ہیں اے پروردگار ہم کو اور ہمارے سابق الایمان بھائیوں کو بخش دے اور ایمان والوں کے خلاف ہمارے دلوں میں کینہ پیدا نہ کر اے ہمارے رب تو مہربان ورحم والا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا مذہب حق ان لوگوں کا ہے جو کسی مومن کے خلاف دل میں کینہ نہیں رکھتے اور اپنے سے پہلے ایمان لانے والوں کے لیے خدا سے مغفرت طلب کرتے ہیں اور یہ صحابہ کرام اور امہات المومنین رضی اللہ عنہم ہیں کیونکہ اس آیت سے پہلے مہاجرین وانصار کا ذکر ہے۔

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا[2]

جس کے لیے سیدھی راہ کھل گئی ہو اس کے بعد بھی وہ رسول کی مخالفت کرتا اور مومنوں کے راستے کے علاوہ دوسرے راستہ پر چل پڑتا ہے وہ اپنے کیے کو خود ہی بھگتے گا اور ہم اسے دوزخ کے حوالہ کردیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

آیت سے معلوم ہوا مومنوں کے خلاف راستہ اختیار کرنے والا مستحق کے دوزخ ہے اس آیت کے نزول کے وقت مومنین صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی تھے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ

1۔ سورة الحشر : الاية: 10

2۔ سورة النساء : الاية: 115

مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ[1]

جو ایمان لا کر نیک کام کریں گے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں اقتدار دے گا جس طرح ان سے پہلوں کو اقتدار دیا اور ان کے لیے جو دین پسند کیا ہے ان کے لیے اسے تمکن عطا فرمائے گا ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا اور وہ میری ہی بندگی کرتے ہیں میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے اس کے بعد اگر کوئی کفر کرے تو وہی فاسق ہیں۔

آیت بالا سے معلوم ہوا کہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں جس دین نے تمکن استحکام اور مضبوطی حاصل کی خدا کا پسندیدہ دین وہی تھا، اور وہ دین جس کا اس وقت وجود ہی نہ تھا یا اگر تھا تو چھ منافقوں، سازشیوں، اور شورش پسند قاتلوں کے دلوں میں ان کی سازشوں اور نفاق کے ساتھ مخفی و پوشیدہ تھا وہ اللہ کا پسندیدہ دین نہیں، اور خدا کے پسندیدہ دین کے مخالف اور اسلامی اقتدار کی نعمت کی ناشکری کرنے والے فاسق ہیں اور طاعت خداوندی سے خارج مثلاً رافضی، خوارج اور نواصب۔

هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ[2]

وہ وہ خدا ہے کہ جو خود اور اس کے فرشتے تم پر رحمت کا نزول کرتے ہیں تاکہ تم کو اندھیروں سے نکال کر یہ روشنی میں لے آئے۔

اس آیت کے اصل مصداق تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی ہیں مگر جس نے بھی ان کی پیروی کر لی وہ بھی گمراہی کے اندھیروں سے نکل کر ایمان کی روشنی میں آگیا، اس لیے کہ اگر کوئی رات کی اندھیریوں میں مشعل لے کر چلے تو روشنی اسے ہی میسر نہیں ہوتی اس کے قدم بقدم ہم سفر بھی اس روشنی سے مستفید ہوتے ہیں تاریکی سے وہ بھی خلاصی پا لیتے ہیں۔

1۔ سورۃ النور: الآیۃ: 55

2۔ سورۃ الاحزاب: الآیۃ: 43

فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مسلمانوں پر اپنی طمانینت وسکینہ نازل فرمایااور پرہیز گاری کی بات پر ان کو ثابت قدم رکھا(کیونکہ وہ اس کے بہت زیادہ حقدار بھی تھے اور اسکے لائق بھی)

معلوم ہوا صلح حدیبیہ کے وقت حضور ﷺ کے لیے جو سکینت اور طمانینت نازل فرمائی گئی اس میں آپ کے رفقاء اور جاں نثار اصحاب رضی اللہ عنہم بھی شریک و سہیم تھے اور اس وقت ان کے دلوں پر کلمۃ التقوی کندہ اور چسپاں کر دیا گیا تا کہ کسی وقت بھی وہ ان سے الگ نہ ہو سکے ،یہی سبب ہے کہ حضور ﷺ کے وصال کے بعد بھی ان سے خلاف تقویٰ کوئی بات صادر نہیں ہوئی اگر ایسا ہوتا تو الزام کلمۃ التقویٰ بے معنی بات ہو جاتی کہ اللہ تعالیٰ کا کندہ کلمہ بھی نشان چھوڑ گیا جب کہ کلمات رب نہ کبھی تبدیل ہوتے ہیں نہ ان کا اثر زائل ہوتا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا وہ جماعت ہی کلمہ تقوی کی زیادہ مستحق بھی تھی اور اس کی اہل بھی مستحق تو اس لیے کہ مسلمان ہی صرف وہ تھے باقی تو سارا جہان کفرستان تھا اور اہل اس لئے کہ وہ سید المرسلین ﷺ کے تربیت دادہ تھے اور یہ اس کی برکت وعظمت ہے کہ ان حضرات کو قیامت تک نجوم ہدایت قرار دیا گیا کہ جو بھی تقوی کا طالب ہو اب وہ انہی احق واہل، اصحاب نبی ﷺ کی پیروی واقتداء کرے ان کی پیروی سے جوروکش ہوا اسے تقویٰ کی ہوا بھی نہ لگی۔

لَٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ[2]

لیکن رسول اور ان کے مسلمان ساتھی کہ انہوں نے جہاد میں اپنے اموال کھپا دیئے اپنی جانیں لڑا دیں(اس لئے) بھلائیاں بھی انہیں کا حصہ ہیں اور کامیاب بھی وہی ہیں۔

1۔ سورۃ الفتح : الایۃ: 26

2۔ سورۃ التوبۃ : الایۃ: 88

ظاہر ہے کامیاب و بامراد کے جو قدم بقدم ہو گا وہ بھی کامیاب ہو گا (جس جنت میں پہنچے آپ کے اصحاب کرام انہیں متعین ہوگئی اب جو اس منزل کو حاصل کرنا چاہے مقصود کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ نعمانی)

وَلَكِنَّ اللهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُولَئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ، فَضْلًا مِنَ اللهِ وَنِعْمَةً[1] لیکن اللہ نے ان کی محبت تم کو عطا کی اور اسے تمہارے دلوں کی زینت بنایا (یعنی باوقعت) اور کفر، فسق اور نافرمانی کی نفرت تم میں پیدا کی ان کی ہدایت ورشد اللہ تعالیٰ کے فضل و نعمت کے سبب سے ہے۔

جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و احسان سے بھلا بنا کر دنیا بھر کے لئے نمونہ قرار دیا تو ظاہر ہے کہ ایسے بھلے کا تابع بھی بھلا ہو گا۔

الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ[2]

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر تمکن عطا کر دیں تو یہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کی پابندی سے ادائیگی کریں اور بھلے کاموں کا حکم دیں اور برے و ناگوار کاموں سے منع کریں۔

یہ آیت مہاجرین رضی اللہ عنہم کے حق میں نازل ہوئی، قاعدہ کے مطابق مقدم کے ساتھ تالی (تابع) کا وجود لازم ہے تاکہ کلام اللہ کے متعلق کوئی جھوٹا شبہ بھی نہ کر سکے اب یہاں مقدم کا ذکر ہو گیا اور ان کے اوصاف بھی معلوم ہو گئے لہٰذا ان کے تالی (تابع) بھی ایسے ہی ہوں گے ان کے دین حق پر ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہو گا۔

هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا

1۔ سورۃ الحجرات: الآیۃ: 7

2۔ سورۃ الحج: الآیۃ: 41

شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَى وَنِعْمَ النَّصِيرُ(1)

اس نے تم کو انتخاب کیا، تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہ رکھی یہ تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے اس نے پہلے بھی اور اس کتاب میں بھی تمہارا نام مسلمان رکھا تاکہ رسول تو تمہارے گواہ ہوں اور تم لوگوں کے پیٹ قائم کروزکوۃ ادا کرو اللہ پر مکمل اعتماد رکھو وہی تمہارا آقا ہے اور کیا بہتر آقا اور کتنا اچھا مددگار ہے۔

چنیدہ اور منتخب خدا کا تابع بھی یقینی طور پر نجات پانے والا ہوتا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ(2)

بہترین امت ہو جو لوگوں کیلیے پیدا کی گئی ہے تاکہ تم سے بھلائیوں کے کرنے کے حکم اور برائیوں سے روکنے (کی نہی کا کام لے)

امت محمد ﷺ کا نام اللہ تعالی نے خیر امت رکھا ہے اس امت کو اس نام کے علاوہ بطور طعن کسی دوسرے نام یا گالی سے یاد کرنے والا نہ تو مسلمان ہو سکتا ہے نہ خیر امت کا کوئی فرد، دوسری بات یہ امت وصف خیریت سے متصف ہے اور اس خیریت کا باعث اسکا فریضہ منصبی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نام تقیہ اخفاء ،احکام الہی میں نرمی نہیں ہے، اور نہ ایسے لوگ جو ان اوصاف سے متصف ہوں خیر امت کا حصہ ہیں۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ(3)

وہی ذات حق ہے جس نے ہدایت و دین حق کے ساتھ اپنے رسول کو مبعوث فرمایا تاکہ تمام ادیان پر اس کی فوقیت و برتری ظاہر فرمائیں۔

1۔ سورۃ الحج : الایۃ: 78

2۔ سورۃ ال عمران : الایۃ: 110

3۔ سورۃ التوبۃ: الایۃ: 33

معلوم ہوا کہ دین حق کا یہ نمایاں وصف ہے کہ وہ کھلم کھلا اور ظاہر و باہر ہو، بلی کے گو کی طرح چھپایا اور پوشیدہ رکھا جانے والا دین، ہر گز حق نہیں بلکہ سرے سے کوئی دین ہی نہیں وہ تو ہفوے بازوں کا اختراع اور گھڑا ہوا ایک عجوبہ ہے، اس آیت کے سلسلہ میں یہ بات جو یہ حضرات کہتے ہیں کہ شیعہ مذہب کے ظہور کا وقت امام مہدی کا زمانہ ہے تو ان کا یہ قول لچر و پوچ ہے اس لیے کہ لیظھرہ کا لام ارسل رسولا سے متعلق ہے لہذا رسول اللہ ﷺ کے متصل ہی اس دین کا ظہور ہو اور وہ جاری رہے اور ظاہری طور پر کوئی دین بجز اہلسنت کے جاری و زندہ نہیں۔

آیات قرآنیہ سے استدلال و ثبوت کے بعد ہم اب اقوال عترت رسول کی طرف آتے ہیں اس سلسلہ میں ہم نے روایات اہل سنت سے بالکل مدد نہیں بلکہ شیعہ کتب کی اوراق گردانی اور ان کی روایات کی چھان بین کی ہے اور ان ہی کتابوں میں خاطر خواہ کافی مواد ملا ہے ان کی کتابوں میں اہل بیت گرامی سے مروی بہت سی ایسی روایات ہیں جو بڑے واضح اور صاف انداز میں اہلسنت کے مذہب کی حقانیت اور مذہب شیعہ کے بطلان پر دلالت کرتی ہیں، ذیل کی پہلی روایت کتاب السواد والبیاض کے امامی مصنف نے اپنی مذکورہ کتاب میں درج کی ہے:

عن الامام ابي عبد الله جعفر الصادق فانه قال في تفسير قوله تعالى والسابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوهم باحسان رضي الله عنهم ورضوا عنه قال رضي الله عنهم بما كان سبق لهم من العناية والتوفيق، ورضوا عنه بما من عليهم بمتابعتهم لرسوله، وقبولهم ما جاءهم به[1]

امام ابی عبد اللہ جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اللہ تعالی کے قول والسابقون الاولون ---- ورضوا عنہ تک کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ تو ان سے یوں راضی ہوا کہ انہوں نے اس سے پہلے توفیق و مدد سے کام لیا اور وہ یوں اللہ سے راضی ہوئے کہ اس نے ان پر یہ احسان کیا کہ رسول کی متابعت اور ان کے لائے ہوئے دین کی پیروی کا موقع نصیب ہوا۔

1۔ تفسیر الثعلبي ج 10 الصفحة 262

لہٰذا معلوم ہوا کہ مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم کے تابعین کو رضوان الٰہی کا مرتبہ ومقام حاصل ہے اور بموجب نص قرآنی ورضوان من الله اكبر، اللہ کی ذراسی رضا تمام دنیاوی واخروی لذائذ ونعائم سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

2۔ انہی روایات میں سے ایک روایت صاحب الفصول کی ہے جو ایک امامی اثنا عشری مصنف ہے:

عن ابي جعفر محمد بن علي الباقر عليه السلام انه قال لجماعة فقالوا في أبي بكر وعمر وعثمان، فلما فرغوا قال لهم علي ابن الحسين: ألا تخبروني، أنتم المهاجرون الأولون الذين أخرجوا من ديارهم وأموالهم يبتغون فضلا من الله ورضوانا، وينصرون الله ورسوله أولئك هم الصادقون؟ قالوا لا، قال: فأنتم الذين تبوءوا الدار والإيمان من قبلهم يحبون من هاجر إليهم ولا يجدون في صدورهم حاجة مما أوتو ويؤثرون على أنفسهم، ولو كان بهم خصاصة، ومن يوق شح نفسه فأولئك هم المفلحون؟ قالوا لا، قال: أما أنتم فقد تبرأتم أن تكونوا من أحد هذين الفريقين، ثم قال: أشهد أنكم لستم من الذين قال الله عز وجل فيهم: والذين جاءوا من بعدهم يقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذين سبقونا بالإيمان، ولا تجعل في قلوبهم غلا للذين آمنوا، ربنا إنك رؤوف رحيم[1]

ابی جعفر محمد بن علی باقر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے انہوں نے اس گروہ سے جو حضرات ابو بکر و عمر وعثمان رضی اللہ عنہم کے بارے میں باتیں بنا رہے تھے فرمایا مجھے بتاؤ تو کیا تم مہاجر ہو جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور جن کا مال اس لیے ضبط کیا گیا کہ وہ اللہ کے فضل ورضا کے طالب تھے اور اللہ رسول کی جی جان سے مدد کرتے ہیں انہوں نے جواب دیا نہیں ہم وہ مہاجر نہیں تب آپ نے دریافت کیا کہ کیا تم وہ لوگ ہو جنہوں نے دار ہجرت میں مقام کیا اور ایمان میں سبقت کی اور جو

1۔ الشيعة في الميزان، ص: 293، ط: دار الشروق بيروت

لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس آئے یہ ان سے محبت کرتے ہیں وہ کہنے لگے نہیں ہم ان میں سے بھی نہیں تب آپ نے فرمایا گویا کہ اقرار ہے کہ ان دونوں فرقوں میں سے ہونے کا تمہارا کوئی دعوی نہیں اور میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ تم ان میں سے نہیں ہو جن کے متعلق اللہ تعالی نے یہ فرمایا ہے "رَبَّنَا اغفِرْ لَنَا وَلِاِخوَانِنَا......... آخر آیت تک"

اس اثر سے صاف معلوم ہوا کہ صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کی شان میں بدگوئی کرنے والے یہ کہ نہ صرف گمراہی ہیں بلکہ دائرہ ملت سے بھی خارج ہیں۔

3۔ انہی روایات میں سے جناب امام سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی یہ روایت ہے کہ آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حق میں دعا فرمائی ان پر درود بھیجا اور ان الفاظ میں ان کی مدح وثنا فرمائی:

اللهم وأصحاب محمد خاصة الذين أحسنوا الصحبة،وفارقوا الأزواج والأولاد في إظهار كلمته، وانهم كانوا مصرين على محبته[1]

وہ نیک صحبت لوگ تھے انہوں نے کلمۃ اللہ کی خاطر اپنی بیوی بچوں کو بھی چھوڑ دیا اور اسی کی محبت پر ڈٹے رہے۔

اور بعد دعا یہ بھی فرمایا:

للذين اتبعوا الصحابة باحسان الذين يقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذين سبقونا بالايمان[2] جنہوں نے صحابہ کی پیروی واقعی صحیح طور کی وہ اپنی دعاؤں میں یوں یاد رکھتے ہیں اور کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کی مغفرت فرما جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گزر چکے ہیں۔

الحمد اللہ اس وصف سے متصف فرقہ اہلسنت ہی کا ہے ناصبی خوارج اور رافضی تو کھلم کھلا اس وصف سے محروم ہیں۔

1۔ الشيعة في الميزان، ص: 292، ط: دار الشروق بيروت

2۔ الشيعة في الميزان، ص: 292، ط: دار الشروق بيروت

4۔ روایت ذیل کو شیعہ محدثین نے جناب امام حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے اور جس تفسیر کو شیعہ انہیں کی طرف منسوب کرتے ہیں اس تفسیر میں بھی یہ موجود ہے:

قال الله تعالى: يا آدم إن محمدا لو وزن به [جميع] الخلق من النبيين والمرسلين والملائكة المقربين وسائر عبادي الصالحين من أول الدهر إلى آخره ومن الثرى إلى العرش لرجح بهم، وإن رجلا من خيار آل محمد لو وزن به جميع آل النبيين لرجح بهم، وإن رجلا من خيار أصحاب محمد لو وزن به جميع أصحاب المرسلين لرجح بهم. يا آدم لو أحب رجل من الكفار أو جميعهم رجلا من آل محمد وأصحابه الخيرين لكافأه الله عن ذلك بأن يختم له بالتوبة والايمان، ثم يدخله [الله] الجنة.[1]

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو بذریعہ وحی مطلع فرمایا کہ اگر محمد کو ایک طرف رکھ کر اور باقی ساری مخلوق انبیاء ورسل مقرب فرشتے نیک بندے از ابتداء تا انتہاء زمانہ اور زمین تا عرش کو دوسری طرف رکھ کر تولا جائے تب بھی محمد کا پلڑا بھاری ہو گا اور اے آدم کافروں میں سے کوئی یا سب اولاد محمد یا اصحاب محمد میں سے کسی کو محبوب رکھے تو اللہ اس کے لیے کافی ہو جائے گا کہ اس کا خاتمہ ایمان پر فرمائے اور اس کو جنت میں داخل کرے۔

اس روایت میں کسی شیعی، خارجی، ناصبی، کے لئے تمسک کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ وہ بھی یہ کہہ کر کہ ہم بھی بعض آل یا اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو محبوب رکھتے ہیں اس لیے ہمارا بھی حشر ایسا ہی ہو گا اس لئے کہ کسی سے محبت کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی تو ہے کہ انہیں میں سے کسی کے ساتھ بغض وعداوت بھی نہ رکھتا ہو کسی کے عداوت رکھتے ہوئے کسی دوسرے کی محبت کا دعویٰ قابل قبول نہیں یہ کوئی گہری بات نہیں بالکل ظاہر اور سامنے

1۔ التفسير المنسوب إلى الامام أبي محمد الحسن بن علي العسكري عليهم السلام، ص: 392، ط: مؤسسة الامام المهدي عجل الله فرجه الشريف قم المقدسة

کی بات ہے کہ جب ایک شخص کی محبت فضیلت کا سبب ہوئی تو اس کے خلاف بغض یقینا باعث ذلت ونقصان ہو گا۔ اور چلئے ان امور سے تھوڑی دیر قطع نظر کر لیتے ہیں، مگر پھر بھی یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ جو لوگ تمام آل اور تمام اصحاب کے ساتھ محبت رکھتے ہوں۔ وہ زیادہ حق رکھتے زیادہ بہتر ہوں گے، اور درجہ میں زیادہ بلند ہوں گے ان سے جو چند سے محبت کرتے ہوں، اور ہمارا مقصد بھی یہی ہے۔

5۔ اسی تفسیر مذکورہ میں یہ روایت بھی مذکور ہے:

فأوحى الله تعالى إلي آدم: إن الله ليفيض على كل واحد من محبي محمد وآله محمد وأصحابه من الرحمة ما لو قسمت على عدد كعدد [كل] ما خلق الله من أول الدهر إلى آخره وكانوا كفارا لكفاهم، ولأداهم إلى عاقبة محمودة: الايمان بالله حتى يستحقوا به الجنة. وإن رجلا ممن يبغض [آل] محمد وأصحابه الخيرين أو واحدا منهم لعذبه الله عذابا لو قسم على مثل عدد ما خلق الله تعالى لأهلكهم أجمعين.[1]

اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آدم علیہ السلام کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ محمد آل محمد اور اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر محبت کرنے والے پر اس قدر مہربانیاں لٹاتا ہے کہ اگر وہ ابتدائے زمانے سے لے کر آخر زمانہ تک کی کافر مخلوق پر تقسیم کر دی جائے تو وہ ایمان باللہ اور ان کی آخرت ایسی سنوار دے کہ وہ جنت کے مستحق بن جائیں اور جو شخص آل محمد یا اصحاب محمد سے یا ان میں سے کسی ایک سے بغض وعداوت رکھے تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسا عذاب دے گا کہ اسے ساری مخلوق پر تقسیم کر دیا جائے تو اسے ہلاک کر ڈالے۔

ان روایات میں قابل غور ایک بات یہ بھی ہے کہ محبت کے ذکر میں واحدا (یعنی کسی ایک سے) نہیں

1۔ التفسير المنسوب إلى الامام أبي محمد الحسن بن علي العسكري عليهم السلام، ص: 392، ط: مؤسسة الامام المهدى عجل الله فرجه الشريف قم المقدسة

فرمایا گیا جس سے معلوم ہوا کہ محبت تمام آل واصحاب رضی اللہ عنہم کی مطلوب و مقصود ہے اور بغض کے ذکر میں سب کے علاوہ واحداً بھی علیحدہ سے ذکر کیا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان حضرات میں سے کسی ایک سے بغض و عداوت ہی ہلاکت کے لیے کافی ہے، اب یہ بات دن میں چمکتے سورج کی طرح ظاہر ہے کہ تمام آل و تمام اصحاب رضی اللہ عنہم سے محبت کرنے اور ان تمام کے بغض سے بری ہونے میں اہلسنت ہی تنہا ہیں دوسرا کوئی نہیں، والحمد الله علی ذالك۔

6۔اس سلسلہ کی ایک وہ روایت ہے جو نہج البلاغہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

انه قال الزموه والزموا السواد الأعظم فإن يد الله على الجماعة .وإياكم والفرقة فإن الشاذ من الناس للشيطان (1)

آپ نے فرمایا کثرت کے ساتھ وابستہ رہو کہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے، اور بچھڑ جانے سے بچو کیونکہ جماعت سے بچھڑ جانے والا شیطان ہے۔

اور ابتداء سے لے کر آج تک سواد اعظم اہلسنت ہی ہیں رافضی، خارجی اور نواصب کسی بھی زمانہ میں نہ سواد اعظم رہے ہیں اور نہ ان شاء اللہ قیامت تک ہوں گے ان کے سواد اعظم ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ عقائد اہلسنت دل سے قبول کرلیں۔

7۔بحوالہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نہج البلاغہ نے یہ روایت نقل و محفوظ رکھی ہے:

ان امير المومنين قال للناس جماعة يد الله عليها، وغضب الله على من خالفها(2)

امیر مومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا لوگوں کی ایک جماعت ایسی ہے جس پر اللہ کا ہاتھ ہے اس جماعت کی مخالفت اللہ کے غضب وغصہ کو بھڑکاتی ہے۔

چودہ صدیاں بیت گئیں آج تک سوائے اہل سنت کے کوئی جماعت نہیں گذری، لطیفہ یہ کہ شعیوں کے

1۔نهج البلاغة، 2/ 8، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

2۔نهج البلاغة، 16/ 8، ط: دار المعرفة للطباعة والنشر بيروت لبنان

ہاں ان کا نام ہی جماعت پڑ گیا اب گویا اس جماعت کا مخالف بقول جناب امیر المومنین رضی اللہ عنہ خدا کے غضب کا سزاوار ہوا، ان دو روایات بالا کو ان کے دوسرے محدثین مثلاً ابو جعفر محمد بن یعقوب رازی کلینی، محمد بن علی بن بابویہ قمی، شیخ الطائفہ محمد بن الحسن الطوسی، اور دوسروں نے بھی روایت کیا ہے قطع نظر اس سے کہ وہ نہج البلاغہ میں وارد ہے جو شیعوں کے نزدیک پوری کی پوری متواتر ہے اور شیعہ اپنی کتابوں میں مختلف طرق سے لائے ہیں۔

یہ ہیں اہل بیت کرام نبی ﷺ کی وہ روایات جو اہل سنت کے مذہب کی حقیت وصحت کو ثابت کرتی ہیں اور اگر بنظر غور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اہلسنت کے پیشواؤں نے سب کچھ سیکھا ہی اہل بیت سے ہے، کیا فقہ و اصول عقائد اور کیا سلوک طریقت یا تفسیر وحدیث سب کچھ انہیں سے حاصل کیا، اہل بیت سے ان کی شاگردی کا تعلق کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں بلکہ عالم آشکار حقیقت ہے اور بہت مشہور و معروف ہے، اور اسی تعلق کی بناء پر اہل بیت ہمیشہ ان سے نرمی، خلق اور فراخ قلبی سے پیش آتے رہے بلکہ بشارتیں بھی دیں ہیں، اور اس بات کا اعتراف و اقرار علمائے امامیہ سے بھی ثابت ہے اگر کوئی جان بوجھ کر ڈھیٹ پنے سے حق سے آنکھ چرائے تو اسکا کوئی علاج نہیں ابن مطہر حلی نے منہج الحق اور منہج الکرامہ میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ امام مدینہ امام مالک رحمہ اللہ نے جناب صادق رحمہ اللہ سے علم حاصل کیا، امام شافعی امام مالک رحمہ اللہ کے اور امام احمد بن حنبل امام شافعی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں اور جناب امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے جناب باقر اور زید شہید رحمہ اللہ سے بھی تلمذ کیا ہے۔

امامیہ اپنے ان مجتہدوں کو واجب الاطاعت مانتے ہیں جو امام کی غیر موجودگی میں اجتہاد کی شرائط اپنے اندر رکھتے ہوں لیکن وہ مجتہد جو ائمہ کی موجودگی میں شروط اجتہاد کا مالک ہی نہ ہو بلکہ ائمہ سے اجتہاد اور فتویٰ کی اجازت بھی حاصل کر چکا ہو امامیہ کے نزدیک اس کے مذہب کا اتباع تو بطریق اولی ہونا چاہیے (لیکن ایسا نہیں ہے) یہ بات خود شیخ حلی کو تسلیم ہے وہ اعتراف کرتا ہے کہ جناب باقر، زید شہید اور جعفر صادق رحمہ اللہ نے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو فتویٰ کی اجازت دی ہے، لہذا آپ کا جامع الشروط ہونا خود نص امام سے ثابت ہوا، اب شیعوں میں سے جو بھی امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو واجب الاطاعت نہ جانے وہ گویا، معصوم کی شہادت کو جھٹلاتا ہے، اور یہ بات عامی شیعہ بھی جانتا ہے کہ معصوم کی شہادت جھٹلانا کفر ہے خصوصاً امام کی غیر موجودگی میں ان کا مذہب ابن بابویہ، ابن عقیل، اور ابن المعلم کے مقابلہ میں زیادہ قابل اتباع ہو گا۔

کہیں تو یہ انصاف کریں اور تعصب اور عناد سے دست بردار ہوں اس بارہ میں اہلسنت کی روایات نہیں مانتے چلو نہ مانیں خود امامیوں کی روایات تو ان کے لیے قابل قبول ہونی چاہیئیں چنانچہ ابوالحاسن حسن بن علی نے اپنی اسناد سے ابی البختری سے روایت کی ہے کہ:

دخل أبو حنيفة على جعفر بن محمد الصادق فلما نظر إليه جعفر قال: كأني أنظر إليك وأنت تحيي سنة جدي صلى الله عليه وسلم بعد ما اندرست، وتكون مفزعا لكل ملهوف، وغياثا لكل مهموم، بك يسلك المتحيرون إذا وقفوا، و تهديهم الواضح من الطريق إذا تحيروا، فلك من الله العون والتوفيق حتى يسلك الربانيون بك الطريق.[1]

ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جناب ابی عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آئے جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ نے جب ان کو دیکھا تو فرمایا گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میرے نانا کی سنت کو زندہ کر رہے ہو جبکہ وہ مٹ چکی ہے تم ہر مضطر کی جائے پناہ بنو گے اور غمگین کی فریاد رسی کا مرکز ہوگے جب حیرت زدہ ٹھٹھک کر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں گے تو تم ہی سے راستہ پوچھیں گے اور جب وہ حیرانی نہیں ہوں گے تو تم ہی ان کو کھلے راستہ پر لگاؤ گے تو اللہ کی طرف سے تم کو مدد اور توفیق ملے گی، اللہ والے تم سے راستہ پوچھا کریں گے۔

سارے ہی امامیہ یہ روایت کرتے اسے تسلیم کرتے اور مانتے ہیں کہ جب امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ وقت ابو منصور کے پاس آئے تو اس کے پاس عیسیٰ بن موسیٰ حاضر تھے وہ کہنے لگے اے امیر المؤمنین یہ آج پوری دنیا کے بڑے اور نامور عالم ہیں اس پر منصور نے پوچھا اے نعمان! تم نے کس سے اکتساب علم کیا ہے؟ ابو حنیفہ بولے علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں سے اور انہوں نے علی سے، اور عبد اللہ بن عباس کے ساتھیوں سے اور انہوں نے عبد اللہ بن عباس سے اس پر منصور بولا اے جوان! تم نے بڑا اور جہ استناد حاصل کیا ہے۔

1۔ الغدير في الكتاب والسنة، 5/ 279، ط: دار الكتاب العربي بيروت لبنان

اور یہ بھی ان اماموں ہی کی کتب میں مسطور و مرقوم ہے کہ ابو حنیفہ مسجد حرام میں بیٹھے ہوئے تھے آپ کے ارد گرد لوگوں کا ہجوم تھا جو آپ کو گھیرے ہوئے تھے اور ہر طرف سے آپ سے سوال پوچھے اور آپ کی طرف سے جواب دیئے جا رہے تھے سوالات کے جواب اتنے برجستہ تھا اور فوری ہوتے گویا وہ پہلے سے آپ کی جیب میں ہوں اور آپ نکال نکال کر دے رہے ہوں اس وقت اچانک ابو عبد اللہ علیہ السلام آپ کے پاس آکر کھڑے ہو گئے جناب ابو حنیفہ نے جب آپ کو دیکھا فوراً تعظیماً کھڑے ہو کر کہا اے ابن رسول اللہ اگر آپ کی آمد کی مجھے محسوس بھی مل جاتی تو اللہ تعالیٰ مجھے اس حال میں نہ دیکھتا کہ میں بیٹھا ہوں اور آپ کھڑے ہوں ابو عبد اللہ علیہ السلام نے فرمایا تم بیٹھے رہو لوگوں کو جواب دیتے رہو میں نے اپنے باپ دادا کو اسی طرح پایا ہے۔[1]

حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے مسئلہ تفضیل کے ذیل میں شرح تجرید ابن مطہر حلی میں یہ دونوں روایتیں موجود ہیں اگر اس موقع پر کسی شیعہ کے دل میں یہ شیطانی دغدغہ پیدا ہو کہ جب امام ابو حنیفہ یا ان جیسے مجتہدین اہل سنت حضرات ائمہ کے شاگرد تھے تو پھر بہت سے مسائل میں ان حضرات کے خلاف فتاویٰ کیوں دیئے تو اس کا جواب قاضی نور اللہ شوستری کی مجالس المومنین میں موجود ہے وہ کہتے ہیں کہ جناب عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے اور آپ کے سامنے ہی درجہ اجتہاد تک پہنچ چکے تھے اور آپ کی موجودگی میں اجتہاد کیا کرتے تھے اور بعض مسائل میں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے اختلاف بھی کرتے تھے اور آپ اسے جائز سمجھتے تھے۔

ہشام احول، ابن سالم، میثمی، زرارہ اصول عقائد الہیہ میں مثلاً تجسیم و صورت اور حدوث عالم باری تعالیٰ میں حضرات ائمہ کے صریح مخالف تھے کولین اور امامیہ کی دوسری صحیح کتابوں میں بذریعہ ایسی روایات موجود ہیں کہ حضرات ائمہ ان سب مذکورہ لوگوں سے ان عقائد میں مخالفت کے سبب نفرت فرماتے اور انہیں

1۔ ولقد يكون أبو حنيفة في حلقته بالكوفة أو في المدينة فيقف عليها الإمام الصادق، ولا تقع عليه عين أبي حنيفة، فإذا لمحته عيناه هب أبو حنيفة واقفا وهو في مجلس الدرس، فقال (يا ابن رسول الله لو شعرت بك أول ما وقفت ما رآني الله أقعد وأنت قائم) ليشهد الله على دخيلة نفسه أنها لا تقبل الجلوس والإمام قائم.وأبو حنيفة أكبر عمرا من الإمام الصادق.لكن الصادق يشد أزره بعبارات مشجعة. فيقول له اجلس يا أبا حنيفة فعلى هذا أدركت آبائي(الإمام جعفر الصادق، ص: 162، ط: المجلس الأعلى للشئون الإسلامية)

سرزنش بھی کرتے اس سب کے باوجود بھی ان بزرگوں سے ان کی شاگردی اور تلمذ سے کسی کو انکار نہیں اور جب یہ لوگ ان ائمہ سے روایات بیان کرتے ہیں تو ان سے کوئی بھی سرتابی نہیں کرتا امام ابو حنیفہ اور امام مالک کا اختلاف تو محض فروع فقہیہ میں ہے اصول عقائد میں کوئی اختلاف نہیں پھر بھی ان کو نظر سے گرایا جارہا ہے اس کا سبب تعصب وعناد کے سوا ہم کو تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ مجتہد کو اپنی دلیل کی پیروی لازم ہے ہاں مسائل منصوصہ کے خلاف دیدہ ودانستہ کرنا اس لیے حرام ہے اور جب مسئلہ کے لیے کوئی نص موجود نہ ہو تو مجتہد اور امام معصوم میں فرق یہ ہے کہ مجتہد کے اجتہاد میں خطا کا احتمال رہتا ہے اور امام معصوم کا قول یقینا صحیح ہوتا ہے اور خطا کی صورت میں مجتہد پر کوئی عتاب نہیں بلکہ اس کو ایک گونا اجر ملتا ہے چنانچہ معلم الاصول شیعہ میں اس کی تشریح موجود ہے تو مجتہد کی خطا احتمال بمنزلہ ثواب یقینی کے ہوئی جسے کوئی خوف وخطر نہیں ہوتا نہ اس کے حق میں نہ مقلد کے حق میں البتہ یہ شرط ضروری ہے کہ اجتہاد اپنی جگہ اور صحیح صورتحال کے ساتھ ہو یعنی قرآن صریح خبر متواتر یا مشہور اور اجماع امت کے مقابلے میں اجتہاد نہ ہو اس لیے کہ ان دلائل کی موجودگی میں اجتہاد درست نہیں۔

پھر ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اہل سنت کے مجتہدین اور ان کے راوی سارے کے سارے تقوی عدالت اور دیانت میں اتنے مشہور ومعروف ہیں کہ شیعہ بھی عقیدہ سنت کے طعن کے سوا ان میں فسق کی یا دنیاداری جیسا کوئی عیب بھی لگانے کی جرات نہیں کرسکے جبکہ دوسرے فرقوں خصوصا شیعوں کے رواۃ کا جو حال ہے وہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں ان کے راوی خود انہی کے ہاتھوں ایسے مجروح ہیں کہ باید وشاید کسی اور فرقے کے راوی ایسے ہوں۔

صفین کی جنگ کے بعد جناب امیر رضی اللہ عنہ کے لشکری جو خلاصہ فرقہ ہیں اور اس گروہ کے قرن اول اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے اقوال وافعال زیادہ تر انہی مطعون ومجروح رواۃ کی وساطت سے مروی ہیں ان کا حال وہاں جناب کہ خطبوں منقولہ نہج البلاغہ میں پوری شرح واپس کے ساتھ بیان ہوچکا کہ یہ کس کا درخوان فاسق امام کے احکامات کے نافرمان، کاذب اور جھوٹے تھے ان کے سارے طور طریقے منافقوں کیسے تھے جناب امیر رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی منافقت کی گواہی دی اور کوفہ کی جماعت جن کی روایت پر عقیدہ کا دارومدار ہے جیسے ہشامین، زرارہ، میثمی وغیرہ ان سب کو خود ائمہ نے تجسیم کے معاملے میں افتراء پرداز کہا اور ان کو بددعا دی اور لعنت بھیجی بعض کو اپنی صحبت میں

آنے سے روک دیا جیسا کہ عبداللہ بن مسکان شیخ مقتول نے ذکر میں اس کا ذکر کیا ہے۔

اور ان رواۃ میں بعض تو ایسے ہیں کہ ان کا اسلام بھی ثابت نہیں مثلاً زکریا بن ابراہیم نصرانی جس سے ابو جعفر طوسی اور دوسرے لوگوں نے روایات لی ہیں اور عباسی دور میں جب ائمہ نظر بند رکھے جاتے تھے تو شیعوں کے اکثر راوی عباسیوں کے ڈر سے گھر سے باہر تک نہ نکلتے تھے نہ ائمہ سے اپنے تعلق کا اظہار کر سکتے تھے وقف اہل سنت کے کہ ان کے علماء اس وقت بھی ائمہ سے شرف ملاقات حاصل کرتے اور اکتساب فیض کرتے ساری تاریخوں میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جناب موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ عباسی خلیفہ کی جیل میں نظر بند تھے تو امام محمد اور قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ان کی زیارت کو جاتے اور علمی مشکلات کو حل کرتے ایسے عالم میں کہ وہ متہم ہونے کی بنا پر اسیر حکومت تھے ان حضرات کا ان سے ملاقات کرنا ان کے انتہائی خلوص اور تعلق خاطر کا مظہر ہے اور یہ تاریخی بات امامیہ کی اپنی کتابوں میں بھی مذکور ہے امامیہ میں سے صاحب الفصول نے مذکورہ بالا ہر دو حضرات سے جناب موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ کے خرق عادات کے باب میں روایت بھی بیان کی ہے:

انهما قال لما حبسه هارون الرشيد دخلنا عليه وجلسنا عنده فجاءه بعض الموكلين فقال اني قد فرغت فانصرفوا فان كان لك حاجه في شيء اتيك بها حين اجيئك غدا فقال مالي حاجه ثم قال لنا اني اعجب من الرجل سالني ان اكله حاجه ياتي بها معه اذا جاء وهو ميت في هذه الليله فجاءة فمات الرجل في ليلته تلك فجاءة.[1]

انہوں نے کہا کہ جب ہارون الرشید نے ان کو قید کیا تو ہم ان کے پاس گئے اور ان کے پاس بیٹھ گئے آپ کے پاس کوئی مامور و متعین شدہ شخص آیا اور کہنے لگا کہ میں ڈیوٹی سے فارغ ہو کر واپس جا رہا ہوں آپ اگر کسی چیز کی ضرورت یا خواہش رکھتے ہوں تو بتائیں میں کل لیتے آؤں گا آپ نے اسے جواب دیا نہیں مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں پھر ہم سے فرمایا میں اس پر حیران ہوں

1 ـ الخرائج والجرائح، لقطب الدين الراوندي، 1/ 322، ط: مؤسسة الإمام المهدي عليه السلام قم المقدسة

کہ یہ شخص جو مجھ سے میری حاجت پوچھتا ہے کہ اگر کچھ ہو تو میں کل لیتا ہوں مگر یہ تورات ہی کو مرنے والا ہے چنانچہ وہ شخص اسی شب اچانک فوت ہو گیا۔

ایک اور بات یہ بھی ہے کہ اہل سنت کا مذہب ہمیشہ ظاہر و مشہور رہا اور شیعوں کا مذہب اس کے برعکس ہمیشہ مستور و مخفی رہا اور دین محمدی ﷺ کو ظاہر ہونا لازم ہے فرمان خداوندی ہے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ[1]

وہ وہ ہے جس نے ہدایت بدین حق کے ساتھ اپنا رسول بھیجا تاکہ تمام دینوں پر اس کو غالب و ظاہر کرے، اور یہ بھی فرمایا:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ[2]

ہم نے زبور میں ذکر کے بعد یہ اعلان کر دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔

اور اس پر اتفاق ہے کہ عباد سے مراد امت محمد ﷺ ہے عرب، عجم، شام، روم، مصر، مغرب کے وارث ہمیشہ اہل سنت ہی رہے ہیں جب مسلمانوں کی شامت اعمال سے عراق و خراسان پر تاتاری کافروں اور چنگیزیوں کا تسلط ہوا تو ان شہروں کے وارث شیعہ ہوئے گویا دولت محمدی کے اصل وارث اہل سنت ہیں اور شیعوں کا یہ گروہ چنگیزیوں کے اگلے ہوئے لقمے کھانے والا ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اہل تشیع اور اہل سنت کے اختلاف کا مدار اور مرکزی مسئلہ امامت کا معاملہ ہے ان کے ہاں امامت کا مسئلہ ایسے پانچ اصولوں پر موقوف ہے جن میں سے کوئی ایک بھی قابل سماع دلیل سے ثابت نہیں وہ اصول خمسہ یہ ہیں:

اصل اول یہ کہ حضرت امیر ﷺ بلا فصل امام (خلیفہ) تھے۔

اصل دوم ائمہ کی تعداد میں ناکامی ہو سکتی ہے نہ زیادتی۔

اصل سوم امام آخر کی درازی عمر، ان کا پوشیدہ رہنا یا مرنے کے بعد ان کی واپسی جیسا کہ ان کے فرقوں میں اختلاف

1۔ سورۃ التوبۃ، الآیۃ: 33

2۔ سورۃ الانبیاء، الآیۃ: 105

ہے یہ تینوں باتیں کتاب اللہ اور اخبار متواترہ سے نہ آج تک ثابت کی جا سکی ہیں اور نہ قیامت تک ثابت ہوں گی۔

اصل چہارم صحابہ کا مرتد و کافر ہونا حق کو چھپانا باطل کو ظاہر کرنا ناشائستہ امور پر ان سب کا اتفاق حالانکہ قرآن مجید میں صحابہ کی شان میں اور ان کے حال کی اچھائی اور ان کے نتیجہ کی بہتری پر صاف اور کھلے طور پر شاہد و ناطق ہیں۔

اصل پنجم ائمہ کے متعلق تقیہ کا اعتقاد رکھنا کہ شیعوں کو وہ ایسی باتیں بتا دیتے تھے جو اوروں سے چھپاتے تھے حالانکہ وہ دوسرے بھی انہی کے شاگرد ہوتے انہی سے علم و طریقت حاصل کیے ہوتے تو بلاوجہ اور سبب حضرات ائمہ کے لیے جھوٹ بولنا کیا ضرور تھا۔

ان پانچوں امور کو جن کو شیعہ اسلام کے ارکان خمسہ کی مانند جانتے ہیں ہم نے ظاہری عقل کتاب اللہ سنت مشہورہ محمد ﷺ بلکہ ساری اگلی پچھلی شریعتوں کے قواعد پر ان کو جانچ پرکھ کر دیکھ لیا اور ان کو سب کے خلاف پایا اور یوں ہم نے یہ یقین کے ساتھ جان اور سمجھ لیا کہ یہ مذہب خاندان نبوت سے نہیں لیا گیا بلکہ ایک مصنوعی اور اختراعی مذہب ہے (جس کی پہلی بنیاد عبد اللہ بن صبا یہودی نے نصب کی اور پھر اس کے حواریوں نے موقع بموقع وقتاً فوقتاً اس کی تعمیر و تکمیل میں اہم کردار ادا کیا اور یہ کوئی سربستہ راز نہیں کہ ابن سبا کا استاد معلم الملکوت ہے۔ن)

ان اصول کے ثبوت میں شیعوں نے جو دلائل دیئے ہیں وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ ایسی احادیث ہیں جو ضعیف اور نامعلوم الحال راویوں سے مروی ہیں جن کا ان کے زمانہ میں علماء میں شمار ہی نہ تھا اور جن کے راوی خود ان کے نزدیک جرح و قدح سے مجروح و مطعون اور جھوٹے و بددیانتی سے متہم ہے یا وہ قرآنی آیات ہیں کہ ان کے ساتھ جب تک اسباب نزول اور خصوصی واقعات شامل نہ کیے جائیں ان کے ظاہر سے ان کا مقصد ہرگز حاصل نہیں ہوتا اور وہ اسباب نزول یہ خصوصی واقعات اکثر موضوع ضعیف اور افترا شدہ اخبارات ہوتی ہیں لیکن پھر بھی اصل مطلب حاصل کرنے کے لیے کھڑے ہوئے ناقابل تسلیم مقدمات ملانے ضروری ہوتی ہیں چنانچہ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

ان امور میں جو بھی عقلمند غور و خوض سے کام لے اور حقیقت حال سے واقف ہو وہ بلا تامل اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ مذہب از ابتدا انتہا فریب، مخترع اور مصنوعی ہے اور یہ بات روز روشن کی طرح اس پر عیاں ہو جائے گی

"وَاللهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ"

ان کے مذہب کے مطالعہ کے دوران ایک یہ بات بھی ہم نے دیکھی اور محسوس کی کہ شیعہ مذہب اصول و فروع میں کافروں کے پانچ مذہبوں سے بہت مشابہت رکھتا ہے یعنی یہود، نصاریٰ، صائبین، مجوس اور ہنود دنیا بھر کے کفار میں علماء کتب اور تصنیف و تالیف کے نقطہ نظر سے یہی پانچ مذہب ممتاز اور مشہور ہیں اور ملت حنفیہ کے سراسر خلاف ہیں اور انتہائی غور و فکر سے کام لینے پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شیعہ مذہب بحیثیت مجموعی بعینہ ان فرقوں کا مذہب ہے ہر مذہب سے ایک نہ ایک چیز لے لی ہے مثلاً:

شیعہ مذہب کی یہودیوں سے مشابہت

اپنی تعریف میں مبالغہ سے کام لینا، عذاب الٰہی سے امن میں رہنے کا دعویٰ، عذاب و عقاب، سوال و جواب، وزن اعمال سے خود کو مستثنیٰ کرنا اور ان امور کو دوسروں کے ساتھ مخصوص کرنا، یہ سب کچھ یہود سے لیا ہے کیونکہ وہی کہتے ہیں " نَحْنُ أَبْنَاءُ اللهِ وَأَحِبَّاؤُهُ "[1] ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں "وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً"[2] ہمیں آگ چند دن سے زیادہ نہ چھوئے گی "لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَى "[3] یہودی و نصرانی کے سوا کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض و عناد رکھنا اور خدا کے مقرب بندوں اور محبوب دوستوں سے تعصب یہ بھی یہودیوں کی ان کے لیے بخشش ہے " قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ "[4] اس پر گواہ ہے اللہ تعالیٰ کو مخلوق سے تشبیہ دینا بدا کا قول یہ بھی یہود کی چھوڑی ہوئی ہڈیاں یا گلے ہوئے لقمے ہیں جو ان کے خوان مذہب کا حصہ ہیں۔

1۔ سورۃ المائدۃ، الآیۃ: 18

2۔ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: 80

3۔ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: 111

4۔ سورۃ البقرۃ، الآیۃ: 97

شیعہ مذہب کی نصرانیوں سے مشابہت

ائمہ کی محبت میں غلو، ان کو الہ ماننا، ان میں روح الٰہی کے حلول کا عقیدہ، ان کو معصوم جاننا، ان کے لیے علم ثابت کرنا، موت ان کے ہاتھ میں ہونے کا عقیدہ رکھنا، جناب امیر رضی اللہ عنہ کو قاسم جنت و دوزخ تسلیم کرنا، ان کو روز جزا کا مالک قرار دینا، اور اپنے کو ان کی محبت کے سبب بخشا ہوا نجات پایا ہوا سمجھنا، یہ سارے عقائد نصاریٰ کی پٹاریوں سے اڑائے ہوئے ہیں جو جناب مسیح علیہ السلام کی عبدیت کے منکر تھے اور مذکورہ بالا مراتب ان کے لیے ثابت کرتے تھے جس طرح شیعوں میں امام ہیں نصاریٰ میں پوپ کا بھی وہی درجہ ہے آدھے قرآن کو ظاہر پر محمول کرنا اور دوسرے آدھے کو جو صحابہ و مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کی تعریف میں ہے غلط سلط اور باطل تاویلات سے تحریف کرنا، یہ بھی یہود و نصاریٰ دونوں کی مشترک پلیٹ ہے جس میں یہ بھی منہ مار رہے ہیں، امامت کو جناب حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں مخصوص و محدود کرنا،[1] بھی یہود کے قول کے مشابہ ہے وہ بھی نبوت کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد کے ساتھ مخصوص مانتے ہیں اپنے کو خدا کا دوست کہنا اور شیعہ علی کی تعریف میں ایران توران کی ہانکنا بھی انہوں نے یہودیوں سے سیکھا ہے یہودیوں کو تو اللہ تعالیٰ نے چیلنج دیا تھا کہ یہودیو تم کو اگر یہ زعم ہے کہ تم ہی اللہ کے دوست ہو اور کوئی نہیں تو اپنا سچ ثابت کرنے کے لیے ذرا موت مانگ کر تو دکھاؤ (ہم بھی ان پیروان یہود سے یہی کہتے ہیں کہ جب تم ہی اللہ کے دوست اور مستحق جنت ہو مالک جنت بھی تمہارے اپنے پیارے ہیں تو پھر دنیا کے اس جہنم زار میں کیوں دنیا بھر کی لعنت پھٹکار سمیٹ رہے ہو مر کر جنت میں کیوں نہیں چلے جاتے مرنا بس میں نہیں مرنے کی آرزو تو کر سکتے ہو وہی کر کے دکھاؤ، نعمانی)

کتاب اللہ میں لفظی اور معنوی تحریف کر کے اس میں کچھ الفاظ کا اضافہ کرنا یہ بھی بعینہ یہودی حرکت

---

1 ۔ الأخبار عندهم كثيرة منها ما رواه ابن بابويه في باب (أن الله عز وجل خص آل محمد بالإمامة دون غيرهم) عن الصادق عن أبيه قال: «قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أراد أن يحيى حياتي، ويموت ميتتي ويدخل جنة عدن غرسها بيد ربي، فليتول عليا عليه السلام وليعاد عدوه، وليأتم بالأوصياء من بعده، أعطاهم الله علمي وفهمي، وهم عترتي من لحمي ودمي ...»، الإمامة والتبصرة: ص 43؛ ورواه أيضا الكليني، الكافي: 1/ 209؛ المجلسي، بحار الأنوار: 23/ 138.

ہے یہود کہتے ہیں جب تک مسیح دجال نہ آئے جہاد جائز نہیں اثنا عشری کہتے ہیں جب تک امام مہدی کا ظہور نہ ہو جہاد جائز نہیں مگر نماز کو ستارہ دیکھنے تک مؤخر کرنا بعینہ یہود کا مذہب ہے[1] تین طلاقوں کے بیک وقت وقوع سے انکار کرنا بھی عین قول یہود کے مطابق ہے یہودی کہتے ہیں مسلمانوں کی ایذاء رسانی میں اتنا اتنا ثواب ہے اس مصرع پر شیعوں نے یہ گرہ لگائی کہ سنی کے قتل کی کوشش کو ستر سالہ عبادت کا درجہ دیا ہے یہودی کہتے ہیں "لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ"[2] امین کے حقوق غصب کرنے پر ہم سے کوئی جواب طلبی نہیں ہو سکتی ہے امامیہ بھی یہی کہتے ہیں کہ سنیوں کی جان ومال وآبرو پر دست درازی میں کوئی مضائقہ نہیں۔

یہودی جناب عیسیٰ مادر محترم مریم علیہا السلام اور ان کے حواریوں پر شب وستم کرتے ہیں شیعہ بھی اصحاب پیغمبر خلفائے راشدین امہات المومنین رضی اللہ عنہم کو سب وشتم کرتے ہیں۔

نصاری پیشاب پاخانے کی نجاست کو کوئی اہمیت نہیں دیتے وہ ناک کی ریزش یا تھوک کی طرح سمجھتے ہیں چنانچہ مذی، ودی اور بعد پیشاب قضیب کو جھٹکنے اور خشک پاخانہ میں شیعوں کا بھی یہی مسلک ہے ان کے نزدیک بھی یہ نجاسات کوئی اہمیت نہیں رکھتی، نصاریٰ اپنی نمازوں میں قبلہ کو معین کرنے کی پابندی نہیں لگاتے چاروں طرف سجدہ کرنا جائز بتاتے ہیں، امامیہ بھی نوافل میں بلا عذر استقبال قبلہ کی قید اڑا دیتے ہیں اور ہر

1۔ وردت روايات عندهم بالنهي عن الصلاة عند تشابك النجوم، وورد عكسها، وحسب قاعدة مخالفة أهل السنة ردوا روايات صحيحة، وأخذوا بروايات تشابك النجوم. روى الطوسي عن جارود قال: «قال لي أبو عبد الله (- عليه السلام -): يا جارود، يُنصحون فلا يقبلون، وإذا سمعوا بشيء نادوا به، أو حُدِّثوا بشيء أذاعوه، قلت لهم: مسّوا بالمغرب قليلا فتركوها حتى اشتبكت النجوم، فأنا الآن أصلّيها إذا سقط القرص». تهذيب الأحكام: 2/ 32؛ وسائل الشيعة: 4/ 177. وفي رواية أخرى يشير الصادق إلى أن الإمامية قلدوا الخطابية في تأخير المغرب؛ روى الطوسي عن أبي أسامة الشحام قال: «قال رجل لأبي عبد الله - عليه السلام - أؤخر المغرب حتى تستبين النجوم؟ قال: فقال: أخطابية؟ إن جبرائيل - عليه السلام - نزل بها على محمد حين سقط القرص». تهذيب الأحكام: 2/ 28؛ رجال الكشي: ص 290؛ ابن بابويه، علل الشرائع: 2/ 350؛ وسائل الشيعة: 4/ 191. وروايات تشابك النجوم في: تهذيب الأحكام: 2/ 30؛ العاملي، وسائل الشيعة: 4/ 196.

2۔ سورة ال عمران، الآية: 75

طرف سجدہ کرتے ہیں نئی اختراعی عیدوں کے منانے میں بھی نصاریٰ کے ساتھ پوری پوری مشابہت رکھتے ہیں کہ انہوں نے بہت سی عیدیں اپنی طرف سے گھڑلی ہیں یوم عاشورہ میں ائمہ کی قبروں پر تصاویر لگاناان کو سجدہ کرناان کے روبرو دست بستہ کھڑے رہنانصاریٰ کے عمل سے ملتاجلتاہے کہ وہ بھی کلیساؤں میں حضرت عیسیٰ بی بی مریم کی تصاویر بناتے ہیں ان کی تعظیم کرتے اور سجدہ کرتے ہیں۔

شیعہ مذہب کی صائبین سے مشابہت

اب ذراصائبین سے مشابہت دیکھیے کہ جب قمر عقرب میں یا محاق میں ہوتا ہے اس سے احتراز کرتے ہیں تاریخوں اور ایام کی سعادت و نحوست کے بارے میں بڑا پختہ عقیدہ رکھتے ہیں نوروز اور شرف آفتاب کی تعظیم کرتے ہیں صابئین تمام ستاروں کو فاعل مختار اور زمینی اشیاء کاخالق خیال کرتے ہیں رافضی بھی تمام حیوانات کو خالق وفاعل مختار جانتے ہیں۔

شیعہ مذہب کی مجوسیوں سے مشابہت

مجوسی نیکی وبدی کاالگ الگ خدامانتے ہیں یعنی یزدان واہرمن رافضی بھی خالق خیر خداکو مانتے ہیں اور خالق شر شیطان وانسان کو ٹھہراتے ہیں اس لیے علماء ملت نے انہیں اس ملت کے مجوسی ہونے کا خطاب دیا ہے مجوسی عورت کے مباح کرنے میں فراغ دل بلکہ انتہادرجہ بے غیرت وبے حیامعلوم ہوتے ہیں مگر یہ رافضی بھی متعہ اور شرمگاہوں کے حلال کرنے میں ان کے قدم بقدم ہیں بلکہ متعہ اور تحلیل فروج میں بیٹیوں اور بہنوں کو حلال جانتے ہیں جس کی وجہ بیان ہوچکی۔

شیعہ مذہب کی ہندوؤں سے مشابہت

رہی ہنود سے مشابہت توہندوجوکچھ اپنے بتوں کے ساتھ کرتے ہیں وہی یہ لوگ ایام عاشور میں اپنے ائمہ کی قبور کی تصاویر کے ساتھ کرتے ہیں ان کو غسل دیتے ہیں سوار کرتے نوبتیں بجاتے ہیں ان کے سامنے کھانارکھتے ہیں اور جھوٹاکوتابطور تبرک تقسیم کرتے ہیں جناب قاسم اور بیوی سکینہ کا بیاہ شادی نکاح رسم مہندی زندوں کی طرح عمل میں لاتے ہیں بغور دیکھاجائے توان کی توہم پرستی ہندوؤں سے بھی بڑی ہوئی ہے اس لیے کہ وہ توصرف اشخاص کی تصویروں کی پرستش کرتے ہیں اور یہ قبروں اور اشخاص کے جنازوں کی تصویروں کی پوجاوپرستش کرتے ہیں ہندو

گائے کے پیشاب اور گوبر کو پاک کہتے ہیں یہ رافضی بھی انسان اور گائے دونوں کے پیشاب پاخانہ کو پاک مانتے ہیں اور اسی طرح ان کے نزدیک دونوں کا خشک پاخانہ بھی پاک ہے سطر عورت ہندو کے ہاں لنگوٹی میں چھپنے والے تین اعضاء ہیں اور شیعہ مذہب میں یہی ستر عورت ہے ہندو عبادت کے وقت ننگا رہنا اچھا خیال کرتے ہیں رافضی بھی نماز و طواف میں برہنہ ہونے کو جائز کہتے ہیں بشرطیکہ آگے پیچھے کے اعضاء پر مٹی لتھڑلی جائے ہندو اپنی پیشانی پر معبد کی خاک ملتے ہیں شیعہ بھی خاک ہی کو اپنی سجدہ گاہ بناتے اور قبلہ ٹھہراتے ہیں ہندو کے ہاں پرستش و پوجا کے وقت کپڑے کی پاکی شرط نہیں امامیہ بھی اس کپڑے کو جو بدن پر متصل نہ ہو پاک ہونے کی شرط نہیں لگاتے مثلاً پگڑی ازار بند کمر بند موزہ سرپر چادر پیشاب، مذی وودی ہندو کی طرح امامیہ کے نزدیک پاک ہیں ہندو اپنی عبادت کے لیے کسی خاص سمت وجہد کو متعین نہیں کرتے شیعہ بھی نوافل اور سجدہ تلاوت میں قبلہ رخ ہونا فرض نہیں مانتے ہندو اپنے روزے میں بعض اشیاء کا کھانا جائز رکھتے ہیں ان کو روزہ توڑنے والی اشیاء شمار نہیں کرتے شیعہ بھی غیر عادی اشیاء کھالینے کو نواقض صوم نہیں جانتے مثلاً وغیرہ ہندو کے نزدیک خون مسفوح حرام نہیں رافضی بھی کھانے میں خون مسفوح بہت سا مل جانے کو بھی حلال کہتے ہیں ہندو کے ہاں نکاح کی مشہوری اور گواہ ضروری نہیں متعہ امامیہ بھی اسی روش کو مانتے ہیں ہندو باندیوں کی شرمگاہیں جس کے لیے چاہیں حلال کرسکتے ہیں بعینہ یہی مسلک ان رافضیوں کا بھی ہے غیر مسکوک چاندی و سونے پر نہ ہندو کے ہاں زکوٰۃ ہیں نہ ہی مذہب امامیہ میں۔[1]

1۔ ان تمام مسائل کی تخریج گذشتہ ابواب کے تحت متفرق جگہوں پر ہو چکی ہے۔

باب دوازدھم

تولّا اور تبرّا

تولا کے معنیٰ محبت کے ہیں اور تبرا کے معنیٰ ہیں عداوت، اس نازک بحث میں پڑھنے سے پہلے چند مقدمات بترتیب گوش گزار کر لینے ضروری اور مفید ہیں یہ مقدمات شیعوں کے معتبر علماء کے اقوال اور آیات قرانی کی رو سے ثابت شدہ ہیں پھر ان سے نتیجہ نکال کر وضاحت سے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ قابل محبت کون ہے اور لائق عداوت کون اور یہ سب کچھ شیعوں کی مقرر کردہ اصول کی بناپر ہو گا اہل سنت کے اقوال کو اس میں قطعی کوئی دخل نہیں۔

مقدمہ نمبر 1: یہ کہ مخالفت اور عداوت میں فرق ہے مخالفت کو عداوت لازم نہیں بات اگرچہ صاف وظاہر ہے محتاج دلیل نہیں مگر ضد توڑنے اور جائے فرار مسدود کرنے کی خاطر دو وجوہ سے اسے ثابت بھی کرتے ہیں:

اول علامہ محمد رفیع واعظ مصنف ابواب الجنان جو اثنا عشریہ میں ایک معتبر شخصیت شمار ہوتا ہے نے تصریح کی ہے کہ دو مومنوں کے درمیان امور دنیاوی میں مخالفت ممکن ہے گو بتقاضائے ایمان دونوں باہم محبت رکھتے ہوں۔[1]

دوم اثنا عشریہ شیعوں کے اعتقاد کے موجب شیخ ابن بابویہ اور سید مرتضیٰ علم الھدی کے درمیان فقہی مسائل یا مروی روایات کی تصحیح کے سلسلہ میں مثلاً یثاق وغیرہ میں باہم اختلاف متحقق اور ثابت ہے اس کے باوجود وہ اتحاد مذہب کے سبب باہم رابطہ محبت بھی رکھتے ہیں لہذا مخالفت عداوت سے عام ہو گئی اس لئے جہاں مخالفت ہو ضروری نہیں وہاں عداوت بھی ہو البتہ جہاں عداوت ہو گی وہاں مخالفت بھی ضرور ہو گی۔

مقدمہ نمبر 2: یہ کہ کبھی محبت وعداوت جمع بھی ہو جاتی ہیں اس اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عداوت دو قسم کی ہوتی ہے ایک دینی مثلا مسلمان کی عداوت کافر کے ساتھ کہ محض اصول عقائد کی بناپر ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں دوسرے دنیاوی مثلاً ایک مسلمان کی عداوت اپنے دوسرے مسلمان بھائی سے کسی دنیاوی نفع و

---

1 ـ کذا قال ابن ابی الحدید: كانوا يجرونها مجرى الأمور الدنيوية ويذهبون لهذا مثل تأمير الامراء وتدبير الحروب وسياسة الرعية وما كانوا يبالون في أمثال هذا من مخالفة نصوصه صلى الله عليه وآله إذا رأوا المصلحة في غيرها۔ (شرح نهج البلاغة لابن أبي الحديد، 12/ 82، ط: مكتبة آية الله العظمى المرعشي النجفي قم إيران)

نقصان کے سبب یا ایک دوسرے کے طور و طرز عمل سے نفرت رکھنے کے باعث پس معلوم ہوا کہ مختلف الجنس یعنی دینی و دنیاوی محبت و عداوت کا یکجا ہو جانا ممکن الوقوع نہیں ہے بلکہ اکثر اوقات واقع ہو جاتا ہے اور متفق الجنس مختلف النوع یا مختلف النوع مختلف الصفت محبت و عداوت کا جمع ہونا بھی جائز الوقوع ہے جیسے مومن فاسق بحیثیت ایمان تو محبوب ہے اور بلحاظ فسق مبغوض (جیسے آیات "وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ"[1] اور "إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ"[2] یا "وَاللهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ"[3] اور اس دلیل سے کہ بری بات سے روکنا فرض ہے اور بری بات سے روکنے کا ادنی درجہ یہ ہے کہ اس سے دلی بغض رکھے۔

اب یہاں ایک اور بحث ہے کہ بعض نیک اعمال کے صدور کے سبب مثلاً خیرات، بھلائی، انصاف، دادرسی، مروت، جواں مردی، پاس عہد اور صدق کلامی کے کسی کافر سے بھی دینی محبت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ سرسری نظر تو مومن فاسق پر قیاس کرتے ہوئے محبت و عداوت کے جمع ہونے کا حکم لگاتی ہے مثلاً سخاوت کی وجہ سے حاتم سے محبت یا عدالت کے سبب نوشیروان سے محبت مگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو یہ محال نظر آتا ہے کہ دینی محبت و عداوت یکجا جمع ہوں وجہ اور سبب یہ ہے کہ خدا کے ہاں کسی عمل کے مقبول ہونے کی شرط اول اعتقاد کی درستی ہے یہاں چونکہ ارتقادی فاسد ہے اس لیے اس کا عمل بھی دینی لحاظ سے خدا کے ہاں فاسد و نا مقبول ہوا اور قابل اعتبار نہ رہا چہ جائیکہ قابل محبت ہو تا پس نیک اطوار کافر یا منصف مزاج کافر سے محبت دنیاوی تو ہو سکتی ہے دینی نہیں اللہ تعالی فرماتے ہیں:

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّى إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللهَ عِنْدَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ وَاللهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ[4]

1۔سورۃ التوبۃ، الآیۃ: 71

2۔سورۃ الانفال، الآیۃ: 58

3۔سورۃ ال عمران، الآیۃ: 57

4۔سورۃ النور، الآیۃ: 39

جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال بیابانی سراب کی طرح ہیں کہ پیاسا ان کو دیکھ کر جب پہنچتا ہے تو وہاں کچھ نہیں پاتا وہاں قضائے الٰہی کو موجود پاتا ہے جو اس کا حساب برابر چکا دے گا اللہ تعالی حساب جلدی لینے والا ہے۔

لہذا معلوم ہو گیا کہ ایک شخص میں ایک ہی حیثیت سے محبت وعداوت کا جمع ہونا محال ہے البتہ دو حیثیات سے جائز الوقوع ہے چنانچہ ملا محمد رفیع واعظ صاحب ابواب الجنان نے سادات میں سے دو ائمہ کا قصہ نقل کیا ہے۔

اور یہ اجتماع جب عوام امت میں ممکن ہوا تو خواص امت میں بھی محال نہ رہا کیونکہ مقتضائے بشریت تو ایک ہی ہے عوام وخواص کے درمیان جو فرق ہے وہ اس حیثیت سے نہیں ہے کہ خواص سے بشریت کے احکام جاتے رہیں اور عوام میں موجود رہیں بلکہ یہ فرق فضائل مناقب کی قلت وکثرت کے سبب یا ایمان کی قوت وضعف کے باعث اور شریعت کے رواج دینے اور احکام الٰہی قبول کرنے میں آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے ہے چنانچہ درجات ایمان کی لمبی حدیث میں روایت کلینی جناب صادق رحمہ اللہ سے یہ سب کچھ بیان ہو چکا ہے اور باتفاق رائے خواص امت کے تین طبقے ہیں:

1۔ اہل بیت اولاد پیغمبر آپ کے اعزہ رضی اللہ عنہم 2۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن

3۔ مہاجرین وانصار میں سے چاند مخصوص مخلصین رضی اللہ عنہم

اتنا ضرور ہے کہ ہر دو جانب مقابل مبہم مناسبت رکھتے ہوں مثلاً امت کے عام افراد کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خواص کے ساتھ اس طرح پیش آئیں جیسے وہ آپس میں پیش آتے ہیں اس پر کئی شرعی دلیلیں دی جا سکتی ہیں پہلی دلیل تو یہ مشہور حدیث شریف ہے:

الله الله في أصحابي، لا تتخذوهم غرضا من بعدي (1)

دیکھو دیکھو میرے صحابہ میرے بعد ان کو نشانہ نہ بنانا۔

دوسری وہ حدیث جو اہل بیت وانصار کے بارے میں ہے:

1۔ شعب الإيمان، 3/ 93، رقم : 1424، ط: مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض

فاقبلوا من محسنهم وتجاوزوا عن مسيئهم[1]

ان کی بھلائیاں بیان کرنے والے کی بات مانو اور ان کی برائی کرنے والوں سے کنارہ کش ہو جاؤ۔

ایک دلیل "وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ"[2] آپ کی ازواج ان کی مائیں ہیں، اور حضور ﷺ نے فرمایا:

أمركن مما يهمني بعدي، ولن يصبر عليكن إلا الصابرون[3]

میرے بعد تمہارے جو حالات و معاملات ہوں گے مجھے وہ فکر مند کرتے ہیں اور تمہارے معاملے پر صابر ہی صبر واستقامت پر قائم رہ سکتا ہے۔

مطلب یہ کہ میرے بعد تمہاری اطاعت و فرمانبر داری اور تمہارے شایان شان حقوق تعظیم ہر کوئی بجا لائے بڑا مشکل نظر آتا ہے ہاں وہی جو صبر واستقامت کا مل رکھتا ہو۔

شرعی دلائل کے علاوہ اس سلسلہ میں عرف عام سے بھی بہت سی دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں ان میں سے ایک یہ کہ اولاد کے لیے یہ زیبا نہیں کہ وہ والدین کے ساتھ اسی طرح پیش آئے جس طرح اپس میں یا اپنے ہم جنسوں سے پیش آنا مثلاً ان کے عیوب کی گرفت یا ان پر لعن وطعن وغیرہ اور ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ہر سلطنت میں خواص سلطنت کی ایک جماعت ہوتی ہے مثلاً شہزادے، بیگمات، وزراء، عمائد اور امراء جنہوں نے ابتدا میں اس سلطنت کی نشوونما میں خاص کردار ادا کیا ہوا ہوتا ہے اور انتہاء میں وہ اس کے بقا کا سبب بنتے ہیں انہی انتھک جدوجہد اور محنت کے سبب اس مملکت کا وجود ممکن ہو سکا اب جو لوگ اس مملکت میں رہتے ہوئے فائدہ اٹھاتے ہیں ان کے ذمہ ان حضرات کی سابقہ خدمات کا حق ادا کرنا اور ان کے ربط قدیم کا اعتراف کرنا لازمی ہے ان قدیم ذمہ داران مملکت کے علاوہ ایک وہ جماعت ہوتی ہے جو قیام ملک کے بعد آئی اور اس کے وسائل سے مستفید ہو رہی ہے تو یہ نئی جماعت جو برتاؤ اپنے ہم چشموں اور ہم عصروں سے کرتے ہیں ویسا ہی برتاؤ بانیان مملکت سے کریں گے تو وہ

1۔صحیح البخاری،باب ویؤثرون علی أنفسهم ولو کان بهم خصاصة، 4/ 227

2۔سورۃ الاحزاب، الایۃ: 6

3۔المستدرک علی الصحیحین للحاکم، ذکر مناقب عبد الرحمن بن عوف، 3/ 352، رقم:5360، ط: دار الکتب العلمیۃ بیروت

باعث تعال ہوں گے اور لائق سرزنش ان خواص کا باہم معاملہ جیسا بھی ہو نئی جماعت اگر اپنے معاملات کو ان پر قیاس کرے گی تو وہ توہین مملکت کا سبب بنیں گے ایک دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی رزیل کسی شریف کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو اس شریف نے کسی دوسرے شریف کے ساتھ کیا ہو تو وہ عقلاء کے نزدیک معذور نہیں سمجھا جائے گا بلکہ اس کو تنبیہ کریں گے سزا دیں گے اور کہیں گے، ایاز قدر خود بشناس۔

مقدمہ نمبر 3: یہ کہ مومنین کی آپس میں دشمنی جو کسی دنیاوی بات کے سبب ہو وہ ایمان میں خلل انداز نہیں ہوتی، البتہ قبیح اور قابل مذمت ضرور ہے، اور پھر اس میں حفظ مراتب کا خیال نہ رکھا گیا تو بہت ہی زیادہ بری اور لائق مذمت ہے اور لحاظ اور حفظ مراتب کا مطلب یہ ہے کہ دونوں ہم مرتبہ ہوں چاہے خواص میں سے ہوں چاہے عوام میں سے اور عدم حفظ مراتب کی شکل یہ ہے کہ عامی کسی خاص سے الجھ جائے اور اس سے وہ سلوک کرے جو اپنے ہم جنس وہم طبقہ سے کرتا ہے۔

صدر اول میں خواص تین قسم پر تھے اصحاب، ازواج، اہل بیت اس کے بعد کے زمانہ میں بھی تین ہی رہے سادات، علماء اور مشائخ طریقت گویا یہاں دو دعوے کیے گئے ہیں کہ باہم دشمنی ایمان میں خلل نہیں ڈالتی اور مذموم و قبیح ہے ان دونوں دعوؤں کے لیے کافی کلینی کی ایک ہی روایت بطور ثبوت کافی ہے ملا محمد رفیع جناب ابو عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کے قصے آزردگی کے ذیل میں صفوان جمال سے بحوالہ کافی جو روایت لایا ہے اس کے آخر میں کہتا ہے کہ حضرت ابو عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ گفتگو پر ایک ہی رات گزرنے پر جناب عبداللہ بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کے گھر تشریف لے گئے اور صلح کرلی بحوالہ کافی اس نے یہ بھی بیان کیا ہے:

لا يفترق رجلان على الهجران إلا استوجب أحدهما البراءة واللعنة وربما استحق ذلك كلاهما، فقال له معتب: جعلني الله فداك هذا الظالم فما بال المظلوم؟ قال: لأنه لا يدعو أخاه إلى الصلح ولا يتغامس له عن كلامه[1]

دو شخص باہم یک دیگر آزردگی دل میں رکھ کر جدا نہیں ہوتے مگر ان میں سے ایک اللہ تعالی کی

---

1 ـ الأصول من الكافي، باب الهجرة، 2/ 344، ط: دار الكتب الاسلامية

طرف سے بیزاری ولعنت کا سزاوار ہوتا ہے اور بعض اوقات دونوں ہی مستحق ہوتے ہیں معتد راوی نے کہا میں آپ پر فدا ظالم تو ٹھیک مستحق بیزاری ولعنت ہو اگر مظلوم وہ کس وجہ سے اپ نے فرمایا وہ اس لیے کہ نہ اس نے چشم پوشی کی اور نہ بھائی کو صلح ہی کی دعوت دی۔

اس سے یہ بات تو معلوم ہو گئی کہ خواص امت میں اس قسم کی آزردگیاں پیدا ہوتی رہی ہیں مگر ان کے ایمان پر خلل انداز نہیں ہو سکی ہیں دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس قسم کی آزردگیاں ایمان میں خلل انداز نہ ہونے کے باوجود کبھی اور مذموم جن کا جلد دفیہ ہو جانا چاہیے آزردگی خواص کا گواہ وہ قصہ ہے جو بقضائے شریعت باوجود درجہ و مرتبہ مساوی ہونے کے وقوع پذیر ہوا اور جس کے سلسلے میں جناب امیر رضی اللہ عنہ لقب ابو تراب سے متفخر ہوئے یہ واقعہ آپ اور سیدۃ النساء بی بی فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے مابین پیش آیا ملا محمد رفیع واعظ نے اس قصہ کو بیان کر کے تقاضائے بشریت پر محمول کیا ہے۔

مقدمہ نمبر 4: یہ کہ مطلق دینی عداوت کا دارو مدار کفر پر ہے ہر کافر کو دشمن جاننا چاہیے کیونکہ احکام قرآنی کی روسے دینی عداوت کا سبب کفر ہے اور جب علت و سبب ایک ہو تو حکم بھی ایک ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ"[1] یا اللہ تعالیٰ کا قول "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ"[2] یا فرمایا "لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللهِ فِي شَيْءٍ"[3] پہلی آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر مسلمان کے کسی کافر سے باپ بیٹا

1۔ سورۃ المجادلۃ، الایۃ: 22

2۔ سورۃ المائدۃ، الایۃ: 51

3۔ سورۃ ال عمران، الایۃ: 28

عزیز و دوست ہونے کے دنیاوی تعلقات ہوں تو کفر کے ہوتے ہوئے سب تعلقات قابل ترک اور بے اعتبار ہوں گے ان کو نظر انداز کر کے مدار عداوت پر رکھنا چاہیے اور محبت دینی کا ایمان پر لہذا تمام اہل ایمان سے بحثیت ایمان محبت رکھنا واجب ہے خواہ وہ فرمانبر دار ہوں یا نافرمان کیونکہ وجوب محبت کا جو سبب ہے وہ دونوں میں موجود و مشترک ہے اور جب علت پائی جائے تو حکم کا وجود واجب ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے "وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ "[1] اور یہ طے شدہ بات ہے کہ ایک شئ کا محب اس کے محب و محبوب دونوں ہی کا محب ہوتا ہے اللہ تعالی تمام مسلمانوں کا محبوب ہے اللہ تعالی کی محبت ہر مسلمان کے دل میں باقی دوسروں سے زیادہ ہونی چاہیے جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا "وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ "[2] اہل ایمان اللہ کی محبت سب سے زیادہ رکھتے ہیں، اور جب اللہ تعالی مومنوں کو مطلقا دوست رکھتا ہے تو یہ لازم ہوا کہ ہر مومن تمام مومنوں کو دوست رکھے ورنہ پھر وہ خدا کا دوست نہ رہے گا۔

"اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ "[3] اللہ مسلمانوں کا دوست ہے انہیں اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے نیز فرمایا " ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَأَنَّ الْكَافِرِينَ لَا مَوْلَى لَهُمْ "[4] اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالی ایمان لانے والوں کا دوست حامی ہے اور کافروں کا کوئی دوست نہیں یا یہ ارشاد "إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا "[5] وہ لوگ جو ایمان لائے اور پسندیدہ کام کیے ان پر عنقریب اللہ کی دوستی ظاہر ہو جائے گی قرآن سے یہ بات بھی یقینی طور پر

1۔سورۃ التوبۃ، الآیۃ: 71

2۔سورۃ البقرۃ، الآیۃ: 165

3۔سورۃ البقرۃ، الآیۃ: 257

4۔سورۃ محمد، الآیۃ: 11

5۔سورۃ مریم، الآیۃ: 96

معلوم ہوتی ہے کہ مومنوں کی دوستی کسی صغیرہ یا کبیرہ گناہ سے زائل نہیں ہوتی "إِذْ هَمَّتْ طَائِفَتَانِ مِنكُمْ أَنْ تَفْشَلَا وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا"[1] جب تمہارے دو گروہوں نے بزدلی دکھانے کا ارادہ کیا مگر اللہ تو ان دونوں کا دوست ہے، ان دونوں فرقوں سے مراد بالاتفاق بنو سلمہ اور بنو حارثہ ہیں جنہوں نے یوم عہد کے موقع پر رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی کے بہکائے میں آکر میدان جنگ سے بھاگنے کا ارادہ کر لیا تھا ظاہر ہے یہ حرکت گناہ کبیرہ شمار ہوتی ہے، خصوصاً ایسے جہاد کے وقت کے خود پیغمبر ﷺ اس میں بنفس نفیس موجود ہوں اور بھاگ جانے پر آپ کی ہلاکت کا پورا پورا گمان اور خطرہ ہو اور پھر جب کہ وقت ایسا نازک ہو کہ ملت اسلامیہ کی نشو نما پورے طور پر نہیں ہو سکی اسلام کا پودا ابھی پورے طور پر جڑ بھی نہیں پکڑ سکا ایسے وقت ذرا سی غلطی اور قصور سے نہایت ہی ہولناک اور تباہ کن اثرات بھی ظاہر ہو سکتے تھے ان سب کے باوجود اللہ تعالی نے ان کی دوستی سے دستبرداری ظاہر نہیں فرمائی اور دونوں گروہوں کو مومنین ہی کے خطاب سے یاد کیا "وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ"[2] مومنوں کو بھروسہ اللہ ہی پر رکھنا چاہیے، اتنی محبت تو محض بد قاضہ ایمانی ضروری ہے اور جب مسلمانوں میں اعمال صالحہ بھی پائے جاتے ہوں مثلاً جہاد قتال مرتدین توبہ طہارت تقویٰ اور اچھے اخلاق تو ایسی صورت میں تو وہ خاص اور یقینی طور پر اللہ تعالی کے محبوب ہوں گے فرمایا اللہ تعالی نے " إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ "[3] یا فرمایا " يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ"[4] یا ارشاد ہوا " إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ"[5] یا فرمایا:

1۔سورۃ ال عمران ، الایۃ: 122

2۔سورۃ ال عمران ، الایۃ: 122

3۔سورۃ الصف، الایۃ: 4

4۔سورۃ المائدۃ، الایۃ: 54

5۔سورۃ البقرۃ، الایۃ: 222

"إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ"[1] یایوں ارشاد ہوا" وَاللهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ"[2]

مقدمہ نمبر 5: یہ کہ مومن وکافر کے ساتھ محبت وعداوت کے مختلف مراتب اور جداجدا درجے ہیں مثلاً باپ بیٹا بھائی چچاموماں اور بہن کے ساتھ محبت اور تعلق خاطر میں جو تفاوت اور فرق پایا جاتا ہے اس سے ہر عقلمند واقف ہے اور محسوس کرتا ہے، اسی طرح دنیاوی دشمنوں میں عداوت کے قوی وضعیف ہونے یا آثار عداوت کی قلت وکثرت میں جو تفاوت اور فرق واختلاف ہے وہ بھی کوئی پوشیدہ بات نہیں بعینہ اسی طرح وہ محبت دینی جو ایمان کی وجہ سے ہو اس میں تفاوت اور اختلاف ہونا بلحاظ ایمانی قوت یا اس میں زیادتی کے بموجب درجہ ایمان کے علو وبلندی کے اور بمقدار اختلاف وتفاوت مسلمانوں کے محب یا محبوب خدا ہونے میں لہذا جس کا درجہ محبوبیت زیادہ ہو اس سے محبت بھی زیادہ رکھنی چاہیے۔

بالاتفاق محبت کا بلند درجہ وہی ہے جو سید المرسلین، رسول رب العالمین، حبیب خدا ﷺ کی ذات مبارک سے ہو اس کے بعد ان سارے مسلمانوں سے جن کو آپ کی ذات مبارک سے انتہائی نزدیکی اور بڑا قرب حاصل ہے یہ جماعت تین طبقوں پر مشتمل ہے:

1۔ اولاد واقارب جو آپ کے جسم اطہر کا جزاور جگر پارے ہیں جن کے بارے میں ارشاد فرمایا:

أحبوا الله لما يغذوكم من نعمه، وأحبوني لحب الله، وأحبوا أهل بيتي لحبي[3]

اللہ کو محبوب رکھو کہ وہ تم کو نعمتوں سے پالتا ہے اور اللہ کی محبت کی خاطر مجھ سے محبت رکھو اور میری محبت کے حصول کے لیے میرے اہل بیت سے محبت رکھو۔

2۔ ازواج مطہرات جو آپ کے اجزائے بدن کے بمنزلہ ہیں جو آپ کی ناموس عزت وابرو ہیں اور آپ کی جلوت و خلوت کی محبوب ہستیاں ہیں جن کی شان میں ارشاد ربانی ہے "وازواجه امهاتهم "بنی نوع انسان اس پر متفق

1۔سورة التوبة، الآية: 4

2۔سورة ال عمران، الآية: 134

3۔المعجم الكبير، للطبراني، 10/ 281، رقم: 10664، ط: مكتبة ابن تيمية القاهرة

ہے کہ بیویاں انتہائی خلط ملط اور الفت و محبت کے سبب اعزاز و اکرام اور تعلق خاطر میں شوہر کا حکم رکھتی ہیں وہ درحقیقت یک جان دو قلب کا درجہ رکھتی ہیں اسی لیے شریعت میں محرمیت و میراث کے معاملہ میں سسرالی تعلق کو معتبر معنی ہے اور احسان جتاتے وقت نسب وصہر دونوں کو شانہ بشانہ رکھ کر ایک لڑی میں پرو دیا ہے:

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا[1]

وہ وہ ذات ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا پھر اس کو نصب اور سسرال میں تقسیم کیا۔

3۔ رفقائے سفر اصحاب کرام جو زندگی کے سفر میں آپ کے ہم قدم وہم عنان وہم آواز رہے آپ کی نصرت و اعانت میں ہمیشہ بڑھ کر اپنی جانوں کے نظرانے پیش کیے صحیح معنوں میں آپ کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہایا جان و مال و عزت و ابرو سب کچھ اپ کے لیے خطرہ میں ڈالا گھر بار کو خیرباد کہا سارے دنیاوی رشتہ و پیوند توڑ ڈالے اور آپ کی خوشنودی کی خاطر ماں، باپ، بھائی، بیٹے بیوی بہن اور سارے اقارب سے ناطہ توڑ لیا ان کی یہی قربانیاں اور جذبات ایثار و محبت اللہ تعالی کی نظر میں معتبر اور وقیع ٹھہرے اور ان کے اس عمل کی قدردانی فرمائی ان کے حق میں خاص عنایت کا یوں اظہار فرمایا:

"لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ، وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ"[2]

یہ بات سارا عالم جانتا ہے کہ اس قسم کی سچائی اور خلوص نزدیکی اور قرب میں نسب سے بھی اعلی وارفع ہے جیسا کہ کسی عربی شاعر نے کہا:

1۔سورة الفرقان، الاية: 54

2۔سورة الحشر، الاية: 8، 9

القوم اخوان صدق بينهم سبب   من المودة لم يعدل به نسب

یہ لوگ باہم برادران صداقت ہیں ان کے درمیان دوستی کا وہ رشتہ ہے جس کی برابری نسب بھی نہیں کر سکتا

لہٰذا ان تینوں طبقوں میں عام مسلمانوں کی نسبت اور بلحاظ جملہ مسلمانوں کے محبت کے اسباب دو وجوہ سے قوی اور زیادہ بھرپور اور بکثرت ہیں:

اول حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کا انتہائی قرب و اتصال جس کی وجہ سے تمام بنی آدم سے محبوبیت میں ممتاز و منفرد ہیں۔

دوم دین شریعت کا ان کے ذریعہ رواج پانا اور دور و نزدیک اس کی اشاعت اور پھیلاؤ اور تقویٰ اور جہاد میں ان کا بلند ترین درجہ، ہاں اس جماعت میں سے کوئی اگر گناہ کا مرتکب ہو یا ایمان سے خالی ہو اور اس کے سبب اس کے سابقہ اعمال سوخت ہو گئے ہوں تو نص قرآن کے مطابق ان کے ساتھ عداوت و دشمنی واجب ہے رسول محترم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قربت کا اعزاز اس برائی کی وجہ سے ساقط ہو جائے گا اور یہ گروہ بالا کے حکم سے مستثنیٰ ہو جائے گا مثلاً ابو لہب وغیرہ اب ان اشخاص کے ایمان واد میں ایمان اور اعمال و اطاعت کے سوخت ہونے کے متعلق چھان بین اور تحقیق و تفتیش کرنی چاہیے، خواجہ نصیر طوسی ایمان و کفر ایمان کی بحث اور حبط اعمال کے ذیل میں تجرید العقائد میں کہتا ہے "الإيمان التصديق بالقلب واللسان" ایمان زبان و قلب کی تصدیق کا نام ہے ،لکل ما جاء به النبي صلي الله عليه وسلم وعلم من دينه ضرورة ولا يكفي الأول ہر اس چیز کے ساتھ جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لائے اور ضروریات دین کا جاننا اور پہلے کا جاننا ہو اکافی نہیں ،بسبب فرمان الٰہی "واستيقنتها أنفسهم "یقین سے جان لیں ان کے نفوس" ولا يكفي الثاني "تصدیق کے بغیر اقرار بھی کافی نہیں ،بسبب قول خداوندی "قل لم تؤمنوا" آپ کہیے کہ تم ایمان ہی نہیں لائے۔[1]

خواجہ مذکور یہ بھی کہتا ہے "والكفر عدم الإيمان" اور کفر ایمان نہ ہونے کا نام ہے اس قول میں اس کا اشارہ اس طرف ہے کہ ایمان و کفر میں کوئی واسطہ نہیں جیسا کہ معتزلہ کا مذہب ہے "إما مع الضد أو

---

1 ۔کشف المراد في شرح تجريد الاعتقاد، ص: 454، ط: منشورات شکوری قم

بدونه "ضد کے ساتھ یا بغیر ضد کے، وہ یہ بھی کہتا ہے "والفسق الخروج عن طاعة الله مع الإيمان" فسق اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل جانا ہے سلامتی ایمان کے باوجود، یعنی وہ فسق جو ارتکاب معصیت کہلاتا ہے یہ ایمان سے منافات نہیں رکھتا اور مومن فاسق ہو سکتا ہے وہ یہ بھی کہتا ہے "والنفاق إظهار الإيمان و إخفاء الكفر والفاسق مؤمن مطلقا" کفر چھپا کر ایمان کا اظہار نفاق ہے، اور فاسق مطلقا مومن ہے،[1] یعنی احکام دنیا آخرت میں مثلاً تجہیز و تکفین، دعائے مغفرت، صدقات، تحریم لعن و تبرا بحیثیت ایمان اس کی محبت واجب ہونے میں یا دخول جنت میں گو بعد عذاب ہی ہو اس کے لیے پیغمبر کی شفاعت ہونے میں اور اس امکان میں کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کرے جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ادخرت شفاعتي لأهل الكبائر من أمتي، ولوجوب الندم والكافر مخلد في النار وعذاب صاحب الكبيره ة منقطع لاستحقاق الثواب بايمانه فمن يعمل مثقال ذره خيرا يره ولقبحه عند العقلاء والسمعيات متاوله ودوام العقاب مختص بالكافر والعفو واقع لانه حقه تعالى وجاز وقوعه[2]

میں نے شفاعت گناہ کبیرہ کرنے والوں یا اس کی کوشش کرنے والوں کے لیے اٹھا رکھی ہے اور کافر تو ہمیشہ دوزخ میں رہے گا اور کبیرہ کے مرتکب کا عذاب ختم ہو جائے گا کیونکہ ایمان کی وجہ سے وہ مستحق ثواب بھی تو ہے جسے ذرہ بھر نیکی کی ہو گی وہ اسے ضرور دیکھے گا عقلاء کے نزدیک یہ قبیح ہے اور سمعیات قابل تاویل ہیں عذاب کی ہمیشگی کافر کے ساتھ مخصوص گناہ کی معافی ضرور ہو گی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے جو وہ وقوع میں آئے گا۔

لہٰذا خواجہ نصیر کے پورے کلام سے پتہ چلا کہ فاسق پر لعنت بھیجنا اور اس سے بیزاری ظاہر کرنا جائز نہیں

1۔کشف المراد في شرح تجريد الاعتقاد، ص: 454، ط: منشورات شكوری قم

2۔کشف المراد في شرح تجريد الاعتقاد، ص: 566، ط: منشورات شكوری قم

بلکہ اس کی شان دوسرے مومنوں کی طرح ہے کہ اس کی مغفرت کی دعا بھی کی جانی چاہیے اس کے لیے بھی ایصال ثواب ہونا اور صدقہ وخیرات کی جانی چاہیے تاکہ عذاب سے چھٹکارا پائے اس کی نجات اور اس کے لیے پیغمبر کی شفاعت کی امید رکھنی چاہیے اور جب تک اس میں ایمان موجود ہے اس سے محبت رکھنا واجب ہے اور اس سے عداوت دینی نقطہ نظر سے حرام ہے کیونکہ تبرہ اور گالی اس وقت تو خیر ٹھیک ہو سکتی ہے کہ اس میں محبت کی کوئی وجہ موجود نہ ہو اور اس کی صرف ایک صورت ہے کہ اس کی موت کفر پر ہو اس لیے کہ کفر کے ہوتے پھر کسی عمل خیر کا کوئی اعتبار نہیں فسق وگناہ کے سبب اس سے اظہار بیزاری جائز نہیں ہاں اس کے فعل فسق وعصیان سے بیزاری ضرور ظاہر کرنے اور اسے برا سمجھنا چاہیے، خواجہ نصیر نے تجرید میں یہ بھی کہا ہے:

والإحباط باطل لاستلزامه الظلم، ولقوله تعالى: فمن يعمل مثقال ذرة خيرا يره[1]

اعمال کی سوخت غلط بات ہے اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قول جو ذرہ بھر بھی نیکی کرے گا اس کا اجر پائے گا کہ روشنی میں ظلم کو لازم کرتا ہے، لہٰذا جب تک اس سے کفر سرزد نہ ہو اس کا کوئی عمل سوخت نہ ہوگا۔

مقدمہ نمبر 6: بالاتفاق صحابہ کرام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم سے وہ چیز صادر نہیں ہوئی جو ان کے کفر کا سبب ہو کر ان کے اعمال حبط کرنے کا باعث بنتی یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ربط کو گھٹاتی یا کم کرتی یا اعتبار کھوتی سوائے اس کے فدک جیسے معاملات میں خلاف وغصب حقوق اہل بیت کے سلسلہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ سے مخالفت رونما ہوئی اور نوبت محاربہ تک پہنچی اب ذرا یہاں یہ غور کر لیا جائے کہ علماء شیعہ کے نزدیک یہ مخالفت محاربہ غصب کفر ہے یا نہیں اس سلسلہ میں خواجہ نصیر طوسی کا قول مشہور ہے کہ "مخالفوه فسقة ومحاربوه كفرة"[2] ان کے مخالف فاسق ان سے لڑنے والے کافر ہیں، لہٰذا صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے جنہوں نے صرف مخالفت کی وہ تو تبرا کے لائق نہیں کیونکہ ان کے عمل کو کھینچ تان کر زیادہ سے زیادہ فسق کہہ سکتے ہو اور فاسق

1۔ كشف المراد في شرح تجريد الاعتقاد، ص: 276، ط: منشورات شكوري قم

2۔ كشف المراد في شرح تجريد الاعتقاد، ص: 243، ط: منشورات شكوري قم

مومن ہے تو گویا شیخین اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم پر خود اصول شیعہ کے مطابق تبرا جائز نہیں اور اتنی بات کا ان کے محقق علماء نے بھی اعتراف کیا ہے۔

قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں تحریر کیا ہے کہ شیعوں کے بارے میں اہل سنت کا یہ کہنا کہ وہ شیخین رضی اللہ عنہما کو کافر ٹھہراتے ہیں یہ ایسی بات ہے کہ کتب اصول شیعہ میں نہ اس کی کوئی بنیاد ہے نہ اصلیت ان کا مذہب صرف اسی قدر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالف فاسق ہیں اور ان سے لڑنے والے کافر جیسا کہ نصیر الدین طوسی نے تجرید میں لکھا ہے اور مقتضائے حدیث "حربك حربي وسلمك سلمي"[1] تیری لڑائی میری لڑائی اور تیری صلح میری صلح ہے یہی ثابت ہوتا ہے اور ظاہر بھی ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما نے حضرت امیر رضی اللہ عنہ سے جنگ تو نہیں بلکہ جنگ و قتال کیے اور تلوار و بھالے کی زحمت برداشت کیے بغیر اپنے لاؤ لشکر اور پیروؤں کی زیادتی کے سبب ان کے حق کو سلب کیا اور رسول کی خلافت کے حق کو غصب کیا۔

ملا عبد اللہ مشہدی مصنف کتاب اظہار الحق اس اصل پر بحث کرتے ہوئے اس کا جواب لکھتا ہے:

> بحث یہ کہ اگر کوئی کہے کہ خلافت مرتضیٰ کے بارے میں اگر نص صریح نہیں ہے تو امامیہ جھوٹے ہیں اور اگر ہے تو جن صحابہ نے مسئلہ خلافت میں مخالفت کی ان کا مرتد ہونا لازمی ہوتا ہے اس کو بھی جنسی ہی لکھ کر لکھتا ہے کہ جس نص کا انکار موجب کفر ہے وہ یہ ہے کہ نص شدہ کو باطل خیال کریں اور اس نفس میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاذ اللہ تکذیب کریں لیکن حق تو ان کا مانتے ہیں، مگر اغراض دنیاوی مصالح سیاسی یا مال وجاہ کے سبب اسے نظر انداز کر دیں تو یہ عصیان ہوگا کفر نہیں ہوگا مثلاً زکوٰۃ باجماع امت واجب ہے اور قرآن وحدیث سے منصوص ہے لہذا جو اس کا انکار کرے گا مرتد ہو جائے گا اور جو وجوب کا تو معتقد ہو مگر پیسے کی محبت یا بخل کے سبب ادائیگی سے روگردانی کرتا ہے تو وہ اپنے اوپر گناہ کا بوجھ لادتا ہے اور یوں گناہ گار ہوتا ہے، جن حضرات نے خلیفہ اول کی خلافت پر اتفاق کیا وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نص مگر صحیح نہیں کیا بلکہ بعض اوقات بعض

1۔الأمالي للشيخ الصدوق، ص: 656، ط: مؤسسة البعثة

لوگ تو یہ کہتے کہ اس سلسلہ میں پیغمبر ﷺ سے کوئی نص مذکور نہیں اور بعض دوسرے کلام پیغمبر علیہ السلام میں رکیک تاویلات کرتے۔[1]

ان کے اس کلام سے چند مفید نتائج حاصل ہوئے اول تو یہ کہ نص کے معنی سے انکار یا اس کے مدلول میں فاسد تاویل سے کفر لازم نہیں آتا بلکہ یہ ایک قسم کا فسق اعتقادی ہے جسے اہل سنت کے ہاں خطائے اجتہادی سے موسوم کیا جاتا ہے دوسرے فدک کا غصب یا قرطاس نہ دینا یا اس کے علاوہ امور جو بعض حضرات سے صادر ہوئے اور اس کا سبب حدیث "نحن معاشر الانبیاء لانورث ولانورث"[2] یا آیت "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِینَکُمْ"[3] سے استدلال ہو تو یہ بھی کفر نہیں بلکہ فسق اعتقادی ہی کی ایک شکل ہے جسے ہم خطائے اجتہادی کہتے ہیں اس لیے کہ جب امامت کے مسئلہ کی نص میں باطل تاویل کفر کا سبب نہ بن سکی تو مسئلہ میراث یا کچھ لکھ دینے میں جو مسئلہ امامت سے بالاتفاق ہزاروں درجہ کم ہے آیت وحدیث سے تمسک کرنا کیوں کفر کا سبب ہوگا اس کی تصریح خود انہوں نے بھی اپنے ہاں کی ہے۔

خلاصہ کلام یہ نکلا کہ مسئلہ خلافت میں اختلاف جب تاویل کی بنا پر ہو تو وہ اعتقادی فسق ہے اس سے ہی یہ لازم آیا کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت بلا فصل کا اعتقاد ان کے ہاں حقیقت ایمان میں داخل نہیں بخلاف نماز روزہ و زکوٰۃ کی فرضیت کے ارتقاد کے اس فرق کو جو کہ پورے فرقہ کا اجماعی ہے قیمتی ثبوت اور دستاویز کی طرح ہاتھ سے

1۔ اگر کسی گوید کہ امامیہ را بر خلافت علی علیہ السلام نص صریح نیست پس امامیہ کاذب باشد و اگر نص صریح ہست پس مخالفت کنندگان مرتد باشند۔ جواب گوییم کہ انکار نص صریح موجب کفر آن وقت شود کہ اعتقاد بہ بطلان امر منصوص داشتہ باشد و تکذیب پیغمبر کند۔ اما اگر نص را حق داند و بسبب اغراض دنیوی یا حب جاہ و مال ترک عمل بر آن کند، آن فسق باشد نہ کفر۔ چنانکہ وجوب زکوٰۃ بنص صریح و اجماع امت ثابت است، اگر کسی انکار وجوب کند کافر شود و اگر اعتقاد بوجوب داشتہ باشد و بسبب بخل و حب مال ادا نکند گناہگار و فاسق باشد۔ و آنکہ گویند اجماع بر خلافت اول شدہ است، این کذب است بلکہ بعضے از صحابہ انکار نص کردہ اند اما بسبب تاویلات بعیدہ و اعراض از حق۔ (اظہار الحق فی معارف الائمہ، از عبد اللہ یزدی ،ص:531،532،قدیم بمبئی ایڈیشن)

2۔ ذکر المجلسي: نحن معاشر الأنبياء لا نورث ما تركناه صدقة. (بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار، 28/ 104، مؤسسة الوفاء بيروت لبنان)

3۔سورة المائدة، الآية: 3

نہیں جانے دینا چاہیے یہ تو خود اپنے ہاتھ پاؤں کاٹنے والی بات ہے اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں اسی لیے یہ سب خواجہ نصیر توسی کا قول بطور گواہی بڑے زور کے ساتھ پیش کرتے ہیں گویا میدان مار لیا ہو جب جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی مخالفت کرنے والوں کا ایمان خود انہی کے محققین کے اقرار و اعتراف سے ثابت ہو گیا تو اب ان کے ظاہری اعمال و اخلاق کی بحث لانی چاہیے جو ان کے حسن سیرت پر دلالت کرتی ہے آیت "يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ"[1] کے ذیل میں ملا عبد اللہ مشہدی رقمطراز ہے کہ:

> صرف شہادتین کا اقرار اور اجمالی تصدیق ہر اس چیز کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے اسلام کا ایک مرتبہ ہے اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد پوری امت اجابت یہ مرتبہ رکھتی تھی اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت و نگرانی کے وعدہ کے سبب اس مرتبہ سے باہر قدم نہیں نکالا عقیدہ اسلامی کا اسے قدر حصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کے لیے کافی تھا مثلاً مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دینا مرتدین و منکرین زکوۃ سے قتال یا مدعیان نبوت سے جنگ یا فارس و روم کے کافروں سے جہاد اور جنہوں نے خلافت و ریاست کے حصول کا قصد کیا انہوں نے ان امور میں انتہائی جدوجہد اور کدوکاش اختیار کی کہ لوگوں کی نظر میں استحقاق امیر خلافت پر دھبہ نہ آجائے اور ان میں سے بہت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف پانے کے سبب اور قرب زمانہ کے باعث ان میں صحبت کی برکتیں موجود ہونے کی وجہ سے یہ حضرات صاحب زہد و ورع و تقویٰ بھی تھے جو مالیات محرمات ظاہریہ سے بھی محترز رہے بلکہ بعض مباح اور جائز لذتوں کو بھی ترک کر دیا ان سے جو کچھ غفلت و سستی عمل میں آئی وہ امر خلافت اور حقوق اہل بیت میں تھی۔[2]

اس تحریر سے معلوم ہو گیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت شریف کی برکت سے اور اس برکت شریف کے ان کے جان و دل میں گھر کر لینے سے یہ نفوس مقدسہ اصل ایمان کے علاوہ ورع، زہد و تقوی سے بھی آراستہ تھے نیز یہ

1۔ سورۃ المائدۃ، الآیۃ: 67

2۔ اظہار الحق فی معارف الائمہ، از عبد اللہ یزدی، ص: 152، قدیم بمبئی ایڈیشن

بھی معلوم ہوا کہ ان حضرات کا پیغمبر ﷺ کے ساتھ تعلق خلوص قلب کے ساتھ تھا نفاق و ظاہر داری کی تو ان حضرات کو ہوا بھی نہیں لگی تھی یہ نہ ہوتا تو صحبت مبارک سے اکتساب فیض اور اصول برکت کیسے کر سکتے تھے۔

اب یہاں عقلاء کے لیے قابل غور بات یہ ہے کہ جب خود انہی کے بلا جبر و اکراہ برضا و رغبت خود اقرار و اعتراف سے یہ معلوم ہو گیا کہ ایمان ورع تقویٰ اور زہد ان میں بالیقین موجود تھا تو اس کے بعد یہ دعویٰ کرنا کہ امر خلافت اور اہل بیت کے حق میں ان سے گناہ صادر ہوا ایک یقینی الثبوت چیز کے خلاف دعوی کرنا ہے۔

معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ ان حضرات کا یہ عمل کسی دلیل سے تمسک کسی عالی نسب کے فہم کے سبب ہی وقوع میں آیا ہو گا کیونکہ جب صحبت پیغمبر ﷺ نے ان میں اتنا اثر کر لیا کہ وہ اتقاء و زہد اور ورع کے ایسے روشن پیکر بن گیا کہ اپنے پرائے سب ان کی خوبیوں کو سراہنے لگے تو ایسی صورت کے بعد ان کے متعلق یہ تصور کر لینا کہ انہوں نے یہ حرکت دنیاوی لالچ یا حب مال وجاہ کی خاطر دیدہ و دانستہ کی ایسی متضاد بات ہے جو کوئی بھی عقلمند نہیں کہہ سکتا اگر ایسا ہے تو پیغمبر ﷺ کے شرف صحبت پر تو حرف آئے گا مگر ان کے زہد و تقویٰ ورع اور محرمات سے بچنے کی صفت کہاں بچیں گی جن کا انہوں نے خود ہی اعتراف کیا اور انہوں نے اپنی تحریر میں جو یہ جملہ ٹانک دیا ہے کہ یہ وہ کدو کاوش اس لیے کرتے تھے کہ لوگوں کی نظروں سے گر کر امر خلافت کی اہلیت نہ کھو دیں تو یہ ان کی اٹکل اور بے سرو پا ہوائی ہے بلکہ پھڑکتے اور دھڑکتے دل کو تھامنے کی کوشش ناکام ہے یا پھر دل کی باتیں جاننے کا دعویٰ ہمیں اتنے تکلفات میں پڑھنے کی تکلیف ہی نہیں دی گئی ظاہری حال کے مطابق تکلیف دی گئی ہے کسی کو بظاہر اچھا دیکھیں اچھا سمجھیں اچھا کہیں اور پھر یہاں تو اس ظاہر کے ساتھ ساتھ اس کا اعتراف بھی کیا گیا ہے کہ ان کے حالات کی حسن بخوبی صحبت شریف کی برکت سے تھی تو لامحالہ اس صحبت نے ان کے باطن پر بھی تو اثر کیا ہو گا۔

بہر حال یہ بات طے ہے کہ علماء شیعہ کے اعتراف سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی جماعت کے خصائص و فضائل کرسی نشین ہو گئے پر ثابت ہو گیا کہ وہ باایمان تھے زاہد و متقی اور ورع والے تھے محرمات سے اجتناب کرتے تھے بلکہ بعض مباحات سے بھی بچتے تھے اس کو رائج کرنے مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکالنے کفار فارس و روم کے ساتھ جہاد کرنے میں انہوں نے کوشش کی۔

اللہ کے ہاں صحابہ رضی اللہ عنہم کا مقام

اب ہم اس بحث کا غاز کریں گے کہ ان حضرات عالی وقار اور والا تبار کا درجہ اور مقام اللہ تعالی کے نزدیک کتنا بلند اور عالی تھا اور ان کے اعمال صالحہ کو دربار خداوندی میں کیسی پذیرائی ملی یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اللہ تعالی کی رضا اور خوشنودی سے بڑھ کر کوئی مرتبہ عالی اور بلند نہیں ہو سکتا جس کو اللہ تعالی پسند فرمالے وہ خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو تمام اہل ایمان میں مقبول ہو گا فرمایا:

وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ[1]

ملا عبداللہ مشہدی صاحب کتاب اظہار الحق نے کہا ہے کہ:

اس آیت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت پر اہل سنت کا استدلال ہر صورت میں صحیح ہے اس کے جواب میں امامیہ کی مشہور باتیں اپنی روش کے مطابق نہ جاندار ہیں نہ کوئی قوت رکھتی ہیں البتہ مشہور باتوں کے خلاف جواب دے سکتے ہیں۔[2]

فریق مخالف کے طریقے استدلال کی جو صورت ہے وہ تفسیر نیشاپوری میں یوں ہے:

قال اهل السنه لا شك ان ابا بكر سبق الى الهجره فهو من السابقين وقد اخبر الله تعالى بانه رضي عنه ولا شك ان الرضا معلل بالسبق الى الهجرة فيدوم بدغامه فدل ذلك على صحه امامته وعدم جواز الطعن فيه[3]

1۔سورۃ التوبۃ، الآیۃ: 100

2۔اظہار الحق، از عبداللہ یزدی، ص:155، قدیم بمبئی ایڈیشن

3۔کذا قال ابن کثیر: فقد أخبر الله العظيم أنه قد رضي عن السابقين الأولين من المهاجرين والأنصار والذين اتبعوهم بإحسان فيا ويل من أبغضهم أو سبهم أو أبغض أو سب بعضهم ولا سيما سيد الصحابة بعد الرسول

اہل سنت نے کہا کہ ابو بکر نے ہجرت میں سبقت کی تو وہ سابقین میں سے ہوئے اور سابقین سے اللہ تعالی راضی ہوا تو ان سے بھی راضی ہوا اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہجرت میں سبقت ہی رضامندی کا سبب ہے اور ہجرت کی سبقت دائی ہے لہذا اللہ تعالی کی رضا بھی دائمی رہے گی معلوم ہوا ان کی امامت صحیح ہے اور ان پر طعن ہر گز جائز نہیں۔ (1)

اس کلام کے بعد ملا مشہدی کہتا ہے کہ:

اس بات کا یہ جواب دینا کہ ہجرت پر نصرت کی سبقت میں ایمان شرط ہے اور وہ شخص معاذ اللہ کبھی ایماندار تھا ہی نہیں حتی کہ امیر مومنین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ناخوشی ظاہر ہونے سے پہلے بھی انصاف سے بہت دور تھا اور یہ کہنا بھی بلا مقصد ایک تکلف ہی ہے کہ سابقین ہجرت و نصرت سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خلافت بلا فصل کی تصدیق کی ہو اور امر خلافت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصیت پر عمل کیا ہو کیونکہ آیت کے کسی لفظ سے اس قید کا پتہ نہیں چلتا۔ (2)

پھر عبد اللہ مشہدی کہتا ہے:

بہتر ہے یوں جواب دیا جائے کہ یہ آیت صرف اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالی مہاجرین و انصار کے سابقین سے اور اس ہجرت پر نصرت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی سبقت سے راضی ہوا اور جب وہ ان کے کسی فعل سے راضی ہوا تو لا محالہ اس کی جزا جنت میں ہمیشہ رہنے سے ہو گی اور ظاہر ہے دخول جنت رضائے الہی پر موقوف ہے اور وہ موقوف اس رضائے الہی کے آخر عمر تک باقی رہنے پر حسن خاتمہ کے ساتھ اور ایمان کی بقا کے ساتھ اور اس شرط کے

وخيرهم وأفضلهم أعني الصديق الأكبر والخليفة الأعظم أبا بكر بن أبي قحافة رضي الله عنه(تفسير القران العظيم لابن كثير، 2/ 398، ط: دار المعرفة بيروت)

1۔ اظہار الحق، از عبد اللہ یزدی، ص:158، قدیم بمبئی ایڈیشن

2۔ اظہار الحق، از عبد اللہ یزدی، ص:162، قدیم بمبئی ایڈیشن

ساتھ کہ اس سے ایسے اعمال صادر نہ ہوں جو اچھے اعمال کو سوخت کر دیں۔[1]

یہ تو ان کے ہاں کے چوٹی کے دانشمندوں کے لیاقت علمی اور حافظہ کا حال ہے کہ وہ اپنے ہی کلام کے ہر پہلو کا بھی لحاظ نہیں رکھ سکتے اور نہ اپنے اصول وعقائد ہی انہیں یاد رہتے ہیں، اول تو بروئے قواعد واصول یہ آیت اس مضمون پر صحیح طور سے دلالت نہیں کرتی جس کی اس میں تقریر کی ہے کیونکہ آیت کا مقصد رضامندی ظاہر کرتا ہے مہاجرین وانصار کی ذاتوں سے اور جب ان کی ذاتوں کو ہجرت ونصرت کے خاص وصف سے یاد کیا ہے تو یہ لازم آیا کہ یہ وصف تعلق کی رضا کا سبب ہو نہ یہ کہ رضا کا تعلق اسی سے ہو اور متعلق رضا ہونے اور تعلق رضا کا سبب ہونے میں جو فرق ہے وہ بالکل ظاہر ہے ملا تو خیر خاصا سن رسیدہ ہے مکتب کے بچے بھی اس فرق کو جانتے ہیں۔

اگر کلام اللہ میں اسی طرح دھاندلی چلنے لگے تو کسی بھی مقصد میں استدلال کی صورت قائم نہیں ہو سکتی مثلاً آیت موالات صرف اسی پر دلالت کرتی ہے کہ تمہاری ولایت اس وصف کے ساتھ متعلق ہے یعنی نماز قائم کرنے اور بحالت رکوع زکوۃ دینے سے اور یہ وصف مشروط ہے اچھے خاتمہ اور فلاں فلاں باتوں سے اسی طرح کی اور بھی مثالیں دی جا سکتی ہیں، دوسرے یہ کہ جب اس عمل کی جزا بالیقین جنت کی دائمی رہائش ہوئی تو اس جزا سے روکنے والی دو ہی چیزیں ہو سکتی ہیں یا کفر وارتداد یا وہ بد اعمالی جو اچھے اعمال کو سخت کر دیں اول صورت میں "مخالفوہ فسقة" درہم برہم ہو جاتا ہے اس کے علاوہ ملا عبداللہ مشہدی نے مذکورۃ الصدر جواب وسوال کے ذیل میں اعتراف کیا ہے کہ کسی تاویل باطل کے بنا پر جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت سے یا نا سے انکار موجب کفر نہیں۔

اور قاضی نور اللہ شوستری مجالس المومنین میں یہ لکھ چکا ہے کہ شیخین رضی اللہ عنہما مرتد نہیں اور یہ سب کچھ بیان ہو چکا ہے دوسری صورت میں خود اپنے عقائد کے خلاف کرنا نصیر الدین طوسی تجرید العقائد میں کہہ ہی چکا ہے کہ حبط اعمال ایک قسم کا ظلم ہے اور طرہ یہ کہ ملا جی کو اپنا یہ عقیدہ ایسا فراموش ہوا اور سخن پروری میں وہ اتنے غرق ہو گئے کہ خلفاء کے اعمال حبط کرنے والے گناہوں کی گنتی اور تعین کرنے لگے کہ چار اعمال کو حبط اعمال کا سبب بھی بیان کر ڈالا اول یہ کہ وہ غزوہ احد میں جنگ سے بھاگے دوم خلافت مرتضی کو غصب کیا، سوم فدک بھی دبا لیا چہارم

1۔ اظہار الحق، از عبداللہ یزدی، ص: 165، قدیم بمبئی ایڈیشن

جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے قرطاس و قلم میں رکاوٹ ڈالی حالانکہ اپنے کلام مذکورۃ الصدر میں خود اعتراف کر چکا ہے کہ امامت مرتضیٰ سے انکار بھی ایت میں تخصیص پیدا نہیں کر سکتا اور اس کو رضا اور خوشنودی سے کوئی منافات نہیں جب وہ رضامندی کے منافی ہی نہیں تو اعمال کس طرح سخت کرے گا اگرچہ تمام شیعوں کے نزدیک بدلیل آیت " لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ "[1] اعمال کا سوخت ہونا کفر و شرک کا خاصہ ہے اور احد کے دن بھاگنا اول تو از روئے قرآن معاف ہو چکا ہے دوسرے وہ اس آیت کے نازل ہونے سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے وہ کس طرح اعمال کے حبط و سوخت کا سبب بنے گا کہ اول تو وف الہی کے باعث گویا نسیاً منسیاً ہوا پھر اس آیت کے نزول کے بعد اگر وہ عمل حبط ہو چکا تھا تو حبط شدہ اعمال کے ساتھ رضائے الہی کا وابستہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔

اس پر اتفاق ہے کہ سورہ توبہ آخر ما نزل ہے اور جنگ احد ہجرت کے تیسرے سال واقع ہوئی اور خلافت مرتضیٰ کو غصب کر لینا باعتراف فضلاء شیعہ کفر نہیں تو اس سے اب حبط اعمال کی صورت کب متصور ہو سکتی ہے اور فدک کا تو غصب واقع ہی نہیں ہوا کیونکہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فدک بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے لے کر اپنے قبضہ میں نہیں لیا بلکہ میراث یا حب ناتمام کی روک تھام کی ہے اسے غصب کوئی فاطر العقل ہی کہہ سکتا ہے اور پھر اس کے باوجود یہ روکنا بھی ایک حدیث سے مشہور کے سبب سے تھا اس لیے وہ گناہ بھی نہ تھا کفر تو دور کی بات ہے اور اعمال سخت ہو جانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں رہا قرطاس و قلم کا معاملہ تو شیخین رضی اللہ عنہما نے اس سے بالکل نہیں روکا " ایتونی بقرطاس " کے مخاطب صرف شیخین رضی اللہ عنہما دو نہ تھے تمام بنی ہاشم اور اہل بیت رضی اللہ عنہم شریک ہیں جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے تو مشورہ دیا تھا اور مشورہ حبط اعمال کا سبب کس اصول قائدے سے ہو گا، حاصل کلام یہ کہ یہاں ملا جی کی بے دست و پائی دیکھنے کے لائق ہے بیچارہ چاروں طرف ٹاک ٹوئیاں مار رہا ہے مگر مقصد کا کوئی پتہ ہاتھ نہیں لگ پا رہا۔

اسی طرح دوسری آیات:

" أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ " اور " وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللهِ لَا يَسْتَوُونَ

---

1 ۔سورة الزمر ، الآية: 65

عِنْدَ اللهِ"اور"الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللهِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ"(1) الى آخر السورة ان آیات مذکورہ بالا میں ملا محمد عبداللہ مشہدی اور ان کے ساتھ دوسرے شیعہ علماء نے بہت ہاتھ پاؤں مارے بہت کوشش کی کہ ادھر ادھر سے کوئی مفید مطلب بات پلے پڑ جائے مگر اے بزقہ آرزو کے خاک شدہ بالآخر ہار تھک کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور چارو ناچار ان حضرات کے مراتب عالیہ کے قائل ہو گئے، یہ ہے ان شیعوں کے نزدیک ان مہاجرین وانصار کا حال جو ان کے خیال میں جناب امیر رضی اللہ عنہ واہل بیت رضی اللہ عنہم کی مخالف تھے جن میں خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے۔

اب رہا معاملہ ان مہاجرین اولین کا جنہوں نے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے محاربہ کیا مثلاً ام المومنین جناب طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہم تو ان کے معاملہ میں شیعہ حضرات بڑے چہ کنم اور تردد میں پڑے ہوئے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ ان کے اگلے لیڈر تو مخالف اور محارب میں کوئی فرق نہیں کرتے وہ تو سب کو کافر کہتے ہیں اور سب پر سب وشتم کرتے اور تبرہ بھیجتے ہیں مگر ان کے پچھلے سوچتے ہیں کہ اگر ہم نے امامت کو نبوت کا درجہ دے کر اس کے منکر کو کافر شمار کیا تو اصول مذہب میں بڑی گڑبڑ پیدا ہو جائے گی ایک خلل اور گڑبڑ تو یہ ہے کہ حضرات ائمہ بلا کسی تکلف اور بغیر کسی مجبوری کے ان حضرات سے رشتہ مناکحت قائم کرتے اور اپنی لڑکیاں ان کو دیتے بھی ہیں اور ان سے لیتے بھی ہیں چنانچہ جناب سکینہ رحمۃ اللہ علیہا کا جناب مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ سے نکاح ہوا اور جناب قاسم بن محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی لڑکی سے جناب امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ نے نکاح کیا اور اسی طرح کا عمل تمام حضرات ائمہ کے درمیان قائم دائم جاری رہا قرض ان حضرات کا معاملہ منکرین امامت کے ساتھ ایسا ہرگز نہ تھا جیسا کہ انکار معاملہ منکرین نبوت کے ساتھ اور ہر امام کی امامت جناب امیر رضی اللہ عنہ کی امامت کی طرح ہے۔

دوسری گڑبڑ یہ کہ خود ان کے اپنے عزیز واقارب ائمہ کے امامت کے منکر ہوئے مثلاً محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کی امامت سے منکر تھے اور ان سے اختلاف رکھتے اور جھگڑا کرتے تھے اور حجر اسود سے فیصلہ طلب کرنے کے بعد بھی اور اس کی شہادت کے باوجود جو جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں

1۔سورۃ التوبۃ، الآیۃ: 19، 20

تھی اپنی امامت کے دعویٰ سے دستبردار نہ ہوئے اور دنیا سے کوچ کے وقت اپنی اولاد کے حق میں امامت کی وصیت کر کے رخصت ہوئے اور نظر دین نیز اور نفس وغیرہ جو کچھ عقائد متفق ان کو بھیجا اس میں جناب زین العابدین کو بالکل شریک نہ کرتے یا حضرت زید شہید رحمۃ اللہ علیہ بلاشبہ اپنی ہی امامت کے مدعی تھے اور امام محمد باقر کی امامت کے منکر انہوں نے اس بارے میں ہشام بن الحکم سے مناظرہ بھی کیا مگر اس دعویٰ سے دستبردار نہ ہوئے حتیٰ کہ شہید ہو گئے اور پھر ان کی اولاد یحییٰ وغیرہ کی جناب جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے بہ سر پرخاش رہے پھر اسی طرح جناب صادق رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد آپس میں لڑتی رہی مثلاً عبداللہ افطح اور اسحاق بن جعفر اپنی اپنی امامت کا دعویٰ کرتے رہے اور اگر امام حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد کو لیں تو ان میں سے بھی ایسے افراد مثلاً نفس زکیہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ تھے جو اپنی امامت کے مدعی ہوئے اور دوسرے ائمہ کے امامت کے منکر تو معاملہ تو تو میں میں سے گزر کر جنگ و قتال تک پہنچا تھا اور لڑائی کی آگ بھڑک اٹھی تھی بلکہ ان کے پیروں نے تو آپس میں کشت و خون کیا اور یہ ساری تفصیلات کتب تاریخ و انساب کے اوراق میں مذکور ہیں۔

لہٰذا اگر انکار امامت انکار نبوت کی طرح کفر ہو تو یہ سب کے سب حضرات کافر ٹھہرتے ہیں اور دوسری طرف وہ حضرات ائمہ جنہوں نے جناب زید شہید اور محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ یا ان جیسے حضرات کے بارے میں خوبی و فلاح کی شہادت دی وہ جھوٹے قرار پاتے ہیں۔ اور اگر یہ کہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد امام وقت کے انکار کے بعد بھی کافر نہیں ہوتی مگر دوسرے ہو جاتے ہیں تو موجبات کفر میں تفاوت و اختلاف اور تمیز لازم آتا ہے حالانکہ موجبات کفر میں بالاتفاق کوئی اختلاف نہیں خواہ امام زادہ ہو یا عامی اور جو زبان سے کلمہ کفر نکالا اور جو کافر ہوا یا آخر مجبور و لاچار ہو کر یہ کہنا پڑا کہ منکر امامت کافر نہیں ہوتا پھر مخالف و محارب میں فرق نکال بیٹھے کہ منکر مخالف ہے اور مخالف فاسق اور محارب کافر لیکن یہاں ایک اور خرابی لازم آگئی کیونکہ انکار امامت کفر نہیں اور محاربہ انکار کو لازم ہے جبکہ امام اپنا تصرف چاہتا ہے تو گویا کفر غیر کفر کو لازم ہو گا حالانکہ یہ محال ہے جو حکم لازم کا ہے وہی ملزوم کا ہوتا ہے لہٰذا انکار بھی کفر ہو گا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ محاربہ خود انکار کا ایک مرتبہ ہے کیونکہ جب امام تصرف کا ارادہ کرے تو انکار کی یہی شکل ہو گی اکثر شیعوں نے اس بات کا جواب اس طریقہ سے دیا ہے کہ اگرچہ قاعدہ کا تقاضا یہی ہے کہ جب

کسی چیز کا انکار کفر نہ ہو تو اس چیز کے مالک کے ساتھ محاربہ بھی کفر نہ ہونا چاہیے کیونکہ محاربہ انکار ہی کی ایک شکل ہے لیکن اس قاعدہ کو خلاف عقل ہم نے محاربان حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے حق میں ترک کر دیا ہے اس لیے کہ ہم کو متفق علیہ حدیث "حربك حربي وسلمك سلمي"[1] پہنچی ہے۔

ان کے اس جواب میں بچند وجو خلش موجود ہے اول یہ کہ یہ کلام مجاز پر محمول ہے حرف تشبیہ کے حذف کے ساتھ یعنی "حربك كانه حربي" اس لیے کہ معنی حقیقی تو بہر حال ممکن ہی نہیں ظاہر کے حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حقیقتاً تو حرب نہیں تھی بلکہ حکماً تھی جب مجاز بحذف حرف تشبیہ ہوا تو اس حدیث سے اس کا مذموم و قبیح ہونا تو معلوم ہوا مگر کفر نہیں ہوا کیونکہ تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ کا تمام احکام میں یکساں ہونا لازم نہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ بہت بہت سے صحابہ اور متعدد قبائل مثلاً غفار، جہینہ، مزینہ کے حق میں ارشاد فرمائے حالانکہ بالاتفاق ان سے محاربہ کفر نہیں۔

دوسرے یہ کہ کلام کے معنی یہ ہیں "حربك بالتحصيص حربي" پاس بہت سی جماعتوں کی لڑائی مثلاً قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کی جن میں حضرت امیر رضی اللہ عنہ بھی ہوں گے حرب رسول نہ تھی اور اس قسم کا اضمار مشہور بھی ہے اور رائج بھی مثلاً اگر کوئی شخص اپنے دوست سے کہے کہ جو تیرا بد خواہ میرا بھی بد خواہ ہوگا اور وہ دوست ایسی جماعت کے زمرہ میں ہے جن کا کوئی بد خواہ کسی امر عام مشترک کے سبب سے ہے تو وہ شخص عموم کلام میں داخل نہ ہوگا نہ بروئے لغت نہ بلحاظ عرف اور صحابہ کرام اور ام المومنین رضی اللہ عنہم خصوصاً جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑائی کا کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے بلکہ ان کا تو قاتلین عثمان سے پورا قصاص لینے کا مطالبہ تھا جب جناب امیر رضی اللہ عنہ بھی اسی لشکر میں شریک تھے تو لا محالہ ان سے بھی لڑائی تھی۔

تیسرے "حربك حربي،عداوتك عداوتي" سے کنایہ ہے ظاہر ہے یہ حضرات جناب امیر رضی اللہ عنہ سے عداوت نہ رکھتے تھے نہ ان کی لڑائی عداوت کی بنا پر تھی محض رفع فساد کے لیے مقابلہ کی نوبت آئی اور بات جنگ و قتال تک جا پہنچی۔

1۔الأمالي للشيخ الصدوق، ص: 656، ط: مؤسسة البعثة

چوتھے یہ کہ تمام اختیاری امور میں قصد وارادہ شرط ہے تاکہ وہ مدح وذم کا مصداق بن سکے مثلاً ایک شخص کہے جو اس برتن کو توڑے گا میں اس کے ساتھ ایسا ایسا کروں گا اب ایک شخص نے چلنے میں ٹھوکر کھائی اور اس کا پاؤں برتن سے لگا اور برتن ٹوٹ گیا تو بالاجماع اسے برتن توڑنے والا نہیں کہا جائے گا اور وہ اس دھمکی کا مصداق نہیں ہو گا چنانچہ معتبر تاریخوں کی روح سے جناب امیر رضی اللہ عنہ سے ان کی لڑائی بالکل اسی نوع کی تھی۔

پانچویں یہ کہ ہم تسلیم بھی کر لیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کی لڑائی بہر حال محاربہ رسول ہے لیکن محاربہ رسول بھی تو مطلقاً کفر نہیں البتہ نبوت اور رسالت کے انکار کے ساتھ کفر ہے دنیا اور مال کی طمع کے ساتھ کفر نہیں اس پر وہ آیت دال ہے جو قطاع الطریق کے حق میں وارد ہے اور ڈاکو بالاجماع کافر نے فاسق ہیں "إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا"[1] سود خوروں کے بارے میں بھی اسی قسم کی دھمکی آئی ہے حالانکہ وہ بالاتفاق کافر نہیں " فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللهِ وَرَسُولِهِ "[2] بلکہ یہاں تو ان فاسقین کے لیے خدا اور رسول ہر دوست سے لڑائی لڑنا ثابت کیا ہے اور حدیث میں تو صرف حرب رسول کا ذکر ہے تو جب خدا اور سول ہر دوست سے لڑائی موجب کفر نہ ہوئی تو تنہا رسول سے محاربہ کیوں کفر ہو گا ہاں رسول کے ساتھ لڑائی دین کے انکار کے ساتھ اور اسلام کی توہین کی غرض سے ہو تو وہ بلاشبہ کفر ہے مطلق لڑائی کفر نہیں حضرت موسی علیہ السلام کے متعلق کیا کہو گے حضرت ہارون علیہ السلام سے محاربہ میں آپ نے کوئی تحمل نہ کیا اور اتنا سخت محاربہ کیا کہ حضرت ہارون علیہ السلام زاری کرنے لگے اور فرمایا" قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي "[3] محاربہ اور لڑائی میں اس سے زیادہ اور کیا ہوتا ہے جناب امیر رضی اللہ عنہ بھی

1۔سورة المائدة، الآية: 33

2۔سورة البقرة، الآية: 279

3۔سورة طه، الآية: 96

بمطابق "أنت مني بمنزلة هارون من موسى"[1] وہ رتبہ رکھتے تھے ادھر زوجہ رسول اور علی علیہ السلام نے اپ کو قاتلین عثمان کا حامی اور معاملہ قصاص میں ٹال مٹول کرنے والا سمجھ کر ان سے رنجش وپرخواہش رکھی دوسرے حضرت موسی علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو گوسالہ پرستی کا حامی اور حد و تعزیر میں سستی کرنے والا جان کر اپنے بڑے بھائی اور پیغمبر کی اہانت کی لہذا اگر محاربہ رسول کو کفر قرار دیا جائے تو حضرت موسی علیہ السلام کے متعلق کیا فیصلہ ہوگا ان کا مقام کہاں ہوگا، حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام اور اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ جو معاملہ کیا اور جو صدمات پہنچائے کیا وہ محاربہ سے کم اذیت ناک تھے پھر ان حضرات کو آپ کہاں اور کس مقام پر لے جا کر کھڑا کریں گے۔

ایسے مباحث اور مواقع پر ادمی کو منصف مزاجی سے کام لینا چاہیے اور ہر شخص کے مرتبہ اور مقام کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے دوسری طرف کی شخصیت کوئی گری پڑی ہستی نہیں زوجہ و محبوبہ رسول ہیں جو قرآن حکم کے مطابق ام المومنین ہیں اور اس طرح جناب امیر خود بھی ماں اپنے بیٹے کو جو اگرچہ قصور سے بری و ذمہ ہو ڈانٹ ڈپٹ سکتی ہے زمانہ کا اونچ نیچ سمجھا سکتی ہے کسی بھی عمل کے متعلق باز پرس کر سکتی ہے ہم تم بچو لیے جو نہ تین میں نہ تیرہ میں ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ان کی ماں پر لعن طعن کریں سب و شتم کریں اور تیر بازی کریں(یہ دو پرائے شگون اپنی ناک کٹائی ہوئی یہ تو ماں بیٹوں کا قضیہ تھا یہاں حل نہ ہوا تو اگے بڑوں کی خدمت میں پہنچ کر طے ہو جائے گا اور سب باہم شیر و شکر ہو جائیں گے کم بختی تو ان کی اے گی جنہوں نے یہاں کرائے کے فوجیوں کا کردار ادا کیا اپنی حیثیت کو بھول کر بڑے بول بولے جن کی عزت و حرمت جزو ایمان تھی اس کے پاک دامن کو لعن طعن اور شب و شتم کے دھبوں سے داغدار کیا اور خوب دل کھول کر بڑی ڈھٹائی اور رعونت سے ڈنکے کی چوٹ پر بر سر ممبر دنیا کو گواہ بنا کر دیدہ و دانستہ اپنی عاقبت خراب کی اپنی گور کو آتش جہنم سے بھرنے کا سامان کیا اور پھر مست و بے خود ہو کر نعرہ لگایا شادم از زندگی خویش کے کارے کردم، از مترجم نعمانی) چنانچہ حضرت موسی اور حضرت یوسف علیہم السلام کے برادران پر زبان طعن دراز کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں جبکہ وہ برابر کے بھائی

1۔ صحیح مسلم ، کتاب الفضائل، باب من فضائل علي بن أبي طالب، 4/ 1870، رقم : 2404۔

ہیں اور یہاں تو ماں بیٹے کا تعلق ہے یہاں تو اور زیادہ محتاط ہونا چاہیے اگر فرق مراتب کا خیال نہ کیا اور ان کو بھول گیا تو یاد رکھو زندگی کہلاؤ گے۔

حاصل کلام یہ کہ حربک حربی سے محاربان جنگ امیر رضی اللہ عنہ کے کفر کے اس بات کے لیے تمسک کرنا قاعدہ کے لحاظ سے درست قرار نہیں پاسکتا اور بہت سے اصولوں کے خلاف رہتا ہے ان لڑائی لڑنے والوں کے نا اعمال صالح کہیں جاتے ہیں نہ ان کا ایمان ضائع ہوتا ہے اور یہی بغض و عداوت سب و شتم اور تبرہ کو روکتے ہیں اور محاربہ و مخالفت کا فرق کسی طرح بھی سمجھنے میں آنے کے لائق نہیں۔

اس سلسلہ میں بھی علمائے شیعہ کی ارا اور اقوال سنیے قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں بیان کیا ہے کہ شیعت کا مفہوم یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جناب علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بلا فصل تھے اس سلسلہ میں سب و طعن اور لعن جائز نہیں اور خلفاء ثلاثہ کے نام زبان پر لانے کی گنجائش ہے اگر جاہل شیعہ وجوب طعن کا حکم لگائیں تو ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں اور شیعوں پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف خبث و فحش کی نسبت کرتے ہیں تو حاشا ثم حاشا ایسا ہرگز نہیں فحش کی نسبت تو کسی عام آدمی کی طرف بھی حرام ہے چہ جائے کہ حرم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ نسبت کی جائے البتہ جب حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا "وقرن فی بیوتکن" کی مخالفت کرتے ہوئے بصرہ آئیں اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑائی کا اقدام کیا اور بموجب حدیث "حربک حربی وسلمک سلمی" جس کو فریقین مناقب امیر رضی اللہ عنہ میں ذکر کرتے ہیں کہ نہ جناب امیر کے ساتھ لڑائی مقبول ہے نہ حضرت پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ اس لیے وہ قابل تان ٹھہرے اسی کے متصل دوسرے ہی سانس میں یہ بھی کہی کہ کتب شیعہ میں ایک ضعیف روایت یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ جناب صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جناب امیر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں توبہ کی لیکن لڑائی کا قصہ متواتر ہے اور توبہ کی حکایت خبر احاد بہر حال اس بات کی بنا پر ان پر طعن جائز نہیں۔

اہل تاریخ اس سے بھی واقف ہیں کہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے کسی لشکری کے حوالہ سے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی توبہ بھی منقول ہے اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کا جناب زبیر رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث یاد دلانا جس سے آپ کی خلافت کی حقیت ثابت ہوتی تھی اور جناب زبیر رضی اللہ عنہ کا معرکہ جنگ سے واپس ہو جانا بھی بطریق شہرت و تواتر

مروی ہے تو ان روایات کی روح سے بھی شیعہ کے نزدیک ان اشخاص پر بھی طعن جائز نہ ہوگا اور یہی مدعا ہے۔

واضح رہے کہ شیعہ اسلاف میں سے مثلا عبداللہ مشہدی اور ان کے ساتھیوں نے اس عقیدہ سے رجوع کر لیا ہے کہ حضرت امیر کا محارب کافر ہے اور صرف اتنے ہی پر قناعت کی ہے کہ جناب سے لڑائی کفر تو نہیں ہے لیکن فسق اور گناہ ہے کبیرہ کے کنارے تک پہنچا دیتی ہے کیونکہ انہوں نے نفس کی تکذیب بہر حال نہیں کی اس میں کوئی غلط تاویل کی یا محاربہ سے انکار کر کے اسے حلال سمجھا تو یہ صورت فسق اعتقادی کی ہے کفر کی نہیں ادھر خواجہ نصیر الدین طوسی بھی کوئی ایسا ویسا نہیں علمائے شیعہ کے نزدیک اس کا قول بھی وحی ناطق کا درجہ رکھتی ہے خاص طور پر باب اعتقاد میں اس لیے ان کے متاخرین میں سے بعض نے ملا عبداللہ اور خواجہ نصیر الدین کے اقوال میں تطبیق دی ہے کہ یہ بمقتضائے حدیث "حربک حربی" جناب مرتضی رضی اللہ عنہ سے لڑنے سے کفر لازم آتا ہے، اگرچہ التزام کفر نہ ہو اور لزوم کفر شیعوں کے نزدیک بھی کفر نہیں بلکہ التزام کفر کفر ضرور ہے، لہذا خواجہ کا قول باعتبار لزوم ہے جو ظاہر حدیث کے موافق ہے اور جناب ملا اور اس کے ساتھیوں کا قول بلحاظ التزام ہے جب ان میں التزام کفر نہ ہو تو ان پر مرتد کا لفظ راست نہ آیا۔

حق یہ ہے کہ یہ کلام تکلف کا شاہکار ہے اصول شیعہ میں اس سے بڑھ کر تکلف کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا لیکن حدیث مشہور گو قابل تعویل ہے اور بالیقین اس کے حقیقی معنی مراد بھی نہیں پھر بھی یہ ان آیات قطعیہ سے بالکل نہیں ٹکراتی جو عام مہاجرین وانصار اور خصوصا ازواج مطہرات اور ان دونوں بزرگوں رضی اللہ عنہم کی شان میں وارد ہوئی ہیں پھر شیعی قواعد کی رو سے بھی ان حضرات کا کفر صحیح نہیں بیٹھتا بات جو زیادہ سے زیادہ کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ امام وقت کے خلاف لڑائی بغاوت ہے اور بغاوت فسق ہے کفر نہیں اور اگر اس کی بنا بھی کسی تاویل یا شبہ پر ہو تو یہ بغاوت فسق بھی نہیں بلکہ خطاء اجتہادی ہے یہ تھا شیعہ نقطہ نظر جناب امیر رضی اللہ عنہ اور ان کی خلافت کے متعلق اس کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں اہل سنت کا جو مذہب ہے وہ بھی زیر بحث لایا جائے اور اس کو بھی ذرا تفصیل کے ساتھ ناظرین کے گوش گزار کر دیا جائے۔

واضح رہے کہ فقہی اجتہادی مسائل مثلا امامت، میراث پیغمبر قبل القبض کا تمام نہ ہونا، تقسیم خمس، حج تمتع وغیرہ میں جناب امیر رضی اللہ عنہ کے مخالفت ہرگز کفر نہیں کفر کیا معصیت وگناہ بھی نہیں، کیونکہ آپ بھی منجملہ

مجتہدین ایک مجتہد تھے اور مسائل اجتہادیہ میں مجتہدوں کا اختلاف جائز ہے اور ہر مجتہد اجر کا مستحق ہے ہاں بغض وعداوت اور عناد کے جذبہ سے جس نے آپ سے لڑائی لڑی وہ اہل سنت کے نزدیک بھی کافر ہیں اس پر سب کا اجماع ہے اور خوارج اور اہل نہروان کے بارے میں ان کی یہی رائے اور مسلک ہے اور حدیث حربک اسی قسم کے حرب پر محمول ہے لیکن یہاں بھی لزوم کفر ہے التزام کفر نہیں تو ان پر مرتد کا اطلاق نہیں ہوگا اور ان کا غیر منقول شدہ نصوص قطعیہ قرآنیہ اور احادیث متواترہ کے خلاف ہے تو وہ ان کے عذر کا سبب نہیں بن سکتا گویا اہل سنت کے نزدیک احکام اخروی میں خوارج کافر ہیں ان کے لیے ایصال ثواب اور دعائے مغفرت نہیں کرنی چاہیے نہ نماز جنازہ پڑھنی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

بغض وعداوت اور عناد کے جذبہ سے پاک محض کسی غلط شبہ غلط فہمی یا غیر مناسب تاویل کی وجہ سے آپ سے لڑنے والے جیسے صاحبان جمل اور اصحاب صفین تو یہ خطائے اجتہادی اور بطلان اعتقادی میں مشترک ہیں فرق یہ ہے کہ اصحاب جمل کی یہ خطا اجتہادی اور فسق اعتقادی کے طور پر بھی طعن و تحقیر کو سند جواز عطا نہیں کرتا اس لیے کہ ان کی مدح خوانی سبقت اسلامی اور جناب رسالت مآب ﷺ سے ان کی قرابت ثابت ہونے میں اور حضور سے ان کے نسبی اور سسرالی رشتہ کے ثابت ہونے میں نصوص قطعیہ قرآنیہ اور احادیث متواترہ وارد ہیں جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معاملہ آپ کی عصمت اور علو مرتبہ پر جو قرآنی نصوص وارد ہے وہ آپ پر طعن کرنے یا آپ کی تحقیر سے مانع ہوئیں جو آپ سے اپنے بھائی کے بارے میں سرزد ہوا وہ بے تاملی اور عجلت کی بنا پر ہوا اور نہ یہ سب کچھ للہ فی اللہ تھا شیطانی وسوسہ کا تو آپ کے لیے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

رہا اصحاب صفین رضی اللہ عنہم کا معاملہ تو جو امور اصحاب جمل کے متعلق قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہوئے ان حضرات کے لیے قطعی اور یقینی طور پر نصوص موجود نہیں اس لیے ان کے معاملہ میں توقف و سکوت لازمی ہے ان آیات و احادیث کے عموم پر نظر کرتے ہوئے جو فضائل صحابہ کے سلسلہ میں وارد ہیں بلکہ تمام ہی مومنین کے فضائل پر مشتمل ہے اور جو ان کی نجات اور شفاعت کی امید پروردگار سے رکھنے کا حکم ظاہر کرتی ہیں اہل شام کی جماعت میں سے کسی کے متعلق جب تک قطعی اور یقینی طور پر یہ نہ جان لیں کہ وہ جناب امیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بغض وعداوت رکھتا تھا حتیٰ کہ آپ کو کافر کہتا تھا اور سب وشتم اور لعن طعن کرتا تھا تو ہم ایسے شخص کو یقینا

کافر کہیں گے اور جب یہ بات معتبر روایات سے پایہ ثبوت تک نہ پہنچے تو چونکہ ان کا اصل ایمان بالیقین ثابت ہے اس لیے ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہوں گے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو کافر کہنے والا آپ کے جنتی ہونے سے انکاری یا دینی اوصاف علم، عدالت، زہد، تقوی کے اعتبار سے آپ کو خلافت کے لیے نااہل کہنے والا اور آپ کی لیاقت منکر کافر ہے، اور یہ بات خوارج نہروان کے متعلق قطعی ثبوت کی حد تک پہنچنے کے سبب ان کو کافر کہتے ہیں اور جن کے بارے میں پایا ثبوت تک نہیں پہنچتی ان کو کافر نہیں کہتے، اہل سنت کے مذہب کی یہ وضاحت و تحقیق ان کے اصول طے شدہ کے بھی مطابق ہے کیونکہ ان کا اتفاق ہے کہ ضروریات دین سے انکار کرنے والا کافر ہے اور جناب امیر رضی اللہ عنہ کا ایمانی درجہ میں بلند ہونا آپ کے جنتی ہونا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت کے لائق ہونا نہ صرف احادیث سے بلکہ آیات قرآنیہ سے ثابت ہے لہذا ان کا منکر کافر ہوگا اور کم ظرفی حب مال وجاہ تاویل باطل غلط فہمی یا کسی کے بھڑکانے اور بہکانے کی وجہ سے آپ سے لڑائی کفر نہیں فسق عملی اعتقادی ہے امامیہ جب اصل بنیاد میں اہل سنت سے اتفاق کرتے ہیں تو انہیں حکم میں بھی اتفاق کرنا چاہیے۔

مقدمہ نمبر 7: یہ کہ اگر کوئی مرد مومن مرتکب کبیرہ ہو جائے یا کسی غلط فہمی یا شبہ فاسد میں پڑھ کر کسی نہ شائستہ حرکت کا مرتکب ہو جائے تو اسے سب و شتم اور لعن طعن کرنا جائز نہیں اور اس سلسلہ میں کئی دلیلیں دی جاسکتی ہیں مثلاً:

1۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ[1]

سنو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اپنے اور مومن اور مومنات کے لیے معافی چاہتے رہو۔

اس اصول باقاعدہ پر سب کا اتفاق ہے کہ کسی چیز کا حکم دینا اس کے خلاف کو روک دینا ہے لہذا مومن فاسق جو محتاج استغفار ہیں ان کو استغفار کا حکم دینا اس بات سے روکتا ہے کہ ان کے گناہ کے سبب ان کو زجر و توبیخ

1۔ سورة محمد، الآية: 19

اور لعن طعن نہ کی جائے نہ بد دعا کی جائے کیونکہ یہ سب باتیں استغفار کے ضد ہونے کی وجہ سے ممنوع ہیں اس لیے نماز کی آخری رکعت میں تشہد و درود کے بعد دعائے ماثورہ مشتمل بر استغفار مومنین و مومنات مسنون ٹھہرا اور لعن کرنا یا بد دعا دینا ان کو رحمت الٰہی سے دور پھینکنا ہے اور شریعت کے حکم سے مقابلہ کرنا حرام قرار دیا جا چکا ہے۔

2۔ "الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ"[1] معلوم ہوا کہ حاملین عرش الٰہی بھی مسلمانوں کے لیے استغفار میں مشغول مصروف ہیں اور ظاہر ہے مقربان دربار کے خلاف حضور شاہ کوئی لب کشائی غضب و ناخوشی کا ہی سبب ہو سکتا ہے ایسے مسلمان و مومن کے خلاف بد دعا یہ سب و شتم جس کے لیے حاملان عرش استغفار میں مشغول ہوں ہر گز رضائے الٰہی نہیں ہو سکتی۔

3۔ اہل کبائر کے حق میں انبیاء علیہم السلام کی شفاعت ثابت ہے اب تم ان کو گالی یا بد دعا دے کر دربار خداوندی میں پیغمبر کے مقابل ہونے کی جرات نہیں کر رہے؟

4۔ "وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ"[2] معلوم ہوا کہ اس امت کے پچھلے آنے والوں کو اس شاندار روایت کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے اپنے سے پہلوں کے لیے دعائے مغفرت کرنی چاہیے اور اس روایت کو زندہ و تازہ رکھنا چاہیے تاکہ کل ہم جب اس کے محتاج ہوں تو ہمارے بعد والے ہمیں فراموش نہ کر دیں اب جو اس کے خلاف کرے یعنی بجائے دعائے مغفرت ان پر لعن طعن کرے وہ گویا ملت و دین کا حق طلب کر رہا ہے۔

5۔ محبت و دوستی کا سبب ایمان ہے جو فاسق میں موجود ہوتا ہے یہ فسق قابل نمائش تمغہ نہیں یہ ایک مرض ہے جو علاج کا محتاج ہے اس سے تعلق اور ہمدردی کا تقاضہ ہے کہ اس کا یہ مرض دور کیا جائے اس کے دو طریقے ہیں ایک زندگی میں ایک موت کے بعد زندگی میں علاج یہ ہے کہ اسے اچھی باتوں کے کرنے اور بری باتوں سے روکنے کو کہا جائے ت کی جائے حد و تعزیر سے آلائش روحانی دور کی جائے اور جب وہ مر جائے تو دوسرا طریقہ کام

1۔ سورۃ غافر، الآیۃ: 7

2۔ سورۃ الحشر، الآیۃ: 10

میں لایا جائے کہ اس کے لیے دعائے مغفرت کی جائے ایصال ثواب کیا جائے صدقہ و خیرات کلمہ و کلام سے اسے فائدہ پہنچایا جائے یہ تو ایک فطری سی اور انسانی زندگی کی پیش یا افتادہ حقیقت ہے کہ جب کسی کا بھائی بند عزیز رشتہ دار مبتلائے مرض ہوتا ہے تو وہ اسے گولی مار کر یا قتل کر کے ازالہ مرض کرنے کی نہیں سوچتا وہ اسے لے کر طبیب کی طرف بھاگتا ہے جو اس کا علاج اس مرض کے اثر کو زائل کرنے کی صورت میں کرتا ہے اس کے قتل اور اس کی روح مٹانے کی شکل میں نہیں کرتا حدیث صحیح کا ایک مضمون ہے "لعن المؤمن كقتله"[1] مومن کو لعنت کرنا گویا اس کو قتل کرنا ہے، اس لیے کہ لعنت کے معنی رحمت سے دور کرنے کے ہیں اور اس پہ جب تک ایمان موجود ہے اس کی رحمت سے دوری نہیں ہو سکتی ایسی صورت میں اس پر لعنت کرنے والا اللہ سے یہ کہہ رہا ہے کہ آپ اس کا ایمان سلب کر لیں وہ سوچ لے کہ کسی سے کیا کہہ کر اپنے لیے کانٹے بو رہا ہے کیونکہ سلب ایمان تو ہلاکت ابدی ہے جو قتل سے ہزار درجہ سخت ہے۔

6۔ علت کا وجود چاہتا ہے کہ حکم موجود ہو اور علت کے زوال کا تقاضا ہے کہ علت نہ ہو تو حکم بھی نہ ہو لہٰذا مومن فاسق کا ایمان دائم ہے روح کے دوام کے سبب دوام روح کی صفت ہے اور یہ ایمان دوستی وہ محبت کا سبب ہوتا ہے تو وجوب محبت بھی دائم بدوام روح ہو گا فسق ایک بدنی عمل ہے جب روح کا بدن سے تعلق ختم ہو گا تو یہ فسق بھی معدوم ہو جائے گا اور اس کے اسباب بغض، عناد، سب و شتم، لعن و طعن، اہانت و تحقیر بھی بعد موت زائل ہو جائیں گے اور ایمان کے تقاضے باقی رہیں گے اور وہ مثلاً طلب مغفرت و بخشش وغیرہ ہیں اسی لیے حدیث صحیح میں وارد ہے " لا تسبوا الأموات، فإنهم قد أفضوا إلى ما قدموا "[2] مردوں کو گالی نہ دو کیونکہ وہ تو اپنی آگے بھیجی ہوئی اشیاء تک پہنچ چکے، موت اس لحاظ سے مومن فاسق کے حق میں توبہ کا حکم رکھتی ہے کہ وہ عمل بد کا سلسلہ تو منقطع کر دیتی ہے مگر عمل سابق کو نہیں مٹا سکتی اور توبہ عمل سابق کو بھی ملیا میٹ کر دیتی ہے اب موت کی وجہ سے جب عمل بد ختم ہو گیا تو اب صرف ایمان رہ گیا وجوب محبت جس کا تقاضا ہے۔

1۔ كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال، 3/ 616، رقم: 8183، ط: مؤسسة الرسالة

2۔ كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال، 15/ 680، رقم: 42714، ط: مؤسسة الرسالة

7۔ "وَعَدَ اللهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا"[1] ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے محض ایمان پر جنت کا وعدہ فرمایا ہے لہذا مسلمان اور مومن پر لعن کرنا اور اس کے عذاب کی آرزو یا دعا کرنا گویا خدا تعالیٰ سے یہ چاہنا ہے کہ وہ ان کی خاطر وعدہ خلافی کر جائے قطع نظر اس کے کہ خدا کے ہاں وعدہ خلافی کا خانہ ہی نہیں ان دشمنان دین وایمان کی سادگی کی بھی تو داد دینی چاہیے اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے فرما دیا کہ "إِنَّ اللهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ"[2] پس یہاں طلب محال کے ساتھ نتیجہ میں سوء ادبی بھی۔

مقدمہ نمبر 8: امور دنیا کے سبب بزرگوں میں باہم بہت دفعہ آزردگی پیدا ہوتی ہے مگر اس کے باوجود یہ بزرگ اس آزردگی باہم کے سبب کبھی اپنے مرتبہ سے نہیں گرے اور نہ تحقیر واہانت کے سزاوار قرار پائے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے برادران کے ان کے مابین تو پتہ نہیں ہوا کیا کیا ہے؟ مگر ہمارے لیے صرف یہی حکم ہے کہ ان کی عزت وتکریم کرے اور ان کی تعظیم ملحوظ خاطر رکھیں۔

ائمہ اور امام زادوں میں جو اختلاف پیدا ہوا حتی کہ بعض نے بعض کی امامت تک سے انکار کر دیا تو ان حضرات کے معاملہ میں شیعہ حضرات کا طرز عمل بھی یہی ہے کہ سب کچھ ہوتے اللہ رب وہ سب کی عزت و تکریم کرتے ہیں اب اس عزت وتعظیم کی وجہ ان کے نزدیک چاہے جو کچھ ہو مگر اس سے تو مجال انکار نہیں کہ ان میں سے معصوم تو صرف ایک ہی ہو گا آپ اپنی تعلیم مذہب اور افتاد طبیعت کے مطابق ان کو معصوم کے مد مقابل کو جو کہنا چاہیے عجیب بات ہے کہ وہ نہیں کہتے، ان کے حق میں کفر تو بڑی بات ہے فسق تک کا اعتقاد بھی نہیں رکھتے اب جس وجہ سے امام زادگان علیہم السلام سے شیعوں کا یہ طرز عمل ہے اسی وجہ سے اہل سنت بھی رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلقین اصحاب ازواج مطہرات اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کی تعظیم وتکریم قوم میں لاتے ہیں اور ہر دو فرقوں کو اپنے اپنے طرز عمل میں معذور رکھتے ہیں۔

اور ملا عبد اللہ مشہدی جو ان شیعوں میں نسبتاً ذرا گہری نظر رکھتا ہے اور حاضر دماغ رہتا ہے اس متوجہ

1۔سورۃ التوبۃ، الآیۃ: 72

2۔سورۃ ال عمران، الآیۃ: 9

پر متنبہ ہو کر مطلق منع کو ناکافی جان کر اس سے چشم پوشی نہ کر سکا اور خود ایک سوال قائم کر کے اس کے جواب کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے کہ:

یہ مقام شبہ کا ہے اور عقلمند کو چاہیے کہ شبہ کی صورت واضح کر کے بیان کرے پھر اس کو دور کرنے کی کوشش کریں اگر کوئی کہے کہ دو ہم مرتبہ اشخاص ہوں یا جماعت مقبولان الہی میں سے ہوں اور ان کے درمیان کسی شبہ شک یا اخفائے رائے کی وجہ سے نزاع یا رنجش پیدا ہو جائے اس صورت میں ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ان میں سے کسی پر بھی تعاون کریں اور اس سے بد گوئی سے پیش آئیں، (اب اس کے جواب میں کہتا ہے) یہ فرضی اگر ایسے تمام صلحائے امت کے درمیان پیش آئے جو سب کے سب جائز الخطا ہوں تو ممکن ہے اور اگر زیر غور مقام ایسا ہو کہ ایک طرف معصوم ہو اور دوسری طرف جائز الخطا تو یہ جائز نہیں اس صورت کو اس پر قیاس نہیں کر سکتے کیونکہ یہاں مخاصمہ کے ہر دو اطراف برابر نہیں ایک طرف معصوم ہیں تو دوسری طرف جائز الخطاب معصوم چونکہ خطا کا احتمال نہیں رکھتا اس لیے وہ مقابل سے ناحق آزردہ نہ ہو گا اور دوسری طرف چونکہ جائز الخطاہے وہ اگر کسی بنا پر شبہ کر کے معصوم سے آزردہ ہو کر عداوت رکھے گا تو وہ معذور نہ ہو گا کیونکہ معصوم کی محبت اور اس کے رعایت تعظیم پر نص آچکی ہے تو اس کے شبہ کا کوئی اعتبار نہیں جس طرح شیطان کا شبہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کی عداوت میں کہ اس کا یہ شبہ قابل عذر نہیں۔

اس جواب میں بڑی ہوشیاری اور چالاکی کا مظاہرہ کر کے گزر جانے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ دانستہ مغالطہ میں ڈالنے کے لیے کی گئی ہے ورنہ وہ اتنے کودن نہیں کہ یہ بھی نہ سمجھ پائے کہ ہم نے اپنے کلام کی بنیاد ہی ایسی صورت پر رکھی ہے کہ اگر دو معصوموں میں باہم حاضردگی و ناراضگی پیدا ہو جب وہ دونوں ہی معصوم ہیں تو پھر کہاں ابلیس کہاں آدم، اور ایسی مثالیں کہ فریقین معصوم ہوں اور ان میں باہم آزردگی پیدا ہو اور دونوں ایک دوسرے کے حق تلفی کریں ہم کتب امامیہ سے بہت سی پیش کر سکتے ہیں:

1۔ میں حضرت آدم علیہ السلام کا تنازعہ کے حضرات ائمہ کا درجہ ان سے بلند کیوں ہو گیا پھر ان سے مخالفت کرنا ان

سے حسد رکھنا ان کی محبت کا عہد باوجو حکم الٰہی کا پورا نہ کرنا اس کی پوری تفصیل باب نبوت میں بیان ہو چکی ہے۔

2۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے بڑے بھائی اور نبی بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے اہانت و تحقیر کرنا داڑھی پکڑنا ان کے سر کے بال کھینچنا یہ واقعہ قرآن مجید میں موجود ہے کسی کو مجال انکار نہیں۔

3۔ شیعوں کی معتبر کتاب بحر المناقب میں مناقب اخطب خوارزم سے ابو تراب کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے نقل ہے کہ جناب رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم بی بی زہرا رضی اللہ عنہا کے گھر میں تشریف لائے جناب علی رضی اللہ عنہ کو وہاں نہ دیکھا تو پوچھا میرا عم زاد کہاں ہے بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا مجھ میں ان میں کچھ ناچاقی ہو گئی اس لیے یہاں قیلولہ کرنے کے بجائے وہ باہر چلے گئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ مسجد میں پہلو کے بل لیٹے سو رہے ہیں اور سر و چہرہ صحن مسجد کی خاک سے خاک آلودہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" قم یا ابا تراب قم یا ابا تراب "ابو تراب اٹھو ابو تراب اٹھو،[1] یہ واقعہ صحیح بخاری میں بھی آیا ہے۔

4۔ ابو مخنف لوط بن یحییٰ ازدی امامیہ کا بہترین محدث ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کرتا ہے کہ:

كان الحسين يبدي الكراهة من صلح أخيه الحسن مع معاوية ويقول: لو جز أنفي كان أحب إلي مما فعله أخي.[2]

آپ اپنے بھائی جناب حسن رضی اللہ عنہ کے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لینے پر بڑے خفا تھے اور فرماتے تھے کہ اگر میری ناک کٹ جاتی تو وہ مجھے زیادہ پسند تھی اس بات کے مقابلہ میں جو میرے بھائی نے کیا۔

لہٰذا ان صورتوں میں آزردگی و ناراضگی ہر دو جانب حق ہو تو اجتماع نقیضین لازم آتا ہے اور اگر ایک طرف حق اور دوسری طرف باطل ہو تو طرف باطل کی عصمت درہم برہم ہوتی ہے اور یہ خلاف مفروض ہے پس معلوم ہوا کہ معصوم کے ساتھ آزردگی دو قسم کی ہوتی ہے ایک وہ جو عداوت تعصب عناد اور بغض پر مبنی ہو

1۔ المناقب للخطيب خوارزم، الفصل الرابع عشر، ص:201، ط: مؤسسة النشر الاسلامى (ايران)

2۔ كشف الغمة عن معرفة الأئمة، للأربلي: 2/ 35.

جیسے خوارج ونواصب کی اہل بیت اور مسلمانوں سے دوسری وہ کہ شریعت ہو یا کسی ایسی دلیل سے جس کا اس پر انکشاف ہو گیا ہو جیسے جناب سیدہ کی آزردگی جناب مرتضیٰ سے یا حضرت موسیٰ کی کبیدگی حضرت ہارون علیہ السلام سے یا جناب حسین کی جناب حسن رضی اللہ عنہ سے اور ایسی آزردگی جو بتقاضائے بشریت ہو یا ظہور دلیل کے سبب ہو نافذک ہے نہ موجب طعن کے عصمت میں خلل پڑے جب ایسی آزردگی سے عصمت معصوم میں کوئی خلل نہیں پڑتا تو عدالت وتقوی میں بدرجہ اولی کوئی فرق نہیں پڑے گا اور ہم یہی بات ذہنوں میں بٹھانا چاہتے ہیں فدک وغیرہ کے سلسلے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جناب مرتضیٰ وبی بی زہرا رضی اللہ عنہا سے جو آزردگیاں پیدا ہو گئی تھیں وہ اسی نوعیت کی تھی صاحب اظہار الحق اس جواب پر متنبہ ہو کر چپ نہ رہ سکا اور خود ہی ایک سوال قائم کر کے اس کے جواب کی فکر میں لگ گیا لیکن جو سوال اس نے قائم کیا ہے اس کا وہ صحیح جواب دے ہی نہ پائے گا اس نے سوال قائم کیا کہ ممکن ہے نیک لوگوں کے ایک جماعت ایک بات چاہیں یا کسی بات کو مسلمانوں کے مفاد میں دیکھیں مگر وہ بات اہل بیت کے لیے بے فائدہ اور فضول ہو اور وہ بدقاضہ بشریت اور اس سبب سے کیسے انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنا مفاد پہلے دیکھتا ہے نیک لوگوں کی مخالفت کریں اور ان سے ناراضگی رکھیں اور اس کا اظہار بھی کریں اس لیے ہو سکتا ہے کہ اہل بیت کے کلام میں ناراضگی ور ناخوشی ظاہر کرنے والی باتیں اسی وجہ سے ہوں اور اس طرف سے رنجش وعداوت مطلق نہ ہو۔

اس سوال کا بڑا طول طویل جواب گھماؤ پھیراؤ سے دیا ہے خلاصہ یہ ہے کہ آیت تطہیر کی رو سے جناب امیر معصوم ہیں اور حقائق شرعیہ کو زیادہ جاننے والے تو آپ کے لیے یہ کہاں سے بجا ہے کہ حق کے خلاف نیکوں کی مخالفت کریں لہذا آپ کی کیفیت صحابہ کے ساتھ ایسی ہے جیسے نیکوں کی باہمی ہوتی ہے۔

مگر یہ جواب بھی بچند وجو پر خلل ہے اول بی بی زہرا جناب حسین رضی اللہ عنہما اور حضرت آدم حضرت موسیٰ علیہم السلام بھی معصوم ہی تھے تو ان کے لیے کب مناسب تھا کہ حق کے خلاف معصوموں کی مخالفت کریں اور ہر دو طرف حق مانا جائے گا تو اجتماع ضدین لازم آئے گا یا یہ کہ ان میں سے ایک فریق معصوم نہ ہو۔

دوسرے بعض اوقات مقابلہ ٹھیک اور زیادہ ٹھیک کا ہوتا ہے اور کبھی ٹھیک اور غلط کا جواز ہوئے دلیل مجتہد کے حق میں ٹھیک ہی کا درجہ رکھتا ہے اس طرح گویا کسی جانب سے بھی حق کے خلاف نہ ہوا۔

مقدمہ نمبر 9: ہر عقلمند جب اپنی سمجھ بوجھ کا جائزہ لے اور دوسروں کے حالات وواقعات پر بھی نظر رکھے تو یہ بات یقیناً اس کی سمجھ میں آجائے گی کہ بسا اوقات خوفناک وہولناک واقعات کے سبب یا الفت وعداوت کے باعث وہ مقرر وطے شدہ بلکہ بدیہی اصول بھی فراموش کر بیٹھتا ہے یا ان کے خلاف کسی گفتگو یا عمل کا مرتکب ہو جاتا ہے اور بعض اوقات یہ غفلت وفراموشی طول بھی کھینچ جاتی ہے اور بعض اوقات متنبہ ہو کر صحیح معلومات کی طرف رجوع ہو جاتا ہے اور یہ غفلت وفراموشی بتقاضائے بشریت ہوتی ہے جس میں کسی کا کوئی استثنیٰ نہیں نبی غیر نبی معصوم غیر معصوم ولی غیر ولی متقی غیر متقی سب اس میں شامل بشریک ہیں اور اس نے سب کا احاطہ کر رکھا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو اس کیفیت میں زیادہ دیر نہیں رکھا جاتا فوراً متنبہ ہو جاتا ہے دوسروں کے لیے ضروری نہیں ہے کہ جلد متنبہ ہو جائے قرآن وحدیث سے بے شمار دلیلیں اس کی ملتی ہیں۔

اول حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر درخت سے انی انا اللہ سن کر یقین ہو گیا تھا کہ یہ تجلی الٰہی ہے جو مصروف تکلم ہے اور عصا ڈال دینے کا حکم دے رہی ہے ایسی صورت کا یہ تقاضا تھا کہ آپ کسی بھی مخلوق کا خوف وخطرہ اپنے دل میں نہ لائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ قادر بھی ہے اور پورا پورا محافظ بھی مگر پھر بھی جب عصا سانپ کی صورت میں متحرک نظر آیا تو آپ ایسے ڈرے کے بھاگ اٹھے اور مڑ کر بھی نہ دیکھا اسی وقت دوران کلام " لَا تَخَفْ إِنِّي لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُونَ "[1] ڈرو نہیں میرے پاس رسول ڈرا نہیں کرتے سے متنبہ ہوا۔

دوسرے فرعون کے جادوگروں سے مقابلہ کے وقت وعدہ الٰہی کے مطابق آپ کو پختہ یقین تھا کہ ان کے مقابلہ میں غلبہ مجھ ہی کو حاصل ہو گا اس کے باوجود جب جادوگرون رسیوں اور لاٹھیوں کے سانپ بنا بنا کر میدان میں پھینکنے اور اپنے مخصوص نعرے لگانے اور شور مچانا شروع کیا تو اچانک آپ کے دل میں خوف آگھسا یہاں بھی آپ کو اس کیفیت سے نکالنے کے لیے فوری طور پر متنبہ ہوا "لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ "[2] ڈرو نہیں تم ہی فتح مند رہو گے۔

1۔سورۃ طہ، الآیۃ: 10

2۔سورۃ طہ، الآیۃ: 68

تیسرے کوہ طور سے واپسی پر قوم کو گوسالہ پرستی میں مبتلا دیکھ کر حضرت ہارون علیہ السلام کی جانب سے عدم اطلاع پاکر ایک دم مشتعل ہوگئے غصہ دماغ میں چڑھا تو یہ بھی خیال نہ رہا کہ ہارون تو پیغمبر ہیں معصوم ہیں پیغمبر و معصوم شرک وبت پرستی پر کیسے راضی ہو سکتا ہے عدم اطلاع کی کوئی وجہ ہی ہوگی۔

چوتھے آپ نے خضر علیہ السلام سے عہد کیا کہ آپ کے معاملہ میں مطلقاً دخل نہ دوں گا نہ آپ کے اعمال کے اسباب آپ سے پوچھوں گا لیکن جو ہی آپ نے کوئی اچھنبے کی بات دیکھی تو عہد ذہن سے فراموش ہوگیا اور حضرت خضر علیہ السلام کے فعل پر سخت نقطہ چینی کی اور بالآخر خضر علیہ السلام کی یاددہانی پر متنبہ ہوئے۔

پانچویں حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ جانتے تھے کہ قوم لوط کافر اور مستحق عذاب ہے نیز یہ اعتقاد بھی پختہ تھا کہ حکم الٰہی ٹالا نہیں جاسکتا اس کے باوجود مجرموں کی پیروی میں استغاثہ لے کر بارگاہ الٰہی میں جاپہنچے ارشاد خداوندی ہے:

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبُشْرَى يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ ، إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُنِيبٌ ، يَا إِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَإِنَّهُمْ آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ (1)

جب ابراہیم کا ڈر نکلا اور خوشخبری سن لی تو وہ قوم لوط کے معاملہ میں ہم سے جھگڑنے لگے ابراہیم بڑے بھلے خداترس اور خدا کی طرف رجوع کرنے والے ہیں ہم نے کہہ دیا ابراہیم اس خیال سے درگزر کرو تمہارے رب کا فیصلہ ہو چکا یہ عذاب آکر رہے گا لوٹایا نہیں جاسکتا۔

چھٹے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے عشاء بعد جب سب نمازی جاچکے تو ام المومنین بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا ملاقات کے لیے تشریف لائیں بہت دیر تک بیٹھی رہی جب واپسی کا ارادہ ہوا تو چونکہ رات خاصی گزر چکی تھی اس لیے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو گھر پہنچانے کے لیے مسجد سے باہر تشریف لائے اثنائے راہ میں دو بڑے مخلص ایمان والے انصاری ملے جب انہوں نے حضور کو پہچان لیا اور یہ بھی دیکھ لیا کہ ساتھ میں محترمہ بھی ہیں تو راستہ میں ایک سمت سمٹ کر تیزی سے نکل جانا چاہا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو روکا اور فرمایا یہ عورت میری بیوی صفیہ ہیں انہوں نے

1۔سورۃ ھود، الآیۃ: 74، 75، 76

عرض کیا یارسول اللہ غلاموں کی یہ گستاخانہ جرات کہاں کہ وہ آپ کے متعلق کوئی غلط خیال کرتے آپ نے فرمایا شیطان آدمی کے دشمن ہے مجھے اندیشہ ہوا کہ شیطان تمہارے دلوں میں گمان بد اور خیال فاسد نہ ڈال دے۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی عصمت کا اعتقاد رکھتے ہوئے بھی یہ ممکن تھا کہ اس حالت کو دیکھتے ہوئے جو عام لوگوں کے لیے سبب تہمت ہو سکتی ہے آنحضرت ﷺ کے متعلق بھی ایسی تہمت کا وہم کسی کے دل میں پیدا ہو جائے اور یہ بات ایمان واعتقاد کے منافی نہیں۔

ساتویں امامیہ کی ساری کتب اخبار میں بحوالہ ابی حمزہ الثمالی علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہ کی یہ روایت بیان کی ہے:

وقال أبو حمزة الثمالي أتيت باب علي بن الحسين فكرهت أن أصوت فقعدت حتى خرج فسلمت عليه ودعوت له فرد علي ثم انتهى إلى حائط فقال يا أبا حمزه ألا ترى هذا الحائط؟ فقلت بلى يا ابن رسول الله قال فإني اتكأت عليه يوما وأنا حزين وإذا رجل حسن الوجه حسن الثياب ينظر في تجاه وجهي ـــــ فقال وما حزنك يا علي فقلت ما أتخوف من فتنة ابن الزبير فقال لي يا علي هل رأيت أحدا سأل الله فلم يعطه؟ قلت لا قال فخاف الله فلم يكفه قلت لا فغاب عني فقيل لي يا علي بن الحسين هذا الخضر عليه السلام[2]

حمزہ کہتا ہے مجھ سے علی بن حسین نے کہا میں دیوار سے ٹیک لگائے غمزدہ و فکر مند صاحب بیٹھا

1۔ عن علي بن الحسين: كان النبي ﷺ في المسجد وعنده أزواجه فرحن، فقال لصفية بنت حيي لا تعجلي حتى أنصرف معك، وكان بيتها في دار أسامة، فخرج النبي ﷺ معها، فلقيه رجلان من الأنصار فنظرا إلى النبي ﷺ، ثم أجازا، وقال لهما النبي ﷺ: «تعاليا إنها صفية بنت حيي»، قالا: سبحان الله يا رسول الله، قال: «إن الشيطان يجري من الإنسان مجرى الدم، وإني خشيت أن يلقي في أنفسكما شيئا»(صحيح البخاری، باب زيارة المرأة زوجها في اعتكافه،3/ 50، رقم : 2038، ط: دار طوق النجاة)

2۔كشف الغمة في معرفة الأئمة، للاربلی، 2/ 289، ط: دار الأضواء بيروت لبنان

تھا کہ اچانک ہی ایک خوش لباس وخوشبو میں بسا ہوا شخص میرے سامنے آکھڑا ہوا اور میرے چہرے پر نظر ڈال کر بولا تمہارے غم و فکر کی کیا وجہ ہے میں نے کہا میں فطرہ ابن زبیر سے خوفزدہ ہوں یہ سن کر وہ شخص ہنسا اور پھر بولا اے علی کیا تم نے کوئی آدمی ایسا دیکھا ہے جو اللہ تعالی سے ڈرتا ہو اور اللہ تعالی نے اسے نجات نہ دی ہو میں نے کہا نہیں پھر وہ بولے کیا تم نے کوئی ایسا آدمی دیکھا ہے جس نے اللہ تعالی سے کچھ مانگا ہو اور اللہ تعالی نے اسے نہ دیا ہو میں نے کہا نہیں یہ کہہ کر میں سامنے نظر اٹھاتا ہوں تو وہاں کوئی نہیں تھا میں اس پر متعجب ہی تھا کہ یہ ماجرہ کیا ہے کہ غیب سے میرے کانوں میں آواز آئی میں آواز ہی سن سکتا تھا بولنے والے کو دیکھ نہیں سکتا تھا اے علی یہ خضر تھے۔

اس قصہ میں جناب امام کو شدت خوف کے سبب ان دو باتوں سے غفلت ہو گئی جن سے ہر مومن آگاہ وباخبر ہوتا ہے اس لیے حضرت خضر علیہ السلام کے ذریعہ آپ کو متنبہ فرما کر یہ غفلت دور کر دی گئی لہذا اگر بعض صحابہ پر اہل بیت کی جانب سے یا اہل بیت پر بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے ایسے حالات طاری ہو جائیں اور وہ طرل بھی کھینچ جائیں اور ایک دوسرے کے فضائل و مناقب سے بھی غفلت رہے تو اس میں نہ تو تعجب کی کوئی بات ہے اور نہ ایسا ہونا دور از خیال بات ہے پھر یہ کیفیت محل طعن و تشنیع کیوں؟

مقدمہ نمبر 10: یہ کہ فضیلت خاص اگر نہ ہو تو فضیلت عام کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور نہ اس کے تقاضوں اور حقوق سے چشم پوشی کرنی چاہیے اور یہ مقدمہ عقل و نقل دونوں سے ثابت ہے عقل سے تو اس طرح کے یہ ظاہر ہے کہ خاص کے اٹھ جانے سے عام نہیں اٹھتا مثلاً انسان کا انتفا اور جب عام نہیں اٹھا یعنی اس کی نفی نہیں ہوئی تو اس کا اثبات اور وجود ہے اور جب وہ خود موجود ہے تو اس کے لوازم بھی موجود ہیں تا کہ لزوم کے معنی صادق آسکیں اسی لیے یہ مقولہ ہے کہ جب کوئی شی پائی گئی تو اس کے لوازم بھی پائے گئے۔

اور نقل سے ثبوت اس طرح ہے کہ اہل کتاب جو اہل ملت میں داخل ہیں بہت سے احکامات میں ان کو غیر اہل کتاب پر ترجیح دی گئی ہے مثلاً ان کا ذبیحہ کھانے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے میں اسی نقطہ نظر سے کہ گو فضیلت خاص یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ان میں موجود نہیں ہے لیکن مطلق انبیاء پر ان کا ایمان ہے یہی

صفت ان کو ایک ایسے شخص سے ممتاز کرتی ہے جو اس صفت سے عاری ہو مثلاً عرب کو بلحاظ کفو عجم پر ترجیح ہے کہ وہ اولاد اسماعیل ہیں گو قریش کفاءت ان میں نہ ہو اسی طرح قریش کو تمام عرب پر برتری کی دی گئی ہے، گو وہ خمس لینے اور زکوۃ کے حرام ہونے میں ہاشمیوں کی طرح نہ ہو اسی طرح اور بھی مثالیں ہو سکتی ہیں غرض شریعت میں جا بجا اس مقدمہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے طول کلام کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس کے جزیات بھی تفصیل بھی بیان کی جا سکتی تھی فی الحال یہی کافی معافی ہیں اس سے قطع نظر کے اس مقدمہ کو عقل و نقل دونوں کی پشت پناہی حاصل ہے امامیہ فرقہ خود بھی اسے تسلیم کرتا ہے اس لیے کہ ان کے نزدیک اولاد علی ہونا ایسی فضیلت ہے جو تمام عالمیوں میں مشترک اور باعث محبت ہے یہ بات ان کی کتب میں صراحت کے ساتھ مستور و موجود ہیں حالانکہ بعض علوی ائمہ کی امامت کے منکر ہوئے پھر بھی وہ فضیلت عامہ یعنی علوی ہونے سے نہیں نکلتے خواہ ان میں فضیلت خاص یعنی اعتقاد امامت تمام ائمہ ہو یا نہ ہو۔

اسی طرح محب علی ہونا اور خود کو شیعہ علی کہنا ان کے نزدیک ایسی خوبی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ائمہ کی امامت کے منکرین پر بھی بد گوئی لعن طعن جائز نہیں پہلی بات کا ثبوت تو یہ کہ جناب محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ صاحبزادے جناب امیر نے اپنی امامت کا دعوی کیا اور امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کی امامت کا انکار کیا اور ان کے ساتھ پرخاش رکھی حتی کہ حجر اسود سے فیصلہ کرانے کی نوبت ائی اور حجر اسود نے جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں گواہی دی مگر پھر بھی محمد بن الحنفیہ آخر عمر تک اپنے دعوی سے دستبردار نہیں ہوئے مختار ثقفی کو اپنے نائب مقرر کیا کوفہ کے شیعوں کو اس کے اعانت و رفاقت کے لیے خطوط لکھے اور اس کو اہل شام سے لڑنے اور جناب حسین رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کے لیے مقرر کیا مختار نے بھی بات فتح عمرو شام کے سروں کو فتح نامہ اور تیس ہزار دینار کے ساتھ محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کو بھیجا جناب زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں نہیں اور رحلت کے وقت اپنے بیٹے ابو ہاشم کو امامت کی وصیت کی اب وہ اعتقاد جو شیعہ محمد بن الحنفیہ اور ان کے بیٹے ابو ہاشم کے بارے میں رکھتے ہیں یا جو تعظیم و توقیر وہ ان کی کرتے ہیں وہ ان کی کتابوں خصوصاً مجالس المومنین میں دیکھنی چاہیے۔

اور اسی طرح کا واقعہ جناب زید شہید رحمۃ اللہ علیہ کے کا ہے کہ انہوں نے بجائے کسی امام کی بیاد کرنے کے خود اپنی امامت کا دعویٰ کیا اور تلوار لہرا کر اعلان کیا کہ اہل بیت میں امام وہی ہے جو مرد میدان ہو تلوار لے کر خروج کرے جو

پوشیدہ اور چوپار ہے وہ امام نہیں چنانچہ قاضی نور اللہ اور دوسرے شیعوں نے ابو بکر حضرمی کے حوالہ سے مجالس وغیرہ میں یہ باتیں بیان کی ہیں اور اس دعوی و امامت کا سلسلہ اپ کی اولاد میں جاری رہا یحیی اور متوکل نے بھی خروج کیا اور امامت کا دعوی ان بزرگوں سے متعلق شیعی عقیدت و محبت کا احوال ان کی کتابوں میں مرقوم و محفوظ ہے یہ سب ان کو نیکی سے یاد کرتے اور واجب المحبت جانتے ہیں بلکہ جناب جعفر رحمہ اللہ سے مناقب زید شہید رحمہ اللہ میں نص صریح نقل کرتے ہیں کہ آپ نے ان کی شہادت کے بعد فرمایا اللہ مجھے بھی ان کے خونوں میں حصہ دار بنائے قسم بخدا زید میرے چچا ہیں وہ اور ان کے ساتھ ہی ایسے ہی شہید ہیں جیسے علی بن ابی طالب اور ان کے ساتھ ہی شیخ ابن بابویہ نے امالی میں فضیل بن یسار سے اس کی روایت کی ہے اور قاضی نور اللہ نے بھی مجالس المومنین میں فضیل بن یسار کے حالات کے ذیل میں یہ روایت نقل کی ہے اور یہ بات بھی اسی ذیل میں آتی ہے کہ جناب جعفر صادق رحمہ اللہ کے پانچوں لڑکے محمد، اسحاق، عبد اللہ، موسی، اسماعیل امامت کے سلسلے میں باہم مخالفت رکھتے تھے۔

عبد اللہ افطح، اسماعیل کے سگے بھائی ہیں ان کی ماں فاطمہ بنت حسین بن حسین بن علی رحمہ اللہ تھیں اسماعیل جناب جعفر کی اولاد میں سب سے بڑے تھے اور اپ کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے اسماعیل کی وراثت کے سبب جناب جعفر رحمہ اللہ کے بعد امامت کا دعوی انہوں نے یعنی عبد اللہ افطح نے کیا اور دلیل میں جناب امام جعفر رحمہ اللہ کا یہ قول پیش کیا کہ:

" أن هذا الأمر في الأكبر، ما لم تكن به عاهة "(1)

امامت بڑے ہی میں رہے گی تا آنکہ اس میں کوئی خرابی نہ ہو۔

جناب جعفر رحمہ اللہ کو غسل بھی انہوں نے دیا نماز جنازہ بھی پڑھائی قبر میں بھی انہی نے اتارا انگوٹھی بھی انہوں نے لی، امام وصی نے امانتیں بھی انہی کے سپرد کیں۔

ادھر محمد نے بھی امامت کا دعوی کیا ان کی سند یہ تھی کہ جناب محمد باقر نے جناب صادق رحمہ اللہ سے فرمایا تھا کہ تمہارے گھر میں میرے بعد ایک لڑکا پیدا ہو گا جس کا نام تم محمد رکھو گے وہ امام ہو گا۔

1۔ الأصول من الکافي، 1/ 285، دار الکتب الاسلامية

اسماعیلیہ اسماعیل کو امام مانتے ہیں تو اسحاقیہ اسحاق کو اور موسویہ امام موسیٰ کاظم کو امام تسلیم کرتے ہیں امام علی رضا کے بعد امام محمد تقی بچے اور حالات سے بے خبر تھے اکثر شیعہ ان کے امامت کے منکر ہیں امام نقی کے بعد موسیٰ بن محمد نے بھی امامت کا دعویٰ کیا ایک جماعت ان کی پیروہوئی جناب امام علی تقی کے بعد جعفر بن علی نے امامت کا دعویٰ کیا جو امام حسن عسکری کی امامت کے قائل تھے ان کا حمار یہ لقب رکھا جب امام حسن عسکری نے وفات پائی تو جعفر نے اپنے دعویٰ میں قوت حاصل کرلی اور کہا کہ حسن بن علی نے کوئی جانشین نہیں چھوڑا امام کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ کوئی خلف وجانشین رکھتا ہو لہٰذا امام حسن کے ماننے والے بہت سے لوگوں نے جعفر کی طرف رجوع کرلیا ان میں سے ایک شخص حسن بن علی بن فضال تھے یہ شخص شیعوں کے مجتہدین محدثین ومعتبرین میں سے تھے۔

جعفر بن علی کے بعد ان کا لڑکا علی بن جعفر اور ان کی لڑکی فاطمہ جعفر نے شرکت میں امامت کا دعویٰ کیا اور جو امام حسن عسکری کی امامت کے معتقد تھے وہ بھی گیارہ فرقوں میں بٹ گئے۔

مقصد کلام یہ کہ ان حضرات کی آپس کی مخالفتیں اور ایک دوسرے کی امامت کا انکار کوئی راز سربستہ قسم کی چیز نہیں تھی بلکہ ساجھے کی ہانڈی کی طرح الاعلان تھوڑی جارہی تھی جلوتی اور خلوتی سارے ہی رازہائے دروں پردہ سے آگاہ ہوچکے تھے خصوصا امام حسن عسکری اور جعفر بن علی کے درمیان تو طعن بازی فسق اور ارتکاب کبائر تک کے الزامات کی نوبت پہنچ گئی تھی شیعہ اسے خوب جانتے ہیں۔

خاتمہ کلام کے طور پر کہنے کی بات صرف اتنی ہے کہ ان ساری مخالفتوں عداوتوں اور توتوں میں میں کے باوجود ان بزرگوں کو اولاد علی ہونے کی نسبت حاصل ہے اس لیے انکساری خامیاں اپنی جگہ مگر یہ ان سب کے نزدیک مقبول اور واجب التعظیم والمحبت ہیں اور ان کی شکررنجیاں اور اداوتیں مخالفتیں وغیرہ سب لائق اغماز وچشم پوشی ہیں۔

اب دوسری بات محب علی یا شیعہ علی کی طرف ایئے سب کو معلوم ہے کہ مختار امامت زین العابدین کا منکر تھا نہ صرف منکر بلکہ معاند بھی کہ آپ کے ایک سلبی بیٹے عبداللہ کو اس نے کوفہ میں قتل کردیا اس کے علاوہ بھی بہت سی قبیح اور ناشائستہ حرکات اس سے سرزدرہی ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے قاضی نوراللہ نے مختار ثقفی کے حالات میں لکھا ہے کہ اس کے حسن عقیدت میں کسی شیعہ کو کوئی کلام نہیں ہے زیادہ سے زیادہ

جب اس کے اعمال پر لوگوں کو اس پر اعتراض ہوا تو وہ اس پر شب و شتم کرنے لگے امام باقر کو جب علم ہوا تو آپ نے شیعوں کو اس سے روکا کہ اس پر لعن طعن نہ کی جائے وہ تو ہمارا بہت بڑا محسن ہے اس نے ہمیں مارنے والوں کو مار اہم کو اموال بھیجے اور دولت دی۔

تو گویا جس نے اپنے اوپر شیعہ علی کا لیبل چسپاں کر لیا اب اس کے لیے دنیا بھر کی ساری خباثتیں حلال ہو گئیں آپ سے نسبت پیدا کر لینے کے بعد اس کے ساتھ برائی سے پیش آنا حرام ہے اور اثنا عشریوں کے ہاں چونکہ بنی فضال اور دوسرے واقفیہ، ناوسیہ کی روایات مقبول ہیں ان پر بھی جائز نہیں کیونکہ آخر وہ محب علی تھے اور خود کو شیعہ علی کہتے تھے کیا ہوا جو بہت سے ائمہ کے امامت کو ٹھکراتے اور انکار کرتے تھے۔

جب یہ مقدمہ ہر پہلو سے ثابت ہو گیا اور کسی کے لیے انکار کی گنجائش نہ رہی تو اب اہل سنت کہتے ہیں کہ علی کی جگہ محمد ﷺ کو فرض کرنا چاہیے اور اپ کی محبت اور آپ پر ایمان کو علی کی محبت اور علی کی امامت کے اعتقاد کی جگہ جاننا چاہیے اور اقارب و ازواج و اصحاب محمد ﷺ کو مہاجرین و انصار میں سے بجائے اولاد علی فرض کرنا چاہیے اور ان لوگوں کو جنہوں نے محمد ﷺ کے ساتھ محبت رکھنے کا دعوی کیا ان پر ایمان رکھا محمد ﷺ کے دشمنوں کے ساتھ جہاد کیا ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور آپ کے خاندان کی خدمات بجالائے اگرچہ ان سے انکار قدر ناشناسی اور اعمال قبیحہ کا صدور ہو ان کو بجائے مختار و بنی فضال کے سمجھنا چاہیے اور ان میں اپس میں موازنہ نہ کرنا چاہیے، اب جو یہ کہتا ہے کہ محبت علی اور شیعت علی تاثیر رکھتی ہے کہ وہ اس کا دعویٰ کر کے بے شک ائمہ کی امامت کا انکار کرے ان کی شان میں بدگوئی کرے ان سے پرخاش رکھے مگر یہ تعلق اسے یہ تحفظ فراہم کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے لعن وطعن سے محفوظ رہتا ہے وہ یہ بتائے کہ محمد ﷺ سے محبت اور آپ کی امت میں خود کو شمار کرنا اتنی تاثیر کیوں نہیں رکھتا کہ علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے انکار کے بعد وہ شیعوں کے لعن وطعن سے محفوظ رہ سکے۔

ہم کہتے ہیں یہ امر دو حال سے خالی نہیں کہ یا تو محمد ﷺ کا درجہ جناب علی رضی اللہ عنہ کے درجہ سے علی گھٹیا ہے یا علی کا درجہ خدانخواستہ محمد رضی اللہ عنہ کے درجہ سے بڑھیا اور یہ دونوں صورتیں شیعوں کے نزدیک غلط و باطل ہیں بلکہ ان کے نزدیک محمد ﷺ و علی رضی اللہ عنہ اعتبار درجہ برابر و مساوی ہیں جیسا کہ باب نبوت میں گزر چکا اور محمد

ﷺ کے منصب نبوت کی بلندی جناب علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے منصب پر اس مساوات کے علاوہ ہے اس لیے تمام کتب شیعہ میں امامت کو نیابت نبی کہا گیا ہے۔

جب یہ دس مقدمات ذہن نشین ہو گئے تو اب ان سے نتیجہ نکال لیجئے اللہ تعالیٰ مقاصد و مبادی تک پہنچنے کی ہدایت اور توفیق مرحمت فرمائے۔

مصنف کا حرف آخر

اپنے موضوع کی عجیب تر کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" بارہویں صدی ہجری کے بعد زیب تحریر سے مزین ہو کر نقش اختتام سے آراستہ ہوئی خدا کا شکر و احسان ہے کہ اس کی ابتدا میں جس بات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اسی شرط کے تحت انجام تک پہنچا۔

حضرت باری عزہ و جل اسمہ کے فضل امین سے امید ہے کہ اس تحفہ کو اپنی بارگاہ میں مقبولیت کا درجہ عطا فرما کر تمام مومن مرد و عورت کو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا موقع عطا فرمائیں گے اور اپنے انتہائی کرم و فضل جود و احسان کے طفیل راقم کتاب کو بھی اجر نیک اور ثواب عظیم عطا فرمائیں گے جناب باری میں انتہائی الحاح عاجزی اور زاری سے ملتجی ہوں کہ زبان و قلم کی لغزش سے اثنائے تقریر و تحریر میں اپنی یا اپنے دوستوں کی مرضی کے خلاف اس کتاب میں کوئی بات درج یا سرزد ہو گئی ہو تو محض اپنی بے پناہ عنایت و مہربانی سے اسے معاف فرما کر درگزر فرمائے اور دنیا و آخرت میں اس کے مواخذہ سے نجات بخشے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ، وصلى الله على خير خلقه محمد واله واصحابه اجمعين برحمتك يا ارحم الراحمين واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

تمت بالخير